افلا یتدبرون القرآن

تدبرِ قرآن

مولانا امین احسن اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ

آلِ عمران ۳ — المآئدۃ ۵

تدبرِ قرآن —— جلد دوم

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ

تدبرِ قرآن

جلد دوم

تفاسیر

سورۂ آل عمران (۳) ___ تا ___ سورۂ مائدہ (۵)

امین احسن اصلاحی

فاران فاؤنڈیشن

لاہور ___ پاکستان

اہتمام — حسن خاور

مطبع — کیو۔وائی پرنٹرز، میکلوڈ روڈ، لاہور

تاریخ اشاعت — نومبر 2009ء — ذیقعد 1430ھ

ادارہ — فاران فاؤنڈیشن

سیکنڈ فلور، علق پریس بلڈنگ، 19-اے،
ایبٹ روڈ، لاہور، پاکستان۔فون: 042-6303244
ای میل: faran@wol.net.pk

فہرس

تدبّرِ قرآن

۳

آلِ عمران

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

مندرجہ ذیل پہلوؤں سے یہ سورہ سابق سورہ (بقرہ) سے نہایت گہرا ربط رکھتی ہے۔

۱۔ ان دونوں کا موضوع ایک ہی ہے۔ یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اثبات۔ لوگوں پر عموماً اور اہل کتاب پر خصوصاً۔

۲۔ دونوں میں یکساں شرح و بسط کے ساتھ دین کی اصولی باتوں پر بحث ہوئی ہے۔

۳۔ دونوں کا قرآنی نام بھی ایک ہی ہے۔ یعنی الٓـمّٓ۔

۴۔ دونوں شکلاً بھی ایک ہی تنے سے پھوٹی ہوئی دو بڑی بڑی شاخوں کی طرح نظر آتی ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کو شمس و قمر سے تشبیہ دی ہے اور فرمایا ہے کہ یہ دونوں حشر کے دن دو بدلیوں کی صورت میں ظاہر ہوں گی۔ اہل بصیرت سمجھ سکتے ہیں کہ وصف اور تمثیل میں یہ اشتراک بغیر کسی گہری مناسبت کے نہیں ہو سکتا۔

۵۔ دونوں میں زوجین کی سی نسبت ہے۔ ایک میں جو بات مجمل بیان ہوئی ہے، دوسری میں اس کی تفصیل بیان ہو گئی ہے۔ اسی طرح ایک میں جو خلا رہ گیا ہے، دوسری نے اس کو پُر کر دیا ہے۔ گویا دونوں مل کر ایک اعلیٰ مقصد کو اس کی مکمل شکل میں نہایت خوب صورتی کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔

ب۔ سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران کے امتیازی پہلو

لیکن اس اشتراک اور یکسانی کے ساتھ ساتھ ان دونوں کی کچھ الگ الگ خصوصیات بھی ہیں جو ان کو ایک دوسری سے ممتاز کرتی ہیں۔ مثلاً

بقرہ پر غور کیجیے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورہ اس زمانے میں نازل ہوئی ہے جب اہل کتاب نے یہ محسوس کر لیا ہے کہ اسلام ایک سچا دین ہے اور یہ آہستہ آہستہ جڑ پکڑ رہا ہے لیکن حسد اور ضد کے باعث وہ اس کو قبول کرنے پر تیار نہیں ہوئے۔ اس احساس نے ان کو شدید کشمکش میں ڈال دیا ہے۔ وہ جذبات سے مغلوب ہو کر اس کی مخالفت کے لیے تو اٹھ کھڑے ہوئے لیکن یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی کہ یہ مخالفت

کس عنوان سے کریں ۔ جس کے منہ میں جو آیا اس نے وہ اگلنا شروع کر دیا ۔ کسی نے کہا نبوت و رسالت کے لیے تو بنی اسرائیل کا گھرانا مخصوص رہا ہے ، اس گھرانے سے باہر کسی کو نبوت کس طرح مل سکتی ہے ؟ کسی نے کہا ہدایت کے لیے تو بس تورات کافی ہے اور جب اس کے حامل ہم موجود ہیں تو اب کسی نئی ہدایت کی ضرورت کہاں باقی رہی ، اسی جھنجھلاہٹ میں بعضوں نے حضرت جبریل تک کو مطعون کر ڈالا کہ یہ فرشتہ شروع سے ہمارا بیری ہے ۔ کچھ لوگوں نے یہود و نصاریٰ کا ایک متحدہ محاذ بنا کر مخالفت کا یہ پہلو اختیار کیا کہ آسمانی ہدایت یا تو یہودیت کے اندر ہے یا نصرانیت کے اندر ، جس کو ہدایت مطلوب ہو وہ ان میں سے کسی کو اختیار کرے ، ان کے سوا آسمانی ہدایت حاصل ہونے کا کوئی اور راستہ نہیں ہے ۔ ایک گروہ نے دھوکا بازی کی روش اختیار کی ۔ اس نے مسلمانوں کو یہ اطمینان دلانا چاہا کہ ہم بھی ایمان رکھتے ہیں ، مسلمان ایمان کا اجارہ دار تنہا اپنے ہی کو نہ سمجھیں ، خدا ، آخرت اور اپنے پیغمبر کو تو ہم بھی مانتے ہیں ، اس سے کیا فرق پیدا ہوا کہ ہم نئے مدعی نبوت کو نہیں مانتے ۔ ان حالات میں یہ سورہ اتری ۔ اس میں ایک طرف تو تفصیل کے ساتھ ان تمام اعتراضات کے جواب دیے گئے جو اہل کتاب کی طرف سے اٹھائے گئے ، دوسری طرف نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کی جو اعلیٰ سند خود ان کے صحیفوں میں موجود تھی ، اس کو واضح کیا گیا اور تیسری طرف نبی امیؐ کی رسالت سے دین حق کی جو تجدید و تکمیل ہوئی تھی اس کی طرف رہنمائی کی گئی ۔ اس طرح یہ سورہ گویا دعوتِ ایمان و اثباتِ رسالت بھی ہے اور دعوتِ جہاد برائے آزادیِ قبلہ و غزوۂ بدر بھی ۔

سورۂ آلِ عمران پر غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ بقرہ کے کچھ عرصہ بعد اس دور میں نازل ہوئی ہے جب افق پر اسلام کے غلبہ اور اس کی صداقت کے آثار اتنے نمایاں ہو چکے ہیں کہ اہل کتاب کے لیے اس کی علانیہ مخالفت کرنا ممکن نہیں رہا ۔ اس صورتِ حال نے اہل کتاب کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا ۔ ایک گروہ نے تو اسلام قبول کر لیا لیکن یہ اسلام صرف اس کی زبانوں ہی تک رہا ، اس کے دلوں میں نہیں گھسا ۔ دوسرے گروہ نے اسلام تو نہیں قبول کیا لیکن اس نے مسلمانوں کے ساتھ مذہب کے معاملے میں ایک سمجھوتہ کرنے کی کوشش کی ۔ اس سمجھوتے کے لیے اس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ ہر مذہب کے پیروؤں کے لیے ان کا اپنا دین حق ہے اس وجہ سے مسلمان ہم کو ہماری یہودیت و نصرانیت پر چھوڑ دیں اور ہم مسلمانوں کو ان کے اسلام پر ۔ اس طرح دونوں اپنے اپنے دین پر قائم رہتے ہوئے ایک ہی ملک میں ایک ساتھ امن کی زندگی بسر کر سکیں گے ۔[1]

---

[1] سورہ بقرہ کے شروع میں اس گروہ کی طرف اشارہ ہے لیکن اس وقت تک یہ گروہ پوری طرح سامنے نہیں آیا تھا ۔ اس سورت میں یہ بے نقاب ہو کر سامنے آ گیا ہے ۔ اس گروہ کا نظریہ بعینہٖ وہی ہے جو آج وحدتِ ادیان کے نام سے پیش کیا جا رہا ہے ۔

اس طرح ان دونوں گروہوں کا رویّہ اسلام کے ساتھ بدل تو گیا لیکن یہ تبدیلی دل کی تبدیلی کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ سراسر مصلحت پرستی پر مبنی تھی۔ پہلے گروہ نے اسلام کا جو اظہار کیا تو محض مسلمانوں کی متوقع کامیابیوں میں حصّہ بٹانے کے لیے۔ دوسرے نے صلح جویانہ پالیسی اختیار کی تو صرف متوقع خطرات سے اپنے کو محفوظ کرنے کے لیے۔

اسی اثنا میں احد کا معرکہ پیش آیا جس میں مسلمانوں ہی کی ایک جماعت کی بے تدبیری سے ان کو ایک عارضی شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ اس واقعے کا اثر اہل کتاب کے مذکورہ دونوں گروہوں پر یہ ہوا کہ انھوں نے اسلام کے بارے میں اپنی پالیسی پھر تبدیل کر دی۔ جو گروہ محض دنیوی کامیابیوں کے لالچ میں اسلام کی صفوں میں آ گھسا تھا جب اس نے دیکھا کہ اس راہ میں خطرات بھی پیش آ سکتے ہیں تو اس نے اس خطرے کے سودے سے دستبرداری کا اعلان کر دیا اور اسلام کی اطاعت کا قلادہ اتار کر پھر اپنے کفر کی طرف پلٹ گیا۔ دوسرے گروہ نے جب دیکھا کہ اسلام کو زک بھی پہنچائی جا سکتی ہے تو اس نے سوچا کہ ہم نے جو اس کی بڑھتی ہوئی طاقت سے مرعوب ہو کر اس کے ساتھ صلح جویانہ روش اختیار کر لی ہے، یہ غلط ہے، کیوں نہ ہم مخالف طاقتوں کو قوت پہنچا کر یہ کوشش کریں کہ ایک مرتبہ اسلام کو جڑ پیڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیں۔ چنانچہ انھوں نے بھی کھلم کھلا اپنی دشمنی کا اعلان کر دیا۔

اس طرح یہ دونوں ہی گروہ کھلم کھلا اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت کی راہ پر چل پڑے اور انھوں نے طرح طرح کی چالوں سے مسلمانوں کے ذہنوں میں شبہات و شکوک بھرنے شروع کیے تاکہ جس طرح وہ خود فرقوں اور گروہوں میں بٹ چکے ہیں اسی طرح مسلمان بھی اپنی وحدت و یکجہتی کھو کر پراگندہ ہو جائیں اور ان کی طاقت ختم ہو جائے۔ ان حالات نے تقاضا کیا کہ اہل کتاب اور مسلمانوں دونوں کے سامنے دین کی یہ حقیقت واضح کی جائے کہ اللہ کی طرف سے لوگوں کو کئی دین نہیں ملے ہیں بلکہ ایک ہی دین ملا ہے جس کا نام اسلام ہے۔ اس دین میں تقسیم اور تجزیہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ اس کے کچھ حصّے کو تو مانا جائے اور کچھ کو نہ مانا جائے بلکہ بیک وقت اس کے کل کو ماننا یا کل کو چھوڑنا ہے۔ اس دین کا مطالبہ ہر حالت میں اللہ کی اطاعت اور اس کے احکام کی فرمانبرداری ہے، خواہ حالات نرم ہوں یا سخت اور خواہ راہ ہموار نظر آ رہی ہو یا آزمائشوں اور فتنوں نے قدم قدم پر رکاوٹیں کھڑی کر رکھی ہوں، حق بہر حال حق ہے، وہ بعض حالات میں مخفی تو ہو جاتا ہے جس طرح چھلکے کے اندر مغز لیکن معدوم نہیں ہوتا۔ اس طرح کے حالات میں وہی لوگ ثابت قدم رہتے ہیں جن کے ایمان اور علم میں پختگی ہوتی ہے۔ جو حق سے بے خبر ہوتے ہیں ان کے قدم اکھڑ جاتے ہیں۔

غزوہ احد بھی اسی طرح کا ایک امتحان بن کر لوگوں کے سامنے آیا۔ جس طرح غزوہ بدر کی نوعیت ایک فرقان کی تھی جس نے حق اور باطل کو الگ الگ کر دیا اسی طرح غزوہ احد کی حیثیت ایک آیت

متشابہ کی تھی جس کے باطن میں حکمت تھی لیکن اس کا ظاہر کمزور لوگوں کے لیے آزمائش بن گیا چنانچہ اس نے پختہ فکر و پختہ ایمان مسلمانوں کو چھانٹ کر ان لوگوں سے بالکل الگ کر دیا جن کے دلوں میں کجی اور دماغوں میں فتنہ جوئی تھی۔

یہ حالات تھے جن میں یہ سورہ اتری چنانچہ اس میں ان تمام خامیوں اور گمراہیوں پر تبصرہ ہے جو اس وقت نمایاں ہوئیں، عام اس سے کہ وہ مسلمانوں سے ظاہر ہوئیں یا اہل کتاب سے۔ اس میں اس شک اور تذبذب کی ضلالت بھی واضح کی گئی ہے جس میں اہل کتاب مبتلا تھے اور اس اختلاف اور عدم اطاعت کے انجام بد پر بھی تبصرہ ہے جس کا اظہار منافقوں اور کمزور قسم کے مسلمانوں کی طرف سے ہوا تھا۔ ساتھ ہی مسلمانوں کو ان تمام چالوں سے آگاہ کیا گیا ہے جو ان کو زک پہنچانے کے لیے ان کے دشمن چل رہے تھے اور احد کی شکست سے ان کو جو بددلی ہوئی تھی اس کو نہایت مؤثر انداز میں دور کیا گیا۔ اس پہلو سے غور کیجیے تو آپ محسوس کریں گے کہ جس طرح سورۂ بقرہ سورہ بدر ہے اسی طرح یہ سورۂ آل عمران سورہ اُحد ہے۔ مزید غور کیجیے تو یہ بات بھی واضح ہوگی کہ بقرہ میں ایمان کی حقیقت واضح کی گئی ہے اور اس سورہ میں اسلام کی۔ دوسرے الفاظ میں اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ بقرہ میں اللہ کے آخری رسول پر ایمان لانے کی دعوت ہے اور اس سورہ میں اسلامی نظام اور اللہ کی حکومت میں داخل ہونے کی دعوت ہے۔

ان دونوں سورتوں کے موضوع اور عمود سے متعلق یہ ہم نے جو کچھ عرض کیا ہے اس سے یہ بات واضح کرنی مقصود ہے کہ بقرہ میں ایمان کا پہلو نمایاں ہے اور اس سورہ میں اسلام کا۔ اس حقیقت کی طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے بھی ہمیں رہنمائی ملتی ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ حضورؐ نمازوں میں کبھی کبھی ایک رکعت میں بقرہ میں سے آیت ایمان پڑھتے اور دوسری رکعت میں آل عمران میں سے آیت اسلام۔ یہ گویا ایک لطیف اشارہ ہوتا اس بات کی طرف کہ ان دونوں سورتوں میں موضوع اور مقصود کی حیثیت کن مضامین کو حاصل ہے۔ علاوہ ازیں بقرہ کا خاتمہ ایک ایسی آیت پر ہوا ہے جو ایمان کے باب میں ایک نہایت جامع آیت ہے۔ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ الآیۃ اور پھر اس کا خاتمہ کامل اطاعت الٰہی کے مضمون پر ہوا ہے تاکہ ہم پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ ایمان کا لازمی ثمرہ اسلام ہے، جہاں صحیح ایمان موجود ہوگا اس سے لازماً اسلام ظہور میں آئے گا۔ اس طرح بقرہ کے خاتمے کی آیت نے آل عمران کے ساتھ اس کے ربط کو خود واضح کر دیا۔

دوسرا پہلو ان دونوں کے درمیان امتیاز کا یہ ہے کہ سورۂ بقرہ میں زیادہ تر خطاب یہود سے ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل کتاب کی حیثیت سے اصلی مقام انھی کو حاصل تھا۔ نصاریٰ کی حیثیت محض ایک ضمنی فرقے کی تھی۔ چنانچہ قرآن نے بقرہ میں ان سے خطاب کیا بھی ہے تو وہ سرسری نوعیت کا ہے۔ البتہ آل عمران میں ان سے براہ راست خطاب کیا ہے اور بحث کا زیادہ حصہ انھی سے متعلق ہے۔ سورہ کی تمہید بھی ایک

جامع نوعیت کی ہے جو یہود و نصاریٰ دونوں کے لیے موزوں ہے۔ پھر اس سے آگے جو مضمون شروع ہوا ہے وہ تدریجی طور پر نصاریٰ کی تردید میں نمایاں ہوتا گیا ہے۔

تیسرا پہلو یہ ہے کہ بقرہ میں استدلال زیادہ تر ایسے امور فطرت سے ہے جو کفار اور اہل کتاب دونوں پر یکساں حجت ہو سکتے ہیں۔ اس کے برخلاف آل عمران میں زیادہ تر استدلال صفات الٰہی یا ایسے مسلمات سے ہے جو اہل کتاب کے ساتھ مخصوص ہیں۔

چوتھا پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اگرچہ ان دونوں ہی سورتوں میں اہل کتاب کو سخت توبیخ فرمائی ہے لیکن انداز توبیخ دونوں میں الگ الگ ہے۔ بقرہ میں توبیخ براہ راست ہے برعکس اس کے آل عمران میں ان کو براہ راست خطاب کرنے کے بجائے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ ان کو یہ یہ تہدیدات پہنچا دو۔ یہ گویا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حجت تمام ہو جانے کے بعد یہ لوگ لائق خطاب نہیں رہے۔ اب خطاب کے اہل صرف پیغمبرؐ اور اہل ایمان ہی ہیں۔

ج۔ دونوں سورتوں کی تقدیم و تاخیر کے وجوہ

ان دونوں سورتوں کے موضوع، ان کے زمانۂ نزول کی خصوصیات، ان کے اسلوب بیان کے امتیازات پر ہم نے یہ جو کچھ عرض کیا ہے اس سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ مضامین کے اشتراک کے باوجود ان دونوں میں نسبت اس نوعیت کی ہے کہ مصحف میں تقدیم و تاخیر کے لحاظ سے ان کی یہی ترتیب ہونی چاہیے تھی جو ہے۔ یہاں بقرہ کے آل عمران پر مقدم رکھنے کے مندرجہ ذیل وجوہ بالکل واضح ہیں۔

ایمان اسلام کی بنیاد ہے۔ جس طرح علم عمل کی بنیاد ہے۔

یہود، نصاریٰ سے اقدم ہیں اس وجہ سے ضروری ہوا کہ پہلے یہود پر حجت تمام کی جائے۔

دلائل فطرت سے استدلال، صفات الٰہی سے استدلال کے مقابل میں زیادہ واضح، زیادہ قدیم، زیادہ وسیع ہے اس وجہ سے قرآن نے پہلے اس کو استعمال کیا۔

علیٰ ہذا القیاس حضرت آدم اور حضرت ابراہیم علیہما السلام چونکہ انبیاء متقدمین میں سے ہیں اس وجہ سے یہ مناسب ہوا کہ پہلے ان کے عہد و میثاق کا حوالہ دیا جائے اور اس سے استدلال کیا جائے۔ چنانچہ بقرہ میں ان کے عہد کا حوالہ دیا۔ بعد کی سورہ میں دوسرے انبیا کے عہد کا ذکر ہوا۔

اس تفصیل سے یہ بات معلوم ہوئی کہ ان لوگوں کا خیال صحیح نہیں ہے جو سمجھتے ہیں کہ ترتیب میں سورتوں کی تقدیم و تاخیر صرف ان کی ظاہری بڑائی چھوٹائی پر مبنی ہے۔ ہمارے نزدیک اس کا تعلق معانی و مطالب سے ہے۔ معانی کی ترتیب کے لحاظ سے حکمت جس ترتیب کی مقتضی ہوئی ہے وہ ترتیب قرآن میں اختیار فرمائی گئی ہے۔ البتہ اگر کہیں معانی کے اعتبار سے دو سورتیں ایک ہی درجے اور ایک ہی مزاج

کی ہوئی ہوں تو ممکن ہے، وہاں مجرد طول و حجم کی بنا پر ایک کو دوسرے پر مقدم کر دیا گیا ہو۔ لیکن یہ بات محض قیاس کے حد تک صحیح قرار دی جا سکتی ہے، ورنہ ایسے مواقع میں بھی گمان یہی ہوتا ہے کہ کوئی گہری معنوی حکمت ایک کو دوسرے پر مقدم کرنے کا باعث ہوئی ہوگی اگرچہ وہ حکمت ہماری سمجھ میں نہ آرہی ہو۔

د۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

یہ جو کچھ ہم نے عرض کیا ہے اس کا تعلق سورہ کے موضوع، اس کے ظاہری نظام اور سابق سورہ کے ساتھ اس کے تعلق سے ہے۔ اب ہمیں چند باتیں اس کے اندرونی نظام اور اس کے مختلف اجزا کے باہمی ربط و تعلق کے بابت بھی کہنی ہیں۔

اس سورہ پر جو شخص بھی تامل کی نظر ڈالے گا اس پر یہ حقیقت واضح ہوگی کہ یہ دو بڑے حصوں میں منقسم ہے۔ اس کے نصف اول میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا اثبات اور اہل کتاب خصوصاً نصاریٰ کی گمراہیوں کا بیان ہے اور اس کے دوسرے نصف میں مسلمانوں کو اہل کتاب کی ان گمراہ کن چالوں سے خبردار کیا گیا ہے جو وہ ان کو راہِ حق سے ہٹانے کے لیے اختیار کر رہے ہیں یا اختیار کرنے والے ہیں۔ ساتھ ہی ان کو اللہ کی رسی مضبوطی سے تھامے رہنے، اطاعت پر جمے رہنے، جہاد کرنے اور امتحان کے مواقع پر انتشار و اختلاف سے بچنے کی تاکید فرمائی کہ اسی طرح وہ اسلام کی پیروی کا صحیح حق ادا کر سکیں گے اور نرمی و سختی دونوں صورتوں میں اللہ کی اطاعت پر قائم رہ سکیں گے۔ اگر وہ ان باتوں کی خلاف ورزی کریں گے تو ان کا حشر بھی وہی ہوگا جو موسیٰ علیہ السلام کی امت کا ہوا کہ انھوں نے اپنے پیغمبر کی نافرمانی کی تو چالیس سال تک صحرا ہی میں بھٹکتے رہ گئے۔

اس پہلو سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ اس کے نصف اول کی حیثیت تمہید کی ہے اور نصف ثانی کی حیثیت مقصود کی۔ اس روشنی میں پوری سورہ کی تلاوت کیجیے تو آیات کا باہمی نظم سمجھنے میں بڑی آسانی ہوگی اور اس تمہید سے اصلی مقصود یہی ہے۔ رہا آیات کا باہمی نظم اور اس کے معانی کی وضاحت تو یہ چیز اس وقت سامنے آئے گی جب ہم سورۂ بقرہ کی طرح اس کے اجزا کو بھی الگ الگ مجموعوں کی شکل میں لے کر ان کی تفسیر کریں گے۔ چنانچہ اب ہم اللہ تعالیٰ کی توفیق کی رہنمائی میں اس سورہ کی تفسیر شروع کرتے ہیں۔ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ[1]

---

[1] یہ تمہیدی بحث بیشتر استاذ رحمۃ اللہ علیہ کے افادات سے ماخوذ ہے۔

سُوْرَۃُ اٰلِ عِمْرٰنَ (۳)

مَدَنِیَّۃٌ ———— اٰیاتھا ۲۰۰

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

آیات ۱-۶

الٓمّٓ ۝۱ اللّٰہُ لَآ اِلٰـہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۝۲ نَزَّلَ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْہِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىۃَ وَالْاِنْجِیْلَ ۝۳ مِنْ قَبْلُ ھُدًی لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ۵ۭ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ لَھُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ ۭ وَاللّٰہُ عَزِیْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ۝۴ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَخْفٰی عَلَیْہِ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَاۗءِ ۝۵ ھُوَ الَّذِیْ یُصَوِّرُکُمْ فِی الْاَرْحَامِ کَیْفَ یَشَاۗءُ ۭ لَآ اِلٰـہَ اِلَّا ھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ۝۶

شروع خدائے رحمان ورحیم کے نام سے

ترجمۂ آیات ۱-۶

یہ الٓمّٓ ہے۔ اللہ ہی معبود ہے، نہیں ہے کوئی معبود مگر وہی، زندہ اور قائم رکھنے والا۔ اس نے تم پر کتاب اتاری حق کے ساتھ مصداق اس کی جو اس کے آگے سے موجود ہے۔ اور اس نے تورات اور انجیل اتاری اس سے پہلے لوگوں کے لیے ہدایت بنا کر۔ اور پھر فرقان اُتارا۔ بے شک جن لوگوں نے اللہ کی آیات کا انکار کیا، ان کے لیے سخت عذاب ہے اور اللہ غالب اور انتقام لینے والا ہے۔ اللہ سے کوئی چیز بھی مخفی نہیں ہے، نہ زمین میں نہ آسمان میں۔ وہی ہے جو تمھاری صورت گری کرتا ہے رحموں کے اندر جس طرح چاہتا ہے۔ نہیں کوئی معبود مگر وہ، وہ غالب اور حکیم ہے۔

۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

الٓمٓ (۱) سورۂ بقرہ کی تفسیر میں حروف مقطعات پر ایک جامع بحث ہم کر چکے ہیں۔ وہاں ہم نے اس باب میں استاذ امام مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ کا نقطۂ نظر بھی پیش کر دیا ہے۔ اس کے سوا کوئی نئی چیز اس سلسلے میں ہمارے سامنے ایسی نہیں آئی جو یہاں قابل ذکر ہو۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ (۲) اس آیت میں جو اسمائے حسنیٰ مذکور ہیں سب کی تحقیق گزر چکی ہے۔ بعض کی تفسیر سورۂ فاتحہ میں، بعض کی سورہ بقرہ میں۔

صفاتِ حیات و قیومیت کے اسرار و مقتضیات

یہ امر، جیسا کہ ہم تمہید میں اشارہ کر چکے ہیں، ملحوظ رہے کہ اس سورہ میں استدلال بیشتر صفاتِ الٰہی سے ہے۔ صفاتِ الٰہی میں سب سے پہلے صفاتِ حیات و قیومیت کو لیا ہے۔ ان دونوں صفتوں کے اسرار و حقائق پر ہم آیت الکرسی کے اسرار و حقائق کے ضمن میں گفتگو کر چکے ہیں۔ یہاں ان کا اعادہ باعثِ طوالت ہوگا۔ یہاں موقع کلام کی مناسبت سے ان صفات کا حوالہ کتابِ الٰہی کی ضرورت کے اثبات کے پہلو سے ہے، چنانچہ بعد کی آیات سے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہو رہا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ، جس کے سوا کوئی معبود نہیں، ایک زندہ خدا ہے تو ناگزیر ہے کہ وہ سب کچھ دیکھتا سنتا ہے، ہماری دعائیں، فریادیں اس تک پہنچتی ہیں ہمارے اعمال و افعال اس کی نظر میں ہیں۔ اس سے یہ بات لازم آتی ہے کہ وہ ہماری دعائیں اپنی حکمت کے مطابق قبول فرماتا ہے اور ہمارے اعمال پر وہ ایک دن جزا اور سزا بھی دے گا۔ پھر ایک قدم اور آگے بڑھ کر اس سے یہ بات بھی لازم آتی ہے کہ بندے اپنی زندگی میں وہ رویہ اختیار کریں جو اسے پسند ہو۔ یہ چیز اس بات کی مقتضی ہے کہ بندوں میں اس بات کی جستجو ہو کہ کون سے اعمال خدا کو پسند ہیں، کون سے ناپسند، تاکہ وہ اس کی اطاعت و ہدایت کی راہ اختیار کر کے سعادت کا مقام حاصل کر سکیں اور حقیقی زندگی کے چشمۂ حیواں سے فیضیاب ہو سکیں۔

اہل کتاب "خداوند خدا، زندہ خدا" کی تعبیر سے اچھی طرح آگاہ تھے۔ ان کے انبیا کے صحیفوں میں بکثرت یہ تعبیر استعمال ہوئی ہے۔ جہاں کہیں بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت، اس کے علم اور اس کی غیرت کا اظہار ہوا ہے بالعموم اس کے لیے "زندہ خداوند" ہی کی تعبیر استعمال ہوئی ہے۔ نصاریٰ اگرچہ اپنے زعم کے مطابق ایک مصلوب خدا کی پرستش کرتے ہیں لیکن وہ بھی "زندہ خدا" کی تعبیر سے ناآشنا نہیں تھے۔ اس وجہ سے یہ بات بداہتہً ان کے خلاف جاتی ہے کہ ایک طرف تو وہ زندہ خدا کا تصور رکھتے ہیں اور دوسری طرف اس کا مصلوب ہونا بھی مانتے ہیں۔

اسی طرح "قیوم" کی صفت بھی انبیا کے صحیفوں میں بار بار مذکور ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے قیوم ہونے کے معنی یہ ہیں کہ آسمان و زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب اللہ ہی کے حکم اور اس کی قدرت سے

قائم ہے۔ یہ صفت اللہ تعالیٰ کی ان بدیہی صفات میں سے ہے جن پر عقلاً بھی ایمان لانا ضروری ہے اور انبیا کے صحیفوں کی رو سے بھی۔ نصاریٰ بھی ان صحیفوں پر ایمان کے مدعی ہیں لیکن اس کے باوجود وہ حضرت مسیح کی الوہیت کے قائل ہیں۔ اگر ان سے یہ سوال کیا جائے کہ جب تم خود اقرار کرتے ہو کہ حضرت مسیح بھوک پیاس محسوس کرتے تھے، غذا اور پانی کے محتاج تھے، بغیر ان چیزوں کے وہ اپنی ہستی کو قائم رکھنے پر قادر نہ تھے تو پھر وہ خدا کس طرح ہوئے، جب کہ خدا کے لیے تمہارے اپنے انبیا کے ارشادات کے بموجب قیوم ہونا ضروری ہے؟ یا یہ سوال کیا جائے کہ جب تمہاری اپنی انجیلوں سے ثابت ہے کہ حضرت مسیح مصائب و شدائد پیش آنے پر روئے، ان کا دل تنگ ہوا اور سولی پر انھوں نے فریاد کی تو پھر وہ آسمان و زمین کے تھامنے والے اور قائم رکھنے والے کیسے ہو سکتے ہیں؟ تو ان سوالوں کے جواب میں ان کے پاس ضد اور کٹ حجتی کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا۔

یہاں قیوم کی صفت کا حوالہ اس بات کی نہایت واضح دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قیوم ہونے کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ وہ ہمیں ہدایت بخشے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ واحد، ہمارا پروردگار، جس طرح ہمارا پیدا کرنے والا اور ہمیں زندگی بخشنے والا ہے اسی طرح وہ، جیسا کہ آیت الکرسی میں ارشاد ہوا، اپنی خلق کو قائم رکھنے والا بھی ہے اور اس کے لیے اس نے ہر قسم کے اسباب و وسائل پیدا کیے ہیں۔ پھر جب اس نے ہماری معیشت کے لیے یہ کچھ سامان کیے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ ہماری اجتماعی زندگی کے لیے وہ چیز نہ دے جو ہمارے قیام و بقا کی ضامن ہو سکے درآنحالیکہ یہ چیز ہماری خلقت کی اصل غایت ہے۔ چنانچہ یہی چیز قیام عدل و قسط کی اصل اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے شرائع و احکام کے نزول کی بنیاد بنی اس لیے کہ اس کے بغیر فطرتِ انسانی ارتقا کے اس درجے کو حاصل نہیں کر سکتی تھی جو اس کے وجود کے اندر مضمر ہے۔

یہ قیومیت اس بات کی بھی مقتضی ہوئی کہ خدائے قیوم و کارساز اس امر کی بھی نگرانی رکھے کہ جب بندے اپنی خود مختاری اور سرکشی سے کام لے کر اس کے نظام عدل کو بالکل مٹا دینے کی کوشش کریں تو وہ اپنے ایسے بندوں کو بھی اٹھاتا رہے جو اس کو از سر نو بحال کرنے کے لیے اپنی مساعی صرف کریں۔ چنانچہ دنیا کی تاریخ شاہد ہے کہ خاتم الانبیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے تک اللہ تعالیٰ نے دنیا کو عدل و حق اور اپنی سیدھی راہ پر استوار رکھنے کے لیے اپنے بے شمار نبی اور رسول بھیجے اور خاتم الانبیا پر دین کی تکمیل کر دینے اور کتابِ الٰہی کو ہر قسم کی دست اندازیوں سے محفوظ کر دینے کے بعد اس مقصد کے لیے یہ اہتمام فرمایا کہ ہر دور میں اس امت کے اندر ایک ایسا گروہ، خواہ وہ کتنا ہی قلیل التعداد ہو، پیدا ہوتا رہے گا جو خود حق و عدل پر قائم اور دوسروں کو اس عدل و حق کے قائم کرنے کی دعوت دیتا رہے گا۔ اس حقیقت کی وضاحت حدیثوں میں بھی ہوئی ہے اور اس کی طرف

بعض لطیف اشارات اس سورہ میں بھی آرہے ہیں جن کی طرف ہم آگے انشاء اللہ موزوں مقامات میں توجہ دلائیں گے۔

نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ۚ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۚ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ (۳)

قرآن کے اتارے جانے کی ضرورت

'حق' کے معنی کی تحقیق تفسیر سورۂ بقرہ کے شروع میں ہم بیان کر چکے ہیں۔ یہاں اس کے مختلف معانی میں سے 'قولِ فیصل' مراد ہے۔ یعنی وہ بات جو نزاع و اختلاف کا فیصلہ کر دے۔ قرآن میں جگہ جگہ یہ بات بیان ہوئی ہے کہ یہود و نصاریٰ کو جو کتاب دی گئی تھی اس میں انھوں نے اختلافات پیدا کر دیے جس کے سبب سے اصل حقیقت گم ہو کر رہ گئی تھی۔ اس گم شدہ حقیقت کو واضح کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن اتارا تاکہ لوگ اللہ کے اصل دین سے بہرہ مند ہوں اور اختلافات و نزاعات کی بھول بھلیاں سے نکل کر دین کی اصلی شاہراہ پر آجائیں۔

'مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ' پر بھی تفصیلی بحث سورہ بقرہ کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔ قرآن کے مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ ہونے کے ایک مشہور معنی تو یہ ہیں کہ یہ بنیادی طور پر پچھلے صحیفوں کی تمام صحیح تعلیمات کی تصدیق کرتا ہے، صرف ان باتوں کی تردید کرتا ہے جو ان میں ملاوٹ کرنے والوں کی طرف سے ملا دی گئی ہیں۔ قرآن اور دوسرے آسمانی صحیفوں کی یہ ہم آہنگی و ہم رنگی اس بات کی صاف شہادت ہے کہ یہ سب ایک ہی آفتابِ حق کی شعاعیں اور ایک ہی منبعِ انوار کے پرتو ہیں۔ دوسرا مفہوم اس کا یہ ہے کہ قرآن اور اس کے حامل کی صفات پچھلے صحیفوں کی پیشین گوئیوں میں مذکور رہیں، یہ پیشین گوئیاں اب تک اپنے مصداق کی منتظر تھیں، قرآن کے نزول اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے ان کی تصدیق ہوئی۔ یہ قرآن کے حق ہونے کی ایک بہت بڑی شہادت ہے اور ساتھ ہی اس سے ان صحیفوں کی بھی تصدیق ہو رہی ہے کہ ان میں جو پیشین گوئیاں وارد تھیں وہ سچی ثابت ہوئیں۔ اس پہلو سے قرآن سب سے پہلے ان لوگوں کی طرف سے خیر مقدم کا سزاوار تھا جو اگلے صحیفوں پر ایمان کے مدعی تھے کہ اصلاً قرآن کے ظہور سے سب سے زیادہ انھی کے سر اونچے ہوئے تھے لیکن انھوں نے اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کے سبب سے اس کا انکار کیا۔

خلاصۂ مطلب

وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ الآیۃ۔ یہ اوپر والے ٹکڑے کے اجمال کی تفصیل ہے جس سے قرآن کے اتارے جانے کی ضرورت واضح ہو جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ حی و قیوم ہے اس وجہ سے اس نے ہماری زندگی کی رہنمائی اور ہمیں عدل و قسط پر استوار رکھنے کے لیے قرآن کو قولِ فیصل بنا کر اتارا ہے۔ اس سے پہلے اس نے لوگوں کی ہدایت

کے لیے تورات اور انجیل نازل فرمائیں لیکن ان کے پیروؤں نے ان میں تحریف اور ان کے بعض حصوں کو فراموش کر کے ان میں بہت سے اختلافات پیدا کر دیے جن کے سبب سے حق و باطل میں امتیاز ناممکن ہو گیا یہ صورتِ حال مقتضی ہوئی کہ اللہ تعالیٰ قرآن کو حق و باطل کے درمیان امتیاز کی کسوٹی بنا کر اتارے۔ چنانچہ اس نے یہ کتاب نازل فرمائی ہے۔ اب جو لوگ اس کتاب کا انکار کریں گے ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے سخت عذاب ہے اس لیے کہ ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کے اس نظامِ عدل و قسط کے دشمن ہیں جو اس کی مخلوق کی صلاح و فلاح اور اس کی دنیا و آخرت دونوں کی سعادت کے لیے ضروری ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو چھوڑ دے، ان کی عدل دشمنی کی ان کو سزا نہ دے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس نے اپنی دنیا کو تباہی کے لیے چھوڑ دیا اور اس کے بقا سے اسے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ درآنحالیکہ اس کی صفت، جیسا کہ اسی سورہ میں آگے ذکر آئے گا، قَآئِمًا بِالْقِسْطِ ہے۔ اس قوامیت کا لازمی تقاضا ہے کہ وہ اس قسط کے دشمنوں سے انتقام لے اور ان کو واجبی سزا دے۔ وہ عزیز یعنی غالب اور قدرت والا ہے، کمزور اور ناتوان نہیں ہے کہ کوئی اسے بے بس کر دے، اسی طرح وہ انتقام والا ہے یعنی عدل و قسط کے معاملے میں غیور ہے، سرد مہر اور بے احساس نہیں ہے کہ ان کی پامالی پر راضی ہو جائے۔ یہ اس کی انھی صفات کا ظہور ہے کہ جن قوموں نے اس کے قائم کردہ قسط کو مٹایا ہے، ایک خاص حد تک ان کو مہلت دینے کے بعد اس نے ان کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا ہے اور جب جب اس کے شرائع و احکام کو نابود کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس نے ان کو از سرِ نو تازہ کرنے اور سنوارنے کا اہتمام فرمایا ہے۔ عدل و قسط کے قیام و بقا کے لیے اپنی اسی سنت کو یہاں انتقام سے تعبیر فرمایا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ (۵) هُوَ الَّذِيْ يُصَوِّرُكُمْ فِي الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَآءُ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۶)

قیامِ عدل پر صفاتِ الٰہی سے استدلال

اوپر والی آیت میں کتابِ الٰہی کے مخالفین یا بالفاظِ دیگر عدل و قسط کے بادیوں کے لیے جو سزا مذکور ہوئی ہے یہ اس کی دلیل ہے کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ خدا کی اس دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے اس سے وہ بے خبر رہتا ہے۔ اس سے کوئی بات بھی مخفی نہیں رہتی، خواہ وہ بڑی ہو یا چھوٹی، اور خواہ زمین میں پیش آئے یا آسمانوں میں، خدا کا علم ہر چیز اور ہر جگہ کو محیط ہے اور محیط کیوں نہ ہو، اسی نے تو سب کو پیدا کیا اور وہی ہے جو رحموں کے اندر صورت گری فرماتا ہے تو جس نے پیدا کیا اور جس نے صورت گری فرمائی کیا وہ بھی بے خبر ہو سکتا ہے اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ (کیا جس نے پیدا کیا وہ بھی نہ جانے گا)

اس کے بعد توحید اور خدا کی صفات میں سے عزیز اور حکیم کا حوالہ دیا۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ محیطِ کل علم رکھنے والی ہستی اگر قیامِ عدل و قسط کا اہتمام نہ کرے تو اس کی وجہ یا تو یہ ہو سکتی ہے کہ اس کو عزت و قدرت حاصل نہیں ہے یا عزت و قدرت تو حاصل ہے لیکن اس کو اپنے کاموں میں کسی حکمت و

مصلحت کی کوئی پروا نہیں، بس ایک کھلنڈرے کا کھیل ہے، خیر ہو یا شر، ظلم ہو یا انصاف اس سے اسے کچھ بحث نہیں، دونوں ہی چیزیں اس کی نظر میں یکساں ہیں، یہ خیال بالبداہت باطل ہے۔ اللہ تعالیٰ عزیز بھی ہے اور حکیم بھی، اسے ہر چیز پر قدرت بھی حاصل ہے اور اس کے ہر کام میں عدل و حکمت بھی ہے اور ساتھ ہی وہ ہر چیز سے باخبر بھی ہے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ ان لوگوں سے انتقام نہ لے گا جو اللہ کی اس کتاب کا انکار کریں گے جو اس نے دنیا میں از سر نو حق و عدل کے آثار و اعلام کو اجاگر کرنے کے لیے نازل فرمائی ہے۔

۲۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۷-۱۷

قرآن کے نزول کی ضرورت واضح کرنے کے بعد اب یہ بات واضح کی جا رہی ہے کہ کس طرح کے لوگ ہیں جو اس قرآن کا انکار کر رہے ہیں اور وہ کیا چیزیں ہیں جن کو وہ اپنے اس انکار کے لیے بہانہ بنا رہے ہیں۔ اس سلسلے میں فرمایا ہے کہ انکار کی راہ ان لوگوں نے اختیار کی ہے جن کے دلوں میں کجی اور جن کی طبیعتوں میں فتنہ پسندی ہے۔ اپنے اس ذوق کی وجہ سے وہ قرآن کی اصل تعلیمات سے کوئی لگاؤ نہیں رکھتے۔ وہ اس میں صرف ایسی چیزیں ڈھونڈھتے ہیں جن کی آڑ لے کر وہ قرآن کے خلاف لوگوں کے دلوں میں کچھ شبہات و شکوک پیدا کر سکیں اور اس طرح خود بھی راہِ حق سے گریز اختیار کریں اور جس حد تک ان کا زور چلے دوسروں کو بھی اس سے بدکائیں۔ چنانچہ ان کی ساری دلچسپی محکمات کے بجائے صرف متشابہات سے ہوتی ہے اس لیے کہ ان کا تعلق آخرت کی زندگی کی تمثیلات و تشبیہات سے ہوتا ہے، ان کے اندر موشگافی اور کرید کر کے کوئی ایسی بات نکالی جا سکتی ہے جو خود ان کی ضلالت کے لیے بھی ایک بہانہ بن سکے اور دوسروں کو بھی اس سے فتنے میں مبتلا کیا جا سکے۔

اس کے بعد ان لوگوں کا ذکر فرمایا ہے جن کے اندر علم و عقل کی پختگی موجود ہے۔ ان لوگوں کے بارے میں فرمایا ہے کہ یہ لوگ اللہ کی آیات کی قدر کرتے ہیں اور اس کی تعلیمات و ہدایات سے فائدہ اٹھاتے ہیں، یہ قرآن کے محکمات کی طرح اس کے متشابہات کی بھی قدر کرتے ہیں اور ان کو اعتراض و فتنہ جوئی کا ذریعہ بنانے کے بجائے ان کو اضافۂ علم کا ذریعہ بناتے اور ان پر صدقِ دل سے ایمان لاتے ہیں۔ اگر کوئی بات اپنی فہم کی گرفت سے ماورا پاتے ہیں تو اس کی حقیقت و ماہیت کے درپے ہونے اور اس کو فتنہ بنانے کے بجائے اس کو اللہ کے حوالے کرتے ہیں کہ یہی رویہ علم و ایمان کی پختگی کا مقتضیٰ ہے۔ نیز ان کے اندر آخرت کا پختہ یقین ہوتا ہے۔ اس وجہ سے وہ شیاطین کی وسوسہ اندازیوں سے محفوظ رہنے کے لیے اللہ تعالیٰ سے برابر دعا بھی کرتے رہتے ہیں کہ ایمان کی دولت سے بہرہ یاب فرمانے کے بعد وہ ان کو کسی گمراہی میں پڑنے سے محفوظ رکھے۔

اس کے بعد گمراہی کے ان اسباب کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو ان کے پچھلے ہم مشربوں کی تباہی کے باعث ہوئے اور ساتھ ہی مسلمانوں کی کامیابی کے بعض تازہ واقعات کا حوالہ دے کر یہ حقیقت واضح کی ہے کہ اگر ان واقعات سے انھوں نے عبرت نہ پکڑی تو ان کا بھی وہی انجام ہوگا جو پچھلوں کا ہو چکا ہے۔

اس کے بعد ان حجابات کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو ان کے اور قرآن کے درمیان آج حائل ہیں اور ساتھ ہی ان کی بے حقیقتی اور بے ثباتی کی طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ دنیائے فانی کی جن چیزوں پر ریجھ کر قرآن سے منہ موڑ رہے ہو ان کی حقیقت جلوۂ سراب سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ ان کے پیچھے بھاگنے کے بجائے ابدی زندگی کی نعمتوں اور خدا کی خوشنودی کے طالب بنو جس کی راہ صبر، سچائی، اطاعتِ الٰہی، انفاق فی سبیل اللہ اور استغفار سے کھلتی ہے اور قرآن اسی راہ کی طرف بلانے کے لیے نازل ہوا ہے۔

اب اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۷-۱۲

هُوَ الَّذِيٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ ۚ (وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم) وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ۘ (وقف منزل) وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ (وقف لازم) اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝۷ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝۸ رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝۹ (ع ۹) اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمْ وَقُوْدُ النَّارِ ۝۱۰ ۙ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا

فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۱﴾ قُلْ
لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ۭ وَبِئْسَ
الْمِهَادُ ﴿۱۲﴾ قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ۭ فِئَةٌ تُقَاتِلُ
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ
الْعَيْنِ ۭ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ
لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ﴿۱۳﴾ زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ
النِّسَاۗءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ
وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ۭ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ
الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ﴿۱۴﴾ قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ
مِّنْ ذٰلِكُمْ ۭ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ
تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ
اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۱۵﴾ اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ
اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۶﴾ اَلصّٰبِرِيْنَ
وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ ﴿۱۷﴾

ترجمۂ آیات ۷-۱۷

وہی ہے جس نے تمھارے اوپر کتاب اتاری جس میں محکم آیات ہیں جو اصل کتاب کا درجہ رکھتی ہیں اور دوسری کچھ آیتیں اس میں ایسی ہیں جو متشابہ ہیں۔ تو جن کے دلوں میں کجی ہے وہ اس میں سے متشابہات کے درپے ہوتے ہیں تاکہ فتنہ پیدا کریں اور ان کی حقیقت و ماہیت معلوم کریں حالانکہ ان کی اصل حقیقت اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا تو

جو لوگ علم میں راسخ ہیں وہ یوں کہتے ہیں کہ ہم ان پر ایمان لائے یہ سب ہمارے رب ہی کے پاس سے ہیں۔ اور یاددہانی تو اہلِ عقل ہی حاصل کرتے ہیں۔ اے ہمارے پروردگار! ہمارے دلوں کو ہدایت بخشنے کے بعد کج نہ کر اور ہمیں اپنے پاس سے رحمت بخش۔ تو نہایت بخشنے والا ہے۔ اے ہمارے پروردگار! تو سب لوگوں کو ایک ایسے دن کے لیے جمع کر کے رہے گا جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرے گا۔ ۷-۹

بے شک جن لوگوں نے کفر کیا، نہ ان کے مال خدا کے ہاں کچھ کام آئیں گے، نہ ان کی اولاد۔ اور وہی لوگ دوزخ کے ایندھن بنیں گے۔ ان کا بھی وہی حال ہونا ہے جو آلِ فرعون اور ان لوگوں کا ہوا جو ان سے پہلے گزرے۔ انھوں نے ہماری آیتوں کی تکذیب کی تو اللہ نے ان کو ان کے گناہوں کی پاداش میں پکڑ لیا اور اللہ سخت پاداش والا ہے۔ ۱۰-۱۱

ان لوگوں سے جنھوں نے کفر کیا ہے یہ کہہ دو کہ تم مغلوب ہو گے اور جہنم کی طرف ہانکے جاؤ گے اور وہ کیا ہی بُرا ٹھکانا ہے۔ جن دو گروہوں میں مڈبھیڑ ہوئی ان کی سرگزشت میں تمھارے لیے نشانی ہے۔ ایک گروہ اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا، دوسرا کافر تھا، یہ ان کو کھلم کھلا ان سے دوگنے دیکھتے تھے اور اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی تائید سے مدد فرماتا ہے۔ اس میں آنکھیں رکھنے والوں کے لیے بصیرت ہے۔ ۱۲-۱۳

لوگوں کی نگاہوں میں مرغوباتِ دنیا عورتیں، بیٹے، سونے چاندی کے ڈھیر، نشان زدہ گھوڑے، چوپائے اور کھیتی کھبا دی گئی ہیں۔ یہ دنیوی زندگی کے سروسامان ہیں اور اللہ کے پاس اچھا ٹھکانا ہے۔ ان سے کہو، کیا میں تمھیں ان چیزوں سے بہتر چیز کا پتہ

دوں؟ جو لوگ تقویٰ اختیار کریں گے ان کے لیے ان کے رب کے پاس باغ ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، ان میں ہمیشہ رہیں گے اور پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور اللہ کی خوشنودی ہوگی۔ اللہ اپنے بندوں کی خبر رکھنے والا ہے۔ جو یہ دعا کرتے رہتے ہیں، اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لائے پس تو ہمارے گناہوں کو بخش اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔ جو صابر، راستباز، فرمانبردار، راہِ خدا میں خرچ کرنے والے اور اوقاتِ سحر میں مغفرت چاہنے والے ہیں۔ ۱۴-۱۷

۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

هُوَ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ مِنۡہُ اٰیٰتٌ مُّحۡکَمٰتٌ ہُنَّ اُمُّ الۡکِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِہٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ زَیۡغٌ فَیَتَّبِعُوۡنَ مَا تَشَابَہَ مِنۡہُ ابۡتِغَآءَ الۡفِتۡنَۃِ وَ ابۡتِغَآءَ تَاۡوِیۡلِہٖ ۚ وَ مَا یَعۡلَمُ تَاۡوِیۡلَہٗۤ اِلَّا اللّٰہُ ۘ وَ الرّٰسِخُوۡنَ فِی الۡعِلۡمِ یَقُوۡلُوۡنَ اٰمَنَّا بِہٖ ۙ کُلٌّ مِّنۡ عِنۡدِ رَبِّنَا ۚ وَ مَا یَذَّکَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ (۷)

هُوَ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ (وہی خدا ہے جس نے تمہارے اوپر کتاب اتاری) سے اشارہ اس عزیز و حکیم اور حی و قیوم خدا کی طرف ہے جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے اور اس سے مقصود یہاں مخاطب کو کئی چیزوں کی طرف متوجہ کرنا ہے۔

ایک تو اس عظیم رحمت کی طرف اشارہ کرنا ہے جو اس کتاب کی شکل میں ظہور میں آئی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی صفات حیات و قیومیت کا ظہور ہے کہ اس نے اپنے بندوں کو زندگی جاوداں سے بہرہ مند اور ان کو جادۂ حق پر استوار کرنے کے لیے یہ کتاب اتاری ہے۔ اس عظیم نعمت کا حق یہ ہے کہ بندے اس کی قدر پہچانیں، اس پر ایمان لائیں اور اس کے ذریعے سے حیاتِ جاوداں اور بقائے دوام حاصل کریں۔

دوسرے اس میں ان لوگوں کے لیے تخویف و تہدید کا پہلو بھی ہے جو اس کی تردید و تکذیب کریں گے اس لیے کہ جس خدا نے یہ کتاب اتاری ہے وہ عزیز بھی ہے اور قیوم بھی۔ اس کی اس عزت و حکمت اور اس قیومیت کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ وہ ان لوگوں کو سزا دے جو اس کے قانونِ حق و عدل کی راہ میں مزاحم ہوں۔

تیسرے اس سے نفس کتاب کے مزاج کی طرف بھی اشارہ ہو رہا ہے کہ یہ ایک خدائے عزیز و حکیم کا کلام ہے اس وجہ سے یہ خود بھی عزیز و حکیم ہے۔ چنانچہ قرآن میں جگہ جگہ اس کی صفت عزیز و حکیم آئی بھی ہے۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ کتاب الجھنے اور موشگافی کرنے کے لیے نہیں ہے بلکہ بقدر ظرف و توفیق فائدہ اٹھانے کے لیے ہے۔ آدمی اس ناپیداکنار سمندر کی حکمتوں سے جو فائدہ اٹھا سکے اٹھالے، یہ توقع نہ کرے کہ وہ اس کے تمام اسرار و حقائق کا احاطہ کر سکتا ہے۔ اس کی جو باتیں سمجھ میں نہ آئیں ان کو فتنہ اور شبہات و شکوک کا ذریعہ نہ بنائے بلکہ ان کو اللہ کے حوالہ کرے۔

اس آیت میں چند الفاظ ایسے استعمال ہوئے ہیں جن کی نوعیت کچھ قرآنی اصطلاحات کی سی ہے۔ چونکہ آیت کا ٹھیک ٹھیک مفہوم اس وقت تک واضح نہیں ہو سکے گا جب تک ان اصطلاحات کا مفہوم اچھی طرح واضح نہ ہو جائے اس وجہ سے پہلے ہم ان کی وضاحت کرتے ہیں۔

'آیاتِ محکمات' سے مراد

اٰیٰتٌ مُّحْکَمٰتٌ: آیات محکمات سے مراد قرآن کی وہ آیات ہیں جو آفاق و انفس کی بالکل بدیہیات، خیر و شر کے مسلمات، اور معروف و منکر کے قطعیات و یقینیات پر مشتمل ہیں۔ جن کو دل قبول کرتے ہیں اور جن کو قبول کرنے کے لیے اس کے سوا کوئی شرط نہیں ہے کہ دل سلیم ہو، جن کے حق میں ہر عقل گواہی دیتی ہے بشرطیکہ اس پر تعصب، جذبات اور غیر فطری عقلیات کے پردے پڑے ہوئے نہ ہوں۔ انھی محکمات پر ہر صحیح مذہب کی بنیاد ہوتی ہے اس وجہ سے تمام آسمانی مذاہب اور تمام انبیا سے یہ تواتر کے ساتھ نقل ہوئی ہیں۔ چونکہ فطرت انسانی کے اندر ان کی جڑیں نہایت مستحکم ہوتی ہیں، شبہات و شکوک کی آندھیاں ان کو ہلانے سے قاصر رہتی ہیں اس وجہ سے قرآن نے ان کو محکمات سے تعبیر کیا ہے۔

'ام الکتاب' کا مفہوم

اُمُّ الْکِتٰبِ: آیات محکمات کی تعریف یہ فرمائی ہے کہ ان کی حیثیت ام الکتاب کی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بقیہ ساری کتاب کا مرجع و مرکز وہی محکمات ہوتی ہیں، انھی پر ساری بحث کا مدار ہوتا ہے، ساری شاخیں انھی سے پھوٹتی ہیں۔ اگر کوئی نزاع و اختلاف پیدا ہوتا ہے تو اس کا فیصلہ بھی انھی کی کسوٹی پر پرکھ کر ہوتا ہے۔ پھر انھی کا یہ درجہ ہوتا ہے کہ ان کو اصول قرار دے کر ان سے مسائل مستنبط کیے جائیں اور ان مسائل پر اسی طرح اعتماد کیا جائے جس طرح اصولوں پر اعتماد کیا جاتا ہے۔

'آیاتِ متشابہات' سے مراد

مُتَشٰبِہٰتٌ: متشابہات سے مراد وہ آیتیں ہیں جن میں ہمارے مشاہدات و معلومات کے دائرے سے باہر کی باتیں تمثیلی و تشبیہی رنگ میں قرآن نے بتائی ہیں۔ یہ باتیں جس بنیادی حقیقت سے تعلق رکھنے والی ہوتی ہیں وہ بجائے خود واضح اور مبرہن ہوتی ہے، عقل اس کے اتنے حصے کو سمجھ سکتی ہے جتنا سمجھنا اس کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ البتہ چونکہ اس کا تعلق ایک نادیدہ عالم سے ہوتا ہے اس وجہ سے قرآن ان کو تمثیل و تشبیہ کے انداز میں پیش کرتا ہے تاکہ علم کے طالب بقدر استعداد ان سے فائدہ اٹھالیں اور ان کی اصل صورت و حقیقت کو علم الٰہی کے حوالہ کریں۔ یہ باتیں خدا کی صفات و افعال یا آخرت کی نعمتوں

اور اس کے آلام سے تعلق رکھنے والی ہوتی ہیں۔ ان کا جس حد تک ہمارے لیے سمجھنا ضروری ہے اتنا ہماری سمجھ میں آجاتا ہے اور اس سے ہمارے علم ویقین میں اضافہ ہوتا ہے لیکن اگر ہم اپنی حد سے آگے بڑھ کر ان کی اصل حقیقت اور صورت کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کریں تو یہ چیز فتنہ بن جاتی ہے اور اس کا نتیجہ صرف یہ نکلتا ہے کہ انسان اپنے ذہن سے شک کا ایک کانٹا نکالنا چاہتا ہے اور اس کے نتیجے میں بے شمار کانٹے اس کے اندر چبھا لیتا ہے۔ یہاں تک کہ اس نایافتہ کی طلب میں اپنی یافتہ دولت کو بھی ضائع کر بیٹھتا ہے اور نہایت واضح حقائق کی اس لیے تکذیب کر دیتا ہے کہ ان کی شکل وصورت ابھی اس کے سامنے نمایاں نہیں ہوئی۔ قرآن نے اسی چیز کی طرف اشارہ فرمایا ہے بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ (بلکہ انھوں نے اس چیز کو جھٹلایا جو ان کے علم کی گرفت میں نہیں آئی اور ابھی تک اس کی حقیقت ان کے سامنے ظاہر نہیں ہوئی ہے) یونس۔ ۳۹۔

متشابہات کی بعض مثالیں

ہم یہاں قرآن سے اس قسم کے بعض متشابہات کی مثالیں نقل کرتے ہیں۔ سورۂ مدثر میں قرآن نے دوزخ کے عذاب کی تصویر ان الفاظ میں پیش کی ہے۔

سَاُصْلِيْهِ سَقَرَ ○ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا	میں اس کو دوزخ میں داخل کروں گا اور تمھیں کیا پتہ کہ
سَقَرُ ○ لَا تُبْقِيْ وَلَا تَذَرُ ○ لَوَّاحَةٌ	دوزخ کیا ہے؟ وہ نہ ذرا ترس کھائے گی اور نہ کسی چیز
لِّلْبَشَرِ ○ عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ ○	کو چھوڑے گی، جسموں کو جھلس دینے والی ہوگی۔ اس پر
(۲۶-۳۰)	خدا کے انیس سرہنگ مقرر ہوں گے۔

اس آیت میں جس سزا کا ذکر ہے وہ ایک حقیقت ہے اور قانون مجازات پر جس کا ایمان ہو اس کے لیے اس سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں، رہی اس کی تفصیل تو اس کا تعلق چونکہ ایک نادیدہ عالم سے ہے اس وجہ سے اس کی اصل صورت کسی طرح ہماری گرفت میں نہیں آسکتی۔ اس طرح کے معاملات میں صحیح روش یہ ہے کہ آدمی اتنے پر قناعت کرے جو سمجھ میں آتا ہے۔ جو سمجھ میں نہیں آتا وہ اس عالم میں سمجھ میں آہی نہیں سکتا، اس وجہ سے اس کے درپے ہونے کے بجائے اس کو خدا کے حوالے کرے۔ سلیم الطبع انسان ایسا ہی کرتے ہیں لیکن جن کے دلوں میں کجی اور عقلوں میں ٹیڑھ ہوتی ہے وہ یہ روش اختیار کرنے کے بجائے متشابہات وتمثیلات کی حقیقت معلوم کرنے کے درپے ہو جاتے ہیں جس سے وہ خود بھی فتنوں میں پڑتے ہیں اور اپنے جیسے دوسرے بہتوں کو بھی فتنوں میں ڈال دیتے ہیں۔ چنانچہ دیکھیے مذکورہ بالا آیت میں تِسْعَةَ عَشَرَ کا جو لفظ آیا تو قرآن نے اس کے متعلق شرارت پسندوں کا ردعمل یہ بتایا ہے کہ وہ اسی کے درپے ہو گئے کہ اس سے کیا مراد ہے؟ اگر اس سے فرشتے مراد ہیں تو یہ سوال انھوں نے اٹھایا کہ انیس کے عدد کی تخصیص میں کیا رمز ہے؟ قرآن نے ان کے اس ردعمل پر ان الفاظ میں تبصرہ فرمایا۔

وَمَا جَعَلْنَآ اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا	اور ہم نے دوزخ کی چوکیداری پر نہیں مقرر کیے ہیں مگر

مَلٰٓئِكَةً ۠ وَّمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ اِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَيَزْدَادَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِيْمَانًا وَّلَا يَرْتَابَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَلِيَقُوْلَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْكٰفِرُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۭ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ ۭ وَمَا هِىَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْبَشَرِ ۝ (المدثر - ۷۴ : ۳۱)

فرشتے، اور ہم نے ان کی تعداد کو نہیں بنایا مگر کافروں کے لیے فتنہ، تاکہ وہ لوگ یقین کریں جن کو کتاب ملی ہے اور ایمان والے اپنے ایمان میں اضافہ کریں اور کتاب پانے والے اور اہل ایمان شک میں نہ پڑیں اور جن کے دلوں میں بیماری ہے اور جو کافر ہیں وہ یہ کہیں کہ اس قسم کی تمثیل سے اللہ تعالیٰ کا کیا مطلب ہے؟ اسی طرح اللہ جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت بخشتا ہے اور تیرے رب کے لشکروں کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا، اور یہ نہیں ہے مگر انسانوں کے لیے یاد دہانی۔

اسی طرح سورہ بقرہ میں جنت کی نعمتوں کا تمثیلی رنگ میں ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ جب اہل جنت کے سامنے جنت کی نعمتیں پیش کی جائیں گی تو وہ خوشی سے پکار اٹھیں گے کہ یہ تو وہی نعمتیں ہیں جن کی ہمیں پہلے قرآن میں سیر کرادی گئی تھی، قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا (البقرۃ - ۲ : ۲۵) (وہ پکاریں گے، یہ تو وہی چیز ہے جو ہمیں اس سے پہلے بخشی گئی اور وہ دیے جائیں گے اس سے ملتی جلتی) یعنی جنت کی نعمتوں کا ذکر جو تمثیلات و متشابہات کے رنگ میں قرآن میں ہوا ہے اس سے اہل ایمان کو تو یہ فائدہ ہوتا ہے کہ وہ دنیا میں بیٹھے ہوئے ایک سیر جنت کی کر لیتے ہیں لیکن انہی تمثیلات و متشابہات سے متعلق فتنہ جوؤں اور ضلالت پسندوں کے رویہ کا ذکر قرآن نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْىٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۭ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ۭ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۝ (البقرۃ - ۲ : ۲۶)

اللہ اس بات سے نہیں جھجکتا کہ کوئی تمثیل بیان کرے خواہ وہ کسی مچھر کی ہو یا اس سے بھی کسی چھوٹی چیز کی، تو جو لوگ ایمان رکھتے ہیں وہ تو جانتے ہیں کہ یہ حق ہے اور ان کے پروردگار ہی کی جانب سے ہے لیکن جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ اس قسم کی تمثیلیں پیش کرنے سے اللہ تعالیٰ نے کیا چاہا؟ اللہ ان تمثیلوں سے بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور ان سے بہتوں کو راہ یاب کرتا ہے اور ان سے نہیں گمراہ کرتا مگر انھیں لوگوں کو جو خدا کی نافرمانی کرنے والے ہوں۔

اس تفصیل سے یہ بات معلوم ہوئی کہ آیات متشابہات سے مراد قرآن کی وہ آیتیں ہیں جن میں یا تو

آخرت کی نعمتوں اور نقمتوں میں سے کسی نعمت و نقمت کا بیان تمثیلی و تشبیہی رنگ میں ہوا ہے یا خدا کی صفات و افعال میں سے کوئی بات تمثیلی اسلوب میں پیش ہوئی ہے۔ مثلاً آدم میں خدا کا اپنی روح پھونکنا یا حضرت عیسیٰ کو بن باپ کے پیدا کرنا وغیرہ۔ اس طرح کی آیات سے، جیساکہ اوپر بیان ہوا اہل ایمان کے علم و ایمان میں اضافہ ہوتا ہے لیکن جن کی طبیعتوں میں فتنہ پسندی ہوتی ہے وہ انھی کے اندر موشگافیاں کر کے بہت سے فتنے پیدا کر لیتے ہیں۔

تاویل کا مفہوم

تاویل:۔ تاویل کا لفظ بھی اس آیت میں ذرا ایک خاص مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ اس سے یہاں مراد مذکورہ بالا قسم کی کسی بیان کردہ شے کی حقیقت اور اس کی صورت ہے۔ جس مفہوم میں یہ لفظ یہاں استعمال ہوا ہے اسی مفہوم میں سورۂ یوسف میں استعمال ہوا ہے۔ قَالَ یٰاَبَتِ ھٰذَا تَاْوِیْلُ رُءْیَایَ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَعَلَھَا رَبِّیْ حَقًّا (اس نے کہا اے میرے باپ، یہ ہے میرے اس خواب کی حقیقت جو میں نے اس سے پہلے دیکھا تھا، میرے پروردگار نے اس کو واقعہ ثابت کر دکھایا) (یوسف ۔ ۱۰۰)

محکمات و متشابہات کے بارے میں چند تنبیہات

یہاں چند باتیں بطور تنبیہ اور بھی قابلِ ذکر ہیں۔ ان سے اس راہ کی ساری الجھنیں انشاءاللہ دور ہو جائیں گی۔

ایک یہ کہ اس آیت میں اسلوبِ کلام حصر کا نہیں ہے۔ اس وجہ سے یہ نہیں گمان کرنا چاہیئے کہ بس قرآن کی آیات دو ہی قسموں، محکمات اور متشابہات، ہی میں تقسیم ہیں۔ یہاں صرف انھی دونوں قسموں کا ذکر دو متقابل قسموں کی حیثیت سے ہوا ہے اور مقصود ان کے ذکر سے محض فتنہ پسندوں اور ہدایت پسندوں کے اختلافِ ذوق کو نمایاں کرنا ہے کہ جو طبیعتیں فتنہ پسند ہوں ان کی ساری دلچسپی صرف متشابہات سے ہوتی ہے تاکہ ان کے ذوقِ فتنہ جوئی کے لیے کوئی غذا فراہم ہو سکے۔ برعکس اس کے جو علم و معرفت کے طالب ہوتے ہیں اور جن پر حقیقت پسندی کا رنگ غالب ہوتا ہے ان کی اصلی دلچسپی محکمات سے ہوتی ہے۔ جہاں تک متشابہات کا تعلق ہے ان کا جتنا حصہ ان کی سمجھ میں آتا ہے اس سے وہ فائدہ اٹھاتے ہیں، جو حصہ سمجھ میں نہیں آتا اس کی صورت و ہیئت معلوم کرنے کے پیچھے نہیں پڑتے بلکہ اس کو خدا کے حوالے کرتے ہیں۔ محکمات کی بدولت چونکہ ان کے قدم علم میں بہت راسخ ہو جاتے ہیں اس وجہ سے اس طرح کی چیزیں ان کو متزلزل نہیں کرتیں۔ قرآن میں ان دو قسموں کے علاوہ بھی آیات ہیں لیکن مقصود یہاں چونکہ آیاتِ قرآنی کی تمام انواع کا احاطہ نہیں ہے اس وجہ سے ان کے ذکر کی ضرورت نہیں تھی۔ مثلاً قصصِ قرآن، امثالِ قرآن، تلمیحات و اشارات۔ یہ چیزیں نہ تو اُمُّ الْکِتٰب کے درجے اور مرتبے کی ہیں اور نہ ان کو ان متشابہات کے درجے میں رکھنا صحیح ہے جن کی تاویل میں غور و فکر کرنا ممنوع ہو۔

دوسری یہ حقیقت یاد رکھنی چاہیئے کہ قرآن کی آیات کا محکم و متشابہ ہونا ہرگز بلحاظ الفاظ نہیں ہے بلکہ صرف بلحاظ معنی ہے۔ قرآن، اپنے الفاظ اور اپنی زبان کے اعتبار سے، تمام تر عربی مبین میں ہے الفاظ

کی تاویل میں جو اختلافات ہوئے ہیں وہ بالعموم تین اسباب سے ہوئے ہیں۔ یا تو غور و تحقیق میں کوتاہی ہوئی ہے یا کسی غلط عقیدے کی بے جا عصبیت اس کا باعث ہوئی ہے، یا عربی زبان سے ناواقفیت اس کا سبب بنی ہے۔ ظاہر ہے کہ جہاں اس طرح کے کسی سبب سے کوئی الجھن پیدا ہوئی ہو تو اس پر غور و فکر عربی زبان کے معروف و مسلّم قواعد و ضوابط کی روشنی میں ہونا چاہیے۔ یہ ان چیزوں میں سے نہیں ہے جن پر غور و فکر ممنوع ہو۔

تیسری بات یہ ہے کہ متشابہات ہوں یا محکمات، قرآن میں یہ دونوں قسمیں ممیز اور معلوم ہیں۔ یہ بات نہیں ہے، جیسا کہ بعض متکلمین نے گمان کیا ہے کہ یہ دونوں غیر ممیز ہیں اور نہ یہ بات ہے کہ الفاظ کی اپنے معانی پر دلالت کوئی مشتبہ اور مشکوک چیز ہے۔ جن لوگوں نے ایسا سمجھا ہے انھوں نے بالکل غلط سمجھا ہے۔ ان میں سے پہلی بات تو صریحاً غلط ہے اور دوسری بات نہایت مبہم ہے جو سرے سے قرآن ہی سے مایوس کر دینے والی ہے حالانکہ قرآن کو اللہ تعالیٰ نے نور و برہان بنا کر اتارا ہے۔ جو باتیں عالم غیب سے تعلق رکھنے والی ہیں ان کے متعلق خدا نے ہماری ضرورت کے حد تک خبر دے دی ہے، اس کا جو حصّہ ہم سے محجوب رکھا گیا ہے بس اس کی تاویل پردۂ خفا میں ہے۔

چوتھی یہ کہ قرآن نے یہاں محکم اور متشابہ کا ایک خاص مفہوم مراد لیا ہے جو ان کے لغوی مفہوم سے ایک حد تک الگ ہے۔ بعض دوسرے مقامات میں بھی قرآن میں یہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں جہاں ان کے لغوی مفہوم مراد ہیں۔ مثلاً محکم سے مراد وہ کلام ہے جو جامع، واضح اور موجز ہو۔ اس صورت میں اس کا مقابل لفظ مفصّل آتا ہے۔ مثلاً كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ (ھود-۱) (یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی آیات پہلے محکم کی گئیں، پھر ان کی تفصیل کی گئی خدائے حکیم و خبیر کی طرف سے) سنتِ الٰہی یہ رہی ہے کہ شروع شروع میں اللہ تعالیٰ نے اپنی تعلیمات و ہدایات قولِ محکم کی شکل میں اتاریں تاکہ وہ ذہن و حافظے میں اچھی طرح راسخ ہو سکیں اور دل اور زبان دونوں کے لیے وہ ہلکی پھلکی محسوس ہوں۔ پھر بعد میں اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے سے یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے ذریعے سے ان کی تفصیل فرما دی۔ اسی طرح متشابہ کا ایک عام مفہوم بھی ہے وہ یہ کہ ایک دوسری سے ملتی جلتی ہم آہنگ و ہم رنگ چیز۔ اپنے اس مفہوم کے اعتبار سے پورا قرآن متشابہ ہے۔ چنانچہ اسی پہلو سے قرآن کو متشابہ کہا گیا ہے۔ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ (زمر-۲۳)

پانچویں یہ کہ جس طرح قرآن محکمات و متشابہات دونوں ہی قسم کی آیات پر مشتمل ہے اسی طرح عالمِ انفس اور عالمِ آفاق میں جو نشانیاں ہیں وہ بھی محکمات و متشابہات دونوں ہی پر مشتمل ہیں۔ ان کے باب میں بھی اربابِ علم اور اہلِ زیغ کا رویہ وہی ہوتا ہے جو اوپر مذکور ہوا۔ جن کے ذہن و فکر میں پختگی ہوتی ہے وہ محکمات سے اطمینان و یقین حاصل کرتے ہیں اور متشابہات سے شبہات و شکوک میں گرفتار ہونے کے

بجائے ان کو خدا کے علم و حکمت کے حوالے کرتے ہیں اور اپنے علم کی کوتاہی کا اقرار کرتے ہیں۔ برعکس اس کے جن کے دلوں میں کجی ہوتی ہے وہ ان متشابہات کو اپنی اور دوسروں کی گمراہی کا ذریعہ بناتے ہیں۔ اس مسئلے پر مفصل بحث انشاء اللہ ہم سورۂ کہف کی تفسیر میں کریں گے۔ غزوۂ اُحد کے واقعہ کو بھی، جیسا کہ ہم تمہیدی بحث میں اشارہ کر چکے ہیں، ایک متشابہ واقعہ کی نوعیت حاصل ہے۔ چنانچہ اس جنگ کے بعد اس عظیم آیت کا اترنا اس کائنات کی ایک بہت بڑی حقیقت سے پردہ اٹھانے کے لیے تھا۔ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ جس طرح غزوۂ بدر حق و باطل کے درمیان ایک یوم فرقان تھا جس سے اہل ایمان کے قلوب اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر مطمئن ہوئے اور اس نے ایک آیت محکم بن کر اہل کفر پر اللہ تعالیٰ کی حجت پوری کر دی اسی طرح غزوۂ احد کی حیثیت ایک آیت متشابہ کی ہے اس لیے کہ اس میں بظاہر باطل کو حق پر غلبہ حاصل ہوا جس سے کفار کو یہ گمان ہوا کہ جنگ میں کامیابی و ناکامی کا تعلق صرف تدابیر اور اسباب و وسائل ہی سے ہے اس میں نہ خدا کو کوئی دخل ہے اور نہ اس کا کوئی تعلق حق اور باطل سے ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک شدید قسم کی غلط فہمی تھی، جس کا دور ہونا نہایت ضروری تھا چنانچہ جب اس کے دور کرنے کے لیے مناسب وقت آگیا تو اللہ تعالیٰ نے اس سورہ میں یہ دور فرمائی اور یہ اس سلسلے کی ایک عظیم آیت ہے۔

'زیغ' کی حقیقت

اس آیت میں 'زیغ' کا جو لفظ آیا ہے مختصراً اس کی حقیقت بھی سمجھ لینی چاہیئے۔

زیغ کے اصل معنی میل یعنی جھکنے اور مائل ہونے کے ہیں۔ یہ لفظ بیک وقت دو مفہوموں کا حامل ہے، ایک کجی اور دوسرے سقوط، کوئی چیز جو کھڑی ہو جب جھک جاتی ہے تو گرنے سے قریب ہو جاتی ہے۔ یہ حالت اس رسوخ کے برعکس حالت ہے جو اس آیت میں وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ کی بیان ہوئی ہے۔

اہل کتاب کی عام بیماری

یہ زیغ یوں تو اہل ضلالت کی عام بیماری ہے لیکن اہل کتاب اس مرض میں سب سے زیادہ شدت کے ساتھ مبتلا رہے ہیں۔ یہود کی تاریخ گواہ ہے کہ وہ شروع ہی سے اس بیماری میں مبتلا رہے ہے۔ اور ان کے زیغ کا یہ پہلو خاص طور پر نہایت سنگین ہے کہ وہ اپنے پیغمبر کی موجودگی میں اس میں مبتلا رہے ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ وہ اس کے سبب سے خدا کے غضب میں مبتلا ہوئے۔ قرآن میں اس بات کا ذکر ہوا ہے۔ سورہ صف میں اس کا ذکر اس طرح ہے۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِیْ وَقَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ فَلَمَّا زَاغُوْۤا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ (صف - ۵)	اور یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم کے لوگو! تم مجھے کیوں دکھ پہنچا رہے ہو جب کہ تم اچھی طرح یہ جان چکے ہو کہ میں تمہاری طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ پس جب وہ کج ہو گئے تو خدا نے بھی ان کے دل کج کر دیے اور اللہ بد عہدوں کو ہدایت نہیں بخشتا۔

یہود و نصاریٰ کی گمراہی میں فرق

یہی یہود ہیں جنھوں نے کلمۃ اللہ اور اس قسم کے بعض دوسرے الفاظ کی حقیقت کی تشریح میں فلسفیانہ قسم کی موشگافیاں پیدا کر کے ان کو ایک گورکھ دھندا بنایا جس سے نصاریٰ کے لیے گمراہی کی راہیں کھلیں اور وہ حضرت مسیح کی الوہیت کے عقیدے میں مبتلا ہوئے۔ بعد میں نصاریٰ کی اس گمراہی پر مزید اضافہ بت پرست قوموں کی تقلید سے ہوا اور پھر آہستہ آہستہ وہ حق سے اتنے دور ہو گئے کہ اس سے ان کا رشتہ ہی منقطع ہو گیا اور وہ صریح کفر میں مبتلا ہو گئے۔ چنانچہ قرآن نے ان کے بارے میں یہ تصریح فرمائی ہے کہ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ (ان لوگوں نے کفر کیا جنھوں نے یہ کہا کہ اللہ تو وہی مسیح ابن مریم ہے) (مائدہ ۵ - ۷۲)

یہود اور نصاریٰ کی گمراہی کی نوعیت میں بس یہ فرق ہے کہ یہود کی گمراہی اصلاً عملی ہے اور نصاریٰ کی اعتقادی۔ اس فرق کی وجہ سے حق کی مخالفت میں ان کا رویہ بھی ایک دوسرے سے مختلف رہا۔ یہود تو قرآن کو حق جاننے کے باوجود اس کی مخالفت کرتے تھے۔ نصاریٰ جس طرح تورات اور انجیل کے متشابہات میں پڑنے کی وجہ سے گمراہ ہوئے تھے اسی طرح قرآن میں بھی ان کی ساری دلچسپی بس متشابہات ہی سے تھی۔ انہیں میں موشگافیاں کر کے وہ طرح طرح کے فتنے پیدا کرتے اور اس طرح اپنی گمراہی کا بھی سامان کرتے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے۔ قرآن کے محکمات سے نہ انھوں نے خود دلچسپی لی اور نہ ان لوگوں کو دلچسپی لینے دی جن پر ان کا بس چلا۔ بالغرض قلب و نظر کے زیغ اور متشابہات کی پیروی کے باب میں تھے تو یہود و نصاریٰ دونوں ایک ہی سطح پر، یہ بیماری ان میں مشترک تھی لیکن ان کے ذوقی رجحانات ذرا الگ الگ تھے۔ یہود ابتغاء فتنہ سے زیادہ رغبت رکھتے تھے اور نصاریٰ ابتغائے تاویل سے۔ یہ گمراہیاں چونکہ دنیا کے تمام گمراہوں میں مشترک ہیں اس وجہ سے قرآن نے اسلوبِ بیان عام ہی رکھا ہے تاکہ کلام میں وسعت پیدا ہو سکے یہود و نصاریٰ کی تخصیص نہیں کی۔ لیکن قرآن کا ذوق رکھنے والے جانتے ہیں کہ اشارہ انھی کی طرف ہے۔ یہی انداز سورۂ فاتحہ میں بھی ہے۔ اس میں بھی مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ اور ضَآلِّيْن کے الفاظ ہرچند عام ہیں اور ان کے عام ہونے کی وجہ سے ان میں بڑی وسعت پیدا ہو گئی ہے لیکن ان کا خاص اشارہ یہود و نصاریٰ کی طرف ہے۔

متشابہات کی گمراہی کی ایک مثال

متشابہات کی پیروی کی وجہ سے نصاریٰ جس قسم کی گمراہیوں میں مبتلا ہوئے اس کو ایک مثال سے واضح کرنا مفید رہے گا۔

قرآن اور انجیل دونوں اس امر میں باہم متفق ہیں کہ حضرت مسیح کلمۃ اللہ ہیں۔ کلمۃ اللہ کا مفہوم بالکل واضح ہے کہ اس سے امر و حکم کی تعبیر کی جاتی ہے۔ حضرت مسیح کی پیدائش چونکہ فطرت کے عام ضابطے کے خلاف ہوئی تھی اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے کلمہ سے تعبیر کیا یعنی ان کی ولادت اللہ تعالیٰ کے کلمۂ کُن سے ہوئی ہے۔ یہ اس حقیقت کا اظہار تھا کہ اصل شے کسی چیز کے واقع ہونے کے لیے اللہ تعالیٰ کا حکم ہی ہے۔ اسباب محض ظاہر کا پردہ ہیں۔ یہ بات قرآن میں نہایت وضاحت سے بیان ہوئی ہے اور اس میں کسی قسم

کا ایچ پیچ نہیں ہے جس سے کسی صاف ذہن کے آدمی کے اندر کوئی الجھن پیدا ہو سکے۔ قرآن نے نہایت غیر مبہم الفاظ میں فرمایا ہے۔ اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ۭ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۔ آل عمران ۔ ۵۹ (بے شک عیسیٰ کی تمثیل اللہ کے نزدیک ایسی ہے جیسی آدم کی، آدم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر اس سے کہا کہ ہو جا بس وہ ہو گیا) یعنی آدم کو کلمۂ 'کن' کے ذریعے سے حی و ناطق بنایا۔ اسی چیز کو دوسری جگہ نفخ روح سے تعبیر فرمایا ہے۔ بعینہٖ یہی معاملہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ہے۔

نصاریٰ نے اس واضح بات میں جو تحریف کی اس کی صورت یہ ہوئی کہ جب ان کو بت پرست قوموں سے سابقہ پیش آیا اور ان کے ساتھ ان کی مذہبی بحثیں شروع ہوئیں تو انھوں نے ان پر یہ اعتراض شروع کیا کہ تم تو ایک مصلوب خدا کی پرستش کرتے ہو، ہم تم سے ہزار درجے افضل ہیں اس لیے کہ ہم آسمانی دیوتاؤں کی پرستش کرتے ہیں۔ نصاریٰ نے اپنے حریفوں کے اس اعتراض سے بچنے کے لیے یہ کوشش کی کہ اپنے عقیدے کو بھی انھی کے عقیدے کے سانچے میں ڈھال دیں۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے یہ دعویٰ کیا کہ مسیح تو ابن اللہ ہیں، وہ مخلوق نہیں ہیں۔ اپنے اس نئے عقیدے کی آرائش میں انھوں نے ایک طرف تو یونانیوں، مجوسیوں اور ہندوؤں کے فکر و فلسفہ سے مواد لیا اور دوسرے ان یہودی متکلمین کے علم کلام سے رہنمائی حاصل کی جو یہود کے آخری دور کی پیداوار تھے اور جو نہ صرف خالق اور مخلوق کے درمیان وسائل و وسائط کے قائل تھے بلکہ ان کو مستقل ذوات کا درجہ دیتے اور ان کو کلمۃ اللہ کہتے تھے۔ نصاریٰ نے بعینہٖ یہی عقیدہ حضرت عیسیٰؑ کے لیے اختیار کر لیا۔ کچھ عرصے تک تو بات اسی حد تک رہی لیکن آہستہ آہستہ گمراہی سے گمراہی پیدا ہونی شروع ہوئی اور انھوں نے ان کو خدا کا کفو، اسی کے جوہر سے اور ازل سے اس کے ساتھ قرار دے دیا۔ اور پھر اس عقیدے کی تائید کے لیے انجیل یوحنا کے آغاز میں تحریف کے چور دروازے سے بعض عبارتیں بھی داخل کر دیں تاکہ باہر سے برآمد کیے ہوئے اس عقیدے کے لیے گھر کی ایک دلیل بھی فراہم ہو جائے۔

'وَمَا یَعْلَمُ' الآیۃ پر توقف ہے

وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ (اور اس کی اصل حقیقت نہیں جانتا مگر اللہ) اوپر کی تفصیلات سے یہ بات آپ سے واضح ہو گئی کہ یہاں وقف ہے۔ یہی مذہب جمہور اہل سنت کا ہے اور یہی حضرت ابن عباسؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت علیؓ، حضرت حسنؓ، مالک بن انسؒ، کسائی اور فرا سے منقول ہے۔ البتہ شیعہ اور بعض متکلمین یہاں وصل کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک متشابہات کی تاویل اللہ تعالیٰ کے سوا راسخین فی العلم بھی جانتے ہیں۔ اس کی وجہ جہاں تک شیعوں کا تعلق ہے، وہ تو یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے اماموں کے متعلق یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ان کو ہر بات کا علم ہوتا ہے۔ رہے دوسرے لوگ جو اس بات کے قائل ہوئے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ تاویل سے مراد معنی لیتے ہیں حالانکہ آیت کا سیاق و سباق اس

کے خلاف ہے۔ اوپر اس کی وضاحت ہو چکی ہے۔[۱]

اگرچہ آیت کے الفاظ اور اس کے مختلف اجزا کی اس وضاحت کے بعد آیت کی صحیح تاویل خود بخود سامنے آگئی ہے لیکن اس کی اہمیت کے پیش نظر مزید اطمینان کے لیے ہم اس کا واضح مفہوم بھی پیش کیے دیتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ وہی خدا جو عزیز بھی ہے اور حکیم بھی، جو زندہ بھی ہے اور قیوم بھی، اسی نے تورات اور انجیل اتاریں۔ پھر جب ان میں گھپلا کر دیا گیا تو اس کی حکمت اور قیومیت مقتضی ہوئی کہ یہ قرآن اتارے تاکہ اس کے ذریعے سے حق و باطل میں امتیاز ہو سکے تو جو لوگ اس کی مزاحمت کریں گے وہ یاد رکھیں کہ خدائے عزیز حق کو مظلوم نہیں چھوڑے گا، وہ اس کا انتقام ضرور لے گا۔

اس کے بعد اس بات کی وضاحت فرمائی کہ اہل کتاب جو اس فرقان کی مخالفت کر رہے ہیں تو اس کی اصل وجہ یہ نہیں ہے کہ فی نفسہٖ اس کتاب میں کوئی بات ایسی ہے جو ان کی وحشت کا باعث ہو رہی ہے بلکہ اس کی اصلی وجہ یہ ہے کہ ان کے اپنے دلوں میں کجی ہے۔ اس کجی کے سبب سے ان کو اس کتاب کے محکمات سے، جن کی حیثیت اصل کتاب کی ہے اور جن پر اس کی تمام تعلیمات اور اس کے سارے حکمت و فلسفہ کی بنیاد ہے، کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ انہیں اگر دلچسپی ہے تو بس اس کی ان آیات متشابہات سے ہے جن میں کوئی بات تمثیلی و تشبیہی رنگ میں بتائی گئی ہے۔ وہ اپنی طبیعت کے بگاڑ کے سبب سے انھی کے درپے ہوتے ہیں اور فساد انگیزی اور فتنہ آرائی کے لیے ان کی صورت و حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ ان کی اصل حقیقت اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔ جس حد تک ان کا علم ضروری ہے وہ خدا نے کھول دیا ہے، بس اتنے پر قناعت کرنی چاہیے، ان کی اصل حقیقت کا معاملہ اللہ کے حوالہ کرنا چاہیے، وہ اس دن کھلیں گی جس دن وہ سامنے آئیں گی۔ جو لوگ علم میں راسخ ہیں ان کی روش متشابہات کے معاملے میں یہی ہے وہ محکمات اور متشابہات دونوں کو اپنے رب ہی کا عطیہ سمجھتے ہیں اور دونوں پر یکساں ایمان رکھتے ہیں۔ وہ اپنے علم کی پختگی کی وجہ سے اس رمز سے واقف ہیں کہ آیات الٰہی کا مقصود بندوں کو یاددہانی ہے اور چونکہ وہ عقل رکھتے ہیں اس وجہ سے ان سے جو فائدہ اٹھانا چاہیے وہ فائدہ اٹھاتے ہیں، کسی سعی نامراد و لاطائل میں اپنا وقت برباد کر کے اپنے خسران کے اسباب نہیں فراہم کرتے۔ اللہ تعالیٰ کی سنت یہی ہے کہ اس کی آیات سے فائدہ وہی لوگ اٹھاتے ہیں جو عقل رکھتے ہیں اور اس عقل سے صحیح طور پر کام لیتے ہیں۔

---

[۱] ان مطالب کا اکثر حصہ استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ کے افادات سے ماخوذ ہے، صرف بعض مطالب کی توضیح میری طرف سے ہے۔ اس وجہ سے اس کی صحیح باتیں مولانا کی طرف منسوب کیجیے اور اگر کہیں خامی ہو تو اس کی ذمہ داری تنہا میرے سر ہے۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝ رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۸-۹

ان دونوں آیتوں میں کوئی لغوی یا نحوی اشکال نہیں ہے۔ زیغ کے لفظ کی تحقیق اوپر گزر چکی ہے۔ یہ راسخین فی العلم کی دعا ہے جس سے اس امر کا اظہار ہو رہا ہے کہ وہ اپنے دین کے معاملے میں اتنے بے پروا نہیں ہیں کہ خواہ مخواہ شبہات اور شکوک کو بلاوے بھیج کر بلائیں اور اپنے ایمان و اسلام کو خطرے میں ڈالیں بلکہ وہ اپنے ایمان کی سلامتی کے لیے برابر اپنے پروردگار سے دعا کرتے رہتے ہیں کہ دین میں ان کے جمے ہوئے قدم اکھڑنے نہ پائیں اور جب فتنوں کی یورش ہو تو خدائے وہاب اپنے پاس سے ان کے لیے وہ روحانی کمک بھیجے جو ان کے ثباتِ قدم کا ذریعہ بنے۔

دوسری آیت میں اس یقین کا اظہار ہے جو ان راسخین کے اندر آخرت کے باب میں ہوتا ہے۔ موقعِ کلام یہاں اشارہ کر رہا ہے کہ درحقیقت یہی یقین ہے جو دل اور عقل دونوں کا اصلی پاسبان ہے۔ یہ نہ ہو تو انسان کے ذہن و فکر کو کوئی چیز بھی ہرزہ گردی سے نہیں روک سکتی۔ وہ زندگی کو ایک نہایت سہل بازی سمجھتا ہے اور ہر داؤں پر اس کو لگا دینے کے لیے تیار رہتا ہے لیکن جن کے اندر آخرت کا یقین رچا بسا ہوتا ہے وہ ہر قدم احتیاط کے ساتھ اٹھاتے اور نہایت پھونک پھونک کر رکھتے ہیں۔ یہ احتیاط ان کو ہمیشہ جادۂ مستقیم پر استوار رکھتی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُھُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـــًٔا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ ھُمْ وَقُوْدُ النَّارِ ۝ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاَخَذَھُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۱۰-۱۱

راہِ حق کی اصل رکاوٹ

"اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا" سے یہاں مراد، جیسا کہ آیت ۴ میں گزر چکا ہے، قرآن کے منکرین ہیں۔ ان کے بارے میں فرمایا کہ یہ مال و اولاد، جن کی محبت آج ان کے لیے ایک سورج سے زیادہ واضح حق کے قبول کرنے کی راہ میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے، انھیں خدا کی پکڑ سے نہیں بچا سکیں گے۔ اس وجہ سے ان کی محبت میں اس خدا کو نہیں بھولنا چاہیے جس کے حقوق سب پر مقدم ہیں اور جس کی پکڑ بھی بے پناہ ہے۔ مال و اولاد کا ذکر یہاں قبولِ حق کی راہ کے اصل حجاب کی حیثیت سے ہوا ہے۔ آگے آیت ۱۴ میں ان کا ذکر تفصیل کے ساتھ آ رہا ہے۔ درحقیقت انھی کی محبت ہے جو انسان کے لیے قبولِ حق میں رکاوٹ بنتی ہے لیکن انسان اصل حقیقت کے اعتراف سے گریز کرتا ہے اور اپنے اغراض کے لیے کچھ ایسے بہانے تلاش کرتا ہے جو اس کی اصل بیماری پر پردہ ڈال سکیں۔ قرآن نے یہ ان لوگوں کی اصلی اندرونی بیماری سے پردہ اٹھایا ہے کہ یہ درحقیقت مال و اولاد کی محبت ہے جو انھیں قرآن کی پیش کردہ سچائیوں کے آگے جھکنے سے روک رہی ہے لیکن وہ اس کو چھپانے کے لیے متشابہات کے اندر سے کچھ اعتراضات و شبہات پیدا کرنے کی

کوشش کرتے ہیں تاکہ ان کی دنیا پرستی بے نقاب نہ ہونے پائے۔ انسان کی یہ عام کمزوری ہے کہ وہ ایک حقیقت سے گریز تو اختیار کرتا ہے اپنے نفس کی کسی کمزوری کے سبب سے لیکن نمائش کچھ ایسی کرتا ہے جس سے مخاطب پر یہ اثر پڑے کہ فی الواقع اس کے اس گریز کے لیے کچھ وجوہ و اسباب اور کچھ اعتراضات و شبہات ہیں۔

اصل بیماری پر پردہ ڈالنے کی کوشش

اس کے بعد فرمایا کہ ان کی یہ روش بعینہٖ وہی روش ہے جو اس سے پہلے فرعون اور اس کی قوم نے اور خدا کے رسولوں کو جھٹلانے والی دوسری قوموں نے اختیار کی۔ انھوں نے بھی جان بوجھ کر محض دنیا کی محبت میں، خدا کی نشانیوں اور اس کی آیتوں کو جھٹلایا اور ظاہر یہ کرنے کی کوشش کی کہ گویا وہ نبی کو کوئی کاہن یا جادوگر اور اس کی پیش کردہ نشانیوں کو کوئی سحر و شعبدہ خیال کر رہے ہیں اس وجہ سے ان کو قبول نہیں کر رہے ہیں۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے ان کے گناہوں کی پاداش میں ان کو پکڑ لیا اور جب پکڑ لیا تو پھر کوئی نہیں تھا جو خدا کی پکڑ سے ان کو بچا سکے۔

'شدید العقاب' کا مفہوم

'شَدِیْدُ الْعِقَابِ' کے لفظ میں دو مفہوم موجود ہیں۔ ایک تو یہ کہ خدا کی طرف سے انسان کو جو سزا بھی ملتی ہے وہ انسان کے اپنے ہی اعمال کا ردّعمل ہوتی ہے، دوسرا یہ کہ جس طرح خدا کے قوانین طبیعی کے نتائج بے لاگ اور لازمی ہیں اسی طرح خدا کے اخلاقی قوانین کے نتائج بھی بے لاگ اور لازمی ہیں جب ان کے ظہور کا مرحلہ آئے گا تو وہ اس طرح بے لاگ لپیٹ اور ایسی قطعیت اور قوت کے ساتھ ظاہر ہوں گے کہ نہ کوئی ان سے بچ سکے گا اور نہ کوئی ان سے بچا سکے گا۔

قُلْ لِّلَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰی جَہَنَّمَ ؕ وَبِئْسَ الْمِہَادُ (۱۲)

منکرین قرآن کو عذاب کی دھمکی

اب یہ صاف صاف قرآن کے تمام منکرین کو دھمکی ہے کہ تم قرآن کے خلاف یہ سازشیں جو کر رہے ہو، کامیاب ہونے والی نہیں ہیں، تم قرآن کے حاملین کے ہاتھوں شکست اٹھاؤ گے اور تمھارے یہ اسباب و وسائل جن پر تمھیں بڑا ناز ہے اور تعداد کی یہ کثرت جس پر تمھیں بڑا بھروسا ہے، یہ چیزیں ذرا بھی کام آنے والی ثابت نہیں ہوں گی۔ تم دنیا میں بھی مغلوب ہو گے اور آخرت میں بھی جہنم کی طرف ہانکے جاؤ گے اور اس جہنم کو کوئی سہل چیز نہ خیال کرو، یہ نہایت برا ٹھکانا ہے۔ اس تنبیہ کی ضرورت اس وجہ سے تھی کہ جو چیز انسان نے دیکھی نہ ہو اوّل تو اس کا صحیح صحیح اندازہ ہی نہیں کر پاتا اور اگر کسی حد تک اندازہ کرتا بھی ہے تو اپنی غفلت سرشتی کے سبب سے اس کو ملحوظ رکھنے میں سہل انگار اور بے پروا ہو جاتا ہے۔

قَدْ کَانَ لَکُمْ اٰیَۃٌ فِیْ فِئَتَیْنِ الْتَقَتَا ؕ فِئَۃٌ تُقَاتِلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَاُخْرٰی کَافِرَۃٌ یَّرَوْنَہُمْ مِّثْلَیْہِمْ رَاْیَ الْعَیْنِ ؕ وَاللّٰہُ یُؤَیِّدُ بِنَصْرِہٖ مَنْ یَّشَآءُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَعِبْرَۃً لِّاُولِی الْاَبْصَارِ (۱۳)

غزوۂ بدر سے عبرت حاصل کرنے کی دعوت

یہ اوپر والے دعوے کی ایک دلیل ایک ایسے واقعے سے پیش کی گئی ہے جس پر ابھی زیادہ زمانہ نہیں گزرا تھا۔ اشارہ بدر کے واقعے کی طرف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن کے حاملین اور اس کے مخالفین

میں اس وقت جو کشمکش برپا ہے اس میں بالآخر شکست مخالفین ہی کو ہو گی۔ اس پیشین گوئی کی صداقت کی ایک نشانی اس معرکے میں موجود ہے جو قریش اور مسلمانوں کے درمیان پیش آچکا ہے۔ اس معرکے میں ایک گروہ اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لیے اٹھا تھا اور دوسرا، جو کفار کا تھا، شیطان کا کلمہ بلند کرنے کے لیے۔ ہر چند کفار کی تعداد ہزار سے متجاوز تھی اور مسلمان کل تین سو تیرہ تھے لیکن جب مقابلے کی نوبت آئی تو کفار نے کھلی آنکھوں سے مسلمانوں کو اپنے سے دوگنا دیکھا یہ بات اللہ تعالیٰ کی خاص تائید و نصرت کی وجہ سے ہوئی اور فتح و شکست کا اصلی تعلق تعداد کی کثرت و قلت سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت ہی سے ہے اور یہ تائید و نصرت ان کو حاصل ہوتی ہے جو اس کا کلمہ بلند کرنے کے لیے اُٹھتے ہیں۔ جو لوگ آنکھیں رکھتے ہیں وہ اس واقعے میں مستقبل کا نقشہ دیکھ سکتے ہیں کہ حق و باطل کی یہ آویزش بالآخر کس فیصلے پر ختم ہونے والی ہے۔

غزوۂ بدر میں کفار کے لیے نشانی

بدر کے واقعہ میں کفار کے ان تمام گروہوں کے لیے غلبۂ حق کی نشانی موجود تھی جو اس وقت قرآن اور اسلام کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ اس وقت یہود، نصاریٰ اور قریش تین جماعتیں براہِ راست اسلام کی مخالفت کر رہی تھیں، اب دیکھیے کہ ان تینوں جماعتوں کی آنکھیں کھولنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے کس طرح بدر کے معرکے کو ایک نشانی بنایا۔

یہود کے لیے نشانی

جہاں تک یہود کا تعلق ہے سورۂ بقرہ میں ہم، طالوت و جالوت کی جنگ کے سلسلہ میں، بیان کر چکے ہیں کہ یہ جنگ اپنے مقصد، اپنی خصوصیات، اپنے نقشہ اور طالوت کی فوج کی تعداد کے لحاظ سے بالکل جنگ بدر کا آئینہ تھی۔ جس طرح مسلمان اپنے گھروں سے نکالے اور اپنے قبلہ سے محروم کیے گئے تھے اسی طرح بنی اسرائیل بھی اپنے گھروں سے بے دخل اور اپنے قبلہ — تابوت — سے محروم کیے گئے تھے۔ جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تین سو تیرہ آدمی تھے اسی طرح طالوت کے ساتھ بھی، جیسا کہ بنی اسرائیل کی روایات سے معلوم ہوتا ہے، اتنے ہی آدمی تھے، جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے معرکہ سے پہلے اپنی فوج کے حوصلے کا امتحان لیا، اسی طرح ایک خاص طریقے پر طالوت نے بھی اپنے ساتھیوں کے عزم و نظم کی جانچ کی، پھر جس طرح اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس جنگ میں اپنی تائید و نصرت سے نواز کر نہایت ناموافق اور ناسازگار حالات میں مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی اور قریش کے بڑے بڑے لیڈر مارے گئے اسی طرح طالوت کی اور ان کے ساتھیوں کی بھی اللہ تعالیٰ نے مدد فرمائی اور ان کے ساتھیوں کی قلیل تعداد دشمنوں کی نہایت بھاری تعداد پر غالب رہی اور فلسطینیوں کا مشہور سپہ سالار حضرت داؤدؑ کی فلاخن سے ڈھیر ہو کر رہ گیا۔ ان دونوں جنگوں کی یہ حیرت انگیز مشابہت یہود پر بالکل واضح تھی۔ ایک کا سارا نقشہ اپنے صحیفوں میں دیکھ چکے تھے اور دوسری کا سارا ماجرا انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ اس وجہ سے ان کے لیے یہ اندازہ کر لینا کچھ مشکل نہیں تھا کہ بدر کے میدان میں ہتھیاروں کی لڑائی نہیں تھی بلکہ حق و باطل کی

جنگ تھی اور انسانوں اور انسانوں کی آویزش نہیں بلکہ فرشتوں اور شیطانوں کی جنگ تھی۔ چنانچہ قرآن میں، جیسا کہ سورۂ انفال کی تفسیر میں ہم وضاحت کریں گے، اس بات کا اشارہ موجود ہے کہ یہود پر یہ حقیقت پوری طرح آشکارا تھی لیکن اس کے باوجود انھوں نے نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی اس نشانی کی کوئی قدر نہیں کی اور برابر اسلام کی مخالفت ہی کرتے رہے۔

نصاریٰ کے لیے نشانی

اسی طرح نصاریٰ کے لیے بھی اس جنگ میں بہت بڑی نشانی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کی موجود تھی۔ یوحنا کے مکاشفات میں یہ مکاشفہ موجود ہے کہ نبی موعود (خاتم النبیین، صلی اللہ علیہ وسلم) جب ظاہر ہوں گے تو وہ حق کی طاقت کے ساتھ جہاد کریں گے اور ان کے جلو میں کروبیوں کا لشکر ہوگا۔ یہ پیشینگوئی بدر کے موقع پر اس طرح ظاہر ہوئی کہ لوگوں نے اپنی آنکھوں سے ملائکہ کو کفار سے لڑتے دیکھا۔ اس نشانی کے بعد بھی اگر نصاریٰ متشابہات کے چکروں ہی میں پھنسے رہے، اعتراف حق کی سعادت انھیں حاصل نہیں ہوئی تو اس کو ان کی بدبختی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

قریش کے لیے نشانی

قریش کے لیے تو یہ جنگ ان کے اپنے مطالبے کے لحاظ سے بھی قرآن اور اسلام کی حقانیت کی ایک ناقابلِ تردید شہادت تھی۔ انھوں نے خود نہایت آشکارا طور پر اس جنگ کو حق و باطل کے درمیان امتیاز کی ایک کسوٹی قرار دیا تھا۔ اُن کا اپنا اعلان یہ تھا کہ اس جنگ میں جس کی جیت ہوگی وہ حق پر سمجھا جائے گا اور جس کو شکست ہوگی وہ باطل پر۔ ابوجہل نے عین میدانِ جنگ میں یہ دعا کی تھی کہ اَللّٰھُمَّ اَقْطَعُنَا للرحم فاحنه الغداۃ (اے اللہ فریقین میں سے جو سب سے زیادہ رشتہ رحم کا کاٹنے والا بنا ہے کل تو اس کو کچل دیجیو!) اس جنگ کے متعلق قرآن نے بھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی نہایت غیر مبہم الفاظ میں پیشین گوئیاں فرمائی تھیں جو حرف بحرف پوری ہوئیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تو قریش کے خاص خاص لیڈروں کے قتل ہونے کی جگہیں تک متعین کر دی تھیں اور جنگ کے خاتمہ پر لوگوں نے دیکھا کہ حضورؐ کی ہر بات سچی ثابت ہوئی۔ چنانچہ انھی وجوہ سے قرآن نے غزوۂ بدر کو فرقان سے تعبیر فرمایا جس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے حق و باطل کے درمیان ایک ایسا امتیاز قائم کر دیا جس سے اسلام کے موافقین کو اپنے برحق ہونے کی دلیل مل گئی اور اس کے مخالفین پر اللہ کی حجت پوری ہو گئی۔

حذف کا ایک اسلوب

آیت میں اہلِ ایمان کے گروہ کی صفت یہ بیان کی ہے کہ "یہ اللہ کی راہ میں جنگ کر رہا تھا" لیکن کفار کے متعلق اس امر کی تصریح نہیں ہے کہ ان کی جنگ کس کی راہ میں تھی۔ اس تصریح کے نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ عربی زبان کا یہ معروف اسلوب قرآن میں بہت استعمال ہوا ہے کہ دو متقابل باتوں میں سے بخیالِ اختصار ایک متقابل کو حذف کر دیتے ہیں اس لیے کہ مذکور خود محذوف کی طرف رہنمائی کر دیتا ہے۔ یہاں اس اسلوب کے بموجب پوری بات اگر کھول دی جائے تو یوں ہوگی، فِئَةٌ مُؤْمِنَةٌ تُقَاتِلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَاُخْرٰی کَافِرَۃٌ تُقَاتِلُ فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ۔ فقرے کے پہلے حصے میں سے لفظ "مومنہ" کو حذف کر دیا اور

دوسرے میں سے فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ، کو اس لیے کہ دوسرے میں کَافِرَۃٌ کی صفت پہلے میں مُؤْمِنَۃٌ کا پتہ دے رہی ہے اور پہلے میں فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ کا حوالہ دوسرے میں فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ کی ضرورت کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ حذف کا یہ اسلوب قرآن مجید میں بہت استعمال ہوا ہے جو واضح نہ ہو تو کلام کا اصلی زور سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ ایجاز کی ایک شاخ ہے اور ایجاز بلاغت کی جان ہے۔

کس نے کس کو دگنا دیکھا

'یَرَوْنَھُمْ مِّثْلَیْھِمْ' میں 'یَرَوْنَھُمْ' کی قرأت نافع نے 'تَرَوْنَھُمْ' کی ہے لیکن یہ قرأت ہمارے نزدیک بطورِ تفسیر ہے۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ یہ فعل مخاطبین یعنی کفار کے لیے ہے یعنی اے کافرو! تمہارا حال یہ تھا کہ تم مسلمانوں کو اپنے سے دگنا دیکھتے تھے۔ انھوں نے اپنی اس تفسیر سے یہ حقیقت واضح فرمائی کہ حریف کو اپنے سے دگنا دیکھنے کا معاملہ مسلمانوں کو نہیں پیش آیا بلکہ کفار کو پیش آیا۔ نافع کی یہ تاویل بہت صحیح معلوم ہوتی ہے اس لیے کہ آیت میں اس بات کی صاف تصریح ہے کہ اس چیز کو اللہ تعالیٰ نے کفار کے لیے ایک آیت (نشانی) بنایا اور اس بات کی بھی خاص طور پر تصریح فرمائی کہ انھوں نے اس نشانی کو سر کی آنکھوں سے دیکھا۔ اگر واقعہ اس کے برعکس ہوتا، مسلمانوں نے کفار کو اپنے سے دگنا دیکھا ہوتا تو اس میں کفار کے لیے کیا نشانی تھی اور ان کو مخاطب کر کے اس نشانی کا ذکر کیوں کیا جاتا؟

ایک سوال کا جواب

ایک سوال ممکن ہے بعض لوگوں کے ذہن میں یہاں پیدا ہو۔ وہ یہ کہ سورہ انفال میں جہاں غزوہ بدر کا واقعہ بیان ہوا ہے وہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ کفار بھی مسلمانوں کی نظر میں کم کر کے دکھائے گئے تھے اور مسلمان بھی کفار کی نگاہوں میں کم دکھائے گئے تھے۔ یہ چیز آیت کی مذکورہ بالا تاویل کے خلاف پڑتی ہے۔ لیکن اس سوال کا جواب ہمارے نزدیک یہ ہے کہ یہ کم دکھانے اور زیادہ دکھانے کا معاملہ دو مختلف مرحلوں میں دو مختلف شکلوں میں ظاہر ہوا ہے۔ میدانِ جنگ میں اترنے سے پہلے تو بلاشبہ یہی صورت رہی کہ مسلمانوں نے بھی کفار کی تعداد معمولی محسوس کی اور کفار نے بھی مسلمانوں کو نہایت حقیر پوزیشن میں محسوس کیا لیکن میدانِ جنگ میں عملاً اتر جانے اور جنگ کے بالفعل شروع ہو جانے کے بعد دفعتہً صورتِ حال بدل گئی۔ اب جو کفار نے میدانِ جنگ پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ نقشہ ہی اور ہے، فرشتوں کی شرکت سے مسلمانوں کی فوج کو اتنی فوقیت حاصل ہو گئی کہ وہ کفار کی نگاہوں میں ان سے دگنی نظر آنے لگی۔ قرآن کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو مختلف مرحلوں میں ظاہر ہونا ایک خدا ساز بات تھی اور مقصود اس سے یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ حق و باطل کو ایک دوسرے سے ٹکرائے اور حق کی امداد کے لیے اپنی غیبی تائید و نصرت ظاہر فرما کر حق کے مخالفوں پر اپنی حجت تمام کرے۔ چنانچہ اس حکمت کے تحت اس نے ابتدائی مرحلے میں مسلمانوں کی نگاہوں میں کفار کو اور کفار کی نگاہوں میں مسلمانوں کو کم کر دکھایا تاکہ ان میں کوئی فریق بھی ایک دوسرے سے ٹکر لینے سے خوف نہ کھائے۔ لیکن جب دونوں میں ٹکر ہو گئی اور میدانِ جنگ گرم ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کے ذریعے سے مسلمانوں کی مدد فرمائی اور کفار میدانِ جنگ کا نقشہ دیکھ کر بالکل مرعوب ہو گئے۔

ہم یہاں سورۂ انفال کی متعلق آیتیں نقل کیے دیتے ہیں تاکہ دونوں موقعوں کا فرق اور دونوں کی حکمت و مصلحت سامنے آجائے۔ ارشاد ہوا ہے۔

إِذْ أَنتُم بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُم بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوَىٰ وَالرَّكْبُ أَسْفَلَ مِنكُمْ ۚ وَلَوْ تَوَاعَدتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيعَادِ ۙ وَلَٰكِن لِّيَقْضِيَ اللَّهُ أَمْرًا كَانَ مَفْعُولًا لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَن بَيِّنَةٍ وَيَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَن بَيِّنَةٍ ۗ وَإِنَّ اللَّهَ لَسَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝ إِذْ يُرِيكَهُمُ اللَّهُ فِي مَنَامِكَ قَلِيلًا ۖ وَلَوْ أَرَاكَهُمْ كَثِيرًا لَّفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ سَلَّمَ ۗ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ۝ وَإِذْ يُرِيكُمُوهُمْ إِذِ الْتَقَيْتُمْ فِي أَعْيُنِكُمْ قَلِيلًا وَيُقَلِّلُكُمْ فِي أَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللَّهُ أَمْرًا كَانَ مَفْعُولًا ۗ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ ۝

(۴۲ - ۴۴ - انفال)

اور یاد کرو جب تم وادی کے ورلے کنارے پر تھے اور وہ پرلے سرے پر تھے اور قافلہ تم سے نیچے تھا اور اگر تم ایک دوسرے کو الٹی میٹم دے کر نکلتے تو میعاد میں ضرور اختلاف کرتے لیکن اللہ نے اس کا سامان کیا تاکہ ایسے معاملے کا فیصلہ فرمائے جس کا فیصلہ ہو طے ہو چکا تھا۔ تاکہ جس کو ہلاکت کی راہ اختیار کرنی ہے وہ یہ راہ اتمام حجت کے بعد اختیار کرے اور جسے زندگی کی راہ اختیار کرنی ہے وہ بھی دلیل کے ساتھ یہ راہ اپنائے بے شک اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ خیال کرو جب کہ اللہ تمھیں ان کو دکھاتا ہے رویا میں قلیل التعداد اور اگر وہ ان کو کثیر التعداد دکھاتا تو تم ہمت ہار بیٹھتے اور اس امر میں اختلاف کرتے۔ لیکن اللہ نے تمھیں اس سے بچایا۔ وہ سینوں کے بھیدوں کو جاننے والا ہے اور یاد کرو جب وہ تمھیں ان کو دکھاتا ہے اس وقت جب کہ تم آمنے سامنے ہوئے، تمھاری نگاہوں میں تھوڑا اور تم کو دکھاتا ہے ان کی نگاہوں میں تھوڑا تاکہ ایک ایسے معاملے کا فیصلہ کر دے جس کا فیصلہ طے ہو چکا ہے اور سارے معاملات اللہ ہی کی طرف لوٹتے ہیں۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوئی کہ آیت زیر بحث اور آیات انفال میں موقع و محل کا فرق ہے۔ انفال میں جس موقع کا ذکر ہے وہ، جیسا کہ ہم نے ذکر کیا، جنگ شروع ہونے سے پہلے کا ہے، اور آیت زیر بحث میں جنگ شروع ہو جانے کے بعد کا جب تائید الٰہی ملائکہ کی کمک کی صورت میں ظاہر ہو گئی ہے۔ اس طرح ان دونوں آیتوں میں پوری پوری موافقت ہے۔ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ انفال میں بھی یہ اشارہ موجود ہے کہ جنگ شروع ہو جانے کے بعد کفار کو میدانِ جنگ کا نقشہ کچھ اور ہی نظر آیا اور اس مشاہدہ نے ان کے حوصلے پست کر دیے۔ ان اشارات کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔ وہیں ہم یہ بھی واضح کریں گے کہ یہود اگرچہ در پردہ قریش کو مسلمانوں پر چڑھا لانے کی سازش میں شریک رہے لیکن بدر کا نقشہ دیکھ کر انھوں نے بھی ہمت

چھوڑ دی۔ وَاللّٰہُ یُؤَیِّدُ بِنَصْرِہٖ مَنْ یَّشَآءُ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی تائید و نصرت سے جس کو چاہے نواز سکتا ہے، کوئی اس کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا اور جس کو وہ اپنی تائید و نصرت سے نوازے اس کے لیے کثرت و قلت کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ اللہ تعالیٰ چاہے تو قطرے کو دریا اور ذرے کو آفتاب بنا دے۔ کتنے کمزور و ناتواں گروہوں کو اس نے دل بادل فوجوں پر فتح عطا فرمائی ہے۔ فتح و شکست کا اصلی سر رشتہ اسی کے ہاتھ میں ہے۔

عبرت کا مفہوم

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَعِبْرَۃً لِّاُولِی الْاَبْصَارِ، عبرت کے معنی ہیں ایک حقیقت سے دوسری حقیقت تک عبور کر جانا۔ ایک صاحبِ بصیرت اور ایک بلید میں سب سے بڑا فرق یہی ہے کہ ایک اپنی ناک سے آگے نہیں دیکھتا لیکن دوسرے کے لیے ایک معمولی سی نشانی، ایک ادنیٰ سی تنبیہ اور ایک سرسری سا اشارہ حقائق کا ایک دفتر کھول دیتا ہے۔ ایک دروازہ اس کے لیے کھل جائے تو دوسرے دروازے کھولنے کے لیے کلید ہاتھ آجاتی ہے۔ ایسے لوگوں کو قرآن "اولوالابصار" کہتا ہے کیونکہ ان کی آنکھوں میں بصارت کے ساتھ بصیرت کا نور بھی ہوتا ہے جو جزو میں کل اور قطرہ میں دجلہ کے مشاہدہ کی صلاحیت رکھتا ہے۔

زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّھَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِیْنَ وَالْقَنَاطِیْرِ الْمُقَنْطَرَۃِ مِنَ الذَّھَبِ وَالْفِضَّۃِ وَالْخَیْلِ الْمُسَوَّمَۃِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِکَ مَتَاعُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا ۚ وَاللّٰہُ عِنْدَہٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ (۱۴)

تزئین کی حقیقت

شہوات کا لفظ یہاں شتہیات یعنی مرغوبات کے معنی میں ہے۔ مال و اولاد اور زن و فرزندان چیزوں میں سے ہیں جو انسان کو بالطبع مرغوب بھی ہیں اور ان کو مرغوب ہونا چاہیے بھی اس لیے کہ یہ چیزیں اس کے ذاتی و نوعی بقا کے لوازم میں سے ہیں لیکن یہاں مجرد ان کی رغبت زیرِ بحث نہیں ہے بلکہ ان کی تزئین کا ذکر ہے۔ 'تزئین' کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی چیز اس طرح آنکھوں میں کھب جائے کہ آدمی اس کے اثر سے ہر چیز اسی کے رنگ میں دیکھنے لگ جائے۔ یہاں تک کہ اس سے الگ ہو کر اس کے لیے کسی چیز کو دیکھنا ممکن ہی نہ رہ جائے۔ وہ ہر چیز کو تولنے اور پرکھنے کے لیے اسی کو پیمانہ اور کسوٹی قرار دے لے۔ کسی چیز کی رغبت کا اس درجہ غلبہ ظاہر ہے فاطرِ فطرت کے منشا کے خلاف ہے۔ اسی سے زندگی میں وہ بے اعتدالیاں ظہور میں آتی ہیں جو انسان کو فطرت اور شریعت کے جادۂ مستقیم سے ہٹا دیتی ہیں۔ یہ ایک بیماری کی حالت ہے جو بے بصیرتی اور حدودِ الٰہی کے عدمِ احترام یا بالفاظِ دیگر عدمِ تقویٰ سے پیدا ہوتی ہے اور اس میں اصل دخل نفس اور شیطان کا ہوتا ہے۔ نفس اپنی چاہتوں میں فطری حدود سے آگے نکل جاتا ہے، پھر شیطان ان چاہتوں پر ایسا دلفریب ملمع کر دیتا ہے کہ آدمی کی نظر ان سے ہٹ کر کسی اور طرف کا رخ ہی نہیں کرتی۔ قرآن نے اسی وجہ سے اس تزئین کو دوسرے مقامات میں شیطانوں کی طرف منسوب کیا ہے۔

قنطار اور مقنطرۃ کا مفہوم

'قِنْطَار' کے معنی مالِ کثیر کے ہیں۔ اس کے ساتھ 'مُقَنْطَرَۃ' کی صفت اسی طرح استعمال ہوتی ہے جس

طرح عربی میں لیلٌ الیلٌ، یا ظلٌ ظلیلٌ وغیرہ کی ترکیبیں استعمال ہوئی ہیں۔

مُسوَّمۃ کا مفہوم

'مُسوَّمَۃ' سومۃ سے ہے جس کے معنی علامت کے ہیں، 'مسومۃ' کے معنی ہوں گے، نشان زدہ چونکہ اصیل اور نفیس گھوڑوں پر بالعموم نشان لگایا جاتا ہے اس وجہ سے یہ لفظ اصالت اور عمدگی کی تعبیر کے لیے معروف ہوگیا۔

'ناس' سے ایک خاص گروہ مراد ہے

آیت میں 'ناس' کا لفظ اگرچہ بظاہر عام ہے لیکن مراد اس سے ایک خاص گروہ ہے۔ یہ اسی طرح کا استعمال ہے جس طرح قرآن میں 'انسان' کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور مقصود اس سے مخصوص وہ گروہ ہوتا ہے جس کے حالات اس مقام میں زیر بحث ہوتے ہیں۔ یہاں سیاق و سباق دلیل ہے کہ وہ لوگ مراد ہیں جو بصیرت اور تقویٰ سے عاری ہیں اس وجہ سے دنیا کی مرغوبات پر ٹوٹے پڑ رہے ہیں اور قرآن جن اعلیٰ اقدار کی طرف توجہ دلا رہا ہے ان کی طرف وہ آنکھ ہی نہیں اٹھاتے۔

مرغوباتِ نفس

مرغوباتِ نفس کے بیان میں ایک خاص ترتیب ملحوظ ہے جو نگاہ میں رکھنے کی ہے۔ پہلے اہل و عیال کا ذکر کیا ہے اس لیے کہ محبت کے لحاظ سے سب سے اونچا مقام انھی کا ہے، دوسری چیزوں کی محبت اصلاً ان کے تابع ہے بلکہ زیادہ تر انھی کے لیے ہے۔ اس کے بعد مال کا ذکر ہے اور مال میں سونے کا ذکر اس کی گراں قیمتی کی وجہ سے دوسرے نقود پر مقدم ہے۔ پھر سامان میں سب سے پہلے گھوڑوں کا ذکر ہے اس لیے کہ اہلِ عرب زینت، فخر اور دفاع، تینوں کے نقطۂ نظر سے گھوڑے کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ اس کے بعد چوپایوں کا ذکر ہے اس لیے کہ تمدن کے ظہور سے پہلے بدویت کے دَور میں معاش کا انحصار بیشتر انھی پر تھا۔ آخر میں کھیتی اور باغ کا ذکر ہے اس لیے کہ ان کی اہمیت تمدن کے دَور میں داخل ہونے کے بعد شروع ہوئی ہے جب انسان نے شہروں اور دیہاتوں کی رہائش اختیار کی ہے۔

'ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا' کے چھوٹے سے فقرے میں معانی کا ایک جہان پوشیدہ ہے۔ اس میں اس دنیا کی ناپائداری کی طرف بھی اشارہ ہے، ان چیزوں کی بے حقیقتی کی طرف بھی، اور ایک عالم باقی کے مقابل میں اس جہانِ فانی کی ناپائدار لذتوں پر ریجھنے کی حماقت کی طرف بھی۔

نظم کے پہلو سے یہ آیت گویا اوپر کی آیت ۹ کے مضمون کی تشریح ہے۔ اس میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ اصل چیز جو لوگوں کو قرآن کی مخالفت پر اکسا رہی ہے وہ ہے تو اس دنیا کی محبت اور اس کی مرغوبات کی طمع لیکن اس بیماری کو چھپائے رکھنے کے لیے یہ طرح طرح کے شبہات و شکوک اور اعتراضات ایجاد کرتے اور پھیلاتے ہیں تاکہ اس طرح اپنے اس گریز کے لیے جواز پیدا کریں۔

قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ۭ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۝ اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ ۝

(۱۵-۱۷)

مخاطبین کو زاویۂ نگاہ بدلنے کی دعوت

یہ مخاطبین کو زاویۂ نگاہ بدلنے کی دعوت ہے اس لیے کہ اس کے بدلے بغیر قرآنی اقدار کی طلب دل میں پیدا نہیں ہو سکتی۔ قرآن کے نزدیک انسان کی اصل بیماری اس کی تنگ نظری اور پست حوصلگی ہے، وہ اس دنیا کی چند روزہ زندگی کو کل زندگی سمجھ بیٹھا ہے، جس کے سبب سے اس کی ساری بھاگ دوڑ اسی دنیا کی مرغوبات و مطلوبات تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے حالانکہ اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے جو ابدی اور لازوال ہے۔ اگر انسان اس زندگی کی طلب میں تقویٰ کی روش اختیار کرے یعنی اس دنیا سے متعلق خدا نے جو حدود حرام و حلال ٹھہرا دیے ہیں ان کی پابندی کرے تو اسے آخرت کی ابدی زندگی میں وہ نعمتیں ملیں گی جن کا آج وہ تصور بھی نہیں کر سکتا۔

ازواج مطہرہ

نعمتوں میں 'ازواج مطہرۃ' کا ذکر خاص طور پر فرمایا ہے۔ اس لفظ پر بقرہ کی آیت ۲۵ کے تحت ہم بحث کر چکے ہیں۔ یہاں خاص طور پر جنت کی نعمتوں میں اس کا ذکر اس وجہ سے ہوا کہ اوپر آیت ۱۴ میں واضح ہو چکا ہے کہ دنیا کے مرغوبات میں سرفہرست جس چیز کو جگہ حاصل ہے وہ اہل و عیال ہیں اس وجہ سے جنت کی نعمتوں میں بھی ان کا ذکر خاص طور پر فرمایا۔

رضوان

'رضوان' کے معنی تو خدا کی خوشنودی اور رضامندی کے ہیں، لیکن قرآن میں یہ لفظ بالعموم جنت کی نعمتوں کی ایک جامع تعبیر کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ جب اس کا ذکر ہو گیا تو گویا ہر نعمت کا ذکر ہو گیا۔ اس کا بھی جس کے لیے تعبیر کا کوئی جامہ موجود ہے اور اس کا بھی جو گمان و خیال اور قیاس و وہم ہر چیز سے بالاتر ہے۔

بصیر بالعباد میں دھمکی اور تسلی دونوں ہے

'وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ' دھمکی اور تسلی دونوں ہی قسم کے مواقع پر استعمال ہو سکتا ہے۔ یہاں موقع دلیل ہے کہ تسلی کے محل میں ہے۔ یعنی جو لوگ آخرت کے لیے اس دنیا کی زندگی میں تقویٰ کی روش اختیار کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی تمام قربانیوں اور مشقتوں سے باخبر ہے۔ ان کو ان تمام قربانیوں کا پورا پورا صلہ دے گا، ان کی کوئی قربانی بھی ضائع نہیں جائے گی۔

اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ الاٰیۃ 'لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا' سے بدل ہے۔ یہ تفصیل ان لوگوں کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو قرآن کی اس دعوت کو قبول کر کے آخرت سے غافل کرنے والی مرغوبات سے دستکش ہو گئے اور اپنی پچھلی زندگی کی خود فراموشیوں سے تائب ہو کر ایمان و عمل صالح کی پاکیزہ زندگی میں آ گئے، ساتھ ہی اس میں ایک خاموش تبلیغ بھی ان لوگوں کے لیے ہے جو اس راہ پر آنے سے ہچکچا رہے تھے اور اپنی اس ہچکچاہٹ کے لیے مختلف قسم کے حیلے بہانے پیدا کر رہے تھے۔

حاملین قرآن کا کردار

اَلصّٰبِرِيْنَ الاٰیۃ۔ یہ دوسرا بدل ہے، اس سے ان اخلاقی اوصاف کی وضاحت ہو گئی ہے جن سے یہ پاکیزہ صفات گروہ متصف ہے اور اسی سے یہ بات بھی واضح ہو رہی ہے کہ وہ اخلاق و کردار کن اجزا سے مرکب ہے جو قرآن کا حامل ہونے کے لیے ضروری ہے۔ یہ آیت گویا اس کے بالکل ضد اخلاق و کردار پیش کر رہی ہے جو اوپر 'زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ' والی آیت میں نمایاں ہوا۔

یہاں صرف پانچ صفات بیان ہوئی ہیں۔ صبر، صدق، قنوت، انفاق، استغفار۔

'صبر' کی حقیقت

صبر کی حقیقت نرم وگرم ہر طرح کے حالات میں حق پر جزم و استقامت ہے۔ غربت، بیماری، مصیبت، مخالفت، جنگ، غرض جس قسم کے بھی حالات سے آدمی کو دوچار ہونا پڑے عزم وہمت کے ساتھ ان کو برداشت کرے، ان کا مقابلہ کرے، ان سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرے اور اپنے امکان کے حد تک موقف حق پہ جما رہے۔ دل کو مایوسی اور گھبراہٹ سے، زبان کو شکوۂ تقدیر سے اور اپنی گردن کو کسی باطل کے آگے جھکنے سے بچائے۔ دین کا بڑا حصہ اسی صبر پر قائم ہے۔ اگر آدمی کے اندر یہ وصف نہ ہو تو کوئی طمع، کوئی ترغیب، کوئی آزمائش بھی اس کو حق سے ہٹا کر باطل کے آگے سرنگوں کر دے سکتی ہے۔ جو شخص سچائی کے راستے پر چلنا چاہے اور اس پر چل کر استوار رہنے کا آرزومند ہو اسے سب سے پہلے اپنے اندر صبر کی صفت پیدا کرنی چاہیئے۔ مزاحموں کے مقابلے کے لیے (اور اس راہ میں ہر قدم پر مزاحموں سے مقابلہ ہے) اصلی ہتھیار بندے کے پاس یہی ہے۔ فلسفۂ دین کے نقطۂ نظر سے دین نصف شکر ہے اور نصف صبر، لیکن عملی تجربہ گواہ ہے کہ آدمی میں صبر نہ ہو تو شکر کا حق بھی ادا نہیں ہو سکتا۔ یہاں چونکہ خطاب ان لوگوں سے ہے جنھیں سچائی کی سب سے بڑی بلندی پر چڑھنے کی دعوت دی جا رہی ہے اس وجہ سے ان کے سامنے، جن لوگوں کا نمونہ پیش کیا گیا ہے ان کے کردار میں سب سے پہلے ان کے صبر ہی کے پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔

'صدق' کی حقیقت

'صدق' کی اصل حقیقت کسی شئے کا بالکل مطابق واقعہ ہونا ہے۔ اس کی روح پختگی اور ٹھوس پن ہے۔ نیزے کی گرہیں دیکھنے میں جیسی مضبوط ظاہر ہو رہی ہیں آزمائش سے بھی ویسی ہی مضبوط ثابت ہوں تو ایسے نیزے کو عربی میں صادق الکعوب کہیں گے۔ زبان، دل سے ہم آہنگ ہو، عمل اور قول میں مطابقت ہو، ظاہر اور باطن ہم رنگ ہوں، عقیدہ اور فعل دونوں ہم عناں ہوں، یہ باتیں صدق کے مظاہر میں سے ہیں اور انسانی زندگی کا سارا ظاہر و باطن انھی سے روشن ہے، یہ نہ ہو تو انسان کی ساری معنویت ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہی چیز ہے جو انسان کو وہ پر پرواز عطا کرتی ہے جس سے وہ روحانی بلندیوں پر چڑھتا ہے اور اس سے اس کے صبر کو بھی سہارا ملتا ہے۔

'قنوت' کی حقیقت

"قنوت" کی اصل روح اللہ جل شانہ کے لیے تواضع و تذلل ہے، یہ چیز اللہ تعالیٰ کی بے پایاں نعمتوں کے شعور اور اس کی بے نہایت عظمتوں کے احساس کا قدرتی ثمرہ ہے۔ یہ نعمت کو شکر کا اور مصیبت کو صبر کا ذریعہ بناتی ہے اور ہر حالت میں بندے کو اللہ تعالیٰ ہی کی طرف متوجہ رکھتی ہے۔ اصلاً تو یہ عقل و دل کی فروتنی اور انکساری ہے لیکن جس طرح قلب کی ہر حالت کا عکس انسان کے ظاہر پر بھی نمایاں ہوتا ہے اسی طرح اس کا عکس بھی انسان کی وضع قطع، چال ڈھال، گفتار کردار ہر چیز میں نمایاں ہوتا ہے۔ یہ اس غرور اور گھمنڈ کی ضد ہے جو نعمتوں کو اپنے استحقاق ذاتی کا ثمرہ سمجھنے کا نتیجہ ہوتا ہے اور اس تلون اور بے صبرے پن کے بھی منافی ہے جو صبر و صدق کے فقدان سے پیدا ہوتا ہے۔

'انفاق' کی حقیقت

'انفاق' کے معنی واضح ہیں۔ یہ مرغوبات دنیا کی اس محبت کی ضد صفت ہے جس کا ذکر اوپر والی آیت میں ہوا۔ اگر مرغوباتِ دنیا کی محبت دل پر اس طرح چھا جائے کہ وہ خدا اور بندوں کے حقوق سے انسان کو روک دے تو یہی وہ چیز ہے جس کو قرآن نے 'زُيِّنَ لِلنَّاسِ' سے تعبیر کیا ہے۔ انفاق کی خصلت اس امر کی شہادت ہے کہ صاحبِ انفاق کی نظر میں اصل قدر و قیمت دنیوی خزف ریزوں کی نہیں بلکہ آخرت کی ابدی زندگی اور اس کی لازوال نعمتوں کی ہے۔ برعکس اس کے جو شخص خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے گریز کرتا ہے وہ اپنے عمل سے ثابت کرتا ہے کہ اس کی نگاہوں میں ساری قدر و قیمت بس اس فانی دنیا کی فانی لذتوں ہی کی ہے، آخرت کی زندگی کا اس کے ذہن میں سرے سے کوئی تصور ہی نہیں ہے۔

'استغفار' کی حقیقت

'استغفار' کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ سے تضرع و زاری کہ وہ اپنے بندے کی کوتاہیوں، گناہوں اور جرموں پر پردہ ڈالے۔ یہ تضرع اس حیا اور خوف کا نتیجہ ہے جو بندے کے دل میں اپنے پروردگار کے بے پایاں احسانات و انعامات کے احساس اور اس کے عدل و انتقام کے تصور سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ 'وقت سحر' کی قید لگی ہوئی ہے جس سے اس حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ یہ وقت قبولیتِ استغفار کے لیے سب سے زیادہ موزوں، ریا کی آفتوں سے سب سے زیادہ محفوظ، دلجمعی اور آیاتِ الٰہی میں تفکر و تدبر کے لیے سب سے زیادہ سازگار ہے۔ قرآن اور حدیث دونوں ہی میں مختلف پہلوؤں سے اس کی وضاحت ہوئی ہے اور یہ رب کریم کا عظیم احسان ہے کہ اس نے استغفار کی ہدایت کے ساتھ ساتھ استغفار کی قبولیت کے لیے سب سے زیادہ سازگار وقت کا بھی خود ہی پتہ دے دیا۔

اس ٹکڑے پر تدبر کی نگاہ ڈالیے تو اس سے جہاں ایک طرف یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کن صفات کے لوگ ہیں جو قرآن کے حامل ہو سکتے ہیں وہیں یہ بات بھی اس سے نکلی کہ وہ موانع کیا ہیں جو قرآن کے ان مخالفین اور قرآن کے درمیان حائل ہیں۔ معلوم ہوا کہ ان میں وہ صبر نہیں ہے جو نفس اور شیطان کی مزاحمتوں کے مقابل میں ان کو پا برجا رکھ سکے، وہ صدق نہیں ہے جو ان کے عقیدہ اور عمل، قول اور فعل، ظاہر اور باطن میں مطابقت پیدا کر سکے، وہ قنوت نہیں ہے جو سب سے بڑے صاحبِ حق کے آگے ان کی گردن اور ان کے دل دونوں کو جھکا دے، ابدی زندگی کا وہ شوق نہیں ہے جو انھیں آخرت کے لیے دنیا کو قربان کرنے پر ابھار سکے اور خدائے منعم و دیان کی نعمتوں اور نقمتوں کا وہ شعور و احساس نہیں ہے جو انھیں غفلت کے بستروں سے اٹھا کر مناجات سحر کے لیے ان کو ان کے رب کے حضور لا کھڑا کرے — اور ساتھ ہی اسلوب بیان نے ایک لطیف اشارہ اس بات کی طرف بھی کر دیا کہ آج جن لوگوں نے اس قرآن کو قبول کر لیا ہے اور اس کے پھیلانے میں اللہ کے رسول کا ساتھ دے رہے ہیں وہ ان صفات سے متصف ہیں اور ان صفات سے متصف ہونے ہی کے سبب سے وہ اس بارِ گراں کے اٹھانے کے اہل بن سکے ہیں۔

۴۔ آگے کا مضمون ــــ آیات ۱۸-۲۲

وہی اوپر والا مضمون ایک دوسری شاندار تمہید کے ساتھ ایک دوسرے پہلو سے بیان ہوا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ، اس کے فرشتوں اور علمِ حقیقی کے تمام حاملین کی شہادت ابتدا سے یہی ہے کہ اللہ واحد کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور وہ عدل و قسط کو قائم کرنے والا اور عزیز و حکیم ہے۔ اس نے بندوں کی ہدایت اور ان کو عدل و قسط پر قائم کرنے کے لیے جو دین عطا فرمایا وہ اسلام ہے، یہی دین اللہ کا حقیقی دین ہے، یہی دین اس نے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعے بھیجا لیکن یہود و نصاریٰ نے اپنی باہمی ضدم ضدا کے سبب سے دیدہ و دانستہ اس دین میں اختلافات برپا کیے اور اسلام کے بجائے یہودیت و نصرانیت کے الگ الگ بت کھڑے کر لیے۔

اس کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا کہ اگر یہود و نصاریٰ تم سے اس دینِ حقیقی کے باب میں جھگڑنا چاہتے ہیں تو تم ان کی اس مخالفت کو ذرا خاطر میں نہ لاؤ بلکہ صاف صاف اہل کتاب کو بھی اور قریش کو بھی سنا دو کہ میں نے اور میرے ساتھیوں نے تو اسلام کی راہ اختیار کر لی ہے، اب جس کا جی چاہے اپنی گمراہی پر اڑا رہے۔ تمہارے اوپر ذمہ داری صرف اس پیغام کو پہنچا دینے کی ہے، اس کے بعد معاملہ اللہ کے حوالہ کرو۔ وہ سب کے حالات سے اچھی طرح باخبر ہے جس کو جس چیز کا سزاوار پائے گا اس کو وہ دے گا۔

آگے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے واسطے سے اہل کتاب کو یہ دھمکی دی ہے کہ جو لوگ اللہ کی آیات کا انکار کرتے رہے ہیں، جنھوں نے اللہ کے نبیوں کا خون ناحق بہایا ہے اور جو دین کے مصلحین و مجددین اور عدل و قسط کے علم برداروں کے درپئے آزار و قتل رہے، اب ان کی عدالت کا وقت آ گیا ہے، اب وہ خدا کی پکڑ سے نہیں بچ سکیں گے، ان کے اعمال دنیا اور آخرت دونوں میں اکارت جائیں گے اور کوئی ان کا حامی و مددگار نہ بن سکے گا۔

اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔ ارشاد ہے۔

آیات ۱۸-۲۲ النصف

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا ۢ بِالْقِسْطِ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۸﴾ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۟ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْ ۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا ۢ بَيْنَهُمْ ؕ وَمَنْ

يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۹﴾ فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ؕ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّيَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۲۱﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۫ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۲۲﴾

ع ۲ / ۱۰

ترجمۂ آیات ۱۸-۲۲

اللہ، فرشتوں اور اہلِ علم کی گواہی ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ عدل و قسط کا قائم رکھنے والا ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ غالب اور حکمت والا ہے۔ ۱۸

اللہ کا اصل دین اسلام ہے۔ اہلِ کتاب نے تو اس میں اختلاف علمِ حق کے آجانے کے بعد محض باہمی ضدم ضدا کے سبب سے کیا ہے۔ جو لوگ اللہ کی آیات کا انکار کریں گے تو وہ یاد رکھیں کہ اللہ بہت جلد حساب چکا دینے والا ہے۔ اگر وہ تم سے اس بارے میں جھگڑتے رہیں تو تم ان سے کہہ دو کہ میں نے اور میرے پیرؤوں نے تو اپنے آپ کو اللہ کے حوالہ کیا اور اہلِ کتاب اور امّیوں سے پوچھو کہ کیا تم بھی اسی طرح اسلام لاتے ہو؟ اگر وہ بھی اسی طرح اسلام لائے تو وہ راہ یاب ہوئے اور اگر وہ اعراض کریں تو تمہارے اوپر ذمہ داری صرف پہنچا دینے کی ہے، اللہ اپنے بندوں کا نگرانِ حال ہے۔ ۱۹-۲۰

جو لوگ اللہ کی آیات کا انکار کرتے رہے ہیں، نبیوں کو ناحق قتل کرتے رہے ہیں اور

ان لوگوں کو قتل کرتے رہے ہیں جو لوگوں میں سے عدل و قسط کی دعوت لے کر اٹھے تو ان کو ایک دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دو۔ یہی لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا اور آخرت دونوں میں اکارت گئے اور ان کا کوئی مدد کرنے والا نہ بنے گا۔ ۲۱-۲۲

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۱۸)

توحید اور قسط کی شہادت کے تین پہلو

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی وحدانیت اور قائم بالقسط ہونے پر اپنی، اپنے فرشتوں اور اہل علم کی شہادت کا حوالہ دیا ہے۔ یہ شہادت تین مختلف پہلوؤں سے ہے۔

آفاق کی شہادت

ایک تو آفاق کی شہادت ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اس کائنات کے خالق نے اس کو جس طرح بنایا ہے اور جس طرح اس کے نظام کو چلا رہا ہے اس سے اس بات کی صاف شہادت مل رہی ہے کہ وہ ایک ہی ہے، کوئی اس کا ساجھی نہیں ہے۔ قرآن نے اس شہادت کو توحید کی دلیل کے عنوان سے اتنی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے کہ اس کے شواہد نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر اسی نظامِ کائنات سے قرآن نے یہ ثابت کیا ہے کہ اس کے ہر گوشے میں اس کائنات کے خالق نے ایک میزان رکھی ہے، مجال نہیں کہ کوئی شے اپنے معین محور و مدار سے ایک انچ بھی ادھر اُدھر ہو سکے۔ یہ اس بات کی شہادت ہے کہ اس کا خالق و فاطر عدل و قسط کو پسند کرتا ہے، یہ نہیں چاہتا ہے کہ اس کی مخلوقات میں سے کوئی چیز اس عدل و قسط سے بال برابر بھی انحراف کرے۔ قرآن میں اس حقیقت کے شواہد بہت ہیں۔ ہم بخیالِ اختصار صرف ایک آیت بطورِ مثال نقل کرتے ہیں۔ ارشاد ہے۔

اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ۝ وَّالنَّجْمُ وَ	سورج اور چاند دونوں ایک حساب کے ساتھ گردش کرتے ہیں۔
الشَّجَرُ يَسْجُدَانِ ۝ وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا	تارے اور درخت سب سجدہ کرتے ہیں۔ اس نے آسمان کو بلند
وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ ۝ اَلَّا تَطْغَوْا فِى الْمِيْزَانِ ۝	کیا اور اس میں ایک میزان رکھی، کہ تم بھی میزان کے معاملے میں تجاوز
وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا	نہ کرو بلکہ وزن کو انصاف کے ساتھ قائم کرو، اور میزان میں کوئی
الْمِيْزَانَ ۝ (۵-۹ رحمان)	کمی نہ کرو۔

یعنی یہ کائنات اپنے وجود سے اس بات کی گواہی دے رہی ہے کہ اس کا خالق عدل و قسط کو پسند کرنے والا ہے اور اس کے سورج اور چاند، شجر و حجر، آسمان و زمین اپنی زبانِ حال سے ہر وقت یہ سبق دے

رہے ہیں کہ جس طرح وہ خدا کے مقرر کردہ پیمانے سے سرِ مُو تجاوز نہیں کرتے، ان کی ہر حرکت اس پیمانے سے نپی تلی ہوتی ہے اسی طرح انسان بھی اپنی زندگی کے تمام گوشوں میں خدا کی میزان میں نپی تلی روش اختیار کرے، اس کے ٹھہرائے ہوئے حدود سے ذرا بھی تجاوز نہ کرے۔

تاریخ کی شہادت

اسی آفاقی شہادت کے ذیل میں قوموں کی تاریخ بھی آتی ہے۔ قرآن نے قوموں کی تاریخ بھی پیش کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ دنیا کوئی اندھیر نگری نہیں ہے بلکہ اس کا خالق و مالک اس کو ایک نظام عدل و قسط کے تحت چلا رہا ہے۔ اس کے اسٹیج پر یکے بعد دیگرے وہ مختلف قوموں کو بھیجتا ہے اور ان کا امتحان کرتا ہے کہ وہ خدا کے قانون عدل و قسط کے اندر اپنے اختیار اور اپنی قوتوں کو استعمال کرتی ہیں یا اس سے بغاوت اور سرکشی کی راہ اختیار کرتی ہیں۔ جب تک کوئی قوم خدا کے حدود کے اندر رہ کر اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرتی ہے، وہ اس کو برومند کرتا اور پروان چڑھاتا ہے، جب وہ اس راہ سے ہٹ کر سرکشی کی راہ اختیار کر لیتی ہے تو ایک خاص حد تک مہلت دے چکنے کے بعد وہ اس کو فنا کر دیتا ہے اور دوسری قوم کو اس کی وارث بناتا ہے۔ قرآن نے اس سنت کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔

انفس کی شہادت

دوسری شہادت انفس کی شہادت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت ایسی بنائی ہے کہ وہ خود توحید کی اور اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کے قائم بالقسط ہونے کی شہادت دے رہی ہے۔ اس شہادت کے دلائل ہم اپنی اس کتاب میں بھی جگہ جگہ بیان کر رہے ہیں اور خاص اس موضوع پر ہم نے حقیقت شرک اور حقیقتِ توحید کے نام سے دو کتابیں بھی لکھی ہیں۔ تفصیل کے طالب ان کو پڑھیں۔ انسانی فطرت کی یہی توحید پسندی ہے جس کے سبب سے قرآن نے توحید کو دین فطرت قرار دیا ہے فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا (اللہ کی بنائی ہوئی فطرت جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا) اور یہی عدل پسندی ہے جس کی بنا پر جزا و سزا کے منکرین سے قرآن یہ سوال کرتا ہے۔ اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ؕ مَا لَكُمْ ٚ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ (۳۴-۳۵ - قلم) کیا ہم فرمانبرداروں کو مجرموں کی طرح کر دیں گے، تمھیں کیا ہو گیا ہے، تم کیسا فیصلہ کرتے ہو؟)

وحی کی شہادت

تیسری شہادت وحی کی شہادت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی پسند ناپسند اور اپنے اوامر و نواہی سے بندوں کو آگاہ کرنے کے لیے اپنے بے شمار نبی اور رسول بھیجے اور ان سب پر اپنی توحید اور اپنے قائم بالقسط ہونے کی شہادت دی اور ان نبیوں اور رسولوں نے یہ شہادت اپنی اپنی امتوں کو پہنچائی۔ اس شہادت کے آثار و نشانات آج بھی ان امتوں کی روایات اور ان کے صحیفوں کی تعلیمات میں موجود ہیں لیکن انھوں نے ان آثار و روایات کو نظر انداز کر کے اپنے آپ کو ایسے نظریات و عقاید میں مبتلا کر لیا جو توحید کے بھی منافی ہیں اور خدا کے قائم بالقسط ہونے کے بھی لیکن ان امتوں کی اس غلط روش کی وجہ سے وہ اپنی ان اعلیٰ صفات سے دستبردار نہیں ہو گیا ہے بلکہ وہ بدستور ان سے متصف ہے اور ہمیشہ متصف رہے گا۔ چنانچہ انھیں صفات کا یہ تقاضا ہے کہ اس نے قرآن کو، جیسا کہ اوپر کی تمہید میں گزرا، حق و باطل کے درمیان فرقان

بنا کر آتا رہا تاکہ حق و عدل کی صراط مستقیم پھر واضح ہو کر لوگوں کے سامنے آجائے اور باطل پر جمے رہنے کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہے۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوئی کہ خدا کی وحدانیت اور اس کے قائم بالقسط ہونے کی شہادت کسی ایک ہی پہلو سے نہیں مل رہی ہے بلکہ تین مختلف پہلوؤں سے مل رہی ہے۔ اس کی بنائی ہوئی کائنات کا نظام اور اس کی تاریخ اس کی شہادت دے رہی ہے، اس کی پیدا کی ہوئی فطرت اس پر گواہ ہے اور اس کے پیغمبروں نے ہمیشہ اس حقیقت کی منادی کی ہے۔ اس آیت میں یہ بات نہایت اجمال کے ساتھ بیان ہوئی ہے لیکن قرآن کے تیس پاروں میں اس اجمال کی تفصیلات پھیلی ہوئی ہیں۔

ملائکہ کی شہادت

اللہ تعالیٰ نے اپنی شہادت کے ساتھ یہاں ملائکہ کی شہادت کا بھی حوالہ دیا ہے۔ یہ ایک امر واقعی کا اظہار و بیان ہے۔ کائنات میں خدا کے ارادوں کے نفاذ کا ذریعہ اور خدا کے پیغمبروں تک اس کی وحی پہنچانے کا واسطہ ملائکہ ہی بنتے ہیں اس وجہ سے خدا کی توحید اور اس کے قائم بالقسط ہونے کے اس کی مخلوقات میں شاہد اول وہی ہیں۔ ان کی گواہی ایک امر واقعی ہونے سے قطع نظر اس پہلو سے بھی خاص طور پر بیان ہوئی کہ نادانوں نے ان کو خدا کا شریک اور شفاعتِ باطل کا واسطہ قرار دے کر توحید کی بھی نفی کی اور خدا کے قائم بالقسط ہونے کی بھی۔ اس لیے کہ جب تصور یہ ہو کہ سفارش حق کو باطل اور باطل کو حق بنا دے سکتی ہے تو پھر خدا قائم بالقسط کہاں رہا؟ فرشتوں کے متعلق اس غلط فہمی کو رفع کرنے کے لیے قرآن نے خود ان کی زبان سے بھی جگہ جگہ ان کے اعترافات کا حوالہ دیا ہے۔ ہم بخیالِ اختصار صرف ایک مثال نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ ارشاد ہے۔

وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ ۝ وَّ اِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ ۝ وَاِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ ۝ (۱۶۴-۱۶۶ - صافات)	اور ہم میں سے ہر ایک کے لیے بس ایک متعین مقام ہے اور ہم تو صفیں باندھ کر حاضر رہنے والے ہیں اور ہم تو اس کی تسبیح کرنے والے ہیں۔

فرشتوں سے متعلق ایک تفصیلی بحث سورۂ بقرہ میں بضمن آیت ایمان ہم کر چکے ہیں۔

اولوا العلم کی شہادت

ملائکہ کے بعد اولو العلم کی شہادت کا ذکر ہے۔ العلم قرآن کی ایک اصطلاح ہے جس سے مراد وہ علمِ حقیقی ہوتا ہے جو نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے دنیا کو ملا ہے۔ اس پر مفصل بحث ہم دوسرے مقام میں کر چکے ہیں۔ اس علم کے حاملین نے ہر دور میں خدا کی توحید اور اس کے قائم بالقسط ہونے کی شہادت دی ہے یہ مصلحین و مجددین کے گروہ کی طرف اشارہ ہے جو ہر دور میں پیدا ہوتے ہیں اور جنھوں نے اللہ کے دین کو بدعات اور آمیزشوں سے پاک کر کے عقاید کو توحیدِ خالص کی بنیاد پر اور شرائع و قوانین اور اعمال و اخلاق کو حق و عدل کی اساس پر استوار کرنے کی جد و جہد کی ہے۔ یہی لوگ ہیں جن کی طرف آگے کی آیت میں یَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ کے لفظ سے اشارہ ہوا ہے اور جن کے متعلق فرمایا ہے کہ اہلِ کتاب ان کو قتل کرتے رہے ہیں۔

حکمتِ دین کا یہ نکتہ ملحوظ رہے کہ یہاں اللہ اور ملائکہ کے ساتھ حاملین علم کا حوالہ ہے اور توحید کے ساتھ عدل وقسط کا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی نظروں میں اہل علم کا کیا مقام ہے اور خدائی شریعت کے نظام میں عدل وقسط کا کیا درجہ و مرتبہ ہے۔ علمِ حقیقی کے حاملین ملائکہ کے زمرے سے نسبت رکھنے والے ہیں اور عدل وقسط کا درجہ صفاتِ الٰہی میں اتنا بلند وارفع ہے کہ توحید کے بعد سب سے پہلے جس کا ذکر ہو سکتا ہے وہ یہی ہے۔

'قسط' کا مفہوم

"قَآئِمًا بِالْقِسْطِ" ترکیب کے لحاظ سے ہمارے نزدیک "اَنَّہٗ" کی ضمیر سے حال پڑا ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ واحد و یکتا ہے، کوئی اس کا ساجھی نہیں، تمام اختیار و تصرف تنہا اسی کے ہاتھ میں ہے اور وہ اس اختیار و تصرف کو ٹھیک عدل وقسط کے مطابق استعمال کر رہا ہے۔

"قسط" کا مفہوم وہی ہے جو ہم عام بول چال میں حق، عدل، انصاف وغیرہ کے الفاظ سے ادا کرتے ہیں۔ اس کا ضد ظلم، جور اور اس معنی کے دوسرے الفاظ ہیں۔ فکر، عمل، قول، اخلاق، کردار، مظاہر اور اشکال غرض ظاہر و باطن کے ہر گوشے میں ایک نقطہ تو وہ ہے جو ہر چیز کے خالق و فاطر کی بنائی ہوئی فطرت اور اس کے مقرر کیے ہوئے حدود و قیود کے اندر ہے، اس کو نقطۂ اعتدال یا بالفاظِ دیگر مرجع عدل وقسط سمجھیے۔ اگر کسی گوشے میں اس نقطہ سے شو شے کے برابر بھی انحراف واقع ہو جائے تو یہ بات عدل وقسط کے منافی ہو گی۔ اعتبارات اور نسبتوں کی تبدیلی سے تعبیرات بدل بدل جائیں گی۔ کسی دائرے میں ہم اس انحراف کو ظلم و جور سے تعبیر کریں گے، کسی گوشے میں بدصورتی اور بدہئیتی سے، اسی طرح کسی پہلو میں اس اعتدال کو حق و عدل سے تعبیر کریں گے، کسی محل میں حسن و جمال سے لیکن اصل حقیقت ہر جگہ ایک ہی ہو گی۔ وہ یہ کہ ایک شے اپنے اصل فطری مقام سے ہٹ گئی تو بگاڑ پیدا ہو گیا اور اگر اپنے جوڑ سے پیوست ہو گئی تو بناؤ نمودار ہو گیا۔

خالقِ کائنات چونکہ اس دنیا کا خالق و مالک ہے اس وجہ سے اس کو اس کا بگاڑ نہیں بلکہ بناؤ مطلوب ہے۔ اس کے نظامِ تکوینی کی اس نے اس طرح چول سے چول بٹھائی ہے کہ مجال نہیں کہ کہیں کوئی رخنہ پیدا ہو جائے اور اگر اس کی قدرت ہی کی کسی معجز نمائی سے کہیں کوئی رخنہ پیدا ہوتا نظر آتا ہے تو دفعتہً اسی کے کارفرما ہاتھ اس کو درست کرنے کے لیے نمودار ہو جاتے ہیں تاکہ جس توازن پر یہ کارخانہ قائم ہے اس میں کوئی خلل نہ پیدا ہونے پائے۔ اس کی یہی توازن پسندی ہماری زندگی کے اس دائرے کے لیے بھی ہے جس دائرے میں اس نے ہمیں محدود قسم کی آزادی دی ہے۔ جب ہم اپنے اختیار کو غلط استعمال کر کے اپنے اخلاق و عمل کے کسی گوشے میں فساد پیدا کر لیتے ہیں تو وہ ہمیں ڈھیل تو دیتا ہے لیکن یہ ڈھیل بس ایک خاص حد تک ہی ہوتی ہے۔ اس کی عدل پسندی یہ گوارا نہیں کرتی کہ وہ ہمیں ہماری خواہشات کی پیروی کے لیے آزاد اور اس کے نتیجے میں اپنی خلق کو تاراج و پامال ہونے کے لیے چھوڑ دے بلکہ وہ اس ڈھیل پر گرفت

کرتا ہے اور ہمارے پیدا کیے ہوئے بگاڑ کو از سرِ نو درست کر دیتا ہے اس لیے کہ وہ قائم بالقسط ہے۔

اس قیام بالقسط ہی کے لیے اس نے مکافاتِ عمل کا قانون رکھا ہے، اسی کے لیے اس نے انبیا و شرائع کے بھیجنے کا سلسلہ جاری کیا، اسی کے لیے اس نے یہ اہتمام فرمایا کہ جب شریعت میں تحریفات و بدعات سے فساد پیدا ہو جائے تو مجددین و مصلحین اس کی اصلاح و تجدید کے لیے سر دھڑ کی بازیاں لگائیں، اسی کی خاطر اس نے قوموں کے عروج و زوال کو ان کے اخلاقی عروج و زوال کے تابع کیا اور پھر سب سے بڑھ کر اس عدل و قسط ہی کے کامل ظہور کے لیے اس نے ایک ایسا دن مقرر کیا ہے جس میں اس کی میزانِ عدل نصب ہو گی اور وہ تول کر بتائے گی کہ کس کا کون سا عمل ترازو میں پورا ہے، کون سا نہیں، اور پھر اسی کے مطابق جزا و سزا ہو گی۔

یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ ایک ہی آیت میں دو مرتبہ کلمہ توحید کا اعادہ ہے اور دونوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی دو الگ الگ صفتوں کا حوالہ ہے۔ پہلے فرمایا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ قائم بالقسط ہے۔ پھر فرمایا کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ عزیز و حکیم ہے۔ اس اسلوب میں مخاطب۔ اہل کتاب کے لیے سخت تنبیہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا، فرشتوں اور تمام حاملینِ علم کی شہادت یہی ہے کہ خدا کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور وہ الٰہ امورِ دنیا سے بے تعلق نہیں ہے کہ لوگوں کو ان کی خواہشات کی چراگاہ میں شترِ بے مہار کی طرح چھوڑے رکھے، وہ دندناتے پھریں اور وہ حی و قیوم ہونے کے باوجود ان کا کوئی نوٹس نہ لے بلکہ وہ تمہاری خواہشوں کے علی الرغم اپنے نظامِ عدل و قسط کو ضرور قائم کرے گا اور کوئی اس کا ہاتھ نہ پکڑ سکے گا۔ پھر فرمایا کہ وہ ایسا کیوں نہ کرے گا جب کہ وہ وحدہٗ لا شریک بھی ہے اور عزیز و حکیم بھی۔ اس کی عزت اور حکمت دونوں کا تقاضا ہے کہ وہ ایسا کرے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ یا تو وہ بے بس اور حق کے لیے غیرت سے خالی ہے یا وہ ایک کھلنڈرا ہے جس نے دنیا کو محض ایک کھیل تماشا بنایا ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا کی عظیم ہستی کے متعلق اس قسم کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَھُمُ الْعِلْمُ بَغْیًا بَیْنَھُمْ وَمَنْ یَّکْفُرْ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ فَاِنَّ اللّٰہَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ (۱۹)

"الدِّیْن" سے مراد دینِ حقیقی، یعنی وہ دین جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی ہدایت کے لیے اتارا اس پر الف لام اسی طرح کا ہے جس طرح کا "الکتٰب" پر ہے۔ اس کی وضاحت تفسیر سورۂ بقرہ کے شروع میں ہم کر چکے ہیں۔

"اَلْعِلْمُ" سے مراد علمِ حق ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حق کو واضح کرنے اور اختلاف کو دور کر دینے کے لیے نازل ہوا۔

دینِ اسلام ہی اللہ کا دین ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ چونکہ عدل و قسط کو قائم کرنے والا ہے اس وجہ سے اس نے بندوں کو صحیح

زندگی گزارنے کا طریقہ بتانے کے لیے ایک دین عطا فرمایا جس کا نام اسلام ہے۔ یہی دین اللہ کا دین ہے یہ دین عدل و قسط کی میزان ہے۔ یہی دین اس کائنات کے تمام نظامِ تکوینی میں نافذ ہے۔ اسی دین پر فطرتِ انسانی کی تخلیق ہوئی ہے۔ یہی دین اس نے ابتدا سے تمام نبیوں اور رسولوں پر اتارا۔ اس سے الگ اس نے کسی کو کوئی اور دین نہیں دیا لیکن یہود و نصاریٰ نے باہمی اختلاف و عناد اور ضدم ضدا کی وجہ سے اس میں بہت سے اختلافات پیدا کر دیے اور یہودیت و نصرانیت کے ناموں سے اپنے الگ الگ دین کھڑے کر لیے۔ ان کا یہ اختلاف کسی بے خبری پر مبنی نہیں تھا بلکہ حق واضح ہو جانے کے باوجود محض شرارتِ نفس، باہمی عناد اور اپنی اپنی بدعات کی پچ میں تھا۔ اس طرح انھوں نے اللہ کی عظیم نعمت پا کر ضائع کر دی۔ اللہ چونکہ حی و قیوم اور قائم بالقسط ہے اس وجہ سے اس نے اس نظامِ عدل و قسط یعنی اسلام کو از سرِ نو تازہ اور مکمل صورت میں نازل فرمایا تاکہ لوگ ہدایت کی صراطِ مستقیم پائیں اور دنیا و آخرت دونوں کی فلاح حاصل کریں۔ اب بھی اگر انھوں نے وہی روش اختیار کیے رکھی جو اس سے پہلے اختیار کی اور خدا کی آیتوں کا انکار کرتے رہے تو یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کا حساب بہت جلد چکا دینے والا ہے۔ یعنی یہ مہلت جو انھیں ملی ہوئی ہے اس کو بہت طویل نہ سمجھیں بلکہ حضرت یحییٰؑ کے لفظوں میں یوں سمجھیں کہ درختوں کی جڑوں پر کلہاڑا رکھا ہوا ہے۔

یہ مضمون سورہ بقرہ میں بھی آچکا ہے اور وہاں ہم تفصیل کے ساتھ اس پر گفتگو کر چکے ہیں۔ ہم آیت نقل کیے دیتے ہیں۔ تفصیل کے طالب اسی مقام میں اس کی تفسیر دیکھیں۔ فرمایا ہے۔

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۲۱۳- بقرہ)	لوگوں کو اللہ نے ایک ہی امت بنایا۔ پھر انھوں نے اختلافات پیدا کیے تو اللہ نے اپنے انبیا بھیجے خوش خبری دیتے ہوئے اور آگاہ کرتے ہوئے اور ان کے ساتھ کتاب اتاری حق کے ساتھ تاکہ لوگوں کے درمیان ان کے اختلافات کا فیصلہ کرے۔ اور اس میں اختلاف انھی لوگوں نے کیا جن کو یہ کتاب ملی، کھلی کھلی تنبیہات کے باوجود، محض آپس کی ضدم ضدا کے سبب سے، تو اللہ نے ایمان لانے والوں کو اپنی توفیق بخشی سے اس حق کی ہدایت دی جس میں ان لوگوں نے اختلاف کیا اور اللہ جس کو چاہتا ہے سیدھی راہ کی ہدایت دیتا ہے۔

فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَ

الْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِ (۲۰)

"اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ" (میں نے اپنا چہرہ اللہ کے حوالے کیا) اپنی ذات کو اللہ کے حوالے کرنے کی تعبیر ہے۔ چہرہ انسان کی ذات کا سب سے اعلیٰ واشرف حصہ ہے۔ جب سب سے اعلیٰ واشرف حصہ حوالے کر دیا تو گویا سب کچھ حوالے کر دیا۔ یہ اسی طرح کی تعبیر ہے جس طرح ہم کسی کی اطاعت کی تعبیر کے لیے سر جھکا دینا بولتے ہیں۔ اس تعبیر میں غایت درجہ تذلل و نیازمندی اور سپردگی پائی جاتی ہے۔ موقع دلیل ہے کہ یہاں یہ اسلوب اصلاً تو اسلام لانے کے مفہوم کو ادا کرنے کے لیے استعمال ہوا ہے لیکن ساتھ ہی اس سے اسلام کی اصل روح بھی واضح ہو گئی ہے تاکہ دینداری کے ان مدعیوں کو، جو اسلام کی مخالفت میں بحث وجدال کے لیے آستینیں چڑھائے ہوئے تھے، تنبیہ ہو کہ وہ کس چیز کے خلاف یہ زور دکھا رہے ہیں۔

'اُمّی' کا مفہوم

'اُمّی' مدرسی و کتابی تعلیم و تعلم سے ناآشنا کو کہتے ہیں۔ اُمّیین، کا لفظ اسماعیلی عربوں کے لیے بطور لقب استعمال ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ مدرسی اور رسمی تعلیم و کتابت سے ناآشنا اپنی بدویانہ سادگی پر قائم تھے اور اس طرح بنی اسرائیل کے بالمقابل، جو حامل کتاب تھے، اُمیّت ان کے لیے ایک امتیازی علامت تھی۔ ہو سکتا ہے کہ عربوں کے لیے اس کے استعمال کا آغاز اہل کتاب سے ہی ہوا ہو اس لیے کہ حضرت اسماعیلؑ اور ان کی ذریّت کی بدویت و امیّت کا ذکر تورات میں بھی ہے لیکن یہ بات بالکل واضح ہے کہ اس لفظ کے استعمال میں عربوں کے لیے تحقیر کا کوئی پہلو نہیں تھا۔ چنانچہ قرآن نے اس لفظ کو عربوں کے لیے ان کو اہل کتاب سے محض ممیز کرنے کے لیے استعمال کیا ہے۔ اسی پہلو سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے 'نبی امی' کا لقب استعمال ہوا ہے۔ اس میں تورات کی پیشین گوئیوں کی ایک تلمیح بھی ہے۔ عرب خود بھی اس لفظ کو اپنے لیے استعمال کرتے تھے، جو اس بات کا نہایت واضح ثبوت ہے کہ وہ اس میں اپنے لیے تحقیر کا کوئی پہلو نہیں پاتے تھے۔ بعض حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی قوم کے لیے یہ لفظ استعمال فرمایا ہے۔ مثلاً وہ حدیث جس میں ارشاد ہوا ہے نَحْنُ اُمَّةٌ اُمِّيَّةٌ الحدیث بعض جگہ اگر یہ لفظ تحقیر کے طور پر استعمال ہوا ہے تو وہاں اس کا مفہوم محض لغوی ہے اصطلاحی نہیں مثلاً مِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (الآیۃ) اس سے مراد یہود کے ان پڑھ عوام ہیں۔

"ءَاَسْلَمْتُمْ" (کیا تم بھی اسلام لاتے ہو؟) یہ اسلوب دھمکی اور دعوت دونوں پر مشتمل ہے بلکہ فی الجملہ اس سے بیزاری کا بھی اظہار ہو رہا ہے۔ یعنی تم بھی اسلام لانا ہے تو لاؤ، ہم اپنا وقت اب تمہارے ساتھ مناظرہ بازی میں ضائع کرنا نہیں چاہتے، ہم نے تو اپنی راہ اختیار کر لی ہے، اب اپنی منزل کھوٹی کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ نے جس وقت اللہ کے دین ۔ اسلام ۔ کو یہودیت و نصرانیت کی صورت میں مسخ کیا جان بوجھ کر مسخ کیا اور اب جو یہودیت و نصرانیت کی حمایت اور اسلام کی مخالفت میں یہ تم سے مناظرہ و مباحثہ چھیڑے ہوئے ہیں یہ بھی جان بوجھ کر رہی ہے ۔ انھیں خوب معلوم ہے کہ حق کیا ہے اور تم جس دین کی دعوت دے رہے ہو اس کی حیثیت کیا ہے؟ اس وجہ سے ان کے ساتھ بحث و جدال میں وقت ضائع کرنے سے کچھ حاصل نہیں ۔ ان سے بھی اور اُمّی عربوں سے بھی کہہ دو کہ میں نے اور میرے ساتھیوں نے تو اپنے آپ کو اللہ کے حوالہ کر دیا اور اسلام کا قلادہ اپنی گردن میں ڈال لیا۔ اگر تم بھی اس بازی کے لیے تیار ہو تو بسم اللہ آگے بڑھو اور اگر تیار نہیں تو ہماری راہ چھوڑو، اب تمھارے پیچھے ہم اپنی اوقات رائیگاں کرنا نہیں چاہتے ۔

اس کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ اگر یہ اسلام کی راہ اختیار کرتے ہیں تو اور اگر یہ راہ نہیں اختیار کرتے بلکہ اپنی حماقتوں پر جمے رہنا چاہتے ہیں تو ان کو ان کے حال پر چھوڑو، تمھارے اوپر ذمہ داری صرف حق کو پہنچا دینے کی تھی، وہ ذمہ داری تم نے ادا کر دی، اب تم اپنے فرض سے سبکدوش ہو۔ اب ان کا فیصلہ اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہ اپنے بندوں کے سارے حالات و معاملات کو دیکھ رہا ہے اور ہر ایک کے ساتھ وہ وہی معاملہ کرے گا جس کا اس کو مستحق پائے گا۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَيَقْتُلُونَ الَّذِينَ يَأْمُرُونَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ (۲۱)

قتلِ انبیاء بغیرِ حق 'يَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ حَقٍّ ' میں 'بغیر حق' کے الفاظ سے ایک تو یہود کے اس جرم کی سنگینی کا اظہار ہو رہا ہے، کیونکہ قتلِ ناحق بجائے خود ایک سنگین جرم ہے اور اگر یہ قتلِ ناحق کسی نبی کا ہو تو پھر تو اس کی سنگینی کا پوچھنا ہی کیا ہے ۔ دوسرے اس سے حق کی عظمت کا اظہار ہو رہا ہے کہ حق سب سے بالاتر چیز ہے یہاں تک کہ انبیا بھی اس کے تحت آتے ہیں۔ اس حقیقت کا اظہار ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف طریقوں سے فرمایا ہے ۔

آمرین بالقسط سے مراد 'الَّذِينَ يَأْمُرُونَ بِالْقِسْطِ' سے مراد وہ مصلحین و مجددین ہیں جو عام لوگوں کے اندر سے اٹھے اور جنھوں نے یہود و نصاریٰ کی تحریفات و بدعات کی اصلاح اور ان کی زندگیوں کو ازسرِنو خدا کے دیے ہوئے نظامِ حق و عدل کے تحت لانے کی جد و جہد کی ۔ ان لوگوں کے ساتھ بھی یہود و نصاریٰ نے وہی معاملہ کیا جو خدا کے نبیوں کے ساتھ کیا ۔ اپنے تمام حربوں سے کام لے کر ان کی مخالفت کی اور جس پر بس چل گیا اس کو قتل کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔

اوپر والی آیت کے آخر میں یہ جو فرمایا تھا کہ اللہ اپنے بندوں کا نگرانِ حال ہے، ہدایت و ضلالت میں سے جس کو جس چیز کا سزاوار پائے گا اس کو وہی بخشے گا، اب یہ اس کے مضمرات کھل رہے ہیں مطلب

یہ ہے کہ جن لوگوں کا ہمیشہ یہ شیوہ رہا ہے کہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے رہے ہیں، جو اللہ کے نبیوں کو قتل کرتے رہے ہیں اور ان لوگوں کو قتل کرتے رہے ہیں جو ان کے اندر اصلاح و تجدید اور حق و عدل کی دعوت لے کر اٹھے یہ کس طرح ممکن ہے کہ آج ان کا مزاج بدل جائے۔ جس نظامِ حق و عدل کو انھوں نے ہمیشہ بگاڑا اور اس کی اصلی بنیادوں پر قائم کرنے والوں کے یہ درپئے آزار بھی رہے اور ان کو قتل بھی کیا اسی نظامِ عدل اور اس کے داعیوں کو آج وہ کس طرح گوارا کریں گے؟ جب اخلاف اپنے اسلاف ہی کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں تو انبیاء اور مصلحین کے قاتلوں اور تورات و انجیل کے محرفوں کی اولاد سے یہ کس طرح توقع رکھتے ہو کہ وہ تم کو اور تمھاری پیش کی ہوئی کتاب کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت کریں گے۔ انجیل میں جگہ جگہ سیدنا مسیحؑ نے قاتلینِ انبیا کی اولاد کے ایمان اور ان کی نجات سے جو مایوسی کا اظہار فرمایا ہے وہ بھی بالکل اسی نوعیت کی بات ہے۔ بعینہٖ وہی بات قرآن نے یہاں اپنے اسلوب میں کہی ہے کہ یہ لوگ ایمان و اسلام کی راہ اختیار کر کے نجات و فلاح کی خوشخبری کے اہل نہیں ہیں۔ بس انھیں ایک دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دو۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمَا لَهُم مِّن نَّاصِرِينَ (۲۲)

'حبطِ عمل' کی حقیقت

'حبطِ عمل' سے مطلب ہے کوششوں اور محنتوں کا اکارت ہو جانا۔ ظاہر ہے کہ وہ ساری دینداریاں جو سیدنا مسیحؑ کے الفاظ میں، مچھر کو چھاننے اور اونٹ کو نگلنے کے مترادف تھیں، ان کے آخرت میں نتیجہ خیز ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ رہیں وہ کوششیں اور تدبیریں جو وہ قرآن و اسلام یا دوسرے لفظوں میں اللہ تعالیٰ کے نظامِ عدل و قسط کی مخالفت میں صرف کر رہے تھے تو اس آیت نے ان کے بھی اکارت ہونے کی پیشین گوئی کر دی اس لیے کہ اس آیت میں دنیا اور آخرت دونوں میں ان کے اعمال کے اکارت ہونے کا ذکر ہوا ہے اور ساتھ ہی یہ بات بھی بیان ہوئی ہے کہ اس ذلت و نامرادی سے بچانے میں ان کا کوئی مددگار ان کی کوئی مدد نہیں کر سکے گا۔ خواہ یہ مددگار روحانی ہوں یا مادی۔ تاریخ گواہ ہے کہ قرآن کی پیشین گوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی۔

۶۔ ایمان بالقسط ایمان کے اہم ارکان میں سے ہے

اس مجموعہ آیات میں جو تعلیم امت کو دی گئی ہے آیات کی وضاحت کے ضمن میں بقدرِ ضرورت ہم اس پر روشنی ڈال چکے ہیں لیکن ایمان باللہ کے ذیل میں اللہ تعالیٰ کے قائم بالقسط ہونے کی صفت کا جو حوالہ ہے یہ ایمان کے نہایت اہم اجزا میں سے ہے اور اسلام کی حقیقت میں تو اس کو اس درجہ دخل ہے کہ گویا اسلام عبارت ہی اسی سے ہے۔ اس کی یہ اہمیت تقاضا کر رہی ہے کہ اس کے متعلق استاذ امامؒ کے چند نکات یہاں درج کر دیے جائیں تاکہ جو لوگ حکمتِ دین پر غور کرنا چاہتے ہیں وہ ان سے فائدہ اٹھا

سکیں۔ مولانا کے نزدیک اس صفت کی اہمیت مندرجہ ذیل پہلوؤں سے ہے۔

ایمان بالقسط کی اہمیت کے چار پہلو

۱۔ ایمان امن سے ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اعتماد و اعتقاد اس کی فطرت میں داخل ہے۔ اس سے یہ بات لازم آتی ہے کہ ایمان کے لیے ناگزیر ہے کہ آدمی کو اللہ کے وجود پر یقین راسخ ہو۔ لیکن یہ چیز اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک یہ اعتماد نہ کیا جائے کہ عقل اصلاً رہنمائی کے لیے بنی ہے نہ کہ گمراہ کرنے کے لیے۔ یعنی یہ مانا جائے کہ عقل اپنی فطرت کے لحاظ سے انسان کے اندر ایک میزان قسط ہے۔ پھر یہ چیز ایک اور نتیجہ کو مستلزم ہے کہ فطرت کو اس کے فاطر نے حق و عدل کے اصولوں پر استوار کیا ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ بہمہ وجوہ عدل و قسط، عدل و قسط کو پسند کرنے والا اور اس کو قائم کرنے والا ہے۔ یہ تمام نتائج عقلاً لازم بلکہ بدیہیات میں سے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی چیز کے حق ہونے کا ثبوت اس وقت تک ممکن ہی نہیں ہے جب تک فاطر فطرت کو حق و عدل نہ مانا جائے۔ اسی سے اس کے تمام افعال کا حق و صدق ہونا ثابت ہوگا۔ جس طرح عقلاً یہ چیز لازم ہے اسی طرح اخلاقی مسلمات سے بھی اس کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ نیکی کو اللہ تعالیٰ نے فطرت میں داخل کیا ہے اور دلوں میں اس کے قبول کرنے اور اس کی عزت کرنے کی رغبت ودیعت فرمائی ہے۔ ایسی حالت میں ہمارے لیے یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہم خود تو نیکی کو پسند کریں اور خدا کو نیکی کو پسند کرنے والا نہ قرار دیں۔ ہم اپنی اس خیر پسندی کی صحت و اصابت پر اطمینان کس طرح کر سکتے ہیں اگر خود فاطر کی خیر پسندی پر ہمارا دل مطمئن نہ ہو۔ ہم اس کو نیکی کر کے خوش کرنا تو اسی وجہ سے چاہتے ہیں کہ ہم یہ اطمینان رکھتے ہیں کہ وہ نیکی کو پسند کرتا ہے۔ اس کو اچھی صفات سے موصوف کرنا بھی اسی بنیاد پر ہے کہ ان صفات کو پسند کرنے کے معاملے میں ہمیں اپنی فطرت کے صحیح ہونے پر پورا اعتماد ہے۔

۲۔ دوسرا یہ کہ ایمان کی اصل خدا کی محبت ہے۔ ہم ایک ایسے معبود پر ایمان رکھتے ہیں جس سے ہم محبت کرتے ہیں، جس سے امید رکھتے ہیں اور جس کی خوشنودی چاہتے ہیں۔ یہ چیز اس وقت تک ممکن ہی نہیں ہے جب تک ہمیں یہ یقین نہ ہو کہ وہ ظلم و ناانصافی کے ہر شائبہ سے پاک ہے۔ وہ اپنا انعام انھی پر فرمائے گا جو اس کی اطاعت کریں گے اور سزا انھی کو دے گا جو اس کے مستحق ٹھہریں گے۔ کسی ظالم و نامنصف آقا سے محبت کرنا انسانی فطرت کے بالکل خلاف ہے۔

۳۔ تیسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ کے انعامات و احسانات پر غور کرنے سے فطرت میں اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کا جو تقاضا ابھرتا ہے اس کی بنیاد شکر پر ہے۔ یہ شکر اس صورت میں لازم ہوتا ہے جب ہم یہ مانیں کہ یہ منعم کا حق اور اس کے انعام کا مقتضا ہے۔ یہی رمز ہے کہ قرآن میں شرک کو ظلم اور ایمان کو شکر قرار دیا گیا ہے۔ اسی اصول پر تمام حقوق کے استحقاق کی بنیاد عدل کے وجوب پر رکھی گئی ہے۔ یہ شریعت اور قانون کی ایک بدیہی حقیقت ہے۔ اس وجہ سے ہر شریعت کی اساس و بنیاد قسط ہے۔

۴۔ چوتھا یہ کہ ایمان کا ثمرہ اطاعتِ الٰہی ہے اور اطاعت کا ثمرہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی۔ اللہ تعالیٰ نے ہر گوشے میں افعال اور ان کے اثرات میں یہ رشتہ اپنے خلق و تدبیر اور اپنے امر و حکم سے قائم کر رکھا ہے اور مختلف طریقوں سے اس حقیقت کی طرف ہماری رہنمائی فرمائی ہے اور ہم چونکہ اعمال کے ان نتائج پر پورا اعتماد رکھتے ہیں اس وجہ سے اس کے وعدے پر بھروسہ رکھتے ہوئے اس کی اطاعت کرتے ہیں۔ اگر اس بات پر ہمارا ایمان نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کر سکتا تو تمام اعمال کی بنیاد ہی ڈھے جائے گی اور پھر سارا اعتماد دو چیزوں میں سے کسی ایک چیز پر رہ جائے گا یا تو نصاریٰ کی طرح جھوٹی شفاعت پر جن کا سارا اعتماد حضرت مسیحؑ پر ہے، جن کو معبود بنا کر وہ ان کی عبادت کرتے اور جن سے خدا سے بڑھ کر محبت کرتے ہیں یا پھر یہود کی طرح کامل سرگشتگی اور ناعاقبت بینی پر۔ انھوں نے ہوا کے رُخ پر اپنی کشتی چھوڑ دی، اپنے تکبر اور حسد کے سبب سے وہ خدا کے فیصلے پر راضی نہ ہوئے، گویا ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے ہاں نیک اور بد میں امتیاز کے لیے کوئی ضابطہ ہی نہیں ہے۔ اس ضلالت سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ اس بات پر پورا یقین رکھا جائے کہ اللہ تعالیٰ قائم بالقسط ہے، اس کا ہر حکم عدل اور اس کا ہر وعدہ سچا ہے۔ جیسا کہ اس نے فرمایا ہے۔ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا

ان چاروں پہلوؤں پر جو شخص بھی غور کرے گا اس پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے گی کہ ایمان بالقسط ایمان کے نہایت اہم ارکان میں سے ہے اور اس پر عقاید، اخلاق اور شرائع کے نہایت بنیادی مسائل مبنی ہیں۔

۷۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۲۳-۲۷

پہلے ان منکرین قرآن کی حالت پر تعجب کا اظہار کیا ہے کہ اہل کتاب ہونے کی وجہ سے ان سے توقع تو اس بات کی تھی کہ جس کتاب کا ایک حصہ ان کو دیا گیا تھا لیکن اپنی بدبختی سے اس کو انھوں نے ضائع کر دیا اس کو از سرِ نو اس کی مکمل صورت میں پا کر اس کی قدر کریں گے اور اس کی روشنی میں اپنے تمام اختلافات رفع کر کے نئے سرے سے عدل و حق کی راہ اختیار کریں گے لیکن انھوں نے حسبِ عادت اعراض ہی کی روش اختیار کی۔

اس کے بعد ان کے اس اعراض کے ایک نہایت اہم سبب کا سراغ دیا ہے کہ یہ اپنے آپ کو ایک برگزیدہ امت سمجھنے کی وجہ سے یہ غلط عقیدہ ایجاد کر بیٹھے ہیں کہ یہ دوزخ کے عذاب سے ہر شکل محفوظ ہیں، اول تو یہ دوزخ میں ڈالے ہی نہیں جائیں گے اور اگر ڈالے بھی گئے تو بس سرسری طور پر کچھ سزا بھگت کر اس سے نجات پا جائیں گے۔ یہ عقیدہ ان کی ایک من گھڑت ایجاد ہے جس کو حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن اسی خود فریبی نے اُن کو ان کے دین سے بالکل غافل کر دیا ہے حالانکہ ایک دن

رتی رتی کا حساب ہونا ہے۔ اس دن ان کی آنکھیں کھلیں گی کہ ان کا سارا کیا دھرا ان کے سامنے موجود ہے اور خدا کی میزان نے نہ ان کے ساتھ کوئی رعایت کی ہے اور نہ کوئی کمی۔

اس کے بعد اس امر کا اعلان ہے کہ یہ یہود و نصاریٰ اب منصبِ امامت سے معزول ہوئے اور شریعتِ الٰہی کی یہ امانت اس امت کے سپرد کی جا رہی ہے جس کو خدا نے اس امانت کا اہل پایا ہے۔ مالک الملک خدا ہی ہے، وہ جس سے چاہے چھینے اور جس کو چاہے بخشے، عزت اور ذلت سب اسی کے ہاتھ میں ہے، رات کو دن میں داخل کرنا اور زندہ کو مردہ سے نکالنا اسی کا کام ہے۔ یہ بات خبر کے بجائے دعا کے اسلوب میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے واسطہ سے آپؐ کے صحابہؓ کو تلقین کی گئی ہے جس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ بارِ گراں اب جن کے کندھوں پر ڈالا جا رہا ہے وہ اس کو خدا کی امانت سمجھیں اور اس کے اٹھانے میں اسی کے سہارے کے طالب بنیں۔ اب اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمایئے۔

آیات ۲۳-۲۷

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يُدْعَوْنَ إِلَىٰ كِتَابِ اللَّهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلَّىٰ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ وَهُم مُّعْرِضُونَ ﴿٢٣﴾ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لَن تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ ۖ وَغَرَّهُمْ فِي دِينِهِم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿٢٤﴾ فَكَيْفَ إِذَا جَمَعْنَاهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيهِ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿٢٥﴾ قُلِ اللَّهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَن تَشَاءُ وَتَنزِعُ الْمُلْكَ مِمَّن تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَن تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَن تَشَاءُ ۖ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ۖ إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٢٦﴾ تُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ ۖ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ۖ وَتَرْزُقُ مَن تَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿٢٧﴾

ترجمۂ آیات ۲۳-۲۷

ذرا ان کو تو دیکھو جن کو کتابِ الٰہی کا ایک حصہ عطا ہوا، ان کو اللہ کی کتاب ہی کی طرف دعوت دی جا رہی ہے تاکہ ان کے درمیان فیصلہ کرے۔ پھر ان کا ایک گروہ منہ پھیر لیتا ہے اور یہ منہ پھیر لینے ہی والے لوگ ہیں۔ یہ اس سبب سے ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں تو دوزخ کی آگ بس گنتی کے چند دن چھوئے گی۔ یہ جو کچھ گھڑتے رہے ہیں اس نے ان کو ان کے دین کے بارے میں دھوکے میں ڈال دیا ہے۔ اس وقت کیا ہو گا جب ہم ان کو ایک ایسے دن کے لیے اکٹھا کریں گے جس کے آنے میں کوئی شک نہیں ہے اور ہر جان کو جو اس نے کمائی کی ہو گی پوری کی جائے گی، ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ ۲۳-۲۵۔

دعا کرو، اے اللہ، بادشاہی کے مالک، تو ہی جس کو چاہے بادشاہی دے، جس سے چاہے بادشاہی چھینے اور تو ہی جس کو چاہے عزت بخشے اور جس کو چاہے ذلت دے، تیرے ہی ہاتھ میں خیر ہے۔ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔ تو، رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور ظاہر کرتا ہے زندہ کو مردہ سے اور ظاہر کرتا ہے مردہ کو زندہ سے اور تو جس پر چاہتا ہے اپنا بے حساب فضل کرتا ہے۔ ۲۶-۲۷

۸۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ اُوۡتُوۡا نَصِیۡبًا مِّنَ الۡکِتٰبِ یُدۡعَوۡنَ اِلٰی کِتٰبِ اللّٰہِ لِیَحۡکُمَ بَیۡنَہُمۡ ثُمَّ یَتَوَلّٰی فَرِیۡقٌ مِّنۡہُمۡ وَ ہُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ (۲۳)

'اَلَمۡ تَرَ' کے خطاب کی نوعیت

'اَلَمۡ تَرَ' کے خطاب پر ہم سورہ بقرہ میں لکھ چکے ہیں۔ ہر جگہ اس کو واحد کے معنی میں لینا صحیح نہیں ہے، اس کا خطاب جماعت سے بھی ہوتا ہے، گویا فرداً فرداً جماعت کا ہر فرد مخاطب ہوتا ہے۔ پھر یہ محض ایک سادہ خطاب ہی نہیں ہے بلکہ یہ فی الجملہ اظہارِ تعجب کا مفہوم بھی اپنے اندر رکھتا ہے۔

قرآن اور دوسرے آسمانی صحیفوں میں نسبت جزو کل کی ہے

'نَصِیْبًا مِّنَ الْکِتٰبِ' سے مراد تورات اور انجیل وغیرہ ہیں اور کتاب اللہ سے مراد قرآن مجید ہے جس طرح پچھلے آسمانی مذاہب اور شریعتِ اسلامی میں نسبت جزو اور کل کی ہے اسی طرح دوسرے آسمانی صحیفوں اور قرآن میں بھی نسبت جزو اور کل کی ہے۔ اللہ کی شریعت انسانی ذہن اور انسانی معاشرہ کے تدریجی ارتقا کے لحاظ سے درجہ بدرجہ عطا ہوئی ہے۔ جب تک انسان، کامل شریعت اور کامل کتاب کا اہل نہیں ہوا تھا اس وقت تک اس کو کامل شریعت اور کامل کتاب نہیں دی گئی بلکہ اس کے حالات اور اس کی ضروریات کے مطابق کتاب دی گئی لیکن یہ کتاب اصلاً اس کامل شریعت اور اس کامل کتاب ہی کا ایک حصہ تھی جو اس کے لیے پہلے سے خدا کی اسکیم میں مقرر تھی۔ انبیائے بنی اسرائیل نے جو تعلیم دی وہ خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے کوئی الگ چیز نہیں بلکہ اسی تعلیم کا اتنا حصہ تھا جو ان کے دور اور ان کے حالات کے لیے موزوں تھا، اسی طرح تورات اور انجیل قرآن مجید سے کوئی الگ چیز نہیں ہیں بلکہ اسی صحیفۂ کامل کے یہ وہ اوراق تھے جو آخری امت سے پہلے کی امتوں کے لیے نازل ہوئے۔ اس طرح گویا تمام آسمانی کتابیں ایک ہی کتابِ الٰہی کے مختلف حصے اور مختلف ابواب کی حیثیت رکھتی ہیں، اصلاً اور نظرتاً ان میں کامل ہم آہنگی و ہم رنگی ہے۔ اگر تورات اور انجیل میں ملاوٹ اور تحریف نہ واقع ہوئی ہوتی تو ان کی تعلیم اور قرآن کی تعلیم میں اجمال و تفصیل اور آغاز و تکمیل کے سوا کوئی فرق نظر نہ آتا تاہم آج بھی ایک صاحب نظر آسانی سے یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ سب صحیفے ایک ہی مشکوٰۃِ علم و معرفت کے انوار اور ایک ہی شجرۂ طوبیٰ کے برگ و بار ہیں۔ اس باہمی یک رنگی کی وجہ سے ان لوگوں کے لیے جو تورات و انجیل کو جانتے اور مانتے ہوں قرآن کا پہچاننا کچھ مشکل نہ تھا بشرطیکہ انھوں نے اپنی آنکھوں پر تعصب اور ضد کی پٹیاں نہ باندھ رکھی ہوتیں، جس کتاب کے ابتدائی ابواب انھوں نے پڑھے ہوں، جس کے انداز، اسلوب اور مزاج سے آشنا ہوں، جس کی ہدایات و تعلیمات کا ابتدائی عکس اور خاکہ انھوں نے دیکھا ہو، جس کی پیشین گوئیوں سے وہ باخبر اور ان کے مصداق کے وہ منتظر ہوں، یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ کتاب عزیز جب اپنے اصلی جمال و کمال کے روپ میں نمایاں ہو تو وہ اس کو نہ پہچان سکیں، پھر کس قدر تعجب کی بات ہے کہ اہل کتاب نے اس سے منہ موڑا اور جان کر اس سے انجان بن گئے!

قرآن کی ضرورت رفعِ اختلاف کے پہلو سے

'لِیَحْکُمَ بَیْنَھُمْ' یہ قرآن کا وہ مقصد بیان ہوا جو اہل کتاب کو، اگر وہ اللہ کی شریعت کے قدر دان ہوتے تو بہت عزیز ہونا تھا۔ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت کے لیے تورات اور انجیل اتاری تھیں لیکن انھوں نے ان میں بہت سے اختلافات پیدا کر دیے اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو فرقان بنا کر اتارا تاکہ یہ تمام اختلافات کا فیصلہ کر کے اصل حق کو پھر واضح کر دے۔ اسی بات کو یہاں پھر دہرایا ہے کہ اس کتاب کی طرف جو ان کو بلایا جا رہا ہے تو اس لیے نہیں کہ اس میں بلانے والے کا کوئی فائدہ ہے بلکہ سر تا سر انھی کا فائدہ ہے۔ ان کو اس لیے بلایا جا رہا ہے کہ خدا کی شریعت میں انھوں نے جو اختلافات

پیدا کر دیے ہیں وہ رفع ہوں اور جو ہدایت انھوں نے گم کر دی تھی اس سے پھر بہرہ مند ہوں۔

ثُمَّ یَتَوَلّٰی فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۔ 'ثُمَّ' یہاں استعجاب کے مفہوم میں ہے اور فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ سے مقصود یہ ظاہر کرنا نہیں ہے کہ اہل کتاب کا ایک قلیل گروہ اس کتاب الٰہی سے منہ موڑ رہا ہے، اس لیے کہ اس جرم کے مرتکب تو اہل کتاب من حیث الجماعت ہوئے تھے، ان کے اندر سے صرف تھوڑے سے لوگ نکلے، جیسا کہ قرآن کے دوسرے مقامات سے واضح ہے، جو اسلام لانے والے بنے، بلکہ اس میں اصلی زور مِنْهُمْ کے لفظ پر ہے یعنی تعجب کا اظہار اس بات پر ہے کہ یہ منہ موڑنے والا گروہ ان اہل کتاب کا ہے جو سب سے زیادہ سزاوار اس بات کے تھے کہ سب سے پہلے اس پر ایمان لانے والے بنتے لیکن وہ ایمان کی راہ میں سبقت کرنے کے بجائے کفر کی راہ میں سبقت کرنے والے بنے۔

یہود کا جماعتی مزاج

آخر میں 'وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ' سے اہل کتاب کے اصل جماعتی مزاج پر روشنی ڈال دی کہ حق سے ان کا یہ اعراض کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ ہمیشہ سے ان کی روش یہی رہی ہے۔ اس فقرے میں اہل کتاب کے لیے سخت ملامت کا پہلو بھی ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسکین و تسلی کا بھی۔ مطلب یہ ہے کہ حق سے اعراض جن کی فطرت ثانیہ اور جن کا قومی مزاج بن چکا ہو ان کے دل میں اگر حق نہیں اترتا تو اس میں قصور تمھارا یا حق کا نہیں ہے بلکہ ان کے فساد مزاج کا ہے۔ پتھر میں جونک کہاں لگی ہے!

جو لوگ بنی اسرائیل کی تاریخ سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ سے لے کر سیدنا مسیحؑ تک بلا استثنا ہر پیغمبر نے ان کے مزاج پر ماتم کیا ہے۔ اگر طوالت کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہم انبیائے بنی اسرائیل کے صحیفوں سے اس کی مثالیں پیش کرتے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ وَغَرَّهُمْ فِیْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (۲۴)

یہ مضمون سورۂ بقرہ میں بھی گزر چکا ہے۔ وہاں ہم اس کے ہر پہلو کی وضاحت کر چکے ہیں۔ وہاں ارشاد ہوا ہے کہ وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ط قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۸۰-۸۱ بقرہ (اور وہ کہتے ہیں کہ ہمیں تو دوزخ کی آگ نہیں چھوئے گی مگر گنتی کے چند دن، ان سے پوچھو کہ کیا تم نے اللہ سے عہد کرا لیا ہے تو اللہ اپنے عہد کے خلاف نہیں کرے گا یا تم اللہ پر ایک تہمت باندھ رہے ہو جس کے بارے میں تمھارے پاس کوئی علم نہیں۔ اصل معاملہ تو یوں ہے کہ جس نے گناہ کی کمائی کی اور اس کے اس گناہ نے اس کو اپنے لپیٹ میں لے لیا تو یہی لوگ دوزخ والے ہیں، یہ اس میں ہمیشہ رہیں گے)

بقرہ میں یہ آیت بنی اسرائیل کی ان جھوٹی آرزوؤں (امانی) کے ضمن میں وارد ہے جن کو کوئی سند

یہود کی جھوٹی آرزوؤں کی ایک مثال

ان کے دین میں موجود نہیں تھی۔ ان کے علماء نے محض اپنے جی سے گھڑ کر ان کو اپنی شریعت کا جزو بنا دیا تھا اور دل پسند ہونے کی وجہ سے یہ بدعتیں ان کے عوام کے دلوں میں اس طرح راسخ ہو گئی تھیں کہ اب ان کا سارا تکیہ انہی جھوٹی آرزوؤں پر رہ گیا تھا۔ ازاں جملہ ان کا یہ من گھڑت عقیدہ بھی تھا کہ بنی اسرائیل چونکہ برگزیدہ امت ہیں اس وجہ سے ان کے اعمال خواہ کچھ بھی ہوں لیکن ان کے لیے دائمی عذابِ نار نہیں ہے، اوّل تو یہ دوزخ میں ڈالے ہی نہیں جائیں گے اور اگر ڈالے گئے بھی تو بس تھوڑی بہت اپنے گناہوں کی سزا بھگت کر چھوٹ جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ عقیدہ ایجاد کر لینے کے بعد دین کی اصلی ذمہ داریوں کو سوچنے سمجھنے کی ان کو کوئی ضرورت ہی باقی نہیں رہ گئی تھی، پھر وہ اس قرآن کی طرف کیوں توجہ کرتے جو ان کو اس جنت الحمقا سے نکال کر ان کو رو در رو ان کی ان ذمہ داریوں کے آگے کھڑا کرنا چاہتا تھا جو ان پر فی الواقع ان کے دین کی رُو سے عاید ہوتی تھیں۔ قرآن نے واضح کیا کہ ان کا یہ عقیدہ 'افتراء علی اللّٰہ' یعنی اللّٰہ تعالیٰ کے اوپر ایک تہمت اور ایک بہتان ہے۔ اس نے کہیں بھی بنی اسرائیل کو یہ لائسنس نہیں دیا ہے کہ وہ جو چاہیں کرتے رہیں، بس چند دن کی سزا کے بعد وہ جنت میں پہنچ جائیں گے۔ ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ درحقیقت ان کی اسی قسم کی من گھڑت بدعات و خرافات ہیں جن میں مبتلا ہو جانے کے سبب سے وہ اپنے دین کے معاملے میں دھوکے میں پڑے ہیں۔ اب ان کا دین ان کی چند دل پسند آرزوؤں اور ان کے چند دلفریب خوابوں کا ایک مجموعہ بن کر رہ گیا ہے جن میں ان کے لیے خدا کے ہاں حقوق تو بے شمار ہیں، ایک سے ایک بڑھ کر، لیکن یہ ان کے اوپر چند رسوم کے سوا کوئی ذمہ داری عاید نہیں کرتا۔

فَكَيْفَ اِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۣ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَھُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (۲۵)

یعنی یہ تو یہ امیدیں لگائے بیٹھے ہیں اور آخرت سے متعلق یہ لذیذ خواب دیکھ رہے ہیں لیکن اس وقت کیا بنے گا جب ہم ان کو ایک ایسے یوم الفصل کے احوال و نتائج دیکھنے کے لیے جمع کریں گے جو اس کائنات کی ایک اٹل حقیقت ہے اور جس کے پیش آنے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے؟ ہمارے نزدیک لام یہاں 'فی' کے معنی میں بھی ہو سکتا ہے، اس لیے کہ اس کے اندر ظرفیت کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔ اور عربی زبان کے قواعد کی رُو سے اس بات کی بھی گنجائش ہے کہ یہاں حرفِ جر کے بعد ایک مضاف محذوف مان لیا جائے۔ ہم نے اسی دوسرے پہلو کو سامنے رکھ کر آیت کی وضاحت کی ہے۔

اس دن کی ایک خصوصیت تو یہ بیان ہوئی کہ اس کے آنے میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے۔ دوسری یہ کہ اس دن ہر نفس کو اس کی کمائی پوری کی جائے گی، کسی کے ساتھ کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔ مطلب یہ ہے کہ اب یہ اہل کتاب خود سوچ لیں کہ آج ایک من گھڑت عقیدے میں مبتلا ہو کر یہ جس خوابِ خوش کے مزے لے رہے ہیں اس سے بیدار ہونے کے بعد انھیں کس حقیقت سے دوچار ہونا ہے۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاۗءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاۗءُ ۡ وَتُعِزُّ مَنْ

تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ؕ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ۝ تُوْلِجُ الَّيْلَ فِى النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِى الَّيْلِ ۡ وَتُخْرِجُ الْحَىَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَىِّ ۡ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ (۲۶-۲۷)

امت مسلمہ کے لیے ایک عظیم بشارت دعا کے اسلوب میں

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کے واسطے سے پوری امت کو ایک دعا تلقین کی گئی ہے جو مندرجہ ذیل امور پر مشتمل ہے۔

۱۔ پہلی چیز وہ عظیم بشارت ہے جو اس امت کے لیے اس کے اندر مضمر ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ یہ دعا در پردہ اشارہ کر رہی ہے کہ اہل کتاب کی ضد اور ان کے حسد کے علی الرغم امامت و سیادت کا وہ منصب جس پر بنی اسرائیل اب تک فائز رہے ہیں اب وہ بنی اسمٰعیل کی طرف منتقل ہو رہا ہے اور بنی اسرائیل کی کوئی مخالفت خدا کے اس فیصلہ کو تبدیل نہیں کر سکتی۔ اپنے ملک کا مالک خدا ہے، جس کو چاہے وہ ملک بخشے اور جس سے چاہے چھین لے، جس کو چاہے عزت دے، جس کو چاہے ذلت دے، خیر کے تمام خزانوں کا مالک وہی ہے۔ بنی اسرائیل یہ جو سمجھتے رہے ہیں کہ تمام خیر کے وارث و مورث وہی ہیں، کسی اور کے لیے، خاص کر بنی اسمٰعیل کے لیے، اس خیر میں کوئی حصہ نہیں ہے، اس دعا نے ان کے اس خیال باطل کی بساط الٹ دی۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ اب مالک کائنات نے اس خزانہ خیر کی کنجیاں بدعہدوں اور خائنوں سے چھین کر ان کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے جو اس امانت کے اہل ہیں۔

۲۔ اس بشارت کے ساتھ اس میں بنی اسرائیل کے لیے انذار بھی ہے اور یہ انذار درحقیقت مذکورہ بالا بشارت ہی کا قدرتی نتیجہ ہے۔ جب سیادت بنی اسمٰعیل کو حاصل ہو گی تو لازماً اس سیادت سے بنی اسرائیل محروم ہوں گے، جب بنی اسماعیل عزت سے سرفراز ہوں گے تو لازماً بنی اسرائیل کے لیے ذلت مقدور ہو چکی ہے۔ نصب و عزل، عزت و ذلت اور حیات و موت دونوں کا ذکر کر کے قرآن نے اپنے مخالفین اور موافقین دونوں کے لیے تقدیر کا فیصلہ سنا دیا۔

۳۔ اس میں اس امت کے لیے ایک عظیم نصیحت بھی ہے کہ اب یہ امانت جو تمھاری طرف منتقل ہو رہی ہے تو یہود کی طرح یہ نہ سمجھ بیٹھنا کہ یہ تمھارے استحقاق ذاتی کا کرشمہ یا تمھارے حسب و نسب کا ثمرہ ہے بلکہ یہ سرتاسر خدا کا فضل ہے جس کے تم اس وقت تک سزاوار قرار پاؤ گے جب تک اس کا حق ادا کرتے اور اس کی ذمہ داریوں کو اٹھانے کے معاملے میں برابر خدا سے دعا کرتے رہو گے۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوئی کہ یہ آیت درحقیقت یہود کے عزل کا اعلان اور امت مسلمہ کے نصب کی بشارت ہے، لیکن بات بجائے خبر اور بشارت کے دعا کے اسلوب میں کہی گئی ہے۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان آیات کے نزول کے وقت تک حالات ابھی پردے میں تھے اور جو چیز پردے میں ہو اس کے متعلق یہی اسلوب موزوں ہے کہ امت اس کے لیے دعا کرے، اور دوسری یہ کہ اس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ امت اس بشارت کو فخر اور غرور کے ساتھ نہ قبول کرے بلکہ تواضع، تذلل،

احساس عبدیت اور دعا کے ساتھ قبول کرے اس لیے کہ سارا اختیار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے، جو محروم ہوتا ہے وہ بھی خدا ہی کے حکم سے محروم ہوتا ہے اور جو پاتا ہے وہ بھی خدا ہی کے ہاتھ سے پاتا ہے۔

بشارت کے دعائیہ اسلوب میں ظاہر ہونے کی بعض اور نہایت بلیغ مثالیں بھی قرآن میں موجود ہیں۔ مثلاً ہجرت کے حکم سے ذرا پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دعا سکھائی گئی۔

وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ	اور دعا کرو کہ اے رب مجھے داخل کر عزت کے
وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ	ساتھ اور مجھے نکال عزت کے ساتھ اور مجھے خاص
مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا ○ وَقُلْ جَآءَ	اپنے پاس سے نصرت کا پروانہ عطا فرما۔ اور یہ اعلان
الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ	کر دو کہ حق آگیا اور باطل نابود ہوا اور باطل نابود ہونے
كَانَ زَهُوْقًا (۸۰-۸۱- بنی اسرائیل)	ہی کے لیے ہے۔

اس دعا میں ہجرت کی خبر بھی ہے اور ساتھ ہی اس بات کی بشارت بھی کہ آپ کا مکہ سے نکلنا اور دار الہجرت میں داخل ہونا دونوں عزت کے ساتھ ہوگا اور آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حفاظت کے لیے خاص بدرقہ اور نصرت کا خاص پروانہ عطا ہوگا بلکہ اس میں ایک لطیف بشارت اس بات کی بھی ہے کہ آپ کے پُروقار داخلہ کا انتظام آپ کے نکلنے سے پہلے ہی ہو چکا ہے۔ اس کا اشارہ اس بات سے ہو رہا ہے کہ دعا میں داخل ہونے کا ذکر نکلنے کے ذکر پر مقدم رکھا گیا ہے بلکہ زیادہ تدبر سے کام لیجیے تو یہ بات بھی آیت سے نکلتی ہے کہ ہجرت درحقیقت فتح کا دیباچہ اور غلبۂ حق کا مقدمہ ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کو خبر اور بشارت کے اسلوب میں کہنے کے بجائے دعا کے اسلوب میں کہا گیا ہے اور اس میں حکمت وہی ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔

نظامِ تکوینی کی شہادت

'تُوْلِجُ الَّیْلَ' الآیہ میں اسی بات پر جو اوپر والی آیت میں مذکور ہوئی اس کائنات کے نظامِ تکوینی کی شہادت کا حوالہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو خدا رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور رات کے بعد دن کو نمودار کرتا ہے، جو مردہ سے زندہ کو اور زندہ سے مردہ کو ظاہر کرتا ہے اس کے سوا دنیا میں عزل و نصب اور عزت و ذلت کا اختیار ہو بھی کیسے سکتا ہے!

یہ دن کو رات میں داخل کرنا اور رات کو دن میں داخل کرنا رات کے بعد دن اور دن کے بعد رات کے آمد و شد کی نہایت خوب صورت تشبیہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے دونوں ایک دوسرے کا پوری سرگرمی سے تعاقب کر رہے ہیں، کبھی رات دن کے اندر گھس جاتی ہے، کبھی دن رات کے اندر چھپ جاتا ہے، یہ چکر پورے تسلسل کے ساتھ چل رہا ہے۔ قرآن میں یہ تشبیہ مختلف اسلوبوں سے بیان ہوئی ہے۔ اسی طرح موت سے زندگی اور زندگی سے موت کے ظاہر ہونے کے نشانات بھی ہر گوشے میں نمایاں ہوتے رہتے ہیں، مادیات میں بھی، معنویات میں بھی۔ یہ ایک لطیف تعریض اس صورتِ حال پر بھی ہے جو بنی اسرائیل کی موت

اور بنی اسماعیل کی زندگی سے نمایاں ہو رہی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ نے جو پودا فلسطین کی سرسبز و شاداب زمین میں لگایا تھا اب وہ سوکھ چکا تھا اور جیسا کہ حضرت یحییٰؑ نے فرمایا، اس کی جڑ پر کلہاڑا رکھا ہوا تھا۔ اس کے برعکس انھوں نے جو پودا عرب کی خشک اور بنجر زمین میں لگایا تھا اور جو مرجھایا ہوا پڑا تھا اب اس میں شگوفے نکل رہے تھے اور جیسا کہ حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا، وہ ایک تناور درخت بن کر ایک عالم کو اپنے سائے کی پناہ میں لینے والا تھا۔

'بغیر حساب' کے دو مفہوم

'وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَاۗءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ' رزق یہاں فضل و انعام کی تعبیر ہے، روزی کے محدود مفہوم میں نہیں ہے۔ بِغَيْرِ حِسَابٍ یہاں دو مفہوموں پر مشتمل ہے۔ ایک کثرت کے مفہوم پر یعنی وہ جس کو چاہتا ہے بے اندازہ فضل و انعام سے نوازتا ہے جس کی کوئی حد و نہایت نہیں، جیسا کہ فرمایا ہے۔ وَاِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ (صابروں کو ان کے صبر کا بے حساب اجر ملے گا) دوسرے بے سان گمان کے مفہوم پر، جیسا کہ فرمایا ہے وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۳۔ طلاق (اور اس کو وہاں سے روزی دے گا جہاں سے اس کو گمان بھی نہ ہو گا)

۹۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۲۸-۳۲

اوپر کی آیات سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اب اہل کتاب کی حیثیت ایک اجڑے ہوئے گھر کی ہے جس کا ڈھے جانا مقدر ہو چکا ہے اس وجہ سے آگے کی آیات میں ان کمزور اور مبتلائے نفاق مسلمانوں کو جو اہل کتاب بالخصوص یہود کی طرف میلان رکھتے تھے متنبہ فرمایا کہ اب ان سے موالات رکھنا ایک اجڑے ہوئے گھر کی دربانی ہے اور اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ جب وہ گھر گرے تو اس کے نیچے وہ لوگ بھی دب کے رہ جائیں جو اس کی دیواروں کے نیچے سائے کی تلاش میں گئے ہیں۔

اس کے بعد ان کے اس نفاق پر تنبیہ فرمائی کہ اگر ان کے دلوں میں کفر اور اہل کفر کی محبت چھپی ہوئی ہے تو وہ یہ یاد رکھیں کہ خدا سے کوئی چیز بھی ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ وہ ہر چیز کو جانتا ہے، ایک دن آئے گا جب ہر شخص کے سامنے اس کا سارا کھلا چھپا آجائے گا، اس دن خدا کا عدل ظاہر ہو گا اور ہر شخص اس کا مزا چکھے گا۔ اللہ تعالیٰ چونکہ اپنے بندوں پر غایت درجہ مہربان ہے اس وجہ سے وہ پہلے سے اس دن سے آگاہ کر رہا ہے۔

پھر ایمان اور محبتِ الٰہی کا صحیح تقاضا واضح فرمایا کہ جو لوگ اللہ پر ایمان اور اس کی محبت کے مدعی ہوں ان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے مخالفوں سے موالات رکھیں بلکہ ان کے لیے صحیح روش یہ ہے کہ وہ اللہ کے رسول کی پیروی کریں، جو لوگ ایسا کریں گے خدا بھی ان سے محبت کرے گا۔ یہی راہ خدا کے محبوب بننے کی راہ ہے۔ جو لوگ اس کے خلاف روش اختیار کریں گے وہ

درحقیقت کافر ہیں اور اللہ تعالیٰ کافروں سے محبت نہیں رکھتا۔

اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۸-۳۲

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكٰفِرِينَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ۭ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿٢٨﴾ قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ ۭ وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿٢٩﴾ يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۚ وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْۗءٍ ۚ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗٓ اَمَدًۢا بَعِيْدًا ۭ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۭ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿٣٠﴾ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٣١﴾ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٣٢﴾

معانقہ — ع ۳ / ۱۱

ترجمۂ آیات ۲۸-۳۲

اہل ایمان مومنوں کے برخلاف کافروں کو اپنا دوست نہ بنائیں اور جو ایسا کریں گے تو اللہ سے ان کو کوئی تعلق نہیں، مگر یہ کہ تم اُن سے بچو جیسا بچنے کا حق ہے، اللہ تمھیں اپنی ذات سے ڈراتا ہے اور اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے، کہہ دو کہ جو کچھ تمھارے دلوں میں ہے اس کو چھپاؤ یا ظاہر کرو، اللہ اس سے باخبر ہے اور وہ اس سب کو جانتا ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جس دن ہر جان اپنی کی ہوئی نیکی کو اپنے سامنے موجود پائے گی اور جو برائی کی ہو گی اس کو بھی موجود

پلائے گی اور وہ آرزو کرے گی کہ کاش اس کے اور اس کے درمیان ایک زمانہ دراز حائل ہوتا اور اللہ اپنی ذات سے تمھیں ہوشیار کرتا ہے، اللہ اپنے بندوں کے ساتھ بڑا مہربان ہے۔ ۲۸-۳۰

کہہ دو، اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم کو دوست رکھے گا اور تمھارے گناہوں کو بخشے گا، اللہ بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔ کہہ دو کہ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی، اگر یہ اعراض کریں تو یاد رکھیں کہ اللہ کافروں کو دوست نہیں رکھتا۔ ۳۱-۳۲

۱۰- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْکٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۚ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ فَلَیْسَ مِنَ اللّٰہِ فِیْ شَیْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْھُمْ تُقٰىۃً ۭ وَیُحَذِّرُکُمُ اللّٰہُ نَفْسَہٗ ۭ وَاِلَی اللّٰہِ الْمَصِیْرُ (۲۸)

آیت ۲۸ میں 'مومنین' سے مراد مذبذب مسلمان اور 'کافرین' سے مراد یہود ہیں

"مُؤْمِنُوْنَ" کا لفظ اگرچہ بظاہر عام ہے لیکن مراد اس سے خاص طور پر وہ مسلمان ہیں جو ابھی پوری طرح یکسو نہیں ہوئے تھے بلکہ کچھ اپنے ذاتی مصالح کی وجہ سے اور کچھ اسلام کے مستقبل کے بارے میں، جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، غیر مطمئن ہونے کے باعث، یہود کی طرف میلان رکھتے تھے، اور یہود اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو سازشیں کرتے تھے اس میں وہ ان کو آلۂ کار بنا لیتے تھے اور یہ ان کے آلۂ کار بن جاتے تھے۔ ان کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اب یہود کے ساتھ موالات اور دوستی اُجڑے گھر کی دربانی بھی ہے اور یہ حرکت ایمان و اسلام کے دعوے کے منافی بھی ہے۔

"کَافِرِیْنَ" سے یہاں مراد اہل کتاب خاص طور پر یہود ہیں جیسا کہ آیت ۲۱ میں ان کے کفر کی تصریح گزر چکی ہے۔

کفار سے مسلمانوں کے برخلاف موالات ناجائز ہے

"وَلِیّ" کے معنی کارساز، حمایتی، ساتھی، دوست اور مددگار کے ہیں جس کی طرف ضرورت کے وقت رجوع کیا جائے اور جس کا حمیت و حمایت کے جذبے سے ساتھ دیا جائے۔ فرمایا کہ مسلمانوں کے لیے جائز نہیں کہ وہ کافروں کو اپنا ولی بنائیں لیکن اس کے ساتھ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ کی قید ہے یعنی کافروں کے ساتھ صرف اس قسم کی موالات ناجائز ہے جو مسلمانوں کے بالمقابل یا ان کے مفاد و مصالح کے خلاف ہو۔ اسلام اور مسلمانوں کا حق اور مفاد دوسرے تمام حقوق و مفادات پر مقدم ہے اس وجہ سے مسلمانوں کی کسی جماعت کے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے مفاد و مصالح کے برخلاف کفار کی کسی جماعت کے ساتھ موالات

کا تعلق قائم کرے۔ اس قید نے یہ بات واضح کر دی کہ غیر حربی کفار کے ساتھ اس نیکی، عدل اور احسان کی ممانعت نہیں ہے جس کی اسلام نے تمام بنی نوع انسان کے معاملے میں ہدایت فرمائی ہے۔ مسلمان غیر مسلم قوموں اور حکومتوں کے ساتھ دوستانہ سیاسی و اقتصادی معاہدے بھی کر سکتے ہیں بشرطیکہ وہ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ نہ ہوں۔ اس مسئلے پر تفصیلی بحث ہم آگے موزوں مقام پر کریں گے۔

اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا الآیۃ کا صحیح مفہوم

اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً (مگر یہ کہ ان سے بچو جیسا کہ بچنے کا حق ہے) تُقٰىةً، جس طرح اسی سورہ کی آیت ۱۰۲ اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ میں مفعول مطلق کے طور پر استعمال ہوا ہے اسی طرح یہاں بھی مفعول مطلق ہے جس سے فعل کی تاکید ظاہر ہو رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو مسلمان اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کفار سے موالات کا تعلق رکھتے ہیں ان کا اللہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس قسم کے لوگ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا ہے وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ انہی لوگوں کے اندر شامل ہیں جن سے یہ موالات رکھتے ہیں۔ اللہ اور اعداء اللہ دونوں کے ساتھ بیک وقت دوستی قائم نہیں رکھی جا سکتی، اللہ سے دوستی کے لیے ضروری ہے کہ ان لوگوں سے اپنا دامن بچا کے رکھو جو اللہ کے، اس کے دین کے اور اس کے وفادار بندوں کے دشمن ہیں[1]۔ یہ جملہ گویا لَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ سے استثنا ہے یعنی اس نفی سے مستثنیٰ صرف وہی ہیں جو ان کفار کی مخالفِ اسلام موالات سے اس طرح بچیں جس طرح اس سے بچنے کا حق ہے۔ اس آیت سے جن لوگوں نے تقیہ کا جواز نکالا ہے انھوں نے لغت، نظائرِ قرآن اور سیاق و سباق ہر چیز کو نظر انداز کیا ہے لیکن صحیح تاویل واضح ہو جانے کے بعد اب اس کی تردید کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

منافقین کے لیے تنبیہ کا ایک خاص پہلو

وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ (اور اللہ تمھیں اپنی ذات سے ہوشیار کرتا ہے) میں منافقین کے لیے تنبیہ کا ایک خاص پہلو ہے۔ وہ یہ کہ اللہ کی کریمی سے دھوکے میں پڑ کے اس کی ذات کے دوسرے پہلوؤں کو نظر انداز نہ کر جاؤ۔ وہ اگر شرارتوں سے درگزر کرتا ہے، سازشوں کو نظر انداز کرتا ہے اور ریشہ دوانیوں کا فوراً نوٹس نہیں لیتا تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ یہ جرائم اس کے نزدیک جرائم نہیں یا وہ ان جرائم پر گرفت نہیں کر سکتا بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ بندوں کو آخری حد تک مہلت دیتا ہے۔ یہ مہلت بہرحال مہلت ہے جو ایک دن ختم ہونی ہے۔ اس کے بعد اس کا عدل ظہور میں آئے گا اور یہ عدل بھی اس کی ذات ہی کا ایک پہلو ہے۔ یہ اگر ابھی ظہور میں نہیں آیا ہے تو اس سے کوئی یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ یہ ظہور میں آئے گا ہی نہیں۔ خدا کے کاموں میں دیر ہے اندھیر نہیں، جب اس کی ذات کا یہ پہلو سامنے آئے گا

---

[1] اس موقع پر قرآن مجید کی یہ آیت بھی پیشِ نظر رہے: لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ (المجادلۃ - ۵۸: ۲۲) تم کوئی ایسی قوم نہیں پا سکتے جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتی ہو، پھر وہ ان لوگوں سے دوستی رکھے جو اللہ اور اس کے رسول سے دشمنی رکھتے ہیں۔

تو ہر شخص پر کھل جائے گا کہ اس سے زیادہ زور آور، اس سے زیادہ بے لاگ اور اس سے بڑا منتقم و قہار کوئی بھی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے اسی پہلو سے یہاں ہوشیار کیا ہے اور آگے واضح ہوگا کہ بارہا ہوشیار کیا ہے۔ ایک دوسری جگہ فرمایا ہے۔ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ (اے انسان تجھ کو تیرے رب کریم کے بارے میں کس چیز نے دھوکے میں ڈال رکھا ہے) اس میں بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

جن کمزور اور منافق قسم کے مسلمانوں کو یہاں تنبیہ فرمائی انھی کا ذکر اسی سورہ میں آگے بھی آ رہا ہے۔ اس سے اس آیت کے بعض مخفی گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ۭ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاۗءُ مِنْ اَفْوَاهِھِمْ ښ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُھُمْ اَكْبَرُ ۭ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ ھٰاَنْتُمْ اُولَاۗءِ تُحِبُّوْنَھُمْ وَلَا يُحِبُّوْنَكُمْ وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّھٖ ۚ وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا ڔ وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ۭ قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْھُمْ ۡ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِھَا ۭ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُھُمْ شَـيْـــًٔا ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ۝ (۱۱۸-۱۲۰- آل عمران)

اے ایمان والو، اپنے سے باہر والوں کو اپنا محرم راز نہ بناؤ، وہ تمھیں نقصان پہنچانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں گے، وہ تمھارے لیے زحمتوں کے آرزومند ہیں۔ ان کی زبانوں سے ان کی دشمنی آشکارا ہو چکی ہے اور جو کچھ ان کے دلوں میں ہے وہ اس سے بھی شدید ہے۔ ہم نے تمھیں واضح تنبیہات پہنچا دی ہیں، اگر تم سمجھنے والے لوگ ہو۔ تمھی ہو کہ ان سے محبت رکھتے ہو، وہ تم سے محبت نہیں رکھتے حالانکہ تم پوری کتاب پر ایمان رکھتے ہو۔ اور جب وہ تمھارے سامنے ہوتے ہیں تو کہتے ہیں ہم بھی ایمان لائے ہوئے ہیں اور جب وہ الگ ہوتے ہیں تو غصے سے تم پر انگلیاں کاٹتے ہیں، کہہ دو کہ تم اپنے اس غصے میں مر جاؤ، اللہ دلوں کے بھیدوں سے باخبر ہے۔ اگر تمھیں کوئی کامیابی حاصل ہوتی ہے تو انھیں بری لگتی ہے اور اگر کوئی گزند تمھیں پہنچ جائے تو اس سے خوش ہوتے ہیں۔ اگر تم ثابت قدم اور تقویٰ پر قائم رہے تو ان کی چالوں سے تمھیں کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔ اللہ ان کے اعمال کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ ۭ وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۚ وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْۗءٍ ۚ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗٓ اَمَدًۢا بَعِيْدًا ۭ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۭ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ (۲۹-۳۰)

'مَا فِیْ صُدُوْرِکُمْ' میں اشارہ ہے اس نفاق اور اہل کفر کی دوستی کی طرف جو یہ لوگ اپنے دلوں میں رکھتے تھے۔ فرمایا کہ اس کو چھپاؤ یا ظاہر کرو خدا سے کوئی چیز بھی چھپی نہیں ہے۔ وہ صرف تمہارے دلوں کے رازوں ہی سے نہیں بلکہ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے اور جو کچھ ہو رہا ہے، سب سے باخبر بھی ہے اور ہر چیز پر قادر بھی ہے۔ اس علم و قدرت کے باوجود اگر وہ ڈھیل دے رہا ہے تو اس لیے کہ اس نے جزا اور سزا کے لیے ایک خاص دن مقرر کر رکھا ہے جس میں ہر ایک کے سامنے اس کی نیکی اور بدی سب آجائے گی اور ایسے نتائج کے ساتھ سامنے آئے گی کہ جو لوگ اس ڈھیل سے دھوکے میں پڑ کر اس دن کو اتنا بعید سمجھ بیٹھے کہ اس کے لیے کسی فکر و اہتمام کی ضرورت ہی سے بےنچنت ہو گئے، وہ یہ آرزوئیں کریں گے کہ کاش ان کے اور ان کے ان نتائج اعمال کے درمیان ایک زمانۂ بعید کی دوری حائل ہو جائے۔

مَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ، کے بعد 'مُحْضَرًا' کا لفظ محذوف ہے۔ چونکہ پہلے ٹکڑے میں اس کا اظہار ہو چکا ہے اس وجہ سے دوسرے میں تکرار سے بچنے کے لیے اس کو حذف کر دیا۔ بَیْنَھَا وَبَیْنَہٗ میں پہلی ضمیر کا مرجع نفس، دوسری کا 'سوء محضر' ہے۔

وَیُحَذِّرُکُمُ اللّٰہُ نَفْسَہٗ ۚ وَاللّٰہُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ' رَءُوْفٌ ' کے لفظ پر ہم کہیں بحث کر آئے ہیں کہ اس میں دفع شر کا پہلو غالب ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ چونکہ اپنے بندوں پر غایت درجہ مہربان ہے، وہ ان کو ان کے اعمال کے نتائج بد سے بچانا چاہتا ہے اس وجہ سے وہ ان کو اپنی ذات سے بار بار ہوشیار کر رہا ہے کہ وہ اس کی ڈھیل سے کسی غلط فہمی میں نہ پڑیں۔ وہ ڈھیل تو بے شک دیتا ہے لیکن جب پکڑے گا تو اس کی پکڑ بھی بڑی سخت ہو گی۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ (۳۱-۳۲)

اہل ایمان کے لیے صحیح روش

یہ ان مذبذب قسم کے مسلمانوں کو اس صحیح رویے کی تعلیم دی گئی ہے جو سچے مسلم کی حیثیت سے انھیں اختیار کرنا چاہیے۔ فرمایا کہ اگر تم اللہ کے ساتھ محبت رکھنے کے مدعی ہو تو اس محبت کے ساتھ ان لوگوں کی محبت جمع نہیں ہو سکتی جو اللہ کے، اس کی کتاب کے اور اس کے دین کے دشمن ہیں بلکہ اس کا راستہ یہ ہے کہ اللہ کے رسول کی پیروی کرو۔ اگر تم رسول کی پیروی کرو گے تو یہی راستہ اللہ سے محبت کرنے کا ہے۔ اور اس کا انعام یہ ہے کہ اللہ بھی تم سے محبت کرے گا اور اب تک تم سے جو غلطیاں اور کمزوریاں صادر ہوئی ہیں ان کو معاف فرما دے گا۔ اللہ غفور رحیم ہے۔

اس کے بعد نہایت واضح الفاظ اور تہدید آمیز انداز میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ اعلان کرا دیا کہ ان کو خبردار کر دو کہ سیدھے سیدھے اللہ کی اور اس کے رسول کی اطاعت کریں اور اگر وہ

اس چیز سے اعراض کرتے ہیں تو یاد رکھیں کہ وہ بھی انھی کافروں میں شامل ہیں جن سے ان کا یارانہ ہے اور اس کے ساتھ اس بات کو بھی یاد رکھیں کہ اللہ کافروں کو کبھی دوست نہیں رکھتا۔

ان دونوں آیتوں میں بعض باتیں خاص طور پر ملحوظ رکھنے کی ہیں۔

ایک یہ کہ ان دونوں کا لب ولہجہ الگ الگ ہے۔ پہلی آیت میں شفقت ہے اور دوسری میں تنبیہ بلکہ تہدید۔ گویا درشتی و نرمی بہم در بہ است۔

دوسری یہ کہ ایمان کی اصل روح اللہ کی محبت ہے اور اس محبت کے لیے یہ شرط ہے کہ اس کے ساتھ کوئی ایسی محبت جمع نہ ہونے پائے جو اس کے ضد ہو۔

تیسری یہ کہ اللہ سے محبت کرنے کا واحد راستہ رسول کی پیروی ہے، اس سے ہٹ کر جو راستے نکالے گئے ہیں وہ سب بدعت و ضلالت ہیں۔

چوتھی یہ کہ خدا کی محبوبیت کا راستہ بھی رسولؐ کی پیروی ہی ہے۔ اگر کسی شخص کی زندگی رسولؐ کی سنت سے منحرف ہو اور وہ اس زعم میں مبتلا ہو کہ وہ خدا کا محبوب ہے یا دوسرے اس کو محبوبِ خدا سمجھیں تو یہ بالکل خبط ہے۔

پانچویں یہ کہ دین کا کم سے کم مطالبہ اللہ و رسول کی اطاعت ہے۔ اگر کوئی شخص یہ مطالبہ پورا کرنے سے اعراض اختیار کرتا ہے تو اس کا شمار دین کے منکروں میں ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں سے محبت نہیں رکھتا۔

۱۱۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۳۳-۴۴

آیت ۳۲ پر سورہ کی تمہید ختم ہوئی۔ اب آگے نصاریٰ کی بدعات کی تردید شروع ہو رہی ہے جو اس سورہ میں اصل مضمون کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا آغاز بھی ایک تمہید سے ہوا ہے۔ پہلے اس سلسلۂ رشد و ہدایت کا حوالہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کی رہنمائی کے لیے قائم فرمایا۔ اس ذیل میں حضرت آدمؑ، حضرت نوحؑ، آلِ ابراہیمؑ اور آلِ عمران کا ذکر ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیا کی امامت و ہدایت کے لیے منتخب فرمایا۔ اس زمرے میں آلِ عمران کا ذکر خاص طور پر سیدنا مسیحؑ کے ذکر کی گویا تمہید ہے اس لیے کہ اسی مبارک خاندان کی چشم و چراغ حضرت مریمؑ ہیں اور انھی حضرت مریمؑ کے بطن سے سیدنا مسیحؑ کی ولادت باسعادت ہوئی۔ مقصود حضرت آدمؑ سے لے کر آلِ ابراہیمؑ و آلِ عمران تک کے اس شجرے کا حوالہ دینے سے یہ ہے کہ حضرت مسیحؑ اور ان کی والدہ ماجدہ حضرت مریمؑ کے متعلق نصاریٰ کے سامنے یہ بات واضح طور پر آجائے کہ ان کی اپنی مانی ہوئی تاریخ سے جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ نہیں ہے کہ حضرت مسیحؑ یا ان کی والدہ کوئی مافوق بشر ہستی ہیں بلکہ ان کا تعلق بھی رشد و ہدایت کے اسی سلسلۃ الذہب سے

ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کی ہدایت کے لیے منتخب فرمایا۔ اس مبارک خانوادہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ارشاد و ہدایت کے لیے برگزیدگی کا شرف ضرور حاصل ہوا لیکن یہ برگزیدگی اللہ کی بندگی اور اس کی بندگی کی دعوت کے لیے تھی، جس طرح اس سلسلے میں دوسرے اللہ کے برگزیدہ بندے ہیں اسی طرح حضرت مسیحؑ بھی خدا کے ایک برگزیدہ بندے ہیں۔ پھر ان کو اور ان کی والدہ کو الوہیت کا درجہ دینے کا جواز کہاں سے پیدا ہوتا ہے۔

آگے حضرت مریمؑ کی ابتدائی زندگی کے واقعات کا حوالہ ہے کہ ان کی ولادت سے پہلے کس طرح ان کی والدہ نے اپنے پیٹ کے بچے کے لیے ایک منت مانی، پھر جب توقع کے خلاف ان کے ہاں لڑکی کی ولادت ہوئی تو انھیں کس نوعیت کا اضطراب پیش آیا پھر اللہ تعالیٰ نے ان کا یہ اضطراب کس طرح دور فرمایا، حضرت زکریا نے ان کو کس طرح اپنی تربیت میں لیا اور کس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی قبولیت سے نوازا یہاں تک کہ ان کے روحانی فیوض و برکات سے حضرت زکریا جیسے صاحبِ فیوض و برکات بھی اس اس درجہ متاثر ہوئے کہ انھوں نے اپنے لیے بھی اولادِ صالح کی دعا مانگی۔ حضرت مریمؑ کی اس سرگزشت کا حوالہ دینے سے مقصود نصاریٰ پر یہ حقیقت واضح کرنا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی ایک پاکیزہ خصائل تابعدار اور فرمانبردار بندی کی سرگزشت ہے نہ کہ ان کے زعم کے مطابق نعوذ باللہ خدا کی ماں کی!

اس کے بعد حضرت زکریا کی دعا کی قبولیت کا ذکر ہے کہ باوجودیکہ وہ خود بڑھاپے کی آخری منزل میں داخل ہو چکے تھے اور ان کی بیوی بھی بانجھ تھیں لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو حضرت یحییٰؑ کی ولادت کی بشارت دی اور وہ اس بشارت کے بموجب پیدا ہوئے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خارقِ عادت ولادت اللہ تعالیٰ کی قدرت کی ایک نشانی ہے، اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جس کی ولادت اسباب کے عام ضابطے کے خلاف ہو اس کو خدا یا اوتار بنا دیا جائے۔ اگر نصاریٰ حضرت عیسیٰؑ کی خارقِ عادت ولادت کی دلیل پر ان کو خدا بنا بیٹھے تو یہ دلیل تو حضرت یحییٰؑ کے حق میں بھی موجود ہے!

اس روشنی میں اب ابطالِ نصرانیت کی اس تمہید کو پڑھیے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

آیات ۳۳-۴۴

إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَنُوحًا وَآلَ إِبْرَاهِيمَ وَآلَ عِمْرَانَ عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿۳۳﴾ ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِن بَعْضٍ ۗ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۳۴﴾ إِذْ قَالَتِ امْرَأَتُ عِمْرَانَ رَبِّ إِنِّي نَذَرْتُ لَكَ مَا فِي بَطْنِي مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّي ۖ إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿۳۵﴾

فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُهَآ اُنْثٰی ۭ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا
وَضَعَتْ ۭ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰى ۚ وَاِنِّىْ سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَ
اِنِّىْٓ اُعِيْذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴿۳۶﴾ فَتَقَبَّلَهَا
رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّاَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ۚ
كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ
قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ۭ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ
يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاۗءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۷﴾ هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ
قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيْعُ
الدُّعَاۗءِ ﴿۳۸﴾ فَنَادَتْهُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ وَھُوَ قَاۗىِٕمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ۙ
اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًۢا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا
وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۳۹﴾ قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ
غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِىَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِيْ عَاقِرٌ ۭ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ
مَا يَشَاۗءُ ﴿۴۰﴾ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ۭ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ
النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ۭ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ
بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ﴿۴۱﴾ وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰۗىِٕكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ
اصْطَفٰىكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰىكِ عَلٰي نِسَاۗءِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۲﴾
يٰمَرْيَمُ اقْنُتِىْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾
ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَاۗءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۭ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ

إِذْ يُلْقُونَ أَقْلَامَهُمْ أَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۖ وَمَا كُنتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يَخْتَصِمُونَ ﴿۴۴﴾

ترجمۂ آیات ۳۳-۴۴

اللہ نے آدم، نوح، آل ابراہیم اور آل عمران کو اہل عالم کی رہنمائی کے لیے منتخب فرمایا، یہ ایک دوسرے کی ذریت ہیں۔ اور اللہ سننے والا، جاننے والا ہے۔ ۳۳-۳۴

یاد کرو جب عمران کی بیوی نے دعا کی کہ اے میرے رب جو بچہ میرے پیٹ میں ہے میں نے اس کو ہر چیز سے چھڑا کر تیرے لیے خاص کیا، سو تو اس کو میری طرف سے قبول فرما، بے شک تو ہی ہے جو سننے والا جاننے والا ہے۔ تو جب اس نے اس کو جنا تو اس نے کہا کہ اے رب یہ تو میں لڑکی جنی ہوں ـــ اور اللہ کو خوب پتا تھا اس چیز کا جو وہ جنی تھی ـــ اور لڑکا لڑکی کی مانند تو نہیں ہوتا، اور میں نے اس کا نام مریم رکھا ہے اور میں اس کو اور اس کی اولاد کو شیطان رجیم سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔ تو اس کے رب نے اس کو اپنی پسندیدگی کی قبولیت سے نوازا، اس کو عمدہ طریقے پر پروان چڑھایا اور زکریاؑ کو اس کا سرپرست بنایا۔ جب جب زکریا محراب میں اس کے پاس جاتا وہاں رزق پاتا، اس نے پوچھا اے مریم یہ چیز تمھیں کہاں سے حاصل ہوتی ہے۔ اس نے کہا یہ اللہ کے پاس سے ہے۔ بے شک اللہ جس کو چاہے بے حساب فضل فرماتا ہے۔ ۳۵-۳۷

اس وقت زکریا نے اپنے رب کو پکارا۔ اس نے دعا کی اے میرے پروردگار! تو مجھے بھی اپنی جناب سے پاکیزہ اولاد عطا فرما، بے شک تو دعا سننے والا ہے۔ تو فرشتوں نے اس کو ندا دی جب کہ وہ محراب میں نماز میں کھڑا تھا کہ اللہ تجھ کو یحییٰ کی خوش خبری دیتا ہے، جو اللہ کے ایک کلمہ کے مصداق، سردار، لذاتِ دنیا سے کنارہ کش اور زمرۂ صالحین

سے نبی ہوں گے۔ اس نے کہا اے میرے رب میرے ہاں لڑکا کیسے ہو گا، میں تو بوڑھا ہو چکا اور میری بیوی بھی بانجھ ہے؟ فرمایا، اسی طرح اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اس نے کہا اے میرے رب تو میرے لیے کوئی نشانی ٹھہرا دے۔ فرمایا تیرے لیے نشانی یہ ہے کہ تو تین دن لوگوں سے بات نہ کر سکے گا مگر اشارے سے۔ اور اپنے رب کو بہت زیادہ یاد کیجیو اور صبح و شام اس کی تسبیح کیجیو۔ ۳۸-۴۱

اور جب فرشتوں نے کہا اے مریم! اللہ نے تم کو برگزیدہ کیا۔ تم کو پاک کیا اور تم کو دنیا کی عورتوں پر ترجیح دی۔ اے مریم اپنے رب کی فرمانبرداری میں لگی رہو اور رکوع سجدہ کرنے والوں کے ساتھ سجدہ اور رکوع کرتی رہو۔ ۴۲-۴۳

یہ غیب کی خبروں میں سے ہیں جو ہم تم کو وحی کر رہے ہیں اور تم تو ان کے پاس موجود نہیں تھے جب وہ اپنے قرعے ڈال رہے تھے کہ کون مریم کی سرپرستی کرے اور تم اس وقت بھی ان کے پاس موجود نہ تھے جب وہ آپس میں جھگڑ رہے تھے۔ ۴۴

۱۲۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَنُوحًا وَآلَ إِبْرَاهِيمَ وَآلَ عِمْرَانَ عَلَى الْعَالَمِينَ ۝ ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ ۗ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ (۳۳-۳۴)

حضرت مسیح کا خاندان۔

آدمؑ، نوحؑ اور ابراہیمؑ (علیہم السلام) یہ سلسلہ نبوت و رسالت کے اساطین و عمائد ہیں۔ ان کا ذکر ہو گیا تو گویا نبوت کے پورے مبارک سلسلے کا ذکر ہو گیا۔ حضرت ابراہیمؑ کے ذکر کے ساتھ ان کے آل کے ذکر نے ان دونوں شاخوں کو جمع کر دیا جو ان سے پھوٹی ہیں۔ یعنی حضرت اسحاقؑ کی شاخ کا بھی، جس کے آخری پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور حضرت اسماعیلؑ کی شاخ کا بھی جس میں خاتم الانبیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی۔ آلِ ابراہیم کے بعد آل عمران کا ذکر یہاں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہ اس خاندان مبارک کا ذکر ہے جس میں حضرت مریمؑ کی ولادت باسعادت ہوئی۔ عمران بن ماتان، حضرت مریمؑ کے والد ماجد کا نام ہے۔

یہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے جد مادری ہیں۔ اس سارے شجرے کے ذکر سے مقصود یہ دکھانا ہے کہ حضرت عیسٰی بھی اسی سلسلۂ مبارک کی ایک کڑی ہیں، ان کی والدہ، ان کے نانا اور ان کے دوسرے اجداد سب معلوم ہیں۔ یہ سارے خاندان ایک دوسرے سے وابستہ و پیوستہ اور ایک دوسرے کی ذریت ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ پھر اسی خاندان سے اٹھے ہوئے ایک شخص کو الوہیت کے مقام پر پہنچا دینے کے کیا معنی؟

'وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ' میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کو نبوت و رسالت کے لیے انتخاب فرمایا، یہ انتخاب تمام تر سمع و علم پر مبنی تھا، اس نے جن کو اس منصب کے لیے اہل پایا ان کو اس کے لیے انتخاب فرمایا۔ اس چیز کا انحصار تمام تر اہلیت و صلاحیت اور اللہ تعالیٰ کی حکمت و مصلحت پر ہے، اس میں کسی خاندان کے شرفِ ذاتی کو کوئی دخل نہیں ہے، جیسا کہ شرفِ نسبی کے گھمنڈ میں مبتلا ہونے والوں نے گمان کیا۔

اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّيْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِيْ بَطْنِيْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّيْ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (۳۵)

حضرت مریمؑ کی ابتدائی سرگزشت

اوپر کی آیت میں آل عمران کا شجرہ نسب واضح کرنے کے بعد اب یہ حضرت مریمؑ کی ولادت کا ذکر فرمایا کہ جب یہ ابھی ماں کے پیٹ ہی میں تھیں تو ان کی والدہ۔ عمران کی بیوی نے یہ منت مانی تھی کہ اس پیدا ہونے والے بچے کو اللہ تعالیٰ کے لیے نذر کر دوں گی۔ کسی بچے کو اللہ تعالیٰ کے لیے نذر کرنے کا مقصد بنی اسرائیل میں یہ ہوتا تھا کہ اس کو معبد کی خدمت کے لیے خاص کر دیا جائے گا۔

'مُحَرَّرًا' کے معنی ہیں آزاد کر کے۔ یعنی بڑے ہونے پر اس بچے پر گھر در اور کمانے کھلانے کی کوئی ذمہ داری نہیں ہوگی، اس کی ساری زندگی صرف بیت المقدس کی خدمت ہی کے لیے وقف ہوگی۔ آگے آ رہا ہے کہ حضرت مریم کی والدہ کو توقع لڑکے کی ولادت کی تھی لیکن پیدا ہوئی لڑکی۔ یہ چیز ان کے لیے موجب تردد ہوئی کیونکہ ہیکل کی خدمت کے لیے لڑکیوں اور عورتوں کے لینے کا رواج نہیں تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت مریمؑ کی والدہ کی نذر قبول فرمائی اور وہ ہیکل میں داخل کر لی گئیں ۔۔۔ حضرت مریمؑ کی یہ ابتدائی سرگزشت اور آگے کے حالات کے بیان کرنے سے مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ جس اللہ کی بندی کی زندگی پیدا ہونے کے پہلے ہی سے خدا اور اس کے ہیکل کی خدمت اور اللہ کی عبادت و اطاعت کے لیے وقف ہو چکی تھی اور پیدا ہونے کے بعد سے دمِ واپسیں تک اس کے لیے وقف رہی یہ کیسی خرد باختگی ہے کہ اس کو خدا کی بندی کے بجائے نعوذ باللہ خدا کی ماں بنا دیا گیا۔

فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّيْ وَضَعْتُهَآ اُنْثٰى ۭ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ۭ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰى ۚ وَاِنِّىْ سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَاِنِّىْٓ اُعِيْذُھَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ (۳۶)

'اِنِّيْ وَضَعْتُهَآ اُنْثٰى' سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ حضرت مریم کی والدہ کو، جیسا کہ اوپر گزرا، توقع فرزند

کی ولادت کی تھی اور اسی توقع پر انھوں نے منت مانی تھی لیکن ولادت، توقع کے خلاف، لڑکی کی ہوئی۔ اس پر انھوں نے اپنے رب کے حضور اپنے تردد کا اظہار فرمایا کہ یہ تو میں لڑکی جنی ہوں اور بہر حال وہ بچہ جس کو میں نے تیری نذر گزار کیا تھا، میرے خیال کے مطابق لڑکا تھا، یہ لڑکی اس کا بدل تو نہیں ہوسکتی لیکن اس پر بھی اگر تو یہ نذر حقیر قبول فرمالے تو یہ تیرا افضل ہی فضل ہوگا۔

'وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ' (اور اللہ خوب جانتا تھا اس چیز کو جو وہ جنی تھی) یہ حضرت مریم کی والدہ کی بات کے بیچ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک جملہ معترضہ ہے۔ والدۂ مریم کا یہ کہنا کہ اِنِّیْ وَضَعْتُهَآ اُنْثٰى (میں تو یہ لڑکی جنی ہوں) نو مولود سے متعلق ایک کہتری کے احساس کی غمازی کر رہا تھا اور انھیں اللہ تعالیٰ کے حضور میں اپنا یہ ہدیہ بہت حقیر محسوس ہو رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی غایت درجہ رافت و رحمت سے یہ واضح فرمایا کہ والدۂ مریم تو مریم کو ایک لڑکی ہونے کی بنا پر نہایت حقیر چیز سمجھ رہی تھیں لیکن اللہ کو خوب علم تھا کہ لڑکی کی صورت میں ان کے پیٹ سے کیسی عظیم اور بابرکت ہستی ظہور میں آئی ہے!

'وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰى' یہ والدۂ مریم کی بات کا حصہ ہے اور اس کا مطلب وہی ہے جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، یعنی کہاں وہ لڑکا جو ذہن میں تھا اور کہاں یہ لڑکی جو وجود میں آئی۔ یہ اس کا بدل تو نہیں ہوسکتی تاہم تو قبول فرمالے تو تیری نوازش۔

'وَاِنِّیْٓ اُعِيْذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ' یہ دعا والدۂ مریم کی طرف سے مریم اور ان کی اولاد کے لیے ایک فطری چیز ہے۔ مقصود اس ذکر سے یہ ہے کہ جس لڑکی کی ماں اپنی لڑکی اور اس کی اولاد کے لیے یہ دعا مانگتی ہے اور جس کو خدا کے حضور نذر کی حیثیت سے پیش کرتے ہوئے اس درجہ کہتری کا احساس اس کے اندر پیدا ہوتا ہے اسی کو نصاریٰ بعد میں خدا کی ماں کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ قرآن کا مقصد اس ساری سرگزشت کے پیش کرنے سے یہی ہے کہ واقعات کی اصل نوعیت سامنے لا کر وہ لوگوں کو دکھائے کہ کس طرح سیدھے سادے واقعات کو ایک افسانہ بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّاَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ۚ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ۭ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاۗءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ (۳۷)

حضرت مریمؑ کا روحانی فضل و کمال

فَتَقَبَّلَهَا الآیہ یعنی والدۂ مریم کو ان کے لڑکی ہونے کی بنا پر جو احساس تھا اس کے برعکس اللہ تعالیٰ نے اپنے حسن قبولیت سے ان کو نوازا، ان کی تمام عقلی، اخلاقی، روحانی صلاحیتیں خوب پروان چڑھیں۔ اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کا ایک خاص فضل ہوا کہ ان کی کفالت و تربیت کی ذمہ داری حضرت زکریا نے اٹھائی جو حضرت مریم کے خالو بھی تھے اور اس دور میں بیت المقدس کے اسرائیلی اصطلاح میں کاہن اعظم بھی۔

'كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا' محراب سے مراد یا تو معبد کا وہ حصہ ہو جو عورتوں کی عبادت اور اعتکاف کے لیے مخصوص تھا یا کوئی خاص گوشہ اور حجرہ جو حضرت مریمؑ کے لیے خاص کیا گیا ہو۔ بیت المقدس میں اس طرح کے حجرے اور گوشے عبادت گزاروں کے لیے بنے ہوئے تھے۔ 'كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ' سے بیک وقت دو باتیں نکلتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ حضرت زکریا حضرت مریم کی دیکھ بھال کے لیے اکثر ان کے پاس جاتے رہتے تھے، دوسری یہ کہ حضرت مریم اپنا سارا وقت محراب میں، ذکر و عبادت میں، گزارتی تھیں۔

'وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا' سے حضرت مریم کے غیر معمولی روحانی کمال کا اظہار ہو رہا ہے کہ حضرت زکریا جیسے صاحبِ کمال بھی ان کے پاس جاتے تو ان کے کمالِ روحانی کے نفحات محسوس کرتے یہاں تک کہ ایک روز وہ استعجاب و تحسین کے طور پر یہ بھی پوچھ بیٹھے کہ اے مریم! یہ چیزیں تمھیں کہاں سے حاصل ہوتی ہیں۔

'رزق' سے مراد حکمت و معرفت ہیں

'رزق' سے مراد یہاں حکمت و معرفت ہے۔ قرآن نے وحی و ہدایت کے لیے یہ لفظ ایک سے زیادہ مقامات میں استعمال کیا ہے۔ تورات اور انجیل میں بھی یہ تعبیر موجود ہے۔ حضرت مسیحؑ کا ارشاد مشہور ہے کہ آدمی صرف روٹی سے نہیں جیتا بلکہ اس کلمے سے جیتا ہے جو خداوند کی طرف سے آتا ہے۔ آگے والی آیت میں آ رہا ہے کہ حضرت زکریا حضرت مریم کی علم و معرفت کی باتوں سے اتنے متاثر ہوئے کہ انھوں نے پیرانہ سالی میں، بیوی کے بانجھ ہونے کے باوجود، اپنے لیے بھی ایسی ہی اولادِ صالح کی دعا مانگی ـــــ ظاہر ہے کہ حضرت زکریا جیسے صاحبِ معرفت کو سیب و انگور والا رزق اس درجہ متاثر نہیں کر سکتا تھا کہ وہ یہ کرشمہ دیکھ کر اولاد کی دعا شروع کر دیں۔ اس طرح کی باتیں اربابِ کمال کے ہاں کوئی خاص درجہ و مرتبہ نہیں رکھتی ہیں۔ حضرت زکریا جیسے صاحبِ کمال تو متاثر ہو سکتے تھے تو کسی ایسے ہی رزقِ روحانی سے متاثر ہو سکتے تھے جو خود ان کی اشتہائے روحانی کو بھی بھڑکا دے، جس کو دیکھ کر وہ بھی عش عش کر اٹھیں اور جو ان کے اندر بھی یہ تمنا پیدا کر دے کہ کاش ان کی نسل سے بھی کوئی اس کمال کا حامل اٹھے۔

'اَنّٰى لَكِ هٰذَا' (یہ چیز تمھیں کہاں سے حاصل ہوتی ہے؟) بغرضِ استفسار و تحقیق نہیں بلکہ بطور استعجاب و تحسین کے ہے۔ جب کسی کا کمال اس کی عمر کے اعتبار سے بہت زیادہ اور متکلم کے گمان و خیال سے بہت بڑھ کر ہو تو اس طرح کا استعجاب قدرتی ہے۔ یہ استعجاب اظہارِ تحسین کا ایک اسلوب ہے۔ اس سے حضرت زکریا کی تواضع اور قدر دانی کا بھی اظہار ہو رہا ہے کہ اپنی ایک زیرِ تربیت لڑکی کو، جس کی عمر ابھی کچھ بھی نہیں ہے، اس کی صلاحیتوں پر کس فیاضی سے داد دے رہے ہیں۔ حضرت مریم کا جواب 'هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ' بھی اس کم سنی میں ان کی پختگی عقل کا شاہد ہے کہ انھوں نے اس سب کو اللہ کا فضل و احسان قرار دیا، اس کو اپنے زہد و ریاضت کا کرشمہ نہیں قرار دیا۔ 'اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ' ہمارے نزدیک حضرت مریم کے جواب کا حصہ نہیں ہے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ

کی طرف سے حضرت مریم کی تحسین اور اپنے فضل بے پایاں کا اظہار ہے۔ بِغَیْرِ حِسَاب کا مفہوم ہم اوپر واضح کر آئے ہیں۔

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهُ ۖ قَالَ رَبِّ هَبْ لِي مِن لَّدُنكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۖ إِنَّكَ سَمِيعُ الدُّعَاءِ (۳۸)

حضرت یحییٰؑ کی ابتدائی سرگزشت

'هُنَالِكَ' سے اس بات کا اظہار ہو رہا ہے کہ حضرت مریم کی حیرت انگیز حکمت و معرفت سے حضرت زکریا اس درجہ متاثر ہوئے کہ اولاد کی آرزو جو ان کے اندر دبی ہوئی تھی وہ دفعتہً بھڑک اٹھی کہ کاش حکمت و معرفت کا کوئی ایسا ہی وارث اللہ تعالیٰ ان کو بھی بخشے۔ چنانچہ اس کے لیے انھوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی۔ 'مِن لَّدُنكَ' کے الفاظ سے یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ اپنے بڑھاپے اور بیوی کے بانجھ ہونے کی وجہ سے ظاہری حالات کو تو وہ غیر مساعد پا رہے تھے لیکن اللہ تعالیٰ سے یہ امید رکھتے تھے کہ وہ اگر چاہے تو اس کے فضل و قدرت سے ایک بوڑھے کی تمنا بھی بر آ سکتی ہے اور ایک بڑھیا بانجھ کی گود بھی ہری ہو سکتی ہے۔ اسباب تو محض ظاہر کا پردہ ہیں، اصل چیز تو خدا کی قدرت اور اس کی عنایت ہے۔

فَنَادَتْهُ الْمَلَائِكَةُ وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّي فِي الْمِحْرَابِ أَنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيَىٰ مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللَّهِ وَسَيِّدًا وَحَصُورًا وَنَبِيًّا مِّنَ الصَّالِحِينَ (۳۹)

ملائکہ کے جمع لانے کی وجہ

مَلٰٓئِكَة کا لفظ یہاں اور خاص اس سیاق میں جہاں جہاں بھی آیا ہے جمع کی صورت میں آیا ہے۔ اس کی وجہ ہمارے نزدیک یہ ہے کہ حضرت زکریا نے ہاتفِ غیبی کی ندا سنی، تعین کے ساتھ انھوں نے فرشتے کو نہیں پہچانا، اس ابہام کے سبب سے قرآن نے کسی خاص فرشتہ کے بجائے فرشتوں کا ذکر فرمایا ہے جس سے یہ بات تو نکلتی ہے کہ زکریا کو جو آواز سنائی دی وہ ملکوتی تھی لیکن ساتھ ہی اس بات کا بھی اظہار ہو رہا ہے کہ یہ محض ایک غیبی آواز تھی جو ان کے کانوں میں پڑی۔

'وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّي فِي الْمِحْرَابِ' یعنی ہاتفِ غیبی کی یہ آواز انھیں اس وقت سنائی دی جب وہ حجرے کے اندر نماز میں کھڑے تھے۔ یہ ایک قرینہ تھا اس بات کا کہ یہ آواز ملکوتی ہی ہوگی اس لیے کہ نماز کی حالت فرشتے کے قرب و اتصال کے لیے سب سے زیادہ موزوں ہے۔ ایک اور اشارہ اس سے یہ بھی نکلتا ہے کہ دعا و مناجات اور اپنے رب سے راز و نیاز کے لیے سب سے زیادہ موزوں وقت وہ ہوتا ہے جب بندہ نماز میں ہوتا ہے۔ اسی سے نماز میں زندگی اور حرارت پیدا ہوتی ہے اور یہی نماز ہماری زندگی کا ربط براہ راست ہمارے خالق و مالک سے قائم کرتی ہے۔ قرآن میں تمام مشکلات و مسائل کے اندر نماز کی جو تاکید پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو کی جاتی ہے اس سے بھی یہی بات نکلتی ہے کہ زندگی کی مشکلات کے حل کی کلید اسی کے اندر ہے۔ احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کی نمازوں کی جو تفصیلات ملتی ہیں ان سے بھی یہی انداز ہوتا ہے کہ ان کی نمازیں فی الواقع خدا سے راز و نیاز کی نمازیں تھیں، ان کی تمام دعائیں اور فریادیں نماز کے

سجدوں اور قیام میں ہوتی تھیں اور وہ اپنی نمازوں سے جب لوٹتے تھے تو اپنے دامن اور اپنی جھولیاں بھر کے لوٹتے تھے۔ ان کے لیے نماز زندگی کی ایک ایسی ہی ضرورت تھی جس طرح پیاسوں کو گھاٹ کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہماری نمازوں کے اندر یہ شان باقی نہیں ہے۔ اب نمازیں صرف رسم داری کی نوعیت کی چیزیں بن کر رہ گئی ہیں، زندگی سے ان کا کوئی تعلق باقی نہیں رہا ہے۔ اب ہم نمازیں تو بے جان اور بے روح پڑھتے ہیں اور لمبی لمبی دعائیں نمازوں سے فارغ ہو کر مانگتے ہیں، حالانکہ مانگنے کا اصلی وقت نمازوں میں ہوتا ہے جب کہ بندہ اپنے رب کے حضور میں ہوتا ہے۔

'اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى الآیہ' یہ وہی حضرت یحیٰیؑ ہیں جن کا نام انجیلوں میں یوحنا آیا ہے۔ انجیلوں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرت عیسٰیؑ سے صرف چھ ماہ پہلے پیدا ہوئے۔ ان کی ولادت کی بشارت کے ساتھ ان کی تین خصوصیات بیان کی گئی تھیں۔

'کلمۃ من اللہ' کی تصدیق

ایک یہ کہ وہ 'مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ' ہوں گے، یعنی اللہ تعالیٰ کے ایک کلمہ کی تصدیق کریں گے اور اس کی بشارت دیں گے۔ 'كَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ' سے مراد حضرت عیسٰی علیہ السلام ہیں۔ چنانچہ آگے آیت ۴۵ میں تصریح کے ساتھ ان کا ذکر اسی لقب سے ہوا ہے يَامَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ ۴۵-آل عمران (اے مریم اللہ تم کو اپنے ایک کلمے کی بشارت دیتا ہے جس کا نام عیسٰی بن مریم ہوگا) حضرت عیسٰیؑ کو کلمۃ اللہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ ان کی ولادت اسباب کے عام ضابطے کے خلاف اللہ تعالیٰ کے کلمہ 'کن' سے ہوئی۔ 'کلمۃ' کی تنکیر سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ان گنت کلمات میں سے حضرت عیسٰیؑ بھی ایک کلمہ ہیں۔ جس طرح اس کائنات کی بے شمار چیزیں مجرد کلمہ 'کن' سے ظہور میں آئی ہیں اسی طرح حضرت عیسٰی علیہ السلام بھی اس کلمہ سے ظہور میں آتے ہیں۔ اس سے نصاریٰ کے ایک دعوے کی تردید ہو رہی ہے۔ وہ یہ کہ وہ کہتے ہیں کہ کلمۃ اللہ صرف حضرت مسیحؑ ہیں اور پھر اس سے ان کی الوہیت کا عقیدہ ثابت کرتے ہیں۔

'بِكَلِمَةٍ' کی 'ب' اس بات کا قرینہ ہے کہ یہاں تصدیق کا لفظ بشارت کے مفہوم پر بھی مشتمل ہے۔ یعنی حضرت یحیٰیؑ، حضرت عیسٰیؑ کی تصدیق بھی کریں گے اور ان کی بشارت بھی دیں گے۔ انجیلوں سے ثابت ہے کہ انھوں نے یہ دونوں فرض انجام دیئے۔ انھوں نے خود اپنی زندگی کا جو مشن واضح کیا وہ یہی تھا کہ وہ آنے والے کی راہ صاف کرنے آئے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنے اس مشن کی تکمیل کے لیے جان کی بازی لگا دی۔ ان کی زندگی سراپا سیدنا مسیحؑ کی تصدیق تھی۔ ان کی ولادت بھی سمجھیے کہ ایک پہلو سے حضرت مسیحؑ کی ولادت کی طرح خارق عادت ہی تھی۔ زہد و توکل اور تجرد میں بھی ہو بہو اپنے بعد آنے والے کا نقش اوّل تھے اور منادی تو انھوں نے جس شان سے حضرت عیسٰیؑ کی کی ہے واقعہ یہ ہے کہ اس سے دشت و جبل گونج اٹھے۔

نبی اپنی فطرت اور دعوت کے لحاظ سے سردار ہوتا ہے

دوسری یہ کہ وہ "سیّد" ہوں گے۔ سیّد کے معنی سردار کے ہیں۔ نبی اپنی فطرت، اپنی دعوت اور اپنے مشن کے لحاظ سے سردار ہوتا ہے۔ وہ داعی بن کر لوگوں کو پکارتا، منذر بن کر لوگوں کو جگاتا اور ہادی و مرشد بن کر لوگوں کی رہنمائی کرتا ہے۔ اس کام کے لیے وہ قدرت کی طرف سے تمام لوازم و اسلحہ سے مسلح ہوتا ہے۔ اس کا سینہ خلق کے لیے شفقت و رافت سے لبریز ہوتا ہے، اس کے کلام میں بے پناہ سطوت و جلالت ہوتی ہے، اس کی آواز اور اس کے انداز میں ہیبت ہوتی ہے، اس کی تابناک پیشانی اس کی عظمت و صداقت کی گواہی دیتی ہے۔ اگرچہ وہ کمل کی پوشاک پہنتا ہو اور جنگلی شہد اور ٹڈیوں پر گزارہ کرتا ہو لیکن اس کے رعب و دبدبہ سے بادشاہوں پر لرزہ طاری ہوتا ہے[1]۔ وہ حق کے لیے ان کو بھی اسی طرح سرزنش کرتا ہے جس طرح دوسروں کو کرتا ہے۔ انجیلوں میں حضرت یحییٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ دونوں حضرات کے متعلق آتا ہے کہ وہ "با اختیار" کی طرح بات کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کے کلام میں با اختیاری کی یہ شان ان کی اس منصبی سرداری ہی کا ایک جلوہ تھی۔ اس کی تحویل میں قدرت کی طرف سے ایک گلہ بھی ہوتا ہے جس کی چرواہی اس کے سپرد کی جاتی ہے اور اس بات سے اس کی حیثیت عرفی میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا کہ گلے نے اس کی اطاعت کی یا نہیں کی۔ اگر اس نے اپنا فرض ادا کیا تو اس نے سرداری کا حق ادا کر دیا اور یہی اس سے مطلوب ہوتا ہے۔

اس نقطے سے اس گمان کی پوری پوری تردید ہو رہی ہے کہ حضرت یحییٰؑ کوئی راہب تھے اور ان کی زندگی خلق سے الگ تھلگ تھی۔ وہ اپنی ذات کے معاملے میں بلاشبہ زاہد تھے لیکن ان کی زندگی کا لمحہ لمحہ اس توبہ کی منادی کے لیے وقف تھا جس کے لیے وہ مامور ہوئے تھے اور اسی راہ میں انھوں نے اپنا سر کٹوا دیا۔

حصور کا مفہوم

تیسری یہ کہ وہ 'حصور' ہوں گے۔ حصور، حصر سے فعول کے وزن پر ہے جس کے لغوی معنی ہوں گے 'اپنے آپ کو گھیرے رکھنے والا'۔ یہیں سے اس کا استعمال اس شخص کے لیے ہوا جو لذات دنیا سے منقطع اور اپنے آپ کو کامل ضبط میں رکھنے والا ہو۔ یوں تو یہ ضبطِ نفس اس سرداری کی خصوصیات میں سے ہے جس کا ذکر اوپر ہوا اس لیے کہ جو اپنے آپ کو ضبط میں رکھ سکے گا وہی خلق کو بھی ضبط میں رکھنے والا بن سکے گا۔ لیکن حضرت یحییٰؑ و حضرت مسیحؑ دونوں نبیوں کی زندگیاں بالکل درویشانہ تھیں، انھوں نے زندگی کی ان لذتوں سے بھی فائدہ نہیں اٹھایا جو عام حالات میں کسی درجے میں بھی داخل دنیاداری نہیں قرار دی جا سکتیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کے حالات خاص تھے۔ ان کے

---

[1] انجیل میں ہے کہ حضرت یحییٰ کمل کی پوشاک پہنتے تھے اور جنگلی شہد اور ٹڈیوں پر گزارہ کرتے تھے لیکن وقت کے حکمران کو انھوں نے اس کی ایک بیہودگی پر سخت سرزنش کی۔

زمانے میں یہود پر دنیا کی محبت اتنی غالب آگئی تھی کہ ان کا رخ موڑنے کے لیے ان کو زندگی کا ایک بالکل زاہدانہ و درویشانہ نمونہ رکھنا پڑا۔ یہ علاج بالضد کی ایک شکل ہے جو جسمانیات کی طرح روحانیات واخلاقیات میں بھی خاص حالات میں اختیار کرنی پڑتی ہے۔ مقصود تو اس سے یہ ہوگا کہ یہ امت بالتدریج اس نقطۂ اعتدال کو اختیار کرنے کے قابل بنے جو بالآخر اللہ کے آخری دین میں ان کے سامنے آنے والا تھا لیکن نصاریٰ نے ان کے اس زہد کو رہبانیت کا رنگ دے دیا اور بعد کے زمانوں میں رہبانیت کا ایک پورا نظام کھڑا کر دیا۔

نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ کا مفہوم

چوتھی یہ کہ وہ نبی ہوں گے۔ نبی کا مفہوم واضح ہے۔ البتہ اس کے ساتھ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ کی جو وضاحت ہے اس سے مقصود ان کے زمرے کو بتانا ہے کہ وہ باہمہ صفات و کمالات تھے زمرۂ صالحین ہی میں سے، یہ نہیں ہے کہ ان کو الوہیت کا کوئی مقام حاصل ہوگیا ہو۔ درآنحالیکہ کمالات و فضائل کے علاوہ حضرت علیٰؑ سے رشتہ داری کا تعلق بھی رکھتے ہیں اور ان کی ولادت بھی حضرت علیٰؑ کی ولادت سے بہت اشبہ ہے بلکہ انجیلوں سے تو یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ انھی نے حضرت علیٰؑ کو بپتسمہ دیا اور حضرت علیٰؑ نے ان کی بابت فرمایا کہ ماؤں نے جن کو جنا ان میں یوحنّا سے بڑا کوئی نہیں۔

قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِيْ عَاقِرٌ ۭ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَاۗءُ (۴۰)

سوال طلبِ تصدیق کے لیے

یہ سوال تعجب یا شک یا انکار کی نوعیت کا نہیں ہے بلکہ یہ نہایت حسین و بلیغ انداز سے طلب تصدیق ہے۔ ان کے سامنے اس بشارت کے ظاہر ہونے میں جو رکاوٹیں تھیں وہ بیان کر کے حضرت زکریا نے چاہا کہ یہ تصریح کرالیں کہ ان رکاوٹوں کے باوجود یہ بشارت ظاہر ہونے کی شکل یہ ہوگی۔ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَاۗءُ۔ یہ بات یوں ہی ہوگی۔ یعنی اللہ کا ارادہ یوں ہی ہے کہ یحییٰؑ کی ولادت بوڑھے باپ اور بانجھ ماں کے ہاں ہو۔ اصل چیز اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہی ہے۔ اسباب تو محض ظاہر کا پردہ ہیں۔ اللہ چاہے تو پتھر کے اندر سے پانی کے چشمے جاری ہو سکتے ہیں اور صحرا کے سینے سے حباب اٹھ سکتے ہیں۔ قرآن میں اس قسم کا سوال و جواب حضرت ابراہیمؑ کی سرگزشت میں بھی منقول ہے۔ اس کی نوعیت بھی بعینہٖ یہی ہے۔

قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ۭ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ۭ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ (۴۱)

اس بات کی نشانی کہ یہ بشارت من جانب اللہ ہے

حضرت زکریا نے یہ باتیں ایک ہاتف غیبی سے سنی تھیں اور اچھی ساعت اور اچھے حالات میں سنی تھیں اس وجہ سے ان کو گمان تو یہی تھا کہ یہ بشارت من جانب اللہ ہی ہے۔ لیکن وہ نہایت متواضع، متقی اور محتاط بندے تھے اس وجہ سے دل کے ایک گوشے میں کھٹک یہ بھی تھی کہ ممکن ہے

یہ اپنے ہی گنبدِ دل کی صدائے بازگشت سنائی دی ہو، ممکن ہے اس کے اندر نفس کی مخفی آرزوؤں کو کوئی دخل ہو جن سے شیطان نے کوئی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہو، اس وجہ سے انھوں نے اپنے رب سے درخواست کی کہ اے رب میرے لیے کوئی ایسی نشانی ٹھہرا دے جس سے مجھے یہ اطمینان ہو جائے کہ یہ بشارت تیری ہی طرف سے ہے، اس میں نفس یا شیطان کا کوئی دھوکا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ درخواست منظور فرمائی اور فرمایا کہ تمھارے لیے نشانی یہ ہے کہ تم تین شبانہ روز کسی سے کوئی بات زبان سے نہ کر سکو گے، صرف اشارے سے کر سکو گے، البتہ اللہ تعالیٰ کا ذکر اور اس کی تسبیح کر سکو گے سو اس دوران میں زیادہ سے زیادہ اللہ کا ذکر کرنا اور شام و صبح اپنے پروردگار کی تسبیح میں مشغول رہنا۔

ظاہر ہے کہ ایک خاص مدت کے لیے آدمی پر ایک ایسی حالت کا طاری ہو جانا کہ وہ زبان سے کوئی دنیوی قسم کی بات تو نہ کر سکے لیکن تسبیح و تہلیل کر سکے کسی شیطانی تصرف کا نتیجہ نہیں ہو سکتی، یہ ہو سکتی ہے تو رحمانی تصرف ہی کا کرشمہ ہو سکتی ہے۔ کسی شیطانی اثر سے یہ بات پیدا ہوتی تو اس کا نتیجہ اس کے بالکل برعکس ظاہر ہونا تھا، یعنی آدمی اپنی دنیا داری کی باتیں تو کر سکتا لیکن اللہ اللہ کرنا اس پر شاق گزرتا۔ اگر حضرت زکریا پر یہ حالت غیر اختیاری طور پر طاری کر دی گئی تو یقیناً یہ اس بات کی ایک قطعی نشانی تھی کہ ان کو بیٹے کی جو بشارت ملی ہے من جانب اللہ ہے، اس میں شیطانی دھوکے کو کوئی دخل نہیں ہے۔ قرآن نے یہاں ضمناً اس بات کی تردید بھی کر دی جو انجیل لوقا میں بیان ہوئی ہے کہ حضرت زکریا کو جو یہ حالت پیش آئی وہ ان کے اس جرم کی سزا کے طور پر تھی کہ انھوں نے فرشتے کی بات کا اعتبار نہ کیا اور سوال کر بیٹھے کہ مجھے اس کی کوئی نشانی دی جائے۔

جو لوگ قرآن کے اسلوبِ بیان سے اچھی طرح آشنا نہیں ہیں ان کو ممکن ہے یہ شبہ پیش آئے کہ آیت میں یہ تو مذکور ہے کہ تم تین دن کسی سے بجز اشارہ کے بات نہ کر سکو گے لیکن اس بات کی تصریح نہیں ہے کہ ذکر و تسبیح کر سکو گے۔ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ آیت میں اس تصریح کی جگہ تسبیح و تہلیل کی ہدایت رکھ دی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ہدایت اسی لیے کی گئی ہے کہ وہ یہ کام کر سکتے تھے۔ اگر اس ہدایت کے ساتھ وہ تصریح بھی ہوتی تو یہ ایک بے فائدہ طوالت ہوتی جو قرآن کی بلاغت کے شایانِ شان نہیں ہے۔

'بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَارِ' اور اس قسم کے دوسرے اسالیب، ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ احاطہ کے مفہوم پر دلیل ہوتے ہیں۔ جس طرح ہم بولتے ہیں صبح و شام، رات دن اللہ کو یاد رکھو۔

وَإِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ۝ يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ (۴۲-۴۳)

اِصطفاء کے معنی چھانٹنے اور انتخاب کرنے کے ہیں۔ قرآن کی اصطلاح میں اس کا ...

حضرت مریمؑ کا اصطفا کس کام کے لیے تھا

کا اپنے کسی بندے کو کسی کارِ خاص کے لیے منتخب کر لینا ہے۔ حضرت مریم کو اللہ تعالیٰ نے اپنی ایک عظیم نشانی کے ظہور کے لیے منتخب فرمایا تھا۔ یہ نشانی ایک بہت بڑی خدائی امانت بھی تھی جو ان کے سپرد ہونے والی تھی اور ساتھ ہی ایک عظیم ابتلا بھی۔ یہ چیز اس بات کی مقتضی ہوئی کہ اللہ تعالیٰ اس بارِ امانت کے اٹھانے کے لیے ان کی خاص تربیت فرمائے تاکہ وہ آنے والے مراحل میں حالات کا مقابلہ کرنے کی اہل بن سکیں۔ اسی تربیت کو یہاں 'تطہیر' سے تعبیر فرمایا ہے۔ پھر اس اصطفا کے متعلق تصریح فرمائی کہ یہ اصطفا کوئی معمولی اصطفا نہیں تھا بلکہ یہ تمام عالم کی عورتوں پر تھا۔ اصطفا کے بعد 'علیٰ' کا صلہ جب آتا ہے تو اس کے اندر ترجیح اور فضیلت کا مفہوم بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی عظیم امانت سپرد کرنے کے لیے تمام دنیا کی عورتوں میں سے انھیں کا انتخاب فرمایا۔ یہ ایک ایسا شرف ہے جس میں حضرت مریم کا کوئی شریک و سہیم نہیں۔

اس بارِ امانت کی تیاریوں کے لیے ہاتفِ غیبی نے ان کو ہدایت کی کہ اُقْنُتِىْ لِرَبِّكِ الاٰیۃ قنوت کے معنی دوسرے مقام پر ہم واضح کر چکے ہیں کہ پوری نیازمندی اور پورے تذلل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف جھک جانے کے ہیں۔ اس نیازمندی اور تذلل کا بہترین اظہار نماز میں ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اس کے بعد 'اسْجُدِىْ وَارْكَعِىْ' گویا 'وَاقْنُتِىْ' کے اجمال کی تفصیل ہوئی۔ بلاغت کا یہ نکتہ بھی یہاں ملحوظ رہے کہ نماز کا ذکر یہاں اس کے اہم اجزا سے ہوا ہے۔ یہ اسلوب قرآن نے جہاں جہاں اختیار کیا ہے اس سے نماز کے استغراق و انہماک، اس کی مداومت اور اس کے لیے اضطراب و بیقراری کا اظہار ہوتا ہے۔ اس نکتے کی خدا نے چاہا تو ہم آیت تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا کی تفسیر کرتے ہوئے وضاحت کریں گے۔ اس کے ساتھ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ کی قید باجماعت کی اہمیت کو بھی واضح کرتی ہے اور یہ اس نماز کی تصویر بھی ہے جس کی سعادت حضرت مریم کو حاصل تھی۔ وہ چونکہ ہیکل ہی میں معتکف تھیں اس وجہ سے انہیں خلوت کی نمازوں کے ساتھ ساتھ جماعت کی نمازوں کی برکات بھی حاصل تھیں۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ؕ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۪ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ (۴۴)

ایک التفات

یہ ایک آیت اثنائے کلام میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف التفات کی نوعیت رکھتی ہے۔ آپ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ یہ غیب کی باتیں ہیں یعنی تمہارے علم و اطلاع سے باہر کی ہیں اس لیے کہ نہ تو یہ ساری باتیں تورات و انجیل ہی میں موجود ہیں اور نہ تم شخصاً ہی ان واقعات کے پیش آنے کے وقت موجود تھے، پھر اس صحت و صداقت کے ساتھ تمہارا ان واقعات کا پیش کرنا کہ اہل کتاب کی بھی آنکھیں کھل جائیں بغیر اس کے کس طرح ممکن ہوا کہ اللہ نے تم کو منصبِ رسالت سے نوازا اور شرفِ وحی سے ممتاز کیا۔ یہ اہل کتاب پر تمہاری نبوت و رسالت کی ایک بہت بڑی حجت ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ انجیلوں میں اہل کتاب کی تاریخ کا یہ حصہ تقریباً غائب ہے، بس کچھ غیر مربوط باتیں لوقا میں حضرت یحییٰؑ کے متعلق ملتی ہیں اور بعض اشارات حضرت مریمؑ کے متعلق، اور سب سے زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ حضرت مریم کا ذکر جو ہے بھی وہ ایک عام عورت کا ذکر معلوم ہوتا ہے، حد یہ ہے کہ انجیل کے بعض مقامات سے تو یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ حضرت مسیحؑ بھی ان کا اس طرح احترام نہیں کرتے تھے جس طرح ماں کا احترام کرنا چاہیئے۔ عیسائیوں نے عقیدے کے طور پر چاہے حضرت مریمؑ کو جو درجہ بھی دیا ہو لیکن انصاف یہ ہے کہ ان کا اصلی اور حقیقی شرف قرآن ہی نے نمایاں کیا ہے۔ آگے مناسب مقامات پر ہم اس مسئلے پر تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے۔

حضرت مریمؑ کے معاملہ میں قرعہ اندازی کی نوعیت

اقلام سے مراد قرعے کے تیر ہیں۔ جوئے کے تیروں کا استعمال تو شریعت میں حرام ہے لیکن قرعے کے لیے تیروں کے استعمال میں کوئی قباحت نہیں ہے، حقوق مساوی ہونے کی صورت میں تصفیہ نزاع کے لیے قرعے کا طریقہ بالکل جائز ہے۔ یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ قرعہ اندازی کا یہ طریقہ صرف حضرت مریم کی کفالت ہی کے باب میں اختیار کیا گیا یا دوسرے زیر تربیت خدام ہیکل کے لیے بھی یہی طریقہ رائج تھا۔ ہمارے نزدیک دونوں ہی باتوں کا امکان ہے۔ اس بات کا بھی امکان ہے کہ تمام نو وارد خدام کی کفالت کا فیصلہ اسی طریقہ سے ہوتا رہا ہو اور اس کا بھی امکان ہے کہ حضرت مریم کا معاملہ لڑکی ہونے کی وجہ سے خاص نزاکت کا حامل تھا اس وجہ سے قرعہ سے اس کا فیصلہ کیا گیا ہو۔ قرعہ ایک اشارۂ غیبی پر بھی محمول کیا جاتا ہے۔ ہیکل میں اس کے خدام کے فرائض کی تقسیم کے لیے قرعہ کا طریقہ رائج تھا۔ لوقا میں ذکر ہے کہ جس روز حضرت زکریا کو بیٹے کی بشارت ملی ہے اس روز جس خدمت پر وہ مامور تھے اس کا فیصلہ قرعہ ہی کے ذریعے ہوا تھا۔

جھگڑا کس بات کے لیے تھا؟

وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يَخْتَصِمُونَ، میں جس جھگڑے کا ذکر ہے اس کا تعلق صرف حضرت مریم کی سرپرستی سے نہیں معلوم ہوتا، ایسا ہوتا تو اس کا ذکر الگ کرنے کی ضرورت نہیں تھی بلکہ اس کو بھی پہلے ٹکڑے ہی کے تحت آنا تھا۔ ہمارے خیال میں یہ جھگڑا خدام ہیکل میں اس سوال پر ہوا ہو گا کہ ایک لڑکی ہیکل کے زمرۂ خدام میں شامل ہو سکتی ہے یا نہیں؟ ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں کہ اس کی روایت ہیکل کی تاریخ میں کم از کم معروف نہیں تھی۔ اس وجہ سے یہ سوال موجب نزاع ہو سکتا تھا۔ ویسے یہ بات بھی بعید نہیں ہے کہ محض تنافس فی الخیر اس جھگڑے کا باعث ہوا ہو اس لیے کہ ایک ایسی لڑکی کی کفالت جو معبد کی خدمت کے لیے وقف کی جا رہی ہو اور جس کی قبولیت روز اول سے نمایاں ہو، ایک بہت بڑی سعادت تھی جس سے محروم ہونا ہیکل کے خدام میں سے کوئی بھی پسند نہ کر سکتا تھا۔

۱۳- آگے کا مضمون ——— آیات ۴۵-۶۳

اب یہ وہ اصل بات آ رہی ہے جو درحقیقت سورہ کا عمود ہے۔ ہم تمہید میں اشارہ کر چکے ہیں کہ

اس سورہ میں خطاب نصاریٰ سے ہے اور مقصود ان پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے باب میں حقیقتِ حال کا اظہار ہے۔ اوپر خاندانِ عمران کا شجرہ، حضرت مریم کی ولادت اور ان کے بارے میں ان کی ماں کی نذر، حضرت زکریا کی بیٹے کے لیے دعا اور حضرت یحییٰ کی ولادت کے واقعات جو بیان ہوئے ہیں، سب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ذکر کی تمہید و تقریب کے طور پر بیان ہوئے ہیں۔ اب آگے یہ بیان ہو رہا ہے کہ جس طرح فرشتے نے حضرت زکریا کو بیٹے کی بشارت دی تھی اسی طرح فرشتے نے حضرت مریم کو بھی بشارت دی کہ ان کے ہاں اللہ کے کلمۂ 'کُن' کے ذریعے سے ایک فرزند کی ولادت ہوگی جس کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہوگا۔ جس طرح حضرت یحییٰ کے بابت ارشاد ہوا کہ وہ سردار، ضابط، نبی اور صالح ہوں گے اسی طرح عیسیٰ بن مریم کے بابت فرمایا کہ دنیا اور آخرت دونوں میں باوقار، مقرب اور صالح ہوں گے۔ پھر جس طرح حضرت زکریا نے اپنے بڑھاپے اور بیوی کے بانجھ پن کے باعث اس بشارت پر تعجب کا اظہار کیا اسی طرح حضرت مریم نے بھی تعجب کا اظہار فرمایا کہ جب انھیں کسی مرد نے ہاتھ نہیں لگایا تو انھیں اولاد کس طرح ہوگی۔ فرشتے نے جو جواب حضرت زکریا کو دیا تھا وہی جواب حضرت مریم کو دیا کہ اصل چیز اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، جب وہ کسی کام کے کرنے کا فیصلہ فرما لیتا ہے تو اس کو ہو جانے کا حکم دیتا ہے اور وہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اسی کلمۂ 'کُن' کے ذریعے سے وہ مسیح عیسیٰ بن مریم کو پیدا کرے گا اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے گا اور ان کو بنی اسرائیل کی طرف اپنا رسول بنا کر بھیجے گا۔

اس کے بعد تین آیتوں میں حضرت عیسیٰ کی زبان سے وہ ابتدائی پیغام ہے جو انھوں نے اپنی رسالت کے اثبات اور اس مقصد کے اظہار کے طور پر بنی اسرائیل کو دیا ہے۔

پھر دو آیتوں میں اس امر کا بیان ہے کہ جب بنی اسرائیل کے علما اور فقیہوں نے اپنی ضد اور ہٹ دھرمی سے آپ کو مایوس کر دیا تو آپ نے ان کو چھوڑ کر ان غریبوں کو اپنا معتمد اور ساتھی بنایا جو ان پر ایمان لائے تھے اور انھی کو اللہ کے دین کی نصرت و حمایت کے لیے کمربستہ ہونے کی دعوت دی۔ چنانچہ یہی غریب لوگ آپ کے ساتھی بنے اور حضرت نے انھی کو تبلیغِ دین کی مہم پر روانہ کیا۔

اس کے بعد چار آیتوں میں اس ردِ عمل کا ذکر ہوا ہے جو حضرت عیسیٰ کی اس آخری کوشش کا بنی اسرائیل کے لیڈروں، فقیہوں اور فریسیوں پر ہوا اور ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کی مدد فرمائی اور آئندہ مدد فرمانے کا وعدہ کیا اس کا حوالہ ہے۔

اس کے بعد پانچ آیتیں التفات کی ہیں جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے یہ واضح فرمایا کہ حضرت عیسیٰ کے بارے میں اصل حقیقت یہ ہے جو بیان ہوئی ہے۔ اگر اس وضاحت کے بعد بھی نصاریٰ تم سے حجت کرتے رہیں تو ان سے کہو کہ آؤ مباہلہ کریں، اگر وہ اس سے بھی گریز کریں تو سمجھ لو کہ یہ پکے مفسد ہیں، ان کا معاملہ اللہ کے حوالہ کرو۔ اب اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت کیجیے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

آیات ۴۵-۶۳

إِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ إِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ
مِّنْهُ ۖ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا
وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۴۵﴾ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ
وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۴۶﴾ قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ
وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا
يَشَآءُ ؕ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۴۷﴾
وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ﴿۴۸﴾
وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۬ۙ اَنِّيْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ
مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّيْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ
الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًاۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ
وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ
وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِيْ بُيُوْتِكُمْ ؕ
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۴۹﴾ وَ
مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ
بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۟
فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۵۰﴾ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ
هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۵۱﴾ فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ
قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ

اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۵۲﴾ رَبَّنَآ اٰمَنَّا
بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۵۳﴾
وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ﴿۵۴﴾ اِذْ قَالَ اللّٰهُ
يٰعِيْسٰٓى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ
فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۵۵﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۡ وَمَا
لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۵۶﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۷﴾ ذٰلِكَ
نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ ﴿۵۸﴾ اِنَّ مَثَلَ
عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ۭ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ
قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۵۹﴾ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ
الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۶۰﴾ فَمَنْ حَاۗجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَكَ مِنَ
الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَاۗءَنَا وَاَبْنَاۗءَكُمْ وَنِسَاۗءَنَا
وَنِسَاۗءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ۣ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ
اللّٰهِ عَلَي الْكٰذِبِيْنَ ﴿۶۱﴾ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَمَا
مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۶۲﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا

فَإِنَّ اللّٰهَ عَلِيمٌۢ بِالْمُفْسِدِينَ ﴿۶۳﴾

ع ۶
۱۴

ترجمۂ آیات ۴۵-۶۳

یاد کرو، جب فرشتوں نے کہا اے مریم! اللہ تمھیں اپنی طرف سے ایک کلمہ کی خوشخبری دیتا ہے۔ اس کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہوگا۔ وہ دنیا اور آخرت دونوں میں ذی وجاہت اور اللہ کے مقرّب بندوں میں سے ہوگا۔ وہ لوگوں سے گہوارے میں بھی بات کرے گا اور ادھیڑ ہو کر بھی اور وہ صالحین کے زمرے میں سے ہوگا۔ وہ بولی کہ اے میرے پروردگار میرے کس طرح لڑکا ہوگا جب کہ کسی مرد نے مجھے ہاتھ تک نہیں لگایا۔ ارشاد ہوا، ایسی طرح اللہ پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے۔ جب وہ کسی امر کا فیصلہ فرمالیتا ہے تو اس کو کہتا ہے کہ ہو جا سو وہ ہو جاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اس کو کتاب اور حکمت، تورات اور انجیل سکھائے گا اور اس کو بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجے گا، چنانچہ اس نے بنی اسرائیل کو دعوت دی کہ میں تمھارے خداوند کی طرف سے نشانی لے کر آیا ہوں —— میں تمھارے لیے مٹی سے پرندوں کی صورت کے مانند صورت بناتا ہوں پھر اس میں پھونک مار دیتا ہوں تو وہ اللہ کے حکم سے واقعی پرندہ بن جاتی ہے اور میں اللہ کے حکم سے اندھے اور کوڑھی کو اچھا اور مردوں کو زندہ کر دیتا ہوں اور میں تمھیں بتا سکتا ہوں جو کچھ تم کھاتے اور ذخیرہ کرتے ہو اپنے گھروں میں، بے شک ان باتوں کے اندر تمھارے لیے نشانی ہے اگر تم ایمان رکھنے والے ہو۔

اور میں مصداق ہوں اپنے سے پیشتر سے آئی ہوئی تورات کا اور اس لیے آیا ہوں کہ بعض ان چیزوں کو تمھارے لیے حلال ٹھہراؤں جو تم پر حرام کر دی گئی ہیں اور میں تمھارے پاس تمھارے خداوند کی طرف سے نشانی لے کر آیا ہوں تو اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو، بے شک اللہ ہی میرا بھی رب ہے، تمھارا بھی رب ہے تو اسی کی بندگی کرو۔ یہی

سیدھی راہ ہے۔ ۴۵-۵۱

پس جب عیسیٰ نے ان کی طرف سے کفر کو بھانپ لیا تو اس نے دعوت دی کہ کون میرا مددگار بنتا ہے اللہ کی راہ میں؟ حواریوں نے جواب دیا کہ ہم ہیں اللہ کے مددگار اور آپ گواہ رہیئے کہ ہم مسلم ہیں۔ اے ہمارے پروردگار ہم ایمان لائے اس چیز پر جو تو نے اتاری اور ہم نے رسول کی پیروی کی سو تو ہم کو گواہی دینے والوں میں لکھ۔ ۵۲-۵۳

اور انھوں نے خفیہ چالیں چلیں تو اللہ نے بھی ان کا خفیہ توڑ کیا اور اللہ بہترین توڑ کرنے والا ہے۔ جب کہ اللہ نے کہا کہ اے عیسیٰ میں تمھیں قبض کر لینے والا ہوں اور اپنی طرف اٹھا لینے والا ہوں اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے ان سے تمھیں پاک کرنے والا ہوں۔ جن لوگوں نے تمھاری پیروی کی ہے ان کو قیامت تک کے لیے ان لوگوں پر غالب کرنے والا ہوں جنھوں نے تمھارا انکار کیا ہے۔ پھر میری طرف تم سب کا پلٹنا ہوگا اور میں تمھارے درمیان ان چیزوں کے بارے میں فیصلہ کروں گا جن میں تم اختلاف کرتے رہے ہو۔ تو جن لوگوں نے کفر کیا ان کو سخت عذاب دوں گا، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، اور ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔ رہے وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے تو ان کو ان کا پورا اجر دے گا اور اللہ ظالموں کو دوست نہیں رکھتا۔ ۵۴-۵۷

یہ ہم تمھیں سنا رہے ہیں اپنی آیات اور اپنی پر حکمت یاددہانی میں سے۔ عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم کی سی ہے۔ اس کو مٹی سے بنایا، پھر اس کو امر کیا کہ ہو جا تو وہ ہو گیا۔ یہی بات تمھارے رب کی طرف سے حق ہے تو تم شک کرنے والوں میں سے نہ بنو۔ سو جو تم سے اس بارے میں حجت کریں بعد اس کے کہ تمھارے پاس صحیح علم آچکا ہے تو ان سے

کہو کہ آؤ، ہم اپنے بیٹوں کو بلائیں، تم اپنے بیٹوں کو بلاؤ، ہم اپنی عورتوں کو جمع کریں تم اپنی عورتوں کو جمع کرو، ہم اپنے آپ کو اکٹھا کریں تم اپنے آپ کو اکٹھا کرو، پھر ہم مل کر دعا کریں اور جھوٹوں پر لعنت بھیجیں۔ بے شک یہی سچا بیان ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اللہ ہی عزیز و حکیم ہے۔ پس اگر وہ اعراض کریں تو اللہ مفسدوں کو خوب جانتا ہے۔ ۵۸-۶۳

۴۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

إِذْ قَالَتِ الْمَلَٰٓئِكَةُ يَٰمَرْيَمُ إِنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ (۴۵)

'اِذْ' کا اعادہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں جو بات کہی جا رہی ہے یہ اس سے الگ ہے جو اوپر کہی گئی۔ پہلے حضرت مریم کو دعا اور عبادت میں مشغول ہو جانے کی تاکید ہوئی پھر کچھ عرصے کے بعد فرشتہ یہ بشارت لے کر حضرت مریم کے پاس آیا۔

'کلمہ' کا مفہوم اور اس کے نکرہ لانے کا فائدہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ یہاں موقع کی رعایت سے ایک نکتہ توجہ کے لائق ہے۔ وہ یہ کہ اصل بشارت تو یہ تھی کہ حضرت مریمؑ کے ہاں بغیر مرد کی ملاقات کے مجرد اللہ تعالیٰ کے امر و حکم سے ایک بیٹا ہوگا لیکن بات حضرت مریم سے کہی جا رہی تھی جو کنواری بھی تھیں اور شرم و حیا کی پیکر بھی۔ اس وجہ سے نہایت اختصار بلکہ ابہام کے ساتھ صرف کلمہ کی بشارت دی گئی۔ البتہ آگے حضرت عیسیٰؑ کے نام اور صفات کے ذکر سے بات واضح ہو گئی کہ کلمہ سے مراد کیا ہے۔

'مسیح' لقب ہے: 'مسیح' حضرت عیسیٰؑ کا لقب ہے۔ لقب کے لیے قاعدہ یہ ہے کہ نام سے پہلے اس کو لاتے ہیں۔ بنی اسرائیل میں یہ روایت رہی ہے کہ ان کے ہاں جو نبی ہونے والا ہوتا اس کے سر پر اس کا پیشرو نبی ایک قسم کا مقدس تیل مل کر اس کو اپنا جانشین بناتا۔ جب نبوت کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں بادشاہی کا سلسلہ شروع ہوا تو مسح کرنے کی یہی روایت بادشاہوں کے لیے بھی اختیار کی گئی۔ جو وقت کا نبی ہوتا وہ ہونے والے بادشاہ کے سر پر مقدس تیل ملتا جس سے واضح ہو جاتا کہ یہ مستقبل کا بادشاہ بھی ہے اور خدا کا برگزیدہ بھی۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ طالوت اور حضرت داؤدؑ کو سموئیل نبی نے اسی طرح مامور کیا تھا۔ حضرت مسیحؑ کے بارے میں انجیلوں سے یہ تو ثابت ہے کہ حضرت یحییٰؑ نے ان کو بپتسمہ دیا لیکن تیل ملنے

کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ پیدائشی مسیح تھے۔ بخاری شریف میں ان کا جو حلیہ بیان ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے سر کا حال یہ تھا کہ گویا اس سے تیل ٹپک رہا ہے۔ ممکن ہے ان کی اس خصوصیت کی وجہ سے ان کو مسیح کا لقب عنایت ہوا ہو۔ انجیل میں ان کے لیے "خدا کا مسیح" کے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں۔

'وجیہ' کا مفہوم حضرت مسیحؑ کی وجاہت کے بعض پہلو

'وجیہ' کے لفظ سے اس سرداری کی شان کی طرف اشارہ ہو رہا ہے جس کا ذکر اوپر حضرت یحییٰؑ کے بیان میں گزر چکا ہے۔ لوقا کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲ سال کی عمر میں حضرت مسیحؑ نے پہلی بار ہیکل میں تعلیم دی لیکن اس کم سنی کے باوجود ان کی تعلیم کی حکمت و معرفت، کلام کی بلاغت و جزالت اور لب و لہجہ کی عظمت و جلالت کا عالم یہ تھا کہ فقیہ اور فریسی، سردار کاہن اور ہیکل کا تمام عملہ دم بخود رہ گیا۔ وہ حیرانی کے عالم میں ایک ایک سے پوچھتے پھرتے تھے کہ یہ کون ہے جو اس شکوہ سے بات کرتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ آسمان سے اس کو اختیار ملا ہوا ہے۔ یہودیہ کی بستیوں میں جب انھوں نے تبلیغ شروع کی تو ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہلچل مچ گئی۔ خلقت ان پر ٹوٹی پڑتی تھی۔ فقیہ اور فریسی سب پر ایک سراسیمگی کا عالم تھا، وہ ان کو زچ کرنے اور عوام میں ان کی مقبولیت کم کرنے کے لیے ان سے طرح طرح کے سوالات کرتے لیکن سیدنا مسیحؑ دو دو لفظوں میں ان کو ایسے دندان شکن جواب دیتے کہ پھر ان کو زبان کھولنے کی جرأت نہ ہوتی۔ تھوڑے ہی دنوں میں ان کی وجاہت کا یہ غلغلہ ہوا کہ عوام ان کو اسرائیل کا بادشاہ کہنے اور ان کی بادشاہی کے گیت گانے لگے، یہاں تک کہ رومی حکام ــــ ہیرودیس اور پیلاطوس ــــ کے سامنے بھی یہ مسئلہ ایک نہایت اہم مسئلہ کی حیثیت سے آ گیا لیکن وہ بھی اپنی تمام قوت و جبروت کے باوجود سیدنا مسیحؑ کی عظمت و صداقت اور ان کی بے پناہ مقبولیت سے مرعوب ہو گئے۔

اس وجاہت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ باوجودیکہ سیدنا مسیح بن باپ کے پیدا ہوئے اور بن باپ کے پیدا ہونے والے کسی بچے کے لیے عام حالات میں کسی عزت و وجاہت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا لیکن سیدنا مسیحؑ چونکہ اللہ تعالیٰ کے کلمۂ 'کن' سے پیدا ہوئے تھے اس وجہ سے اس کا معجزانہ اثر یہ ظاہر ہوا کہ روزِ اوّل سے ان کو خلق کی نگاہوں میں وہ وجاہت حاصل رہی جو اس عہد میں کسی کو بھی حاصل نہیں ہوئی۔ وہ زندگی بھر اپنے جانی دشمنوں میں گھرے رہے لیکن اس پہلو سے کسی کو ان پر طعن کرنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ یہود کے ایک گروہ نے اگر جسارت بھی کی تو بعد کے زمانوں میں کی، ان کے عہد مبارک میں کسی کو بھی اس قسم کی جرأت نہ ہو سکی۔ ان کی اس وجاہت کی بشارت ان کی ولادت کی بشارت کے ساتھ ہی حضرت مریمؑ کو اس لیے دی گئی کہ ان کو اس پہلو سے کوئی خلجان نہ ہو کہ بن باپ کے پیدا ہونے کے سبب سے بچے کی یا خود ان کی وجاہت پر کوئی اثر پڑے گا۔

اس کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ اس سے ان تمام خرافات کی تردید ہو رہی ہے جو انجیلوں میں مذکور ہیں کہ یہودیوں نے سیدنا مسیحؑ کے نعوذ باللہ طمانچے لگائے، ان کا مذاق اڑایا، ان کو گالیاں دیں، ان کے منہ پر تھوکا۔ ان خرافات کا اکثر حصہ، جیسا کہ ہم آگے واضح کریں گے، غلط ہے۔ اللہ کے رسولوں کے دشمن ان کی توہین و تحقیر کی جسارت تو کرتے ہیں اور اس سلسلے میں ایک حد تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو ڈھیل بھی مل جاتی ہے لیکن یہ ڈھیل بس ایک خاص حد تک ہی ہوتی ہے، جب کوئی قوم اس حد سے آگے بڑھنے کی جسارت کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو اپنی حفاظت میں لے لیتا ہے اور اس ناہنجار قوم کا بیڑا غرق کر دیا جاتا ہے۔ آگے اس سنت اللہ کی ہم وضاحت کریں گے۔

حضرت مسیحؑ، ابن مریم ہیں

اس آیت میں حضرت عیسیٰؑ کو ابن مریم کہہ کر قرآن نے ان لوگوں کے لیے گفتگو کی ہر گنجائش ختم کر دی ہے جو نہایت کمزور تاویلات کے ذریعے سے قرآن کے نہایت واضح نصوص کی تحریف کرنا چاہتے ہیں۔ اگر حضرت عیسیٰؑ کسی باپ کے بیٹے تھے تو آخر قرآن کو مسیح بن مریم کہنے کے بجائے ان کے باپ کی طرف ان کی نسبت کرنے میں کیا رکاوٹ تھی؟ قرآن بھی مسیحؑ بن یوسف کہہ سکتا تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کہا۔ آخر کیوں نہیں کہا؟

وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ (۴۶)

حضرت مسیحؑ کا کلام گہوارے میں

سیدنا مسیحؑ کا گہوارے میں بات کرنا حضرت مریم کی پاکدامنی کے اظہار کے لیے اللہ تعالیٰ کا ایک معجزہ تھا۔ اس معجزے کی بشارت بچے کی ولادت کی بشارت کے ساتھ ہی حضرت مریم کو اس لیے دے دی گئی کہ وہ مطمئن رہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اگر اپنی ایک عظیم نشانی کے ظہور کے لیے ان کو واسطہ بنایا ہے تو ان کے ناموس کو اعدا کی بد زبانیوں سے بچانے کے لیے بھی اس نے ایسا انتظام فرمایا ہے کہ کسی تہمت کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر نہایت مہربان ہے، یہ کس طرح ممکن تھا کہ وہ اپنی ایک مومنہ و قانتہ بندی کو ساری خدائی کی تہمتوں کا ہدف بنا دے اور اس کی مدافعت میں کوئی ایسی زبان نہ کھولے جو سب کی زبانیں بند کر دے۔

کہل کا مفہوم

'کہل' کے معنی ادھیڑ کے ہیں۔ موجودہ انجیلوں سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ ادھیڑ ہونے سے بہت پہلے دنیا سے رخصت ہو گئے تھے لیکن قرآن کی اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مریم کو ضمناً حضرت عیسیٰؑ کے کہولت تک پہنچنے کی بھی بشارت دی گئی تھی۔ رسولوں کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کی جو سنت رہی ہے اس کے لحاظ سے یہی بات صحیح معلوم ہوتی ہے۔ انجیل میں بھی بعض اشارات اس کی تائید میں ہیں۔ مثلاً یوحنا ۸: ۵۷ میں ہے۔

"اور یہودیوں نے اس سے کہا تیری عمر تو ابھی پچاس برس کی بھی نہیں ہے پھر کیا تو نے ابرہام کو دیکھا ہے۔"

ظاہر ہے کہ یہ بات ایسے ہی شخص کو مخاطب کر کے کہی جا سکتی ہے جو پچاس سال کے قریب پہنچ رہا ہو۔

گہوارے میں کلام کے ساتھ ان کے کہولت کے کلام کا حوالہ دینے سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ ان کی گہوارے کی بات بچوں کی سی نہیں ہوگی بلکہ اس کے اندر بھی پختہ سن و سال کی دانائی ہوگی، اس لیے کہ یہ بات من جانب اللہ ہوگی۔

آخر میں وَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ فرما کر، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، یہ واضح کر دیا کہ وہ صالحین کے زمرے میں سے ہوں گے یعنی ان تمام کمالات و اوصاف کے باوجود یہ نہیں ہے کہ ان کو الوہیت کا کوئی درجہ حاصل ہو جائے، بس وہ اللہ کے صالح بندوں میں سے ہوں گے۔

قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (۴۷)

آیت ۴۵ کے تحت اس آیت کے اہم اجزا کی وضاحت گزر چکی ہے۔ البتہ اس میں اس کلمہ کی وضاحت بھی ہو گئی ہے جس سے حضرت عیسیٰ کی ولادت ہوئی۔ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (اللہ جب کسی امر کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اس کو حکم دیتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے)

وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ (۴۸)

انجیل مجموعۂ حکمت ہے

تورات اور انجیل کے الفاظ یہاں کتاب اور حکمت کی تفسیر کے طور پر ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ان دونوں چیزوں کی تعلیم دے گا۔ سیدنا مسیح جہاں تک کتاب و شریعت کا تعلق ہے حضرت موسیٰ کی شریعت ہی کے پیرو اور داعی تھے، وہ تورات سے کوئی الگ شریعت لے کر نہیں آئے تھے۔ اس حقیقت کا اعلان بار بار بڑے زور اور تاکید کے ساتھ انھوں نے خود فرمایا ہے۔ انجیلوں میں ان کی تصریحات موجود ہیں۔ البتہ انھوں نے اس شریعت کی روح اور اس کی حکمت نہایت معجزانہ انداز میں بے نقاب فرمائی ہے اور اناجیل درحقیقت ان کی انھی حکمتوں کا مجموعہ ہیں۔ یہود نے تورات کو بالکل بے روح احکام اور بے جان رسوم کا مجموعہ بنا کر رکھ دیا تھا اس وجہ سے ان کی شریعت زندگی سے بالکل خالی ان کے لیے صرف ایک بوجھ بن کر رہ گئی تھی۔ حضرت مسیح نے اس کے اندر اپنی تعلیم حکمت سے زندگی پیدا کی لیکن یہود نے اس کی قدر نہ کی۔

وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ اَنِّيْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّيْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًاۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِيْ بُيُوْتِكُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۴۹)

نبی اور رسول میں فرق

رَسُوْلًا سے پہلے ایک فعل محذوف ہے۔ یعنی یَبْعَثُہٗ رَسُوْلًا سیدنا مسیح حضرت یحییٰ کی طرح صرف ایک نبی نہیں تھے بلکہ جس طرح حضرت موسیٰؑ فرعون اور اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے اسی طرح یہ بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے۔ رسول اور نبی میں فرق ہوتا ہے رسول جس قوم کی طرف بھیجا جاتا ہے اس کے لیے خدا کی عدالت بن کر آتا ہے۔ اس کے لازماً اس قوم کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ اگر وہ ایمان لاتی ہے تو نجات پاتی ہے اور اگر اپنے کفر پر اڑی رہ جاتی ہے اور اپنے نبی کو گزند پہنچانے کی کوشش کرتی ہے تو فنا کر دی جاتی ہے۔ اس حقیقت کی طرف حضرت یحییٰؑ نے مختلف اسلوبوں سے اشارہ فرمایا تھا۔ مثلاً یہ کہ میں تو تمھیں پانی سے بپتسمہ دے رہا ہوں، پر جو آ رہا ہے وہ تمھیں آگ سے بپتسمہ دے گا، یا یہ کہ، اب درختوں کی جڑوں پر کلہاڑا رکھا ہوا ہے؛ یا یہ کہ، اس کے ہاتھ میں اس کا چھاج ہوگا اور وہ اپنے کھلیان کو اچھی طرح پھٹکے گا اور گندم کو بھس سے علیحدہ کرے گا، اس کی پوری تفصیل دوسرے مقام میں آئے گی۔

اس سے حضرت عیسیٰ کی رسالت کا بنی اسرائیل کے لیے خاص ہونا بھی واضح ہو گیا۔ سیدنا مسیح کا خود اپنا اعلان بھی یہی ہے۔ انھوں نے جب اپنے حواریوں کو تبلیغ دین کی مہم پر روانہ کیا تو ان کو غیر بنی اسرائیل کی طرف جانے سے نہایت صاف لفظوں میں روک دیا۔ انھوں نے فرمایا کہ 'میں صرف بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں ہی کی تلاش کے لیے آیا ہوں'۔ ایک غیر اسرائیلی عورت ان سے دعائے شفا کی طالب ہوئی تو انھوں نے اس جواب میں یہی کہا کہ 'بچوں کے حصے کی روٹی کتوں کے آگے ڈالنا ٹھیک نہیں'۔ انجیل میں ضیافت والی جو تمثیل ہے اس میں بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ آپ کی دعوت جن معروفات پر مبنی تھی یہ معروفات بنی اسرائیل کے لیے دلیل و حجت بن سکتے تھے لیکن دوسری قوموں کے لیے ان کا سمجھنا ممکن نہیں تھا۔ اس وجہ سے یہ دعوت اپنی فطرت ہی کے لحاظ سے دوسری قوموں کے لیے بالکل ناموزوں تھی۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ دوسری قوموں نے، جن کے سامنے یہ دعوت پیش کی گئی، اس کو بالکل نہیں سمجھا۔ انھوں نے انجیلوں سے بس یہ سمجھا کہ حضرت عیسیٰ نے بے شمار معجزے دکھائے ہیں۔ اس کا جو اثر ان پر پڑا وہ یہ کہ انھوں نے ان معجزات کے بل پر ان کو ایک معبود بنا کر رکھ دیا۔

سرگزشتوں کے بیان میں غیر ضروری حصے کا حذف

اِنِّیْ قَدْ جِئْتُکُمْ بِاٰیَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ یہاں رَسُوْلًا اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ کے بعد حضرت مسیح کی سرگزشت کا وہ سارا حصہ حذف ہے جو اس بشارت اور ان کے عملاً بنی اسرائیل کے سامنے دعوتِ رسالت لے کر اٹھنے کے درمیان کی مدت سے تعلق رکھنے والا ہے۔ قرآن نے انبیا علیہم السلام کی سرگزشتوں کے بیان میں حذف کا یہ طریقہ بہت استعمال کیا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ قاری کی توجہ کلام کے اصل مقصد پر مرکوز رہتی ہے، کوئی زائد چیز بیچ میں مخل نہیں ہونے پاتی۔ یہاں بھی یہی صورت ہے۔ ان کے مقصد بعثت کو واضح کر دینے کے بعد گویا ان کو داعی بنا کر بنی اسرائیل کے سامنے کھڑا کر دیا کہ انھوں نے ان کو یہ دعوت

دی اور اپنی رسالت کے ثبوت میں یہ نشانیاں دکھائیں۔

تورات اور قرآن کے بیان کا ایک فرق

یہاں جو معجزات مذکور ہیں ان میں سے پہلے اور آخری کے سوا انجیل میں بھی سب مذکور ہیں۔ البتہ قرآن میں ان میں سے ہر ایک کے ساتھ باذن اللہ کی قید لگی ہوئی ہے لیکن انجیل میں اس قسم کی تصریحات غائب ہیں۔ اس لیے کہ جب حضرت عیسیٰؑ کے لیے خدا کا تصور پیدا ہوا ہوگا تو اس قسم کے الفاظ خدائی کے تصور سے بے جوڑ سمجھ کر نکال دیے گئے ہوں گے۔ لیکن یہ لوگ کہاں کہاں حقائق کو چھپاتے، ان کی ساری کوششوں کے علی الرغم آج بھی انجیلوں میں توحید خالص کی ایسی شہادتیں موجود ہیں کہ حیرت ہوتی ہے کہ ان روشن شواہد کے ہوتے ہوئے نصاریٰ شرک میں کس طرح مبتلا ہو گئے؟ آگے بعض چیزوں کی طرف ہم اشارہ کریں گے۔

نکرہ وحدت کے لیے نہیں بلکہ تعمیم کے لیے

'جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ' لفظ آیت' کی تنکیر وحدت کو نہیں بلکہ تعمیم کو ظاہر کرتی ہے۔ یعنی میں اپنی رسالت کے ثبوت میں اپنے رب کی طرف سے نشانی لے کر آیا ہوں۔ اس سے قطع نظر کہ ان کی تعداد کیا ہے۔

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ (۵۰)

'مصدقاً لما بین یدی' کے دو مفہوم

'مُصَدِّقًا' ہے تو حال لیکن یہ محض مشابہت کی وجہ سے سابق جملے پر عطف ہو گیا ہے۔ اس کے دو مفہوم ہیں اور ان دونوں مفہوموں کی دوسرے مقام میں ہم وضاحت کر چکے ہیں۔ ایک یہ کہ میں تورات کی تصدیق کرتا ہوں۔ اس تصدیق کے شواہد انجیلوں میں موجود ہیں۔ حضرت مسیح نے بڑے زور اور بڑی تاکید کے ساتھ یہ بات بار بار فرمائی ہے کہ میں تورات کو منسوخ کرنے نہیں بلکہ اس کو قائم کرنے آیا ہوں۔ انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ آسمان اور زمین ٹل جائیں گے لیکن اس کا (تورات) ایک نقطہ بھی نہیں ٹل سکتا جب تک ہر بات پوری نہ ہو لے۔ انھوں نے عملاً جس شریعت کی خود پیروی کی اور جس کی پیروی کی ہدایت اپنے پیرؤوں کو دی وہ تورات ہی کی شریعت تھی۔ انھوں نے تورات پر جو اضافہ فرمایا ہے وہ شریعت کا نہیں بلکہ صرف حکمت کا ہے اور اس اضافے کی نوعیت یہ ہے کہ انھوں نے تورات کے اس باطن کو کھول دیا ہے جس سے یہود کے علما اور فریسیوں کی آنکھیں بند تھیں۔ ان کے نام لیواؤں نے تورات سے بغاوت کا اعلان توپال کے زمانے سے کیا ہے۔

دوسرا یہ کہ میں تورات کی پیشین گوئیوں کا مصداق ہوں، میرے ظہور سے ان کی تصدیق ہوئی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیشرو نبیوں سے ایسی پیشین گوئیاں موجود تھیں جن کی بنا پر یہود کو ایک نبی کی بعثت کا انتظار تھا۔ چنانچہ حضرت عیسیٰؑ کی شہرت ہوئی تو بہت سے حلقوں میں یہ چرچا ہونے لگا کہ جس کا انتظار تھا وہ آگیا۔ بعض لوگ اس منتظر کا نام ایلیا لیتے تھے۔ انجیلوں میں حضرت یوحنا کے متعلق بھی منقول ہے کہ جب وہ ہیرودیس کے حکم سے جیل میں تھے تو انھوں نے اپنے چند شاگردوں کو

حضرت مسیح کی خدمت میں بھیج کر پچھوایا کہ وہ جس کا انتظار تھا تو ہی ہے، یا ہم کسی اور کا انتظار کریں؟ حضرت مسیح نے پیغام لانے والوں سے کہا کہ جو کچھ دیکھ رہے ہو وہ جا کر بتا دو کہ "لنگڑے چل رہے ہیں، گونگے بول رہے ہیں، اندھے دیکھ رہے ہیں، اب اور کس بات کا انتظار ہے"؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے متعدد ایسی باتوں کا خود بھی حوالہ دیا ہے جو ان کے بارے میں پچھلے نبیوں نے فرمائی ہیں۔ یہ حوالے انجیلوں میں موجود ہیں۔

حضرت مسیح نے کئی حرام کردہ چیزوں کو حلال ٹھہرایا

'وَلِاُحِلَّ لَکُمۡ بَعۡضَ الَّذِیۡ حُرِّمَ عَلَیۡکُمۡ' یہ جملہ بھی معنی پر عطف ہے۔ بعض حرام کردہ چیزوں کے حلال کرنے سے ان چیزوں کو حلال کرنا مراد ہے جو علمائے یہود نے محض اپنے من گھڑت فتووں اور اپنے غلو کی وجہ سے حرام کر رکھی تھیں اور یہ چیزیں روایت بن کر شریعت میں داخل ہو گئی تھیں۔ مثال کے طور پر سبت کے احترام کے مسئلہ کو لیجیے۔ اس حکایت کو یہود کے فقیہوں اور فریسیوں نے اس قدر بڑھا دیا تھا کہ سبت کے دن کسی مریض کو شفا کی دعا دینا بھی ان کے نزدیک احترام سبت کے منافی تھا چنانچہ احترام سبت کے مسئلے پر حضرت مسیح اور علمائے یہود کے درمیان متعدد مناظروں کا ذکر انجیلوں میں بھی ہے۔ اسی طرح متعدد ایسی روایات کا بھی انجیلوں میں ذکر ہے جن کو سیدنا مسیح اور ان کے شاگردوں نے علانیہ توڑا اور جب ان کے توڑنے پر علمائے یہود نے ان پر بے دینی کا الزام لگایا تو آپ نے ان کی اس جھوٹی دینداری کی اچھی طرح قلعی کھولی۔

إِنَّ اللّٰهَ رَبِّیۡ وَرَبُّکُمۡ فَاعۡبُدُوۡهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسۡتَقِیۡمٌ (۵۱)

خدا کے لیے لفظ 'اب' کے استعمال کی حقیقت

انجیلوں میں خدا کے لیے 'میرا باپ اور تمھارا باپ' کی جو تعبیر بار بار آتی ہے یہ قرآن نے اس کی تصحیح فرمائی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دراصل جو بات فرمائی تھی وہ یہ تھی کہ اللہ ہی میرا رب بھی ہے اور تمھارا رب بھی، سو اسی کی بندگی کرو۔ لیکن نصاریٰ نے متشابہات کی پیروی کی اور آپ کی واضح تعلیمات کو نظر انداز کر دیا۔ عبرانی میں 'اب' کا لفظ باپ اور رب دونوں معنوں کے لیے استعمال ہوتا ہے، اسی طرح ابن کا لفظ بیٹے اور عبد دونوں معنوں میں آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب کوئی لفظ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے تو سیاق و سباق متعین کرتا ہے کہ لفظ کس مفہوم میں استعمال ہوا ہے لیکن جب نصاریٰ نے حضرت مسیح کی الوہیت کا عقیدہ بنا لیا تو جو چیز بھی انھیں مفید مطلب نظر آئی اس کو انھوں نے اسی عقیدے کی تائید میں استعمال کر لیا قطع نظر اس سے کہ اس کا موقع و محل کیا ہے۔ پھر جب اصل انجیل کی جگہ صرف اس کے ترجمے رہ گئے تو ہر چیز کی تعبیر بھی یک قلم بدل کے کچھ سے کچھ ہو گئی لیکن ان ساری تحریفات کے باوجود آج بھی انجیل میں ایسی تصریحات موجود ہیں جن سے صاف واضح ہے کہ حضرت مسیح جب خدا کو 'اب' کہتے ہیں تو اس سے ان کی مراد 'رب' ہی ہوتی ہے چنانچہ بعض مقامات میں انھوں نے دوسرے مترادف اس لفظ کے استعمال کر کے مطلب کو بالکل واضح کر دیا ہے چنانچہ یوحنا

باب ۲۰ : ۱۸ میں ہے :-

> لیکن میرے بھائیوں کے پاس جا کر ان سے کہہ کہ میں اپنے باپ اور تمہارے باپ اور اپنے خدا اور تمہارے خدا کے پاس اوپر جاتا ہوں ۔

اس ارشاد سے صاف واضح ہے کہ حضرت عیسیٰ جس معنی میں اللہ تعالیٰ کو اپنا 'اب' کہتے ہیں اس معنی میں وہ اس کو تمام خلق کا 'اب' کہتے ہیں اور اس سے یہ بھی واضح ہے کہ وہ اس لفظ کو اللہ تعالیٰ کی تعبیر کے لیے اس کی ربوبیت کے پہلو سے استعمال کرتے ہیں نہ کہ اس کے ساتھ اپنا نسبی رشتہ جوڑنے کے لیے علاوہ ازیں وہ خدا کے لیے خدا کی تعبیر بھی استعمال کرتے ہیں اور اس کو جس طرح دوسروں کا خدا کہتے ہیں اسی طرح اس کو اپنا بھی خدا کہتے ہیں۔

توحید صراط مستقیم ہے

هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ یعنی خدا تک پہنچنے کی سیدھی راہ یہی ہے کہ اسی کو سب کا رب مانا جائے اپنا بھی اور دوسروں کا بھی اور اسی کی عبادت کی جائے ۔ جن لوگوں نے دوسرے وسیلے اور واسطے بیچ میں پیدا کر لیے ہیں انھوں نے اس سیدھی راہ میں بہت سے کج پیچ پیدا کر لیے ہیں جس کے سبب سے وہ شرک و گمراہی کی وادیوں میں بھٹک گئے ہیں۔ یہ راہ بغیر کسی کجی (عوج) کے ہے، یہ سیدھی خدا تک پہنچاتی ہے ۔ نکرہ یہاں اس شاہراہ فطرت کی اہمیت و شان کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝ رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ (۵۲-۵۳)

حواری کا مفہوم

حواری کا لفظ عربی میں عبرانی سے آیا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے لغوی مفہوم میں اہل لغت کا اختلاف ہے ۔ ہمارے نزدیک اس کے معنی خیر خواہ، حامی، ناصر اور مددگار کے ہیں۔ جس طرح لفظ انصار مدینہ کے ان جانثاروں کے لیے خاص ہوا جنھوں نے ابتدائے دعوت ہی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیا اسی طرح 'حواریین' کا لفظ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ان خاص شاگردوں کے لیے استعمال ہوا جو آپ پر ایمان لائے، ہر قسم کے نرم و گرم حالات میں آپ کے ساتھ رہے، آپ نے پوری شفقت اور دل سوزی سے شب و روز جن کی تعلیم و تربیت کی اور جو بالآخر آپ کے داعی، نقیب اور آپ کے پیغام بر بن کر بنی اسرائیل کی ایک ایک بستی میں پہنچے۔ ان شاگردوں کا ذکر تفصیل کے ساتھ انجیل میں موجود ہے۔

انصار کا مفہوم

'انصار' ناصر کی بھی جمع ہے اور نصیر کی بھی۔ معنی واضح ہیں۔ ہمارے نزدیک، جیسا کہ اوپر ہم نے اشارہ کیا، معنی کے اعتبار سے انصار اور حواریین کے لفظ میں کچھ ایسا فرق نہیں ہے ۔ چنانچہ اسی اشتراک معنوی کے پہلو سے حواریین کو قرآن نے، جیسا کہ ہم سورۂ صف میں بتائیں گے، انصار مدینہ کے سامنے بطور مثال پیش کیا ہے۔

آیت ۵۲ کا مطلب

آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب حضرت عیسٰی علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے علماء اور سرداروں کے رویے سے یہ محسوس کر لیا کہ یہ لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں تو انھوں نے اپنی ساری توجہ اپنے ان غریب ساتھیوں کی طرف پھیر دی جو اگرچہ منصب وجاہ نہیں رکھتے تھے لیکن دولت ایمان سے متمتع تھے۔ انبیا علیہم السلام کی یہ سنت رہی ہے کہ اول اول تو انھوں نے اپنی اپنی قوموں کے با اثر لوگوں کو جھنجھوڑنے اور جگانے کی کوشش کی ہے لیکن جب انھوں نے یہ دیکھ لیا ہے کہ یہ خواب غفلت کے ماتے لوگ کروٹ بدلنے والے نہیں ہیں تو انھوں نے ان سرمستوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر اپنی ساری توجہ اپنے غریب باایمان ساتھیوں پر مرکوز کر دی ہے۔ قرآن مجید میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار سے اعراض کرنے اور اہل ایمان کو تذکیر کرنے کی جو بار بار ہدایت ہوئی ہے وہ اسی مرحلے کی بات ہے۔ اور یہی مرحلہ ہے جس میں سیدنا مسیح نے دریا کے کنارے کے ماہی گیروں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اے مچھلیوں کے پکڑنے والو آؤ، میں تمھیں آدمیوں کا پکڑنے والا بناؤں۔

انبیاء کے کردار کا ایک پہلو

اس آیت سے حضرات انبیاء علیہم السلام کے کردار پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ وہ حالات کے بگاڑ اور قوم کی ہٹ دھرمی سے مایوس اور دل شکستہ نہیں ہوتے بلکہ خدا کی راہ میں وہ اپنی جدوجہد جاری رکھتے ہیں۔ اگر زور و اثر رکھنے والے لوگ ان کا ساتھ نہیں دیتے تو وہ اپنے غریب، وفادار اور کمزور و بے اثر ساتھیوں ہی کو لے کر اپنا سفر شروع کر دیتے ہیں۔ حالات کی تاریکی ان کے اندر روشنی اور قوم کی بے مہری ان کے اندر مزید قوت اور عزم پیدا کرتی ہے۔ بقول

حدی را تیز ترمی خواں چو محمل را گراں بینی

سورہ نوح کی تفسیر میں انبیاء کے کردار کے اس پہلو پر انشاءاللہ ہم تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے۔

مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ کا مفہوم

'مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ' سے ایک طرف تو اس جوش دعوت کا اظہار ہو رہا ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، دوسری طرف ان کے اس اقدام اور اس عزم و جزم کا اظہار ہو رہا ہے جو اللہ کے سوا ہر معیت و رفاقت سے بالکل بے نیاز ہوتا ہے۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ دعوت کی اس للکار میں یہ مضمون بھی مضمر ہے کہ میں تو اپنے رب کی راہ پر، یہ دیکھو، چل کھڑا ہوا ہوں، اب جس کے اندر حوصلہ ہو وہ اس وادی پرخار میں میرا ساتھ دے۔

نبی کا یہ فیصلہ کن عزم مردوں کے اندر بھی زندگی کی لہر دوڑا دینے کا اثر رکھتا ہے۔ جن روحوں کے اندر کچھ صلاحیت ہوتی ہے وہ نہ صرف یہ کہ بیدار ہو جاتی ہیں بلکہ تڑپ اٹھتی ہیں اور جب تڑپ اٹھتی ہیں تو برسوں کی منزل لمحوں میں طے کر لیتی ہیں۔ جو لوگ عربی کے اداشناس ہیں ان کے لیے یہاں ایک نکتہ قابل ذکر ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے تو فرمایا کہ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ لیکن حواریین نے جو جواب دیا وہ یہ نہیں ہے کہ نَحْنُ اَنْصَارُکَ اِلَی اللّٰہِ بلکہ بے دھڑک جواب دیا کہ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ۔ سیدنا مسیح کے ارشاد

زبان کا ایک نکتہ

میں رُانی اس مسافت کو واضح کر رہا ہے جو راہ اور منزل کے درمیان واقع ہے اور ایک داعی کی حیثیت سے ان کے شایانِ شان یہی تھا کہ اس راہ کی مشکلات اور درمیان کی مسافت سے آگاہ کر دیں لیکن حواریین نے اپنے جواب میں جوشِ فدویت کی ایک ہی جست میں گویا ساری مسافت طے کر لی ہے اور دعوتِ حق کے اس نازک مرحلے میں ان کے جذبۂ ایمان و اسلام کے شایانِ شان بات یہی تھی۔

یہاں یہ بات بھی ملحوظ رکھنے کی ہے کہ حضرت مسیحؑ کے سوال میں تو بڑا اختصار ہے لیکن حواریین کے جواب میں بڑی تفصیل ہے۔ انھوں نے اپنے ایمان کا بھی اقرار کیا، اپنے مسلم ہونے پر بھی حضرت مسیحؑ کو گواہ ٹھہرایا، اور اپنے ایمان و اتباعِ رسول کے اقرار کے ساتھ خدا سے دعا بھی کی کہ ان کو حق کی شہادت دینے والوں میں لکھا جائے۔

نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ کے مضمرات

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حواریین اس بات کو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اللہ کے انصار میں سے ہونے کے معنی کیا ہیں اور یہ اجمال کن تضمنات و مضمرات پر مشتمل ہے۔ معلوم ہوا کہ اس کے تقاضوں میں سے یہ ہے کہ خدا پر صدقِ دل سے ایمان لایا جائے، اس کے جملہ احکام کی بے چون و چرا پیروی کی جائے، جو کچھ اس نے اتارا ہے اس کو مانا جائے، اس کے بھیجے ہوئے رسول کی پیروی کی جائے اور قول، عمل، زندگی اور موت سے اس حق کی شہادت دی جائے جس کا خدا نے امین بنایا ہے۔ یہی وہ شہادت ہے جو اگر جان دے کر دی جائے تو اصل شہادت کا درجہ حاصل کرتی ہے۔

یہ بات بھی یاد رکھیے کہ حواریین نے سیدنا مسیحؑ کو جس چیز پر خاص طور پر گواہ ٹھہرایا ہے وہ اپنا مسلم ہونا ہے۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ حواریین کے ذہن میں صرف اسلام اور مسلم کا تصور تھا، نصاریٰ اور نصرانیت کا کوئی تصور نہیں تھا۔ یہ بات اس سورہ کے عمود سے تعلق رکھتی ہے۔ ہم سورہ کے تمہیدی مباحث میں واضح کر چکے ہیں کہ اس سورہ کا عمود اسلام ہے۔

فَاکْتُبْنَا مَعَ الشّٰھِدِیْنَ، یہ اس بات کی دعا ہے کہ قیامت کے روز ان کا شمار حق کی شہادت دینے والوں میں لکھا ہو، حق کو چھپانے والوں میں نہ لکھا جائے۔ یہی شہادتِ حق وہ اصل ذمہ داری ہے جو ہر نبی کی امت پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈالی جاتی ہے۔ نبی، جان کی بازی لگا کر امت پر اللہ کے دین کی گواہی دیتا ہے اور نبی کے بعد یہ امت کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ اس حق کی گواہی، ہر طمع اور ہر خوف سے بے پروا ہو کر، خلق پر دے۔ یہ گواہی دل، زبان، قول، عمل اور جان و مال کی قربانی، ہر پہلو سے دینے کا مطالبہ ہے۔ اس شہادت کا ضد کتمانِ حق ہے جو شریعتِ الٰہی کے شدید ترین جرائم میں سے ہے۔ مذاہب کی تاریخ سے ثابت ہے کہ یہود اس جرم کے سب سے بڑے مجرم ہوئے ہیں اور یہ جرم من جملہ ان جرائم کے ہے جن کے سبب سے وہ اللہ تعالیٰ کی لعنت کے مستحق قرار پائے۔ حواریین کی اس دعا کے باطن پر غور کیجیے تو محسوس ہوگا کہ اس میں یہود کی اس حق پوشی پر بالواسطہ تعریض بھی ہے۔

اس آیت کا مضمون تھوڑے سے تغیرِ الفاظ کے ساتھ سورۂ صف میں بھی بیان ہوا ہے۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ كُونُوٓا۟ أَنصَارَ ٱللَّهِ	اے ایمان والو، اللہ کے مددگار بن جاؤ، جیسا کہ
كَمَا قَالَ عِيسَى ٱبْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيِّـۧنَ مَنْ	عیسٰی بن مریم نے حواریوں سے کہا کہ کون اللہ کی راہ
أَنصَارِىٓ إِلَى ٱللَّهِ ۖ قَالَ ٱلْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ	میں میرا مددگار بنتا ہے؟ حواریوں نے جواب دیا
أَنصَارُ ٱللَّهِ ۖ فَـَٔامَنَت طَّآئِفَةٌ مِّنۢ بَنِىٓ	کہ ہم ہیں اللہ کے مددگار۔ تو بنی اسرائیل کا ایک
إِسْرَٰٓءِيلَ وَكَفَرَت طَّآئِفَةٌ ۖ فَأَيَّدْنَا	گروہ ایمان لایا اور ایک گروہ نے کفر کیا، پس ہم
ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ عَلَىٰ عَدُوِّهِمْ فَأَصْبَحُوا۟	نے ایمان لانے والوں کی ان کے دشمنوں کے مقابل
ظَٰهِرِينَ (۱۴)	میں مدد کی تو وہ ان پر غالب ہو گئے۔

یہاں یہ بات ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اللہ کی مدد سے مراد اللہ کے رسول اور اللہ کے اس دین کی تائید و حمایت ہے جس کو قائم کرنے کی دعوت لے کر اللہ کا رسول اٹھتا ہے۔ مَنْ أَنصَارِىٓ إِلَى ٱللَّهِ کے الفاظ سے خود اس حقیقت کا اظہار ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کی امداد سے بے نیاز ہونے کے باوجود اس کو اپنی امداد سے جو تعبیر فرمایا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کام اللہ کو پسند ہے اور اس میں اس کے بندوں کی فلاح و بہبود ہے۔

وَمَكَرُوا۟ وَمَكَرَ ٱللَّهُ ۖ وَٱللَّهُ خَيْرُ ٱلْمَٰكِرِينَ (۵۴)

لفظ مکر کا اصل مفہوم

'مکر' کے معنی ہیں کسی کو نقصان پہنچانے کے لیے کوئی مخفی تدبیر کرنا۔ اس میں مذمت کا پہلو یہاں سے پیدا ہوا کہ مخفی تدابیر کا استعمال آدمی کی کمزوری کی دلیل ہے۔ چونکہ عام طور پر صورت یہی ہوتی ہے کہ خفیہ تدبیریں کمزور لوگ ہی استعمال کرتے ہیں اس وجہ سے اس کی مذمت کا پہلو ذہنوں پر غالب ہو گیا اور یہ گمان کیا جانے لگا کہ مکر لازماً مذموم ہی ہوتا ہے۔ لیکن یہ بات حقیقت کے خلاف ہے۔ خفیہ تدبیر بعض حالات میں کسی مکر کرنے والے کے مکر کے توڑ یا اس کی سزا کے طور پر بھی استعمال کرنی پڑتی ہے۔ ایک خفیہ چالیں چلنے والے کے خلاف اگر کوئی علانیہ انتقامی کارروائی کی جائے تو وہ اس کو ظلم و زیادتی قرار دے گا اور حالات سے ناواقف اس کو حق بجانب ٹھہرائیں گے۔ اسی طرح کوئی مخفی تدبیر کسی سازشی دشمن کے خلاف بعض اوقات اس کو متنبہ کرنے کے لیے اختیار کرنی پڑتی ہے تاکہ اس پر یہ ظاہر ہو جائے کہ اس کی سازشیں مخفی نہیں ہیں، جن کے لیے وہ یہ جال بن رہا ہے وہ اس کے اس جال سے واقف ہیں، یہ چیز اس کو رسوا بھی کرتی ہے اور آئندہ کے لیے اس کو ایسی حرکتوں سے باز رکھنے میں بھی مددگار ہوتی ہے بشرطیکہ اس کے اندر سبق حاصل کرنے کی صلاحیت ہو۔ یہاں جس مکر کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے اس سے مراد یہی مکر ہے جو حق کے دشمنوں کی سازشوں کے توڑ یا ان کی سرکوبی کے لیے اللہ تعالیٰ اختیار فرماتا ہے۔ یہ تدبیریں ایسی تیر بہدف ہوتی ہیں کہ دشمنوں کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں اور ساتھ ہی ان سے خلق کو

بے شمار برکتیں بھی حاصل ہوتی ہیں۔ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ سے اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہو رہا ہے۔ رہا یہ سوال کہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا مسیح کو یہود کے شر سے بچانے کے لیے کیا تدبیر اختیار فرمائی تو اس کے جواب کے لیے موزوں موقع سورۂ نساء میں آئے گا۔

حضرات انبیاء کی زندگی کی ایک مشترک حقیقت

اس آیت میں جس بات کی طرف اشارہ ہے وہ تمام انبیا علیہم السلام کی زندگی کی ایک مشترک حقیقت ہے۔ تمام انبیا کی زندگی شہادت دیتی ہے کہ جب انھوں نے اپنی قوم کے اعیان و اکابر سے مایوس ہو کر اپنی پوری توجہ اپنے غریب ساتھیوں اور قوم کے عام لوگوں پر مرکوز کی ہے اور ان کی دعوت ان لوگوں کے اندر اپنے اثرات پھیلانے لگی ہے تو یہ اعیان و اکابر اس چیز کو اپنے اقتدار کے لیے ایک شدید خطرہ سمجھ کر نبی کے خلاف مختلف قسم کی سازشوں میں مصروف ہو گئے ہیں تاکہ اس کے قتل کا کوئی بہانہ پیدا کر کے اپنے خیال کے مطابق اس مصیبت سے پیچھا چھڑائیں۔

سیدنا مسیح کے خلاف

یہ مرحلۂ آزمائش یوں تو ہر نبی کی زندگی میں، جیساکہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، پیش آیا ہے، لیکن ہم یہاں سیدنا مسیح سے متعلق یہود کے اعیان و اکابر کی بعض سازشوں کا ذکر کرتے ہیں۔

یہود کی سازشیں

انجیل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود کے علماء اور ان کے کاہنوں اور فقیہوں نے اس موقع پر آنحضرتؑ کے خلاف مختلف قسم کے جال پھیلائے۔

ایک تو انھوں نے آپ پر اور آپ کے ساتھیوں پر اسلاف کی روایات توڑنے اور بزرگوں کی توہین و تحقیر کا الزام لگایا تاکہ عوام کے جذبات اُن کے خلاف بھڑکائے جا سکیں۔

دوسرا جال انھوں نے یہ بچھایا کہ اپنے مخصوص آدمی بھیج بھیج کر ان سے ایسے سوالات کیے جن کے جوابوں سے ان کے خلاف کفر و ارتداد کے فتوے کا مواد فراہم ہو سکے۔ یہ کام یہود کے فقیہوں اور فریسیوں نے بڑی سرگرمی سے انجام دیا اور سیدنا مسیحؑ کی تمثیلوں اور تشبیہوں کے اندر سے انھوں نے اپنی دانست میں وہ مواد فراہم کر لیا جس کی بنیاد پر ان کے واجب القتل ہونے کا فتویٰ دیا جا سکے۔

تیسرا یہ کہ اس زمانے میں چونکہ ملک پر سیاسی اقتدار رومیوں کا تھا اس وجہ سے ان کو بھڑکانے کے لیے مواد فراہم کرنے کی کوشش کی گئی۔ پہلے تو خراج کی ادائیگی سے متعلق سیدنا مسیح علیہ السلام سے سوالات کیے گئے جن سے یہ ثابت ہو سکے کہ یہ شخص لوگوں کو قیصر کو خراج دینے سے روکتا ہے۔ لیکن اس قسم کے سوالوں کے جواب سیدنا مسیحؑ نے ایسے دندان شکن دیئے کہ علمائے یہود اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ پھر انھوں نے یہ الزام لگایا کہ یہ شخص اسرائیل کا بادشاہ ہونے کا مدعی ہے۔ اس کے لیے حضرت مسیحؑ کے بعض تمثیلی اقوال سے مواد حاصل کرنے اور اس کے ذریعہ سے رومی حکومت کو بھڑکانے کی کوشش کی گئی۔

چوتھی تدبیر یہ کی گئی کہ سیدنا مسیحؑ کے بارہ شاگردوں میں سے ایک شاگرد یہودا کو، جو منافق تھا، یہود نے رشوت دے کر اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ آنحضرتؑ کی مخبری کرے اور ان کو گرفتار کرائے۔

ان تمام سازشوں کی تفصیل انجیلوں میں موجود ہے۔ اگر طوالت کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہم یہ سارا مواد ایک مناسب ترتیب کے ساتھ یہاں جمع کر دیتے لیکن بہتر یہی معلوم ہوا کہ جس طرح قرآن نے صرف اشارے پر اکتفا کیا ہے اسی طرح ہم بھی اشارات ہی پر اکتفا کریں۔

پیغمبر کی زندگی کا یہی وہ مرحلہ ہوتا ہے جس میں وہ قوم کو چھوڑ کر اور اپنے دشمنوں سے اعلان برأت کر کے ہجرت کرتا ہے اور یہ ہجرت مختلف شکلوں میں، جن کی تفصیل اپنے مقام میں آئے گی، ظاہر ہوتی ہے۔

إِذْ قَالَ اللَّهُ يَا عِيسَىٰ إِنِّي مُتَوَفِّيكَ وَرَافِعُكَ إِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ ۖ ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيمَا كُنتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ (۵۵)

حضرت مسیح کی حفاظت کے لیے تدبیر الٰہی

اب یہ بیان ہو رہا ہے اس بہترین مخفی تدبیر کا جو اللہ تعالیٰ نے سیدنا مسیح علیہ السلام کو یہود کی سازش سے بچانے کے لیے اختیار فرمائی اور جس سے ان کی سازش کے تمام تار پود بکھر کر رہ گئے۔

توفی کے لغوی اور مجازی مفہوم

تَوَفِّی کے اصل معنی عربی لغت میں الاخذ بالتمام کسی شے کے پورا پورا لے لینے یا کسی چیز کو اپنی طرف قبض کر لینے کے ہیں۔ موت دینے کے معنی میں اس لفظ کا استعمال حقیقۃً نہیں بلکہ مجازاً ہوا ہے۔ ایسے الفاظ جو اپنے حقیقی اور مجازی دونوں معنوں میں استعمال ہوتے ہیں، اپنے صحیح مفہوم کے تعین میں قرائن کے محتاج ہوتے ہیں۔

یہاں مندرجہ ذیل قرائن اس بات کے خلاف ہیں کہ اس کے معنی یہاں موت دینے کے لیے جائیں۔

قرائن جو اس بات کے خلاف ہیں کہ اس کے معنی موت دینے کے لیے جائیں

ایک یہ کہ یہ موقع اللہ تعالیٰ کی طرف سے سیدنا مسیحؑ اور ان کے ساتھیوں کے لیے بشارت اور وعدۂ نصرت کا ہے۔ جملہ رسولوں کی سرگزشتیں اس امر کی شاہد ہیں کہ جب ان کی قوموں نے ان کے قتل کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی حفاظت و نصرت کی بشارت دی ہے۔ یہاں بھی آیت پر نگاہ ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ پوری آیت بشارات اور وعدۂ نصرت ہی کی ہے۔ اس سیاق و سباق میں آخر یہ کہنے کا کیا محل ہے کہ میں تمہیں موت دینے والا ہوں، یہ تو وہی چیز ہوتی جس کے خواہاں یہود تھے۔ فرق صرف ذریعے کا ہوتا کہ موت یہود کے ہاتھوں نہیں بلکہ قدرت کے ہاتھوں واقع ہوتی۔

دوسرا یہ کہ اگر اس لفظ سے یہاں موت دینا مراد ہے تو اس کے بعد 'رَافِعُكَ إِلَيَّ' کے الفاظ بالکل غیر ضروری ہو کے رہ جاتے ہیں۔ آخر یہ کہنے کا کیا فائدہ کہ میں تمہیں موت دینے والا اور اپنی طرف اٹھا لینے والا ہوں۔ موقع دلیل ہے کہ یہاں 'مُتَوَفِّيكَ' کے بعد 'رَافِعُكَ إِلَيَّ' کے الفاظ تَوَفِّی کے مفہوم کو واضح کر رہے ہیں کہ تمہاری تَوَفِّی کی شکل یہ ہوگی کہ میں تمہیں اپنی طرف اٹھا لوں گا۔

تیسرا یہ کہ 'رَافِعُكَ إِلَيَّ' کے معنی مجرد رفع درجات لینا صحیح نہیں ہے۔ اس صورت میں 'إِلَيَّ' کا لفظ بالکل

بے ضرورت ہو کر رہ جاتا ہے اور قرآن میں کوئی لفظ بھی بے ضرورت استعمال نہیں ہوا ہے۔ اگر صرف درجے کی بلندی کا اظہار مقصود ہوتا تو عربیت کے لحاظ سے 'رَافِعُكَ' کافی تھا۔ 'اِلَيَّ' کی ضرورت نہیں تھی۔ قرآن میں دیکھیے جہاں بھی یہ لفظ بلندئ مرتبہ کے مضمون کے لیے استعمال ہوا ہے بغیر اِلیٰ کے استعمال ہوا ہے۔ مثلاً

مِنْهُمْ مَنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجَاتٍ (۲۵۳۔ بقرہ)	ان میں وہ بھی ہیں جن سے اللہ نے بات کی اور بعض کے مدارج بلند کیے۔
وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ (۱۷۶۔ اعراف)	اور اگر ہم چاہتے تو ان آیات کے ذریعے سے ان کا مرتبہ بلند کرتے لیکن وہ تو برابر زمین ہی کی طرف جھکا رہا۔
وَرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا (۵۷۔ مریم)	اور ہم نے اس کو فائز کیا اونچے درجے پر۔

اگر حرف 'اِلیٰ' کا صحیح صحیح حق ادا کیا جائے اور یہ حق ادا کرنا ضروری ہے تو 'رَافِعُكَ اِلَيَّ' کے معنی یہ ہوں گے کہ میں تم کو عزت و اکرام کے ساتھ اپنی جانب اٹھا لینے والا ہوں۔

چوتھا یہ کہ قرآن نے دوسرے مقام میں جہاں یہ مضمون بیان کیا ہے وہاں 'مُتَوَفِّيكَ' کا لفظ بالکل اڑا دیا ہے، قتل اور سولی کی نفی کے بعد جس چیز کا اثبات کیا ہے وہ صرف اٹھا لیے جانے کا ہے۔ 'بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ' (بلکہ اللہ نے اس کو اپنی جانب اٹھا لیا)۔ یہ اس بات کا نہایت واضح قرینہ ہے کہ قرآن نے 'توفی' کی اصل شکل بتائی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی جانب اٹھا لیا۔ آیت ملاحظہ ہو۔

وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا۔ (۱۵۷-۱۵۸)	اور نہ انھوں نے اس کو قتل کیا اور نہ اس کو سولی دی بلکہ معاملہ ان کے لیے گھپلا کر دیا گیا اور جن لوگوں نے اس بارے میں اختلاف کیا وہ اس کی طرف سے شک میں ہیں، انھیں اس کے بارے میں کوئی علم نہیں، محض اٹکل کے تیر تکے چلا رہے ہیں اور انھوں نے اس کو قتل یقیناً نہیں کیا بلکہ اس کو اللہ نے اپنی طرف اٹھا لیا اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔

یہ آیت سب سے زیادہ موزوں مقام اپنے اندر رکھتی تھی اس بات کے بیان کے لیے کہ حضرت عیسیٰؑ کی موت کس طرح ہوئی؟ اس لیے کہ یہاں قرآن نے بڑی تاکید اور شدت کے ساتھ ان لوگوں کی تردید کی ہے جو ان کے قتل یا ان کی سولی کے مدعی تھے۔ اگر آپ کی موت واقع ہوئی ہوتی تو اس موقع پر قرآن صاف صاف یوں کہتا کہ نہ ان کو قتل کیا گیا اور نہ ان کو سولی دی گئی بلکہ اللہ نے ان کو وفات دی۔ لیکن قرآن نے نہ صرف یہ کہ یہ کہا نہیں بلکہ یہاں 'تَوَفِّیْ' کا لفظ بھی استعمال نہیں کیا، صرف 'رَفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ' کا لفظ استعمال کیا۔ ہر صاحبِ ذوق اندازہ کر سکتا ہے کہ قتل اور سولی کی نفی کے بعد اس رفع سے موت مراد لینے کی کس حد تک گنجائش ہے۔

'وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا' یعنی اس گندے معاشرے سے الگ کر کے تمہیں صالحین و ابرار کے زمرے میں داخل کروں گا۔ انبیا علیہم السلام کے لیے سنتِ الٰہی یہ ہے کہ وہ جس قوم کی اصلاح کے لیے بھیجے جاتے ہیں اس کے اندر اس وقت تک وہ قیام کرتے ہیں جب تک ان کے ایمان لانے کی کچھ توقع ہوتی ہے۔ یہ توقع اس وقت ختم ہو جاتی ہے جب قوم کے لوگ نبی کے قتل کے درپے ہو جاتے ہیں۔ اس وقت نبی بحکم الٰہی ہجرت کر جاتا ہے۔ پھر جس طرح روح کی علیحدگی کے بعد جسم کے لیے سڑنے اور گلنے کے سوا کوئی اور شکل باقی نہیں رہ جاتی اسی طرح نبی کی علیحدگی کے بعد اس کے جھٹلانے والوں کے لیے ہزیمت اور ذلت کے سوا کوئی اور راہ باقی نہیں رہ جاتی۔ نبی اور اس کے ساتھی گندے ماحول سے نکل کر پاکیزہ اور صحت بخش ماحول میں داخل ہو جاتے ہیں جس سے ان کی روحانی قوت و صحت میں اضافہ ہوتا ہے۔ برعکس اس کے نبی کے دشمن زندگی بخش عناصر سے یک قلم محروم ہو کر پوری تیزی کے ساتھ ہلاکت کی وادی کی طرف چل پڑتے ہیں۔ استاذ امامؒ نے سورۂ کافرون کی تفسیر میں ہجرت کے ان اثرات و نتائج پر تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔ سیدنا مسیحؑ کا یہ رفع آسمانی بھی چونکہ ایک نوعیت کی ہجرت ہی ہے اس وجہ سے جس طرح تمام رسولوں کو ہجرت کے بعد فتح و کامیابی کی بشارت ملی اسی طرح آپ کو بھی اس ہجرت کے ساتھ کامیابی و فتحمندی کی، جیسا کہ آگے بیان ہے، بشارت ملی۔

سیدنا مسیحؑ کا رفع آسمانی ہجرتِ الی اللہ ہے

'وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا الآیہ' اس میں اس بات کی بشارت ہے کہ حضرت مسیحؑ کے نام لیوا ان کے منکرین پر ہمیشہ غالب رہیں گے۔ تاریخی طور پر یہ بات ایک امر واقعہ ہے کہ نصاریٰ من حیث القوم اس بشارت کے بعد سے یہود پر ہمیشہ حاوی و غالب رہے ہیں۔ آج بھی جب کہ بظاہر یہود کی ایک چھوٹے سے خطہ میں سلطنت قائم ہو چکی ہے، یہ حقیقت اپنی جگہ پر اسی طرح قائم و ثابت ہے جس طرح پہلے قائم و ثابت تھی۔ اس لیے کہ یہود کی یہ نام نہاد سلطنت قائم بھی نصاریٰ ہی کے ہاتھوں ہوئی ہے اور باقی بھی انھی کے بل بوتے پر ہے۔

حضرت مسیحؑ کے متبعین کا یہود پر غلبہ

البتہ ایک بات یہاں دل میں ضرور کھٹکتی ہے وہ یہ کہ یہ نصاریٰ خود متبع مسیح کب ہیں؟ یہ تو بالکل مبتدع اور حضرت مسیحؑ کی تعلیم سے یک قلم منحرف ہیں؟ اس کا جواب ہمارے نزدیک یہ ہے کہ 'الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ' سے یہاں مراد صرف ان کے صحیح قسم کے متبعین ہی نہیں ہیں بلکہ اس میں ان کے عام متبعین اور نام لیوا بھی شامل ہیں۔ ہماری اس رائے کے حق میں کئی باتیں جاتی ہیں۔ مثلاً

ایک شبہ کا ازالہ

ایک یہ کہ قرآن میں 'اَهْلُ الْكِتٰبِ' اور 'الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ' کے الفاظ بھی دو مختلف مفہوموں میں استعمال ہوئے ہیں۔ بعض جگہ ان سے اہل کتاب کو بحیثیت گروہ کے مراد لیا گیا ہے، اس سے بحث نہیں کہ فی الواقع ان کے عقائد و اعمال کیا ہیں، اور بعض جگہ ان سے صرف حقیقی اہل کتاب مراد لیے گئے ہیں۔ اسی طرح ہمارے نزدیک 'الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ' اپنے اندر وسیع معنی رکھتا ہے، حضرت مسیحؑ کے تمام منتسبین اس میں شامل ہیں۔ عام اس سے کہ وہ ان کے حقیقی پیرو ہیں یا محض نام لیوا ہیں۔

دوسری یہ کہ یہاں 'اَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ' کے مقابل 'اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا' رکھا ہے جس سے قرینہ یہی نکلتا ہے کہ تقابل درحقیقت منکرین مسیح اور متبعینِ مسیح کے درمیان ہے نہ کہ مخلصین و مبتدعین کے درمیان۔

تیسری یہ کہ یہ موقع بشارت کا ہے۔ بشارت کا تقاضا یہی ہے کہ اس میں وسعت ہو۔ اگر 'اَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ' سے، صرف حقیقی متبعین ہی مراد ہوتے تو بشارت کا دائرہ بہت محدود ہو کر رہ جاتا۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ذریتِ ابراہیمؑ کے لیے رزق کی جو بشارت دی تو اس کو صرف اہلِ ایمان ہی تک محدود نہیں رکھا بلکہ اہلِ ایمان اور غیر اہلِ ایمان سب کے لیے عام رکھا ہے، اسی طرح یہاں 'اَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ' بھی خالص اور غیر خالص متبعین کے لیے عام ہے۔

رسول اپنی قوم کے لیے عدالت ہوتا ہے

اوپر ہم اشارہ کر آئے ہیں کہ انبیا میں سے جو رسول کے درجے پر فائز ہوتے ہیں وہ اپنی قوم کے لیے عدالت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے ذریعے سے لازماً قوم کے درمیان حق و باطل کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ رسول اور اس کے ساتھیوں کو غلبہ حاصل ہوتا ہے اور اس کے مخالفین شکست کھاتے ہیں۔ قطع نظر اس سے کہ یہ غلبہ رسول کی موجودگی میں حاصل ہو یا اس کے رخصت ہو چکنے کے بعد۔ سیدنا مسیحؑ کے متعلق قرآن کی تصریح کی روشنی میں اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ وہ صرف نبی ہی نہیں تھے بلکہ 'رَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ' بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے۔ ان کے اس منصب کا یہ لازمی تقاضا تھا کہ ان کے متبعین کو ان کے مخالفین پر وہ غلبہ حاصل ہوتا جس کی اس آیت میں بشارت ہے۔ 'لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ' والی آیت میں بھی اسی سنت اللہ کا بیان ہے۔ یہی وہ عدالت ہے جس کا ذکر انجیلوں میں بار بار آتا ہے۔ رسولوں کی اس امتیازی خصوصیت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کے دشمنوں کو یہ مہلت نہیں دیتا کہ وہ ان کو قتل کر دیں۔ چنانچہ رسولوں میں سے کسی کا قتل ہونا ثابت نہیں۔ یہ بات بھی نصاریٰ کے اس دعوے کے خلاف جاتی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو سولی پر چڑھایا گیا۔ اس مسئلے پر مفصل بحث سورۂ مائدہ میں آئے گی۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ (۵۶، ۵۷)

یہ اسی عدالت کا ظہور ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے اور جو کسی قوم کی طرف رسول کی بعثت کا لازمی نتیجہ ہے۔ اس میں عذابِ دنیا اور عذابِ آخرت دونوں کی دھمکی ہے۔ یہود پر اس دنیا میں جو دل ہلا دینے والی آفتیں آئیں سب ان کے اسی کفر کا نتیجہ تھیں۔ 'وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ' سے یہ اشارہ بھی نکلتا ہے کہ مسیحؑ پر ایمان رکھنے کے مدعی بھی اگر ایمان کے بعد شرک و بدعت میں مبتلا ہو گئے تو آخرت کی پکڑ سے وہ بھی نہ بچ سکیں گے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو ایمان کے بعد شرک و بدعت میں مبتلا ہوں اور اس طرح اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنیں۔

ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ (۵۸)

پیغمبر کی طرف التفات

یہ آیت اور اس کے ساتھ کی پانچ آیتیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف التفات کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اثنائے کلام میں آپ کو مخاطب کر کے مخالفین خصوصاً نصاریٰ کے رویے کے مقابل میں تسلی بھی دی گئی ہے۔ اور بعض ضروری ہدایات بھی دی گئی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ جو عیسیٰؑ کی پوری تاریخ تمہیں سنائی گئی ہے۔ تو یہ ہے اصل حقیقت مسیح کی۔ یہ اس قسم کی من گھڑت داستان نہیں ہے جیسی کہ نصاریٰ نے تصنیف کر رکھی ہے بلکہ یہ اللہ کی آیات ہیں اور یہ ایک پُر حکمت یاد دہانی ہے۔ یعنی نصاریٰ نے تو اس کو ایک معمّا و چی بنا کر رکھ دیا ہے جس سے صرف گمراہی حاصل کی جا سکتی ہے لیکن اللہ نے اس کو از سر نو تمہارے ذریعے سے آشکار کیا ہے تاکہ اس سے حق و ہدایت اور حکمت و موعظت کی راہیں کھلیں۔ بعینہٖ اسی قسم کا التفات آگے آیت ۱۰۸ میں آرہا ہے۔ اس سے اس آیت کے بعض الفاظ کی وضاحت بھی ہو رہی ہے۔ ارشاد ہے تِلۡكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتۡلُوۡهَا عَلَيۡكَ بِالۡحَـقِّ وَمَا اللّٰهُ يُرِيۡدُ ظُلۡمًا لِّلۡعٰلَمِيۡنَ۔ ۱۰۸ (یہ اللہ کی آیات ہیں جو ہم تمہیں حق کے ساتھ سنا رہے ہیں اور اللہ دنیا والوں پر کوئی ظلم نہیں کرنا چاہتا) یعنی یہ حق کو از سر نو اس لیے واضح فرما دیا ہے تاکہ لوگوں کے لیے گمراہی پر جمے رہنے کے لیے عذر باقی نہ رہ جائے، اور اگر وہ گمراہی پر جمے رہیں تو ذمہ داری ان کی اپنی ہو۔

اِنَّ مَثَلَ عِيۡسٰى عِنۡدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ‌ؕ خَلَقَهٗ مِنۡ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ ۝ اَلۡحَـقُّ مِنۡ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنۡ مِّنَ الۡمُمۡتَرِيۡنَ (۵۹-۶۰)

عیسیٰ کی مثال آدمؑ کی ہے

یہ آیت اس باب میں خاتمۂ بحث کی آیت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح خدا نے آدمؑ کو مٹی سے پیدا کیا اور اس کو فرمایا کہ ہو جا تو وہ ہو گیا اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے کلمۂ 'کن' سے عیسیٰؑ کو پیدا کر دیا۔ بلکہ ولادت کے معاملے میں آدمؑ کو اس اعتبار سے عیسیٰؑ پر فضیلت حاصل ہے کہ ان کی ولادت میں نہ باپ کو دخل ہے نہ ماں کو تو جب نصاریٰ ان کو معبود نہیں مانتے تو آخر حضرت عیسیٰؑ کو کیوں معبود بنا بیٹھے۔

لفظ 'ابن' کا استعمال دوسروں کے لیے

جس طرح پیدائش کے معاملے سے کسی مغالطے کے لیے کوئی وجہ موجود نہیں تھی، اسی طرح 'ابن' کے لفظ سے بھی، اگر نصاریٰ عقل سے کام لیتے تو کسی گمراہی میں پڑنے کی کوئی وجہ نہیں تھی، تورات اور انجیل میں 'ابن' کا لفظ صرف عیسیٰؑ ہی کے لیے نہیں استعمال ہوا ہے بلکہ حضرت آدمؑ کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ ملاحظہ ہو لوقا ۳: ۳۸۔ فرشتوں کے لیے بھی استعمال ہوا ہے، ملاحظہ ہو پیدائش ۶: ۲و۴۔ حضرت یعقوبؑ کے لیے بھی استعمال ہوا ہے ملاحظہ ہو استثنا ۱۴: ۱۔ نصاریٰ کے لیے بھی استعمال ہوا ہے ملاحظہ ہو یوحنا ۱: ۱۱-۱۲۔ اگر کسی کو معبود بنا دینے کے لیے یہ لفظ کافی ہے تو پھر حضرت عیسیٰؑ کی کوئی تخصیص نہیں رہ جاتی، پھر تو معبودوں کا ایک پورا لشکر تیار ہو سکتا ہے، نصاریٰ نے صرف حضرت عیسیٰؑ ہی پر کیوں قناعت کر لی؟

گویا بحث اتمامِ حجت کے آخری نقطہ پر پہنچ گئی اس وجہ سے قرآن نے یہ کہہ کر کہ اَلۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّكَ الآیہ مزید بحث و گفتگو کا دروازہ بند کر دیا۔ اس جملے میں ہمارے نزدیک مبتدا محذوف ہے اور یہ بات ہم دوسرے

مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ جب مبتدا کو حذف کرتے ہیں تو اس سے مقصود مخاطب کی ساری توجہ خبر پر مرکوز کرانی ہوتی ہے۔ یعنی حضرت مسیح سے متعلق اصل حقیقت یہی ہے جو قرآن نے واضح کر دی ہے، باقی جو کچھ ہے وہ سب نصاریٰ کی افسانہ طرازی ہے۔ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ میں ظاہر خطاب اگرچہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے لیکن اس طرح کے مواقع میں، جیسا کہ ہم ایک سے زیادہ مواقع میں واضح کر چکے ہیں، روئے سخن پیغمبر کی طرف نہیں بلکہ امت کی طرف ہوتا ہے اور اگر اس میں کوئی عتاب مضمر ہوتا ہے تو اس کا تعلق درحقیقت مخالفین سے ہوتا ہے۔ لیکن وہ لائقِ خطاب نہیں رہ جاتے اس وجہ سے ان کے بجائے اپنوں کو خطاب کر کے بات کہہ دی جاتی ہے۔

فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ (۶۱)

العلم سے مراد

'العلم' کے لفظ پر ہم دوسری جگہ گفتگو کر چکے ہیں کہ قرآن میں اس سے مراد وہ علمِ حقیقی ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ وحی آتا ہے۔ اس کا مقابل لفظ ظن ہے۔

آیت ۶۱ کے بعض محذوفات

اس آیت میں عربی زبان کے اسلوب کے مطابق بعض چیزیں حذف ہیں۔ اگر محذوفات کو ظاہر کر دیا جائے تو پوری بات گویا یوں ہوگی۔ نَدْعُ نَحْنُ اَبْنَآءَنَا وَ اَنْتُمْ اَبْنَآءَكُمْ وَنُحْضِرُ نَحْنُ اَنْفُسَنَا وَاَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ نَحْنُ وَاَنْتُمْ۔ ہم نے اپنے ترجمے میں ان محذوفات کو کھول دیا ہے۔

مباہلہ کا موقع و محل

'ابتہال' کے معنی دعا اور تضرع کے ہیں لیکن اس کے اندر ترک کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے اس وجہ سے یہ ایک دوسرے پر لعنت کی بد دعا کے لیے معروف ہے۔

جن معاملات میں بنائے اختلاف کوئی عقلی و استدلالی چیز ہو ان میں تو مسئلے کو طے کرنے کا صحیح طریقہ عقل و استدلال ہی ہے لیکن جہاں عقل و استدلال کے تمام مرحلے طے ہو چکے ہوں، مخاطب دلیل و حجت سے بالکل عاری ہو، حق اس کے سامنے سورج کی طرح روشن ہو، اس کے لیے اس سے گریز و فرار کی کوئی راہ نہ ہو لیکن وہ محض اپنی بات کی پچ اور ہٹ دھرمی کی آن قائم رکھنے کے لیے اپنی بات پر اڑا ہو تو ایسے مواقع کے لیے مباہلہ کا طریقہ آخری چارۂ کار کی حیثیت رکھتا ہے۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ نصاریٰ نے قرآن کے اس چیلنج کو قبول کرنے کی جرأت نہیں کی جس سے یہ بات آخری درجے میں واضح ہو گئی کہ سیدنا مسیح کے بارے میں وہ اپنے موقف کو صحیح نہیں سمجھتے تھے بلکہ محض اپنے گروہی تعصب کے تحت اس کی حمایت کرتے تھے۔ برعکس اس کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ کھلا ہوا چیلنج اس بات کا نہایت کھلا ہوا ثبوت ہے کہ آپ کو اپنے موقف کی صحت و صداقت پر پورا پورا یقین تھا۔

مباہلے میں اپنے ساتھ اپنے اہل و عیال اور اپنے اعزا و متعلقین کی شمولیت اس کی سنجیدگی اور اہمیت کو دوچند بلکہ دہ چند کر دیتی ہے اس لیے کہ کوئی شخص جانتے بوجھتے اپنے زن و فرزند اور اپنے محبوں اور

محبوبوں پر لعنت کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ۚ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِالْمُفْسِدِيْنَ ۝ (۶۲ - ۶۳)

یعنی حضرت عیسٰیؑ کی اصل حقیقت یہ ہے جو بیان ہوئی۔ ان کا جو درجہ و مرتبہ بھی ہے خدا کے ایک بندے اور اس کے نبی و رسول کی حیثیت سے ہے۔ خدا کی خدائی میں ان کا کوئی حصّہ نہیں ہے۔ معبود تو صرف اللہ تعالیٰ ہے اور وہ عزیز اور حکیم ہے۔ عزیز یعنی سب پر غالب اور سب سے بالاتر، حکیم یعنی اس کا ہر کام حکمت اور مصلحت پر مبنی ہوتا ہے۔ یہ دونوں صفتیں شرک کی کامل نفی کرتی ہیں۔

شرک، فساد فی الارض ہے

دوسری آیت میں فرمایا کہ مباہلہ اس قضیے کو طے کرنے کی آخری صورت تھی لیکن اگر وہ اس پر بھی راضی نہیں ہیں تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ حق کی پیروی نہیں کرنا چاہتے بلکہ حق کی مخالفت کر کے خدا کی زمین میں فساد برپا کرنا چاہتے ہیں اس لیے کہ شرک تمام فساد کی جڑ ہے۔ اگر زمین و آسمان میں بہت سے معبود ہوتے تو ان کا سارا نظامِ تکوینی درہم برہم ہو کر رہ جاتا، اسی طرح اگر دین میں شرک کے لیے کوئی گنجائش تسلیم کر لی جائے تو اس دنیا کا سارا نظامِ عدل و قسط درہم برہم ہو کر رہ جائے۔

۱۵۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۶۴ - ۷۱

توحید ایک مشترک حقیقت ہے

حضرت مسیح علیہ السلام کی اصلی حقیقت واضح اور نصاریٰ پر حجت تمام کر دینے کے بعد یہود و نصاریٰ دونوں کو مخاطب کر کے ان کو توحید اور اسلام کی دعوت دی ہے۔ اس کا آغاز اس طرح فرمایا ہے کہ توحید کو ایک مشترک حقیقت قرار دیا ہے کہ جس طرح اسلام اس کی دعوت لے کر آیا ہے اسی طرح پچھلے انبیا اور صحیفوں نے بھی اسی چیز کی دعوت دی ہے۔ اس وجہ سے اگر تم توحید کو جھٹلاتے ہو تو صرف قرآن کو نہیں جھٹلاتے بلکہ خود اپنے انبیا اور اپنے صحیفوں کو بھی جھٹلاتے ہو۔

حضرت ابراہیمؑ مسلم تھے

پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا حوالہ دیا ہے کہ اپنی بدعات کی تائید میں ان کے نام کو کیوں ملوث کرتے ہو؟ وہ تو نہ یہودی تھے، نہ نصرانی، وہ تو ایک حنیف مسلم تھے۔ تورات اور انجیل ان کے بعد نازل ہوئیں اور یہودیت و نصرانیت کے شاخسانے تم نے ان کے بعد کھڑے کیے، پھر اپنی حمایت میں ان کو کیوں گھسیٹنے کی کوشش کرتے ہو؟ ان کے ساتھ نسبت اور قربت کے حقدار تو وہ ہو سکتے ہیں جو ان کی ملّتِ اسلام کی پیروی کریں، اور یہ شرف اگر حاصل ہے تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان پر ایمان لانے والوں کو حاصل ہے نہ کہ تم کو جو اسلام کی مخالفت میں پیش پیش ہو۔

مسلمانوں کو تنبیہ

اس کے بعد مسلمانوں کو تنبیہ ہے کہ ان اہلِ کتاب کے فتنوں سے بچ کے رہو۔ ان کی ساری کوشش اس بات کے لیے ہے کہ تمہیں صراطِ مستقیم سے ہٹا کر گمراہی کی راہ پر ڈال دیں۔ ساتھ ہی اہلِ کتاب کو بھی سرزنش

کی ہے کہ جانتے بوجھتے کہ حق کیا ہے، اس حق کی مخالفت کرنا اور دوسروں کو بھی اس حق سے برگشتہ کرنے کی کوشش کرنا آخر یہ کیا پیشہ ہے جو تم نے اہل کتاب ہوتے ہوئے اپنے لیے پسند کیا ہے: — اب اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۶۴-۷۱

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿٦٤﴾ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمَآ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَالْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿٦٥﴾ هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَاۗءِ حَاجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٦٦﴾ مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ۭ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿٦٧﴾ اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَھٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٦٨﴾ وَدَّتْ طَّاۗىِٕفَةٌ مِّنْ اَھْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ ۭ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَھُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿٦٩﴾ يٰٓاَھْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿٧٠﴾ يٰٓاَھْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿٧١﴾ ع ۱۵

ترجمۂ آیات ۶۴-۷۱

کہہ دو، اے اہل کتاب اس چیز کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمھارے درمیان

یکساں مشترک ہے، یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک ٹھہرائیں اور نہ ہم میں سے کوئی ایک دوسرے کو اللہ کے سوا رب ٹھہرائے۔ اگر وہ اس چیز سے اعراض کریں تو کہہ دو کہ گواہ رہو کہ ہم تو مسلم ہیں۔ ۶۴

اے اہل کتاب تم ابراہیم کے بارے میں کیوں حجت کرتے ہو۔ درآنحالیکہ تورات اور انجیل نہیں نازل کی گئی ہیں مگر اس کے بعد؟ کیا تم اس بات کو نہیں سمجھتے؟ تمھیں لوگ ہو کہ تم نے حجت کی ان چیزوں کے بارے میں جن کے باب میں تمھیں کچھ علم تھا تو اس چیز کے بارے میں کیوں حجت کرتے ہو جس کے باب میں تمھیں کوئی علم نہیں؟ اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے۔ ابراہیم نہ تو یہودی تھا، نہ نصرانی، بلکہ حنیف مسلم تھا، اور وہ مشرکین میں سے بھی نہ تھا۔ ابراہیم کے ساتھ نسبت کے سب سے زیادہ حقدار وہ ہیں جنھوں نے اس کی پیروی کی، پھر یہ پیغمبر ہیں اور جو ان پر ایمان لائے اور اللہ اہل ایمان کا ساتھی ہے۔ ۶۵-۶۸

اہل کتاب کا ایک گروہ یہ آرزو رکھتا ہے کہ کاش تمھیں گمراہ کر دیں۔ حالانکہ وہ نہیں گمراہ کرتے مگر اپنے ہی کو، لیکن وہ اس کا احساس نہیں کرتے۔ اے اہل کتاب اللہ کی آیات کا کیوں انکار کرتے ہو حالانکہ تم گواہ ہو۔ اے اہل کتاب تم کیوں حق کو باطل کے ساتھ گڈمڈ کرتے ہو اور حق کو چھپاتے ہو درآنحالیکہ تم جانتے ہو؟ ۶۹-۷۱

۱۶- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

قُلْ يَٰٓأَهْلَ ٱلْكِتَٰبِ تَعَالَوْا۟ إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا ٱللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِۦ شَيْـًٔا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ ٱللَّهِ ۚ فَإِن تَوَلَّوْا۟ فَقُولُوا۟ ٱشْهَدُوا۟ بِأَنَّا مُسْلِمُونَ (۶۴)

'يَٰٓأَهْلَ ٱلْكِتَٰبِ' کا خطاب اگرچہ یہود و نصاریٰ دونوں سے یکساں ہے لیکن اس سورہ میں نصاریٰ چونکہ

خاص طور پر مخاطب ہیں اس وجہ سے روئے سخن ان کی طرف زیادہ ہے۔

لفظ 'سواء' کی تحقیق

'سواء' کے معنی وسط کے ہیں، 'سواء الراس' سر کے بیچ کے حصے کو کہیں گے۔ 'سواء الطریق' کے معنی ہوں گے وسط شاہراہ۔ جو چیز دو جماعتوں کے بیچوں بیچ ہوگی وہ دونوں میں یکساں مشترک، مسلّم اور جانی پہچانی ہوئی ہوگی۔ توحید کے متعلق قرآن مجید کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ اہل کتاب اور مسلمانوں کے درمیان یکساں مشترک و مسلّم ہے۔ قرآن نے اسی مشترک کلمہ کو بنیاد قرار دے کر ان سے بحث کا آغاز کیا ہے کہ جب توحید ہمارے اور تمہارے درمیان ایک مشترک حقیقت ہے تو موازنہ کرو کہ اس قدرِ مشترک کے معیار پر قرآن اور اسلام پورے اترتے ہیں یا یہودیت اور نصرانیت؟

دعوتِ دین کا حکیمانہ طریقہ

بحث کا یہ طریقہ قرآن کے اس قرار دادہ طریقہ کے بالکل مطابق ہے جس کی اس نے آیت اُدۡعُ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّکَ بِالۡحِکۡمَۃِ وَالۡمَوۡعِظَۃِ الۡحَسَنَۃِ (اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعہ سے دعوت دو) میں تلقین فرمائی ہے۔ اس طریقۂ حکمت کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ اگر مخاطب سے بحث کے لیے کوئی مشترک بنیاد مل سکتی ہو تو اسی پر گفتگو کو آگے بڑھایا جائے، خواہ مخواہ اپنی انفرادیت کی دھونس جمانے کی کوشش نہ کی جائے۔ چنانچہ قرآن نے یہاں یہی طریقہ اختیار فرمایا ہے۔ اہل کتاب آسمانی صحیفوں کے حامل ہونے کے سبب سے توحید کی تعلیم سے اچھی طرح آشنا بھی تھے اور اس کے علمبردار ہونے کے مدعی بھی تھے۔ ان کے صحیفوں میں نہایت واضح الفاظ میں توحید کی تعلیم موجود تھی۔ انھوں نے اگر شرک اختیار کیا تھا تو اس وجہ سے نہیں کہ ان کے دین میں شرک کے لیے کوئی گنجائش تھی بلکہ اپنے نبیوں اور صحیفوں کی تعلیمات کے بالکل خلاف محض بدعت کی راہ سے انھوں نے یہ چیز اختیار کی اور پھر متشابہات کی پیروی کر کے، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں، اس کے حق میں الٹی سیدھی دلیلیں گھڑنے کی کوشش کی۔ قرآن نے ان کو دعوت دی کہ یہ بات ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں مسلّم ہے کہ اللہ کے سوا نہ کسی کی بندگی کی جائے، نہ اس کا کسی کو ساجھی ٹھہرایا جائے اور نہ ہم میں سے کوئی ایک دوسرے کو رب ٹھہرائے، پھر اس مسلّم و مشترک حقیقت کے برخلاف تم نے خدا کی عبادت میں دوسروں کو شریک کیوں بنا رکھا ہے اور اپنے احبار و رہبان اور فقیہوں صوفیوں کو اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ کا درجہ کیوں دے دیا۔

اسی نقطہ سے بحث کا آغاز کیا ہے اور پھر بتدریج اس کے تقاضے اور لوازم واضح فرمائے ہیں اور جو چیزیں اس کے تقاضوں کے خلاف اہل کتاب میں پیدا ہو گئی تھیں ان کی تردید فرمائی ہے۔

یہ بات کہ توحید بنیادی طور پر ہمارے اور اہل کتاب کے درمیان ایک مشترک حقیقت کی حیثیت رکھتی ہے، وضاحت کی محتاج نہیں ہے۔ جو شخص بھی تورات اور انجیل پر نگاہ رکھتا ہے، وہ اس سے اچھی طرح واقف ہے۔ جہاں تک تورات کا تعلق ہے اس میں تو توحید کی تعلیم اس قدر وضاحت و قطعیت اور اتنی کثرت کے ساتھ ہے کہ اس کے حوالے نقل کرنا محض بات کو طول دینا ہوگا۔ البتہ انجیل سے کچھ حوالے

یہاں ہم پیش کرتے ہیں اس لیے کہ توحید کے معاملے میں سب سے زیادہ گمراہی نصاریٰ ہی کو پیش آئی ہے اور آیت میں درحقیقت، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں، روئے سخن ہے بھی انھی کی طرف۔ لوقا ۴: ۸ میں ہے۔

انجیلوں میں توحید کے شواہد

"یسوع نے جواب میں اس سے کہا۔ لکھا ہے کہ تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور اسی کی بندگی کر۔"

مرقس ۱۲: ۲۹-۳۰ میں ہے۔

"یسوع نے جواب دیا کہ اول (حکم) یہ ہے اے اسرائیل سن! خداوند ہمارا ایک ہی خداوند ہے۔"

یوحنا ۱۷: ۳ میں ہے۔

"اور ہمیشہ کی زندگی یہ ہے کہ وہ تجھ خدائے واحد و برحق کو اور یسوع مسیح کو جسے تو نے بھیجا ہے جانیں۔"

متی ۱۹: ۱۷ میں ہے۔

"اس نے اس سے کہا کہ تو مجھ سے نیکی کی بات کیوں پوچھتا ہے؟ نیک تو ایک ہی ہے۔"

یہاں جس لفظ کا ترجمہ "نیکی" کیا گیا ہے، ہمارے نزدیک اس کا ترجمہ "پاکی" ہونا چاہیے۔ اس طرح "نیک تو ایک ہی ہے" بھی ٹھیک ترجمہ نہیں ہے۔ یہ دراصل "پاک تو ایک ہی ہے" ہوگا۔ انجیل کے اس ٹکڑے کا ترجمہ بعض دوسرے نسخوں میں مختلف ہے۔ اگرچہ غلط یہ بھی ہے لیکن اس میں نسبتہً وضاحت ہے۔ ملاحظہ ہو۔

"تو مجھے نیک کیوں ٹھہراتا ہے، نیک تو ایک ہی ہے اور وہ اللہ ہے۔"

یہ فقرہ بھی دراصل یوں ہے۔ "تو مجھے پاک کیوں ٹھہراتا ہے؟ پاک تو ایک ہی ہے اور وہ اللہ ہے۔"

توحید کی ان واضح تعلیمات کی موجودگی میں اہل کتاب سے قرآن کا یہ مطالبہ کتنا معقول ہے کہ وہ بھی ان نصوص کی روشنی میں اپنے عقائد کا جائزہ لیں اور جو باتیں ان کے بالکل خلاف، محض بدعات و متشابہات کی پیروی کر کے، انھوں نے اپنے عقاید میں شامل کر لی ہیں ان سے اپنے عقاید کو پاک کریں۔ پھر آخر میں مسلمانوں کو ہدایت فرمائی کہ اگر یہ لوگ اپنے ہی نبیوں اور صحیفوں کی تعلیمات سے اعراض کرتے ہیں تو تم یہ واضح کر دو کہ ہم تو ان حقائق سے اعراض کرنے والے نہیں ہیں، ہم تو اپنے آپ کو اسی ربِ واحد کے حوالہ کرتے ہیں اور یہی درحقیقت اصل اسلام ہے۔

اس آیت میں یہ بات جو آئی ہے کہ "ہم میں سے کوئی ایک دوسرے کو رب نہ بنائے"۔ اس کی وضاحت دوسرے مقام میں ہوئی ہے کہ اہل کتاب نے اس ہدایت کے برخلاف اپنے احبار و رہبان کو رب بنا لیا۔ اس پر بعض اہل کتاب کی طرف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال ہوا کہ ہم احبار و رہبان کو رب تو نہیں مانتے؟ حضورؐ نے جواب میں فرمایا کہ "کیا یہ بات نہیں ہے کہ جس چیز کو وہ حرام ٹھہرا دیں تم اس کو حرام ٹھہرا دیتے ہو اور جس چیز کو حلال ٹھہرا دیں اس کو حلال؟" سائل نے اقرار کیا کہ یہ بات تو ہے۔ آپ نے فرمایا کہ یہی ان کو رب بنا دینا ہے۔ اور جب اس طرح کسی کی اطاعت کی جائے کہ اس کے لیے تحریم و تحلیل کا حق تسلیم کر لیا جائے تو درحقیقت یہ چیز اس کی عبادت کرنے کے ہم معنی ہے اگرچہ بظاہر اس کو سجدہ کرنا

کیا جائے یا نہ کیا جائے۔

آیت کے آخر میں یہ بات بھی واضح فرمادی کہ اگر یہ اہل کتاب توحید کی اس مشترک حقیقت کو بھی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں تو تم ان کو صاف صاف سنا دو کہ گواہ رہو کہ ہم تو مسلم ہیں۔ یہ 'گواہ رہو' کے الفاظ بطور اظہار برأت ہیں۔ یعنی سن رکھو اور اس بات کے گواہ رہو کہ ہم نے تمہیں پوری وضاحت کے ساتھ سنا دیا تھا۔ اب کل کو خدا کے حضور ساری ذمہ داری تمہاری ہے۔ ہم اپنا فرض ادا کر چکے ہیں۔

'بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ' سے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہو رہا ہے کہ یہی توحید اس سپردگی اور حوالگی کی روح ہے جس سے اسلام عبارت ہے اور جو اصل مطلوب و مقصود ہے۔ جس کو یہ توحید حاصل نہیں اس کو اسلام حاصل نہیں اور جس کو اسلام حاصل نہیں اس کو خدا حاصل نہیں۔

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمَآ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَالْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ حَاجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ (۶۵ - ۶۸)

حضرت ابراہیم کا دین

ان آیات میں کوئی نحوی یا ادبی اشکال نہیں ہے۔ مضمون بھی ان کا پوری تفصیل کے ساتھ سورہ بقرہ کی تفسیر میں بیان ہو چکا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام چونکہ بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل دونوں ہی کے مسلّم خاندانی و روحانی پیشوا تھے اس وجہ سے یہود، نصاریٰ اور مشرکین تینوں ہی گروہ اپنی اپنی بدعات کی حمایت میں ان کے نام کو استعمال کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ یہود کہتے کہ حضرت ابراہیم ہمارے طریقہ پر تھے۔ نصاریٰ ان کو اپنے طریقہ پر بتاتے اور مشرکین عرب اپنے طریقہ پر۔ یوں تو یہ ہوا ہی سے فخر ان میں ہر گروہ کو ایک دوسرے کے مقابل میں ہمیشہ رہا لیکن اسلام کی دعوت شروع ہونے کے بعد اس کی مخالفت میں خاص حربہ جو ان تینوں ہی گروہوں نے استعمال کیا وہ یہی تھا کہ نیا دین دینِ ابراہیمی کے خلاف ہے، اصل دینِ ابراہیمی کے حامل ہم ہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم کو ہمارے اصلی جدی دین سے ہٹا کر گمراہ کرنا چاہتے ہیں۔

قرآن نے یہاں ان کے اس پروپگنڈے کی تردید کی ہے کہ تورات اور انجیل کا نزول تو حضرت ابراہیم کے صدیوں بعد ہوا ہے، پھر وہ یہودیت یا نصرانیت پر کس طرح ہوئے؟ بے وقوفی کی بات کے لیے بھی آخر کوئی نہ کوئی چھوٹی موٹی بنیاد ہوا کرتی ہے۔ تم نے بعض ایسے معاملات میں بھی حجتیں پیدا کی ہیں جن کے بارے میں تمہیں کچھ نہ کچھ علم تھا، ان کے لیے تم کسی جواز کا سہارا لے سکتے ہو اور اپنے آپ کو تسلی دے سکتے ہو لیکن تمہاری یہ بات تو بالکل ہی پادر ہوا ہے، آخر جس چیز کے باب میں تمہیں کچھ معلومات

ہی نہیں اس میں دخل در معقولات کے لیے جو آنکھ کیا گنجائش ہے، حق کی مخالفت و عداوت کا یہ کیسا جنون ہے کہ اتنی موٹی سی بات بھی تمھاری سمجھ میں نہیں آرہی ہے!

اس کے بعد قرآن نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دین بتایا کہ وہ نہ یہودی تھے نہ نصرانی بلکہ حنیف مسلم تھے۔ "حنیف" کے معنی، جیسا کہ سورہ بقرہ میں وضاحت ہو چکی ہے، یکسو کے ہیں، یعنی وہ توحید کی صراط مستقیم پر تھے۔ انھوں نے اس سے ہٹ کر کج پیچ کی مشرکانہ راہیں نہیں اختیار کی تھیں اور وہ مسلم یعنی اپنے رب کے فرمانبردار تھے۔ اس سے یہ بات نکلی کہ یہودیت اور نصرانیت توحید سے ہٹی ہوئی کج پیچ کی راہیں ہیں جو ہدایت کے بجائے ضلالت کی طرف لے جاتی ہیں۔

اس کے ساتھ ہی اس بات کی بھی وضاحت فرمادی کہ جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہودیت اور نصرانیت سے کوئی تعلق نہیں ہے اسی طرح ان کو مشرکین سے بھی کوئی واسطہ نہیں ہے۔ یہ بات جملے کے عام سیاق سے الگ کر کے اس لیے فرمائی کہ یہ مشرکین بنی اسماعیل کی تردید میں ہے جو اس سورہ میں براہ راست مخاطب نہیں ہیں۔ اس سورہ کا خطاب، جیسا کہ اوپر وضاحت ہو چکی ہے، اہل کتاب بالخصوص نصاریٰ سے ہے، مشرکین کی تردید میں اگر اس میں کوئی بات آئی ہے تو وہ ضمناً ہی آئی ہے۔ یہ بات بھی ضمنی باتوں ہی میں سے ہے، اور اس کے ذکر کی ضرورت، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، اس لیے تھی کہ جس طرح یہود اور نصاریٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نام کو اپنی گمراہیوں کی تائید میں پیش کرتے تھے اسی طرح بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ زور و شور کے ساتھ قریش کے مشرکین ان کے نام کو اپنی حمایت میں پیش کرتے تھے بلکہ ان کا تو یہ دعویٰ تھا کہ جس دین پر وہ ہیں، یہ دین ان کو حضرت ابراہیمؑ ہی سے وراثت میں ملا ہے۔

اس کے بعد یہ بتایا کہ ابراہیمؑ سے نسبت کے اصل حقدار وہ لوگ ہیں جنھوں نے ان کی پیروی کی ہے۔ یعنی یہ نسبت صرف خاندان اور نسب سے حاصل ہونے والی چیز نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق اتباع اور اطاعت سے ہے۔ اس اعتبار سے حضرت ابراہیمؑ سے سب سے زیادہ اولیٰ واقرب یہ پیغمبر (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان پر ایمان لانے والے صحابہؓ ہیں، نہ کہ یہود و نصاریٰ اور مشرکین جنھوں نے دینِ ابراہیمی کو بالکل مسخ اور برباد کیا ہے۔

آخر میں فرمایا کہ یہی اہل ایمان ہیں جن کا ساتھی اللہ ہے، وہ ان کی مدد فرمائے گا اور ان کے مخالفوں پر ان کو غالب کرے گا اس لیے کہ یہی اس دینِ حق پر ہیں جو حضرت ابراہیمؑ لے کر آئے تھے۔

وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ۝ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۶۹-۷۱)

اہل کتاب کو ملامت

ان میں سے پہلی آیت کا خطاب مسلمانوں سے بطور تنبیہ ہے کہ یہود اور نصاریٰ یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ حضرت ابراہیم کو یہودیت اور نصرانیت کی ان بدعات سے کوئی ادنیٰ تعلق بھی نہیں تھا لیکن اس کے باوجود وہ محض اس لیے پروپگنڈا کر رہے ہیں کہ تمھیں تمھارے دینِ حق سے برگشتہ کریں حالانکہ اس کوشش سے وہ صرف اپنی ہی محرومی اور گمراہی کا سامان کر رہے ہیں۔ جو شخص اپنی گمراہی کو ہدایت ثابت کرنے کے لیے دیدہ و دانستہ دوسرے کو راہِ حق سے ہٹانے کی کوشش کرتا ہے وہ سب سے پہلے خود اپنے ہی کو گمراہی میں مبتلا کرتا ہے۔ لیکن دوسرے کی مخالفت کے جوش میں اس کو اپنی اس حرکت کے اصلی نتیجہ کا احساس نہیں ہوتا۔

بعد کی دو آیتوں میں خطاب اہل کتاب سے ہے اور دونوں میں "یا اہل الکتاب" کی تکرار سے حسرت اور ملامت کا اظہار ہو رہا ہے کہ افسوس ہے کہ اہل کتاب ہو کر تم نے رہنمائی کے بجائے گمراہ کرنے اور اظہارِ حق کے بجائے کتمانِ حق کا پیشہ اپنے لیے پسند کیا۔

"وَاَنۡتُمۡ تَشۡهَدُوۡنَ" کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ آج تم اللہ کی جن آیات کا انکار کر رہے ہو، تمھارے دل ان کے باب میں گواہی دے رہے ہیں کہ یہ اللہ کی آیات ہیں۔ دوسرا یہ کہ آج حسد اور عداوت کے جوش میں تم جس حق کو جھٹلانے کے لیے اپنا ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے ہو اس کی تائید و تصدیق اور خلق کے آگے اس کی شہادت دینے کا تم سے عہد لیا جا چکا ہے اور تم اس ذمہ داری کے اٹھانے کا اقرار کر چکے ہو۔ پہلا مضمون محتاج ثبوت نہیں ہے۔ اس دوسرے مطلب کے لیے نظیر اسی سورہ میں آگے موجود ہے۔ فرمایا ہے۔

وَاِذۡ اَخَذَ اللّٰهُ مِيۡثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَاۤ اٰتَيۡتُكُمۡ مِّنۡ كِتٰبٍ وَّحِكۡمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمۡ لَتُؤۡمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنۡصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقۡرَرۡتُمۡ وَاَخَذۡتُمۡ عَلٰى ذٰلِكُمۡ اِصۡرِىۡ ؕ قَالُوۡۤا اَقۡرَرۡنَا ؕ قَالَ فَاشۡهَدُوۡا وَاَنَا مَعَكُمۡ مِّنَ الشّٰهِدِيۡنَ ۞ (۸۱ - آل عمران)	اور یاد کرو جب کہ اللہ نے تم سے نبیوں کے بارے میں میثاق لیا کہ چونکہ میں نے تم کو کتاب و حکمت عطا فرمائی ہے تو جب آئے تمھارے پاس ایک رسول بھی ثابت کرتا ہوا ان پیشین گوئیوں کو جو تمھارے اپنے پاس موجود ہیں تو تم اس پر ایمان لاؤ گے اور اس کی مدد کرو گے، پوچھا کیا تم نے اس کا اقرار کیا اور اس پر میری طرف سے تم نے ذمہ داری اٹھائی؟ بولے ہم نے اقرار کیا۔ فرمایا تو اس پر گواہ رہنا اور میں بھی تمھارے ساتھ اس کے گواہوں میں سے ہوں۔

اس آیت کی پوری تشریح آگے آ رہی ہے۔

حق اور باطل کو ایک دوسرے کے ساتھ گڈمڈ کرنے کی وضاحت سورۂ بقرہ کی تفسیر میں اچھی طرح ہو چکی

ہے۔ یہود نے یوں تو پوری تورات کو اپنی تحریفات سے مسخ کر ڈالا تھا جس کے سبب سے حق و باطل کا امتیاز مشکل ہو گیا تھا لیکن یہاں خاص طور پر ان کی ان تحریفات کی طرف اشارہ ہے جو انھوں نے حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسماعیلؑ اور تعمیرِ بیت اللہ سے متعلق حالات و واقعات اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیوں کے اندر کی تھیں۔ ان تحریفات کا مقصد یہ تھا کہ حضرت ابراہیمؑ کا تعلق مکہ اور بیت اللہ سے اس طرح کاٹ دیا جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق انبیا کے بیان کردہ حقائق پر پردہ ڈالا جا سکے۔ قرآن کے الفاظ وَاَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ نزولِ قرآن کے علمائے یہود بھی ان تحریفات سے واقف تھے اور فی الواقع ان تحریفات کی نوعیت ہے ہی ایسی کہ بادنیٰ تامل ان پر گرفت کی جا سکتی ہے۔ یہ ملحوظ رہے کہ یہاں زیرِ بحث یہود کے عوام کا کردار نہیں بلکہ ان کے علماء کا کردار ہے۔ سیاق و سباق اور آیت کے الفاظ اس پر دلیل ہیں۔

۱۷۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۷۲-۷۶

یہود کی بعض شرارتیں

آگے اہلِ کتاب، بالخصوص یہود کی بعض سازشوں اور شرارتوں کا ذکر کیا ہے جن کا مقصد یہ تھا کہ کسی طرح وہ مسلمانوں کو ان کے دین سے پھیریں۔ پھر اس گہرے بغض و حسد کا پتہ دیا ہے جو بنی اسرائیل کے اندر بنی اسماعیل کے خلاف تھا جس کے سبب سے وہ کسی طرح بھی اس بات کو گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں تھے کہ بنی اسماعیل بھی ان کی طرح کتاب و شریعت کے حامل سمجھے جائیں اور اللہ کے ہاں ان کے جرائم کے گواہ بنیں۔ گویا اس جوشِ عداوت میں خدا کے فضل کے اجارہ دار وہ خود بن بیٹھے تھے کہ جس کو چاہیں اس میں سے حصہ دیں اور جس کو چاہیں محروم کر دیں۔

اس عداوت و حسد نے بنی اسماعیل کے خلاف بنی اسرائیل کے مجموعی اخلاق و کردار کو ایک خاص سانچے میں ڈھال دیا تھا۔ وہ ان کے معاملے میں کسی اخلاقی و شرعی ضابطے کی پابندی کے قائل نہیں تھے۔ ان کی رکھی ہوئی امانتوں میں خیانت کرنا وہ ثواب سمجھتے تھے کہ یہ کافر کا مال ہے، اس کو دبا بیٹھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ قرآن نے ان باتوں کا حوالہ اس لیے دیا کہ مسلمانوں کو متنبہ کرے کہ جن کا حسد اور بغض تمھارے خلاف اس حد تک بڑھا ہوا ہے ان سے یہ توقع نہ رکھو کہ ان کا کوئی مشورہ تمھارے لیے خیر خواہانہ ہو سکتا ہے اور تمھارے حق میں ان کی زبان سے کوئی سچی بات نکل سکتی ہے۔ یہ تو تمھارے ایک پیسے کی بھی چوری کر سکتے ہیں، پھر ان سے یہ توقع کیسے رکھتے ہو کہ یہ تمھاری ایک لاکھ کی امانت ادا کر دیں گے اور تمھارے نبی کے بارے میں اس حق کی شہادت دیں گے جس کے وہ امین بنائے گئے تھے۔ اب اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات ۷۲-۷۶

وَقَالَتۡ طَّآئِفَةٌ مِّنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ اٰمِنُوۡا بِالَّذِيۡۤ اُنۡزِلَ

عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿٧٢﴾ وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ ؕ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ۙ اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ اَوْ يُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿٧٣﴾ ۚۙ يَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿٧٤﴾ وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِى الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿٧٥﴾ بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴿٧٦﴾

ترجمۂ آیات ۷۲-۷۶

اور اہل کتاب کا ایک گروہ کہتا ہے کہ مسلمانوں پر جو چیز نازل کی گئی ہے اس پر صبح کو ایمان لاؤ اور شام کو اس کا انکار کر دیا کرو تاکہ وہ بھی اس سے برگشتہ ہوں اور تم اپنے دین کی پیروی کرنے والے کے سوا اور کسی کی بات کا اعتبار نہ کیا کرو ـــــ ان سے کہو کہ اصل ہدایت تو اللہ کی ہدایت ہے ـــــ کہ مبادا اس طرح کی چیز کسی اور کو بھی مل جائے جس طرح کی چیز تمھیں ملی ہے یا وہ تم سے تمھارے رب کے حضور حجت کر سکیں۔ ان سے کہو کہ فضل تو اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہ جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ بڑی سمائی رکھنے والا اور علم والا ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت کے

لیے خاص کر لیتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔ ۷۲-۷۴

اور اہل کتاب میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ اگر ان کے پاس امانت کا ڈھیر بھی رکھو تو مانگنے پر لوٹا دیں گے اور ان میں وہ بھی ہیں کہ اگر تم ان کی امانت میں ایک دینار بھی رکھو تو وہ اس وقت تک اس کو لوٹانے والے نہیں ہیں جب تک تم ان کے سر پر سوار نہ ہو جاؤ۔ یہ اس وجہ سے کہ وہ کہتے ہیں کہ ان امیوں کے معاملے میں ہمارے اوپر کوئی الزام نہیں ہے۔ اور یہ جانتے بوجھتے اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں ـــــ ہاں، جو لوگ اس کے عہد کو پورا کریں گے اور اللہ سے ڈریں گے تو بے شک اللہ اپنے سے ڈرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ ۷۵-۷۶

۱۸۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (۷۲)

اہل کتاب کی اس سازش کا ذکر کرتے ہوئے قرآن نے اس بات کی تصریح فرما دی ہے کہ یہ ان کے ایک مخصوص گروہ کی سازش ہے۔ یہ تصریح اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن اپنے مخالفین کے جرائم بیان کرتے ہوئے بھی حق و انصاف کے حدود سے سرِ مُو تجاوز نہیں کرتا۔ اگر ایک جرم مخالف گروہ کی کسی مخصوص پارٹی ہی کا جرم ہے تو وہ اس کی ذمہ داری اسی پارٹی پر ڈالتا ہے، یہ نہیں کرتا کہ چند کی شرارت کی ذمہ داری مخالفت کے جوش میں پوری قوم پر لاد دے۔ یہ انصاف پسندی صداقت کے عام نصب العین سے قطع نظر دعوتِ حق کے نقطۂ نظر سے بھی نہایت بابرکت اور نتیجہ خیز ثابت ہوتی ہے۔ آگے اس کی بعض نہایت مؤثر مثالیں آ رہی ہیں۔

منافقانہ شرارت کی ایک خاص قسم

یہاں جس شرارت کا ذکر ہے وہ منافقانہ شرارت کی ایک مخصوص قسم ہے۔ وہ یہ کہ اپنے حریف کے سامنے اپنے آپ کو اس کا دوست اور ساتھی ظاہر کر کے اندر سے اس کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی جائے۔ یہود نے اپنے اس منصوبے کے تحت جو مختلف قسم کی چالیں چلیں، ان میں سے ایک چال یہ بھی تھی کہ ان کے

لیڈروں نے اپنے کچھ آدمیوں کو اس بات کے لیے تیار کیا کہ وہ پہلے اپنے ایمان و اسلام کا اظہار و اعلان کر کے مسلمانوں کے اندر شامل ہوں، پھر اسلام کی کچھ خرابیوں کا اظہار کر کے اس سے علیحدگی اختیار کر لیا کریں۔ اس کا فائدہ انھوں نے ایک تو یہ سوچا ہوگا کہ اس طرح بہت سے جدید العہد مسلمانوں کا اعتماد اسلام پر سے متزلزل ہو جائے گا، وہ یہ سوچنے لگیں گے کہ فی الواقع اسلام میں کوئی خرابی ہے جس کے سبب سے یہ پڑھے لکھے لوگ اسلام کے قریب آکر اس سے بدک جاتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ اس تدبیر سے وہ خود اپنی قوم کے عوام کو اسلام کے اثر سے بچائے جائیں گے، جب وہ یہ دیکھیں گے کہ ان کی اپنی قوم کے کچھ پڑھے لکھے لوگ اسلام کو آزما کر چھوڑ چکے ہیں تو ان کی وہ رغبت کمزور ہو جائے گی جو اسلام اور مسلمانوں کی کشش کے سبب سے ان کے اندر اسلام میں داخل ہونے کے لیے پیدا ہوتی تھی۔

اس سازش کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ یہود نے جب بھی کسی ملت کو اپنا نشانہ بنایا ہے اس کے لیے تدبیر یہی اختیار کی ہے کہ اس کے اندر گھس کر اس کو مسخ کرنے کی کوشش کی ہے۔ دین مسیحی کو بگاڑنے کے لیے پال نے جو کامیاب کوشش کی وہ مذاہب کی تاریخ کی ایک نہایت دردانگیز داستان ہے۔ پھر مسلمانوں کے عقائد و نظریات کو مسخ کرنے کے لیے یہود و نصاریٰ دونوں نے جو فتنے خود ہمارے کتب خانوں میں بیٹھ کر ہمدردانہ بھیس میں اٹھائے ہیں، وہ بھی کوئی مخفی چیز نہیں ہے۔ اگر طوالت کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہم یہاں بعض حقائق کی طرف اشارہ کرتے۔

وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ اَوْ يُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝ يَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ (۷۳-۷۴)

اسلوب کی بعض مشکلات

اس آیت کی تشریح و تفسیر میں ہمارے ارباب تاویل کو بڑا اضطراب پیش آیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں اسلوب کی بعض مشکلیں ہیں۔ ہم پہلے ان اسلوبوں کی وضاحت کریں گے اس کے بعد آیت کی صحیح تاویل بیان کریں گے۔

اس میں پہلی سمجھنے کی چیز قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ (کہہ دو کہ اصل ہدایت تو اللہ کی ہدایت ہے) کے ٹکڑے کا جملہ کے اندر مقام ہے۔ یہ ٹکڑا در اصل سلسلۂ کلام کا جزو نہیں ہے بلکہ اس کی حیثیت ایک جملہ معترضہ کی ہے۔ یعنی سلسلۂ کلام کے بیچ میں مخاطب کی ایک غلط بات کی برسر موقع تردید فرما دی گئی ہے۔ اصل سلسلۂ کلام یوں ہے کہ وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ الایۃ یہود جن لوگوں کو سکھا پڑھا کر مذکورہ بالا سازش کے لیے مسلمانوں کے اندر بھیجتے تھے ان کو پورے اہتمام کے ساتھ یہ تاکید بھی کر دیتے تھے کہ مسلمانوں کو ان کے دین سے برگشتہ کرنے کے لیے اسلام کا اظہار تو کر دو لیکن بات بہر حال ماننی اپنے ہی لوگوں کی ہے، اپنے دائرہ سے باہر کسی کی بات، ماننا ہمارے لیے جائز نہیں ہے۔ یہ بات چونکہ یہود کی

تمام گمراہیوں کی جڑ تھی اس وجہ سے قرآن نے بالکل برمحل اس پر ٹوک دیا کہ یہ کیا اندھا بہرا گروہی تعصب ہے جس میں یہ مبتلا ہیں، ان سے کہو کہ اصل ہدایت تو اللہ کی ہدایت ہے جس کی ان کو پیروی کرنی چاہیئے، خواہ وہ کسی اسرائیلی پیغمبر کے ذریعہ سے ملے یا کسی اسماعیلی پیغمبر کے واسطہ سے۔ نجات کے حصول کا ذریعہ تو خدا کی ہدایت کی پیروی ہے نہ کہ یہودیت و نصرانیت۔ یہ بات چونکہ سورۂ بقرہ کی تفسیر میں پوری وضاحت سے بیان ہو چکی ہے، نیز آگے کی سورتوں میں بھی اس کی طرف اشارات آئیں گے اس وجہ سے یہاں اس کے شواہد پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

دوسری چیز اس آیت میں یہ سمجھنے کی ہے کہ 'اَنْ' سے پہلے عربی زبان میں بعض اوقات لفظ مخافۃ یا اس کے کوئی ہم معنی لفظ محذوف ہو جاتا ہے۔ اس حذف کی مثالیں کلام عرب میں بھی موجود ہیں اور قرآن میں بھی۔ فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے نظائر اپنی کتاب اسالیب القرآن میں جمع کر دیے ہیں۔ ہم بھی اپنی اس تفسیر میں جگہ جگہ اس کو واضح کر رہے ہیں۔

یہود کے دل کا ایک چور

اس اسلوب کو ذہن میں رکھنے کے بعد آیت سے مذکورہ بالا جملہ معترضہ کو الگ کر کے اگر اَنْ یُّؤْتٰٓی اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِیْتُمْ اَوْ یُحَآجُّوْکُمْ عِنْدَ رَبِّکُمْ کو وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِیْنَکُمْ کے ٹکڑے سے ملایئے تو معلوم ہوگا کہ یہ درحقیقت ان کے اس باطنی محرک پر روشنی ڈالی جا رہی ہے جس کے تحت وہ اپنے آدمیوں کو بڑے شد و مد کے ساتھ یہ سبق پڑھاتے تھے کہ وہ کسی حال میں بھی کسی غیر اسرائیلی نبی کے دعوے کی صداقت تسلیم نہ کریں۔ یہ باطنی محرک یہ ہے کہ ان کے دل میں یہ چور تھا کہ کہیں اس طرح کی دینی سیادت و پیشوائی بنی اسماعیل کو بھی حاصل نہ ہو جائے جس طرح کی سیادت اب تک صرف ان کو حاصل رہی ہے۔ اور ساتھ ہی یہ اندیشہ بھی دل میں تھا کہ اگر ہماری طرف سے کوئی اعتراف اس دین اور اس نبی کے حق میں زبان سے نکل گیا تو مسلمان اس کو قیامت کے دن ہمارے خلاف حجت بنائیں گے کہ ہم نے حق واضح ہونے کے باوجود اس کی تکذیب کی۔ قرآن نے ان کے دل کے اس چور کو ایک دوسرے مقام میں بھی پکڑا ہے جہاں یہ واضح فرمایا ہے کہ یہود اپنے لوگوں کو اس بات کی سخت تاکید کرتے رہتے تھے کہ آخری نبی اور آخری دین کے باب میں تورات کے کسی اشارے کو مسلمانوں پر نہ کھولا جائے ورنہ وہ اس چیز کو قیامت کے روز ان کے خلاف دلیل بنائیں گے، چنانچہ سورہ بقرہ میں یہ مضمون گزر چکا ہے۔

وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا	اور جب یہ مسلمانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم بھی
اٰمَنَّا وَاِذَا خَلَا بَعْضُھُمْ	ایمان لائے ہوئے ہیں اور جب آپس میں ایک دوسرے
اِلٰی بَعْضٍ قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَھُمْ	سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ تم مسلمانوں کو وہ باتیں بتاتے
بِمَا فَتَحَ اللّٰہُ عَلَیْکُمْ	ہو جو اللہ نے تمہارے اوپر کھولی ہیں تاکہ مسلمان ان
لِیُحَآجُّوْکُمْ بِہٖ عِنْدَ	کی بنا پر تمہارے رب کے سامنے تمہیں قائل کریں کیا

رَبِّكُمْ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ o	تم لوگ یہ بات نہیں سمجھتے ؟ کیا یہ لوگ یہ نہیں جانتے
اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ	کہ اللہ ان کی اس بات کو بھی جانتا ہے جو آپس میں
يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا	رازدارانہ طور پر کہتے ہیں اور اس بات کو بھی جانتا
يُعْلِنُوْنَ o (۷۶-۷۷ بقرہ)	ہے جو وہ مسلمانوں سے علانیہ کہتے ہیں۔

ان دونوں اسلوبوں کے واضح ہو جانے کے بعد اب آیت کا مفہوم بالکل واضح ہے۔ یہود کے علماء اور لیڈروں کو مخاطب کر کے کہا جا رہا ہے کہ تم اپنی قوم کے اندر اس تعصب کی آگ بھڑکا رہے ہو کہ کسی اسرائیلی کے لیے کسی غیر اسرائیلی کی نبوت کی تصدیق جائز نہیں۔ حالانکہ یہ بات محض حماقت اور تنگ نظری پر مبنی ہے۔ اصل شے تو خدا کی ہدایت ہے جس کا تمھیں طالب ہونا چاہیے۔ خواہ وہ بنی اسرائیل کے کسی شخص پر نازل ہو یا بنی اسماعیل کے۔ تمھارا یہ تعصب حق کی عصبیت و حمیت کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ محض خوف و حسد کا نتیجہ ہے۔ تم ڈرتے ہو کہ مبادا وہ سیادت و پیشوائی جو اب تک صرف تمھیں حاصل رہی ہے کسی دوسرے کو حاصل ہو جائے۔ آیت میں اَحَدٌ کا لفظ ہے لیکن قرینہ دلیل ہے کہ یہاں اس اَحَدٌ کا اشارہ بنی اسماعیل ہی کی طرف ہے جن کے اندر نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تھی۔ چونکہ یہاں بنی اسرائیل کے دل کے ایک راز کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے اس وجہ سے قرآن نے اس کو مبہم ہی رکھا ہے۔ اَوْ يُحَاجُّوْكُمْ سے، جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا، ان کے اس اندیشے کی طرف اشارہ ہے کہ اگر آج اسلام اور پیغمبر اسلام کے حق میں ان کے کسی آدمی کی زبان سے کوئی بات نکل گئی تو اس کو قیامت کے دن مسلمان ان کے خلاف حجت بنائیں گے۔

قرآن نے اس پر فرمایا کہ اپنی جس سیادت و پیشوائی کو بچانے کے لیے تم یہ جتن کر رہے ہو، یہ تمھارے اختیار کی بات نہیں ہے۔ عزت و فضیلت اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہ جس کو چاہے بخشتا ہے اور جس سے چاہے چھینتا ہے۔ اسی نے تم کو یہ عزت بخشی تھی اور اب وہی اگر اس کے لیے کسی دوسرے کو منتخب کر رہا ہے تو تم اس کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتے۔ اس کا فیصلہ نافذ ہو کر رہے گا۔ اَللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و رحمت کو تمھارے تنگ پیمانوں سے ناپ کر نہیں دیتا جن میں تمھارے سوا کسی اور کے لیے کوئی گنجائش ہی نہیں ہے بلکہ وہ بڑی سمائی رکھنے والی ہستی ہے اور اس کا ہر فیصلہ علم و خبر پر مبنی ہوتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کون کس چیز کا مستحق ہے اور کون مستحق نہیں ہے۔

يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ الآیہ میں دو باتوں کی طرف اشارہ ہے۔ ایک تو اس بات کی طرف کہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت ایک عظیم اور بے پایاں برکت و رحمت ہے۔ دوسری اس بات کی طرف کہ یہ بنی اسماعیل پر اللہ تعالیٰ کا عظیم انعام ہے کہ اس نے ان کے خاندان کو اس عظیم اور عالم گیر برکت کے ظہور کے لیے منتخب فرمایا۔ اس سے لازمی نتیجہ کے طور پر دو باتیں نکلتی ہیں۔ ایک یہ کہ بنی اسماعیل پر یہ حق ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس عظیم انعام کی قدر کریں اور اس کے شکر گزار رہیں۔ دوسری یہ کہ بنی اسرائیل کے غصہ

اور حسد کے علی الرغم اللہ تعالیٰ نے اپنی اس عظیم برکت سے امیوں کو نوازا سو وہ جس کو چاہے اپنی رحمت کے لیے خاص کرے، اس کی مشیت میں خود اس کی حکمت کے سوا اور کسی کو بھی دخل نہیں ہے۔

وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ۗ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِى الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ (۷۵)

امیین سے مراد

"اُمِّيّٖنَ" سے مراد بنی اسماعیل ہیں۔ اس لفظ پر مفصل بحث ہم سورۂ بقرہ کی تفسیر میں کر چکے ہیں۔

سبیل کا مفہوم

"سَبِيْلٌ" کے معنی یہاں الزام اور مواخذہ کے ہیں۔ لَيْسَ عَلَيْنَا فِى الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ یعنی امیوں کے معاملے میں ہم پر کوئی الزام اور مواخذہ نہیں۔

یہود کا ایک من گھڑت فتویٰ

یہ قرآن نے امیین سے متعلق بنی اسرائیل کے ذہن اور ان کے مجموعی کردار کو واضح کیا ہے کہ وہ ان کی امانتوں میں خیانت کرنے اور ان کے مال کو ہڑپ کر جانے میں کوئی قباحت نہیں سمجھتے بلکہ اس کو اپنی دینداری کا حق سمجھتے ہیں۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ تورات میں غصب، خیانت اور سود خواری وغیرہ کی جو ممانعت وارد ہے اس کا تعلق غیر قوموں خصوصاً کافر قوموں سے نہیں ہے۔ اپنے اس من گھڑت شرعی فتوے کے تحت انھوں نے دوسری قوموں سے ہر قسم کی بدمعاملگی جائز کر لی تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ عرب بنی اسماعیل کو بھی اسی فہرست میں داخل کرتے تھے اس وجہ سے ان کے مال کو بھی خیانت، بدعہدی یا سود وغیرہ کی راہ سے ہڑپ کرنا ان کے نزدیک کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں تھی۔ اہلِ عرب، یہودی سود خواروں اور مہاجنوں کے پاس اگر کوئی چیز بطور امانت یا رہن رکھتے تو شاید ہی کوئی قسمت والا ہوتا جو ان کے حلق سے اپنا مال نکالنے میں کامیاب ہوتا۔ وہ اس کو دبا بیٹھتے اور اپنے اس فعل کو ثواب ثابت کرنے کے لیے انھوں نے اپنے مولویوں سے فتوے بھی حاصل کر رکھے تھے کہ کافروں کا مال ہڑپ کر جانے میں کوئی عیب نہیں ہے۔

قرآن نے ان کا یہ کردار نمایاں کرنے کے لیے واضح کیا ہے کہ جو تمھاری چند ٹکوں کی امانت واپس کرنے میں یہ لیت و لعل کرتے ہیں اور اس کے لیے انھوں نے اس اہتمام سے شرعی حیلے ایجاد کر رکھے ہیں، ان سے یہ توقع نہ رکھو کہ تمھارے نبی اور تمھارے مذہب و شریعت کے بارے میں یہ پچھلے نبیوں کی جن پیش گوئیوں کے امین بنائے گئے تھے ان کو وہ آسانی سے ادا کریں گے اور خلق کے سامنے ان کی شہادت دینے کی ذمہ داری اٹھائیں گے۔ جو لوگ دنیا کی نہایت حقیر چیزوں میں خائن ہیں وہ اتنی بڑی امانت ادا کرنے کے لیے دل گردہ کہاں سے لائیں گے!

لیکن یہود جیسی ذلیل قوم کے اس کردار کو بیان کرتے ہوئے بھی قرآن نے انصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا، بلکہ ان میں جو اچھے کردار کے لوگ تھے ان کے کردار کی اچھائی کی داد دی بلکہ پہلے انھی کا ذکر

کیا تاکہ ان کی حوصلہ افزائی ہو اور وہ اس میدان میں اور آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔ یہی لوگ تھے جو بعد میں اسلام کی نعمت سے بہرہ ور ہوئے۔

وَيَقُولُونَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ، یہ ان کے اس مَن گھڑت اور خانہ ساز فتوے کی تردید کی ہے جس کا ذکر اوپر ہوا، کہ امیوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں وہ اخلاق و شریعت کی پابندیوں سے بری ہیں۔ یہ اللہ اور شریعت پر ان کا بہتان تھا اور اس کے خلافِ شریعت ہونے سے وہ خود بھی واقف تھے لیکن محض اپنی خواہشات کی پیروی اور حرصِ دنیا میں انھوں نے اس قسم کے حیلے ایجاد کر لیے تھے۔ بعد میں یہی فتوے تحریف کی راہ سے تورات میں داخل ہو گئے۔ یہاں تک کہ اب اگر کوئی تورات کو پڑھے تو وہ عام اخلاقی و انسانی حقوق و معاملات میں بھی محسوس کرتا ہے کہ بنی اسرائیل کے لیے شریعت کچھ اور ہے اور غیر بنی اسرائیل کے لیے، جن کو تورات میں اجنبیوں اور پردیسیوں سے تعبیر کیا جاتا ہے، کچھ اور۔

بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (۷۶)

اس آیت میں اور اس اسلوب پر مبنی جتنی بھی آیات ہیں سب میں جواب شرط محذوف ہوتا ہے۔ اس کی بعض مثالیں سورۂ بقرہ میں ہم پیش کر چکے ہیں۔ یہاں اگر جواب شرط کو واضح کیا جائے تو پوری بات یوں ہوگی کہ ہاں جو لوگ اللہ کے عہد کو پورا کریں اور حدودِ الٰہی کی حفاظت کریں تو وہ لوگ متقی ہیں اور اللہ متقین ہی کو دوست رکھتا ہے۔

اوپر والی باتوں پر استدراک

یہ آیت یہود کی اوپر والی باتوں پر استدراک کی حیثیت رکھتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہود کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ ان کے لیے خدا کے ہاں کوئی خاص مرتبہ و مقام ہے جس کے سبب سے وہ دوسروں سے بالاتر اور امیوں کے معاملے میں ذمہ داریوں سے بری ہیں۔ اصل یہ ہے کہ اللہ کے ہاں جو مرتبہ و مقام بھی ہے وہ ان لوگوں کے لیے ہے جو خدا سے باندھے ہوئے عہد کو پورا کریں اور ہر طرح کے حالات میں اس عہد کے تحت قائم کردہ حدود کی نگہداشت کریں۔ جن لوگوں کی روش یہ ہوگی وہ اللہ کے نزدیک متقی ہیں اور اللہ ایسے ہی متقی بندوں کو دوست رکھتا ہے۔ جو لوگ خدا کے عہد اور اس کے حدود کو توڑنے میں بے باک ہیں اور اس کے باوجود تقویٰ اور محبوبِ الٰہی ہونے کے مدعی ہیں وہ محض خیالی پلاؤ پکا رہے ہیں۔

عام طور پر مترجمین قرآن نے اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ کا ترجمہ "اپنے عہد کو پورا کرتے ہیں" کیا ہے۔ میرے نزدیک ضمیر کا مرجع اللہ ہے۔ قرآن کے نظائر سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔ آگے والی آیت ملاحظہ ہو۔ ابن جریر نے بھی یہی تاویل کی ہے۔

۱۹۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۷۷-۸۰

آگے کی آیات میں پہلے تو اہل کتاب کی اس عہد شکنی بلکہ عہد فروشی پر عتاب ہے جس کا ذکر اوپر

ہوا ہے۔ فرمایا کہ اللہ نے ان کو اپنے کلام و پیام سے نوازا، ان کے لیے تعلیم و تزکیہ کا اہتمام فرمایا اور ان کو اپنی نگاہِ لطف و کرم سے مشرف کیا لیکن انھوں نے دنیا کے حقیر مفادات کے بدلے میں اللہ کے عہد کو فروخت کیا اور اس کی بے پایاں عنایات کی نہایت بے دردی کے ساتھ ناقدری کی اس وجہ سے اب آخرت میں ان کے لیے کوئی حصہ باقی نہیں رہا۔

پھر ان کی بعض تحریفی کوششوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ اللہ نے جو کتاب انھیں ہدایت و رہنمائی کے لیے عطا فرمائی، انھوں نے اس میں توڑ موڑ اور لچک لچکا کر اس غرض کے لیے تصرفات کیے کہ جو چیز اللہ کی کتاب کی نہیں تھی وہ کتاب کی سمجھی جائے۔

پھر اہل کتاب بالخصوص نصاریٰ کو دعوت دی ہے کہ وہ عقلِ سلیم کی روشنی میں غور کریں کہ آج جن باتوں کو وہ مسیحؑ کی طرف منسوب کرتے ہیں وہ باتیں وہ کتاب و حکمت اور نبوت کے حامل ہوتے ہوئے کس طرح کہہ سکتے ہیں۔

اب اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔ ارشاد ہے۔

آیات ۷۷-۸۰

إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٧٧﴾ وَإِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيقًا يَلْوُونَ أَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتَابِ لِتَحْسَبُوهُ مِنَ الْكِتَابِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتَابِ وَيَقُولُونَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿٧٨﴾ مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَٰكِنْ كُونُوا رَبَّانِيِّينَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ ﴿٧٩﴾ وَلَا يَأْمُرَكُمْ أَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلَائِكَةَ وَالنَّبِيِّينَ أَرْبَابًا ۗ أَيَأْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ إِذْ

وعٗ اَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ ﴿۸۰﴾

ترجمۂ آیات ۷۷-۸۰

جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کو ایک حقیر قیمت کے عوض بیچتے ہیں ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ اور اللہ نہ ان سے بات کرے گا، نہ ان کی طرف قیامت کے دن دیکھے گا اور نہ ان کو پاک کرے گا۔ ان کے لیے دردناک عذاب ہو گا۔ ۷۷

اور ان میں ایک گروہ ان لوگوں کا بھی ہے جو اپنی زبان کو کتابِ الٰہی کے ساتھ توڑتا موڑتا ہے تاکہ تم اس کو کتابِ الٰہی کا ایک حصہ سمجھو حالانکہ وہ کتابِ الٰہی کا حصہ نہیں اور وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس سے ہے حالانکہ وہ اللہ کے پاس سے نہیں ہے۔ وہ اللہ پر جانتے بوجھتے جھوٹ باندھتے ہیں۔ ۷۸

کسی بشر کی شان نہیں کہ اللہ اس کو کتاب، قوتِ فیصلہ اور منصبِ نبوت عطا فرمائے پھر وہ لوگوں کو یہ دعوت دے کہ لوگو! اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ بلکہ وہ تو لوگوں کو یہی دعوت دے گا کہ لوگو! اللہ والے بنو، بوجہ اس کے کہ تم کتابِ الٰہی کی دوسروں کو تعلیم دیتے ہو اور خود بھی اس کو پڑھتے ہو اور نہ یہ ممکن ہے کہ وہ تمہیں یہ حکم دے کہ فرشتوں اور نبیوں کو رب بناؤ۔ کیا وہ تمہیں کفر کا حکم دے گا بعد اس کے کہ تم خدا کے فرمانبردار ہو۔ ۷۹-۸۰

۲۰- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اِنَّ الَّذِيۡنَ يَشۡتَرُوۡنَ بِعَهۡدِ اللّٰهِ وَاَيۡمَانِهِمۡ ثَمَنًا قَلِيۡلًا اُولٰٓـئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمۡ فِى الۡاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنۡظُرُ اِلَيۡهِمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيۡهِمۡ وَلَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ﴿۷۷﴾

اشتراء کا مفہوم

'اشتراء' کے لفظ پر سورہ بقرہ کی تفسیر میں بحث گزر چکی ہے۔ جب مبادلہ چیز کا چیز سے ہو، جس کا عموماً قدیم زمانہ میں رواج تھا تو ہر شے مبیع بھی ہو سکتی ہے اور ثمن بھی۔ اس وجہ سے کسی شے کا اشتراء درحقیقت اس مفہوم میں خریدنا نہیں ہوتا تھا جس مفہوم میں ہم خریدنا بولتے ہیں بلکہ اس کا مفہوم مبادلہ ہوتا

تھا۔ اس وجہ سے 'اشتراء' کا لفظ بدلنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور پھر اس مفہوم سے ترقی کر کے ترجیح دینے کے معنی میں بھی۔

'عہد اللہ' سے مراد

'عَهْدَ اللّٰهِ' سے مراد کتاب و شریعت ہے اس لیے کہ کتاب و شریعت کی حیثیت اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان معاہدے کی ہوتی ہے۔ یہاں اس عام مفہوم کے اندر ایک خاص اشارہ اس عہد کی طرف بھی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب سے آخری بعثت کے باب میں لیا تھا اور جس کو اہل کتاب نے نہ صرف نسیاً منسیاً کر دیا تھا بلکہ اس کے آثار انھوں نے اپنی کتابوں سے بھی مٹا ڈالنے کی کوشش کی تھی۔

'ایمان' سے مراد

'اَیْمَان' سے مراد وہ عام عہد و پیمان ہیں جن پر اجتماعی و تمدنی زندگی کی بنیاد ہوتی ہے اور جن سے معاشرتی زندگی اور معاملات میں اعتماد اور حسنِ ظن کی فضا بنتی ہے۔ یہود کا اس معاملے میں جو حال تھا وہ اوپر واضح ہو چکا ہے کہ انھوں نے امانتوں میں خیانت کرنے اور اپنے کیے ہوئے عہد و پیمان کی ذمہ داریوں سے فرار کے لیے کیسے کیسے شرعی حیلے ایجاد کر لیے تھے۔

'لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ' میں فعل کی نفی اس کے حقیقی معنی کے اعتبار سے ہے یعنی اللہ تعالیٰ ان سے اس معنی میں کلام نہیں کرے گا یا ان کی طرف نظر نہیں کرے گا جو کلام کرنے اور نظر کرنے کا اصلی مفہوم ہے۔ یہ اسلوب عربی زبان ہی میں عام ہے بلکہ ہر زبان میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنے قول و قرار کو اس طرح خرید نی و فروختنی چیز بنائے ہوئے ہیں اور اپنے دنیوی مفادات پر (جن کی بڑی سے بڑی مقدار بھی اجرِ آخرت کے بالمقابل حقیر ہی ہے) ان کو اس بے دردی سے قربان کر رہے ہیں ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ وہ اپنے جواہرات کو کوڑیوں کے عوض فروخت کر چکے ہیں اور جو لوگ اللہ کی امانت کے معاملے میں ایسے نااہل ثابت ہوئے ان سے نہ تو اللہ اب بات کرے گا، نہ ان کی طرف نظر کرے گا، اور نہ ان کو پاک کرے گا۔ اب آخرت میں ایسے شامت زدوں کے لیے دردناک عذاب کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

یہود سے شدید نفرت کا اظہار

الفاظ کے تیور جو لوگ پہچانتے ہیں وہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہاں ان کے اندر کتنی نفرت اور کیسی شدید بیزاری چھپی ہوئی ہے لیکن اہل کتاب بالخصوص یہود اپنی ان کارستانیوں کے باعث جن کا اوپر ذکر ہوا اسی کے سزاوار تھے۔ خاص طور پر اس وجہ سے بھی کہ یہ وہ قوم تھی جس کو اللہ تعالیٰ نے اس کے پیغمبر کے واسطہ سے اپنے خاص کلام و خطاب کے شرف سے نوازا۔ یہ فرعونیوں کے قدموں کے نیچے روندی جا رہی تھی تو خدا نے اس پر عنایت کی نظر کی اور اس کو اس ذلت سے نکال کر سیادت و امامت کے تخت پر بٹھایا۔ اس کے تزکیہ کے لیے کتاب نازل فرمائی اور اس کو سنوارنے اور سدھارنے کے لیے اس کے اندر اپنے نبی اور رسول بھیجے لیکن اس قوم نے نہ تو اس خطاب و کلام کی کچھ قدر کی اور نہ اس نظرِ شفقت و عنایت اور اس تزکیہ و تطہیر کی، جس کا خدا اور اس کے نبیوں نے یہ کچھ اہتمام کیا تو اب اس قوم کا کیا منہ ہے کہ اللہ اس سے بات

کرے، یا اس کی طرف نظر کرے یا اس کو پاک کرے۔ اس نے تو اپنے اوپر امید کے سارے دروازے خود بند کر لیے۔

اس آیت میں تزکیہ کی جو نفی ہے اس کے دو پہلو ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ آخرت تزکیہ کا محل نہیں ہے، اس کا محل یہ دنیا ہے۔ جب انھوں نے یہاں اس کا موقع ضائع کر دیا تو آخرت میں وہ اس کو حاصل نہ کر سکیں گے۔ دوسرا یہ کہ ان کے جرائم ایسے نہیں ہیں کہ یہ آخرت میں تھوڑی بہت سزا پا کر ان سے پاک ہو جائیں بلکہ یہ جرائم ان کو ہمیشہ ہمیش کے لیے جہنم میں لے ڈوبنے والے ہیں۔

وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ (۷۸)

'لوی بلوی' کا مفہوم

لوی، بلوی، لَیًّا کے معنی کسی چیز کو بٹنے، توڑنے مروڑنے اور اینٹھنے کے ہیں۔ یَلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْکِتٰبِ کے معنی یہ ہوئے کہ کتابِ الٰہی کے بعض الفاظ ادا کرتے ہوئے وہ اپنی زبان اس طرح توڑتے مروڑتے ہیں کہ الفاظ کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں۔

عہد الٰہی سے فرار کی ایک تدبیر

یہ اہل کتاب کی ان تدبیروں میں سے ایک تدبیر ہے جو انھوں نے عہد الٰہی کی ذمہ داریوں سے فرار کے لیے اختیار کی تھیں۔ تفسیر بقرہ میں جہاں ہم نے تحریف کے سوال پر بحث کی ہے وہاں بتایا ہے کہ تحریف کے طریقوں میں سے ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ قرأت کی راہ سے لفظ یا جملہ کا تلفظ توڑ مروڑ کر اس طرح بگاڑ دیتے تھے کہ اصل حقیقت بالکل گم ہو کر رہ جاتی تھی۔ اس جرم کا ارتکاب یہود اور نصاریٰ دونوں ہی نے کیا ہے۔ اس کی مثال میں ہم نے لفظ "مروہ" کا ذکر کیا ہے۔ یہ لفظ تورات میں حضرت ابراہیمؑ کی سرگزشت کے سلسلہ میں آیا ہے کہ اس مقام پر ان کو بیٹے کی قربانی کا حکم ہوا۔ یہود نے اس قربانی کے واقعے میں جہاں کئی اور بیشی کی نوعیت کی بہت سی تبدیلیاں کی ہیں وہیں لفظ مروہ کی قرأت کو بگاڑ کر مریا، موریا، موریاہ، مورہ اور نہ جانے کیا کیا بنایا تاکہ مکہ کی مشہور پہاڑی مروہ کے بجائے اس سے بیت المقدس کے کسی مقام کو مراد لے سکیں اور اس طرح حضرت ابراہیمؑ اور ان کی ہجرت و قربانی کے واقعہ کا تعلق بیت اللہ سے بالکل کاٹ دیں۔ مقصد اس ساری کاوش سے ان کا یہ تھا کہ اس ایرپھیر سے ان پیشین گوئیوں اور اشارات کا رُخ موڑا جا سکے جو نبی اسماعیل اور ان کے اندر نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق تورات کے صحیفوں میں وارد تھیں۔ اسی طرح کی حرکت انھوں نے لفظ 'بکہ' کی قرأت میں کی جس پر آگے چل کر ہم بحث کریں گے۔

اس سازش کے ذکر کے بعد ان کی جسارت اور ڈھٹائی کی طرف توجہ دلائی کہ یہ حرکت وہ اس مقصد سے کرتے ہیں کہ جو چیز کتابِ الٰہی کی نہیں ہے اس پر کتابِ الٰہی کا لیبل چسپاں کر دیں اور جو چیز اللہ کی طرف سے نہیں ہے اس کو اللہ کے نام پر پیش کریں۔ فرمایا کہ یہ جانتے بوجھتے اللہ کے اوپر جھوٹ باندھنا ہے اور اللہ پر جھوٹ باندھنے سے بڑی جسارت اور کیا ہو سکتی ہے۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۝ وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ؕ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (۷۹-۸۰)

حکم کے مختلف مفہوم

"حُکم" کے معنی قضا اور فیصلہ کے ہیں۔ اپنے اسی مفہوم کی روح کو لیے ہوئے یہ قرآن میں تین مختلف پہلوؤں سے استعمال ہوا ہے۔

بعض جگہ محض فیصلہ کے معنی ہیں مثلاً وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ (۷۸۔ انبیاء) (اور ہم ان کے فیصلہ کے وقت موجود تھے) اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا (۵۰۔ مائدہ) (کیا وہ جاہلیت کے فیصلہ کے طالب ہیں اور اللہ سے بڑھ کر کون فیصلہ کرنے والا ہے)

بعض مقامات میں قوتِ فیصلہ اور بصیرت کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً وَلُوْطًا اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا (۷۴۔ انبیاء) (اور لوط کو ہم نے قوتِ فیصلہ عطا فرمائی اور علم) وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً (۱۲-۱۳۔ مریم) (اور ہم نے اس کو بچپن میں فیصلہ کی قوت دی اور خاص اپنے پاس سے سوز و گداز اور پاکیزگی)

بعض آیات میں امر و حکم کے معنی میں ہے مثلاً فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ (۱۲۔ غافر) (پس حکم خدائے بلند و بزرگ کے لیے ہے) وَلَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (۷۰۔ قصص) (اور اسی کے لیے حکم ہے اور تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے)

یہاں موقع و محل پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ اپنے دوسرے اور تیسرے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔[۱]

'ربانی' کا مفہوم

'رَبَّانِی' کے معنی خدا پرست اور اللہ والے کے ہیں۔ یہ لفظ عربی میں عبرانی سے آیا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ رِبِّی کا لفظ تورات اور انجیل میں بہت آیا ہے۔ صورت ذرا دونوں کی مختلف ہے لیکن معناً کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا۔

اس آیت کا رخ خاص طور پر نصاریٰ کی طرف ہے جو اس سورہ میں اصلاً مخاطب ہیں۔ اب تک کی بحث بیشتر نقل پر مبنی تھی۔ اس آیت میں عقل سلیم کو مخاطب کیا ہے اور فرمایا ہے کہ سوچنے کی بات ہے کہ یہ کسی طرح ممکن ہے کہ ایک انسان جس کو اللہ تعالیٰ کتاب و حکمت اور نبوت سے سرفراز فرمائے، وہ لوگوں کو اللہ کے بجائے اپنا بندہ بننے کی دعوت دے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہاری بدعات نہ صرف مسیح کی تعلیمات، تمہاری مسلمہ تاریخ، اور انبیاء کے متفق علیہ عقاید کے بالکل خلاف ہیں بلکہ عقل سلیم بھی مسیح کی طرف ان کی نسبت قبول نہیں کر سکتی۔ اللہ تعالیٰ جب کسی بندے کو نبوت و رسالت کے منصب پر سرفراز فرماتا ہے اور اس

---

[۱] لفظ حکم کی یہ تحقیق استاذ امامؒ کا افادہ ہے۔

کو کتاب و حکمت عطا فرماتا ہے تو اس لیے کہ وہ لوگوں کو دوسروں کی بندگی اور غلامی سے چھڑا کر خدا کی بندگی و غلامی میں لائے نہ کہ ان کو خدا سے چھڑا کر اپنا بندہ بنانے کی کوشش کرے۔ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ جس کو خدا نے اپنے گلّے کی تلاش کے لیے بھیجا وہ خود ہی اس کے گلّے کو بھٹکانے والا بن گیا۔ بھلا اس سے بڑی تہمت خدا کے ایک رسول پر اور کیا ہو سکتی ہے؟

اس کے بعد بتایا کہ ایک حاملِ کتاب و حکمت نبی اگر تمھیں دعوت دے سکتا ہے تو اس بات کی دے سکتا ہے کہ لوگو! خدا پرست اور اللہ والے بنو اس لیے کہ تمھارے کتابِ الٰہی کے پڑھنے پڑھانے والے ہونے کا اگر کوئی صحیح تقاضا ہو سکتا ہے تو یہی ہو سکتا ہے۔

پھر فرمایا کہ جس طرح وہ لوگوں کو اپنا بندہ بننے کی دعوت نہیں دے سکتا اسی طرح وہ یہ دعوت بھی نہیں دے سکتا کہ فرشتوں اور نبیوں کو اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ بنالو اس لیے کہ دعوتِ ایمان کے ساتھ یہ کفر کی دعوت کس طرح جمع ہو سکتی ہے؟ کیا جو شخص تمھارے لیے ایمان و اسلام کی دعوت لے کر آئے گا وہی تمھیں مسلم بنانے کے بعد کفر میں جھونکنے کی کوشش کرے گا۔

اس آخری ٹکڑے میں خطاب میں ذرا وسعت پیدا ہو گئی ہے یعنی نصاریٰ کے ساتھ ساتھ اس میں ایک اشارہ قریش کی طرف بھی ہو گیا ہے جو فرشتوں اور نبیوں کے بھی بت بنا کر پوجنے لگے تھے۔

۲۱- آگے کا مضمون ــــــ آیات ۸۱-۹۱

اب آگے پہلے ایک جامع میثاق کا حوالہ دیا ہے جو اہلِ کتاب سے انبیا علیہم السلام خصوصاً آخری نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید و حمایت کے لیے لیا گیا تھا اور اہلِ کتاب نے من حیث الجماعت اس کا اقرار کیا تھا لیکن اب وہ، جیسا کہ اوپر تفصیلات گزریں، اس کی ذمہ داریوں سے گریز اختیار کر رہے ہیں۔

پھر اہلِ کتاب سے باندازِ تعجب سوال کیا ہے کہ اگر وہ آخری نبی پر ایمان لانے اور اپنے باندھے ہوئے عہد کی ذمہ داریوں سے گریز اختیار کر رہے ہیں تو کیا وہ اللہ کے دین کے سوا کسی اور دین کے طالب ہیں؟ اللہ کا دین تو اسلام ہے اور یہی دین اس تمام کائنات کا دین ہے اس لیے کہ اس کائنات کی ہر چیز اپنے دائرۂ تکوینی میں طوعاً و کرہاً بہر حال اللہ ہی کی اطاعت کرتی ہے۔

اس کے بعد امتِ مسلمہ کے کلمۂ جامعہ کا حوالہ دیا ہے کہ اگر یہ اہلِ کتاب اپنے تعصبات کی جکڑبندی سے آزاد نہیں ہونا چاہتے تو تم ان کو ان کے حال پر چھوڑو اور یہ اعلان کر دو کہ ہم تمام انبیا پر ایمان لاتے ہیں، ان کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے اور ہم خدا ہی کے فرمانبردار ہیں۔

پھر آگے کی آیات میں ان اہلِ کتاب کے انجامِ بد کا ذکر فرمایا ہے کہ بھلا یہ لوگ جنھوں نے ایمان کے بعد کفر کی راہ اختیار کی ہے اور آخری رسولؐ کو پہچاننے کے بعد اس کی تکذیب کی ہے، خدا کی ہدایت سے

کس طرح بہرہ مند ہو سکتے ہیں۔ یہ تو اس کے سزاوار ہیں کہ ان پر اللہ، اس کے فرشتوں اور تمام خلق کی لعنت ہو ـــ اب اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات ۸۱-۹۱

وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُم مِّن كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنصُرُنَّهُ ۚ قَالَ أَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَىٰ ذَٰلِكُمْ إِصْرِي ۖ قَالُوا أَقْرَرْنَا ۚ قَالَ فَاشْهَدُوا وَأَنَا مَعَكُم مِّنَ الشَّاهِدِينَ ﴿٨١﴾ فَمَن تَوَلَّىٰ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ﴿٨٢﴾ أَفَغَيْرَ دِينِ اللَّهِ يَبْغُونَ وَلَهُ أَسْلَمَ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا وَإِلَيْهِ يُرْجَعُونَ ﴿٨٣﴾ قُلْ آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنزِلَ عَلَيْنَا وَمَا أُنزِلَ عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسَىٰ وَعِيسَىٰ وَالنَّبِيُّونَ مِن رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ﴿٨٤﴾ وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴿٨٥﴾ كَيْفَ يَهْدِي اللَّهُ قَوْمًا كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ وَشَهِدُوا أَنَّ الرَّسُولَ حَقٌّ وَجَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۚ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿٨٦﴾ أُولَٰئِكَ جَزَاؤُهُمْ أَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴿٨٧﴾ خَالِدِينَ فِيهَا لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ ﴿٨٨﴾ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِن بَعْدِ ذَٰلِكَ وَأَصْلَحُوا

فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۸۹﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّوْنَ ﴿۹۰﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّلَوِ افْتَدٰى بِهٖ ۗ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ وَّمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۹۱﴾

ع ۹ / ۱۱ / ۱۷

ترجمۂ آیات ۸۱ - ۹۱

اور یاد کرو جب کہ خدا نے تم سے نبیوں کے بارے میں میثاق لیا۔ ہر گاہ میں نے تمھیں کتاب اور حکمت عطا فرمائی، پھر آئے گا تمھارے پاس ایک رسول مصداق بن کر ان پیشین گوئیوں کا جو تمھارے پاس موجود ہیں تو تم اس پر ایمان لانا اور اس کی مدد کرنا۔ پوچھا کیا تم نے اس امر کا اقرار کیا اور اس پر میری ڈالی ہوئی ذمہ داری تم نے اٹھائی، بولے کہ ہم نے اقرار کیا۔ فرمایا کہ تو گواہ رہو اور میں بھی تمھارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں۔ تو جو لوگ اس عہد کے بعد پھر جائیں گے وہی لوگ نافرمان ٹھہریں گے۔ ۸۱-۸۲

کیا یہ اللہ کے دین کے سوا کسی اور دین کے طالب ہیں حالانکہ جو آسمان و زمین میں ہیں طوعاً و کرہاً سب اسی کے فرمانبردار ہیں اور سب اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے تم کہہ دو کہ ہم تو اللہ پر اور اس چیز پر ایمان لائے جو ہم پر اتاری گئی اور اس چیز پر جو ابراہیم اسماعیل، اسحاق، یعقوبؑ اور ان کی اولاد پر اتاری گئی اور اس چیز پر جو موسیٰ، عیسیٰ اور دوسرے نبیوں کو ان کے رب کی جانب سے دی گئی، ہم ان میں سے کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں۔ اور جو اسلام کے سوا کسی اور دین کا طالب بنے گا تو وہ اس سے قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نامرادوں میں سے ہو گا۔

اللہ ان لوگوں کو کس طرح بامراد کرے گا جنھوں نے ایمان کے بعد کفر کیا درآنحالیکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ رسول سچے ہیں اور ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں بھی آچکی ہیں اور اللہ ظالموں کو بامراد نہیں کرے گا۔ ان لوگوں کا بدلہ یہ ہے کہ ان پر اللہ کی، اس کے فرشتوں کی اور سارے لوگوں کی لعنت ہوگی۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے نہ ان کا عذاب ہلکا کیا جائے گا، نہ ان کو مہلت ہی دی جائے گی۔ البتہ جن لوگوں نے اس کے بعد توبہ اور اصلاح کر لی تو بے شک اللہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ جن لوگوں نے کفر کیا اپنے ایمان کے بعد اور اپنے کفر میں بڑھتے گئے ان کی توبہ ہرگز قبول نہیں ہوگی اور یہی لوگ اصلی گمراہ ہیں۔ بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اور اسی کفر کی حالت میں مر گئے اگر وہ زمین بھر سونا بھی فدیہ میں دیں تو قبول نہیں کیا جائے گا۔ ان کے لیے عذاب دردناک ہے اور ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔ ۸۳-۹۱

۲۲- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُمْ مِنْ كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنْصُرُنَّهُ ۚ قَالَ أَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَىٰ ذَٰلِكُمْ إِصْرِي ۖ قَالُوا أَقْرَرْنَا ۚ قَالَ فَاشْهَدُوا وَأَنَا مَعَكُمْ مِنَ الشَّاهِدِينَ ۝ فَمَنْ تَوَلَّىٰ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ (۸۱-۸۲)

انبیا کے باب میں بنی اسرائیل سے میثاق

'مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ'، میں اضافت فاعل کی طرف نہیں بلکہ مفعول کی طرف ہے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ انبیا سے میثاق لیا گیا بلکہ یہ مطلب ہے کہ انبیا کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے میثاق لیا۔ یہ میثاق، جیسا کہ آیت میں ذکر ہے، اس بات کے لیے تھا کہ بنی اسرائیل چونکہ کتاب و حکمت کے حامل اور امین بنائے گئے ہیں اس وجہ سے ان کے اس منصب کا فطری تقاضا یہ ہے کہ جو انبیا آئیں خاص طور پر آخری نبی جب آئیں تو سب سے آگے بڑھ کر ان پر ایمان لائیں اور ان کی مدد کریں۔ اس عہد کا ذکر قرآن میں مختلف اسلوبوں سے ہوا ہے، مثلاً سورۂ مائدہ میں ہے۔

وَلَقَدْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ	اور اللہ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا۔ اور اٹھائے ہم نے
وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيبًا ۖ وَقَالَ	ان میں سے بارہ نقیب اور اللہ نے فرمایا کہ میں تمھارے

اللّٰہُ اِنِّیْ مَعَکُمْ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَیْتُمُ الزَّکٰوۃَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِیْ وَعَزَّرْتُمُوْھُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُکَفِّرَنَّ عَنْکُمْ سَیِّاٰتِکُمْ وَلَاُدْخِلَنَّکُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ فَمَنْ کَفَرَ بَعْدَ ذٰلِکَ مِنْکُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیْلِ (۱۲ - مائدہ)

ساتھ ہوں اگر تم نماز کا اہتمام کرتے اور زکوٰۃ دیتے رہے اور میرے رسولوں پر ایمان لائے اور ان کی عزت کی اور اللہ کو قرض حسن دیتے رہے، میں تمہارے گناہ تم سے جھاڑ دوں گا اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ جس نے اس کے بعد تم میں سے کفر کیا تو وہ وسط شاہراہ سے بھٹک گیا۔

نبی اُمّی کے باب میں میثاق

اس آیت میں رُسُل کا لفظ ہے جو عام ہے لیکن ایک دوسری آیت میں نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کی تصریح بھی ہے، ملاحظہ ہو۔

فَسَاَکْتُبُھَا لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَالَّذِیْنَ ھُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوْنَ ہ اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَہٗ مَکْتُوْبًا عِنْدَھُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ یَاْمُرُھُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیُحِلُّ لَھُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْھِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَیَضَعُ عَنْھُمْ اِصْرَھُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ کَانَتْ عَلَیْھِمْ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِہٖ وَعَزَّرُوْہُ وَنَصَرُوْہُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَہٗٓ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ (۱۵۶ - ۱۵۷ اعراف)

پس میں اپنی اس رحمت کو ان لوگوں کے لیے لکھ رکھوں گا جو تقویٰ اختیار کریں گے، زکوٰۃ دیتے رہیں گے اور جو ہماری آیتوں پر ایمان لائیں گے یعنی ان لوگوں پر جو اس رسول اور نبی امی کی پیروی کریں گے جس کو وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں، جو انھیں نیکی کا حکم دیتا ہے، ان کے لیے پاکیزہ چیزوں کو حلال ٹھہراتا ہے، ان پر گندی چیزوں کو حرام کرتا ہے اور ان پر سے اس بوجھ اور ان پابندیوں کو دور کرتا ہے جو ان پر اب تک رہی ہیں۔ تو جو لوگ اس پر ایمان لائے، اس کی توقیر اور مدد کی اور اس روشنی کی پیروی کی جو اس پر اتاری گئی، وہی فلاح پانے والے ہیں۔

ان آیات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہود اور نصاریٰ دونوں ہی سے نبی امّی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے اور ان کی تائید و نصرت کا عہد لیا گیا تھا، لیکن انھوں نے اس عہد کی کوئی پروا نہیں کی۔ اس عہد کے کچھ آثار تورات اور انجیل میں بھی موجود ہیں لیکن اب وہ تحریف کے گرد و غبار سے بہت بڑی حد تک دھندلے ہو چکے ہیں، مناسب موقع پر وہ زیر بحث آئیں گے۔

رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَکُمْ سے مراد نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَکُمْ کی وضاحت ہم بقرہ میں کر چکے ہیں۔ اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک خاص اہمیت رکھنے والا پہلو یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم

کے ظہور اور آپ کی صفات اور کارناموں سے ان پیشین گوئیوں کا مصداق سامنے آیا تھا جو تورات اور انجیل میں موجود تھیں اور جن کے مصداق کے ظہور کے لیے اہل کتاب منتظر بھی تھے اور ان کو منتظر ہونا چاہیے بھی تھا۔ اس لیے کہ ان پیشین گوئیوں کی تصدیق سے سب سے پہلے انھی کا سر اونچا ہوتا۔ لفظ تصدیق کے اس مفہوم کے لیے ایک حماسی شاعر کا یہ شعر پیش نظر رکھیے۔

فدات نفسی وما ملکت یمینی فوارس صدقوا فیھم ظنونی

"میری جان اور میرا مال ان شہسواروں پر قربان جنھوں نے اپنے بارے میں میرے سارے گمان سچے ثابت کر دیے۔"

اس پہلو سے اگر یہود و نصاریٰ غور کرتے تو وہ دیکھتے کہ حضورؐ کی بعثت سے خود ان کی اور ان کی کتابوں کی تصدیق ہو رہی ہے لیکن یہ ان کی شامت تھی کہ جس نے ان کی تصدیق کی اس کو انھوں نے جھٹلایا اور جس کی حجت اور جس کی شہادت کا بارِ گراں وہ اتنی مدت تک اٹھائے پھرے جب وہ آیا تو انھوں نے اس کی تکذیب کر دی۔

بنی اسرائیل میں یثاق لینے کی صورت

ءَاَقۡرَرۡتُمۡ وَاَخَذۡتُمۡ عَلٰی ذٰلِکُمۡ اِصۡرِیۡ' کا ایک خاص موقع و محل ہے جس کو نگاہ میں رکھنا چاہیے تب اس ٹکڑے کا زور سمجھ میں آجائے گا۔ موسوی شریعت میں یہ قاعدہ تھا کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس طرح کی ہدایات اترتیں تو حضرت موسیٰؑ ان کو انفرادی طور پر اپنے صحابہ کو صرف سنا دینے ہی پر اکتفا نہ فرماتے بلکہ بنی اسرائیل کی پوری جماعت یا کم ازکم ان کے تمام سرداروں کو خیمۂ عبادت میں جمع کرتے، تلاوت بیان ہوتا، حضرت موسیٰؑ وعظ و تذکیر کے بعد خداوند خدا کا حکم سناتے پھر سب سے اس کی اطاعت کا اقرار لیتے سب کے اقرار کے بعد لوگوں کو اس کا گواہ رہنے کی تاکید کرتے، اور خدا کو اس پر گواہ ٹھہراتے۔ آخر میں اس حکم کی نافرمانی کے دنیوی و اخروی عواقب و نتائج سے بھی آگاہ فرما دیتے۔ اس طرح گویا اللہ تعالیٰ کا ہر امر و نہی اللہ تعالیٰ اور بنی اسرائیل کے درمیان ایک عہد و میثاق کا درجہ حاصل کر لیتا۔ اب یہ کس قدر عبرت کا مقام ہے کہ جس شریعت کے تحفظ کے لیے یہ جتن کیے گئے اس کے حاملوں نے اس کے ایک ایک عہد کے پرزے اڑا کے رکھ دیے۔ اس روشنی میں فَمَنۡ تَوَلّٰی بَعۡدَ ذٰلِکَ کے الفاظ پر غور کیجیے تو بَعۡدَ ذٰلِکَ کا حقیقی وزن محسوس ہوگا کہ اس کے بعد بھی جو لوگ اپنے عہد سے منہ موڑیں تو ان سے بڑھ کر عہد شکن کون ہوگا؟ فاسق کا لفظ یہاں عام معنوں میں نہیں ہے بلکہ جس طرح ابلیس کے بارے میں وارد ہے کہ فَفَسَقَ عَنۡ اَمۡرِ رَبِّہٖ کہ وہ اپنے رب کے حکم سے نکل بھاگا اسی مفہوم میں یہاں بنی اسرائیل کے لیے استعمال ہوا۔

اَفَغَیۡرَ دِیۡنِ اللّٰہِ یَبۡغُوۡنَ وَلَہٗۤ اَسۡلَمَ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ طَوۡعًا وَّکَرۡھًا وَّاِلَیۡہِ یُرۡجَعُوۡنَ (۸۳)

اسلام تمام کائنات کا دین ہے

اہل کتاب کے اس تمام گریز و فرار پر اب یہ باندازِ استعجاب سوال کیا ہے کہ آخر اسلام اور پیغمبر اسلام سے اس سعی فرار کا مقصد کیا ہے؟ کیا اللہ کے دین کے سوا یہ اہل کتاب کسی اور دین کے طلبگار ہیں۔ اللہ کا دین ازل سے اسلام ہے۔ یہی دین اس نے تمام نبیوں اور رسولوں کو دیا اور یہی دین اس پوری کائنات کا دین ہے۔ سورج، چاند، ابر، ہوا اور آسمان و زمین سب اسی دین کے پیرو ہیں۔ اسلام کی حقیقت اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دینا ہے۔ کس کی مجال ہے جو خدا کے حکم اور اس کے قانون سے سرتابی کر سکے۔ جو اپنے محدود دائرۂ اختیار میں (اور یہ دائرۂ اختیار بھی خدا ہی کا قائم کردہ اور اسی کی مشیت کے تحت ہے) کوئی سرتابی کرتے بھی ہیں تو وہ بھی دائرۂ تکوینی کے اندر خدا کے قوانین کے تحت عاجز و سرفگندہ ہیں۔ کس کی تاب ہے کہ وہ زندگی اور موت کے طبعی قوانین سے بھاگ سکے۔ پس فطرت اور عقل کا تقاضا یہی ہے کہ انسان اپنے محدود دائرہ اختیار میں بھی اسی خالق و مالک کے قوانین کی طوعاً تابعداری کرے جس کے قوانین کی تابعداری اپنے دائرۂ تکوینی میں کرتا رہا ہے۔ اس طرح اس کی زندگی اس پوری کائنات کے ذرہ ذرہ سے ہم آہنگ و ہم رنگ ہو جائے گی۔ اس کے دائرۂ اختیار اور دائرۂ تکوینی دونوں میں کامل موافقت پیدا ہو جائے گی اور انسان خدا کی بخشی ہوئی آزادی کو خدا ہی کی شریعت کے حوالہ کر کے اپنے آپ کو فرشتوں اور نبیوں کی طرح خدا کے رنگ میں رنگ لے گا۔ یہی اسلام ہے۔ یہی صبغۃ اللہ ہے۔ یہی خدا کا دین ہے۔ یہی مذہب آدمؑ، یہی دعوتِ نوحؑ اور یہی ملتِ ابراہیم ہے اور اسی کی دعوت لے کر یہ آخری نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) آئے ہیں۔ پھر اس دینِ فطرت اور اس دینِ کائنات کو چھوڑ کر یہ اہل کتاب ـــــ اہلِ کتاب ہو کر ـــــ کس دین کے طلبگار ہیں۔

"وَاِلَیۡهِ یُرۡجَعُوۡنَ" میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ جس طرح اس زندگی میں خدا کے قانون سے فرار کی کوئی راہ نہیں ہے اسی طرح آگے بھی راہ رُندھی ہوئی ہے۔ جو مر کے اس سے چھوٹتا ہے وہ بھی چھوٹتا نہیں بلکہ وہ بھی خدا ہی کے پاس جاتا ہے اور اپنے آپ کو اسی کے حوالہ کرتا ہے۔

قُلۡ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنۡزِلَ عَلَیۡنَا وَمَاۤ اُنۡزِلَ عَلٰۤی اِبۡرٰهِیۡمَ وَاِسۡمٰعِیۡلَ وَاِسۡحٰقَ وَیَعۡقُوۡبَ وَالۡاَسۡبَاطِ وَمَاۤ اُوۡتِیَ مُوۡسٰی وَعِیۡسٰی وَالنَّبِیُّوۡنَ مِنۡ رَّبِّهِمۡ ۪ لَا نُفَرِّقُ بَیۡنَ اَحَدٍ مِّنۡهُمۡ ۫ وَنَحۡنُ لَهٗ مُسۡلِمُوۡنَ (۸۴)

اسلام کا کلمۂ جامعہ

یہ آیت بعینہٖ سورۂ بقرہ میں بھی گزر چکی ہے۔ وہاں اس کے تمام الفاظ اور مطالب پر بحث ہو چکی ہے۔ ملاحظہ ہو آیت ۱۳۶ بقرہ۔ یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اسلام کے کلمہ جامعہ کا اعلان کرایا گیا ہے اور سیاق کلام یہ ہے کہ یہ اہل کتاب اگر اسلام کے سوا کسی اور دین کے طالب ہیں تو انھیں ان کی خواہش کے حوالہ کرو۔ شیطان جس وادی میں چاہے ان کو ٹھوکر کھلائے۔ تم ان کے پیچھے اپنی اوقات رائیگاں نہ کرو بلکہ اعلان کر دو کہ ہم تو اللہ اور اس کے اس دین پر ایمان لائے جو تمام انبیا کا دین ہے۔ ہم ان انبیا میں کوئی تفریق نہیں کرتے کہ کسی کو مانیں، کسی کو نہ مانیں۔ ہم سب پر ایمان رکھتے ہیں اور ہم خدا ہی کے فرمانبردار ہیں

اور اپنے آپ کو اسی کے حوالہ کرتے ہیں۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (۸۵)

اسلام کے حق میں دلائل واضح کر دینے کے بعد اب یہ صاف الفاظ میں اعلان فرما دیا کہ جو لوگ اسلام کے سوا کسی اور دین کے طالب بنیں گے یا اس پر جمے رہیں گے، عام اس سے کہ وہ یہودیت ہو یا نصرانیت یا کوئی اور دین، وہ اللہ کے ہاں قبول نہ ہوگا۔ ایسے لوگ آخرت میں محروم و نامراد ہوں گے۔

كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۚ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۟ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۸۶-۸۹)

لفظ 'ہدایت' کا خاص مفہوم

لفظ 'ہدایت' پر ہم بقرہ میں بحث کر چکے ہیں کہ اس کے تین مرحلے ہیں۔ آخری مرحلہ اس کا ہدایت آخرت کا ہے۔ اس مرحلہ میں غایت و مقصود کی طرف ہدایت ہوتی ہے اور بندہ اپنی مساعی کے ثمرہ سے بہرہ مند اور اپنی جدوجہد زندگی کے حاصل سے بامراد ہوتا ہے۔ ہدایت کا لفظ اس معنی میں بھی قرآن میں جگہ جگہ استعمال ہوا ہے۔ مجھے بار بار خیال ہوتا ہے کہ 'یھدی' اس آیت میں اسی معنی میں ہے۔ استاذ مرحوم اس سے ہدایت کا عام مفہوم ہی مراد لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہاں بنی اسرائیل کے لیے جس ہدایت کی نفی ہے وہ من حیث القوم ہے، من حیث الافراد نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو قوم ایسے شدید جرائم کی مرتکب ہوئی ہے اس کے لیے اسلام کی راہ کس طرح کھل سکتی ہے!

'شھدوا' میں شہادت سے مراد دل کی شہادت ہے کہ ان اہل کتاب کے دل مانتے ہیں کہ یہ رسول سچے ہیں۔ ان کی وہ نشانیاں جو ان پر ظاہر ہوئی ہیں وہ اس قدر واضح ہیں کہ ان کی صداقت پر ان کے دل گواہی دیتے ہیں لیکن محض ضد، تعصب اور حسد کے سبب سے اس کو جھٹلاتے ہیں۔

یہ اوپر والی آیت کی توجیہ بیان ہوئی ہے کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو کس طرح بامراد کر سکتا ہے جنھوں نے ایمان کے بعد کفر اختیار کیا، جن کے پاس اس رسول کی صداقت کی کھلی ہوئی نشانیاں آ چکی ہیں لیکن وہ ان کی تکذیب کر رہے ہیں، جن کے دل گواہی دیتے ہیں کہ یہ رسول برحق ہیں لیکن پھر بھی ان کی زبانیں اس کو جھٹلاتی ہیں؟ ایسے لوگ اپنی فطرت، اپنی عقل اور اپنی روح پر بہت بڑا ظلم ڈھانے والے ہیں اور یہ سنت الٰہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو بامراد نہیں کرتا جو خود اپنے ہاتھوں اپنے نشانات راہ گم کریں اور اپنے آپ کو خود ٹھوکر کھلائیں۔ ایسے لوگوں کی سزا یہی ہے کہ ان پر اللہ کی، اس کے فرشتوں کی اور ساری خلقت کی لعنت ہو۔ 'الناس' کے ساتھ 'اجمعین' کی تاکید اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ قیامت کے دن ان پر نیک اور بد سب ہی لعنت کریں گے۔ نیکوں کی لعنت کی وجہ تو واضح ہے، بد اس لیے

لعنت کریں گے کہ وہ ان کے سبب سے گمراہ ہوئے ــــ چنانچہ قرآن میں تصریح ہے کہ قیامت کے دن گمراہ لیڈر اور ان کے گمراہ پیرو دونوں ایک دوسرے پر لعنت کریں گے، پیرو کہیں گے کہ تم نے ہمیں برباد کیا، اگر تم ہماری راہ نہ مارتے تو ہم ہدایت پر ہوتے، لیڈر کہیں گے ہم جیسے تھے ویسا ہی ہم نے تم کو بنایا، تم خود شامت زدہ تھے کہ تم نے ہدایت کی راہ اختیار نہ کی۔

خٰلِدِیْنَ فِیْھَا میں ضمیر کا مرجع دوزخ ہے۔ اگرچہ دوزخ کا ذکر الفاظ میں موجود نہیں ہے لیکن اوپر جس لعنت کا ذکر ہے اس نے اس کا ایسا واضح قرینہ بہم پہنچا دیا ہے کہ لفظوں میں اس کے ذکر کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ گویا لعنت خود عذاب کی قائم مقام بن گئی۔ زبان میں اس اسلوب کی مثالیں بہت ہیں۔ سورۂ حدید کی تفسیر میں ہم اس اسلوب پر بحث کریں گے۔ اس عذاب کی نسبت فرمایا کہ نہ اس میں کسی مرحلے میں کوئی تخفیف ہوگی اور نہ اس سے ان کو کبھی مہلت ملے گی۔ اس میں پڑ جانے کے بعد ان کے لیے امید کے سارے دروازے بند ہو جائیں گے البتہ وہ لوگ اس عذاب سے بچ جائیں گے جو ان تنبیہات کے بعد توبہ کر کے اپنے حالات کی اصلاح کر لیں گے اور جن حق پوشیوں کے اب تک مجرم ہوئے ہیں ان کا برملا اظہار و اعلان کر دیں گے۔ اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بَعْدَ اِیْمَانِھِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا کُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُھُمْ ۚ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الضَّآلُّوْنَ ۔ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَھُمْ کُفَّارٌ فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِھِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَھَبًا وَّلَوِ افْتَدٰی بِہٖ ؕ اُولٰٓئِکَ لَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ وَّمَا لَھُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ (۹۰ - ۹۱)

ان لوگوں کا بیان جن کی توبہ قبول نہیں ہوتی

یہ ان لوگوں کا بیان ہے جن کی توبہ قبول نہیں ہوگی۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ان تمام جرائم کا ارتکاب کر کے جن کا ذکر اوپر ہوا، ایمان کے بعد کفر میں مبتلا ہوئے۔ پھر اس کفر پر رقے کے بعد رقے چڑھاتے چلے گئے۔ جب وقت آخر آیا تو زبان سے توبہ توبہ کر لی، نہ اپنے جرائم کی اصلاح کی، نہ اپنی حق پوشیوں کا پیغمبرؐ اور اہلِ ایمان کے سامنے اظہار و اعتراف کیا، نہ اللہ کی راہ میں انفاق اور پیغمبرؐ کی حمایت و نصرت سے اپنے گناہ دھونے کی کوشش کی۔ بلکہ جیسا کہ قرآن میں اشارہ ہے، اس غلط آرزو میں مر گئے کہ سَیُغْفَرُ لَنَا اللہ ہماری ساری غلطیوں کو معاف فرما دے گا۔ قرآن نے یہاں واضح فرما دیا کہ جو لوگ اس قسم کی طمع خام میں مبتلا ہیں، نہ ان کی یہ توبہ توبہ ہے، نہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کی توبہ کو پذیرائی بخشے گا۔

اسی طرح کا معاملہ ان لوگوں کا ہے جو ایمان کے بعد کفر میں مبتلا ہوئے اور اسی حالتِ کفر میں مر گئے۔ فرمایا کہ اگر اس طرح کے لوگ زمین برابر سونا بھی اپنے آپ کو عذابِ الٰہی سے بچانے کے لیے فدیہ میں دیں تو بھی قبول نہیں ہوگا۔ یہ اسلوبِ بیان محض ان کی نجات کے عدم امکان کی تعبیر کے لیے اختیار کیا گیا ورنہ آخرت میں نہ کسی کے پاس فدیہ میں دینے کے لیے کچھ ہوگا، نہ آخرت اس قسم کے لین دین کی کوئی جگہ ہے۔ وَمَا لَھُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ، میں ان لوگوں کی اس طمع خام کی نفی ہے جو یہ اپنے بزرگ اسلاف کی شفاعت

کی رکھتے تھے۔ فرمایا کہ آخرت میں ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔

یہ مضمون سورہ بقرہ میں بھی گزر چکا ہے۔ وہاں ہم نے اس پر تفصیلی بحث کی ہے۔ آیت ہم یہاں بھی نقل کیے دیتے ہیں تاکہ زیر بحث آیت کے بعض مضمرات روشنی میں آجائیں۔ فرمایا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِن بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ ۝ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَبَيَّنُوا فَأُولَٰئِكَ أَتُوبُ عَلَيْهِمْ وَأَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۝ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ۝ خَالِدِينَ فِيهَا لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ ۝ (۱۵۹-۱۶۲ بقرہ)

بے شک جو لوگ ان واضح آیات اور اس ہدایت کو چھپاتے ہیں جو ہم نے اتاری ہے، بعد اس کے کہ ہم نے اس کو اپنی کتاب میں لوگوں کے لیے اچھی طرح واضح کر دیا ہے وہی لوگ ہیں جن پر اللہ بھی لعنت کرتا ہے اور ان پر لعنت کرنے والے بھی لعنت کریں گے۔ البتہ وہ لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں جو توبہ کر لیں اور اپنی اصلاح کریں اور کھول دیں چھپائی ہوئی باتوں کو۔ یہی لوگ ہیں جن کی توبہ میں قبول کروں گا اور میں توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہوں۔ بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اور اسی حالتِ کفر میں مر گئے ان پر اللہ کی، اس کے فرشتوں کی اور سارے لوگوں کی لعنت ہے۔ اس میں ہمیشہ رہیں گے، نہ ان کا عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ ان کو مہلت ہی دی جائے گی۔

۲۳۔ آگے کا مضمون ــــ آیات ۹۲-۹۹

اوپر کا مضمون اگر ذہن میں موجود ہے تو آگے کا سلسلہ بیان سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔ اوپر آیت ۶۲ سے یہ بحث شروع ہوئی تھی کہ یہود اور نصاریٰ ملت ابراہیمؑ پر ہونے کا جو دعویٰ کرتے ہیں محض بے بنیاد دعویٰ ہے۔ ملت ابراہیمؑ پر یہ پیغمبرؐ اور ان کے ساتھی ہیں لیکن یہ یہود و نصاریٰ طرح طرح کی سازشوں اور تحریفوں سے اصل حقائق پر پردہ ڈالنا اور خلق کو گمراہ کرنا چاہتے ہیں کہ قربانی کوئی نہ دینی پڑے۔ بس دینداری کی چند جھوٹی سچی رسمیں ادا کر کے خدا کی وفاداری کے سب سے اونچے مقام کے حق دار سمجھے جاتے رہیں۔

یہاں سب سے پہلے تو یہ مغالطہ دور فرمایا کہ خدا کی وفاداری کا مقام محض جھوٹی رسم داری اور نمائشی دین داری سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ اصل شے یہ ہے کہ خدا کی راہ میں ان چیزوں میں سے خرچ کرو جو تمھیں محبوب ہیں۔ جب تک انسان خدا کے لیے اپنی محبوبات کی قربانی کا عادی نہیں ہوتا اس وقت تک اس میں خدا کے عہد و پیمان کے تقاضوں کو پورا کرنے کا حوصلہ پیدا نہیں ہوتا۔

مسلمانوں پر ملتِ ابراہیم کی مخالفت کا الزام

اس کے بعد ضمنی طور پر یہود کے ایک اعتراض کا جواب دیا ہے جو انھوں نے مسلمانوں کو ملتِ ابراہیم کے خلاف ثابت کرنے کے لیے اٹھایا تھا۔ وہ یہ کہ مسلمانوں کے ہاں کھانے پینے کی بعض ایسی چیزیں جائز ہیں جو یہود کے زعم کے مطابق ابراہیمی شریعت میں حرام تھیں۔ مثلاً اونٹ کی نسبت ان کا دعویٰ تھا کہ یہ حضرت ابراہیمؑ کی شریعت میں حرام ہے لیکن مسلمانوں کے ہاں نہ صرف یہ کہ حلال طیب ہے بلکہ ان کے ہاں یہ محبوب ترین مال ہے اور وہ اس کے نحر اور قربانی کو بڑے ثواب کا کام سمجھتے ہیں۔ اس پروپیگنڈے سے ان کا مقصد، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، محض عوام کو یہ باور کرانا تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے ساتھی ملتِ ابراہیم سے برگشتہ ہیں۔ قرآن نے اس کا جواب دے دیا کہ یہ بات محض یہود کا افترا ہے۔ تورات خود اس بات پر شاہد ہے کہ اونٹ کی حرمت کا تعلق اگر ہے تو شریعتِ موسوی سے ہے نہ کہ شریعتِ ابراہیمی سے۔

اس ضمنی اعتراض کا جواب دینے کے بعد ان کو پھر ملتِ ابراہیمی کی پیروی کی دعوت دی ہے اور ان پیشین گوئیوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو تورات میں خانہ کعبہ کی اولیت، اس کی مرکزیت اور اس کے سرچشمۂ برکت و ہدایت ہونے کے باب میں وارد تھیں لیکن ان پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی گئی، نیز ان نشانیوں کی طرف توجہ دلائی ہے جو صاف شہادت دیتی ہیں کہ اسی سرزمین کو حضرت ابراہیمؑ نے اپنا مسکن بنایا، اسی کو دارالامن قرار دیا، اسی کو حج و عبادت کا مرکز ٹھہرایا اور ہزاروں سال سے ان کی ذریت اس سرزمین پر ان کے نام اور ان کی روایات کی حامل چلی آرہی ہے۔

آخر کی دو آیتوں میں اہل کتاب کو ملامت کی ہے کہ جس راہ کی نشان دہی کے لیے تم خدا کی طرف سے مقرر کیے گئے تھے یہ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ تم اس سے لوگوں کو روکنے اور اس کو گم کرنے کے لیے اپنی کوششیں صرف کر رہے ہو۔ اب اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمایئے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

آیات ۹۲-۹۹

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۹۲﴾ كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَاۗءِيْلُ عَلٰي نَفْسِهٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْھَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۳﴾ فَمَنِ افْتَرٰى عَلَي اللّٰهِ الْكَذِبَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۹۴﴾ قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ

فَاتَّبِعُوۡا مِلَّةَ اِبۡرٰهِيۡمَ حَنِيۡفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ﴿۹۵﴾ اِنَّ اَوَّلَ بَيۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِىۡ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلۡعٰلَمِيۡنَ‌ ﴿۹۶﴾ فِيۡهِ اٰيٰتٌ ۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبۡرٰهِيۡمَ ۚ وَمَنۡ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ‌ؕ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الۡبَيۡتِ مَنِ اسۡتَطَاعَ اِلَيۡهِ سَبِيۡلًا ‌ؕ وَمَنۡ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِىٌّ عَنِ الۡعٰلَمِيۡنَ‏ ﴿۹۷﴾ قُلۡ يٰۤـاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لِمَ تَكۡفُرُوۡنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ شَهِيۡدٌ عَلٰى مَا تَعۡمَلُوۡنَ‏ ﴿۹۸﴾ قُلۡ يٰۤـاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ مَنۡ اٰمَنَ تَبۡغُوۡنَهَا عِوَجًا وَّاَنۡتُمۡ شُهَدَآءُ‌ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ‏ ﴿۹۹﴾

ترجمۂ آیات ۹۲-۹۹

تم خدا کی وفاداری کا درجہ ہرگز نہیں حاصل کر سکتے جب تک ان چیزوں میں سے نہ خرچ کرو جن کو تم محبوب رکھتے ہو اور جو کوئی چیز بھی تم خرچ کرو گے تو اللہ اس سے باخبر ہے۔ ۹۲

کھانے کی ساری چیزیں بنی اسرائیل کے لیے حلال تھیں، مگر وہ جو اسرائیل نے تورات کے نازل کیے جانے سے پہلے اپنے اوپر حرام ٹھہرا لی تھیں۔ کہہ دو لاؤ تورات اور اس کو پڑھو اگر تم سچے ہو۔ جو لوگ اس کے بعد بھی اللہ پر جھوٹ باندھیں وہی لوگ ظالم ہیں۔ ۹۳-۹۴

کہہ دو اللہ نے سچ فرمایا تو ابراہیم کی ملت کی پیروی کرو جو حنیف تھا اور مشرکین میں سے نہ تھا۔ بے شک پہلا گھر جو لوگوں کے لیے بنایا گیا وہی ہے جو مکہ میں ہے۔ عالم والوں

کے لیے برکت اور ہدایت کا مرکز۔ وہاں واضح نشانیاں ہیں، مسکن ابراہیم ہے۔ جو اس میں داخل ہو جائے وہ مامون ہے۔ اور جو لوگ وہاں تک پہنچنے کی استطاعت رکھتے ہیں ان کے اوپر اللہ کے لیے اس گھر کا حج ہے اور جس نے کفر کیا تو اللہ عالم والوں سے بے پروا ہے۔ ۹۵-۹۷

پوچھو اے اہل کتاب تم اللہ کی آیتوں کا کیوں انکار کرتے ہو، درآنحالیکہ جو کچھ تم کر رہے ہو سب خدا کی نظر میں ہے؟ کہو، اے اہل کتاب تم ایمان لانے والوں کو اللہ کی راہ سے کیوں روک رہے ہو، تم اس میں کجی پیدا کرنی چاہتے ہو حالانکہ تم گواہ بنائے گئے ہو۔ جو کچھ تم کر رہے ہو، اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے۔ ۹۸-۹۹

۲۴۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۚ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ (۹۲)

خدا کے ساتھ وفاداری کی شرط محبوب مال کا انفاق

لفظ 'بر' کی تحقیق تفسیر سورہ بقرہ میں گزر چکی ہے۔ اس لفظ کی اصل روح ایفائے عہد و ادائے حقوق و فرائض ہے عام اس سے کہ یہ خدا کے حقوق و فرائض ہوں یا اس کے بندوں کے۔ بنی اسرائیل ایفائے عہد و ادائے حقوق کے معاملے میں تو بالکل صفر تھے لیکن محض چند رسوم کی ظاہر دارانہ پیروی کر کے یہ سمجھتے تھے کہ خدا کی وفاداری میں جو مرتبہ و مقام ان کا ہے وہ کسی کا نہ ہوا ہے نہ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اسی زعم میں وہ اپنے آپ کو حضرت ابراہیمؑ اور دوسرے تمام انبیا کی وراثت کا تنہا اجارہ دار سمجھتے تھے اور یہ سوچنے کے لیے بھی تیار نہ تھے کہ کوئی اس میدان میں ان کا حریف ہو سکتا ہے۔ قرآن نے یہاں ان کے اسی زعمِ باطل پر ضرب لگائی ہے کہ خدا کی وفاداری کا مقام مجرد خالی خولی دعووں اور چند رسموں کے ادا کر دینے سے نہیں حاصل ہو جاتا بلکہ اس کے لیے قربانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب تک تم خدا کی راہ میں اپنی محبوب چیزوں میں سے خرچ نہ کرو اس وقت تک تمہارا یہ دعویٰ بالکل بے دلیل ہے۔

محبت اور وفاداری کی جانچ کے لیے یہ کسوٹی ایک ایسی کسوٹی ہے جو فی الحقیقت بنی اسرائیل کا سارا بھرم کھول دینے کے لیے کافی تھی اس لیے کہ دینداری کی بے خرچ ظاہر داریاں تو وہ کسی نہ کسی حد تک نباہنے

کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن جہاں معاملہ خرچ کرنے کا پیش آجائے اور وہ بھی محبوب مال کے خرچ کرنے کا تو پھر ان کا سارا دعوائے عشق و محبت ہرن ہو جاتا۔ حالانکہ جن حضرت ابراہیمؑ کی پیروی اور جن کی وراثت و نیابت کے وہ تنہا اجارہ دار بنے بیٹھے تھے ان کے متعلق جانتے تھے کہ ان کو خدا کی وفاداری کا جو مقام حاصل ہوا محض زبانی جمع خرچ سے نہیں حاصل ہوا بلکہ اپنے محبوب اکلوتے بیٹے کی قربانی سے حاصل ہوا۔

قرآن نے یہود کی اس رسمی دینداری پر جگہ جگہ تعریض کی ہے مثلاً فرمایا ہے۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ	خدا کی وفاداری کا حق اس سے ادا نہیں ہو جاتا کہ اپنا
الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ	رخ مشرق اور مغرب کی طرف کرو بلکہ اصل وفاداری
اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ	تو ان کی ہے جو اللہ پر، یوم آخرت پر، فرشتوں پر،
وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ	کتاب پر اور نبیوں پر ایمان رکھتے ہیں اور اپنے مال
ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ	اس کے محبوب ہونے کے باوجود دیتے ہیں قرابت مندوں
وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي	کو، یتیموں کو، مسکینوں کو، مسافر کو، سائلوں کو نیز اس
الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى	کو خرچ کرتے ہیں گردنوں کو آزاد کرانے میں، اور نماز کا
الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا	اہتمام کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور جب عہد کر بیٹھیں
عٰهَدُوْا وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ	تو اپنے عہد کو پورا کرنے والے ہیں اور خاص کر وہ لوگ
وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا	جو بھوک اور بیماری میں اور جنگ کے وقت ثابت قدم
وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ (۱۷۷۔ بقرہ)	رہنے والے ہوں۔ یہی لوگ سچے ہیں اور یہی لوگ متقی ہیں۔

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ والآیۃ (اور جو کوئی چیز بھی تم اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے تو اللہ اس سے باخبر ہے) سے مقصود اس کا لازم ہے۔ یعنی خدا جب تمہارے خرچ کیے ہوئے پیسے پیسے سے باخبر ہے تو اطمینان رکھو کوئی حبہ ضائع جانے والا نہیں ہے۔ اگر ایک خرچ کرو گے تو دس گنے سے لے کر سات سو گنے تک پاؤ گے اور اللہ کا فضل مزید براں ہے جس کی کوئی حد و نہایت ہی نہیں۔

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِيْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ فَمَنِ افْتَرٰى عَلَي اللّٰهِ الْكَذِبَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (۹۳-۹۴)

یہود کے ایک اعتراض کا جواب

یہ یہود کے اس اعتراض کا ضمنی جواب ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ یہود مدعی تھے کہ اصل ملت ابراہیمؑ پر وہ ہیں نہ کہ مسلمان۔ اپنے اس دعوے کے ثبوت میں جو باتیں وہ کہتے تھے ان میں سے ایک بات یہ بھی تھی کہ مسلمانوں نے جو چیزیں جائز کر رکھی ہیں ان میں سے بعض چیزیں ملت ابراہیمؑ میں حرام تھیں لیکن مسلمان نہ صرف یہ کہ ان کو جائز رکھتے ہیں بلکہ ان کے بر و تقویٰ اور ان کے انفاق و قربانی کا انحصار

انھی چیزوں پر ہے سان کا اشارہ اونٹ کے ذبیحہ اور ماس کی قربانی کی طرف ہوگا اس لیے کہ اونٹ عرب کے محبوب ترین اموال میں سے تھا، اور یہود کی شریعت میں، جیسا کہ احبار میں وارد ہے، وہ حرام ہے۔

قرآن نے یہاں مناسب موقعہ پر ان کے اس غلط خیال کی تردید کردی۔ فرمایا کہ جو چیزیں طیبات میں داخل اور کھانے پینے کی ہیں وہ سب ابتداءً بنی اسرائیل کے ہاں بھی حلال تھیں مازان جملہ اونٹ بھی ہے۔ البتہ تورات کے نازل ہونے سے پہلے یعقوبؑ نے بعض چیزیں اپنے اوپر حرام ٹھہرالی تھیں۔ چنانچہ تورات میں دیکھ لو کہ اونٹ یا بعض دوسری چیزیں جن کو تم حرام قرار دیتے ہو ان کی حرمت کا کوئی ذکر عہدِ ابراہیمی میں نہیں ملتا۔ اگر ملتا ہے تو تورات میں ملتا ہے۔

یہود کی حرام کردہ طیبات کی تین قسمیں

تورات میں ملتِ ابراہیمی کے خلاف جن طیبات کو حرام ٹھہرایا گیا ہے وہ تین قسم کی ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جو محض یہود کے فقہا کی تحلیل و تحریم اور ان کی موشگافیوں کی پیدا کردہ ہیں۔ انھوں نے اپنے فتوے کے تحت کسی چیز کو حرام ٹھہرایا اور بعد میں ان کا یہی فتویٰ تورات میں شامل ہو کر اس کا ایک جزو بن گیا اور اس طرح فقیہوں کے ایک فتوے نے کتابِ الٰہی کی حیثیت حاصل کرلی۔ تورات میں اس قسم کے جو گھپلے ہوئے ہیں ان پر یہاں بحث کا موقع نہیں ہے، ان کا تعلق تورات کی تاریخ سے ہے اور یہ ایک الگ موضوع ہے۔

دوسری وہ ہیں جو یہود کی سرکشی، ان کی کٹ حجتی اور ان کی سوال بازی کے سبب سے حرام ہوئیں۔ انھوں نے کسی چیز کے متعین کرانے میں اتنے سوالات اٹھائے کہ ان کے لیے جواز کی راہ تنگ سے تنگ ہوتی چلی گئی اور اچھی بھلی طیب و طاہر چیزیں بھی ان کے لیے حرام ہو کر رہ گئیں۔

تیسری وہ ہیں جن سے احتراز و اجتناب کا تصور ان کے ہاں بزرگوں سے چلا آرہا تھا۔ مثلاً بعض چیزیں حضرت یعقوبؑ کسی احتیاط یا محض طبعی و ذوقی عدم مناسبت کی بنا پر نہیں استعمال کرتے تھے۔ یہود نے اس طرح کی چیزوں کا سرا حضرت ابراہیمؑ سے ملادیا اور ان کی حرمت بھی تورات کی محرمات کی فہرست میں شامل ہوگئی۔

یہی وہ حرمتیں ہیں جن کو قرآن میں "اصر و اغلال" سے تعبیر کیا گیا ہے اور یہود کے صحیفوں میں ملتِ ابراہیمؑ پر مبعوث ہونے والے پیغمبرؐ کے بارے میں یہ پیشین گوئی موجود تھی کہ جب وہ آئیں گے تو یہود کے لیے تمام طیبات کو حلال کریں گے اور جو طوق و سلاسل انھوں نے اپنے اوپر لاد رکھے ہیں ان سے ان کو نجات دیں گے اس مسئلہ پر ہم سورۂ انعام کی تفسیر میں تفصیل سے بحث کرنے والے ہیں اس وجہ سے یہاں ان مختصر اشارات پر کفایت کرتے ہیں۔

'فَمَنِ افْتَرٰی الآیہ'، یعنی جو لوگ اس وضاحت کے بعد بھی اس بات پر اڑے رہیں کہ جن چیزوں کو انھوں نے حرام ٹھہرا رکھا ہے وہ ملتِ ابراہیمؑ میں بھی حرام تھیں اور ان کو اللہ تعالیٰ نے حرام ٹھہرایا ہے تو یہ لوگ اللہ پر جھوٹ باندھ رہے ہیں اور جو لوگ اللہ پر جھوٹ باندھیں ان سے بڑھ کر ظالم کون ہوسکتا ہے!

قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۭ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (۹۵)

فرمایا کہ ان لوگوں سے کہہ دو کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو یہ تو محض اللہ پر جھوٹا بہتان ہے البتہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ فرمایا ہے یہ سچ ہے۔ تو اپنی بدعات کو ملتِ ابراہیمؑ ثابت کرنے کی کوشش نہ کرو بلکہ اس ملتِ ابراہیمؑ کی پیروی کرو جس کی دعوت میں دے رہا ہوں۔ ابراہیم علیہ السلام اسلام کی راہ پر بالکل یکسو تھے، نہ انھوں نے اس راہ سے دوسری پگڈنڈیاں نکالیں اور نہ وہ مشرکین میں سے تھے۔

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّھُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ۚ فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ۚ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ۭ وَلِلّٰهِ عَلَي النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ۭ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِىٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ (۹۶ - ۹۷)

بکہ کی تحقیق

'بکہ' سے مراد مکہ[1] ہے۔ قدیم صحیفوں میں اس کا یہی نام آیا ہے۔ لغوی معنی اس کے شہر کے ہیں مثلاً بعلبک (بعل کا شہر) یہود نے آخری بعثت کے نشانات گم کرنے کے لیے قرأت کے توڑ مروڑ یا بالفاظِ قرآن "لَیًّا بِأَلْسِنَتِهِمْ" کے ذریعہ سے جو تحریفیں کی ہیں، ان کی ایک مثال یہ لفظ بھی ہے۔ اس کو یہود نے بگاڑ کر 'بکہ' کے بجائے بکا بنایا اور اس کو مصدر قرار دے کر ترجمہ اس کا رونا کر دیا اور اس طرح 'وادی بکہ' کو رونے کی وادی[2] میں تبدیل کر کے اس سب سے بڑے نشان کو گم کر دیا جس سے خلق کو آخری نبیؐ کے بارے میں رہنمائی مل سکتی تھی۔ اس آیت میں قرآن نے مکہ کو بکہ کے نام سے ذکر کر کے مکہ کے اس قدیم نام کی یاددہانی کی ہے جو تورات کے صحیفوں میں تھا۔ بلکہ بعض صحیفوں میں اب بھی ہے مثلاً زبور میں۔

اس آیت میں ان چیزوں کی طرف اشارہ ہے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا کی عبادت کا وہ گھر جو حضرت ابراہیمؑ نے تعمیر فرمایا یہی مکہ کا بیت اللہ ہے۔ اسی گھر کو حضرت ابراہیمؑ نے ملتِ ابراہیمؑ کا مرکز بنایا اور اسی گھر سے ان کی مشہور دعا رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ الآیہ کے بموجب اس پیغمبر کی دعوت بلند ہوئی، جو امیوں میں پیدا ہونے والے تھے اور جن کی دعوت سے ساری دنیا کو فیض پہنچنے والا تھا۔ مُبٰرَكًا وَّھُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ میں اس بات کا اشارہ موجود ہے۔

یہ بات محتاجِ ثبوت نہیں ہے کہ تورات میں حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں جس بیت ایل (بیت اللہ) کی

---

[1] مولانا فراہیؒ نے اپنی کتاب مفردات القرآن میں لفظ مکہ پر لکھا ہے "لوگوں نے اس لفظ کے اشتقاق کے بارے میں اختلاف کیا ہے لیکن اس امر میں شبہے کی گنجائش نہیں ہے کہ یہ بکہ کی بدلی ہوئی صورت ہے چنانچہ یہ لفظ خود قرآن میں آیا ہے۔ جس وقت حضرت اسماعیلؑ اس وادی میں آباد کیے گئے ہیں اس وادی کا یہی نام تھا۔ اس کے معنی آبادی کے ہیں جیسا کہ لفظ بعلبک سے اس کی شہادت ملتی ہے۔ چونکہ حضرت ابراہیمؑ بابل سے تشریف لائے تھے اس وجہ سے انھوں نے مکہ کے نام کے لیے اپنی زبان کا لفظ پسند فرمایا۔

[2] ملاحظہ ہو مزمور ۸۴۔

تعمیر کا ذکر ہے اس کا مصداق اگر کوئی ہو سکتا ہے تو مکہ کا بیت اللہ ہی ہو سکتا ہے نہ کہ بیت المقدس۔ اس لیے کہ بیت المقدس کی تعمیر حضرت ابراہیمؑ کے سینکڑوں سال بعد حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کے ہاتھوں ہوئی ہے۔ یہ اس بات کا نہایت واضح ثبوت ہے کہ یہی گھر ملت ابراہیمؑ کی برکتوں کا مظہر ہو سکتا ہے نہ کہ بیت المقدس۔

کعبہ کے بیت اللہ ہونے کی نشانیاں

'فِیۡہِ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ' یعنی اس میں نہایت واضح نشانیاں اس بات کی موجود ہیں کہ یہی گھر حضرت ابراہیمؑ کا بنایا ہوا ہے۔ ان نشانیوں کو اگرچہ یہود نے مٹانے کی کوشش کی لیکن تورات میں آج بھی ایسے ناقابل تردید شواہد موجود ہیں جو یہود کی تمام تحریفات کا پردہ چاک کر کے اصل حقیقت کو بالکل بے نقاب کر دیتے ہیں۔ ہم نے سورۂ بقرہ کی تفسیر میں قبلہ کی بحث میں اس مسئلے پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ جو لوگ تفصیل کے طالب ہوں، اس بحث کو پڑھیں۔ یہاں اس کے دہرانے میں طوالت ہو گی۔

نشانیوں کا بالاجمال ذکر کرنے کے بعد جس طرح عام کے بعد خاص کا ذکر ہوتا ہے تین چیزوں کی طرف خاص طور پر اشارہ فرمایا ہے۔ ایک یہ کہ یہ مقام ابراہیم ہے، دوسری یہ کہ جو اس حرم میں داخل ہو جائے وہ امن میں ہو جاتا ہے۔ تیسری یہ کہ تمام اہل استطاعت پر اس گھر کا حج فرض ہے۔

اگرچہ سورہ بقرہ کی تفسیر میں ان ساری چیزوں پر ہم بحث کر چکے ہیں لیکن بالاجمال ہم یہاں بھی ان تینوں چیزوں کے ان پہلوؤں کی طرف اشارہ کیے دیتے ہیں جن سے اس امر کا ثبوت بہم پہنچتا ہے کہ درحقیقت یہی گھر حضرت ابراہیمؑ کا تعمیر کردہ ہے اور یہی ملت ابراہیمؑ کا مرکز ہے۔

مقام ابراہیمؑ سے مراد

مقام ابراہیمؑ سے مراد، جیسا کہ ہم نے تفسیر سورۂ بقرہ میں بدلائل واضح کیا ہے، یہ ہے کہ اسی مقام کو حضرت ابراہیمؑ نے ہجرت کے بعد اپنے قیام کے لیے منتخب فرمایا، یہیں مروہ کے پاس اپنے اکلوتے فرزند کی قربانی کی، یہیں ان کو بیت اللہ کی خدمت اور نماز کے اہتمام کے لیے بسایا اور یہیں ان سے نسبت رکھنے والی ایک پوری قوم صدیوں سے آباد ہے۔ یہ ساری باتیں خود تورات کے دلائل سے اس قدر قطعیت کے ساتھ ثابت ہیں کہ کوئی صاحب انصاف ان کا انکار نہیں کر سکتا۔

مکہ امن کا شہر ہے

'وَمَنۡ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا' سے اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اس سرزمین میں اپنی اولاد کو بساتے ہوئے اس کے لیے امن کی جو دعا کی تھی یہ سرزمین اور یہ گھر اس دعا کی مقبولیت کا مظہر ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کی دعا قرآن میں یوں نقل ہوئی ہے۔

وَاِذۡ قَالَ اِبۡرٰهِيۡمُ رَبِّ اجۡعَلۡ هٰذَا الۡبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجۡنُبۡنِىۡ وَبَنِىَّ اَنۡ نَّعۡبُدَ الۡاَصۡنَامَ (۳۵- ابراھیم)	اور جب کہ ابراہیمؑ نے دعا کی اے میرے پروردگار اس سرزمین کو امن کی سرزمین بنا اور مجھے اور میری اولاد کو بتوں کی پوجا سے محفوظ رکھ۔

یہ اسی دعا کی برکت ہے کہ اشہر حرم کی سنت قائم ہوئی اور اس گھر کے جوار میں آدمی تو درکنار کسی جانور کو

بھی ایذا پہنچانا جرم ٹھہرا۔

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ الآیہ سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اس سرزمین اور اس گھر کے لیے مرجعیت کی جو دعا کی تھی اس کی قبولیت بھی اس کے چپے چپے سے نمایاں ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی اس دعا کا ذکر قرآن میں یوں ہے۔

رَبَّنَا اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْـِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ ۔ (۳۷ - ابراھیم)

اے ہمارے رب، میں نے اپنی اولاد میں سے بعض کو اسماعیل کو، ایک بن کھیتی کی سرزمین میں تیرے محترم گھر کے پاس بسایا، اے ہمارے رب تاکہ یہ نماز قائم کریں تو تو لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر دے اور ان کو پھلوں کی روزی دے کہ یہ تیری شکر گزاری کریں۔

حج کی سنت

اسی طرح حضرت ابراہیمؑ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ہدایت اس گھر کے لیے اعلان حج کی ملی تھی اس کی سنت بھی ان کے عہد سے لے کر آج تک چلی آرہی ہے۔

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْـًٔا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّاۗىِٕفِيْنَ وَالْقَاۗىِٕمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۝ وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰي كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ (۲۶ - ۲۷ - حج)

اور یاد کرو جب ہم نے ابراہیمؑ کو بیت اللہ کے پاس اس ہدایت کے ساتھ بسایا کہ میرا کسی کو شریک نہ ٹھہرائیو اور میرے گھر کو طواف، قیام اور رکوع و سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک رکھیو اور لوگوں میں حج کی منادی کر دو، لوگ تمہارے پاس پیادہ اور لاغر اونٹنیوں پر تمام گہرے راستوں سے آئیں گے۔

ان تمام نشانیوں کے حوالے دینے سے مقصود، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا اہل کتاب پر یہ ثابت کرنا ہے کہ دنیا میں اگر کوئی گھر حضرت ابراہیمؑ کا بنایا ہوا اور ان کی ملت اور ان کی دعوت کا مرکز ہو سکتا ہے تو یہی کعبہ بیت اللہ ہو سکتا ہے۔ اہل کتاب کی تمام تحریفی کوششوں کے باوجود آج بھی یہود کے صحیفوں میں ایسے اشارات و قرائن موجود ہیں جو اصل حقیقت کو کھولنے کے لیے کافی ہیں۔ ان اشارات کی تفصیل کے لیے ہماری سورہ بقرہ کی تفسیر پڑھیے۔

حج کے بارے میں ایک تنبیہ

وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۔ یعنی ان تمام تفصیلات کے بعد بھی جو اہل کتاب اپنی ضد پر اڑے ہی رہ جائیں گے اور یہی دعویٰ کرتے رہیں گے کہ ملت ابراہیمؑ وہی ہے جس پر وہ ہیں اور ملت ابراہیمؑ کا مرکز بیت المقدس ہے تو یہ لوگ اللہ کی آیات کے منکر ہیں اور اللہ تعالیٰ حجت تمام کر دینے کے بعد اس بات سے بے پروا ہو جاتا ہے کہ کون کفر کی راہ اختیار کرتا ہے اور کون ایمان کی۔

آیت کے اسی آخری ٹکڑے پر وہ حدیث مبنی ہے جس میں حضورؐ نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو شخص استطاعت کے باوجود حج سے بے پروا ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ کو اس بات کی کوئی پروا نہیں رہ جاتی کہ وہ یہودی ہو کے مرے گا یا نصرانی ہو کر۔ ہمارے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے شخص کے رویے میں درحقیقت یہود و نصاریٰ کی اس بے پروائی کا ایک عکس ہے جو انھوں نے بیت اللہ کے معاملے میں اختیار کی اور جس کے نتیجے میں وہ اپنا ایمان ہی گنوا بیٹھے۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ ﴿﴾ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّاَنْتُمْ شُهَدَاۗءُ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (۹۸-۹۹)

اب یہ اہل کتاب کو زجر اور ملامت ہے کہ اللہ کی جو نشانیاں ملت ابراہیمؑ، بیت اللہ اور آخری رسول سے متعلق خود تمھارے اپنے صحیفوں میں موجود ہیں ان کو اور ان کے مصداق کو جان بوجھ کر کیوں جھٹلاتے ہو؟ اور لوگوں کے ذہن میں کیوں شبہات بھر رہے ہو؟ یہ بات تمھیں معلوم رہنی چاہیئے کہ اللہ اور اس کی آیات کے ساتھ یہ شرارت جو تم کر رہے ہو یہ گویا اللہ کی موجودگی میں کر رہے ہو اور وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ جنھوں نے اللہ کی توفیق سے یہ راہ پائی ہے اب تم یہ چاہتے ہو کہ ان کے ذہن میں شبہات پیدا کر کے ان کو کسی ایسے رُخ پر موڑ دو کہ ان کی ملی ہوئی راہ پھر گم ہو کر رہ جائے حالانکہ تم کو اللہ نے پہلے سے اس راہ پر اس لیے کھڑا کیا تھا کہ تم لوگوں کو رستہ بتاؤ گے لیکن تم نے شہداء اللہ ہو کر رہزنوں اور بٹ ماروں کا پیشہ اختیار کر لیا، یاد رکھو کہ یہ جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے۔

۲۵۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۱۰۰-۱۰۹

یہاں تک خطاب کا اصلی رخ اہل کتاب کی طرف تھا، ان پر حجت تمام کر دینے کے بعد اب آگے کی آیت سے خطاب مسلمانوں سے ہو گیا ہے اور ان کو آگاہ کیا جا رہا ہے کہ اگر تم نے اہل کتاب کی بات مانی تو یہ تم کو پھر اسی کفر و جاہلیت کے گڑھے میں گرا کے رہیں گے جس سے نکل کر تم ایمان و اسلام کی روشنی میں آئے ہو۔

پھر اس عظیم نعمت کی قدردانی اور شکرگزاری کا احساس دلاتے ہوئے جو انھیں پیغمبرؐ اور قرآن کی شکل میں حاصل ہوئی ہے، اس طریقے کی طرف رہنمائی فرمائی ہے جس کو اختیار کر کے وہ ان فتنوں سے اپنے آپ کو بچا سکتے ہیں جو اہل کتاب ان کو گمراہ کرنے کے لیے اٹھا رہے ہیں۔ ساتھ ہی اس اجتماعی نظام کی طرف بھی رہنمائی فرمائی ہے جو اس ملت کو صراط مستقیم پر قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ ورنہ اس ملت کا انجام بھی وہی ہوگا جو اہل کتاب کا ہوا ــــــ اب اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات ۱۰۰-۱۰۹

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا
الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۰﴾ وَكَيْفَ
تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ ؕ
وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۰۱﴾ ع ۱۰
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا
وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا
تَفَرَّقُوْا ۪ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً
فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ
عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ
اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ
يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ
الْمُنْكَرِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۴﴾ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ
تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ وَاُولٰٓئِكَ
لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۰۵﴾ يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ۚ
فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ ۣ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ
فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۱۰۶﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ
ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ؕ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۰۷﴾
تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ

ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۸﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۱۰۹﴾ ع

ترجمۂ آیات ۱۰۰ - ۱۰۹

اے ایمان والو! اگر تم اہل کتاب کے ایک گروہ کی بات مان لوگے تو یہ تم کو تمھارے ایمان کے بعد پھر کفر کی طرف پلٹا دیں گے، اور تمھارا کفر میں پڑنا کس طرح جائز ہے جب کہ تم کو اللہ کی آیات سنائی جا رہی ہیں اور تمھارے اندر اس کا رسول موجود ہے۔ اور جو اللہ کو مضبوطی سے پکڑے گا تو وہی ہے جس کو صراط مستقیم کی ہدایت ملی۔ ۱۰۰-۱۰۱

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے اور نہ مرو تم مگر اس حال میں کہ تم اسلام پر ہو اور اللہ کی رسّی کو سب مل کر مضبوطی سے پکڑو اور پراگندہ نہ ہو اور اپنے اوپر اللہ کے اس فضل کو یاد کرو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اللہ نے تمھارے دلوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیا اور تم اس کے فضل سے بھائی بھائی بن گئے اور تم آگ کے ایک گڑھے کے بالکل کنارے پر کھڑے تھے تو اللہ نے تمھیں اس سے بچا لیا۔ اسی طرح اللہ تمھارے لیے اپنی ہدایات کو واضح کرتا ہے تاکہ تم راہ یاب ہو۔ اور چاہیے کہ تم میں ایک گروہ ایسا ہو جو نیکی کی دعوت دے، معروف کا حکم کرے اور منکر سے روکے اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ ۱۰۲-۱۰۴

اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو پراگندہ ہو گئے اور جنھوں نے اختلاف کیا بعد اس کے کہ ان کے پاس واضح ہدایات آچکی تھیں اور وہی ہیں جن کے لیے بڑا عذاب ہے۔ اس دن جس دن کچھ چہرے روشن ہوں گے اور کچھ چہرے سیاہ ہوں گے تو جن کے چہرے سیاہ ہوں گے ان سے پوچھا جائے گا کہ کیا تم نے اپنے ایمان کے بعد کفر کیا ہے تو اب

چکھو عذاب اپنے کفر کی پاداش میں۔ رہے وہ جن کے چہرے روشن ہوں گے تو وہ اللہ کی رحمت کے سایہ میں ہوں گے وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ اللہ کی آیات ہیں جو ہم تمہیں حق کے ساتھ سنا رہے ہیں اور اللہ عالم والوں پر کوئی ظلم نہیں کرنا چاہتا، اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب اللہ ہی کے لیے ہے اور سارے معاملات اللہ ہی کے حضور میں پیش کیے جاتے ہیں۔ (۱۰۵-۱۰۹)

۲۶- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ (۱۰۰)

مسلمانوں کو اہل کتاب کے اشرار سے بچتے رہنے کی تاکید

فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ سے اہل کتاب کا وہی گروہ مراد ہے جس کی مخالفتوں اور وسوسہ اندازیوں کا اوپر تفصیل سے ذکر ہوا ہے۔ اہل کتاب میں ایک گروہ، جیسا کہ اوپر بھی ذکر گزر چکا ہے اور آگے بھی آرہا ہے، اہل انصاف کا بھی تھا، اس وجہ سے قرآن نے جگہ جگہ اس امر کو ملحوظ رکھا ہے کہ ان کے ساتھ کوئی ناانصافی نہ ہونے پائے۔ چنانچہ یہاں بھی مسلمانوں کو اہل کتاب کی وسوسہ اندازیوں اور خاکبازیوں سے بچتے رہنے کی جو تاکید فرمائی ہے تو تعیین کے ساتھ اس گروہ کی طرف انگلی اٹھا دی ہے جس سے بچانا پیش نظر ہے۔ یہ انصاف کا بھی تقاضا تھا اور دعوت و تبلیغ کے نقطۂ نظر سے بھی یہی بات مطابق حکمت و مصلحت تھی۔

اس آیت میں تنبیہ کا خاص پہلو یہ ہے کہ یہ ہیں تو اہل کتاب میں سے اس وجہ سے ایک نیک نیت آدمی کو یہ حسن ظن ہو سکتا ہے کہ بھلا یہ دیندار لوگ کوئی گمراہی کی بات کس طرح سوچ سکتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ اسلام کے ایسے پکے دشمن ہیں کہ جو مسلمان ان کی باتوں میں آجائے گا یہ اس کو پھر کافر بنا کے چھوڑیں گے۔

وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ ۭ وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۱۰۱)

فتنوں سے محفوظ رہنے کی تدبیر

اعتصام کے معنی کسی شے کو مضبوطی سے پکڑنے اور تھامنے کے ہیں۔ اعتصام باللہ کے معنی اللہ کے احکام و ہدایات اور اس کی کتاب پر مضبوطی سے نرم و گرم ہر طرح کے حالات میں مخالفت و موافقت سے بے نیاز ہو کر قائم رہنا ہے۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ یوں تو کفر وارتداد ہر حالت میں انسان کی بدبختی اور اس کی شامت کی دلیل ہے لیکن آج تم نے اگر یہ راہ اختیار کی جب کہ اللہ کی آیات تمھیں سنائی جا رہی ہیں اور خدا کا رسول تمھارے اندر موجود ہے تو یہ محرومی و بدبختی کی انتہا ہوگی۔ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ تم نے پورے دن کی روشنی میں ٹھوکر کھائی اور اپنے لیے عذر کا کوئی شائبہ بھی باقی نہ چھوڑا۔ پھر اس قسم کی ٹھوکر سے بچنے کی تدبیر بتا دی کہ اگر چاہتے ہو کہ تمھارے قدم جادۂ مستقیم پر استوار رہیں اور تمھارے مخالفین تمھیں ٹھوکر نہ کھلا سکیں تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ اللہ کو مضبوط پکڑو، یعنی اللہ کی جو آیات وہدایات تمھیں سنائی جا رہی ہیں، انھیں حرزِ جان بناؤ اور تمام مخالفتوں اور تمام خاکبازیوں کے علی الرغم ان پر قائم و دائم رہو۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (۱۰۲)

اعتصام باللہ کی حقیقت

یہ اعتصام باللہ کی حقیقت واضح فرما دی کہ اللہ کو مضبوط پکڑنے کے معنی یہ ہیں کہ اس سے اس طرح ڈرتے رہو جس طرح اس سے ڈرتے رہنے کا حق ہے۔ یہ تقویٰ اگرچہ مطلوب تو اسی حد تک ہے جس حد تک بندے کی استطاعت میں ہے، اس کی وضاحت خود قرآن ہی نے فرما دی ہے کہ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ (۱۶۔ تغابن) لیکن خدا سے ڈرنے اور دوسروں سے ڈرنے میں بڑا فرق ہے، اس وجہ سے ارشاد ہوا کہ خدا سے ڈرتے رہو جس طرح خدا سے ڈرتے رہنے کا حق ہے۔ اول تو بندے پر خدا کے جو حقوق ہیں وہ کسی اور کے نہیں، دوسری بات یہ ہے کہ خدا نے جو حدود و قیود قائم کیے ہیں اور ان کے توڑنے کی جو سزا مقرر کی ہے وہ تمام تر بندوں کی دنیوی و اخروی بہبود کے لیے کی ہے، ان کی پابندی سے خدا کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا بلکہ بندوں ہی کو پہنچتا ہے۔ تیسری یہ کہ خدا کی آنکھیں ہر جگہ نگراں ہیں یہاں تک کہ وہ دلوں کے وسوسوں سے بھی باخبر ہے۔ چوتھی یہ کہ خدا کی پکڑ سے کوئی دوسرا بچا نہیں سکتا اور وہ دنیا اور آخرت دونوں میں سزا دے سکتا ہے اور ہمیشہ کے لیے دے سکتا ہے۔ خدا سے ڈرنے میں جب تک بندہ ان تمام پہلوؤں کو مدنظر نہ رکھے وہ خدا سے ڈرنے کا صحیح مفہوم سمجھ بھی نہیں سکتا چہ جائیکہ وہ اس کا صحیح حق ادا کر پائے۔ بہت سے لوگ جو انسانوں سے ڈر کر خدا اور اس کی شریعت کو چھوڑ بیٹھتے ہیں ان کی بنیادی گمراہی یہی ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کی مخالفت اور خدا کے غضب میں فرق نہیں کر پاتے۔

وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ میں یہ لطیف حقیقت واضح فرمائی ہے کہ خدا سے یہ ڈرنا صرف عارضی اور وقتی طور پر مطلوب نہیں ہے بلکہ یہ زندگی بھر کا معاملہ ہے۔ اسی پر جینا اور اسی پر مرنا ہے۔ ہوش سنبھالنے کے بعد سے یہ جدوجہد شروع ہوتی اور زندگی کی آخری سانس پر تمام ہوتی ہے۔ اگر آخری مرحلے میں بھی یہ تسلسل کہیں ٹوٹ گیا تو ساری عمر کی محنت برباد گئی۔ آیت کے اسلوب میں یہ بات بھی مخفی ہے کہ یہ راہ بہت ہموار نہیں ہے بلکہ اس میں بہت سے نشیب و فراز اور ہر قدم پر اتار چڑھاؤ ہیں۔ اس میں آزمائشوں اور فتنوں سے دوچار ہونا ہوگا اور شیاطین کے شب خونوں اور معاندین کی دراندازیوں اور فساد انگیزیوں

سے سابقہ پیش آئے گا۔ کبھی طمع ورغلانے کے لیے عشوہ گری کرے گی، کبھی خوف دھمکانے کے لیے اپنے اسلحہ سنبھالے گا۔ جو ان سب مرحلوں سے اپنا ایمان و اسلام بچاتا ہوا منزل پر پہنچا اور اسی حال میں اس نے جان، جان آفرین کے سپرد کی درحقیقت وہ ہے جو خدا سے اس طرح ڈرا جس طرح خدا سے ڈرنے کا حق ہے اور یہی ہے جس کو اعتصام باللہ کا مقام حاصل ہوا۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ (۱۰۳)

'حبل اللہ' سے مراد

'حبل' کے معنی رسی کے ہیں۔ اپنے اسی معنی سے ترقی کر کے یہ لفظ تعلق اور ربط کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے اس لیے کہ رسی دو چیزوں میں ربط و تعلق کا ذریعہ ہوتی ہے۔ ایک حماسی شاعر کا مشہور شعر ہے۔

وَلٰكِنِّي وصلت الحبل منه　　مواصلة بحبل ابي بيان

"لیکن میں نے اس سے اپنا تعلق جوڑے رکھا، ابو بیان کے تعلق سے وابستگی کی بنا پر۔"

پھر مزید ترقی کر کے یہ لفظ معاہدہ کے مفہوم میں بھی استعمال ہونے لگا اس لیے کہ رسی جس طرح دو چیزوں کو ایک ساتھ باندھ دیتی ہے اسی طرح معاہدہ بھی دو قوموں کو ایک دوسرے سے باندھ دیتا ہے۔ معاہدہ کے مفہوم میں یہ لفظ خود قرآن میں استعمال ہوا ہے۔ الا بحبل من اللہ وحبل من الناس (مگر اللہ کے اور لوگوں کے کسی معاہدے کے تحت) آیت زیر بحث میں حبل سے مراد قرآن ہے اس لیے کہ یہی ہمارے رب اور ہمارے درمیان ایک عہد و میثاق ہے۔ خدا کو مضبوطی سے پکڑنا ظاہر ہے کہ اپنے ظاہری مفہوم میں نہیں ہے اس لیے کہ خدا چھونے اور پکڑنے کی چیز نہیں۔ اس کو مضبوطی سے پکڑنے کی شکل یہی ہو سکتی ہے کہ ہم اس کتاب کو مضبوطی سے پکڑیں جو ہمارے اور اس کے درمیان واسطہ ہے۔ گویا اوپر والی آیت میں وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ جو فرمایا تھا وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ کے الفاظ سے اس کی وضاحت فرما دی۔

سلف میں سے قتادہ، سدی، عبداللہ بن عباسؓ، مجاہد اور ضحاک کی یہی رائے ہے۔ ابن جریر نے ابو سعید خدریؓ کے واسطے سے ایک روایت بھی نقل کی ہے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کتاب اللہ هو حبل اللہ الممدود من السماء الی الارض: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ کی کتاب ہی اللہ کی رسی ہے جو آسمان سے زمین تک خدا اور اس کے بندوں کے درمیان تنی ہوئی ہے۔

'اعتصام بحبل اللہ' کی جامع حیثیت ہے مطلوب ہے

گویا یہی چیز ہے جو بندوں کو خدا سے جوڑتی ہے، جس نے اس کو تھام لیا، گویا خدا کو تھام لیا۔ سلف میں سے جو لوگ حبل اللہ کی تعبیر عہد اللہ سے کرتے ہیں وہ بھی درحقیقت حبل اللہ سے قرآن ہی کو مراد لیتے ہیں، اس لیے کہ ہمارے اور ہمارے رب کے درمیان معاہدہ کی حیثیت قرآن ہی کو حاصل ہے۔ قرآن اور دوسرے

آسمانی صحیفوں کو میثاق اور عہد سے اسی بنا پر تعبیر کیا گیا ہے۔ اس پر مفصل بحث سورۂ مائدہ میں آئے گی۔
مضبوط پکڑنے کے ساتھ ساتھ جَمِیْعًا کی تاکید اور وَلَا تَفَرَّقُوْا کی نہی نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ یہ چیز جماعتی حیثیت سے مطلوب ہے، سب مل کر اس کو مضبوطی سے تھامیں۔ اسی حبل اللہ سے مسلمانوں کی شیرازہ بندی ہوئی ہے، اس کو چھوڑ کر وہ اپنے شیرازے کو پراگندہ نہ کریں۔ اگر اس کے ساتھ تعلق میں ضعف پیدا ہو گیا، اس کی جگہ انھوں نے دوسری رسیوں کا سہارا لے لیا اور حق و باطل کے جانچنے کے اس سے الگ کچھ معیارات بنا لیے تو وہ بھی اسی طرح پراگندہ ہو جائیں گے جس طرح یہود و نصاریٰ پراگندہ ہو گئے۔

مسلمانوں کو ایک تنبیہ

اس کے بعد اس عظیم احسان کی یاد دہانی فرمائی ہے جو اس کتاب کے ذریعہ سے عرب قوم پر ہوا۔ اس کتاب کے نزول سے پہلے عرب کا ہر قبیلہ دوسرے قبیلے کا دشمن تھا۔ ان میں باہم خونریز جنگیں برپا رہتی تھیں۔ ان کے دیوتا الگ الگ اور ان کے اغراض و مفادات باہم متصادم تھے۔ لیکن اس حبل اللہ نے ان کو ایک رشتہ میں پرو کر ان کو موتیوں کی لڑی بنا دیا اور وہ جو ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے ایک دوسرے کے جگری دوست اور غمخوار بھائی بن گئے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر اس حالت کو باقی رکھنا چاہتے ہو تو اس حبل اللہ کے ساتھ اپنی وابستگی کو برابر برقرار رکھو۔ اگر یہ رشتہ کمزور رہا تو پھر وہی جاہلیت کی حالت لوٹ آئے گی، جس میں اس سے پہلے مبتلا تھے۔ تم تباہی کے گڑھے کے بالکل کنارے پر کھڑے تھے۔ خدا نے تم کو اس سے بچایا ہے۔ اس کو چھوڑ کر پھر اسی گڑھے میں گرنے کا سامان نہ کر لینا۔

چونکہ یہ مقام بہت اہم ہے، جو ہدایات یہاں دی جا رہی ہیں وہ مسلمانوں کے مستقبل سے بڑا گہرا تعلق رکھنے والی ہیں، ان میں معمولی غلطی یا غلط فہمی بھی بڑے ہولناک فتنوں کے دروازے کھول سکتی تھی، اس وجہ سے یہاں، جیسا کہ اوپر کے سلسلہ کلام سے واضح ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنی ہدایات بڑی وضاحت سے بیان فرمائی ہیں تاکہ کسی گمراہی کے لیے کوئی وجہ باقی نہ رہے۔ اسی چیز کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ (الآیہ)

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَھُمُ الْبَيِّنٰتُ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ لَھُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (۱۰۴-۱۰۵)

خلافت کے قیام کا بنیادی مقصد

یہ، امت کو اس اہتمام و انتظام کی ہدایت فرمائی گئی ہے جو اعتصام بحبل اللہ پر قائم رہنے اور لوگوں کو قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ اس مقصد کے لیے یہ ہدایت ہوئی کہ مسلمان اپنے اندر سے ایک گروہ کو اس کام پر مقرر کریں کہ وہ لوگوں کو نیکی اور بھلائی کی دعوت دے، معروف کا حکم کرے اور منکر سے روکے۔ معروف و منکر سے مراد شریعت اور سوسائٹی دونوں کے معروفات و منکرات ہیں اور ان کے لیے امر و نہی کے جو

الفاظ استعمال ہوئے ان کا غالب قرینہ یہی ہے کہ یہ کام مجرد وعظ و تلقین ہی سے نہیں انجام دینا ہے۔ بلکہ اختیار اور قوت سے اس کو نافذ کرنا ہے جو بغیر اس کے ممکن نہیں کہ یہ گروہ امت کی طرف سے سیاسی اقتدار و اختیار کا حامل ہو۔ اگر تنہا دعوت و تبلیغ ہی سے یہ کام لینا مدنظر ہوتا تو اس مطلب کو ادا کرنے کے لیے یَدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ کے الفاظ کافی تھے یَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ (الآیہ) کی ضرورت نہیں تھی۔ ہمارے نزدیک اس آیت سے اس امت کے اندر خلافت کے قیام کا واجب ہونا ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ اسی حکم کی تعمیل میں مسلمانوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد پہلا کام جو کیا وہ خلافت علیٰ منہاج النبوت کا قیام تھا۔ اس ادارے کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ وہ اس امر کی نگرانی کرے کہ مسلمان اعتصام باللہ کے نصب العین سے ہٹنے نہ پائیں۔ اس کے لیے جو طریقے اس کو اختیار کرنے تھے وہ اصولی طور پر تین تھے۔ دعوت الی الخیر، امر بالمعروف، نہی عن المنکر۔ انہی تین سے خلافت راشدہ کے دور میں وہ تمام شعبے وجود میں آئے جو ملت کی تمام داخلی و خارجی ذمہ داریوں کے ادا کرنے کا ذریعہ بنے۔

وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ کا تعلق صرف اس مخصوص گروہ ہی سے نہیں ہے بلکہ یہ اشارہ پوری امت کی طرف ہے کہ جو امت اعتصام باللہ کے لیے یہ اہتمام کرے گی وہی دنیا اور آخرت میں فلاح حاصل کرنے والی بنے گی۔

اس کے بعد یہود و نصاریٰ کے انجام سے مسلمانوں کو عبرت دلائی ہے کہ وہ خدا کی واضح تنبیہات کے باوجود خدا کی رسی چھوڑ بیٹھے اور پھر جس کے ہاتھ میں جو رسی آگئی وہ اسی کو حبل اللہ سمجھ بیٹھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے درمیان ایسے اختلافات پھوٹ پڑے جن کی اصلاح ناممکن ہوگئی۔ فرمایا کہ تم بھی انہی یہود و نصاریٰ کی طرح اپنی دنیا و عاقبت نہ برباد کر لینا۔ یہ فلاح کی راہ نہیں بلکہ عذاب الیم کی مستوجب ہے۔

یَّوْمَ تَبْیَضُّ وُجُوْہٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْہٌ ۚ فَاَمَّا الَّذِیْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْھُھُمْ ۣ اَکَفَرْتُمْ بَعْدَ اِیْمَانِکُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا کُنْتُمْ تَکْفُرُوْنَ ○ وَاَمَّا الَّذِیْنَ ابْیَضَّتْ وُجُوْھُھُمْ فَفِیْ رَحْمَۃِ اللّٰہِ ۭ ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ ○ تِلْکَ اٰیٰتُ اللّٰہِ نَتْلُوْھَا عَلَیْکَ بِالْحَقِّ ۭ وَمَا اللّٰہُ یُرِیْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِیْنَ ○ وَلِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ۭ وَاِلَی اللّٰہِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ (۱۰۶-۱۰۹)

مسلمانوں کو چند تنبیہات

نظم کلام کی روشنی میں ان آیات پر غور کیجیے تو مندرجہ ذیل حقائق سامنے آئیں گے۔

اول یہ کہ اعتصام بحبل اللہ سے محروم ہو جانے کے بعد اہل کتاب اختلاف و انتشار میں مبتلا ہوئے اور یہ انتشار و اختلاف درحقیقت ایمان کے بعد کفر کی طرف پلٹ جانے کے ہم معنی ہے۔

دوم یہ کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ یہ سرفرازی و سرخروئی بخشتا ہے کہ ان کے ہاتھ میں خود اپنی رسی پکڑاتا ہے اگر وہ اپنی شامت اعمال سے اس رسی کو چھوڑ کر دوسرے پھندے اپنی گردنوں میں ڈال لیتے ہیں تو قیامت کے دن ان کو اسی درجے کی روسیاہی بھی حاصل ہوگی جس درجے کی ان کو سرخ روئی بخشی گئی تھی۔ چہرے روشن ان کے ہوں گے جو ہر طرح کے حالات میں اس رسی کو تھامے رہیں گے۔ یہ لوگ بے شک اللہ کے فضل و رحمت

کے حق دار ہوں گے۔

سوم یہ کہ یہ ساری تنبیہات بالحق ہیں یعنی ہر بات شدنی ہے۔ ان کو محض خالی خولی دھمکی سمجھ کر جو لوگ نظر انداز کریں گے وہ اپنی روسیاہی کا سامان خود کریں گے اور اس کی تمام تر ذمہ داری انھی پر ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آگاہی پہلے سے اسی لیے سنا دی ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ نہیں چاہتا کہ کسی کو سزا اس پر حجت تمام کیے بغیر دے۔

چہارم یہ کہ آسمان و زمین میں سارا اختیار صرف اللہ تعالیٰ ہی کا ہے۔ سارے امور اسی کے حضور پیش ہوں گے اور اسی کا فیصلہ ناطق و نافذ ہوگا۔ اگر کسی نے کسی اور سے امید باندھ رکھی ہو تو اس کی یہ امید محض ایک واہمہ ہے جو حقیقت کے ظہور کے بعد بالکل سراب ثابت ہوگی۔

یہ ملحوظ رہے کہ یہ ساری تنبیہات مسلمانوں کو سنائی جا رہی ہیں کہ ان تمام خطرات سے بچ کے رہنا۔

۲۷۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۱۰-۱۲۰

اوپر کی تنبیہات کے اندر یہ حقیقت خود بول رہی تھی کہ اہل کتاب جس منصب امامت پر اب تک سرفراز رہے ہیں ہر پہلو سے وہ اس کے لیے نااہل ثابت ہو چکے ہیں۔ اس وجہ سے وہ اس منصب سے معزول ہوئے اور خدا نے یہ امانت اس امت کے سپرد فرمائی جو اس کی اہل ہے۔ ساتھ ہی مسلمانوں کو یہ بشارت دی ہے کہ اب یہ اہل کتاب تمھاری مخالفت میں جتنا زور چاہیں لگا لیں وہ تمھارا کچھ بھی نہ بگاڑ سکیں گے بلکہ ہر جگہ منہ کی کھائیں گے اور ان کے لیے ذلت مقدر ہو چکی ہے۔

اثنائے کلام میں اہل کتاب کے اس گروہ کی تحسین بھی فرمائی ہے جو حق پر قائم تھا اور جو بالآخر دولتِ اسلام سے سرفراز ہوا۔

پھر اہل کتاب کی اصل بیماری کی طرف اشارہ ہے جو فی الحقیقت قبولِ حق میں ان کے لیے حجاب بنی اور یہ واضح فرمایا کہ اس حق سے محروم رہنے کے بعد اب وہ اپنی دینداری کا بھرم رکھنے کے لیے جو ظاہرداری بھی کریں گے سب اکارت جائے گی، اس کا کچھ حاصل نہیں ہے۔

اس کے بعد مسلمانوں کو متنبہ کیا ہے کہ اب تم ان سے تمام تعلقات دوستی و محبت ختم کر لو اس لیے کہ اب تمھارے لیے ان کے دلوں میں دشمنی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے اور ان کے اندر خیر کی کوئی رمق باقی نہیں رہی ہے ـــــ اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۱۰-۱۲۰

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ

لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۱۱۰﴾
لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّآ اَذًى ؕ وَاِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ ۟ ثُمَّ
لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ
مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ
عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ
يَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۱۱۲﴾
لَيْسُوْا سَوَآءً ؕ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ
اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ
الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ
فِي الْخَيْرٰتِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ
فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۱۵﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْئًا ؕ وَاُولٰٓئِكَ
اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ مَثَلُ مَا يُنْفِقُوْنَ فِيْ
هٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيْحٍ فِيْهَا صِرٌّ اَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْٓا
اَنْفُسَهُمْ فَاَهْلَكَتْهُ ؕ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ
يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۱۷﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ
دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ؕ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ
الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۚۖ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ؕ قَدْ

بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ هٰٓاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ وَلَا يُحِبُّوْنَكُمْ وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ ۚ وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚۖ وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ؕ قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۱۹﴾ اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۡ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا ؕ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿۱۲۰﴾ ع

ترجمۂ آیات ۱۱۰-۱۲۰

تم بہترین امت ہو، لوگوں کی رہنمائی کے لیے مبعوث کیے گئے ہو، معروف کا حکم دیتے ہو، منکر سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔ اور اگر اہل کتاب بھی ایمان لاتے تو ان کے لیے یہ بہتر ہوتا۔ ان میں سے کچھ تو مومن ہیں اور اکثر نافرمان ہیں۔ وہ تمھیں تھوڑی سی زبان درازی کے سوا کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے اور اگر وہ تم سے جنگ کریں گے تو پیٹھ دکھائیں گے۔ پھر ان کی کوئی مدد بھی نہیں ہوگی۔ وہ جہاں کہیں بھی ہیں ان پر ذلت تھوپ دی گئی ہے۔ بس اگر کچھ سہارا ہے تو اللہ اور لوگوں کے کسی عہد کے تحت۔ وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹے ہیں اور ان پر پست ہمتی تھوپ دی گئی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اللہ کی آیتوں کا انکار اور نبیوں کو ناحق قتل کرتے رہے ہیں کیونکہ یہ نافرمان اور حد سے آگے بڑھنے والے رہے ہیں۔ ۱۱۰-۱۱۲

سب اہل کتاب یکساں نہیں ہیں۔ ان میں ایک گروہ عہد پر قائم ہے۔ یہ رات کے وقتوں میں اللہ کی آیات کی تلاوت اور سجدہ کرتے ہیں۔ اللہ اور روز آخرت پر ایمان

رکھتے ہیں، معروف کا حکم دیتے ہیں، منکر سے روکتے ہیں اور بھلائی کے کاموں میں سبقت کرتے ہیں اور یہ لوگ نیکو کاروں میں سے ہیں۔ جو نیکی بھی یہ کریں گے تو اس سے محروم نہیں کیے جائیں گے اور اللہ خدا ترسوں سے باخبر ہے۔ ۱۱۳-۱۱۵

بے شک جن لوگوں نے کفر کیا ان کے مال اور ان کی اولاد خدا کے مقابل میں کام آنے والے نہیں۔ یہ لوگ دوزخی ہوں گے اور وہ اسی دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ جو کچھ اس دنیا میں خرچ کرتے ہیں اس کی تمثیل ایسی ہے کہ کسی ایسی قوم کی کھیتی پر جس نے اپنے اوپر ظلم کیا ہو، پالے والی ہوا چل جائے اور وہ اس کو تباہ کر کے رکھ دے۔ اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا۔ بلکہ یہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھاتے رہے ہیں۔ ۱۱۶-۱۱۷

اے ایمان والو! اپنے سے باہر والوں کو اپنا محرم راز نہ بناؤ، یہ تمھیں نقصان پہنچانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں گے۔ یہ تمھارے لیے زحمتوں کے خواہاں ہیں۔ ان کی عداوت ان کے مونہوں سے ظاہر ہو چکی ہے اور جو کچھ ان کے سینے چھپائے ہوئے ہیں وہ اس سے بھی سخت تر ہے۔ ہم نے تمھارے لیے اپنی تنبیہات واضح کر دی ہیں اگر تم سمجھ رکھتے ہو۔ یہ تمھی ہو کہ تم ان سے دوستی رکھتے ہو، وہ تو تم سے دوستی نہیں رکھتے حالانکہ تم ساری کتاب پر ایمان رکھتے ہو۔ اور جب وہ تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تو ایمان لائے ہوئے ہیں اور جب آپس میں ملتے ہیں تو تم پر غصہ سے انگلیاں کاٹتے ہیں، کہہ دو تم اپنے غصے میں مر جاؤ۔ اللہ سینوں کے بھید سے خوب واقف ہے۔ اگر تمھیں کوئی کامیابی حاصل ہوتی ہے تو ان کو اس سے تکلیف پہنچتی ہے اور اگر تم کو کوئی گزند پہنچ جاتا ہے تو اس سے خوش ہوتے ہیں اور اگر تم صبر کرو گے اور تقویٰ اختیار کرو گے تو ان کی چال تمھیں کوئی نقصان نہ

پہنچا سکے گی۔ وہ جو کچھ کر رہے ہیں، اللہ اس کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے ہے۔ ۱۱۸-۱۲۰

۲۸- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ط وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ط مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ (۱۱۰)

كَانَ یہاں تامہ ہے جس طرح كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا میں ہے۔ خَيْرَ اُمَّةٍ میں اشارہ اس حقیقت کی طرف ہے کہ اب دین کی صحیح شاہراہ پر تمہی ہو۔ اللہ نے جو دین نازل فرمایا تھا، اہل کتاب نے اس میں کج پیچ کی راہیں نکال کر اصلی دین کو گم کر دیا۔ اب خلق کی رہنمائی کے لیے خدا نے تم کو کھڑا کیا ہے۔ اسی حقیقت کو سورہ بقرہ میں كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (الآیہ) کے الفاظ سے واضح فرمایا ہے۔ وہاں ہم لکھ چکے ہیں کہ یہ امت چونکہ ٹھیک نقطۂ اعتدال اور وسط شاہراہ پر ہے اس وجہ سے یہ خیر امت ہے۔ لِلنَّاسِ میں ایک مضاف محذوف ہے یعنی لوگوں کی اصلاح، رہنمائی اور ان پر اللہ کے دین کی گواہی دینے کے لیے، جیسا کہ فرمایا ہے لِتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ۔

خیر امت کا منصب صفات کے ساتھ مشروط ہے

تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ یہ اس امت کے خیر امت ہونے کی دلیل بیان ہوئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم اس لیے خیر امت ہو کہ تم معروف کا حکم دیتے ہو، منکر سے روکتے ہو، اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس منصب پر تم نسل و نسب کی بنا پر نہیں سرفراز ہوئے ہو، جیسا کہ اہل کتاب نے اپنی بابت گمان کیا، بلکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری نے تمھیں اس کا استحقاق بخشا ہے۔ اس سے یہ بات آپ سے آپ واضح ہوگئی کہ یہ منصب صفات اور ذمہ داریوں کے ساتھ مشروط ہے۔ کسی مخصوص گروہ کے ساتھ اللہ نے اس کو باندھ نہیں چھوڑا ہے کہ لازماً یہ اس کے ساتھ بندھا ہی رہے، اگرچہ وہ یہود و نصاریٰ کی طرح معروف کو منکر اور منکر کو معروف بنا کے رکھ دے۔

ایمان ہر نیکی کی جڑ ہے

تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اصل بنیاد اللہ پر ایمان ہے۔ کسی کو جو کچھ بھی عزت و فضیلت اللہ کی نگاہوں میں حاصل ہوتی ہے وہ اسی کی بنا پر حاصل ہوتی ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی معتبر وہی ہے جو ایمان باللہ کے ساتھ ہو۔ منبروں اور اسٹیجوں سے خدا پرستی اور دینداری کے جو وعظ کھوکھلے سینوں سے نکلتے ہیں ان کی حیثیت وہی ہے جس کا ذکر قرآن نے علمائے یہود سے متعلق فرمایا ہے کہ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ (کیا تم دوسروں کو نیکی اور تقویٰ کے وعظ سناتے ہو لیکن اپنے آپ کو بھول جاتے ہو؟)

فسق کا لفظ یہاں ایمان و اطاعت سے نکل جانے کے معنی میں ہے۔ اس کی تشریح ہم دوسرے مقام میں کر چکے ہیں۔

اس امت کے منصب امامت کا اعلان

نظم کے اعتبار سے یہ آیت جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں، اس امت کے منصب امامت کا اعلان ہے۔ اس سورہ کی تمہید میں اَللّٰھُمَّ مٰلِکَ الْمُلْکِ والی دعا کے ضمن میں ہم یہ لکھ آئے ہیں کہ اس کے اندر اہل کتاب کی معزولی اور امت مسلمہ کی تقرری کا فیصلہ مضمر ہے۔ چنانچہ پوری تفصیل کے ساتھ یہود و نصاریٰ دونوں کی بدعہدیاں واضح کر چکنے کے بعد یہ اعلان کر دیا گیا کہ اب خیر امت کے منصب کے حق دار یہ اہل ایمان ہیں نہ کہ یہود و نصاریٰ۔ یہود و نصاریٰ کے متعلق فرمایا کہ اگر یہ قرآن اور پیغمبرؐ پر ایمان لاتے تو یہ ان کے حق میں بہتر ہوتا۔ بہتر ہوتا کے الفاظ کے اندر جو ابہام و اجمال ہے یہ متکلم کے اس غضب کا غماز ہے جس کے متحمل الفاظ نہیں ہو سکتے تھے۔ اس کے بعد بانداز حسرت فرمایا کہ اہل کتاب ہونے کے باوجود ان میں ایمان لانے والے تھوڑے نکلے اکثریت بدعہدوں اور نافرمانوں ہی کی نکلی۔

لَنْ یَّضُرُّوْکُمْ اِلَّآ اَذًی ط وَاِنْ یُّقَاتِلُوْکُمْ یُوَلُّوْکُمُ الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا یُنْصَرُوْنَ (۱۱۱)

اذًی کا مفہوم

'اذًی' کے معنی دکھ اور تکلیف کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اب ان کی جڑ کٹ چکی ہے، ان کے اندر اب اتنا دم خم نہیں ہے کہ تمھیں کوئی بڑا نقصان پہنچا سکیں۔ بس زیادہ سے زیادہ جو یہ کر سکتے ہیں وہ یہ کہ اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے کچھ طعن و تشنیع، کچھ زبان درازی اور کچھ افترا پردازی و تہمت تراشی کر لیں۔ اس سے زیادہ کا حوصلہ ان کے اندر نہیں ہے۔ اور اگر یہ تم سے لڑنے کے لیے نکلے تو پیٹھ دکھائیں گے اور پھر ایسے ذلیل و خوار ہوں گے کہ کسی طرف سے بھی ان کی کوئی مدد نہیں ہوگی۔ بعد کے واقعات نے قرآن کی اس پیشین گوئی کی حرف بہ حرف تصدیق کر دی۔ یہی مضمون آگے اس طرح بیان ہوا ہے وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ وَمِنَ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْٓا اَذًی کَثِیْرًا (۱۸۶) اور تم ان لوگوں کی طرف سے جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی اور مشرکین کی طرف سے بہت سی تکلیف دہ باتیں سنو گے۔

ضُرِبَتْ عَلَیْھِمُ الذِّلَّۃُ اَیْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰہِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَضُرِبَتْ عَلَیْھِمُ الْمَسْکَنَۃُ ط ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ کَانُوْا یَکْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَیَقْتُلُوْنَ الْاَنْبِیَآءَ بِغَیْرِ حَقٍّ ط ذٰلِکَ بِمَا عَصَوْا وَّکَانُوْا یَعْتَدُوْنَ (۱۱۲)

ذلت کی مار

ضُرِبَتْ عَلَیْھِمُ الذِّلَّۃُ یعنی جس طرح دیوار پر گیلی مٹی تھوپ دی جاتی ہے اسی طرح ان پر ذلت تھوپ دی گئی ہے۔ اس میں اشارہ اس بات کی طرف بھی ہے کہ انھوں نے عزت کی جگہ ذلت کی راہ اختیار کی تو ان پر پوری طرح ذلت مسلط کر دی گئی۔ اَیْنَمَا ثُقِفُوْٓا سے اس ذلت کے احاطہ اور اس کی ہمہ گیری کی طرف اشارہ ہے کہ جہاں کہیں بھی یہ ہیں ذلت ان پر مسلط ہے، یہاں تک کہ اپنے مرکز میں بھی یہ ذلیل و خوار ہیں۔ دنیا کا کوئی خطہ ایسا نہیں ہے جہاں ان کو عزت حاصل ہو اور یہ اپنی کمر کے بل بوتے پر

کھڑے ہوں۔

'اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰہِ' کا مفہوم

'اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰہِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ' میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر یہ کہیں قائم ہیں تو اپنی سطوت و عزت کے اعتماد پر نہیں بلکہ یا تو اللہ والوں کے کسی معاہدے نے ان کو امان دے رکھی ہے یا اپنے پاس پڑوس کے قبائل سے انھوں نے کوئی اسی قسم کا سہارا حاصل کر رکھا ہے۔ یہ سہارے وقتی اور عارضی ہیں۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداءً ان کے مختلف قبائل سے جو معاہدے کیے تھے ان کی عہد شکنیوں اور شرارتوں کی وجہ سے بعد میں وہ ختم کر دیئے گئے اور یہ یا تو اپنے جرائم کی پاداش میں قتل کر دیئے گئے یا جلا وطن کر دیئے گئے۔ دوسرے قبائل سے انھوں نے جو معاہدے کر رکھے تھے وہ قبائل بھی آہستہ آہستہ اسلام کے زیر اثر آ گئے تو وہ معاہدے بھی عملاً بے اثر ہو کر رہ گئے۔ جس درخت کی اپنی جڑیں کھوکھلی ہوں وہ تھونیوں کے سہارے آخر کب تک کھڑا رہ سکتا تھا۔ اس زمانے میں یہود کی نام نہاد سلطنت اسرائیل بھی، جیسا کہ ہم اس کتاب میں کہیں اشارہ کر چکے ہیں، اسی حکم میں داخل ہے۔ وہ بھی درحقیقت اپنے بل بوتے پر نہیں بلکہ بِحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ امریکہ اور انگلستان کے سہارے پر کھڑی ہے اور جو چیز دوسرے کے سہارے کھڑی ہو اس کا کھڑا ہونا اور نہ ہونا دونوں برابر ہیں۔

وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰہِ کا مفہوم

وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰہِ کا مفہوم سورۂ بقرہ کی تفسیر میں ہم واضح کر چکے ہیں کہ یہ یہود کی شامتِ اعمال اور ان کی بدبختی کا بیان ہے کہ جہاں سے ان کو عزت و سرفرازی کی دولتِ دو جہاں لے کے لوٹنا تھا یہ اپنی دوں ہمتی کی وجہ سے وہاں سے خدا کا غضب لے کر لوٹے جس کے نتیجے میں ان پر ذلت مسلط کر دی گئی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو منصبِ امامت و شہادت پر مامور فرمایا تھا۔ اگر یہ اس کی ذمہ داریاں ادا کرتے اور اپنے عہد پر استوار رہتے تو دنیا اور آخرت دونوں میں ان کا مقام بہت اونچا تھا لیکن یہ اپنی دنیا پرستی اور پست ہمتی کی وجہ سے اس کی ذمہ داریاں نہ سنبھال سکے اور خدا کے غضب کے مستحق ٹھہرے۔ یہ حقیقت یہاں پیشِ نظر رہے کہ جو مقام جتنا ہی اونچا ہوتا ہے اس کی چڑھائی اتنی ہی سخت ہوتی ہے اور پھر اسی اعتبار سے اس سے گرنے کا انجام بھی نہایت خطرناک ہوتا ہے۔

'مسکنت' کا مفہوم

وَضُرِبَتْ عَلَیْھِمُ الْمَسْکَنَةُ مسکنت سے مراد بے حوصلگی اور پست ہمتی ہے۔ قرآن نے اہل کتاب کی پست ہمتی کو نہایت حقیقت افروز تمثیلوں سے جگہ جگہ واضح فرمایا ہے۔ ان تمثیلوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہود پر دنیا پرستی کا اتنا غلبہ تھا کہ آخرت کی طلب اور اس کے لیے ایثار و قربانی کا کوئی حوصلہ ان کے اندر باقی رہ ہی نہیں گیا تھا۔ وہ آخرت کے بڑے سے بڑے نسیہ کے لیے اپنی دنیا کے چھوٹے سے چھوٹے نقد کو قربان کرنے کی بھی ہمت اپنے اندر نہیں پاتے تھے۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی ان کی اس بزدلی اور پست ہمتی پر بار بار ملامت کی ہے۔ بعد کے انبیاء نے بھی اس کا نوحہ کیا ہے۔ قرآن نے بھی جگہ جگہ اس کا ذکر کیا ہے۔ کتنے دانی تمثیل ان کی پست ہمتی ہی کی تمثیل ہے اور غور کیجیے تو معلوم

ہوگا کہ ان کی یہ پست ہمتی ہی تھی جس کے سبب سے وہ اس بات کے مستحق ہوئے کہ ان پر ذلت مسلط کر دی جائے۔

ذلت و مسکنت کے عذاب کا سبب

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ الایہ۔ یہ علت بیان ہوئی ہے اس بات کی کہ کیوں یہ ذلت، غضب اور مسکنت کے عذاب کے مستحق قرار پائے؟ فرمایا کہ اس کا سبب یہ ہے کہ یہ اللہ کی آیات کا انکار اور انبیا کو ناحق قتل کرتے رہے ہیں۔ بلندی اور رفعت کا ذریعہ اللہ کی آیات ہیں۔ جو لوگ ان کا انکار کریں اور اس انکار کو اپنا شیوہ بنالیں وہ اگر ذلت کے سزاوار نہ ہوں گے تو کس چیز کے ہوں گے۔ اسی حقیقت کو قرآن نے اس تمثیل میں پیش کیا ہے جس میں فرمایا ہے کہ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ اگر ہم چاہتے تو ان آیات کے ذریعے سے اس کو بلند کرتے لیکن یہ تو برابر زمین ہی کی طرف جھکا رہا۔ ایسا ہی معاملہ انبیا اور آمرین بالقسط کے قتل کا ہے۔ یہ انسانیت کے گل سر سبد ہوتے ہیں۔ انھی کے سہارے انسانیت سعادت اور کمال کے مدارج طے کرتی ہے۔ اگر کوئی گروہ ان کا قاتل رہا ہو تو وہ خدا کی طرف سے غضب اور ذلت کے سوا اور کس چیز کا حقدار ہو سکتا ہے؟

ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ یہ سبب بیان ہوا ہے ان کے کفر بآیات اللہ اور قتل انبیاء کا یعنی نافرمانی اور حدود الٰہی سے تجاوز ان کی عادت رہی ہے۔ اسی چیز نے ان کو کفر اور قتل انبیا پر اکسایا۔ بالآخر یہ جرائم ان کے لیے خدا کے غضب کا باعث ہوئے اور ان پر ذلت و مسکنت تھوپ دی گئی۔

اجزا کی وضاحت کے بعد نظم کے پہلو پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اوپر کی آیت میں جو بات فرمائی گئی تھی، اس آیت میں اس کی دلیل بیان ہوگئی کہ بھلا وہ لوگ تمھارا کیا بگاڑ سکیں گے جن پر ہر جگہ خدا کی مار ہے اور جواب تمھارے سہاروں ہی پر جی رہے ہیں۔

لَيْسُوْا سَوَآءً ۭ مِنْ اَھْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَاۗىِٕمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَاۗءَ الَّيْلِ وَھُمْ يَسْجُدُوْنَ ۝ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ (۱۱۳-۱۱۵)

اُمَّةٌ قَاۗىِٕمَةٌ یعنی وہ گروہ جو اللہ کے عہد و میثاق اور اس کی شریعت پر قائم ہے۔ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَاۗءَ الَّيْلِ وَھُمْ يَسْجُدُوْنَ یعنی وہ شب کے اوقات میں کتاب الٰہی کی تلاوت کرتے ہیں اور نمازیں پڑھتے ہیں۔ شب کی نماز و تلاوت ان کے عہد الٰہی پر قائم رہنے کا ثبوت ہے اس لیے کہ اس بے ریا نماز و تلاوت کی بے قراری انھی لوگوں کے اندر پیدا ہو سکتی ہے جو اپنی عظیم ذمہ داری کا نہایت گہرا احساس رکھتے ہوں۔ نماز کی تعبیر سجدہ سے ایک تو اس پہلو سے ہے کہ سجدہ نماز کے اہم ترین ارکان میں سے ہے، دوسرے یہ خشیت اور تذلل کا سب سے بڑا مظہر ہے، تیسرے اس پہلو سے بھی ہے کہ یہود نے، جیسا کہ ہم اس کتاب میں کہیں ذکر کر چکے ہیں، سجدہ کو اپنی نماز سے خارج کر دیا تھا۔

اہل کتاب کا باایمان گروہ

یہ اہل کتاب کے اس گروہ قلیل کا ذکر ہے جو اس اکثریت سے مستثنیٰ ہے جس کا حال اوپر والی آیت

میں بیان ہوا ہے۔ فرمایا کہ سب اہل کتاب اسی طرح کے نہیں ہیں جن کا ذکر اوپر ہوا ہے بلکہ ان میں ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی ہے جو اپنے عہد پر قائم، شب بیدار و تہجد گزار، اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے والے اور نیکی اور بھلائی کے کاموں میں سبقت کرنے والے ہیں۔ اس گروہ میں وہ لوگ بھی تھے جو علی الاعلان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا چکے تھے اور ایسے لوگ بھی تھے جو اگرچہ ان آیات کے نزول کے وقت تک اپنے اسلام کا اعلان نہیں کر سکے تھے لیکن اندر سے وہ بالکل مومن صادق تھے اور بالآخر وہ اسلام لائے۔ ان لوگوں کو قرآن نے صالحین و متقین میں شمار کیا ہے۔ یہ لوگ جو نیکی بھی کریں گے اس کے اجر سے محروم نہیں رہیں گے۔ یہ اسلام میں آجانے کے بعد اپنی ان نیکیوں کا بھی پورا پورا اجر پائیں گے جو اسلام میں آنے سے پہلے انھوں نے کی ہیں۔ اسی گروہ کا ذکر اس سورہ کے آخر میں فرمایا ہے۔

وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ	اور بے شک اہل کتاب میں ایسے لوگ بھی ہیں
بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَمَآ	جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور اس چیز پر بھی ایمان
اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ لَا يَشْتَرُوْنَ	رکھتے ہیں جو تمھاری طرف اتاری گئی ہے اور جو ان کی
بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ	طرف اتاری گئی ہے خدا سے ڈرتے ہوئے۔ یہ اللہ کی آیات
لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ	کے عوض میں حقیر قیمت قبول نہیں کرتے یہی لوگ ہیں جن کے
اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۔	لیے ان کے رب کے پاس ان کا صلہ ہے۔ بے شک
(۱۹۹- آل عمران)	اللہ جلد حساب چکا دینے والا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْئًا ۭ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ مَثَلُ مَا يُنْفِقُوْنَ فِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيْحٍ فِيْهَا صِرٌّ اَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَاَهْلَكَتْهُ ۭ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (۱۱۶-۱۱۷)

کفر و شرک سے تمام نیکیاں برباد ہو جاتی ہیں

یہ ان اہل کتاب کا ذکر ہے جو اوپر والے گروہ کے برعکس اپنے کفر پر اڑے رہ گئے۔ ان کے بابت فرمایا کہ جس مال و اولاد کی محبت نے انہیں خدا سے بے پروا کیا وہ ان کو خدا کی پکڑ اور دوزخ سے نہ بچا سکیں گے۔ یہ لوگ دوزخ میں پڑیں گے اور اس سے کبھی نہ نکل سکیں گے۔ اس دنیا کی زندگی میں اپنی رسمی دینداری کی نمائش کے لیے جو کچھ یہ خرچ کرتے ہیں، یہ خرچ کرنا بھی آخرت میں ان کے لیے کچھ سود مند نہیں۔ ان کے اس خرچ کی تمثیل اس کھیتی کی ہے جس پر پالے والی ہوا چل جائے اور وہ اس کو برباد کر کے رکھ دے کفر و شرک کے ساتھ جو کام نیکی اور دینداری کی نوعیت کے کیے جاتے ہیں وہ سب اکارت جاتے ہیں۔ کفر و شرک ٹھنڈی آگ ہے جو ساری محنت کو راکھ کا ڈھیر بنا کے رکھ دیتی ہے۔ اوپر والی آیت میں بیان ہوا تھا کہ جو اہل کتاب اپنے ایمان پر قائم رہے اور قرآن کے نزول کے بعد قرآن پر بھی ایمان لائے ان کی پچھلی

نیکیاں بھی سب شرف قبولیت پائیں گی۔ اس آیت میں واضح فرمایا ہے کہ جو لوگ نہ اپنے عہد پر قائم رہے نہ اسلام میں داخل ہوئے ان کا سارا کیا دھرا برباد ہو جائے گا۔

وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ الآیہ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ خدا کی طرف سے ان پر کوئی ظلم نہیں ہے بلکہ یہ ظلم انھوں نے خود اپنے اوپر کیا ہے۔ درخت اپنی جڑ کے سلامت رہنے سے سلامت رہتا ہے۔ اگر درخت کی جڑ اکھاڑ دی جائے تو اس کی شاخوں اور اس کے پتوں پر پانی دینے میں خواہ کوئی کتنی ہی محنت اٹھائے اور کتنی ہی زحمت جھیلے سب بے سود ہے۔ اس کی محنت کی بربادی پر اگر قابل ملامت ہے تو وہ خود ہے نہ کہ قدرت اور قدرت کا قانون۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ؕ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۚۖ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ؕ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ هٰٓاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ وَلَا يُحِبُّوْنَكُمْ وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ ۚ وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚۖ وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ؕ قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۟ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا ؕ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ (۱۱۸ - ۱۲۰)

لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً 'بطانۃ' لحاف وغیرہ کے استر کو کہتے ہیں۔ بطانۃ الرجل سے آدمی کے اہل و عیال اور اس کے خواص و محرمان راز مراد ہوتے ہیں[1]۔ 'خبال' کے معنی فساد اور بگاڑ کے ہیں لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا یعنی تمہارے اندر فساد پیدا کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں گے۔ 'عنت' کے معنی مشقت، زحمت اور تکلیف کے ہیں۔ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ یعنی تمہارے لیے وہ اس بات کے متمنی ہیں کہ تمہیں اس راہ میں ٹھوکریں پیش آئیں اور تم زحمتوں میں پھنسو۔ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ سے مراد اسلام دشمنی کی وہ باتیں ہیں جن سے صاف پتہ چلتا تھا کہ اہل کتاب سب کچھ گوارا کرنے کے لیے تیار ہیں لیکن اسلام اور مسلمانوں کو کسی قیمت پر بھی گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں چنانچہ قرآن نے ان کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ یہ کھلم کھلا مشرکین تک کو بھی مسلمانوں پر ترجیح دیتے ہیں، کہتے ہیں کہ مسلمانوں سے تو کہیں زیادہ ہدایت پر یہ ہیں۔ (هٰٓؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا)

هٰٓاَنْتُمْ اُولَآءِ میں ضمیر خطاب ھا اور لاء کے بیچ میں آگئی ہے۔ ھا در حقیقت تنبیہ کا کلمہ ہے اس وجہ سے جب اس پر زور دینا ہوتا ہے تو اہل عرب یہ طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ اسی طرح ھا انا ذا بھی کہتے ہیں۔

---

[1] بطانۃ الرجل ولیجتہ الذی یکاشفہ باسرارہ ثقۃ بمودتہ۔ اقرب الموارد

اللہ کی پوری کتاب صرف قرآن ہے

'تُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ' پر تفصیل کے ساتھ ہم سورۂ بقرہ میں بحث کر چکے ہیں۔ اصل میں پچھلے صحیفوں اور قرآن میں نسبت جزء اور کل کی ہے۔ اہل کتاب کو کتاب الٰہی کا صرف ایک حصہ دیا گیا تھا، پوری کتاب کا دیا جانا آخری بعثت پر اٹھا رکھا گیا تھا۔ چنانچہ اہل کتاب کے متعلق بار بار یہ الفاظ آئے ہیں اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ۔ ۲۳ آل عمران (بھلا ان کو تو دیکھو جنھیں کتاب الٰہی کا ایک حصہ دیا گیا) اللہ تعالیٰ کی پوری کتاب قرآن ہے، جس طرح اس کا پورا دین اسلام ہے۔ اس وجہ سے جب مسلمان قرآن پر ایمان لاتا ہے تو خدا کی پوری کتاب پر ایمان لاتا ہے، اس پر بھی جو پہلے اتری اور اس پر بھی جو بعد میں اتری۔ قرآن سب کا جامع ہے۔

'وَاِذَا خَلَوْا' یعنی جب وہ اپنی مجلسوں میں ہوتے ہیں جیسا کہ سورۂ بقرہ میں بالکل اسی قسم کے سیاق میں فرمایا ہے وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ (اور جب یہ اپنے لیڈروں کے پاس ہوتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تو آپ کے ساتھ ہیں)

مسلمانوں کو اہل کتاب سے ہوشیار رہنے کی ہدایت

ان آیات میں مسلمانوں کو اسی طرح کی تنبیہ ہے جس طرح کی تنبیہ آیت ۲۸ میں گزر چکی ہے۔ خطاب اگرچہ عام ہے لیکن پیش نظر، جیسا کہ ہم نے آیت ۲۸ کے تحت اشارہ کیا ہے، وہ مسلمان ہیں جو یا تو اپنی سادگی کی وجہ سے اہل کتاب کی چالوں کو اچھی طرح سمجھتے نہیں تھے یا اپنی کمزوری کے سبب سے ان سے اپنے پچھلے روابط توڑنا نہیں چاہتے تھے درآنحالیکہ اس مرحلے میں اہل کتاب کے تعلقات کسی مسلمان کے ساتھ مخلصانہ نہیں رہ گئے تھے بلکہ جس حد تک بھی تھے محض سازشانہ اغراض و مقاصد کے لیے تھے۔ اس وجہ سے قرآن نے نہایت واضح الفاظ اور بالکل قطعی لب و لہجہ میں متنبہ کیا کہ اے ایمان والو! اپنے سے باہر والوں کو اپنا محرم راز نہ بناؤ۔ یہ تمھیں نقصان پہنچانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں گے۔ یہ اس بات کے خواہشمند نہیں ہیں کہ تمھیں تمھارے مقاصد میں کامیابی حاصل ہو، بلکہ یہ تمھارے لیے زحمتوں اور پریشانیوں کے آرزومند ہیں۔ ان کی دشمنی ان کی باتوں سے ہی ظاہر ہو چکی ہے لیکن دلوں میں جو کچھ ہے وہ اس سے بھی کہیں زیادہ سخت و شدید ہے۔ فرمایا کہ ہم نے یہ بات اچھی طرح کھول کر سمجھا دی ہے۔ اب بھی اگر تم نہ سمجھے تو اس کا خمیازہ بھگتو گے۔

اس کے بعد غیرت دلائی ہے کہ تم تو ان سے محبت کی پینگیں بڑھاتے ہو لیکن وہ تم سے ذرا محبت نہیں کرتے حالانکہ تم پوری کتاب پر ایمان رکھتے ہو اور تمام نبیوں پر ایمان لائے ہو اور وہ تمھاری کتاب پر ایمان لانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ جب تم سے ملتے ہیں تو تمھیں دھوکا دینے کے لیے کہہ دیتے ہیں کہ ہم تو ایمان لائے ہوئے ہیں[1]، اور جب اپنوں کے اندر ہوتے ہیں تو تم پر غصے سے دانت پیستے اور اپنی انگلیاں چباتے ہیں۔

اسی بیچ میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ان دانت پیسنے والوں کو مخاطب کر کے کہلا دیا کہ تم اسی غیظ و غضب کی بھٹی میں چاہو تو جل کر مر جاؤ لیکن تم اسلام کا بال بیکا نہیں کر سکتے۔

---

[1] اس کی وضاحت ہم سورۂ بقرہ میں کر چکے ہیں، وہاں دیکھیے۔

صبر و تقویٰ کلید کامیابی ہے

اس جملہ معترضہ کے بعد اوپر والا سلسلۂ کلام پھر لے لیا اور فرمایا کہ ان کا حال یہ ہے کہ اگر تم کو کوئی کامیابی حاصل ہوتی ہے تو انھیں بڑا رنج ہوتا ہے اور اگر تمھیں کوئی نقصان پہنچ جائے تو یہ اس سے بہت خوش ہوتے ہیں۔ لیکن اگر تم نے ثابت قدمی دکھائی اور ان باتوں سے بچتے رہے جن سے بچتے رہنے کی تمھیں نہایت واضح ہدایات دے دی گئی ہیں تو ان کی چالیں تمھیں کچھ بھی نقصان نہ پہنچا سکیں گی۔ اللہ تعالیٰ ان کی ساری سرگرمیوں اور ساری چالوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس آخری ٹکڑے کی مزید وضاحت کے لیے اسی سورہ کی آیات ۱۲۵ اور ۱۸۶ پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔ وَاِنۡ تَصۡبِرُوۡا وَتَتَّقُوۡا کے تحت ابن جریرؒ کا ایک نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہاں جس تقویٰ کا حکم دیا گیا ہے اس میں سب سے مقدم لَا تَتَّخِذُوۡا بِطَانَةً مِّنۡ دُوۡنِكُمۡ کی ہدایات پر عمل ہے یعنی کفار کو اپنا محرم راز بنانے سے احتراز۔

۲۹۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۲۱-۱۲۹

اب آگے ان واقعات و حالات پر تبصرہ ہے جو غزوۂ احد کے موقع پر پیش آئے اور یہ سلسلۂ بیان سورہ کے آخر تک چلا جائے گا۔ ہم اس سورہ کے تمہیدی مباحث میں واضح کر چکے ہیں کہ غزوۂ احد میں مسلمانوں کی اپنی ہی ایک جماعت کی بے تدبیری سے جو شکست پیش آئی اس نے اسلام اور کفر کی اس کشمکش سے تعلق رکھنے والے ہر گروہ پر کسی نہ کسی پہلو سے اثر ڈالا۔ مسلمانوں میں جو لوگ کمزور تھے وہ اس حادثہ سے بددل ہو گئے اور ان کی اس بددلی سے منافقین نے فائدہ اٹھا کر ان کے دلوں میں اسلام، اسلام کے مستقبل اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف مختلف قسم کے وسوسے بھرنے شروع کر دیے۔ یہود کو بھی اس حادثے سے بڑی شہ ملی، وہ از سرِ نو اسلام کے خلاف پروپیگنڈا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف سازشوں اور ریشہ دوانیوں میں سرگرم ہو گئے۔ قریش کو بدر کی شکست سے جو ضرب پہنچی تھی اس کا زخم بھی گویا اس واقعہ سے مندمل ہو گیا اور وہ پھر یہ حوصلہ کرنے لگے کہ اسلام کو زک پہنچائی جا سکتی ہے۔

یہ صورتِ حال مقتضی ہوئی کہ اُحد کے واقعات پر تبصرہ کر کے ان تمام غلط فہمیوں کو دور کیا جائے جو اس موقع پر مخالفین، ذہنوں میں پیدا کر رہے تھے۔ ساتھ ہی بہترین موقع تھا اس بات کے لیے کہ مسلمانوں کی کمزوریوں اور غلطیوں پر گرفت کی جائے اور آئندہ ان کو ان سے احتراز کرنے کی ہدایت کی جائے تاکہ یہ امت کمزوریوں سے پاک ہو کر اس منصب کی ان ذمہ داریوں کی صحیح طور پر اہل ہو سکے جس پر كُنۡتُمۡ خَيۡرَ اُمَّةٍ والی آیت میں اس کو سرفراز کیا گیا ہے۔ چنانچہ جب اس سورہ میں بات یہاں تک پہنچی کہ تمھی غالب اور فتح مند ہو گے اور تمھارے مخالفوں کی کوئی چال بھی تمھیں نقصان نہیں پہنچا سکے گی بشرطیکہ تم صبر اور تقویٰ پر قائم رہو تو بہترین موقع گویا احد کے واقعات پر تبصرہ کر کے یہ دکھانے کا آ گیا کہ صبر اور تقویٰ کے پہلو سے وہ کیا خامیاں ابھی جماعتی زندگی میں موجود تھیں جو اس افتاد کا باعث ہوئیں اور اس سے انفرادی اور اجتماعی اصلاح و تزکیہ کے کیا کیا سبق ملتے ہیں۔

اب اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۲۱-۱۲۹

وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۲۱﴾ اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ بَلٰٓى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ﴿۱۲۵﴾ الربع وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ؕ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ﴿۱۲۶﴾ لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوْا خَآئِبِيْنَ ﴿۱۲۷﴾ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۲۸﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ ؕ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۹﴾ ع ۳ ۴

ترجمۂ آیات ۱۲۱-۱۲۹

اور یاد کرو جب کہ تم اپنے گھر سے نکلے مسلمانوں کو جنگ کے مورچوں میں مامور کرنے کے لیے اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ ۱۲۱

جب کہ تم میں سے دو جماعتوں نے حوصلہ چھوڑ دینے کا ارادہ کیا حالانکہ اللہ ان کا

مددگار تھا۔ اور اللہ ہی پر چاہیئے کہ اہلِ ایمان بھروسہ کریں۔ اور اللہ نے تو تمھاری مدد بدر میں بھی کی جب کہ تم نہایت کمزور تھے۔ پس اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ اس کے شکر گزار رہ سکو۔ ۱۲۲-۱۲۳

یاد کرو کہ جب تم مسلمانوں سے کہہ رہے تھے کہ کیا تمھارے لیے کافی نہیں ہے کہ تمھارا رب تین ہزار تازہ دم فرشتوں سے تمھاری مدد فرمائے؟ ہاں اگر تم ثابت قدم رہو گے اور بچتے رہو گے اور وہ تمھارے اوپر بھی آدھمکے، تو تمھارا رب پانچ ہزار فرشتوں سے تمھاری مدد فرمائے گا، جو اپنے خاص نشان لگائے ہوئے ہوں گے۔ ۱۲۴-۱۲۵

اور اللہ نے اس کو نہیں بنایا مگر تمھارے لیے بشارت اور تاکہ تمھارے دل اس سے مطمئن ہو جائیں، اور مدد نہیں آتی مگر خدائے غالب و حکیم ہی کے پاس سے، تاکہ اللہ کافروں کے ایک حصے کو کاٹ دے یا انھیں ذلیل کر دے کہ وہ خوار ہو کر لوٹیں۔ ۱۲۶-۱۲۷

تمھیں اس معاملے میں کوئی اختیار نہیں، خدا ان کی توبہ قبول کرے یا انھیں عذاب دے۔ کیونکہ وہ ظالم ہیں اور اللہ ہی کے اختیار میں ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ وہ جس کو چاہے گا بخشے گا اور جس کو چاہے گا عذاب دے گا اور اللہ غفور رحیم ہے۔ ۱۲۸-۱۲۹

۳۰- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاِذۡ غَدَوۡتَ مِنۡ اَهۡلِكَ تُبَوِّئُ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ مَقَاعِدَ لِلۡقِتَالِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ (۱۲۱)

'بَوَّا'، 'یُبَوِّیُٔ' کے معنی ٹھہرانا، ٹکانا، مقیم کرنا، مامور کرنا۔ مقاعد، مقعد کی جمع ہے جس کے معنی بیٹھنے کی جگہ کے ہیں لیکن وسیع استعمال میں اس کے معنی گھات لگانے کی جگہ کے بھی ہو سکتے ہیں اور قرینہ موجود ہو جیسا کہ یہاں ہے تو اس سے جنگ کا مورچہ بھی مراد ہو سکتا ہے۔

یہ آیت تمہید ہے اس تبصرے کی جو جنگ اُحد کے واقعات اور ان سے پیدا شدہ اثرات پر آگے آرہا

غزوۂ احد کے واقعات پر تبصرہ

ہے۔ یہ جنگ چونکہ ابھی تازہ تازہ ہوئی تھی، اس وجہ سے ہر شخص کے سامنے تھی۔ نام لیے بغیر بھی اس کے واقعات کی طرف اشارہ کر دینا کافی تھا۔ لیکن یہ تبصرہ چونکہ بعض ایسے حالات و اثرات پر بھی تھا جن کے بعض گوشے بعض پارٹیوں کی در پردہ سازشوں سے تعلق رکھنے والے تھے یا ان کا تعلق ذہنی و قلبی تصورات و تاثرات سے تھا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات — سمیع و علیم — کا حوالہ دے کر تمہید ہی میں سب کو تنبیہ کر دیا کہ اس تبصرے پر کسی کے لیے چون و چرا، رد و قدح اور بحث و تردید کی کوئی گنجائش نہیں ہے اس لیے کہ یہ تبصرہ اس کی طرف سے ہے جو سب کچھ جانتا سنتا ہے۔ اس نے جو کچھ بھی کہا ہے سب کچھ بے خطا سمع و علم پر مبنی ہے۔

إِذْ هَمَّتْ طَّائِفَتَانِ مِنكُمْ أَن تَفْشَلَا وَاللَّهُ وَلِيُّهُمَا ۗ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ۝ وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ بِبَدْرٍ وَأَنتُمْ أَذِلَّةٌ ۖ فَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (۱۲۲-۱۲۳)

'فشل' کا مفہوم

'فشل' کے معنی ہمت ہار دینے اور حوصلہ چھوڑ دینے کے ہیں۔ جنگ میں اصل اہمیت حوصلہ و ہمت کو حاصل ہے، اسلحہ اور دوسری چیزیں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس وجہ سے سب سے پہلے بعض جماعتوں کی اس کمزوری پر گرفت فرمائی۔

'اذلۃ' کا مفہوم

'اذلۃ' ذلیل کی جمع ہے۔ ذلیل عزیز کا متقابل لفظ ہے۔ عزیز کے معنی ہیں غالب، زور آور اور دوسروں کی دسترس سے باہر۔ ذلیل کے معنی کمزور، ناتوان اور دوسروں کے لیے لقمۂ تر کے ہیں۔ اخلاقی رذالت اس لفظ کے بنیادی اجزا میں سے نہیں ہے بلکہ اس کے لوازم بعیدہ میں سے ہے۔ چنانچہ یہ لفظ اچھے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے مثلاً۔ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ (۵۴-مائدہ) (وہ مسلمانوں کے لیے نہایت نرم اور کافروں کے لیے نہایت سخت ہیں) یعنی اگر کفار ان کے اندر انگلی دھنسانا اور ان کو اپنے اغراض کے لیے نرم کرنا چاہیں تو وہ پتھر کی چٹان ہیں لیکن مسلمانوں کے لیے نہایت نرم خو ہیں۔ وہ ان سے جس طرح چاہیں فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ آیت زیر بحث میں بھی یہ لفظ مسلمانوں کی صرف اس وقت کی عددی و مادی کمزوری کو ظاہر کرتا ہے۔ اس میں اخلاقی ضعف و ذلت کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔

منافقین کی ایک شرارت

آیت میں جن دو گروہوں کی طرف اشارہ ہے، مفسرین کے بیان کے مطابق، وہ قبیلہ خزرج کے بنو سلمہ اور قبیلہ اوس کے بنو حارثہ ہیں۔ ان دونوں گروہوں کے اندر منافقین کی شرارت کی وجہ سے کچھ بزدلی پیدا ہوئی لیکن پھر وہ سنبھل گئے۔ منافقین درحقیقت اس جنگ کے لیے نکلنا نہیں چاہتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی اس کمزوری کا اندازہ تھا۔ چنانچہ آپ نے یہ چاہا کہ نکلنے سے پہلے صحیح صورتِ حال سامنے آجائے۔ اس کے لیے امتحاناً آپ نے مسلمانوں کے سامنے یہ سوال رکھا کہ قریش کا مقابلہ مدینہ کے اندر سے کیا جائے یا باہر نکل کر؟ اس کا جواب سچے اور پکے مسلمانوں کی طرف سے تو ظاہر ہے کہ یہی ہو سکتا ہے کہ باہر نکل کر، چنانچہ انھوں نے پورے جوش و جذبے کے ساتھ یہی جواب دیا۔ لیکن منافقین نے مدینہ میں محصور ہو کر

مقابلے کی مصلحتیں سمجھانے کی کوشش کی۔ آنحضرتؐ نے جب صورتِ حال کا اندازہ کر لیا، منافقین کی کمزوری آپ پر واضح ہو گئی تو آپ نے وہی کیا جو آپ کے دل میں تھا اور جس کا اظہار آپ کے جان نثار ساتھیوں نے کیا تھا۔ منافقین نے جب دیکھا کہ ان کی یہ سازش ناکام ہو گئی تو وہ نکلنے کو تو مسلمانوں کے ساتھ نکلے، لیکن نکلنے کے بعد ان کے لیڈر ابن اُبَیّ نے ان کو ورغلایا اور اس چیز کو بہانہ بنا کر کہ اس کے مشورے کی قدر نہیں کی گئی، راستے ہی میں تین سو آدمیوں کے لشکر کے ساتھ الگ ہو گیا۔ اس واقعہ سے قدرتی طور پر مسلمانوں کی بعض جماعتوں کے حوصلے پر اثر پڑا۔ اس لیے کہ مسلمانوں کی تعداد تین ہزار کفار کے مقابلے میں کل ایک ہزار تھی۔ ایک ہزار آدمیوں میں سے تین سو آدمیوں کا عین موقع پر فرار، ظاہر ہے کہ ایک اہم حادثہ تھا جس سے کمزور طبائع کا اثر لینا قدرتی امر تھا۔

خدا اہل ایمان کا کارساز ہے

قرآن نے اس کمزوری پر گرفت کی اور فرمایا کہ جو مسلمان اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے نکلتے ہیں اللہ ان کا مددگار اور کارساز ہوتا ہے اور ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان خدا کی مدد اور اس کی کارسازی پر پورا پورا بھروسہ کریں۔ جب خدا ساتھ ہے تو منافقوں اور بزدلوں کی کوئی جماعت ساتھ چھوڑ بھی دے تو اس سے کیا بنتا بگڑتا ہے۔

واقعہ بدر کی یاددہانی

ایمان اور توکل کا تقاضا واضح کرنے کے بعد بدر کے واقعہ کی بھی یاددہانی فرما دی کہ جب تمھاری عددی قلت اور مادی بے سروسامانی کے باوجود بھی کل خدا نے تمھاری مدد فرمائی اور تمھیں شاندار فتح دی تو اس خدا سے کیوں مایوس ہوتے ہو۔ وہ آج بھی تمھارا حامی و ناصر اور ولی و کارساز ہے۔

تقویٰ کا لفظ وسیع معنوں میں

'فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ' میں تقویٰ کا لفظ جیسا کہ ہم آیت ۱۲۰ کے تحت اشارہ کر چکے ہیں، اپنے وسیع معنی میں ہے۔ یعنی ایمان اور توکل اور خدا کو ولی اور کارساز ماننے کے تقاضے کے خلاف بزدلی اور بے ہمتی کی راہ اختیار کرنے سے بچو۔ خدا کی شکرگزاری کا صحیح حق ادا کرنے کے لیے یہ تقویٰ ضروری ہے۔ جو لوگ عزم و ہمت سے خالی ہوں گے وہ شیطان سے ہر قدم پر مار کھائیں گے اور حق کے بجائے باطل کی راہ اختیار کر لیں گے۔ ایسے لوگ خدا کی شکرگزاری کا حق ادا نہ کر سکیں گے۔

اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ۝ بَلٰٓى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ (۱۲۴-۱۲۵)

مُسَوِّمِیْنَ کا مفہوم

'مُسَوِّمِيْنَ'، 'سومۃ' 'سیمۃ' سے ہے جس کے معنی علامت اور نشان کے ہیں الخیل المسومۃ، ان گھوڑوں کو کہتے ہیں جن پر نشان لگے ہوئے ہوں۔ فرشتوں کے لیے مسومین کی صفت سے اس امر کا اظہار مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو خاص اہتمام کے ساتھ اس مہم کے لیے بھیجے گا اور وہ خاص اس جنگ کے لیے اپنے امتیازی نشان اور بیج لگائے ہوئے ہوں گے۔

یہ اس بات کا حوالہ ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کا حوصلہ بحال کرنے کے لیے اس وقت فرمائی

جب عبداللہ بن ابی اپنے تین سو ساتھیوں کو لے کر واپس ہوگیا اور مسلمانوں کی بعض جماعتوں میں، جیسا کہ اوپر والی آیت میں ذکر ہے، اس سے بد دلی پھیلی۔ آپ نے فرمایا کہ اگر تین سو آدمی الگ ہوگئے تو کیا ہوا! کیا تمھارے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ تین سو کمزور اور پست ہمت آدمیوں کی جگہ تین ہزار تازہ دم اتارے ہوئے فرشتوں کے ذریعے سے تمھاری مدد فرمائے۔ 'اتارے ہوئے' سے مقصود اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اسی کارِ خاص کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تازہ دم کمک کے طور پر آسمان سے اتارے جائیں گے۔

بَلٰٓی اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کی تائید ہے۔ آپ نے جو امید مسلمانوں کو دلائی تھی وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت و نصرت کے بھروسے پر دلائی تھی کہ یہ تین سو آدمیوں کی کمی تین ہزار فرشتوں سے پوری ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی اس بات کی تائید فرمادی اور اپنے فضل سے اس پر دو ہزار فرشتوں کا اور اضافہ فرما دیا لیکن اس شرط کے ساتھ کہ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا، اگر تم ثابت قدم رہے اور خدا اور رسول کے احکام کی نافرمانی سے بچتے رہے۔ جنگِ اُحد کے واقعات شاہد ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس وعدے کو پورا فرمایا۔ چنانچہ مسلمانوں نے اپنے ابتدائی حملے میں کفار کو اچھی طرح تہ تیغ کیا اور ان کو شکست دے دی لیکن شکست دے چکنے کے بعد ان کی ایک جماعت نے کمزوری دکھائی اور رسولؐ کی صریح ہدایت کے خلاف مالِ غنیمت کی طمع میں ایک نہایت اہم مورچہ خالی چھوڑ دیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حاصل کی ہوئی فتح صبر و تقویٰ کی کمزوری کے سبب سے شکست میں تبدیل ہوگئی۔ آگے اسی سورہ میں اس بات کا ذکر اس طرح ہوا ہے۔

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْھُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ (۱۵۲)	اور اللہ نے تم سے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا تھا جب کہ تم خدا کے حکم سے ان کافروں کو تہ تیغ کر رہے تھے یہاں تک کہ تم نے کمزوری دکھائی اور تعمیلِ حکم میں اختلاف کیا۔ اور اس وقت نافرمانی کی جب کہ خدا نے تمھیں تمھاری محبوب چیز — فتح — دکھا دی۔ تم میں کچھ دنیا کے طالب ہوئے اور کچھ آخرت کے، تو خدا نے تمھارا رخ ان سے پھیر دیا تاکہ تمھیں آزمائش میں ڈالے۔

وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَىِٕنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ۭ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۙ لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْ يَكْبِتَھُمْ فَيَنْقَلِبُوْا خَاۗىِٕبِيْنَ (۱۲۶-۱۲۷)

'جعلہ' میں ضمیر کا مرجع وہ وعدۂ نصرت ہے جو اوپر والی آیت میں مذکور ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے ذریعے سے جو تمھاری مدد کا خاص طور پر وعدہ فرمایا تو یہ اس لیے کہ یہ

تمھارے لیے بشارت کا باعث ہو اور تمھیں مخالفین و منافقین کے رویے سے جو بددلی ہوئی ہے وہ دور ہو جائے۔ اگر یہ بشارت نہ بھی اترتی جب بھی اہل ایمان کو یہ عقیدہ رکھنا چاہیے کہ فتح و نصرت ہمیشہ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے اور وہ عزیز و غالب ہے جس کو چاہے فتح و غلبہ عطا فرمائے اور حکیم بھی ہے اس وجہ سے اس کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ اس آیت پر مزید بحث ہم سورۂ انفال میں کریں گے۔

لِیَقْطَعَ طَرَفًا الآیہ۔ یہ مقصد بیان ہوا ہے اس موقع پر خاص اہتمام کے ساتھ حوصلہ افزائی کا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا کہ اس جنگ میں یا تو قریش کی قوت بالکل پامال ہو جائے اور وہ ذلیل و خوار ہو کر واپس ہوں یا کم از کم ان کی طاقت کا ایک حصہ ٹوٹ جائے۔

لَیْسَ لَکَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ اَوْ یَتُوْبَ عَلَیْھِمْ اَوْ یُعَذِّبَھُمْ فَاِنَّھُمْ ظٰلِمُوْنَ ۝ وَلِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ط یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ ط وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (۱۲۸ - ۱۲۹)

آنحضرتؐ کو تسلی

یہ آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف التفات کی نوعیت کی ہے۔ اس جنگ کے سلسلے میں منافقین نے جو روش اختیار کی اور اپنی روش سے جو اثر دوسرے مسلمانوں پر انھوں نے ڈالا اس کی طرف اشارہ اوپر گزرا۔ قدرتی طور پر اس بات سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صدمہ پہنچا ہوگا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو تسلی دی کہ اس معاملے میں نہ تم کو کوئی دخل ہے اور نہ اس کی تم پر کوئی ذمہ داری ہے۔ تم نے اپنا فرض کما حقہٗ انجام دے دیا۔ اب اگر کوئی گروہ خود اپنی جان پر ظلم ڈھاتا ہے تو اس کا غم تم کیوں کرو۔ اس کا معاملہ اللہ کے حوالہ کرو۔ وہ چاہے گا تو ان کو توبہ کی توفیق دے گا، یہ توبہ کریں گے اور وہ ان کو معاف کرے گا۔ اور اگر وہ اس کے اہل نہ ہوں گے تو ان کو سزا دے گا۔ آسمان و زمین کا سارا اختیار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جس کو چاہے گا بخش دے گا اور جس کو چاہے گا عذاب دے گا۔ آخر میں اپنی صفاتِ غفور رحیم کا حوالہ دے کر یہ ظاہر فرما دیا کہ خدا غفور رحیم ہے۔ اس وجہ سے اگر وہ کسی کو سزا دے گا تو اسی وقت دے گا جب وہ اس کو سزا کا مستحق پائے گا۔

۳۱۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۳۰-۱۴۳

آگے کی آیات میں پہلے اسی جہاد کے تعلق سے جس کا ذکر ہوا انفاق پر ابھارا ہے، پھر اُحد کی شکست سے جو بددلی پیدا ہوئی تھی اس کو دور کرنے کے لیے اس کی بعض حکمتیں اور مصلحتیں واضح فرمائی ہیں تاکہ جن مسلمانوں کے اندر کچھ افسردگی پیدا ہو گئی ہے ان کے اندر از سر نو انفاق و جہاد کی حرارت پیدا ہو جائے۔ خطاب اگرچہ عام ہے لیکن سیاق و سباق دلیل ہے کہ روئے سخن خاص طور پر انھی مسلمانوں کی طرف ہے جن سے اس جنگ کے دوران میں کوئی کمزوری صادر ہوتی تھی، یا جنگ کے نتیجہ نے ان کے ذہن پر کوئی بڑا اثر ڈالا تھا۔ گویا اس جنگ نے بہت سی طبیعتوں کے اس میل کچیل کو اوپر ابھار دیا تھا جو اب تک اندر دبا ہوا تھا اور اب وقت آگیا تھا کہ اس کو دھو کر صاف کیا جائے۔ چنانچہ اب آگے کا سلسلۂ بیان زیادہ تر اسی نوعیت کا ہے۔ یہ گویا

تزکیہ و تطہیر کے باب کا ایک حصہ ہے۔

انفاق کے مضمون کا آغاز سود کی ممانعت کے ذکر سے کیا ہے اس لیے کہ سود خوری اور انفاق میں نسبت ضدین کی ہے۔ قرآن میں یہ اسلوب بہت استعمال ہوا ہے کہ جب ایک چیز بیان ہوتی ہے تو بالعموم اس کے ضد کا بھی اس کے ساتھ ذکر ہوتا ہے، چنانچہ سورۂ بقرہ میں بھی انفاق کے ذکر کے ساتھ سود کی حرمت کا ذکر ہوا ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ بقرہ میں سود کی حرمت کا ذکر انفاق کے بعد ہے، اور اس سورہ میں انفاق سے پہلے۔ ان دونوں اسلوبوں کے الگ الگ فوائد ہیں، لیکن اس مسئلے پر بحث کے لیے یہ مقام موزوں نہیں۔ یہاں نظم کلام کی وضاحت کے لیے بس اتنی بات یاد رکھیے کہ انفاق کے حکم سے پہلے سود سے روکنے کی بات بالکل ایسی ہی ہے جس طرح سچ بولنے کی ہدایت سے پہلے جھوٹ سے باز رہنے کی تاکید کی جائے۔ سود اور انفاق کے تعلق پر سورہ بقرہ کی تفسیر میں ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس موقع پر ایک نظر اس پر بھی ڈال لیجیے۔ اب اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۳۰-۱۳۶

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۖ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۳۰﴾ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۳۱﴾ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۳۳﴾ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ۗ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳۴﴾ وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۠ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۠ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۵﴾ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَجَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ﴿۱۳۶﴾

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ ۙ فَسِيْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۳۷﴾ هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۳۸﴾ وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۹﴾ اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ؕ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۙ﴿۱۴۰﴾ وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۴۱﴾ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۲﴾ وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ ۠ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۱۴۳﴾

ع ۱۴ ۱۴ ۵

ترجمۂ آیات ۱۳۰-۱۴۳

اے ایمان والو! سود نہ کھاؤ دگنا چوگنا بڑھتا ہوا۔ اللہ سے ڈرو تاکہ تم فلاح پاؤ اور اس آگ سے ڈرو جو کافروں کے لیے تیار ہے۔ اور اللہ اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ ۱۳۰-۱۳۲

اور اپنے رب کی مغفرت اور اس جنت کے لیے مسابقت کرو جس کا عرض آسمانوں اور زمین کے عرض کی طرح ہے، یہ پرہیزگاروں کے لیے تیار ہے۔ ان لوگوں کے لیے جو کشادگی اور تنگی ہر حال میں خرچ کرتے رہتے ہیں، غصّہ کو ضبط کرنے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں اور اللہ خوب کاروں کو دوست رکھتا ہے۔ یہ لوگ جب کسی کھلی برائی،

کا ارتکاب یا اپنی جان پر کوئی ظلم کر بیٹھتے ہیں تو اللہ کو یاد کر کے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں اور اللہ کے سوا کون ہے جو گناہوں کو بخشے۔ اور یہ جانتے بوجھتے اپنے کیے پر اصرار نہیں کرتے۔ یہ لوگ ہیں کہ ان کا بدلہ ان کے رب کی طرف سے مغفرت اور ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ ان میں ہمیشہ رہیں گے اور کیا ہی خوب صلہ ہے کارگزاروں کے لیے! تم سے پہلے بہت سی مثالیں گزر چکی ہیں تو زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا ہے۔ یہ تنبیہ ہے لوگوں کے لیے اور ہدایت و نصیحت ہے ڈرنے والوں کے لیے۔ ۱۳۳-۱۳۸

اور پست ہمت نہ ہو اور غم نہ کرو، اگر تم مومن ہو تو تمھی غالب رہو گے۔ اگر تمھیں کوئی چوٹ پہنچے تو اس سے پست ہمت نہ ہو آخر دشمن کو بھی تو اسی طرح کی چوٹ پہنچی ہے۔ یہ ایام اسی طرح ہم لوگوں کے اندر الٹ پھیر کرتے رہتے ہیں، تاکہ اللہ تمھارا امتحان کرے اور ممیز کر دے ایمان والوں کو، اور تم میں سے کچھ لوگوں کو شہید بنائے اور اللہ ظالموں کو دوست نہیں رکھتا۔ اور تاکہ اللہ مومنوں کو چھانٹ کر الگ کر دے اور کافروں کو مٹا دے۔ کیا تم نے گمان کر رکھا ہے کہ تم جنت میں جا داخل ہو گے حالانکہ ابھی اللہ نے تم میں سے ان لوگوں کو ممیز نہیں کیا جنھوں نے جہاد کیا اور تاکہ ممیز کرے ثابت قدم رہنے والوں کو۔ اور تم موت کی تمنا کر رہے تھے اس سے ملنے سے پہلے سو اب تم نے اس کو دیکھ لیا، آنکھیں چار کر کے۔ ۱۳۹-۱۴۳

۳۲- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْکُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَۃً ۪ وَّاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ وَ

اتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ۝ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (۱۳۰-۱۳۲)

اضعافا مضاعفۃ کی قید کا مقصد

لفظ رِبٰوا کی تحقیق اور اس سے متعلق دوسرے بعض اہم سوالات پر سورۂ بقرہ میں بحث گزر چکی ہے۔ یہاں اس کے ساتھ اَضْعَافًا مُّضٰعَفَۃً کی جو قید لگی ہوئی ہے اس سے مقصود یہ نہیں ہے کہ اسلام میں ممنوع صرف سود در سود ہے، بلکہ یہ قید، جیسا کہ ہم سورۂ بقرہ میں لَا یَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا کے تحت متعدد مثالوں سے واضح کر چکے ہیں، محض صورتِ حال کی تصویر اور اس کے گھنونے پن کے اظہار کے لیے ہے، جس طرح لَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَاۗءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا (اپنی لونڈیوں کو زنا پر مجبور نہ کرو اگر وہ قید نکاح میں آنا چاہتی ہیں) میں اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا کی شرط سے مقصود یہ نہیں ہے کہ اگر وہ قیدِ نکاح میں نہ آنا چاہیں تو ان کو پیشہ کرنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے، بلکہ مقصود اس سے صرف حال کی تصویر اور اس کے نفرت انگیز ہونے کا اظہار ہے۔ اسی طرح آیت زیر بحث میں اَضْعَافًا مُّضٰعَفَۃً کی قید ہے۔

سود خوری کے میدان میں مسابقت کے بجائے انفاق میں مسابقت کی دعوت

یہاں اس قید کے نمایاں کرنے میں بلاغت کا ایک نکتہ بھی ہے۔ اوپر ہم ظاہر کر چکے ہیں کہ یہاں اصل مضمون جو بیان ہو رہا ہے وہ جہاد کے سلسلہ سے انفاق کا ہے۔ اس کی تمہید کے طور پر یہ سود خواری کی ممانعت کا ذکر ہوا ہے اس لیے کہ یہ انفاق کا ضد ہے۔ انفاق کا ذکر یہاں جس نوعیت سے ہوا ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس راہ میں مسابقت یعنی ایک دوسرے کے مقابل میں بڑھنے، بازی لے جانے اور میدان مارنے کی دعوت دی گئی ہے۔ گویا اہل ایمان کے لیے مقابلہ و مسابقت کا میدان اگر ہے تو یہ ہے۔ چنانچہ اس مضمون کی تمہید سَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ الآیہ (اور مسابقت کرو اپنے رب کی رحمت اور ایسی جنت ...) ہے۔ یہ مضمون اس بات کا مقتضی ہوا کہ اس میدانِ مسابقت کی دعوت دینے سے پہلے لوگوں کو اس میدان سے موڑا جائے جس میں یہودی ساہوکار اور مہاجن اب تک ایک دوسرے پر سبقت کرنے کے لیے سردھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھے اور ان کی دیکھا دیکھی عربوں کو بھی اس کا چسکا لگ رہا تھا۔ عربی زبان کا جن لوگوں کو کچھ ذوق ہے وہ اندازہ کر سکیں گے کہ سود خوری کے میدان میں اس مسابقت کا اظہار اَضْعَافًا مُّضٰعَفَۃً کے الفاظ سے ہو رہا ہے۔ اگر یہ الفاظ نہ ہوتے تو یہ حقیقت پوری طرح سامنے نہ آتی۔ قرآن نے یہ چاہا ہے کہ لوگ اس ناپاک میدان میں اَضْعَافًا مُّضٰعَفَۃً کی غلاظت کا انبار جمع کرنے کے بجائے اس جنت کے لیے بازیاں لگائیں جس کی پہنائی آسمان و زمین کے برابر ہے۔

وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ کا ٹکڑا اس سیاق میں اس بات کی نہایت واضح دلیل ہے کہ اس تنبیہ کے بعد بھی جو لوگ سود خوری پر مصر رہیں گے وہ کافر ہیں اور ان کے لیے دوزخ کی آگ تیار ہے اس نکتہ پر ہم سورہ بقرہ میں بحث کر چکے ہیں۔ درحقیقت ایسے لوگ اپنی آگ کے لیے اَضْعَافًا مُّضٰعَفَۃً ایندھن خود فراہم کر چھوڑتے ہیں۔ اس وجہ سے یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کی آگ بالکل تیار ہے۔

وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝

الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝

جنت کی وسعت کی ایک تمثیل

یعنی سود کے ذریعہ سے اگر بہت تیر مارو گے تو ایک کا دس یا بیس یا سو یا ہزار بنا لو گے اور اس کا نفع بہر حال اسی زندگی تک محدود رہے گا۔ آخرت میں یہ سارا اندوختہ تمہارے جلانے کے لیے ایندھن بنے گا۔ برعکس اس کے اگر اپنا مال خدا کی راہ میں خرچ کرو گے تو اس کے بدلے میں خدا کی مغفرت کے حق دار اور اس کے نتیجے میں ایسی وسیع جنت کے وارث ٹھہرو گے جس کی وسعت کے آگے تمام آسمانوں اور پوری زمین کی وسعت گرد ہو کے رہ جائے گی۔ پھر ایک بند گلی کی ایک محدود و تنگ نائے کے لیے دوڑ دھوپ کرنے کے بجائے ابدی زندگی کی یہ ناپیدا کنار بادشاہی حاصل کرنے کے لیے مقابلہ کیوں نہ کرو۔ یہی مضمون سورہ حدید میں اس طرح آیا ہے۔

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ	جان رکھو کہ یہ دنیا کی زندگی ـــ لہو و لعب، زینت،
وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ	باہمی تفاخر، مال و اولاد کی کثرت میں ایک دوسرے کا
فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ؕ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ	مقابلہ ـــ اس کی تمثیل اس بارش کی ہے جس کی اگائی
الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا	ہوئی نباتات کسانوں کے دل موہ لیں۔ پھر وہ خشک
ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا ؕ وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ	ہو کر رہ جائیں پھر تو دیکھے ان کو زرد، پھر وہ ریزہ ریزہ
شَدِيْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ؕ	ہو جائے اور آخرت میں سخت عذاب بھی ہے اور اللہ
وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝	کی طرف سے مغفرت اور خوشنودی بھی ہے اور یہ دنیا کی
سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ	زندگی محض دھوکے کی ٹٹی ہے۔ مسابقت کرو اپنے رب کی مغفرت
عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۙ اُعِدَّتْ	اور ایک ایسی جنت کی طرف جس کا عرض آسمان و زمین کی طرح
لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ؕ ذٰلِكَ	ہے یہ ان لوگوں کے لیے تیار کی گئی ہے جو اللہ پر اور اس کے رسولوں
فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ	پر پختہ ایمان رکھتے ہیں۔ یہ اللہ کا فضل ہے، وہ دے گا
ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ (۲۰-۲۱)	جس کو چاہے گا اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

جنت کی وسعت کی یہ تمثیل بھی بہر حال ایک تمثیل ہی ہے جس سے انسان اس کی وسعت کا بس ایک دھندلا سا تصور کر سکتا ہے۔ اصل حقیقت اس کی وسعت کی کیا ہے یہ صرف اللہ ہی کو معلوم ہے لیکن اس وسعت کے باوجود انسان اگر چاہے تو خدا کی راہ میں انفاق کر کے اس کو خرید سکتا ہے۔

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ (الآیہ) میں اس انفاق کی بعض وہ خصوصیات بیان کر دی گئی ہیں جن کے اہتمام کے بغیر نہ تو انفاق کا حق ادا ہوتا ہے اور نہ اس انفاق کو احسان کا درجہ حاصل ہوتا ہے ـــ ان خصوصیات پر ہم سورۂ بقرہ کی تفسیر میں تفصیل کے ساتھ بحث کر چکے ہیں۔ اس سلسلے میں غصہ کو دبا لینے اور لوگوں سے درگزر کرنے کی جو تاکید ہے اس کا خاص پہلو ہے۔ اس کی توجیہ آیات ۲۶۲ - ۲۶۵ بقرہ کے تحت ملاحظہ فرمائیے۔

وَالَّذِيْنَ إِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوْٓا أَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ص وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ إِلَّا اللّٰهُ ۚ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۞ أُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَجَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَنِعْمَ أَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ (۱۳۵-۱۳۶)

انفاق کی راہ کی ایک مزاحمت

یہ راہ انفاق کی ایک نہایت اہم مزاحمت کا بیان ہے جس طرح سود خوری کی علت روپے کی ایسی تونس پیدا کر دیتی ہے کہ آدمی کے لیے کسی اچھے کام میں خرچ کرنا پہاڑ ہو جاتا ہے اسی طرح بدکاری اور عیاشی کی چاٹ بھی کسی نیکی کے کام میں خرچ کرنے کی راہ بند کر دیتی ہے۔ جو لوگ اس راہ پر چل پڑتے ہیں وہ اپنی خواہشوں کے ہاتھوں اس طرح بے بس ہو جاتے ہیں کہ ان کو کسی اور طرف نگاہ کرنے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ اس وجہ سے قرآن نے انفاق کی تعلیم کے سلسلے میں جہاں سود خوری سے روکا ہے وہیں بدکاری، بے حیائی اور اس کے لازمی نتیجہ اسراف و تبذیر سے بھی روکا ہے۔ بقرہ کی آیت ۲۶۸ کے تحت ہم اس پر بحث کر آئے ہیں، مزید بحث اس پر بنی اسرائیل کی آیات ۲۶، ۲۷ کے تحت آئے گی۔

فرمایا کہ اس انفاق کی راہ میں وہی لوگ بڑھ سکیں گے جو بدکاری و عیاشی کی لت سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکیں گے۔ جو لوگ جانتے بوجھتے اپنے گناہوں پر اصرار کیے چلے جائیں گے وہ اپنے اوپر اس سعادت کے دروازے بند کر لیں گے۔ سعادت کی راہ یہ ہے کہ آدمی اگر غلبۂ جذبات سے کسی بڑے یا چھوٹے گناہ کا ارتکاب کر بیٹھے تو خدا کی یاد اس کو چوکنا کر دے اور وہ فوراً اس سے معافی مانگے۔ خدا کے سوا کوئی نہیں ہے جو معافی دے سکے۔ جو لوگ دوسروں کی سفارش کی امید پر گناہوں کو اوڑھنا بچھونا بنائے ہوئے ہیں، وہ صرف اپنی شامتِ اعمال سے دوچار ہوں گے۔

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ ۙ فَسِيْرُوْا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ۞ هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ (۱۳۷-۱۳۸)

'سنن' کا مفہوم

'سنن' سے مراد اللہ تعالیٰ کے وہ ضابطے اور قاعدے ہیں جن کے تحت وہ قوموں کے ساتھ معاملہ کرتا ہے۔ ایک قوم اگر اللہ تعالیٰ کے احکام و ہدایات کی تعمیل اور اس کے بھیجے ہوئے رسولوں کی پیروی کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو برومند اور کامیاب کرتا ہے۔ برعکس اس کے اگر کوئی قوم خدا کے احکام و قوانین کی نافرمانی اور اس کے رسولوں کی تکذیب کرتی ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کو تباہ کر دیتا ہے۔ اس سنت کے مظاہر خدا کی زمین میں بے شمار ہیں۔ سرزمین عرب میں بھی، جس کے بسنے والے اس آیت میں مخاطب ہیں، اللہ تعالیٰ کی اس سنت کے مظاہر عاد، ثمود، اہلِ مدین، قوم لوط وغیرہ کے آثار کی شکل میں موجود تھے۔ عدلِ الٰہی کے انھی مظاہر کو یہاں 'سنن' کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ قرآن میں یہ لفظ اس مفہوم میں بار بار استعمال ہوا ہے۔ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ (۳۸- احزاب) (یہ اللہ کی سنت رہی ہے گزشتہ قوموں میں) فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ إِلَّا سُنَّتَ الْأَوَّلِيْنَ (۴۳- فاطر) (یہ لوگ نہیں منتظر ہیں مگر اس بات کے کہ ان کے لیے بھی اللہ کی وہی

سنت ظاہر ہو جائے جو اگلوں کے لیے ظاہر ہوئی)

سود خوری کی ممانعت اور اللہ کی راہ میں انفاق کی دعوت کے بعد یہ دو آیتیں تنبیہ و تہدید کی نوعیت کی ہیں۔ ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں کہ خطاب اگرچہ عام ہے لیکن پیش نظر خاص طور پر وہ لوگ ہیں جو یا تو ابھی پوری طرح یکسو نہیں ہوئے تھے یا صریح نفاق میں مبتلا تھے۔ فرمایا کہ جو لوگ اللہ کے رسولوں کی تکذیب کرتے ہیں ان کے انجام کا اندازہ کرنے کے لیے بہت دور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمھارے اپنے ہی ملک میں کافی سامانِ عبرت موجود ہے۔ یہ واضح تنبیہ ہم نے نازل کر دی ہے اس میں ان لوگوں کے لیے ہدایت و نصیحت کا پورا سامان موجود ہے جن کے اندر خدا کا خوف ہے۔

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ۭ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُھَا بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَاۗءَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ (۱۳۹-۱۴۱)

'وہن' کا مفہوم

'وہن' کے معنی ضعف کے ہیں۔ عام اس سے کہ یہ ضعف عمل کا ہو یا ارادے کا، جسم کا ہو یا کردار و اخلاق کا۔ ایک حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ صحابہؓ سے فرمایا کہ ایک زمانہ آئے گا کہ تم سیلاب کے خس و خاشاک کے مانند ہو جاؤ گے۔ صحابہؓ نے پوچھا۔ یا رسول اللہ! اس کا کیا سبب ہوگا؟ آپ نے فرمایا تمھارے اندر 'وہن' پیدا ہو جائے گا۔ لوگوں نے پوچھا۔ یا رسول اللہ! 'وہن' کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا۔ حب الدنیا وکراھۃ الموت (دنیا کی محبت اور موت کا ڈر)۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عزم و حوصلہ اور عمل و ارادہ کی وہ پستی جو دنیا اور دنیا کی زندگی کی محبت اور موت کے خوف سے پیدا ہوتی ہے اور انسان کو راہ حق میں جہاد سے روکتی ہے وہ 'وہن' ہے۔ یہ حدیث اس لفظ کی بہترین تشریح ہے۔ یہاں بھی لَا تَهِنُوْا سے یہی مراد ہے کہ احد میں جو افتاد تمھیں پیش آئی ہے اس سے مرعوب اور خوف زدہ ہو کر ہمت نہ ہار بیٹھو۔ گویا پوری بات یوں ہے لَا تَهِنُوْا مِمَّآ اَصَابَكُمْ وَلَا تَحْزَنُوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ۔ اس شکست کے سبب سے جو تمھیں پیش آئی ہے حوصلہ ہار دو اور نہ اس نقصان کا جو تمھیں پہنچا غم کرو۔

'القوم' سے مراد

'القوم' کا لفظ اس سیاق و سباق میں جب آتا ہے تو اس سے مراد حریف مقابل اور دشمن ہوتا ہے۔ یہاں اشارہ کفار قریش کی طرف ہے۔

'الایام' سے مراد

'الایام' جب اس طرح جمع کی شکل میں آتا ہے تو اس سے مراد تاریخ کے وہ دن ہوتے ہیں جن میں بڑے بڑے واقعات و حوادث پیش آئے ہوں۔ ایام العرب سے مراد اہل عرب کی جنگیں ہیں۔ قرآن میں ہے وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ یعنی دنیا میں قوموں پر اللہ کی رحمت اور اس کے عذاب کے جو بڑے بڑے واقعات پیش آئے ہیں ان کے ذریعہ سے لوگوں کو یاد دہانی کرو۔ آیت زیر بحث میں بھی اس

حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ اس طرح کے فتح و شکست کے جو واقعات پیش آتے ہیں، یہ ہر قوم کو پیش آتے ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت اور اس کے قانونِ آزمائش کے تحت پیش آتے ہیں۔

معطوف علیہ کے
وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ الآیہ کا معطوف علیہ یہاں مذکور نہیں ہے۔ ہم اس کتاب میں ایک سے زیادہ مقامات میں ذکر کر چکے ہیں کہ جب اس طرح حرفِ عطف آئے تو اس کا معطوف علیہ محذوف ہوتا ہے اور وہ قرینہ سے معین ہوتا ہے۔ ہمارے نزدیک اس سے پہلے لِيَبْتَلِيَكُمْ محذوف ہے۔ ہم نے ترجمہ میں اس کو کھول دیا ہے۔

'شہداء' سے مراد
وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَاءَ میں شہدا سے مراد اللہ کی راہ میں شہادت کا درجہ حاصل کرنے والے ہیں۔ ان لوگوں کو شہید کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس امت پر شہادت علی الناس کی جو ذمہ داری اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈالی گئی ہے اس کا حق یہ جان دے کر کرتے ہیں، اس وجہ سے یہ مستحق ٹھہرے کہ ان کو شہید کے لقب سے ملقب کیا جائے۔ یہ گویا لفظ کا استعمال اس کے حقیقی مصداق کے لیے ہے۔ اس ٹکڑے سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں شہادت کا مرتبہ ایسا عالی مرتبہ ہے اور اسلام کے ابتدائی دور میں مسلمانوں کے اندر اس کی طلب اتنی شدید تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس میدان میں گوئے سابقت لے جانے والوں کے شوق و جذبہ کی تسکین کے لیے مواقع فراہم فرمائے۔ چنانچہ اُحد میں جو افتاد پیش آئی اس میں جہاں دوسری حکمتیں اور مصلحتیں تھیں وہاں ایک حکمت یہ بھی تھی کہ جن کے لیے یہ منصبِ عالی مقدر ہے وہ اس موقع پر اس سے سرفراز ہو جائیں۔

'تمحیص' کا مفہوم
وَلِيُمَحِّصَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا الآیہ میں تمحیص کے معنی کسی چیز کو میل کچیل اور کھوٹ سے بالکل پاک صاف کر دینا ہے مَحَّصَ الذَّهَبَ بِالنَّارِ کے معنی ہوں گے سونے کو غل و غش اور کھوٹ سے پاک صاف کر دیا۔

الفاظ کی تحقیق کے بعد اب ان آیات کے مطالب ترتیب کے ساتھ ہم پیش کرتے ہیں۔

احد کی شکست سے کمزور قسم کے لوگوں پر جو دل شکستگی طاری ہوئی اس نے بہت سے ذہنوں میں یہ خیال بھی پیدا کر دیا کہ اسلام کے لیے فتح و غلبہ کی جو بشارتیں سنائی جاتی رہی ہیں وہ سب بس یوں ہی بادِ ہوا باتیں تھیں۔ مقصود ان سے محض اپنی ہوا باندھنا اور لوگوں کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنا تھا۔ اب ساری حقیقت کھل گئی۔ منافقین اور مخالفین نے موقع غنیمت پا کر اس خیال کو خوب ہوا دی تاکہ مسلمانوں کو اسلام کے مستقبل کی طرف سے بالکل مایوس کر دیں۔ قرآن نے یہاں اس پروپیگنڈے کا رد کیا اور مسلمانوں کو اطمینان دلایا کہ اُحد کے حادثہ سے دل شکستہ اور پست ہمت نہ ہو۔ حق و باطل کی اس کشمکش میں غالب اور سربلند، جیسا کہ اللہ نے فرمایا ہے، تمہی رہو گے بشرطیکہ تم سچے اور پکے مومن بن جاؤ۔

اس کے بعد فرمایا کہ اگر تمہیں کوئی نقصان پہنچ جائے جیسا کہ جنگ احد میں پہنچ گیا تو یہ کوئی مایوس ہو جانے کی بات نہیں ہے۔ تمہارے دشمنوں کو بھی خود اسی جنگ میں اور اس سے پہلے بدر میں کافی چوٹ

پہنچ چکی ہے۔ فتح و شکست کے یہ ردوبدل جو ہوتے ہیں خدا کی حکمت کے تحت اور اس کے حکم سے ہوتے ہیں، ان سے یہ نتیجہ نکال لینا جائز نہیں ہے کہ خدا کی سنت میں کوئی تبدیلی ہوگئی ہے اور اب وہ نیکوں کے بجائے بدوں کو ہی پیار کرنے لگا ہے بلکہ اس سے مقصود لوگوں کو جانچنا پرکھنا اور ان کی صلاحیتوں کو ابھارنا ہوتا ہے۔ اسی سے سچے اور کچے، مخلص اور منافق میں امتیاز ہوتا ہے اور حق کے لیے جان کی بازی کھیلنے والے شہدا کو اپنے جوہر دکھانے کا موقع نصیب ہوتا ہے۔

توحید سے مقصود کفر کو مٹانا ہے

پھر فرمایا کہ یہ نہ خیال کرو کہ احد میں اگر قریش کو فتح ہوگئی تو اللہ تعالیٰ اب اہلِ ایمان کے بجائے ان ظالموں ہی سے محبت کرنے لگا ہے بلکہ درحقیقت یہ بھی اہلِ کفر کو مٹانے ہی کی ایک تدبیر ہے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو امتحان کی بھٹی سے گزار کر یہ چاہتا ہے کہ ان کے اندر سے ہر قسم کا کھوٹ نکال کر ان کو بالکل زرِ خالص بنا دے اور کفر و اہل کفر سے ان کو چھانٹ کر بالکل الگ کر دے۔ اس علیحدگی کے بعد اہلِ ایمان اس زنجیر سے بالکل آزاد ہو جائیں گے جو ان کی ترقی میں مزاحم ہے اور ساتھ ہی پھر اہلِ کفر کا مٹ جانا بھی قطعی ہے، کیونکہ اس دنیا میں باطل صرف اسی وقت تک باقی رہ سکتا ہے جب تک اس کو کچھ حق کا سہارا حاصل رہے۔ اگر حق کا سہارا اس سے بالکل ہی چھن جائے تو اس کا نابود ہو جانا یقینی ہو جاتا ہے۔ اس دنیا کو اللہ تعالیٰ نے بالحق پیدا کیا ہے، اس وجہ سے کسی باطل مجرد کی پرورش اس کے مزاج کے بالکل خلاف ہے۔ تمحیص کے ذکر کے بعد یَمۡحَقَ الۡکٰفِرِیۡنَ سے اسی فلسفہ کی طرف اشارہ مقصود ہے۔ نبی اور اس کے ساتھیوں کی ہجرت کے بعد اہلِ کفر پر جو عذاب آتا ہے اس میں بھی یہی رمز ہے، تفصیل اس کی سورۂ برأت میں آئے گی۔

اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تَدۡخُلُوا الۡجَنَّۃَ وَلَمَّا یَعۡلَمِ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ جٰہَدُوۡا مِنۡکُمۡ وَیَعۡلَمَ الصّٰبِرِیۡنَ ۝ وَلَقَدۡ کُنۡتُمۡ تَمَنَّوۡنَ الۡمَوۡتَ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تَلۡقَوۡہُ ۪ فَقَدۡ رَاَیۡتُمُوۡہُ وَاَنۡتُمۡ تَنۡظُرُوۡنَ (۱۴۲-۱۴۳)

'علم یعلم' کے مختلف معانی پر سورۂ بقرہ کی تفسیر میں ہم بحث کر چکے ہیں۔ یہاں قرینہ دلیل ہے کہ یہ ممیز کرنے اور چھانٹ کر الگ کرنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ جٰہَدُوۡا مِنۡکُمۡ کے بعد اس کا مقابل جملہ الَّذِیۡنَ لَمۡ یُجَاہِدُوۡا عربیت کے معروف اسلوب کے مطابق حذف کر دیا گیا ہے۔ وَیَعۡلَمَ الصّٰبِرِیۡنَ میں یَعۡلَمَ کے فتحہ کے بارے میں لوگوں نے مختلف توجیہیں پیش کی ہیں لیکن ہمارے نزدیک اس کا عطف اوپر وَلِیَعۡلَمَ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا پر ہے۔ وہاں چونکہ کلام قانون ابتلا کی دوسری حکمتوں کے بیان کی طرف مڑ گیا تھا اس وجہ سے صبر کے ذکر کو مضمونِ جہاد سے وابستہ کر دیا لیکن اس کے فتحہ سے یہ بات آپ سے آپ واضح ہوگئی کہ آزمائش کر کے اللہ تعالیٰ جن لوگوں کو چھانٹنا چاہتا ہے ان میں صابرین بھی ہیں۔

راہ حق میں آزمائشیں ناگزیر ہیں

احد کی شکست سے جو لوگ بددل ہوئے تھے ان کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اگر تمہارا یہ گمان تھا کہ حق کی راہ خطرات اور آزمائشوں سے خالی ہے اور تم اسلام کا دعویٰ کر کے ایک ٹھنڈی سڑک سے سیدھے سیدھے جنت میں جا براجو گے تو تمہارا یہ خیال بالکل غلط ہے۔ خدا کی جنت میں کوئی شخص اس وقت تک داخل

نہیں ہو سکتا جب تک امتحان سے یہ تعین نہ ہو جائے کہ یہ اللہ کی راہ میں جہاد کا ولولہ رکھتا ہے یا نہیں اور حق کے لیے آزمائشوں کی تاب لا سکتا ہے یا نہیں۔ چنانچہ اسی چیز کی جانچ کے لیے تمھیں یہ احد کی آزمائش پیش آئی۔ اب تک تمھاری طرف سے جہاد کے لیے بڑے جوش و خروش کا اظہار ہو رہا ہے۔ لیکن اس کی نوعیت صرف زبانی جمع خرچ کی تھی۔ ضرورت تھی کہ سچے اور جھوٹے، عاشق صادق اور بوالہوس کے درمیان امتیاز کے لیے کوئی ایسا موقع پیش آئے جب موت سے رودررو ہو کر تمھیں لڑنا پڑے۔ چنانچہ یہ موقع اللہ نے تمھیں دکھا دیا اور تمھارے کھرے اور کھوٹے میں امتیاز کی ایک کسوٹی سامنے آگئی۔ یہ بات یہاں یاد رکھنے کی ہے کہ جو لوگ دل کے کمزور تھے بالعموم وہ زبان سے شوقِ جہاد کا اظہار زیادہ کرتے تھے تاکہ ان کی کمزوری پر پردہ پڑا رہے۔ سورۂ نساء میں انھی لوگوں کی طرف اشارہ ہے۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ (۷۷) کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن سے کہا جاتا تھا کہ ابھی اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز کا اہتمام کرو اور زکوٰۃ دیتے رہو۔ پھر جب ان پر جنگ فرض کر دی گئی تو ان میں سے ایک گروہ لوگوں سے اس طرح ڈرتا ہے جس طرح خدا سے ڈرنا چاہیے بلکہ اس سے بھی زیادہ اور کہتا ہے کہ اے رب تو نے ہم پر جنگ کیوں فرض کر دی، کچھ دن اور مہلت کیوں نہ دی؟

۳۳۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۴۴-۱۴۸

آگے کی آیات میں پہلے یہ غلط فہمی دور فرمائی کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کوئی مافوق بشر ہستی نہیں ہیں، وہ اللہ کے رسولوں میں سے ایک رسول ہیں جس طرح بہت سے رسول گزر چکے ہیں اسی طرح ایک دن ان کو بھی بہر حال وفات پانا ہے اور اس کا بھی امکان ہے کہ وہ شہید کر دیے جائیں لیکن اللہ کے دین کو ہمیشہ باقی رہنا ہے تو اس دین کے ساتھ آدمی کی وابستگی اس مفروضہ پر مبنی نہیں ہونی چاہیے کہ آپ اس دنیا میں ہمیشہ رہنے کے لیے آئے ہیں۔ اس غلط فہمی کی اصلاح اس لیے ضروری تھی کہ اگر اس قسم کا کوئی وہم دلوں میں چھپا ہوا رہتا تو آپ کی وفات پر سب کے دل بیٹھ جاتے اور منافقین و معاندین، اسلام کی مخالفت میں اس سے بڑا فائدہ اٹھا سکتے۔ چنانچہ جوں ہی اس غلط فہمی کی موجودگی کے کچھ آثار نمایاں ہوئے قرآن نے اس کی اصلاح فرما دی۔ روایات میں آتا ہے کہ غزوۂ احد میں جب مسلمانوں کو شکست ہو گئی تو یہ خبر بھی مشہور ہو گئی کہ خود سرورِ عالم بھی شہید ہو گئے۔ اس اندوہناک خبر نے بہت سے مسلمانوں کے حوصلے پست کر دیے۔ انھوں نے خیال کیا کہ جب حضورؐ ہی شہید ہو گئے تو اب بھلا کیا ہو سکتا ہے۔ اگرچہ ذی ہوش لوگوں نے یہ کہہ کر حالات کو سنبھالا کہ جب حضورؐ شہید ہو گئے تو ہمارے زندہ رہنے سے کیا حاصل، ہمیں بھی اسی مقصدِ حق کے لیے شہید ہو جانا چاہیے

جس کے لیے حضورؐ شہید ہوئے، تاہم مسلمانوں کے اندر یہ ایک ایسی کمزوری نمایاں ہوئی تھی جس کی کو وقت اصلاح خود قرآن کی زبان سے ضروری تھی تاکہ آئندہ کے لیے فتنوں کا سدِ باب ہو جائے۔

اس کے بعد پچھلے انبیا اور ان کے جاں نثار صحابہ کا ذکر بطور مثال کیا ہے کہ انھیں بھی اللہ کی راہ میں جہاد کرنا پڑا، اور اس راہ میں انھیں تکلیفیں اور مصیبتیں بھی پہنچیں لیکن وہ دل شکستہ نہ ہوئے تو پھر تم کو اگر شکست ہوئی یا تمھارے پیغمبر کو کوئی تکلیف پہنچی تو تم کیوں دل شکستہ ہوتے ہو تم بھی انھی کی روش اختیار کرو جب کہ اسی کام کے لیے اٹھے ہو جس کے لیے وہ اٹھے تھے۔ اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔ ارشاد ہے۔

آیات ۱۴۴-۱۴۸

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَا۟ئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۴﴾ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ؕ وَسَنَجْزِى الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۵﴾ وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِىٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَاۤ اَصَابَهُمْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۶﴾ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِىْۤ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾ فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۴۸﴾ ع ۱۵

ترجمۂ آیات ۱۴۴-۱۴۸

محمد تو بس ایک رسول ہیں۔ ان سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں تو کیا اگر وہ وفات پا گئے یا قتل کر دیے گئے تو تم پیٹھ پیچھے پھر جاؤ گے۔ جو پیٹھ پیچھے پھر جائے گا وہ اللہ کا

کچھ نہیں بگاڑے گا اور اللہ شکر گزاروں کو صلہ عطا فرمائے گا۔ ۱۴۴

اور کوئی جان مر نہیں سکتی مگر اللہ کے حکم سے ایک مقررہ نوشتہ کے مطابق۔ جو دنیا کا صلہ چاہتے ہیں ہم انھیں دنیا میں سے دیتے ہیں اور جو اجرِ آخرت کے طالب ہیں ہم انھیں اس میں سے دیں گے اور ہم شکر گزاروں کو بھرپور صلہ دیں گے۔ ۱۴۵

اور کتنے انبیا گزرے ہیں جن کے ساتھ ہو کر بہت سے اللہ والوں نے جنگ کی تو وہ ان مصیبتوں کے سبب سے جو انھیں خدا کی راہ میں پہنچیں نہ تو پست ہمت ہوئے نہ انھوں نے کمزوری دکھائی اور نہ دشمنوں کے آگے گھٹنے ٹیکے اور اللہ ثابت قدم رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ ان کی دعا تو ہمیشہ بس یہ رہی کہ اے رب ہمارے گناہوں اور ہمارے معاملے میں ہماری بے اعتدالیوں کو بخش دے، ہمارے قدم جمائے رکھ اور کافروں کے مقابل میں ہماری مدد فرما۔ تو اللہ نے ان کو دنیا کا صلہ بھی عطا فرمایا، اور آخرت کے اچھے اجر سے بھی نوازا اور اللہ خوب کاروں کو دوست رکھتا ہے۔ ۱۴۶-۱۴۸

۳۴- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ اَفَا۟ىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۭ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰي عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَـيْـــًٔـا ۭ وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ (۱۴۴)

'عقب' کے معنی ایڑی کے ہیں۔ اِنْقَلَبَ عَلٰی عَقِبَیْهِ پیٹھ پیچھے پھرنے کی تعبیر ہے۔ یہاں اس سے مراد اسلام کو چھوڑ کر پھر جاہلیت کی طرف مڑ جانا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جس طرح دنیا میں بہت سے رسول گزرے ہیں اسی طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی اللہ کے ایک رسول ہیں۔ جس طرح کی آزمائشیں اور مصیبتیں دوسرے رسولوں کو پیش آئیں اسی طرح کی آزمائشیں اور مصیبتیں انہیں بھی پیش آسکتی ہیں۔ جس طرح تمام رسولوں کو موت کے مرحلے سے گزرنا پڑا انھیں بھی ایک دن وفات پانا ہے۔ ان کے رسول ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ یہ وفات نہیں پائیں گے یا

قتل نہیں ہو سکتے یا کسی مصیبت یا ہزیمت کا ابتلا انھیں پیش نہیں آسکتا۔ اگر کسی نے اس غلط فہمی کے ساتھ اسلام قبول کیا تھا اور اب اُحد کے حادثے کے بعد کسی تذبذب میں مبتلا ہو گیا ہے اور وہ از سر نو جاہلیت کی زندگی کی طرف پلٹ جانا چاہتا ہے تو پلٹ جائے وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑے گا بلکہ اپنی ہی دنیا اور آخرت برباد کرے گا۔ جو لوگ اسلام کو دیکھ کر بھی جاہلیت اور اسلام کے فرق کو سمجھ نہ سکے اور اسلام کے قدردان نہ بنے اللہ کو ان کی کچھ پروا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے انعامات کا حق دار ان کو سمجھتا ہے جو اسلام کی نعمت پانے پر اپنے رب کے شکر گزار ہیں، جاہلیت کی طرف بازگشت کا ان کے ذہن میں خیال بھی نہیں گزرتا۔

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ۭ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۭ وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ (۱۴۵)

'كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا' اس طرح کی ترکیب ہے جس طرح وعد اللہ یا صنع اللہ الذی اتقن وغیرہ ہے۔

منافقین کی دو خاص کمزوریاں

اس آیت میں کمزور اور منافق قسم کے لوگوں کی دو کمزوریوں کی نشان دہی کی ہے۔

ایک یہ کہ یہ اس بات پر عقیدہ نہیں رکھتے کہ ہر شخص کی موت کے لیے ایک نوشتۂ الٰہی ہے، جب تک اس نوشتہ کی مقررہ مدت پوری نہیں ہو گی اس وقت تک کسی کی موت نہیں آسکتی، اسی طرح جب نوشتہ پورا ہو جائے گا تو کسی کی موت ایک منٹ کے لیے ٹل بھی نہیں سکتی۔ اس وجہ سے خدا کے مقرر کردہ فرائض سے فرار کے بجائے آدمی کے لیے صحیح رویہ یہ ہے کہ وہ عزم و حزم کے ساتھ اپنا فرض ادا کرے اور موت کے معاملے میں اطمینان رکھے کہ اس کا وقت بھی خدا کے ہاں لکھا ہوا ہے اور اس کی شکل بھی متعین ہے۔

دوسری کمزوری یہ ہے کہ یہ اپنے دنیوی مفادات کو تمام تر اپنی سعی و تدبیر ہی پر منحصر سمجھتے ہیں اور یہ اندیشہ رکھتے ہیں کہ اگر آخرت کے پیچھے زیادہ پڑے تو دنیا سے یک قلم محروم ہو جائیں گے۔ حالانکہ یہ حقیقت نہیں ہے۔ خدا دنیا کے طالبوں کو دنیا میں سے اتنا ہی حصہ دیتا ہے جتنا ان کے لیے مقدر ہوتا ہے اور وہ آخرت کے اجر سے بالکل ہی محروم رہتے ہیں۔ برعکس اس کے جو آخرت کے طلبگار ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو آخرت کے انعامات سے بھی نوازتا ہے اور دنیا میں سے بھی ان کو اتنا دیتا ہے جتنا ان کے لیے مقدر ہوتا ہے۔ اس وجہ سے صحیح رویہ یہ نہیں ہے کہ آدمی آخرت کو چھوڑ کر صرف دنیا کا بندہ بن کر رہ جائے بلکہ یہ ہے کہ آخرت کا طالب بنے اور دنیا میں سے اللہ تعالیٰ جو کچھ بخشے اس پر قناعت کرے۔ آگے کی آیت میں اس مضمون کی وضاحت آرہی ہے۔

'وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ' میں قرینہ دلیل ہے کہ فعل اپنے کامل معنی میں استعمال ہوا ہے اور 'شاکرین' سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی اُس عظیم نعمت کے دل سے قدردان ہیں جو اب نہیں آخری اور کامل ہدایت کی صورت میں ملی ہے۔ فرمایا کہ ہم انھیں اس قدردانی کا بھرپور صلہ دیں گے۔ رہے وہ لوگ جو اس روشنی کو دیکھ کر بھی ظلمت ہی کے طالب ہیں وہ تاریکی ہی میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیے جائیں گے۔

وَكَاَيِّنۡ مِّنۡ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوۡنَ كَثِيۡرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوۡا لِمَاۤ اَصَابَهُمۡ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوۡا وَمَا اسۡتَكَانُوۡا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيۡنَ ۝ وَمَا كَانَ قَوۡلَهُمۡ اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوۡا رَبَّنَا اغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَا وَاِسۡرَافَنَا فِىۡۤ اَمۡرِنَا وَثَبِّتۡ اَقۡدَامَنَا وَانۡصُرۡنَا عَلَى الۡقَوۡمِ الۡكٰفِرِيۡنَ ۝ فَاٰتٰٮهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنۡيَا وَحُسۡنَ ثَوَابِ الۡاٰخِرَةِ ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الۡمُحۡسِنِيۡنَ (۱۴۶ - ۱۴۸)

'وہن' 'ضعف' اور 'استکانت' کا مفہوم

'رِبِّی' اور 'وہن' کے الفاظ پر پیچھے بحث گزر چکی ہے۔ وہن، ضعف اور استکانت کے الفاظ اگرچہ اظہار کمزوری کے مفہوم کے لیے کچھ مشترک سے ہیں لیکن ان تینوں میں ایک نازک سا فرق بھی ہے۔ موت سے خوف اور زندگی کی محبت سے دل میں جو بزدلی پیدا ہوتی ہے، یہ وہن ہے۔ اس وہن سے ارادے اور عمل میں جو تعطل پیدا ہوتا ہے وہ ضعف ہے۔ اس ضعف سے حریف کے آگے گھٹنے ٹیک دینے کا جو نتیجہ ظہور میں آتا ہے وہ استکانت ہے۔

انبیاء اور ان کے صحابہ کی ایک سنت

آیت کا مطلب یہ ہے کہ تاریخ میں اس سے پہلے بھی ایسی مثالیں گزر چکی ہیں کہ اللہ کے نبیوں نے جہاد کیا ہے اور اس جہاد میں اللہ کے بہت سے نیک بندوں نے ان کا ساتھ دیا ہے اور انھیں اس راہ میں مصیبتوں اور ہزیمتوں سے بھی سابقہ پیش آیا ہے لیکن اس چیز کا اثر ان پر یہ نہیں پڑا کہ وہ ہمت ہار جائیں، تھڑدلا پن دکھائیں یا دشمن کے آگے گھٹنے ٹیک دیں بلکہ انھوں نے راہِ حق میں استقامت دکھائی اور اللہ ایسے ہی لوگوں کو دوست رکھتا ہے۔

یہ اشارہ ہے ان جنگوں کی طرف جو حضرت موسیٰ، حضرت داؤد، حضرت سلیمان علیہم السلام اور بعض دوسرے انبیا کو لڑنی پڑیں۔ حضرت سموئیلؑ کے زمانے کی ایک جنگ کا، جو غزوۂ بدر سے مشابہ تھی، ذکر سورۂ بقرہ میں بھی گزر چکا ہے۔ مقصود اس اشارے سے ان لوگوں کو جو احد کی شکست سے بددل ہو رہے تھے اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا ہے کہ نہ تو نبی اور اس کے صحابہؓ کے لیے جنگ کا پیش آنا کوئی انوکھی بات ہے اور نہ مصائب و شدائد سے ان کا گزرنا کوئی نیا حادثہ ہے۔ یہ انبیا کی ایک سنت اور خدا کے قانونِ ابتلا کا ایک لازمی تقاضا ہے۔ کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ جو نبی ہوتا ہے وہ اور اس کے ساتھی امتحان سے گزرے بغیر ہی منزل پر جا پہنچتے ہیں۔ اللہ کو محبوب تو صرف وہی لوگ ہیں جو اس کی راہ میں استقامت دکھائیں نہ کہ ہر مدعی دینداری۔ پھر جھوٹے اور سچے میں امتیاز آخر اس امتحان کے بغیر کیسے ہوگا؟

وَمَا كَانَ قَوۡلَهُمۡ اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوۡا الآیہ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انھیں جب مصیبتیں اور آزمائشیں پیش آئیں تو انھوں نے اس طرح کی باتیں نہیں بنائیں جس طرح کی باتیں آج کمزور قسم کے مسلمان اور منافق لوگ بنا کر پیغمبرؐ کے خلاف طرح طرح کے شبہات دلوں میں پیدا کر رہے ہیں، بلکہ جو افتاد انھیں پیش آئی اس کو انھوں نے خدا اور رسول کی طرف منسوب کرنے کے بجائے خود اپنی کمزوری اور اپنے تجاوز پر محمول کیا اور اللہ تعالیٰ سے اپنے قصوروں کی معافی مانگی۔ اس کا صلہ ان کو یہ ملا کہ دنیا میں بھی خدا نے ان کو اقتدار

اور حکومت سے سرفراز فرمایا اور آخرت میں بھی ان کے لیے نہایت اعلیٰ صلہ و انعام موجود ہے۔ آخر میں فرمایا کہ یہی لوگ ہیں جو مرتبۂ احسان پر فائز ہیں اور اللہ ایسے ہی خوب کاروں کو دوست رکھتا ہے۔

۳۵- آگے کا مضمون ___ آیات ۱۴۹-۱۵۵

آگے بھی انھی کمزوریوں پر تبصرہ ہے جو جنگِ احد اور اس کی شکست سے ابھر کر سامنے آئی تھیں۔ قرآن نے ان میں سے ایک ایک کو لے کر ان کے باطن کو نمایاں کیا ہے، ان کی اصلاح کی تدبیریں بتائی ہیں اور اس آزمائش سے مسلمانوں کی تربیت و تطہیر کے جو مصالح پورے ہوئے ہیں ان کی طرف اشارے فرمائے ہیں۔

آیات ۱۴۹-۱۵۵

يَٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوٓا إِن تُطِيعُوا الَّذِينَ كَفَرُوا يَرُدُّوكُمْ عَلٰىٓ أَعْقَابِكُمْ فَتَنقَلِبُوا خٰسِرِينَ ﴿۱۴۹﴾ بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۖ وَهُوَ خَيْرُ النّٰصِرِينَ ﴿۱۵۰﴾ سَنُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَآ أَشْرَكُوا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا ۖ وَمَأْوٰىهُمُ النَّارُ ۚ وَبِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِينَ ﴿۱۵۱﴾ وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ إِذْ تَحُسُّونَهُم بِإِذْنِهٖ ۖ حَتّٰىٓ إِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنٰزَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ وَعَصَيْتُم مِّنۢ بَعْدِ مَآ أَرٰىكُم مَّا تُحِبُّونَ ۚ مِنكُم مَّن يُرِيدُ الدُّنْيَا وَمِنكُم مَّن يُرِيدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۖ وَلَقَدْ عَفَا عَنكُمْ ۗ وَاللّٰهُ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ ﴿۱۵۲﴾ إِذْ تُصْعِدُونَ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰىٓ أَحَدٍ وَّالرَّسُولُ يَدْعُوكُمْ فِيٓ أُخْرٰىكُمْ فَأَثٰبَكُمْ غَمًّۢا بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَآ أَصٰبَكُمْ ۗ وَاللّٰهُ خَبِيرٌۢ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿۱۵۳﴾ ثُمَّ أَنزَلَ عَلَيْكُم مِّنۢ بَعْدِ الْغَمِّ أَمَنَةً نُّعَاسًا

يَغْشٰى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ ۙ وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ۭ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ۭ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ۭ يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ ۭ يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ۭ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ۚ وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (۱۵۴) اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۙ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ۚ وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ (۱۵۵) ع ۱۶

ترجمۂ آیات ۱۴۹-۱۵۵

اے ایمان والو، اگر تم کافروں کی بات مانو گے تو یہ تمھیں پیٹھ پیچھے لوٹا کے رہیں گے اور تم نامراد ہو کے رہ جاؤ گے۔ تمھارا مولیٰ تو اللہ ہے اور وہ بہترین مددگار ہے۔ ہم ان کافروں کے دلوں میں تمھارا رعب ڈال دیں گے کیونکہ انھوں نے ایسی چیزوں کو خدا کا شریک ٹھہرا رکھا ہے جن کے حق میں خدا نے کوئی دلیل نہیں اتاری۔ ان کا ٹھکانا جہنم ہوگا اور اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والوں کا کیا ہی برا ٹھکانا ہے۔ ۱۴۹-۱۵۱

اور اللہ نے تو تم سے جو وعدہ کیا وہ سچ کر دکھایا جب کہ تم ان کو اللہ کے حکم سے تہ تیغ کر رہے تھے یہاں تک کہ جب تم خود ڈھیلے پڑ گئے اور حکم میں تم نے اختلاف کیا اور رسول کی نافرمانی کی جب کہ اللہ نے تمھیں وہ چیز دکھا دی تھی جس کے تم تمنائی تھے۔ تم میں کچھ دنیا کے طالب تھے اور کچھ آخرت کے۔ پھر خدا نے تمھارا رخ ان سے پھیر دیا تاکہ تمھیں آزمائش میں

ڈالے اور اللہ مسلمانوں پر فضل فرمانے والا ہے۔ یاد کرو، جب کہ تم منہ اٹھائے بھاگے جا رہے تھے اور کسی کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھتے تھے اور خدا کا رسول تم کو تمہارے پیچھے سے پکار رہا تھا تو خدا نے تم کو غم پر غم پہنچایا تاکہ تم دل شکستہ نہ ہوا کرو، نہ کسی نقصان پر اور نہ کسی مصیبت پر۔ اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس کی خبر رکھنے والا ہے۔ ۱۵۲-۱۵۳

پھر خدا نے تم پر غم کے بعد اطمینان نازل فرمایا یعنی نیند جو آکر تم میں سے ایک گروہ کو چھا لیتی ہے اور ایک گروہ کو اپنی جانوں کی پڑی ہوئی، یہ خدا کے بارے میں خلافِ حقیقت زمانۂ جاہلیت کے قسم کی بدگمانیوں میں مبتلا رہے۔ یہ کہتے رہے کہ بھلا ہمیں ان معاملات میں کیا دخل؟ کہہ دو سارا معاملہ اللہ کے اختیار میں ہے۔ وہ اپنے دلوں میں وہ کچھ چھپائے ہوئے ہیں جو تم پر ظاہر نہیں کرتے۔ وہ دل میں کہتے ہیں کہ اگر اس امر میں کچھ ہمارا بھی دخل ہوتا تو ہم یہاں نہ مارے جاتے۔ کہہ دو اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے جب بھی جن کا قتل ہونا مقدر تھا وہ اپنی قتل گاہوں تک پہنچ کے رہتے۔ یہ اس لیے ہوا کہ اللہ تم میں امتیاز کرے، جو کچھ تمہارے سینوں میں ہے اس کو پرکھے اور جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اس کو صاف کرے اور اللہ سینوں کے بھیدوں سے خوب واقف ہے۔ دونوں گروہوں کی مڈبھیڑ کے دن جو لوگ تم میں سے پھر گئے ان کو شیطان نے ان کی بعض کرتوتوں کے سبب سے پھسلا دیا۔ اللہ نے ان سے درگزر فرمایا۔ بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ ۱۵۴-۱۵۵

۳۶- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تُطِیْعُوا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا یَرُدُّوْكُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِیْنَ ۝ بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَ هُوَ خَیْرُ النّٰصِرِیْنَ (۱۴۹-۱۵۰)

احد کی شکست کے بعد کفار اور یہود نے یہ چاہا کہ بدر کی فتح کے اثرات کو یک قلم مٹا کے رکھ دیں گے۔

کفار اور منافقین کا پروپیگنڈا

چنانچہ انھوں نے اپنے منظم پروپیگنڈے سے مسلمانوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ تمھارا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ محمدؐ خدا کے کوئی فرستادہ ہیں اور ان کو خدا اور فرشتوں کی مدد حاصل ہے۔ اگر یہ بات ہوتی تو تم اُحد میں شکست کیوں کھاتے؟ بدر میں تم نے فتح حاصل کی، اُحد میں ہم فتحمند رہے۔ یہ تدبیر اور وسائل کا کھیل ہے۔ اس کو خدا اور اس کے فرشتوں سے وابستہ کر دینا اور اپنے آپ کو خدا کی مدد کا اجارہ دار سمجھ بیٹھنا محض طفلانہ خام خیالی ہے۔

پروپیگنڈے کا جواب

کفار کا یہ پروپیگنڈا ان مسلمانوں پر اثر انداز ہوا جو کمزور قسم کے تھے۔ منافقین نے بھی اپنی وسوسہ اندازیوں سے اس کو تقویت پہنچائی۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو متنبہ فرمایا کہ اگر تم نے ان کفار کی باتوں کا اثر قبول کیا تو یہ تم کو پھر اسی جاہلیت کی تاریکی میں واپس لے جائیں گے جس سے نکال کر خدا تمھیں اسلام کی روشنی میں لایا ہے اور تمھاری کامیابی پھر نامرادی سے بدل جائے گی۔ تمھارے ولی و مرجع یہ کفار نہیں ہیں کہ تم اپنی مشکلات اور پریشانیوں میں ان سے رجوع کرو اور ان سے رہنمائی چاہو بلکہ تمھارا مرجع و مولیٰ اللہ ہے، تم اس کی طرف رجوع کرو اور اس سے مدد چاہو، وہ بہترین مددگار ہے۔ اوپر لَا تَتَّخِذُوا بِطَانَةً والی آیت میں بھی یہی مضمون گزر چکا ہے۔

سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَآ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا ۚ وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ۭ وَبِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِيْنَ (۱۵۱)

شرک کی کوئی بنیاد نہیں

یعنی اس وقت ذرا ان کا حوصلہ جو بڑھ گیا ہے تو یہ محض ایک وقتی اور عارضی نشہ ہے۔ اس کی کوئی پائیدار بنیاد نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ بہت جلد ان کے حوصلے پست کر دے گا اور ان کے دلوں میں اسلام اور مسلمانوں کا رعب ڈال دے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے ایسی چیزوں کو خدا کی خدائی میں شریک بنا رکھا ہے جن کی کوئی شہادت نہ تو عقل و فطرت کے اندر موجود ہے، نہ نظامِ کائنات میں اور نہ خدا کے اتارے ہوئے صحیفوں میں۔ ایسی وہمی چیزیں اول تو حقائق کے مقابلے میں کچھ سہارا نہیں دے سکتیں، دوسرے اتنے مختلف دیوتاؤں کے ساتھ ان کی وابستگی ان کے دل کو اس طرح منتشر اور پراگندہ کیے ہوئے ہے کہ ان کو وہ دل جمعی و یکسوئی کبھی حاصل ہی نہیں ہو سکتی جو تمام عزم اور حوصلے کی بنیاد ہے۔ آیت میں 'ظالمین' سے مراد مشرکین ہیں۔ شرک کو ظلم سے تعبیر کرنے کے وجوہ پر ہم دوسری جگہ بحث کر چکے ہیں۔ از انجملہ یہ بات بھی ہے کہ شرک درحقیقت انسان کا خود اپنے نفس پر بہت بڑا ظلم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو تمام مخلوقات سے اشرف بنایا ہے۔ اس شرف کا احساس ہی ہے جس کے اندر اس کی تمام قوت و عظمت کا راز مضمر ہے۔ انسان جب اپنے سے فروتر مخلوق کو اپنا رازق و حاکم مان کر اس کی پرستش کرنے لگتا ہے تو گویا وہ شاہین ہو کر کنجشکِ فرومایہ کی غلامی اختیار کر لیتا ہے اور اس طرح نہ صرف اپنی شاہینی کھو دیتا ہے بلکہ کنجشک سے بھی زیادہ حقیر و فرومایہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس پر تفصیلی بحث کی سورتوں میں آئے گی۔

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِى الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْھُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۭ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ (۱۵۲)

'حَسّ' کا مفہوم

'حَسٌّ' کے معنی دشمن کو اس طرح قتل کرنے کے ہیں کہ اس کو بالکل پامال اور اس کا استیصال کر دیا جائے۔ 'بِاِذْنِہٖ' کا مفہوم یہ ہے کہ یہ شاندار نتیجہ صرف تمہاری تدبیر اور تمہاری قوت کا کرشمہ نہیں تھا بلکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت و مشیت کا کرشمہ تھا۔

'فشل' کا مفہوم

'فشل' کے معنی سست پڑ جانے، ڈھیلے پڑ جانے اور کمزوری دکھانے کے ہیں۔

'تنازع فی الامر' کا مفہوم

'تنازع فی الامر' تنازع فی الحدیث سے نکلا ہوا محاورہ ہے۔ تنازع فی الحدیث کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایک بات میں کوئی شخص کچھ رائے دے، دوسرا کچھ رائے دے۔ اسی طرح تنازع فی الامر کا مطلب اس موقع پر یہ ہے کہ نبیؐ نے جو حکم دیا اس کی تعمیل میں کسی نے کچھ موقف لیا، کسی نے دوسرا موقف لیا۔

'مَا تُحِبُّوْنَ' کا مفہوم

'مَا تُحِبُّوْنَ' میں اشارہ فتح کی تمنا کی طرف ہے۔ قرآن نے بعض جگہ اس ابہام کو کھول بھی دیا ہے۔ مثلاً سورۂ صف میں ہے۔ وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ۭ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ (اور دوسری ایک اور چیز بھی جس کو تم محبوب رکھتے ہو، یعنی اللہ کی مدد اور جلد حاصل ہونے والی فتح)

احد میں شکست کی وجہ

اب یہ اس پروپیگنڈے کی تردید ہو رہی ہے جو کفار و منافقین نے پھیلانا شروع کیا تھا ــ کہ مسلمان خواہ مخواہ کو اس خبط میں مبتلا ہیں کہ خدا اور اس کے فرشتے ان کی مدد کرتے ہیں۔ اگر مدد کرتے ہیں تو یہ مدد اُحد میں کہاں چلی گئی؟ اوپر آیت ۱۴۹ کے تحت ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ کمزور قسم کے مسلمان اس پروپیگنڈے سے مسموم ہوئے۔ اس فتنہ سے مسلمانوں کو بچانے کے لیے قرآن نے آگاہ فرمایا کہ جہاں تک اللہ تعالیٰ کے وعدۂ نصرت کے پورے ہونے کا تعلق ہے وہ تو اُحد میں بھی پورا ہوا، اس لیے کہ شروع شروع میں تم نے کفار کو خوب تہ تیغ کیا، یہاں تک کہ وہ پسپا ہو گئے اور فتح بالکل تمہارے سامنے تھی لیکن قبل اس کے کہ تم دشمن کو اچھی طرح کچل کے اس کو ہتھیار ڈال دینے پر مجبور کر دیتے، تم ڈھیلے پڑ گئے۔ رسولؐ نے پشت کے درے کی حفاظت پر جن لوگوں کو اس قطعی ہدایت کے ساتھ مامور کیا تھا کہ وہ کسی حال میں بھی اس کو نہ چھوڑیں، انھوں نے رسولؐ کے حکم کے منشا کے تعین میں اختلاف کیا اور ان کی اکثریت یہ سوچ کر کہ اب تو فتح سامنے ہے رسولؐ کے حکم کے خلاف مالِ غنیمت حاصل کرنے میں مصروف ہو گئی۔ تم میں کچھ لوگ دنیا کے طالب تھے اور کچھ لوگ آخرت کے۔ اسلام کی صفوں میں ایسے لوگوں کا موجود ہونا، جو دنیا کی خاطر رسول کے حکم کو نظر انداز کر دیں، اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ہے اس وجہ سے اس کی حکمت کا تقاضا یہ ہوا کہ وہ تمہیں امتحان میں ڈالے تاکہ جو لوگ دنیا کے طالب ہیں وہ تم سے چھٹ کر الگ ہو جائیں۔ چنانچہ اس نے تمہارا رخ ان سے پھیر دیا اور تمہاری فتح شکست سے بدل گئی۔

خدا کا وعدۂ نصرت مشروط ہے

مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے اللہ کا وعدۂ نصرت غیر مشروط نہیں ہے کہ وہ جو روی بھی چاہیں اختیار کریں لیکن خدا کی نصرت ہر حال میں ان کے ہمرکاب ہی رہے بلکہ یہ مشروط ہے اس شرط کے ساتھ کہ مسلمان ادائے فرض میں ڈھیلے نہ پڑیں، اطاعتِ امر میں اختلاف نہ کریں، خدا اور رسول کی نافرمانی نہ کریں، آخرت کو چھوڑ کر دنیا کے طالب نہ بنیں۔

اگر اس طرح کی کوئی چیز ان کے اندر پائی جاتی ہے تو بھی اللہ تعالیٰ یہ نہیں کرتا کہ ان پر اپنا غضب نازل کر دے بلکہ ان کو ایسی آزمائشوں میں مبتلا کرتا ہے جن سے ان کی یہ کمزوریاں دور ہوں اور وہ زیادہ سے زیادہ خدا کی تائید و نصرت کے سزاوار بن سکیں۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کے عفو و درگزر اور اس کے فضل و عنایت ہی کی ایک شکل ہوئی۔ چنانچہ آیت کے آخر میں اس عفو اور فضل کی طرف بھی اشارہ فرما دیا۔

غزوہ احد کے متعلق یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اس امر پر تمام اربابِ سِیَر متفق ہیں کہ اس جنگ میں مسلمانوں کا ابتدائی حملہ بہت کامیاب رہا۔ انھوں نے دشمن پر غلبہ پا لیا تھا لیکن ایک دستہ جو ایک اہم درے کی حفاظت پر مامور تھا اور جس کو حضورؐ کی طرف سے ہدایت تھی کہ وہ کسی حال میں بھی اپنی جگہ کو نہ چھوڑے قبل از وقت اپنی جگہ چھوڑ کر مالِ غنیمت سمیٹنے میں مصروف ہو گیا، صرف تھوڑے سے آدمی اس دستے کے اپنی جگہ پر قائم رہے۔ اس چیز سے دشمن کے ایک دستہ نے فائدہ اٹھایا اور کاوا لگا کر اس نے پشت سے مسلمانوں پر حملہ کر دیا اور یہ حملہ ایسا اچانک اور کامیاب ہوا کہ مسلمان اوسان کھو بیٹھے۔ آیت میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰٓی اَحَدٍ وَّالرَّسُوْلُ یَدْعُوْكُمْ فِیْٓ اُخْرٰىكُمْ فَاَثَابَكُمْ غَمًّۢا بِغَمٍّ لِّكَیْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰی مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَآ اَصَابَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (۱۵۳)

'اصعاد' کا مفہوم

اصعاد کے اصل معنی کسی چڑھائی کی سمت میں جانے کے ہیں اسی سے اصعد فی العداء کا محاورہ نکلا جس کے معنی کسی سمت میں منہ اٹھائے بھاگ کھڑے ہونے کے ہیں۔

'غَمًّۢا بِغَمٍّ' کا مفہوم

غَمًّۢا بِغَمٍّ میں 'ب' تلبس کے مفہوم میں ہے یعنی ایک غم تو شکست کا تھا ہی اس کے ساتھ لپٹا ہوا ایک اور غم بھی سامنے آ گیا۔ ہمارے نزدیک اس غم سے مراد وہ غم ہے جو اس دوران میں مسلمانوں کو کفار کی اڑائی ہوئی اس افواہ سے پہنچا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی شہید کر دیے گئے۔ اس افواہ کا ذکر تاریخ اور سیرت کی کتابوں میں بھی ہے اور قرآن کی اس آیت سے بھی اس کا اشارہ نکلتا ہے اس لیے کہ فرمایا ہے کہ تم اس طرح بگٹٹ بھاگے چلے جا رہے تھے کہ تمھیں اپنے دہنے بائیں کا بھی ہوش نہیں رہا تھا کہ تم ذرا مڑ کے دیکھ سکتے کہ کون ہے اور کیا کہہ رہا ہے، یہاں تک کہ اس رسول کی طرف بھی تم نے توجہ نہیں کی جو تمھارے پیچھے سے تمھیں برابر پکارتا رہا کہ اللہ کے بندو، میری طرف آؤ۔ اس کے بعد 'ف' کے ساتھ، جو عربی میں نتیجہ کے بیان کے لیے آتی ہے، اس غم کا ذکر کیا ہے۔ اس سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ یہ غم پیغمبر کی ذات ہی سے

متعلق ہوگا تاکہ پیغمبرؐ کی جو ناقدری ان سے صادر ہوئی ہے اس پر ان کو تنبیہ کی جائے۔

آیت ۱۵۳ کا نظام

اس آیت کے نظام کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اوپر والی آیت پر پھر ایک نظر ڈال لیجیے۔ اوپر فرمایا تھا کہ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ یعنی خدا نے تمہاری خلاں خلاں غلطیوں اور نافرمانیوں کی وجہ سے تمھیں پسپا کر دیا تاکہ تمھیں ابتلاء میں ڈالے۔ اس کے بعد یہ واضح فرمادیا کہ یہ ابتلا میں ڈالنا اس لیے ہوا کہ خدا نے تم کو تمھاری غلطی پر سزا دینے کے بجائے یہ پسند فرمایا کہ تمھیں معاف کرے اور تم پر اپنا فضل فرمائے۔ اس کے بعد اِذْ تُصْعِدُوْنَ سے لے کر فَاَثَابَكُمْ غَمًّاۢ بِغَمٍّ تک اس ابتلا کی تفصیل ہے۔ پھر لِكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَآ اَصَابَكُمْ میں اس ابتلا کا وہ فائدہ مذکور ہوا ہے جو اہلِ ایمان کو حاصل ہو سکتا ہے اگر وہ اس کا حق ادا کریں۔

ابتلا کا مقصد

یہ امر محتاجِ بیان نہیں ہے کہ ابتلا خدا کا عذاب نہیں ہے بلکہ اس کی رحمت ہے۔ عذاب کفار پر آتا ہے اور ابتلا میں اہلِ ایمان مبتلا کیے جاتے ہیں۔ عذاب کا مقصد کفار کو مٹانا ہوتا ہے اور ابتلا کا مقصد اہلِ ایمان کو عقلی و اخلاقی کمزوریوں سے پاک کرنا۔ ایک موت ہے دوسرا زندگی۔ قانونِ الٰہی یہ ہے کہ جب تک اللہ تعالیٰ کسی قوم کو باقی رکھنا چاہتا ہے اس وقت تک وہ اس کے جرموں پر اس طرح کی سزا نہیں دیتا جس طرح کی سزا مجرموں اور باغیوں کو دی جاتی ہے بلکہ مختلف آزمائشوں اور امتحانوں کے ذریعہ سے اس کے اندر پیدا ہونے والی بیماریوں کو وہ دور فرماتا رہتا ہے۔ ہلاکت کے حوالہ وہ کسی قوم کو اسی وقت کرتا ہے جب وہ زندگی کے اصلی اوصاف سے بالکل خالی ہو جاتی ہے۔

احد کے ابتلا میں ازالۂ غم کے پہلو

رہا یہ سوال کہ احد کے اس ابتلا میں حزن سے بچانے والی کیا بات تھی تو اس کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے تو یہ بات یاد رکھیے کہ یہاں حزن سے مراد وہ عام رنج و غم نہیں ہے جو کسی موقع کے ضائع ہو جانے یا کوئی نقصان پہنچ جانے پر فطرتاً ہو جایا کرتا ہے بلکہ اس سے مراد وہ مایوسی اور دل شکستگی ہے جو انسان کے عزم و حوصلہ کو ختم کر کے رکھ دیتی ہے۔ اوپر آیت ۱۳۹ لَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا میں اسی حزن سے منع فرمایا ہے۔ یہ مایوسی اور دل شکستگی پیدا کرنے والے متعدد اسباب اس وقت موجود تھے جو اصلاح و علاج کے محتاج تھے۔ مثلاً یہ کہ مسلمانوں میں ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی تھا جو اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ جو شخص نبی ہو اس کو اور اس کے ساتھیوں کو لازماً ہر مہم میں کامیابی ہی حاصل ہونی چاہیئے، ان کے لیے شکست ان کے نزدیک ان کے تمام دعوے کو مشتبہ کر دینے کے مترادف تھی، اسی طرح ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی تھا جو اس وہم میں مبتلا تھا کہ جب ہم مسلمان ہیں اور پیغمبرؐ کا ساتھ ہم نے دیا ہے تو ہمیں اپنی غلطیوں کے خمیازے سے بالاتر ہونا چاہیئے، کچھ ایسے لوگ بھی تھے جن کا سارا اعتماد اپنی رائے اور اپنی تدبیروں پر ہی تھا، ان پر یہ حقیقت واضح نہیں تھی کہ اس دنیا میں تدبیر ہی کار فرما نہیں ہے بلکہ اصلی کار فرما تقدیر ہے۔ ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی تھا جو خدا کے بارے میں اس طرح کی بدگمانیوں میں مبتلا تھے جو زمانۂ جاہلیت کی باقیات میں

سے تھیں۔ ان تمام گروہوں کی طرف آگے کی آیات میں اشارات آرہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب اتنی ساری غلط فہمیاں اور خام خیالیاں مسلمانوں میں موجود تھیں تو ان کے ہوتے ہوئے ناممکن تھا کہ وہ ان حالات و مشکلات کا مقابلہ کر سکتے جن سے وہ ہر قدم پر دوچار تھے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ کی رحمت نے اس غزوۂ اُحد کے ابتلا کے ذریعہ سے مسلمانوں کو ان بہت سی خام خیالیوں سے پاک کر دیا جن سے نازک اوقات میں ان کے عزم و حوصلے کو تزلزل پیش آسکتا تھا۔ ان مضامین کو کھولنے والی جو آیتیں خود اس سورہ میں ہیں وہ بعض اوپر گزر چکی ہیں اور بعض آگے آرہی ہیں، البتہ سورۂ حدید کی ایک آیت ہم یہاں نقل کرتے ہیں، اس سے ایک نہایت اہم گوشے پر روشنی پڑتی ہے۔ مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ يَسِيْرٌ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰي مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِ (۲۲-۲۳) تمہیں جو مالی یا جانی تکلیف بھی پہنچتی ہے وہ ہم نے وجود میں لانے سے پہلے ایک کتاب میں لکھ رکھی ہے۔ یہ اللہ کے لیے ایک معمولی بات ہے، تاکہ تم غم نہ کرو اگر کوئی موقع تم سے کھو جائے اور نہ اتراؤ اس چیز پر جو اس نے تم کو بخشی ہے۔ اللہ اکڑنے والے اور فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔

ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَاۗىِٕفَةً مِّنْكُمْ ۙ وَطَاۗىِٕفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْھُمْ اَنْفُسُھُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ۭ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ۭ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ۭ يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِھِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ ۭ يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ۭ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِھِمْ ۚ وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (۱۵۴)

'امنۃ' کا مفہوم — جنگی نقطۂ نظر سے نیند کی اہمیت

'امنۃ' کے معنی راحت، سکون اور اطمینان کے ہیں۔ نعاس اونگھ اور نیند کو کہتے ہیں۔ یہاں یہ بدلیت کے طریقے پر امنۃ کی گویا وضاحت ہے۔ نیند، اطمینان و راحت کا ذریعہ بھی ہے اور دل کے اطمینان اور دماغ کی یکسوئی کی شہادت بھی۔ جس کا ذہن پریشان اور دماغ منتشر ہو اس کی نیند اڑ جایا کرتی ہے اور ایسے شخص کے لیے کوئی کام عزم و حوصلہ اور استقلال و عزیمت کے ساتھ کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے دورانِ جنگ میں فوج کے لیے سونے کا موقع ملنا اور اس موقع سے فائدہ اٹھانا نہایت ضروری ہوتا ہے۔ نیند کی اسی اہمیت کی وجہ سے دشمن فوج کے حوصلے کو پست کرنے والی تدابیر میں سے ایک تدبیر یہ بھی ہے کہ اس کو سونے کا موقع نہ دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کا بڑا ہی فضل ہوتا ہے اگر کسی فوج کو اس کا موقع ملے، اور وہ اس سے فائدہ بھی اٹھا سکے کیونکہ اس سے فائدہ اٹھا سکنا صرف موقع ملنے ہی پر منحصر نہیں ہے بلکہ اس کا بہت کچھ انحصار سونے والے کی ذہنی و قلبی صلاحیت پر بھی ہے۔ غزوہ بدر سے متعلق سورۂ انفال میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر جو احسانات گنائے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ جنگ سے پہلے والی

رات میں خوب سوئے اور اس طرح صبح کو لڑنے کے لیے خوب چاق و چوبند ہو گئے۔ یہاں آیت زیرِ بحث میں فرمایا ہے کہ ایک گروہ تو آرام سے سویا لیکن ایک دوسرے گروہ کو برابر اپنی جانوں کی پڑی رہی۔ اگرچہ دشمن واپس جا چکا تھا لیکن وہ اپنے خوف اور بزدلی کے سبب سے یہی سمجھتے رہے کہ ابھی وہ سر ہی پر کھڑا ہے۔

يَغْشٰى طَآئِفَةً میں حال کا صیغہ صورتِ حال کی تصویر کے لیے ہے یَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ میں ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ غیر الحق کی وضاحت ہے اور مقصود اس وضاحت سے ان کے خیال کے گھنونے پن کو ظاہر کرنا ہے کہ باوجودیکہ یہ لوگ مسلمان بنے پھرتے ہیں لیکن اب تک خدا کی صفات اور انسانی زندگی سے اس کے تعلق کے باب میں ان کے خیالات و تصورات وہی ہیں جو زمانہ جاہلیت کی تاریکی میں تھے یَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا الآیہ ان کے ظن جاہلیت کی ایک مثال بھی ہے اور وہ اپنے دل میں جو کچھ چھپائے ہوئے تھے اس کا اظہار و بیان بھی۔

'ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ' کا مفہوم

وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ کا معطوف علیہ حذف ہے اور اس طرح کے مواقع میں نہ صرف یہ کہ معطوف علیہ محذوف ہوتا ہے بلکہ بسا اوقات وہ چیز بھی محذوف ہوتی ہے جس کی ان صیغوں کے ذریعے سے علت بیان ہوتی ہے۔ اس کی مثال سورۂ حدید کی اس آیت میں بھی ہے جس کا ہم نے اوپر حوالہ دیا ہے۔ اگر سیاق و سباق کی روشنی میں اس محذوف کو کھول دیا جائے تو پوری بات گویا یوں ہوگی کہ اگر تم اپنی ہی رائے پر عمل کرتے جب بھی تم، اگر تمھاری موت مقدر ہو چکی ہوتی، اپنے آپ کو موت سے نہ بچا سکتے بلکہ انھی مقامات میں پہنچ کر قتل ہوتے جن مقامات میں تمھارا قتل ہونا اللہ نے لکھ رکھا ہے۔ لیکن یہ رسول کے ہاتھوں اللہ نے اس لیے کرایا کہ تمھارے دلوں میں یہ حسرت کا ایک کانٹا بنے اور تمھارے دلوں میں جو کمزوریاں ہیں وہ ابھر کر سامنے آئیں۔

حذف کی ایک مثال

یہ آیت بھی پوری کی پوری اُحد کی شکست سے ظاہر ہونے والے واقعات و حالات پر تبصرہ ہے۔ اور مقصود اس تبصرے سے، جیسا کہ اوپر واضح ہوا، یہ دکھانا ہے کہ نبی اور اہلِ ایمان کے لیے اللہ کی نصرت کا وعدہ برحق ہے لیکن جماعت کے اندر جو کمزوریاں چھپی ہوئی تھیں ان کا علاج بھی ضروری تھا۔ فرمایا کہ احد کی شکست کے بعد تم میں ایک گروہ تو بے شک ایسے لوگوں کا رہا جو خدا اور رسول سے شاکی اور بدگمان نہیں ہوا۔ اس نے اپنا حوصلہ قائم رکھا۔ اس نے اس افتاد کو جو پیش آئی جماعت ہی کی بعض خامیوں کا نتیجہ سمجھا۔ اور خدا کے فیصلے پر راضی رہا۔ چنانچہ بددل و ہراساں ہونے کے بجائے وہ خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے آنے والی شب میں اطمینان کے ساتھ سویا جو اس کی دل جمعی اور ایمانی مضبوطی کی ایک شہادت ہے۔ لیکن ساتھ ہی ایک دوسرا گروہ بھی تھا جسے برابر اپنی جانوں کی پڑی رہی، وہ خدا سے اس قسم کی بدگمانیوں میں مبتلا رہا جو ایمان و اسلام کے شایانِ شان نہیں بلکہ زمانۂ جاہلیت سے مناسبت رکھنے والی تھیں۔ اس کا خیال تھا کہ معاملات کے فیصلے کرنے میں پیغمبر استبداد اور خود رائی سے کام لیتے ہیں۔ ان کے مشوروں کی کوئی قدر نہیں کرتے۔ اگر ان

احد کے واقعات پر تبصرہ

کی رائے مان لی جاتی اور مدینہ کے اندر محصور ہو کر جنگ کی جاتی تو یہ افسوسناک صورت پیش نہ آتی اور ہم یہاں آ کر ذلت کے ساتھ قتل نہ ہوتے۔ ان کی تردید میں فرمایا کہ تمہارا یہ خیال بالکل غلط ہے۔ اگر تم اپنے گھروں میں بند ہوتے جب بھی جس کو جہاں مرنا تھا وہیں مرتا۔ یہ امور تمہاری تدبیر کے تابع نہیں بلکہ خدا کی مقدر کی ہوئی تقدیر کے تابع ہیں۔ تمہارے اندر چونکہ یہ کمزوریاں موجود تھیں اس وجہ سے اللہ نے چاہا کہ ایسے حالات پیش آئیں کہ تمہاری کمزوریاں ظاہر ہوں، تمہارے دلوں کی جانچ ہو اور تمہارے کھوٹ باہر آئیں۔ اللہ دلوں کے امراض اور ان کے علاج سے اچھی طرح واقف ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ یَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۙ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّیْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ۚ وَ لَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ (۱۵۵)

اوپر آیت ۱۲۲ کے تحت گزر چکا ہے کہ منافقین کی شرارت خاص کر ابن اُبی کے حوصلہ شکن طرز عمل سے کچھ کمزور قسم کے مسلمان بھی متاثر ہوئے جن میں سے کچھ تو فوراً ہی سنبھل گئے لیکن بعض سے کمزوری صادر ہو گئی۔ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے اگرچہ معاف فرما دیا اس لیے کہ بعد میں ان میں سے ہر شخص کو خود اپنی غلطی کا احساس ہو گیا، لیکن ساتھ ہی یہ واضح فرما دیا کہ ان کی کچھ پچھلی غلطیاں تھیں جن کے سبب سے شیطان نے ان کو ٹھوکر کھلائی۔ گناہ سے گناہ جنم لیتا ہے اور شیطان کے داؤں انھی لوگوں پر زیادہ آسانی سے کارگر ہوتے ہیں جن کے اندر گناہ کی کوئی جڑ موجود ہوتی ہے۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ جب آدمی سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو اس کو دل میں جگہ نہ پکڑنے دے بلکہ استغفار اور توبۂ نصوح کے ذریعہ سے اس کا استیصال کر دے، ورنہ اسی قسم کے لوگ ہوتے ہیں جو بڑی بڑی جماعتوں کے لیے وجہ ابتلا بن جاتے ہیں۔ اوپر آیاتِ قرآن کی روشنی میں یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ احد کے معرکے میں مسلمانوں کو جو ابتلا پیش آیا وہ بعض گروہوں کی اسی طرح کی کمزوریوں کے نتیجہ میں پیش آیا۔

۳۷۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۵۶-۱۸۹

جنگ اُحد سے پیدا شدہ حالات و خیالات پر جو تبصرہ اوپر سے چلا آ رہا ہے اسی سلسلے کی کچھ مزید باتیں ارشاد ہو رہی ہیں۔

آیات ۱۵۶-۱۸۹

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِی الْاَرْضِ اَوْ كَانُوْا غُزًّى لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَ مَا قُتِلُوْا ۚ لِیَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِیْ قُلُوْبِهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ یُحْیٖ

وَيُمِيْتُ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۵۶﴾ وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ
اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿۱۵۷﴾
وَلَئِنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِلَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۱۵۸﴾ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ
اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ
حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ
فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ﴿۱۵۹﴾
اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ
يَنْصُرُكُمْ مِّنْ بَعْدِهٖ ۗ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۶۰﴾ وَمَا
كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ ۗ وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ
ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۶۱﴾ اَفَمَنِ
اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ۗ
وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۶۲﴾ هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا
يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶۳﴾ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ
رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ
الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۶۴﴾
النصف
اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا ۙ قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ۗ
قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۶۵﴾
وَمَآ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيَعْلَمَ

الْمُؤْمِنِينَ ﴿١٦٦﴾ وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ نَافَقُوا ۚ وَقِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا
قَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَوِ ادْفَعُوا ۖ قَالُوا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا
لَاتَّبَعْنَاكُمْ ۗ هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ أَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْإِيمَانِ ۚ
يَقُولُونَ بِأَفْوَاهِهِمْ مَا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ ۗ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا
يَكْتُمُونَ ﴿١٦٧﴾ الَّذِينَ قَالُوا لِإِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوا لَوْ أَطَاعُونَا
مَا قُتِلُوا ۗ قُلْ فَادْرَءُوا عَنْ أَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ
صَادِقِينَ ﴿١٦٨﴾ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ
أَمْوَاتًا ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ ﴿١٦٩﴾ فَرِحِينَ بِمَا
آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ وَيَسْتَبْشِرُونَ بِالَّذِينَ لَمْ يَلْحَقُوا
بِهِمْ مِنْ خَلْفِهِمْ أَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿١٧٠﴾ وقف لازم
يَسْتَبْشِرُونَ بِنِعْمَةٍ مِنَ اللَّهِ وَفَضْلٍ وَأَنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ
الْمُؤْمِنِينَ ﴿١٧١﴾ الَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِلَّهِ وَالرَّسُولِ مِنْ بَعْدِ مَا
أَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۚ لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا أَجْرٌ عَظِيمٌ ﴿١٧٢﴾
الَّذِينَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ
فَزَادَهُمْ إِيمَانًا وَقَالُوا حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ ﴿١٧٣﴾
فَانْقَلَبُوا بِنِعْمَةٍ مِنَ اللَّهِ وَفَضْلٍ لَمْ يَمْسَسْهُمْ سُوءٌ
وَاتَّبَعُوا رِضْوَانَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ ذُو فَضْلٍ عَظِيمٍ ﴿١٧٤﴾ إِنَّمَا ذَٰلِكُمُ
الشَّيْطَانُ يُخَوِّفُ أَوْلِيَاءَهُ فَلَا تَخَافُوهُمْ وَخَافُونِ إِنْ

كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۵﴾ وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِۚ
اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ۭ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا
فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ
بِالْاِيْمَانِ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۷﴾ وَ
لَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ ۭ
اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۱۷۸﴾ مَا
كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰي مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰي يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ
مِنَ الطَّيِّبِ ۭ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَي الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ
يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَاِنْ
تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۹﴾ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ
يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىھُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ھُوَ خَيْرًا لَّھُمْ ۭ بَلْ ھُوَ
شَرٌّ لَّھُمْ ۭ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَلِلّٰهِ
مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۸۰﴾ ع ۱۸
لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّ
نَحْنُ اَغْنِيَاۗءُ ۘ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا وَقَتْلَھُمُ الْاَنْۢبِيَاۗءَ (وقف لازم)
بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّنَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۱۸۱﴾ ذٰلِكَ بِمَا
قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۱۸۲﴾ۚ
اَلَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَآ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰي

يَأْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَأْكُلُهُ النَّارُ ۗ قُلْ قَدْ جَآءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ
قَبْلِىْ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالَّذِىْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ اِنْ كُنْتُمْ
صٰدِقِيْنَ ﴿۱۸۳﴾ فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ
جَآءُوْ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ﴿۱۸۴﴾ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ
الْمَوْتِ ۗ وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۗ فَمَنْ زُحْزِحَ
عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ۗ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ
اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿۱۸۵﴾ لَتُبْلَوُنَّ فِىْٓ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۗ وَلَتَسْمَعُنَّ
مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا
اَذًى كَثِيْرًا ۗ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۱۸۶﴾
وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ
وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ ۡ فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهٖ
ثَمَنًا قَلِيْلًا ۗ فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُوْنَ ﴿۱۸۷﴾ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ
يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا
تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۸۸﴾
وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۗ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۸۹﴾ ع ۱۹ / ۹ / ۱۰

ترجمۂ آیات ۱۵۶-۱۸۹

اے ایمان والو! ان لوگوں کے مانند نہ بن جانا جنھوں نے کفر کیا اور جو اپنے بھائیوں
کے بابت، جبکہ وہ سفر یا جہاد میں نکلتے ہیں اور ان کو موت آجاتی ہے، کہتے ہیں کہ اگر
وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے، نہ قتل ہوتے۔ یہ خیال ان کے اندر اس لیے پیدا

ہوا کہ اللہ اس کو ان کے دلوں میں باعث حسرت بنا دے۔ اللہ ہی ہے جو جلاتا اور مارتا ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو وہ خدا کی نگاہوں میں ہے۔ اور اگر تم اللہ کی راہ میں قتل ہو گے یا مر گے تو وہ مغفرت اور رحمت جو تمہیں اللہ کی طرف سے حاصل ہو گی اس سے کہیں بہتر ہے جو یہ جمع کر رہے ہیں۔ اور تم مرو یا قتل ہو، بہر حال اللہ ہی کے پاس اکٹھے کیے جاؤ گے۔ ۱۵۶-۱۵۸

یہ اللہ ہی کا فضل ہے کہ تم ان کے لیے نرم خو ہو۔ اگر تم درشت خو اور سخت دل ہوتے تو تمھارے پاس سے یہ منتشر ہو جاتے، سو ان سے درگزر کرو، ان کے لیے مغفرت چاہو اور معاملات میں ان سے مشورہ لیتے رہو، پس جب تم فیصلہ کر لو تو اللہ پر بھروسہ کرو۔ بے شک اللہ اپنے اوپر بھروسہ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ اگر اللہ تمھاری مدد فرمائے گا تو کوئی تم پر غالب نہیں ہو سکتا اور اگر وہ چھوڑ دے گا تو اس کے بعد کون ہے جو تمھاری مدد کر سکے اور اللہ ہی کے اوپر چاہیئے کہ بھروسہ کریں اہلِ ایمان۔ ۱۵۹-۱۶۰

اور ایک نبی کی شان سے بعید ہے کہ وہ بدخواہی کرے اور جو کوئی بدخواہی کرے گا تو قیامت کے دن وہ اپنی بدخواہی سمیت پیش ہو گا۔ پھر ہر جان کو اس کی کمائی کا پورا پورا بدلہ ملے گا اور ان کے ساتھ کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔ کیا وہ جو خدا کی خوشنودی کا طالب ہو، اس کے مانند ہو جائے گا جو خدا کا غضب لے کر لوٹا اور جس کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ کیا ہی بُرا ٹھکانا ہے! خدا کے ہاں ان کے درجے الگ الگ ہوں گے۔ یہ جو کچھ کر رہے ہیں خدا اس کو دیکھ رہا ہے۔ ۱۶۱-۱۶۳

یہ اللہ نے مومنین پر احسان فرمایا ہے کہ ان میں انھی میں سے ایک رسول مبعوث فرمایا جو ان کو اس کی آیتیں سناتا ہے، ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو شریعت اور حکمت

کی تعلیم دیتا ہے۔ بے شک یہ اس سے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔ ۱۶۴

اور کیا جب تمھیں ایک مصیبت پہنچی جس کی دو نی مصیبت تم نے پہنچائی تو تم نے کہا کہ یہ کہاں سے آگئی؟ کہہ دو یہ تمھارے اپنے ہی پاس سے ہے۔ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اور دونوں جماعتوں کی مڈ بھیڑ کے دن تمھیں جو مصیبت پہنچی یہ اللہ کے حکم سے پہنچی اور تاکہ اللہ ایمان والوں کو ممیز کردے اور ان منافقین کو بھی ممیز کردے جن سے کہا گیا کہ آؤ اللہ کی راہ میں جنگ کرو یا دشمن کو دفع کرو۔ انھوں نے کہا کہ اگر ہمیں اندازہ ہوتا کہ جنگ ہونی ہے تو ہم ضرور تمھارے ساتھ ہوتے۔ یہ لوگ اس دن ایمان کی بہ نسبت کفر سے زیادہ قریب تھے۔ یہ اپنے منہ سے وہ بات کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہے اور اللہ اس چیز کو خوب جانتا ہے جس کو یہ چھپاتے ہیں۔ یہ ہیں جو خود تو بیٹھے رہے اور اپنے بھائیوں کی نسبت کہا کہ اگر وہ ہماری بات مانتے تو یوں نہ قتل ہوتے۔ ان سے کہہ دو کہ اگر تم اپنی اس بات میں سچے ہو تو خود اپنے آپ سے موت کو دفع کرلو۔ اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں ان کو مردہ نہ خیال کرو۔ بلکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں، انھیں روزی مل رہی ہے، فرحاں و شاداں ہیں اس پر جو اللہ نے اپنے فضل میں سے ان کو دے رکھا ہے اور ان لوگوں کے باب میں بشارت حاصل کر رہے ہیں جو ان کے اخلاف میں سے اب تک ان سے نہیں ملے ہیں کہ ان پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ وہ بشارت حاصل کر رہے ہیں اللہ کی نعمت اور اس کے فضل کی اور اس بات کی کہ اللہ اہلِ ایمان کے اجر کو ضائع نہیں کرے گا۔ ان اہلِ ایمان کے اجر کو جنھوں نے چوٹ کھانے کے بعد بھی اللہ اور رسول کی پکار پر لبیک کہی۔ ان میں سے جنھوں نے بھی خوبی کے ساتھ کام کیے اور جو تقویٰ کی راہ چلے

ہیں ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔ یہ وہ ہیں کہ جن کو لوگوں نے سنایا کہ دشمن نے تمہارے لیے بڑی طاقت اکٹھی کی ہے تو اس سے ڈرو تو اس چیز نے ان کے ایمان میں اور اضافہ کر دیا اور وہ بولے کہ اللہ ہمارے لیے کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔ سو یہ لوگ اللہ کی نعمت اور اس کے فضل کے ساتھ واپس آئے، ان کو ذرا گزند نہ پہنچا، اور یہ اللہ کی خوشنودی کے طالب ہوئے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔ یہ شیطان ہے جو اپنے رفیقوں کے ڈراوے دے رہا ہے تو تم ان سے نہ ڈرو، مجھی سے ڈرو، اگر تم مومن ہو۔ ۱۷۲-۱۷۵

اور یہ لوگ تمہارے لیے باعثِ غم نہ بنیں جو کفر کی راہ میں سبقت کر رہے ہیں۔ یہ اللہ کو ہرگز کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں گے۔ اللہ چاہتا ہے کہ ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہ رکھے۔ ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔ بے شک جنھوں نے ایمان سے کفر کو بدلا وہ اللہ کا کچھ بھی نہ بگاڑیں گے اور ان کے لیے ایک دردناک عذاب ہے۔ اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے یہ نہ گمان کریں کہ یہ جو ہم ان کو ڈھیل دے رہے ہیں تو یہ ان کے حق میں کوئی بہتر بات ہے، ہم تو بس اس لیے ڈھیل دے رہے ہیں کہ وہ گناہ میں کچھ اور اضافہ کر لیں اور ان کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔ ۱۷۶-۱۷۸

اللہ یہ نہیں کر سکتا تھا کہ مسلمانوں کو، جس حال پر تم تھے اسی پر، خبیث کو طیب سے الگ کیے بغیر، چھوڑے رکھے اور نہ یہ کر سکتا تھا کہ وہ تمہیں سارے غیب سے باخبر کر دے بلکہ اللہ اس کام کے لیے اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے منتخب کر لیتا ہے تو اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور اگر تم ایمان لائے اور تم نے تقویٰ اختیار کیا تو تمہارے لیے بہت بڑا اجر ہے۔ ۱۷۹

اور جو لوگ بخالت کرتے ہیں اس چیز میں جو اللہ ہی نے ان کو اپنے فضل میں سے بخشی ہے، یہ نہ خیال کریں کہ یہ ان کے حق میں بہتر ہے۔ بلکہ یہ ان کے حق میں بہت برا ہے۔ جس چیز میں وہ بخالت کریں گے اس کا قیامت کے دن ان کو طوق پہنایا جائے گا۔ اور اللہ ہی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین کی وراثت اور اللہ جو کچھ تم کر رہے ہو اس سے باخبر ہے۔ اللہ نے ان لوگوں کی بات سن رکھی ہے جنھوں نے کہا کہ اللہ محتاج ہے اور ہم غنی ہیں۔ ہم ان کی اس بات کو بھی لکھ رکھیں گے اور ساتھ ہی ان کے ناحق قتلِ انبیا کو بھی، اور کہیں گے کہ اب چکھو عذاب آگ کا۔ یہ تمھارے اپنے ہی ہاتھوں کی کرتوت ہے، اللہ اپنے بندوں کے ساتھ ذرا بھی ناانصافی کرنے والا نہیں۔ ۱۸۰-۱۸۲

جنھوں نے کہا کہ اللہ نے ہمیں یہ ہدایت کر رکھی ہے کہ ہم اس وقت تک کسی رسول کی بات باور نہ کریں جب تک یہ وہ قربانی نہ پیش کرے جس کو کھانے کے لیے آگ اُترے، ان سے کہو کہ مجھ سے پہلے تمھارے پاس رسول کھلی کھلی نشانیاں اور وہ چیز بھی لے کر آئے جس کے لیے تم کہہ رہے ہو تو تم نے ان کو قتل کیوں کیا، اگر تم سچے ہو؟ پس اگر یہ تمھاری تکذیب کرتے ہیں تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں، تم سے پہلے بھی رسولوں کی تکذیب ہو چکی ہے جو کھلی ہوئی نشانیاں، صحیفے اور روشن کتاب لے کر آئے۔ ہر جان کو موت کا مزا چکھنا ہے اور تم پورا پورا اجر تو بس قیامت ہی کے دن پاؤ گے۔ پس جو دوزخ سے بچا یا گیا اور جنت میں داخل کیا گیا وہ کامیاب رہا اور یہ دنیا کی زندگی تو بس دھوکے کا سودا ہے۔ ۱۸۳-۱۸۵

تمھارے مال اور تمھاری جان میں تمھاری آزمائش ہونی ہے اور تمھیں ان لوگوں کی

طرف سے جن کو تم سے پہلے کتاب ملی اور ان لوگوں کی طرف سے جنھوں نے شرک کیا بہت سی تکلیف دہ باتیں سننی پڑیں گی۔ اور اگر تم ثابت قدم رہے اور تم نے تقویٰ کو ملحوظ رکھا تو بے شک یہ چیز عزیمت کے احوال میں سے ہے۔ ۱۸۶

اور یاد کرو جب کہ اللہ نے ان لوگوں سے عہد لیا جن کو کتاب دی گئی کہ تم لوگوں کے سامنے اس کتاب کو اچھی طرح ظاہر کرنا، اسے چھپانا مت تو انھوں نے اس کو پس پشت ڈال دیا اور اس کے بدلے میں ایک حقیر قیمت لے لی، کیا ہی بری ہے وہ چیز جسے وہ لے رہے ہیں۔ جو لوگ اپنی ان کرتوتوں پر مگن ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کاموں پر ان کو سراہا جائے جو انھوں نے کیے نہیں ان کو عذاب سے بری نہ سمجھو، ان کے لیے ایک دردناک عذاب ہے۔ اور اللہ ہی کے لیے آسمان و زمین کی بادشاہی ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۱۸۷-۱۸۹

۳۸- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِي الْاَرْضِ اَوْ كَانُوْا غُزًّى لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا ۚ لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۗ وَاللّٰهُ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۝ وَلَئِنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِ۟لَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ (۱۵۶-۱۵۸)

لِ کا مفہوم　'وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ' میں 'لِ' اس طرح کا ہے جس طرح 'وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُوْنَآ اِلَيْهِ' (اور جن لوگوں نے کفر کیا وہ ایمان لانے والوں کے بارے میں کہتے ہیں کہ اگر یہ نئی دعوت کوئی خیر و برکت والی چیز ہوتی تو یہ لوگ اس کی طرف ہم سے سبقت نہیں کر سکتے تھے) میں ہے۔ یعنی بابت اور متعلق کے معنی میں۔ 'اخوان' سے مراد بھائی بند اور تعلق و رشتہ کے لوگ ہیں۔ 'غُزًّى' غازی کی جمع ہے۔ 'لِيَجْعَلَ' سے پہلے اس کا متعلق محذوف ہے۔ یعنی یہ بات جو ان کے ذہن میں گھسی ہوئی ہے یہ اس لیے گھسی ہوئی ہے کہ ان کی منافقت کی وجہ سے اللہ یہ چاہتا ہے کہ یہ بدعقیدگی ان کے دلوں میں خار غم بن کر کھٹکتی رہے۔ اس قسم کے حذف کی مثالیں گزر چکی ہیں۔

موت اور زندگی خدا کے اختیار میں ہے

یہ مسلمانوں کو نصیحت کی جا رہی ہے کہ کفار و منافقین کی روش کی تقلید سے اپنے آپ کو محفوظ رکھو۔ ان کی بزدلی کی اصلی وجہ ان کی یہ بدعقیدگی ہے کہ وہ موت اور زندگی کو اپنی تدبیروں کے تحت سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ان کے بھائی بندوں میں سے کوئی کسی سفر یا جنگ میں مارا جائے تو بڑی حسرت کے ساتھ کہتے ہیں کہ اگر ہمارے پاس ہوتا یا ہمارے مشورے پر عمل کرتا تو یہ افتاد اس کو پیش نہ آتی۔ چنانچہ یہی بات انھوں نے جنگِ اُحد کے مقتولوں کے بارے میں بھی کہی۔ حالانکہ موت و زندگی کا معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے زندگی دیتا ہے، جس کو چاہتا ہے موت دیتا ہے۔ اس نے جس کی موت جس وقت، جس مقام اور جس شکل میں لکھ رکھی ہے وہ آ کے رہے گی اگرچہ وہ اپنے آپ کو آہنی قلعوں کے اندر بند کر چھوڑے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنی تدبیروں سے موت کو ٹال سکتے ہیں وہ اس وہم سے ایک دائمی خلشِ غم اور بزدلی کے سوا کچھ نہیں حاصل کر سکتے۔ اہلِ ایمان کو چاہیے وہ اپنے آپ کو اس فتنہ سے محفوظ رکھیں۔ زندگی اور موت خدا ہی کے اختیار میں ہے اور وہ ہمارے ہر عمل کو قدم قدم پر دیکھ رہا ہے۔

مزید حوصلہ افزائی کے لیے ارشاد ہوا کہ اگر تم کو خدا کی راہ میں شہادت حاصل ہوئی یا کسی اور طرح سے موت آگئی تو یہ چیز غم کرنے کی نہیں ہے اس لیے کہ اس کے صلے میں جو مغفرت و رحمت تمھیں حاصل ہوگی وہ ان تمام فانی ذخیروں سے کہیں بہتر ہے جو اس زندگی کے پرستار اپنے لیے جمع کر رہے ہیں۔

یہ ملحوظ رہے کہ یہ آیت تہور کی دعوت نہیں دے رہی ہے بلکہ اس حقیقت سے آگاہ کر رہی ہے کہ فرائض سے فرار زندگی بچانے کی کوئی تدبیر نہیں ہے۔ آدمی کے لیے صحیح روش یہ ہے کہ جو فرض جب عائد ہو جائے پورے عزم و حزم کے ساتھ اس کو ادا کرے اور یہ یقین رکھے کہ موت اس وقت آئے گی جب اس کا وقت مقرر ہے اور ساتھ ہی یہ بھی یقین رکھے کہ ادائے فرض کی راہ میں مرنا اس دنیا کی زندگی اور اس زندگی کے تمام اندوختوں سے کہیں زیادہ قیمتی ہے۔ اس مضمون کی مزید وضاحت آگے آیات ۱۶۷-۱۷۱ کے تحت آ رہی ہے۔

آخر میں فرمایا کہ جو مرتا یا قتل ہوتا ہے بہرحال خدا ہی کے پاس پہنچتا ہے تو مومن خدا کے قرب سے کیوں گھبرائے۔ یہی تو قربانی کی حقیقت اور اس کا اصل مدعا ہے!

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ۝ اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ۭ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ (۱۵۹-۱۶۰)

'فَبِمَا رَحْمَةٍ' میں زبان کا وہی اسلوب استعمال ہوا ہے جو فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ میں ہے۔ اہلِ نحو اس طرح کے مواقع میں عموماً 'ما' کو تاکید کے مفہوم میں لیتے ہیں۔ ہمارے نزدیک بعض مواقع میں یہ محض نقرے

کے آہنگ کو ٹھیک رکھنے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

خظا کا مفہوم

'فظ' کے معنی درشت خو اور غلیظ القلب کے معنی سخت دل کے ہیں۔

منافقین کے بارے میں آنحضرت صلعم کے رویہ کی تصویب

یہ آیت بطور التفات وارد ہوئی ہے۔ اوپر سخت الفاظ میں منافقین پر جو تنقید ہوئی ہے اس کا اثر نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اور پھر قدرتی طور پر باحمیت مسلمانوں پر یہ پڑ سکتا تھا کہ آپؐ کا اور آپؐ کے مخلص صحابہؓ کا رویہ ان کے بارے میں سخت ہو جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے اس مرحلے میں یہ پسند نہیں فرمایا کہ یہ تبدیلی واقع ہو۔ اگرچہ منافقین کی روش نہایت قابل اعتراض تھی، وہ حضورؐ کی رافت اور چشم پوشی سے بہت غلط فائدہ اٹھا رہے تھے لیکن یہ مریض تھے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے یہی پسند فرمایا کہ ابھی ان کو اصلاح حال کی مزید مہلت دی جائے تاکہ جن کے اندر ادنیٰ گنجائش بھی اصلاح پذیری کی باقی ہے وہ اپنی اصلاح کر سکیں۔ چنانچہ اس حکمت کے پیش نظر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی کریمانہ طرز عمل کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے تائید و تصویب فرما دی گئی جواب تک ان لوگوں کے ساتھ رہا تھا اور اس کی مصلحت بھی واضح فرما دی گئی کہ یہ منافقین اپنی صحت اور اصلاح کے اتنے قدردان نہیں ہیں کہ اس کے لیے کوئی تلخ گھونٹ برداشت کر سکیں، یہ تو اللہ کی عنایت ہی تھی کہ اس نے تم کو نہایت نرم خو اور حلیم بنایا اور تم نے اسی نرم خوئی اور اسی رافت و شفقت کے ساتھ ان کی اصلاح کی کوشش کی۔ اگر تم ذرا بھی ان کے ساتھ سخت گیری کی روش اختیار کرتے تو یہ ایسے وحشی اور ناقدرے ہیں کہ تمہارے پاس سے بھاگ کھڑے ہوتے، اگرچہ دنیا جہان کے روگ ان کے ساتھ چمٹے رہتے، تو ان کے ساتھ ابھی اپنی رافت و رحمت کی یہی روش قائم رکھو، ان کی ناقدریوں سے درگزر کرو اور ان کے لیے اللہ سے استغفار کرتے رہو۔

یہ ملحوظ رہے کہ بعد میں جب منافقین کے ایک گروہ نے اپنے رویہ سے بالکل مایوس کر دیا اور یہ بات واضح ہو گئی کہ چشم پوشی کی روش سے یہ لوگ اصلاح قبول کرنے والے نہیں ہیں تو آخر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اور مسلمانوں کو بھی ہدایت ہوئی کہ ان لوگوں کے بارے میں اپنے رویے کو بدل دیں اور نرمی سے اگر یہ غلط فائدہ اٹھا رہے ہیں تو سختی سے ان کو صحیح راہ پر لائیں۔ اس پر مفصل بحث توبہ کی آیات ۷۳، ۱۲۳ اور تحریم کی آیت ۹ کے تحت آئے گی۔

یہاں عفو اور استغفار کی ہدایت کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت بھی ہوئی کہ وَشَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ یعنی معاملات میں ان سے مشورہ لیتے رہو۔ اس بات کے ذکر کا یہاں ایک خاص موقع ہے جس کو مختصراً سمجھ لینا چاہیے۔

اسلامی نظام میں شورائیت کا درجہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم معاملاتِ دین میں کسی کے مشورے کے محتاج نہیں تھے اس لیے کہ آپؐ ہر کام وحی الٰہی کی رہنمائی میں کرتے تھے لیکن سیاسی و انتظامی معاملات میں آپؐ اپنے صحابہؓ سے برابر مشورہ کرتے رہتے تھے اور اس طرح گویا حضورؐ نے خود اپنے طرز عمل سے اس شورائیت کی بنیاد ڈالی جو اسلام کے سیاسی

نظام کی ایک بنیادی خصوصیت رہی ہے۔ اسی شوریٰت کے پیش نظر آپ نے غزوۂ احد کے موقع پر بھی، جس کے اثرات و نتائج بیان زیر بحث ہیں، صحابہؓ سے مشورہ کیا کہ دشمن کا مقابلہ شہر کے اندر سے کیا جائے یا باہر نکل کر۔ مقصود اس مشورے سے، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں، یہ تھا کہ جماعت کے اندر جو کمزور لوگ ہیں وہ کھل کر سامنے آ جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جو کمزور اور منافق قسم کے لوگ تھے انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ شہر کے اندر محفوظ ہو کر مقابلہ کیا جائے اور اس سے ان کا مقصود یہ تھا کہ اس طرح وہ اپنی کمزوری اور نفاق کو چھپانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ لیکن مخلصین اور جاں نثاروں کی رائے اس کے خلاف ہوئی اور یہی رائے صائب اور حضورؐ کی رائے کے مطابق تھی، اس وجہ سے حضورؐ نے اسی رائے پر عمل فرمایا[۱]۔ منافقین کو جب اپنا مشورہ منوانے میں ناکامی ہوئی تو انھوں نے مختلف طریقوں سے اپنا غصہ نکالا۔ ایک گروہ تو یہ بہانہ بنا کر عین موقع پر فوج سے الگ ہو گیا کہ اس کے مشورے کی قدر نہیں کی گئی۔ دوسرا گروہ جو بادلِ ناخواستہ ساتھ رہا، اس نے شکست کے بعد مسلمانوں میں یہ بددلی پھیلانا شروع کر دی کہ جنگ کا یہ نتیجہ اس وجہ سے نکلا کہ اس کے مشورے کی قدر نہیں کی گئی، اگر ان کی رائے مان لی جاتی تو یہ افتاد پیش نہ آتی۔ ظاہر ہے کہ ان تمام باتوں کا مقصود شرارت اور مسلمانوں میں بددلی پھیلانا تھا لیکن اس مرحلے میں مصلحت، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، یہی تھی کہ ان منافقین سے درگزر کی

---

[۱] تاریخ و سیرت کی کتابوں میں یہ بات جو نقل ہوئی ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے بھی یہی تھی کہ مدینہ کے اندر محصور رہ کر دشمن کا مقابلہ کیا جائے لیکن پُرجوش صحابہؓ نے آپ کو نکلنے پر مجبور کر دیا، یہ بالکل بے ثبوت بات ہے۔ آنحضرت صلعم نے جس وقت لوگوں کے سامنے یہ مسئلہ رکھا اس کے بارے میں خود اپنی رائے ظاہر نہیں فرمائی تاکہ ہر شخص آزادی کے ساتھ اپنی رائے ظاہر کر سکے اور مقصود اس سے لوگوں کے حوصلہ کا جائزہ لینا تھا تاکہ جنگ سے پہلے فوج کی صحیح صحیح حالت کا اندازہ ہو جائے۔ عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں نے شہر کے اندر سے مقابلہ پر اصرار کیا اور جاں نثاروں نے باہر نکل کر۔ آپ نے اس تدبیر سے جب کمزوروں اور حوصلہ مندوں کا اندازہ فرما لیا تو گھر کے اندر داخل ہوئے اور اسلحہ پہن کر باہر تشریف لائے۔ یہ اس امر کا اظہار تھا کہ مقابلہ باہر نکل کر کرنا ہے۔ جاں نثاروں کو بطور خود یہ گمان ہوا کہ مبادا حضورؐ نے یہ رائے ان کے اصرار کی وجہ سے اختیار فرمائی ہو اس وجہ سے انھوں نے معذرت کے ساتھ اپنی رائے واپس لینی چاہی۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ نبی ہتھیار پہن کر اتارا نہیں کرتا۔ یعنی اب جب کہ عزم ہو چکا تو یہ بدل نہیں سکتا۔ جب منافقین نے دیکھا کہ ان کی بات نہیں چلی تو عبداللہ بن ابی اپنے تین سو ساتھیوں کے ساتھ الگ ہو گیا۔ یہ واضح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی اہم جنگ کے لیے نکلنے سے پہلے فوج کے حوصلے کا اندازہ کرنے کے لیے کوئی حکیمانہ تدبیر ضرور اختیار فرماتے تھے۔ بدر کے موقع پر بھی آپ نے یہ تدبیر اختیار فرمائی تھی اور اسی موقع پر انصار کے لیڈر نے وہ تقریر کی تھی جو اسلام کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رہے گی۔

روش اختیار کی جائے اور جو مجلسی اور جماعتی حقوق ان کو حاصل ہیں وہ ان کی ان غلطیوں کے باوجود بھی ابھی باقی رہیں۔ چنانچہ جس طرح حضورؐ کو ان کے لیے عفو و استغفار کی ہدایت ہوئی اسی طرح اس بات کی بھی ہدایت ہوئی کہ جو امور مشورہ کے تحت آتے رہیں ان میں آپ بدستور ان سے مشورہ لیتے رہیں۔ اگرچہ ان کی کمزوری اور بدخواہی واضح ہو چکی ہے۔

اکثریت اور اقلیت کے باب میں صحیح نقطۂ نظر

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ کے بعد فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ سے یہ اشارہ بھی نکلتا ہے کہ انتظامی و سیاسی امور میں مشورے کی یہ ہدایت صاحبِ امر کی تقویت اور اس کے اطمینان کے پہلو سے ہے۔ مشورہ کرنا تو بہرحال ضروری ہے لیکن مشورے کے بعد جس بات پر اس کا دل ٹھک جائے اللہ کے بھروسے پر وہ کام اسے کر گزرنا چاہیے۔ صاحبِ امر کے اطمینان کے بعد یہ امر کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا کہ جو رائے اس نے اختیار کی وہ اکثریت کی ہے یا اقلیت کی۔ نہ اکثریت فی نفسہٖ دلیلِ صحت و صواب ہے نہ اقلیت دلیل خطا۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ اکثریت کی رائے میں فی الجملہ صحت کا گمان غالب ہے۔ اس وجہ سے فصل نزاعات میں اگر اس کو فیصلہ کن مانا جائے تو مصلحت کے پہلو سے یہ راہ مامون ہے۔ بالخصوص اس زمانے میں جب کہ اتباعِ ہوا کا زور ہے اور اختیار و اقتدار کو حدود کے اندر استعمال کرنے والے لوگ کم رہ ہی ہیں۔

چند نکات

مذکورہ بالا دونوں آیتوں سے مندرجہ ذیل باتیں سامنے آتی ہیں۔

ایک یہ کہ عام افراد کی طرح اربابِ اقتدار و سیاست کے لیے بھی پسندیدہ روش نرمی و چشم پوشی ہی کی روش ہے۔ اسی سے افراد میں حسنِ ظن اور اعتماد پیدا ہوتا ہے جس سے اجتماعی نظام میں وحدت، قوت اور استحکام کی برکتیں ظہور میں آتی ہیں۔ سختی اور سخت گیری اس کی فطرت میں نہیں بلکہ اس کے عوارض میں سے ہے۔ جس طرح صحت کے لیے اصل شے غذا ہے لیکن کبھی کبھی کسی مرض کے علاج کے لیے دوا کی بھی ضرورت پیش آجاتی ہے اسی طرح اجتماعی نظام میں اصل چیز نرمی ہے۔ سختی کبھی کبھی ضرورت کے تحت اختیار کرنی پڑتی ہے۔

دوسری یہ کہ اجتماعی نظام میں شورائیت اس حسنِ ظن و اعتماد کا مظہر ہے جو راعی اور رعایا اور امیر و مامور میں ہونا چاہیے۔ اسی سے استبداد اور سخت دلی کی جڑ کٹتی ہے اور راعی اور رعایا دونوں طرف سے وہ تعاون ظہور میں آتا ہے جو استحکام کی بنیاد ہے۔

تیسری یہ کہ توکل، بے عملی اور تعطل کا کوئی بہانہ اور گوشۂ خمول کا کوئی تکیہ نہیں ہے بلکہ انفرادی و اجتماعی زندگی کی تمام سرگرمیوں میں عزم و عمل کی بنیاد ہے۔

چوتھی یہ کہ اصل قوت توکل علی اللہ ہے۔ وسائل و اسباب کی حیثیت ثانوی ہے۔

پانچویں یہ کہ توکل ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔ جو شخص خدا پر ایمان کا مدعی ہے لیکن اس کو خدا پر بھروسہ نہیں ہے اس کا ایمان بے معنی ہے۔

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَغُلَّ ۚ وَمَنْ يَغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ۝ أَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللَّهِ كَمَنْ بَاءَ بِسَخَطٍ مِنَ اللَّهِ وَمَأْوَاهُ جَهَنَّمُ ۚ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ۝ هُمْ دَرَجَاتٌ عِنْدَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُونَ (۱۶۱-۱۶۳)

لفظ غلّ کا صحیح مفہوم

غلّ یغلّ غلولاً کے معنی خیانت، بدعہدی اور بے وفائی کرنے کے ہیں۔ یہ لفظ دراصل لفظ نصح کا ضد ہے جس کے معنی خیر خواہی اور خیر سگالی کے ہیں۔ اصحاب لغت میں سے زجاج نے مَاكَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَغُلَّ کی تشریح، جیسا کہ صاحب لسان العرب نے تصریح کی ہے، مَاكَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَخُونَ أُمَّتَهُ کے الفاظ سے کی ہے۔ لفظ غلّ جو قرآن میں متعدد جگہ استعمال ہوا ہے، غش، عداوت، ضغن (کینہ) حقد اور حسد کے معنی میں استعمال ہوا ہے (لَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِلَّذِينَ آمَنُوا) اس لفظ کو صرف مالی خیانت کے ساتھ مخصوص کرنے کی کوئی دلیل میرے علم میں نہیں آئی۔

آنحضرت صلعم پر منافقین کا الزام اور اس کا جواب

یہ منافقین کے اس الزام کی تردید ہے جو انھوں نے احد کی شکست کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر لگایا اور جس کو مسلمانوں کے اندر بددلی پیدا کرنے کے ارادے سے اچھی طرح پھیلایا۔ الزام یہ تھا کہ ہم نے تو اس شخص پر اعتماد کیا، اس کے ہاتھ پر بیعت کی، اپنے نیک و بد کا اس کو مالک بنایا لیکن یہ اس اعتماد سے بالکل غلط فائدہ اٹھا رہے ہیں اور ہمارے جان و مال کو اپنے ذاتی حوصلوں اور امنگوں کے لیے تباہ کر رہے ہیں۔ ہم نے تو واضح طور پر یہ مشورہ دیا تھا کہ شہر کے اندر رہ کر دشمن کا مقابلہ کیا جائے لیکن انھوں نے ہمارے مشوروں کی اور ہمارے بھائیوں کی جانوں کی کوئی قدر و قیمت نہ سمجھی اور ان کو ایک بالکل نامناسب مقام میں لے جا کر دشمن سے تہ تیغ کرا دیا، یہ صریحاً قوم کی بدخواہی اور اس کے ساتھ غداری و بے وفائی ہے۔

اس الزام کی طرف اوپر کی آیات میں بھی اشارات موجود ہیں اور آگے بھی اس کی وضاحت آئے گی۔ قرآن نے یہ ان کے اس الزام کی تردید فرمائی ہے کہ تمہارا یہ الزام بالکل جھوٹ ہے۔ کوئی نبی اپنی امت کے ساتھ کبھی بے وفائی و بدعہدی نہیں کرتا۔ نبی جو قدم بھی اٹھاتا ہے رضائے الٰہی کی طلب میں اور اس کے احکام کے تحت اٹھاتا ہے۔ وہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہوتا کہ ہر بدعہدی و بے وفائی خدا کے حضور پیش ہوگی اور یہ بدعہد اپنے کیے کی پوری پوری سزا بھگتے گا۔ رضائے الٰہی کے طالب اور اس کے قہر و غضب کے سزاوار یکساں نہیں ہوں گے۔ ان کے درجے اور ٹھکانے ان کے اعمال کے مطابق الگ الگ ہوں گے۔ اللہ ہر ایک کے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔

آیت کی یہ تاویل الفاظ قرآن اور نظم کلام کے مطابق ہے۔ ارباب تاویل میں سے بھی بعض لوگوں نے، جیسا کہ تفسیر ابن جریر سے واضح ہوتا ہے، یہی تاویل اختیار کی ہے۔ اسی وجہ سے اس روایت کو زیادہ اہمیت دینے کی ضرورت نہیں ہے جو تفسیر کی کتابوں میں نقل ہوئی ہے کہ مال غنیمت میں سے ایک چادر گم ہو گئی تھی جس کا الزام منافقین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر لگایا تھا اور یہ اس کی تردید ہے۔ اول تو یہ روایت بجائے

کے مال غنیمت سے متعلق بیان کی جاتی ہے (اس لیے کہ اُحد میں مال غنیمت کا کوئی سوال ہی نہیں تھا، اس میں تو مسلمانوں کو شکست ہوئی تھی) اور یہاں حالات پر تبصرہ ہو رہا ہے اُحد کے۔ اس بیچ میں بغیر کسی قرینہ اور بدون کسی حوالہ کے بدر کے کسی واقعہ کا جس پر ایک عرصہ گزر چکا تھا، ذکر کرنے کا کیا موقع تھا؟ پھر سب سے زیادہ خیال کرنے کی بات یہ ہے کہ منافقین ایسے بے وقوف نہیں تھے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک ایسا الزام لگائیں جس کو کوئی بھی باور نہ کرے بلکہ جو شخص بھی سنے اس کو سن کر ہنس دے۔ منافقین تو درکنار آپ کے کٹر سے کٹر معاندین قریش تک کا حال یہ تھا کہ انھوں نے آپ پر کسی مالی خیانت کا، خواہ وہ بڑی ہو یا چھوٹی، کوئی الزام لگانے کی جسارت کبھی نہیں کی۔ اسلام اور جاہلیت دونوں میں آپ امین کے لقب سے مشہور رہے اور آپ کی اس شہرت کی دھاک جس طرح دوستوں پر تھی، اسی طرح دشمنوں پر بھی تھی۔ مالی معاملات میں اگر بعض نادان لوگوں نے حضورؐ کے خلاف کبھی کچھ کہا بھی ہے تو اس کی نوعیت الزامِ خیانت کی نہیں ہے بلکہ زیادہ سے زیادہ کسی کے مقابل میں کسی کو کچھ زیادہ دے دینے کی ہے۔ ان مواقع پر بھی حقیقت واضح ہو جانے کے بعد الزام لگانے والے فریق نے سخت ندامت کا اظہار کیا ہے۔ مثلاً فتح مکہ اور غزوہ حنین کے موقع پر۔ اس وجہ سے یہ بات تو بالکل بعید از عقل معلوم ہوتی ہے کہ منافقین آپؐ پر ایک حقیر چادر کی خیانت کا الزام لگائیں۔ البتہ یہ بات کہہ کر وہ کمزور لوگوں کے دلوں میں وسوسہ اندازی کر سکتے تھے کہ (نعوذ باللہ) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی قوم کے وفادار اور بہی خواہ نہیں ہیں، وہ اپنے حوصلوں پر اپنی قوم کو قربان کر رہے ہیں۔ اُحد کی شکست کے بعد اس قسم کے پروپیگنڈے کے لیے ان کو ایک موقع ہاتھ آگیا تھا۔ جس سے انھوں نے فائدہ اٹھایا۔ بالخصوص اس وجہ سے کہ وہ شہر سے باہر نکل کر جنگ کے مخالف تھے لیکن جاں نثار صحابہؓ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی رائے قبول نہیں کی۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۱۶۴)

بعثتِ نبوی کی برکات

یہ آیت تھوڑے سے فرق کے ساتھ سورۂ بقرہ میں بھی گزر چکی ہے۔ وہاں اس کے تمام اہم اجزا کی تشریح ہو چکی ہے۔ نظم کے پہلو سے یہ آیت اسی حقیقت کو مثبت پہلو سے پیش کر رہی ہے جو اوپر والی آیت میں منفی پہلو سے ظاہر کی گئی۔ اوپر کی آیت میں، جیسا کہ بیان ہوا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ملت کے ساتھ بدخواہی و بے وفائی کے الزام سے بری قرار دیا گیا ہے، اس آیت میں اس عظیم احسان کا اظہار کیا گیا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی شکل میں تمام دنیا پر اور خاص طور پر قوم عرب پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ یہ احسان یہاں تین مختلف پہلوؤں سے ظاہر کیا گیا ہے۔

ایک تو اس پہلو سے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل عرب کے اندر انہی کے اندر سے ایک رسول مبعوث فرمایا تاکہ زبان کی اجنبیت، نسل و نسب کی غیریت، رجحانات و میلانات کی بیگانگی اور ماضی و حاضر سے بے خبری

کسی تعصب اور بدگمانی کا باعث نہ بنے اور لوگ اس پر اپنے ہی باپ اور بھائی کی حیثیت سے اعتماد کر سکیں اور اس کی آواز کو خود اپنے ضمیر کی آواز کی طرح پہچان اور سن سکیں۔ اس حقیقت کا اظہار مِنْ اَنْفُسِكُمْ کے الفاظ سے ہو رہا ہے۔

دوسرے اس رسول کے مقصد اور مشن کے پہلو سے کہ یہ رسول، اللہ کی آیتیں سناتا ہے، تم کو تمام عقلی، اخلاقی اور عملی گمراہیوں سے پاک کرتا ہے اور تمہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے رہا ہے۔ بھلا جس کے فیوض و برکات سے تمہاری انفرادی و اجتماعی اور ظاہری و باطنی زندگی کا ہر گوشہ یوں منور ہو رہا ہے اس سے بڑا بھی تمہارا کوئی خیر خواہ ہو سکتا ہے!

تیسرے مخاطب کی ضرورت کے پہلو سے۔ اہل عرب دین و شریعت سے بے خبر اور نبوت و رسالت سے ناآشنا امی لوگ تھے۔ ایک زمانۂ دراز سے کفر و جاہلیت کی تاریکیوں میں بھٹک رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے ان کی دستگیری فرمائی اور ان کو گمراہی کی وادیوں سے نکال کر ہدایت کی صراط مستقیم پر لا کھڑا کیا۔ اس حقیقت کا اظہار وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ کے الفاظ سے ہو رہا ہے۔ یہاں یہ اِنْ مخففہ ہے جو اِنَّ کے معنی میں آتا ہے اور اس کے بعد جو لَ ہے یہ اس کا قرینہ ہے۔

اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا ۙ قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ۭ قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۱۶۵)

'ا' حرفِ استفہام ہے اور 'و' حرفِ ربط ہے۔ عربی زبان میں حرفِ استفہام کی اصلی جگہ جملہ کے آغاز ہی میں ہے۔ مثلاً اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ۔ (۸۱ الواقعہ) یہ حرفِ استفہام اظہارِ تعجب کے لیے ہے اور حرفِ ربط اس بات کی دلیل ہے کہ یہ بات بھی منجملہ ان اعتراضات کے ایک اعتراض ہے جن کے جواب اوپر دیے گئے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

اوپر یہ بات گزر چکی ہے کہ کچھ لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ جو شخص خدا کا رسول ہو اس کو اور اس کے ساتھیوں کو ہر قسم کی تکلیفوں اور مصیبتوں سے محفوظ ہونا چاہیے، جب وہ کسی مہم پر نکلیں تو ان کے ساتھ خدا کے فرشتوں کی مدد ہونی چاہیے، جب انھیں کوئی جنگ پیش آئے تو ضروری ہے کہ وہ اس میں فتحمند ہوں۔ اس خیال کے لوگوں کو اُحد کی شکست سے قدرتی طور پر بڑا دھکا لگا۔ وہ سوچنے لگ گئے کہ اگر اسلام ایک سچا دین ہے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سچ مچ خدا کے رسول ہیں تو یہ شکست ان کو کہاں سے پیش آئی؟ کمزوروں کی اس نفسیاتی کیفیت سے منافقین نے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور اس شکست کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ایک دلیل کے طور پر لوگوں کے سامنے پیش کرنا شروع کیا۔ قرآن نے اس آیت میں اور اس کے بعد کی آیات میں تفصیل کے ساتھ اس غلط فہمی کو دور کیا ہے اور اہل حق

کو جو آزمائشیں پیش آتی ہیں ان کی حکمت واضح فرمائی ہے۔

اس آیت میں پہلی بات یہ فرمائی کہ جو افتاد تمھیں پیش آئی یہ صرف تمھی کو پیش نہیں آئی کہ تم اس کو بدگمانی اور مایوسی کی دلیل بنا لو بلکہ اس سے دو چند نقصان تمھارے ہاتھوں تمھارے دشمنوں کو پہنچ چکا ہے۔ بدر میں تم نے دشمن کے ۷۰ آدمی قتل کیے، ۷۰ قیدی بنائے۔ احد میں بھی پہلے تمھارا ہی پلہ بھاری تھا اور تمھارے ہاتھوں دشمن کے کچھ آدمی قتل اور زخمی بھی ہوئے۔ لیکن بعد میں خود تمھاری غلطی سے تمھیں شکست ہو گئی۔ اللہ فتح اور شکست دونوں پر قادر ہے اور اس کی قدرت ہمیشہ اس کی حکمت کے تحت ظاہر ہوتی ہے۔

دوسری بات یہ فرمائی کہ اس افتاد کے سبب تم خود ہوئے ہو۔ اس کی وضاحت اوپر آیت ۱۵۲ میں ان الفاظ کے ساتھ ہو چکی ہے۔ وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۭ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ (اور اللہ نے تم سے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا تھا جب کہ تم خدا کے حکم سے ان کو تہ تیغ کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ تم کمزور پڑ گئے، تم نے معاملے میں اختلاف کیا اور تم نے نافرمانی کی جب کہ خدا نے تمھیں وہ چیز دکھا دی جس کو تم عزیز رکھتے تھے تم میں کچھ دنیا کے طالب تھے، کچھ آخرت کے، پھر خدا نے تمھارا رخ ان سے پھیر دیا تاکہ تمھاری آزمائش کرے اور اللہ نے تم سے درگزر کیا اور اللہ مومنوں پر بڑے فضل والا ہے)

وَمَآ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا ۚۖ وَقِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوِ ادْفَعُوْا ۭ قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّاتَّبَعْنٰكُمْ ۭ هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَىِٕذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ ۚ يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُوْنَ ۚ اَلَّذِيْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوْا لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا ۭ قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۱۶۶-۱۶۸)

راہِ حق کی آزمائشوں کی حکمت

اب یہ اس ابتلاء کی حکمت واضح کی جا رہی ہے کہ یہ جو کچھ پیش آیا ہے خدا کے حکم سے پیش آیا ہے اور اس سے مقصود یہ ہے کہ اللہ سچے مسلمانوں اور منافقوں کو اچھی طرح واضح کر دے تاکہ ہر شخص کھلی آنکھوں سے دیکھ لے کہ کون لوگ جماعت کے اندر قابلِ اعتماد ہیں کون لوگ نہیں۔ مقصد یہ ہے کہ یہ آزمائش جماعتی تطہیر کے لیے ضروری تھی۔ اگر مخلصین اور منافقین دونوں اسی طرح رلے ملے رہتے تو معلوم نہیں مفسد عناصر کس وقت پوری جماعت کا بیڑا غرق کر دیتے۔

'وَقِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا' یہ منافقین کے ایک گروہ کی طرف اشارہ ہے جن کو اس موقع پر جہاد کی دعوت دی گئی کہ اٹھو اگر جنگ ہو گئی تو جہاد کا ثواب حاصل ہو گا اور اگر دشمن ہماری جمعیت سے مرعوب ہو گیا تو دفاع کا مقصد پورا ہو جائے گا۔ لیکن یہ لوگ جہاد کے لیے نہ اٹھے اور اپنے نفاق اور بزدلی پر پردہ ڈالتے

کے لیے انھوں نے یہ بات بنائی کہ ہمیں علم ہے کہ اس موقع پر لڑائی نہیں ہونی ہے۔ اگر ہمیں لڑائی کا علم ہوتا تو ہم ضرور تمھارے ساتھ چلتے۔ قرآن نے ان کے بابت فرمایا کہ یہ بات کہتے وقت یہ ایمان سے زیادہ کفر سے قریب تر تھے اور انھوں نے زبان سے وہ بات کہی جو ان کے دل میں نہیں تھی۔ دل میں وہ جو کچھ چھپائے ہوئے تھے اس کا خدا کو خوب پتا ہے۔

اس کے بعد ان کے دل کا راز کھول دیا کہ یہ خود تو سخن سازی کر کے گھروں میں بیٹھے رہے لیکن ان کے جو بھائی بند جہاد میں شریک اور شہید ہوئے، ان کی بابت انھوں نے کہا کہ اگر وہ ہماری بات مانتے تو یوں قتل نہ ہوتے۔ مقصد یہ ہے کہ اصل چیز جو ان کے لیے مانع ہوئی وہ ہے تو موت کا خوف لیکن انھوں نے بات یہ بنائی کہ وہ اس لیے نہیں اٹھ رہے ہیں کہ جنگ و دنگ کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔

آخر میں فرمایا کہ اگر یہ موت و زندگی کے مواقع سے ایسے ہی باخبر ہیں تو وہ اپنے آپ کو موت سے بچائیں۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ يُرْزَقُوْنَ ۝ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىھُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِھٖ ۙ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِھِمْ مِّنْ خَلْفِھِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْھِمْ وَلَا ھُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ (۱۶۹-۱۷۱)

منافقین کو ایک تنبیہ

یہ ان منافقین کو تنبیہ ہے کہ خدا کی راہ میں شہید ہونے والوں کو مردہ نہ سمجھو۔ مردہ وہ نہیں ہیں بلکہ تم ہو۔ وہ تو زندہ ہیں اور اپنے رب کے جوارِ رحمت میں اس کی نعمتوں سے محظوظ ہو رہے ہیں۔ تم اپنی جہالت اور بے بصیرتی سے ترس کھا رہے ہو کہ وہ مارے گئے اور خیال کر رہے ہو کہ اگر وہ تمھاری رائے پر چلتے، تمھاری ہی طرح گھروں میں بیٹھ رہتے تو نہ مارے جاتے۔ اور ان کا حال یہ ہے کہ وہ اس فضل و نعمت پر فرحاں و شاداں ہیں جس سے اللہ نے ان کو نواز رکھا ہے۔ تمھیں ان کی موت پر حسرت و افسوس ہے اور ان کا عالم یہ ہے کہ دمبدم ان کو اپنے ان اخلاف و اولاد سے متعلق، جو ان کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں اور ان سے ملنے کے آرزومند ہیں اگرچہ ابھی ملے نہیں ہیں، یہ بشارت مل رہی ہے کہ وہ بھی عنقریب ان سے ملیں گے اور ان کو بھی انھی کی طرح وہ مقام حاصل ہوگا جہاں نہ تو مستقبل کا کوئی اندیشہ ہوگا نہ ماضی کی کوئی حسرت۔

شہدا کے ساتھ باایمان اخلاف کے ساتھ رعایت

یہ امر ملحوظ رہے کہ قرآن میں یہ حقیقت مختلف اسلوبوں سے واضح کی گئی ہے کہ عالی مقام اہلِ ایمان کے ساتھ جنت میں ان کی ذریت اور ان کے اخلاف میں سے ان لوگوں کو بھی جمع کر دیا جائے گا جن کا خاتمہ ایمان پر ہوگا اگرچہ اپنے عمل کے لحاظ سے یہ ان کے درجے کے نہ ہوں۔ یہ شہدا اور صدیقین پر اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہوگا کہ ان کی مسرت کی تکمیل کے لیے ان کی باایمان ذریت کو ان کے ساتھ جمع کر دیا جائے گا اور اس مقصد کے لیے اسلاف کا درجہ نیچا نہیں کیا جائے گا بلکہ اخلاف کا درجہ بلند کر دیا جائے گا۔ اس مسئلہ پر خدا نے چاہا تو ہم سورۂ طور کی تفسیر میں بحث کریں گے۔

ان آیات پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ قرآن نے نہایت بلاغت کے ساتھ ان تمام بُرے اثرات کو

مٹایا ہے جو منافقین مسلمانوں کے دلوں پر عموماً اور شہدا کی ذریات اور ان کے اخلاف پر خصوصاً ڈالنا چاہتے تھے۔

اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۛؕ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۚ اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖۗ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ۝ فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ ۝ اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ ۠ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ (۱۷۲-۱۷۵)

احد کی شکست کے بعد بھی مخلصین کا حوصلہ برقرار رہا

'اَلَّذِیْنَ' ان مومنین کی صفت ہے جن کا ذکر اوپر ہوا۔ اس صفت کے اضافے نے کلام کو بالکل مطابق حال بنا دیا اور اوپر والی آیت میں جو اصولی بات فرمائی گئی تھی اس کا ایک متعین محمل سامنے آ گیا۔ یعنی اس عظیم اجر کے مستحق وہ لوگ ٹھہریں گے جن کے عزم و ایمان کا حال یہ ہے کہ احد کی شکست کا زخم کھانے کے بعد بھی اُن میں کوئی خم نہیں پیدا ہوا بلکہ جوں ہی اللہ و رسول کی طرف سے ایک تازہ مہم کی منادی ہوئی وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ تاریخ و سیرت کی کتابوں میں بیان ہوا ہے کہ احد میں مسلمانوں کی شکست کے بعد قریش کی فوج اول اول تو واپس چلی گئی لیکن روحاء کے مقام تک پہنچنے کے بعد ابوسفیان اور ان کے ساتھیوں کو احساس ہوا کہ انھوں نے اس قدر جلد واپس ہونے میں سخت غلطی کی ہے، لگے ہاتھوں انھیں مدینہ کا قصہ بھی پاک کر دینا تھا۔ یہ سوچ کر انھوں نے اپنی فوج کی از سر نو تنظیم شروع کر دی اور ادھر مسلمانوں کو ہراساں کرنے کے لیے منافقین کے ذریعے سے یہ افواہ پھیلا دی گئی کہ قریش نئے ساز و سامان سے مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے تیاریاں کر رہے ہیں۔ حضور کو جب اس کی اطلاع پہنچی تو آپ نے بھی لوگوں کو قریش کے تعاقب کے لیے تیار ہو جانے کا حکم دے دیا۔ اس فوج میں صرف انھی لوگوں کو شامل ہونے کی اجازت دی گئی جو پہلے روز کی جنگ میں شریک رہے تھے۔ یہ احتیاط غالباً اس لیے کی گئی کہ منافقین کے لوث سے یہ لشکر پاک رہے۔ چنانچہ حضور جاں نثاروں کی ایک جماعت کے ساتھ ابوسفیان کے تعاقب میں نکلے اور حمراء الاسد تک گئے جو مدینہ سے ۸ میل کے فاصلے پر ہے۔ ابوسفیان نے جب دیکھا کہ ابھی مسلمانوں کے حوصلہ میں کوئی فرق نہیں آیا ہے تو ارادہ بدل دیا اور مسلمان کامیاب و بامراد واپس آ گئے۔

'لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا' یہاں 'احسان' اللہ و رسول کی وفاداری کے حق کو بہتر سے بہتر شکل میں ادا کرنے اور تقویٰ، نفاق کی تمام آلائشوں سے بچنے کے معنی میں ہے۔ یہ درجہ ایک نہایت اونچا درجہ ہے اور اس کے لیے جد و جہد کرنے والوں کے درجات و مراتب ان کے باطنی خلوص اور ان کے ظاہری اعمال و اقدامات کے لحاظ سے مختلف ہوتے ہیں۔

رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

'اَلَّذِیْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ الاٰیة' میں مذکورہ اصحابِ احسان کا بیان ہے کہ جب منافقین نے ان کو ہراساں کرنے کے لیے یہ افواہ پھیلائی کہ قریش نئے ساز و سامان کے ساتھ حملہ کی پھر تیاریاں کر رہے ہیں تو

یہ خبر بجائے اس کے کہ ان کے اندر خوف وہراس پیدا کرتی، ان کے عزم و ایمان کو بڑھانے کا سبب بن گئی۔ قاعدہ ہے کہ جس کنوئیں کے سوتے زوردار ہوں اس کے اندر سے جتنا ہی پانی نکالا جائے اتنا ہی اس کے سوتے اور زیادہ جوش کے ساتھ اُبلتے ہیں۔ اسی طرح آگ اگر قوت ور ہو تو گیلی لکڑی بھی اس میں ڈالیے تو اس کو بھی اپنی غذا بنا کر مزید طاقت ور بن جاتی ہے۔ یہی حال اصحاب عزم و ایمان کا ہے۔ ان کو بھی رکاوٹیں ضعیف کرنے کے بجائے اور زیادہ پر عزم اور پرحوصلہ بنا دیتی ہیں، ہر آزمائش ان کی مخفی صلاحیتوں کے لیے مہمیز کا کام دیتی ہے اور ہر امتحان ان کے لیے فتحمندی کا ایک نیا میدان کھولتا ہے۔

رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

'وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ' یہ اس زیادتِ ایمان کا مظہر ہے جس کا ذکر فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا کے الفاظ سے ہوا ہے۔ اہل ایمان کی تمام قوت و طاقت کا خزانہ درحقیقت یہی حَسْبُنَا اللّٰهُ کا عقیدہ ہے۔ مومن کا ایمان اس بات پر ہوتا ہے کہ تمام قوت و طاقت اللہ وحدہٗ لاشریک ہی کے ہاتھ میں ہے تو جب بندہ خدا کے مقرر کیے ہوئے کسی فرض کو ادا کرنے کے لیے خود خدا ہی کے حکم سے اٹھ رہا ہے تو اس کو دنیا کی کوئی طاقت کس طرح ڈرا سکتی ہے۔ بہترین ہستی جس کو بندہ اپنا معاملہ سپرد کر سکتا ہے وہ خدا کی ہستی ہے تو جس نے خدا کو اپنا وکیل و معتمد بنا لیا اب اس کے لیے کسی خوف وہراس کی گنجائش کہاں باقی رہی!

کیا غم ہے اگر ساری خدائی ہو مخالف
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے

'اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ' الآیہ یعنی یہ ڈراوے سب شیطان کی طرف سے تھے اور اس طرح وہ تم پر اپنا اور اپنے ساتھیوں اور دوستوں کا رعب جمانا چاہتا تھا تو تم شیطان اور اس کے ساتھیوں سے نہ ڈرو، بلکہ صرف مجھی سے ڈرو، اگر تم سچے مومن ہو۔ ظاہر ہے کہ یہاں شیطان اور اس کے اولیا سے اشارہ قریش اور ان کے ساتھیوں کی طرف ہے اور ان سے جس ڈر کی ممانعت کی گئی ہے یہ وہ ڈر ہے جس کا ہوا منافقین دکھا رہے تھے کہ ان کے ڈر سے خدا کے دین کے احکام و مطالبات کو پس پشت ڈال دیا جائے۔

وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ ۚ اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ۭ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَلَّا يَجْعَلَ لَھُمْ حَظًّا فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَھُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَـيْـــًٔا ۚ وَلَھُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّمَا نُمْلِيْ لَھُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِھِمْ ۭ اِنَّمَا نُمْلِيْ لَھُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا ۚ وَلَھُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰي مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ۭ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَي الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ (۱۷۶-۱۷۹)

آیات ۱۷۶-۱۷۹

یہ آیتیں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی طرف التفات کی نوعیت کی ہیں۔ احد کی شکست کے بعد جیسا کہ

اوپر کی آیات سے واضح ہے اور ہم سورہ کی تمہید میں بھی اشارہ کر چکے ہیں، وہ لوگ جو منافقانہ اسلام کی صفوں میں آگھسے تھے یا تو علانیہ کفر کی طرف پلٹ گئے یا پلٹ جانے کے لیے تمہیدیں استوار کرنے لگ گئے۔ یہ لوگ اس طمع خام میں مبتلا ہو گئے کہ قریش کی حمایت کر کے اس دین کو شکست دی جا سکتی ہے۔ چنانچہ ان کی تمام سرگرمیاں اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت اور کفر اور اہلِ کفر کی حمایت کے لیے وقف ہو گئیں۔ اس صورتِ حال پر ارشاد ہوا کہ اس سے ذرا بھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ کفر کی راہ میں ان لوگوں کی یہ سرگرمیاں اللہ اور اس کے دین کو ذرا بھی نقصان نہ پہنچا سکیں گی۔ جو لوگ کفر کو ایمان پر ترجیح دے رہے ہیں اللہ بھی ان کے لیے یہی چاہتا ہے کہ آخرت میں ان کا حصہ صرف دردناک عذاب ہو۔ اللہ نے ان کی معاندانہ سرگرمیوں کے باوجود ان کو جو ڈھیل دے رکھی ہے اس ڈھیل کو یہ اپنی کامیابی سمجھتے ہیں حالانکہ یہ ان کی کامیابی نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ ان پر حجت تمام ہو جائے اور ان کے گناہوں کا پیمانہ اچھی طرح لبریز ہو جائے تاکہ جب ان کی کشتی ڈوبے تو پھر اس کو ابھرنا نصیب نہ ہو۔ اس ڈھیل کے بعد ان کے لیے صرف ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔ ایسا عذاب جس کے بعد کسی کو بھی ان سے کوئی ہمدردی نہیں ہو گی بلکہ صرف دنیا اور آخرت کی رسوائی ہو گی۔

واقعۂ احد کی حکمت

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الاٰیۃ یہ اشارہ ہے اس حکمت کی طرف جو احد کی اس آزمائش میں اہلِ ایمان کے لیے مضمر تھی۔ فرمایا کہ اب تک مسلمانوں کی جماعت خام و پختہ، خبیث و طیب اور مخلص و منافق ہر قسم کے افراد پر مشتمل رہی ہے۔ یہ بات اللہ تعالیٰ کی حکمت کے خلاف تھی کہ جو جماعت تمام دنیا کی صلاح و فلاح کا ذریعہ بننے والی ہے وہ اس طرح صالح و فاسد کا ملغوبہ بنی رہے۔ چنانچہ اس نے چاہا کہ اس کے فاسد عناصر کو اس سے الگ کیا جائے تاکہ مخلص اہلِ ایمان ابھر کر سامنے آئیں اور اپنی صلاحیتوں کے مطابق پروان چڑھیں۔ اس کے لیے ایک شکل تو یہ تھی کہ تمام مسلمانوں کو غیب کا علم دے دیا جاتا کہ وہ خود معلوم کر سکتے کہ کون ان کے اندر مخلص ہے، کون منافق۔ لیکن یہ بات اللہ کی سنت کے خلاف ہے کہ وہ غیب کے اسرار سے ہر ایک کو واقف کر دے۔ غیب کی باتوں کے لیے اپنے رسولوں میں سے وہ جن کو چاہتا ہے منتخب کرتا ہے اور ان کو امورِ غیب میں سے جس چیز سے چاہتا ہے آگاہ فرماتا ہے۔ اس کی دوسری شکل یہ تھی کہ تمہاری جماعت کو کوئی ایسا امتحان پیش آئے جو خود تمہارے کھرے اور کھوٹے اور مخلص و منافق کو چھانٹ کر الگ کر دے۔ یہی شکل اللہ کی سنت کے مطابق ہے چنانچہ واقعۂ احد کی صورت میں یہ امتحان تمہارے سامنے آگیا اور اس امتحان نے تمہارے کھرے اور کھوٹے میں امتیاز کر دیا۔

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ الاٰیۃ یہ اس امتحان کی برکات سے پورا پورا فائدہ اٹھانے اور ایمان و تقویٰ کے تمام تقاضے پورے کرتے رہنے کی تاکید ہے تاکہ اس تطہیر کے بعد نفاق کی بیماری کو پھر جماعت کے اندر گھسنے کی راہ نہ ملے۔ یہاں یہ فعل اپنے کامل معنی میں ہے اور آخر میں اس کے اجرِ عظیم کا وعدہ ہے۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ۭ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ۭ سَيُطَوَّقُوْنَ

مَا بَخِلُوْا بِهٖ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ وَ لِلّٰهِ مِیْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ۠ لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِیْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ فَقِیْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِیَآءُ ۘ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا وَ قَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِیَآءَ بِغَیْرِ حَقٍّ ۙ وَّ نَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِیْقِ ۝ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْكُمْ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ (۱۸۰ - ۱۸۲)

منافقین کی کمزوری انفاق کے معاملے میں

اہلِ نفاق جس طرح اپنی جان کے معاملے میں چور ہوتے ہیں اسی طرح اپنے مال کے معاملے میں بھی چور ہوتے ہیں اس وجہ سے ان کی اس کمزوری پر بھی تنبیہ فرمائی تاکہ مسلمان اس بیماری سے بھی ہوشیار رہیں۔ فرمایا کہ جو لوگ خدا کی راہ میں اپنا مال خرچ کرنے سے دریغ کر رہے ہیں درآنحالیکہ وہ خدا ہی کا بخشا ہوا ہے اور خدا نے ان کو کسی استحقاق کی بنا پر نہیں بلکہ محض اپنے فضل سے بخشا ہے، وہ یہ نہ سمجھیں کہ اپنے مستقبل کی مصلحت کے لیے وہ کوئی بڑا مفید کام کر رہے ہیں۔ خدا کے حقوق و فرائض سے چرا چرا کر جو مال جمع کیا جا رہا ہے وہ قیامت کے دن ان کی گردنوں کا بوجھل طوق بنے گا اور سونے کے جو طوق آج زینت و فخر کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں یہ سانپوں اور اژدہوں کی شکل میں تبدیل ہو جائیں گے۔

مزید فرمایا کہ آسمان و زمین کی ساری میراث بالآخر خدا ہی کی طرف پلٹ جانے والی ہے۔ جو کچھ جس کو ملا ہے خدا ہی سے ملا ہے اور پھر یہ سب کچھ اسی کی طرف لوٹ جانے والا ہے یہ ساری چیزیں خدا نے ہمیں بطورِ امانت بخشی ہیں اور مقصود اس سے ہمارا امتحان ہے۔ وہ اس بات سے اچھی طرح باخبر ہے کہ ہم نے اس کی بخشی ہوئی نعمتوں میں کس طرح کا تصرف کیا ہے اور اپنے اس علم کے مطابق وہ جزا یا سزا دے گا۔

منافقین کا طنز اللہ جل شانہ کی شان میں

'لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِیْنَ قَالُوْا الایۃ' یہ منافقین کے اس استہزا پر تہدید و وعید ہے جو وہ اپنی مجلسوں میں قرآن کی دعوتِ انفاق کا کیا کرتے تھے۔ قرآن جب یہ کہتا کہ کون ہے جو اللہ کو قرضِ حسن دے تو یہ منافقین اس پر یہ فقرہ چست کرتے کہ ان دنوں اللہ میاں بہت غریب ہو گئے ہیں اور ہم ان سے زیادہ امیر ہیں کہ وہ ہم سے قرض مانگنے پر اتر آئے ہیں۔ یہ منافقین زیادہ تر یہودیوں سے تھے اس وجہ سے خدا پر طنز کرنے میں بھی انھوں نے بالکل یہود ہی کی ہمنوائی کی۔ سورۂ مائدہ میں یہود کا یہ قول جو نقل ہوا ہے کہ 'یَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ' اس کی نوعیت بھی، جیسا کہ ہم تشریح کریں گے، بالکل یہی تھی۔ وہ بھی قرآن کی مذکورہ بالا دعوتِ انفاق کا مذاق اڑانے کے لیے کہتے کہ آج کل مسلمانوں کے اللہ میاں کا ہاتھ بہت تنگ ہے کہ وہ بندوں سے قرض مانگتے پھرتے ہیں، اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ 'سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا' یہ جو کچھ انھوں نے کہا ہے اس کو ہم نوٹ کر رکھیں گے۔ فنِ بلاغت کے اداشناس اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان دو لفظوں کے اندر جو قہر و غضب چھپا ہوا ہے اس کی تعبیر ہم عاجزوں کے قلم سے صفحوں میں بھی ممکن نہیں ہے۔ پھر اس سے زیادہ بلیغ بات یہ ہے کہ اسی پر

بلاغت کا ایک لطیف نکتہ

عطف کر دیا ہے 'وَقَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِیَآءَ بِغَیْرِ حَقٍّ' کو یعنی ان کے ناحق قتلِ انبیا کو بھی ہم نے لکھ رکھا ہے۔ یہ قتلِ انبیا کا جرم ظاہر ہے کہ یہود کا ہے۔ منافقین کے ایک قول اور یہود کے ایک فعل کو ایک ہی زمرے میں اس طرح شمار کرنا اور دونوں کے لیے ضمیر بھی ایک ہی استعمال کرنا یہاں دو باتوں پر دلیل ہے۔ ایک تو اس بات پر کہ

یہ سنگین بات کہ کر یہ منافقین یہود کی اسی برادری میں پھر جا شامل ہوئے ہیں جس سے نکل کر انھوں نے اسلام میں داخل ہونے کا ڈھونگ رچایا تھا۔ دوسری یہ کہ منافقین کا یہ استہزا اور یہود کا یہ عمل دونوں ایسے سنگین جرائم ہیں کہ خدا ان کو بھولنے والا نہیں ہے بلکہ وہ بھی ایک دن ان سے کہے گا کہ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ خدا کا یہ عذاب چکھو اور یہ عذاب جو کچھ بھی ہوگا ان کے اعمال ہی کا ثمرہ و نتیجہ ہوگا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ بندوں پر کسی قسم کا ظلم کرنے والا نہیں ہے۔

اَلَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَآ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ ۭ قُلْ قَدْ جَاۗءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِيْ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالَّذِيْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْھُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۔ فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَاۗءُوْ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ۔ كُلُّ نَفْسٍ ذَاۗىِٕقَةُ الْمَوْتِ ۭ وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ۭ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۔ لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۣ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا ۭ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (۱۸۳-۱۸۶)

بات جب منافقین کے ذکر سے یہود کے ذکر تک پہنچ گئی تو ان کی ایک اور شرارت کا حوالہ دے کر اس کی بھی لگے ہاتھوں تردید فرما دی اور ساتھ ہی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو تسلی دی کہ ابھی اس طرح کی بہت سی دل آزار باتیں تمھیں اہل کتاب اور مشرکین کی طرف سے دیکھنی اور سننی پڑیں گی۔ یہ تمھارے صبر و عزیمت کا امتحان ہے۔

یہود کی ایک شرارت

یہود کی جس شرارت کا حوالہ دیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو چپ کرنے کے لیے یہ کہتے کہ ہمیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ہدایت ہے کہ ہم کسی شخص کے دعوائے رسالت کی اس وقت تک تصدیق ہی نہ کریں جب تک اس سے یہ معجزہ نہ صادر ہو کہ وہ ایسی قربانی پیش کرے جس کو کھانے کے لیے قبولیت کے نشان کے طور پر، آسمان سے آگ اترے۔ یہ بات یہود محض شرارت کی وجہ سے کہتے تھے۔ تورات میں بعض انبیا سے اس معجزے کا صادر ہونا مذکور ہے مثلاً سلاطین ۱۸: ۳۰-۳۸ میں ایلیا نبی کے متعلق اور تواریخ ۷: ۱ میں حضرت سلیمانؑ کے متعلق، لیکن یہ کہیں مذکور نہیں ہے کہ یہ معجزہ لازم و شرائط نبوت میں سے ہے، جب تک کوئی نبی یہ معجزہ نہ دکھائے اس کا دعوائے نبوت ہی قابل غور نہیں، بالخصوص آخری نبی سے متعلق تو ان کے ہاں جو پیشین گوئیاں ہیں وہ اس قسم کے تکلفات سے بالکل ہی خالی ہیں۔ یہ عذر یہود نے محض شرارت سے جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے گھڑا تھا اس وجہ سے قرآن نے ان کے ذہن کو سامنے رکھ کر جواب دے دیا کہ ان سے کہہ دو کہ مجھ سے پہلے ایسے رسول آچکے ہیں جو نہایت واضح نشانیاں لے کر آئے اور وہ معجزہ بھی انھوں نے دکھایا جس کا تم نے ذکر کیا تو تم نے ان کو قتل کیوں کیا؟ تمھارا یہ فعل تو اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ تم اپنی اس بات میں بھی

جھوٹے ہو۔ اگر تم کو یہ معجزہ بھی دکھا دیا جائے گا جب بھی تم اپنی اسی ضد پر اڑے رہو گے اور ایمان نہ لانے کا کوئی اور بہانہ تلاش کر لو گے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف التفات

اس کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی کہ اگر یہ تمہاری تکذیب کر رہے ہیں تو تم اس کا غم نہ کرو۔ نہ یہ بات تمہاری کسی کوتاہی کے سبب سے ہے اور نہ اس وجہ سے ہے کہ تم ان کے حسبِ منشا ان کو معجزہ نہیں دکھا رہے ہو بلکہ اس کا واحد سبب یہ ہے کہ یہ لوگ تم پر ایمان نہیں لانا چاہتے۔ یہ معاملہ خاص تمہی کو نہیں پیش آیا ہے، تم سے پہلے بھی بہت سے رسولوں کی تکذیب ہو چکی ہے حالانکہ وہ معجزے، صحیفے اور روشن کتاب سب کچھ لے کر آئے تھے، خالی ہاتھ نہیں آئے تھے۔

یہاں تین لفظ استعمال ہوئے ہیں۔ بیّنات ۔ زبر ۔ کتاب منیر۔

'بیّنات' کا مفہوم

'بیّنات' کے معنی واضح اور روشن کے ہیں۔ یہ لفظ آیات کی صفت کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں جہاں کہیں یہ لفظ تنہا بغیر موصوف کے استعمال ہوا ہے دو معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ واضح اور مسکت دلائل کے معنی میں یا حسی معجزات کے معنی میں۔

'زبر' کا مفہوم

'زبر' زبور کی جمع ہے۔ اس کے معنی ٹکڑے، قطعے اور صحیفے کے ہیں۔ مزامیرِ داؤد کے لیے اس کا استعمال معروف ہے۔ یہاں اس سے مراد انبیا کے وہ صحائف ہیں جو تورات کے مجموعہ میں شامل ہیں۔

'کتاب منیر' سے مراد

'کتاب منیر' سے مراد تورات ہے۔ قرآن سے پہلے کی نازل شدہ چیزوں میں سے تورات ہی ہے جو اس لفظ کا اصلی مصداق ہو سکتی ہے۔

تہدید اور تسلی دونوں

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ الآیہ، میں تہدید اور تسکین دونوں کے پہلو موجود ہیں۔ منافقین و معاندین کے لیے یہ تہدید ہے اور اہلِ ایمان کے لیے پیامِ تسکین۔ مطلب یہ ہے کہ تم کو اور تمہارے مخالفوں کو سب کو موت کی منزل سے گزر کر بالآخر خدا ہی کے پاس آنا ہے، وہاں قیامت کے دن سب کو ان کا پورا پورا بدلہ مل جائے گا۔ وہاں بازی دراصل اس کی ہے جو دوزخ سے محفوظ رہا اور جنت میں داخل ہوا۔ یہ دنیا اور اس کی چمک دمک تو محض ایک جلوۂ سراب ہے اور شامت ہی ہے ان کی جو اس کے پیچھے پڑ کر آخرت کو گنوا بیٹھے۔

مسلمانوں کو صبر اور تقویٰ کی تلقین

لَتُبْلَوُنَّ فِیٓ اَمْوَالِكُمْ الآیہ یہ مسلمانوں کو معاندین کی تمام سرگرمیوں کے علی الرغم صبر اور تقویٰ پر جمے رہنے کی تلقین ہے۔ فرمایا کہ اہلِ کتاب اور مشرکین کے ہاتھوں تمہیں جانی و مالی آزمائشیں بھی پیش آنی ہیں اور ان کی طرف سے تمہیں ابھی بہت سی دل آزار باتیں بھی سننی پڑیں گی۔ یہ دراصل تمہارے صبر اور تقویٰ کا امتحان ہے۔ اگر ان باتوں کے باوجود تم اپنے موقف پر ڈٹے رہے اور تم نے حدودِ الٰہی کا احترام ملحوظ رکھا تو یہی وہ عزیمت کا مقام ہے جو انبیائے اولوالعزم اور ان کے جاں نثاروں کا خاص حصہ ہے اور جو بالآخر اس راہ میں کامیابی کی کلید ہے۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ

ظُهُوْرِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُوْنَ ۝ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّھُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَلَھُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۱۸۷-۱۸۹)

اہل کتاب کو آخری تنبیہ

اس سورہ میں اہل کتاب کو یہ آخری تنبیہ ہے۔ فرمایا کہ خود ساختہ عہد کے حوالے دے کر یہ حق کی مخالفت کے معاملے میں تو بڑے چابکدست ہیں لیکن وہ اصل میثاق جو اللہ نے ان سے اپنی کتاب کو ایک ایک کے آگے آشکارا کرنے کا لیا تھا اور یہ جو ہدایت فرمائی تھی کہ اس کی کسی چیز کو چھپانا مت، اس عہد کو انھوں نے پس پشت ڈال دیا اور دنیا کے حقیر فائدے کے عوض اس کو قربان کر دیا۔ اس عہد کا حوالہ تورات اور انجیل دونوں میں مختلف اسلوبوں اور پیرایوں سے آیا ہے۔ ہم بخیال اختصار صرف دو حوالے نقل کرتے ہیں۔ استثنا میں ہے۔

تورات اور انجیل میں تبیین کتاب کی تاکید

"اس لیے میری ان باتوں کو تم اپنے دل اور اپنی جان میں محفوظ رکھنا اور نشان کے طور پر ان کو اپنے ہاتھوں پر باندھنا اور وہ تمھاری پیشانی پر ٹیکوں کی مانند ہوں اور تم ان کو اپنے لڑکوں کو سکھانا اور تو گھر بیٹھے اور راہ چلتے اور لیٹتے اور اٹھتے وقت ان ہی کا ذکر کیا کرنا اور تو ان کو اپنے گھر کی چوکھٹوں پر اور اپنے پھاٹکوں پر لکھا کرنا" ۱۱: ۱۸-۲۱

ان الفاظ پر غور فرمائیے۔ جس کتاب کی تبیین کا ان الفاظ میں یہود سے عہد لیا گیا تھا اس کو انھوں نے نہ صرف یہ کہ گلدستۂ طاق نسیاں بنا کر رکھ دیا بلکہ اس میں تحریف کر کے اس کے حقائق کی قلب ماہیت بھی کر ڈالی۔

اسی طرح انجیلوں میں بھی نہایت مؤثر اسلوبوں میں یہ ہدایت موجود ہے اور خاص طور پر یہ فقرہ تو آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔

"جو کچھ میں تم سے اندھیرے میں کہتا ہوں اجالے میں کہو اور جو کچھ تم کان میں سنتے ہو کوٹھوں پر اس کی منادی کرو" متی ۱۰: ۲۷

فرمایا کہ جن کے کارنامے یہ کچھ ہیں، جنھوں نے حقیر دنیوی مفادات کی خاطر اس ڈھٹائی کے ساتھ شریعت فروشی کی ہے اور پھر اپنے اس کارنامے پر خوش بھی ہیں، جو چاہتے ہیں کہ اس کام کا کریڈٹ حاصل کریں جو انھوں نے کیا نہیں۔ فرمایا کہ ان کو عذاب الٰہی سے محفوظ نہ سمجھو، وہ دنیا میں بھی عذاب کی زد میں ہیں اور آخرت میں بھی ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

'مفازۃ' کے معنی نجات اور پناہ کی جگہ کے ہیں اور 'وَيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا' کا مفہوم یہ ہے کہ اہل کتاب پر اللہ تعالیٰ نے کتاب کی جو ذمہ داری ڈالی اور اس کے اظہار و اعلان، اس کی تعلیم و تبیین، اور اس کے اجرا و نفاذ سے متعلق جو عہد ان سے لیا اس کا کوئی جزو انھوں نے پورا نہیں کیا بلکہ الٹے اس کے کتمان

اور تحریف کے لیے سازشیں کیں اور اس کو اپنے دنیوی اغراض کے لیے حقیر داموں بیچا لیکن اس کے باوجود ان کی خواہش یہ ہے کہ انھیں حامل کتاب سمجھا جائے، انھیں خدا کی برگزیدہ امّت قرار دیا جائے اور ان کو دنیا اور آخرت دونوں میں خدا کے تمام فضل و انعام اور تمام لطف و احسان کا حق دار مانا جائے۔ اہل کتاب کے اسی طرح کے لذیذ خواب ہیں جن کو قرآن نے سورہ بقرہ میں 'اَمَانِیَّ' باطل آرزوؤں سے تعبیر فرمایا ہے۔

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ الآیہ یہ اوپر والی دھمکی کی تصدیق و توثیق ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آسمان و زمین کی بادشاہی خدا ہی کے اختیار میں ہے، اس میں کسی اور کے زور و اثر کا کوئی دخل نہیں ہے۔ جو لوگ خدا سے سرکشی کر رہے ہیں وہ ہر وقت خدا کی مٹھی میں ہیں اور خدا ہر چیز پر قادر ہے۔

۳۹۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۹۰-۲۰۰

خاتمۂ سورہ

اس مجموعۂ آیات کی حیثیت خاتمہ سورہ کی ہے اور یہ خاتمہ موازنہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہ بہت کچھ ملتا جلتا ہوا ہے سورۂ بقرہ کے خاتمہ سے۔ خاص طور پر اس میں جو دعا ہے وہ تو بالکل عکس ہے اس دعا کا جس پر سورۂ بقرہ ختم ہوئی ہے۔

اس خاتمہ میں پہلے تو اس عالم گیر حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ جہاں تک خدا کی قدرت و حکمت کی نشانیوں کا تعلق ہے ان سے تو آسمان و زمین کا گوشہ گوشہ معمور ہے۔ اصل شے نبیؐ کی دعوت پر ایمان لانے کے لیے جو ضروری ہے وہ یہ نہیں ہے کہ وہ ایسی سوختنی قربانی پیش کرے جس کو کھانے کے لیے آسمان سے آگ اُترے بلکہ یہ ہے کہ اس کی باتوں کو سننے کے لیے لوگوں کے کان کھلیں، آسمان و زمین میں تصرفات قدرت کے عجائب دیکھنے کے لیے لوگ اپنی آنکھیں کھولیں اور اس کارخانۂ کائنات کی حکمت و غایت پر غور کرنے کے لیے لوگ اپنے دماغوں اور اپنی عقلوں سے کام لیں۔

پھر فرمایا کہ جن کے دل بیدار ہیں، جو اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے خدا کو یاد رکھتے ہیں اور آسمان و زمین کی خلقت پر غور کرتے رہتے ہیں وہ اس نتیجے پر خود پہنچ جاتے ہیں کہ یہ دنیا کوئی اندھیر نگری نہیں ہے جس کو بنانے والے نے یوں ہی بے مقصد بنا ڈالا ہو اور یوں ہی اس کو ایک شتر بے مہار کی طرح چھوڑے رکھے بلکہ اس کے پیچھے ضرور غایت و مقصد اور جزا و سزا ہے۔ چنانچہ وہ خدا سے دعا کرتے رہتے ہیں کہ وہ ان کو انجام کار کے عذاب سے محفوظ رکھے۔

آگے فرمایا کہ اس طرح کے بیدار عقل اور بیدار دل لوگ معجزوں اور کرشموں کی تلاش میں نہیں رہتے۔ ان کے کانوں میں جب دعوت حق پڑتی ہے تو اس کی صداقت کے جانچنے کے لیے کسوٹی خود ان کی عقل اور ان کے دل کے اندر ہوتی ہے وہ اس پر پرکھ کر خود اس کی قدر و قیمت پہچان لیتے ہیں۔ ان کے لیے پیغمبر کی دعوت

اور اس کا چہرہ ہی سب سے بڑا معجزہ ہوتا ہے۔

اس کے بعد ان لوگوں کی طرف اشارہ فرمایا جو ان اوصاف کے اس عہد میں حقیقی مصداق تھے اور ان کی ان جاں بازیوں اور قربانیوں کا ذکر کیا جو اس دعوتِ حق کی راہ میں وہ پیش کر رہے تھے اور ان کے لیے اللہ کے پاس جو اجرِ عظیم ہے اس کی بشارت دی۔

آگے چند آیتوں میں اس بات کی وضاحت فرمادی کہ آج جو حق کے مخالفین زور لگا رہے ہیں اس سے کوئی مغالطہ نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ مہلت جو ان کو ملی ہے اللہ ہی کی طرف سے ملی ہے اور اس کے بھی مصالح ہیں۔ یہ مہلت عارضی ہے جو بہت جلد ختم ہوجانے والی ہے۔ انجام کار کی کامیابی خدا کے متقی اور وفادار بندوں ہی کے لیے ہے۔

آخر میں اہل کتاب کے اس گروہ کی تحسین فرمائی جو معاندین کے برعکس حق پر قائم رہا اور اسی نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی توفیق پائی۔ فرمایا کہ یہ لوگ اللہ کے ہاں اپنی اس استقامت اور حق پرستی کا انعام پائیں گے۔

سب سے آخر میں مسلمانوں کو نہایت مختصر مگر جامع الفاظ میں ان باتوں کی ہدایت فرمائی جن کا اہتمام اس ذمہ داری کے ادا کرنے کے لیے ضروری ہے جو آخری امت کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ نے ان پر ڈالی تھی۔

اب اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات ۱۹۰-۲۰۰

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ﴿۱۹۰﴾ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُودًا وَّعَلٰى جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۱﴾ رَبَّنَا إِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ أَخْزَيْتَهٗ ۖ وَمَا لِلظّٰلِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ ﴿۱۹۲﴾ رَبَّنَا إِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِي لِلْإِيْمَانِ أَنْ اٰمِنُوا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۖ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْأَبْرَارِ ﴿۱۹۳﴾ رَبَّنَا

وَآتِنَا مَا وَعَدتَّنَا عَلَىٰ رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۗ
إِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيعَادَ ﴿١٩٤﴾ فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّي لَا
أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنكُم مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ ۖ بَعْضُكُم
مِّن بَعْضٍ ۖ فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَأُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَ
أُوذُوا فِي سَبِيلِي وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا لَأُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ
وَلَأُدْخِلَنَّهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ثَوَابًا مِّنْ
عِندِ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عِندَهُ حُسْنُ الثَّوَابِ ﴿١٩٥﴾ لَا يَغُرَّنَّكَ
تَقَلُّبُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي الْبِلَادِ ﴿١٩٦﴾ مَتَاعٌ قَلِيلٌ ثُمَّ مَأْوَاهُمْ
جَهَنَّمُ ۚ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿١٩٧﴾ لَٰكِنِ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ
جَنَّاتٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا نُزُلًا مِّنْ
عِندِ اللَّهِ ۗ وَمَا عِندَ اللَّهِ خَيْرٌ لِّلْأَبْرَارِ ﴿١٩٨﴾ وَإِنَّ مِنْ أَهْلِ الثلثة
الْكِتَابِ لَمَن يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْكُمْ وَمَا أُنزِلَ
إِلَيْهِمْ خَاشِعِينَ لِلَّهِ لَا يَشْتَرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ۗ
أُولَٰئِكَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ
الْحِسَابِ ﴿١٩٩﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَ
رَابِطُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿٢٠٠﴾ ع ۲۰/۱۱

ترجمۂ آیات ۱۹۰ - ۲۰۰

بے شک آسمانوں اور زمین کی خلقت اور رات اور دن کی آمد و شد میں اہل عقل
کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں، ان کے لیے جو کھڑے، بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر خدا

کو یاد کرتے رہتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی خلقت پر غور کرتے رہتے ہیں۔ ان کی دعا یہ ہوتی ہے کہ اے ہمارے پروردگار! تو نے یہ کارخانہ بے مقصد نہیں پیدا کیا ہے۔ تو اس بات سے پاک ہے کہ کوئی عبث کام کرے۔ سو تو ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔ اے ہمارے رب! جس کو تو نے دوزخ میں ڈالا بے شک اس کو تو نے رسوا کر دیا اور ظالموں کا کوئی بھی مددگار نہیں ہوگا۔ اے ہمارے رب، ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا ایمان کی دعوت دیتے کہ لوگو، اپنے رب پر ایمان لاؤ، تو ہم ایمان لائے اے ہمارے رب، ہمارے گناہوں کو بخش دے، ہماری برائیوں کو ہم سے دور کر دے اور ہمیں موت اپنے وفادار بندوں کے ساتھ دے۔ اے ہمارے رب اور ہمیں بخش وہ کچھ جس کا تو نے اپنے رسولوں کی زبانی ہم سے وعدہ فرمایا ہے اور قیامت کے دن ہمیں رسوا نہ کیجیو، بے شک تو اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرے گا۔ ۱۹۰-۱۹۴

تو ان کے پروردگار نے ان کی دعا قبول فرمائی کہ میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہیں کروں گا، مرد ہو یا عورت، تم سب ایک دوسرے سے ہو۔ سو جنھوں نے ہجرت کی اور جو اپنے گھروں سے نکالے اور ہماری راہ میں ستائے گئے اور لڑے اور مارے گئے ہیں ان سے ان کے گناہ دور کر دوں گا اور ان کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ یہ اللہ کے پاس سے ان کا بدلہ ہوگا اور بہترین بدلہ تو اللہ ہی کے پاس ہے۔ ۱۹۵

اور ملک کے اندر کافروں کی یہ سرگرمیاں تمھیں کسی مغالطہ میں نہ ڈالیں، یہ چند دن کی چاندنی ہے پھر ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ کیا ہی بری جگہ ہے۔ البتہ وہ لوگ جو اپنے رب

سے ڈرتے رہے ان کے لیے ایسے باغ ہوں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ اللہ کی طرف سے ان کے لیے پہلی میزبانی ہوگی اور جو کچھ اللہ کے پاس اس کے وفادار بندوں کے لیے ہے وہ کہیں بہتر ہے۔ ۱۹۶-۱۹۸

اور بے شک اہل کتاب میں سے ایسے بھی ہیں جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس چیز پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو تم پر اتارا گیا اور اس پر بھی جو ان پر اتارا گیا ہے۔ اللہ سے ڈرتے ہوئے۔ وہ اللہ کی آیتوں کا حقیر قیمت پر سودا نہیں کرتے۔ ان کے لیے ان کے رب کے پاس ان کا اجر ہے۔ بے شک اللہ جلد حساب چکانے والا ہے۔ ۱۹۹

اے ایمان والو، صبر کرو، ثابت قدم رہو، مقابلے کے لیے تیار رہو اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم کامیاب رہو! ۲۰۰

۴۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۚ الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ رَبَّنَاۤ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَیْتَهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ (۱۹۰-۱۹۲)

ارباب بصیرت کی نگاہ

محبت دنیا کے ان اندھوں کا ذکر کرنے کے بعد جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کے لیے اس قسم کی کٹ حجتیاں پیدا کر رہے تھے جن کی تفصیل اوپر بیان ہوئی اب یہ ان ارباب بصیرت کا بیان ہو رہا ہے جو اللہ کو ہر جگہ اور ہر حال میں یاد رکھتے ہیں اور زمین و آسمان کی خلقت پر برابر غور کرتے رہتے ہیں۔ فرمایا کہ یہ ذکر و فکر خود بخود ان کو اس نتیجے تک پہنچا دیتا ہے کہ یہ عظیم کارخانہ بے غایت و بے مقصد نہیں ہو سکتا، اور جب بے غایت و بے مقصد نہیں ہو سکتا تو لازم ہے کہ یہ محض اتنے ہی پر تمام نہ ہو جائے جتنا ظاہر ہو رہا ہے بلکہ ضروری ہے کہ ایک دن ایسا آئے جس میں گنہگار اور نیکوکار دونوں اپنے اپنے اعمال کا بدلہ پائیں اور اس دنیا کی خلقت میں جو عظیم حکمت پوشیدہ ہے وہ ظاہر ہو۔

فلسفۂ کائنات

آسمان و زمین کی خلقت اور رات اور دن کی آمد و شد میں جو نشانیاں ہیں ان کی طرف یہاں صرف اجمالی اشارہ ہے ان کی تفصیل پورے قرآن میں پھیلی ہوئی ہے۔ قرآن نے بڑی وضاحت کے ساتھ گوناگوں پہلوؤں سے آفاق کی ان نشانیوں کو نمایاں کیا ہے جو شہادت دیتی ہیں کہ اس کائنات کے پیچھے صرف ایک عظیم طاقت ہی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ عظیم حکمت بھی ہے، صرف بے پناہ قدرت ہی نہیں ہے بلکہ بے پایاں رافت و رحمت بھی ہے، صرف بے اندازہ کثرت ہی نہیں ہے بلکہ اس کثرت کے اندر نہایت حیرت انگیز توافق و توازن بھی ہے۔ یہ چیز ظاہر کرتی ہے کہ اس دنیا کا پیدا ہونا نہ تو کوئی اتفاقی سانحہ ہے نہ کسی کھلنڈرے کا کھیل ہے بلکہ یہ ایک قدیر و حکیم، عزیز و غفور اور سمیع و علیم کی بنائی ہوئی دنیا ہے۔ اس وجہ سے یہ بات اس کی فطرت کے خلاف ہے کہ یہ خیر و شر اور نیک و بد کے درمیان امتیاز کے بغیر یوں ہی چلتی رہے یا یوں ہی تمام ہو جائے۔ اگر ایسا ہو تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ یا تو اس کا کوئی خالق و مالک ہی نہیں ہے، یہ آپ سے آپ کہیں سے آدھمکی ہے اور اسی طرح چلتی رہے گی یا یہ کہ نعوذ باللہ اس کا خالق کوئی کھلنڈرے مزاج کا ہے جو کسی کو گداگر، کسی کو تونگر، کسی کو ظالم اور کسی کو مظلوم بنا کر اس کا تماشہ دیکھ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں اس قدرت اور اس حکمت کے بالکل منافی ہیں جن کی شہادت اس کائنات کے گوشے گوشے سے مل رہی ہے۔ ایسی علیم و حکیم ہستی کی شان علم و حکمت کے یہ بات بالکل منافی ہے کہ وہ کوئی بے حکمت کام کرے۔

اس طرح اس کائنات کی قدرت و حکمت پر غور کرنے والا شخص نہ صرف خدا تک بلکہ اقرار آخرت تک خود پہنچ جاتا ہے اور جس کا ذہن اس حقیقت تک پہنچ جائے گا ظاہر ہے کہ جزا و سزا کے تصور سے اس کا دل کانپ اٹھے گا اور اس کے اندر شدید داعیہ اس بات کے لیے پیدا ہوگا کہ وہ اس عذاب اور اس رسوائی سے پناہ مانگے جو ان لوگوں کے لیے مقدر ہے جو اس دنیا کو بس ایک کھلنڈرے کا کھیل سمجھتے رہے اور اس طرح انھوں نے اپنی ساری زندگی بالکل بطالت میں گزار دی۔

چند نکات

یہ ان آیات کا سیدھا سادا مطلب ہوا۔ ان پر مزید غور کیجیے تو چند اور باتیں بھی سامنے آئیں گی اور وہ بھی نہایت قیمتی ہیں۔

ایک یہ کہ قرآن کے نزدیک اولوا الالباب صرف وہ لوگ ہیں جو اس کائنات کے نظام پر غور کر کے خدا کے ذکر اور آخرت کی فکر تک رہنمائی حاصل کریں۔ جن کو یہ چیز حاصل نہیں ہوتی وہ اگرچہ آسمان و زمین کی تمام مسافت ناپ ڈالیں اور چاند و مریخ تک سفر کر آئیں لیکن وہ اولوا الالباب نہیں ہیں۔ ان کے سروں پر کھوپڑیاں تو ہیں لیکن ان کے اندر مغز نہیں ہے۔ اگر ان کے اندر مغز ہوتا تو یہ کس طرح ممکن تھا کہ انھیں سب کچھ نظر آ جاتا اور یہ تل کی اوٹ میں چھپا ہوا پہاڑ نظر نہ آتا۔

دوسری یہ کہ جہاں تک خدا کا تعلق ہے وہ فکر و نظر کا محتاج نہیں ہے۔ وہ اس کائنات کی بدیہی

حقیقت بلکہ ابدہ البدیہیات ہے۔ اس کائنات کا ذرہ ذرہ اس کی منادی کر رہا ہے۔ ہماری فطرت اس کی شہادت دے رہی ہے۔ انسان کے اندر اگر عقلِ سلیم ہو تو وہ خدا کو اسی طرح دیکھتی ہے جس طرح سلیم آنکھ سورج کو دیکھتی ہے۔ خدا کو پانے کے لیے یہ کافی ہے کہ انسان اس کو یاد رکھے۔ البتہ آخرت کا معاملہ تفکر و تدبر کا محتاج ہے۔

تیسری یہ کہ جہاں تک ذکرِ الٰہی کا تعلق ہے وہ ہر حال میں مطلوب ہے۔ اس کے لیے قیام و قعود، نرمی و گرمی اور صبح و مسا کی کوئی قید نہیں ہے۔ انسان کی مادی زندگی کے بقا کے لیے جس طرح سانس کی آمد و شد ضروری ہے اسی طرح اس کی روحانی زندگی کے بقا کے لیے اللہ کی یاد ضروری ہے اور قرآن کی زیرِ بحث آیات سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ اولوالالباب کی خاص صفت یہی ہوتی ہے کہ وہ اللہ کی یاد سے کبھی غافل نہیں ہوتے۔

چوتھی یہ کہ دین میں جس طرح ذکر مطلوب ہے اسی طرح فکر بھی مطلوب ہے۔ اگر ذکر ہو اور فکر نہ ہو تو بسا اوقات یہ ذکر صرف زبان کا ایک شغل بن کے رہ جاتا ہے۔ اس سے معرفت کے دروازے نہیں کھلتے۔ اولوالالباب کے ذکر کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ اس کے ساتھ فکر بھی ہوتا ہے جس کی وجہ سے ان کے قدم درجہ بدرجہ حکمت و معرفت میں راسخ ہوتے جاتے ہیں اس لیے کہ یہی فکر، آخرت کے یقین کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔

پانچویں یہ کہ اس کائنات میں تفکر سے جس طرح اولوالالباب اس حقیقت تک پہنچ جاتے ہیں کہ یہ کائنات کسی کھلنڈرے کا کھیل نہیں ہے اس وجہ سے ایک روزِ عدل کا ظہور ضروری ہے اسی طرح یہ حقیقت بھی ان پر واضح ہو جاتی ہے کہ اس دن حقیقی رسوائی سے وہ لوگ دوچار ہوں گے جو جھوٹی شفاعتوں پر تکیہ کیے بیٹھے ہیں اس لیے کہ اس دن ایسے بدقسمتوں کا کوئی بھی مددگار نہ ہوگا۔[1]

رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِیْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۖ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ۝ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝ فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِیْ سَبِيْلِیْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ (۱۹۳ - ۱۹۵)

---

[1] اگر قیامت میں باطل شفاعتوں کے لیے گنجائش مان لی جائے تو یہ دنیا پھر اسی طرح بازیچۂ اطفال بن کے رہ جاتی ہے جس طرح آخرت نہ ماننے کی صورت میں۔ اور یہ بات بالبداہت غلط ہے۔

دعوت اسلامی کے باب میں اولوالالباب کا رویہ

اب یہ مذکورہ بالا اولوالالباب کا رویہ بیان ہو رہا ہے کہ وہ اللہ کے رسول اور اس کی دعوت کے ساتھ کیا معاملہ کرتے ہیں۔ فرمایا کہ نہ وہ کٹ حجتیاں کرتے، نہ خوارق اور معجزات مانگتے۔ پیغمبر کی دعوت خود ان کے اپنے دل کی آواز ہوتی ہے۔ وہ جس خدا اور آخرت پر ایمان کی دعوت دے رہا ہوتا ہے اس کی شہادت وہ خود اپنے باطن سے سنتے ہیں اس وجہ سے ان کے لیے پیغمبر کی آواز اور اس کا چہرہ ہی معجزے کا کام کرتا ہے۔ جب اس کی دعوت سنتے ہیں تو اس کی مخالفت کر کے اس کو دبانے کے بجائے اس پر لبیک کہتے ہیں اور اپنے پروردگار سے دعا کرتے ہیں کہ ان کے گناہوں کو وہ معاف فرمائے، ان کی لغزشوں سے درگزر فرمائے اور ان کا خاتمہ اپنے وفا شعار بندوں کے ساتھ کرے۔

بدعہدوں پر ایک لطیف تعریض

'تَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ' خدا کے وفادار بندوں کے زمرے میں شامل کیے جانے کی تمنا کا اظہار ہے۔ یعنی جب ہمارا خاتمہ ہو تو ہمیں ان کی معیت نصیب ہو جو آخر دم تک تیرے عہد و پیمان میں مضبوط رہے۔ لفظ 'بار' پر ہم دوسرے مقام میں گفتگو کر چکے ہیں کہ اس لفظ کی اصل روح وفاداری، پابندی عہد و میثاق اور ادائے حقوق و فرائض ہے۔ اس پہلو سے غور کیجیے تو یہاں اس میں ان اہل کتاب پر ایک لطیف تعریض بھی ہے جن سے آخری رسول کی تائید و حمایت کا عہد لیا گیا تھا لیکن انھوں نے اس عہد کے برخلاف سارا زور اس کی مخالفت میں صرف کیا۔ یہ واضح رہے کہ یہاں کلام میں پیش نظر اہل کتاب ہی ہیں۔

صحیح اور بروقت دعا قبول ہوتی ہے

'فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ' نہایت بلیغ اسلوب میں دعا کی قبولیت کا اظہار ہے۔ گویا ادھر ان کی زبان سے دعا کے الفاظ نکلے ادھر بارگاہ خداوندی سے ان کی قبولیت کی سند مل گئی۔ جو دعائیں صحیح جذبے کے ساتھ صحیح محل اور ٹھیک وقت پر نکلتی ہیں ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ یہی ہے۔ اس حقیقت کی طرف ہم دوسرے مقام میں بھی اشارہ کر چکے ہیں۔

دعا کی بلاغت

یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ اولوالالباب کی طرف سے حق کی یہ تائید دعوے کی شکل میں نہیں بلکہ دعا کی شکل میں سامنے آئی ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اپنے اس 'آمَنَّا' کی ذمہ داریوں اور اس کی مشکلات سے اچھی طرح واقف ہیں اس وجہ سے بجائے اس کے کہ وہ اس کا اظہار فخر کے ساتھ کرتے انھوں نے نہایت عاجزی اور فروتنی کے ساتھ اپنے آپ کو اپنے رب کے آگے ڈال دیا ہے کہ جس طرح اس نے یہ 'آمَنَّا' کہنے کی توفیق دی ہے اسی طرح وہ تمام اگلی اور پچھلی کوتاہیوں سے درگزر فرمائے اور اس راہ کی ذمہ داریوں اور مشکلات سے عہدہ برا ہونے کی توفیق دے۔

مظلوموں اور کمزوروں کی حوصلہ افزائی

'لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى' میں تمام اہل ایمان کی حوصلہ افزائی ہے جو دعوت اسلامی کے اس نازک مرحلے میں اس کی تائید کے لیے خطرات سے بے پروا ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ یہ مرحلہ، جیسا کہ فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا کے الفاظ سے واضح ہے، ہجرت، جہاد، راہ خدا میں مصائب جھیلنے اور مرنے مارنے کا مرحلہ تھا۔ اس شکل وقت میں جو لوگ

اس میدان عشق میں سر دھڑ کی بازیاں لگا کر اترے تھے ان میں آزاد بھی تھے اور غلام بھی، مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ اور سب ایک سے ایک بڑھ کر قربانیاں پیش کر رہے تھے اور ایمان و اسلام کے جرم میں معاندین اسلام کے ہاتھوں لرزہ خیز مظالم کا ہدف بنے ہوئے تھے۔ خاص طور پر کمزوروں یعنی عورتوں اور غلاموں پر جو ستم توڑے جا رہے تھے ان کو سن کر تو آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں لیکن یہ اسلام کا معجزہ ہے کہ کفار کی یہ تمام ستم رانیاں کسی ایک شخص کو بھی اسلام سے پھیرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں بلکہ یہ کہنا بھی ذرا مبالغہ نہیں ہے کہ جو جتنا ہی کمزور تھا اس نے اسی قدر زیادہ استقلال اور پامردی کا ثبوت دیا۔ یہ صورت حال مقتضی ہوئی کہ اللہ تعالیٰ اپنے وعدے میں ان کمزوروں کی دلداری اور حوصلہ افزائی کا خاص طور پر اہتمام فرمائے۔ چنانچہ ارشاد ہوا کہ اِنِّیْ لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ تم میں سے جو شخص بھی آج میرے دین کی کوئی خدمت کر رہا ہے میں اس کو ضائع نہیں کروں گا بلکہ اس کا بھرپور صلہ دوں گا۔ اس کے بعد اس کے ساتھ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی کے الفاظ بھی بڑھا دیے یعنی عام اس سے کہ مرد ہو یا عورت، جو بھی آج میرے لیے کوئی دکھ جھیل رہا ہے میرا یہ وعدہ ان سب کو شامل ہے۔ اس ٹکڑے نے کلام کو بالکل مطابق حال کر دیا۔ اور کون اندازہ کر سکتا ہے کہ ان دو لفظوں نے ان مظلوم خواتین کی کتنی ڈھارس بندھائی ہوگی جو محض اسلام کی خاطر طرح طرح کے مظالم کا نشانہ بنی ہوئی تھیں!

اعمال کی میزان میں عورت اور مرد دونوں برابر ہیں

'بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ' اثنائے کلام میں بالکل ضمنی طور پر اس بات کی دلیل بیان ہو گئی ہے کہ کیوں اللہ تعالیٰ کی میزان میں مرد اور عورت دونوں کا عمل بالکل یکساں وزن رکھتا ہے؟ فرمایا کہ اس لیے کہ عورت اور مرد دونوں ایک ہی جنس سے ہیں، دونوں ایک ہی آدم و حوا کی اولاد ہیں، دونوں ایک ہی قسم کے گوشت پوست سے بنے ہوئے ہیں۔ ان دو لفظوں سے قرآن نے ان تمام جاہلی نظریات اور غلط مذہبی تصورات کی تردید کر دی جو عورت کو مرد کے مقابل میں، ایک فروتر مخلوق قرار دیتے تھے۔ اس مسئلے پر ہم آگے والی سورہ میں بحث کرنے والے ہیں اس وجہ سے یہاں اس مختصر اشارے پر کفایت کرتے ہیں۔

عمل اور ردعمل

'ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ' ثاب، یثوب، ثوبا کے اصل معنی رجوع کرنے اور لوٹنے کے ہیں۔ اسی سے ثواب ہے جس کے معنی اس ثمرے اور نتیجے کے ہیں جو کسی عمل کرنے والے کے عمل کے ردعمل کے طور پر اس کو حاصل ہو۔ اگرچہ لفظ میں گنجائش خیر اور شر دونوں کی ہے لیکن اس کا غالب استعمال اچھے عمل کے اچھے ردعمل کے لیے ہے۔ بندوں کے حقیر اعمال پر اللہ تعالیٰ جو ابدی اور لازوال انعامات عطا فرمائے گا ان کو ثواب کے لفظ سے تعبیر کر کے رب کریم نے بندوں کے اعمال کی قدر و قیمت بڑھائی ہے۔ ورنہ ذرے اور پہاڑ میں کیا نسبت ہے۔ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ کے الفاظ سے اسی بُعد کو رفع فرمایا گیا ہے۔ یعنی ہے تو تمہارے ہی عمل کا بدلہ لیکن ہے اللہ کے پاس سے جس کے پاس حسن ثواب کے خزانے ہیں، وہ داتا جس کو جتنا چاہے دے دے۔ اس کے پاس کیا کمی ہے۔

لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي الْبِلَادِ ۝ مَتَاعٌ قَلِيلٌ قف ثُمَّ مَأْوٰهُمْ جَهَنَّمُ ط وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝ لٰكِنِ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ خٰلِدِينَ فِيهَا نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ط وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْأَبْرَارِ (۱۹۶-۱۹۸)

لا یغرنک میں خطاب عام ہے

'لَا يَغُرَّنَّكَ' میں خطاب عام مسلمانوں سے ہے۔ اس طرح واحد کے صیغے سے خطاب، ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں، اس امر کو ظاہر کرتا ہے کہ مخاطب گروہ کا ایک ایک شخص فرداً فرداً مخاطب ہے۔

'تقلب' کا مفہوم

'تَقَلُّبُ' کے معنی آمد و شد، چلت پھرت اور ایاب و ذہاب کے ہیں۔ موقع و محل کے لحاظ سے اس کے اندر غرور، اکڑ اور دندنانے کے معنی بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس آیت میں موقع کلام دلیل ہے کہ اس سے مراد اس وقت کفار کا ملک کے حالات و معاملات میں وہ آزادانہ و خود مختارانہ تصرف ہے جو مسلمانوں کے مقابل میں ان کو حاصل تھا۔ اس وقت تک مسلمان ابھی کمزور اور مظلوم تھے۔ اور کفار اپنی سطوت کے گھمنڈ میں ہر جگہ دندناتے پھر رہے تھے اور کمزور مسلمانوں پر ظلم ڈھاتے تھے۔

'نُزُل'، اس ضیافت و میزبانی کو کہتے ہیں جو کسی مہمان کی آمد پر سب سے پہلے پیش کی جاتی ہے۔

'مَتَاعٌ قَلِيلٌ' مبتدائے محذوف کی خبر ہے اور یہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ جب اس طرح مبتدا کو حذف کر دیں تو مقصود اس سے ساری توجہ صرف خبر پر مرکوز کرانا ہوتا ہے۔

مسلمانوں کی مزید حوصلہ افزائی

اوپر کی آیات میں کمزور اور مظلوم مسلمانوں کی جو حوصلہ افزائی فرمائی گئی ہے اسی مضمون کی یہ مزید تائید ہے۔ مسلمانوں کو بالخصوص کمزور اور مظلوم مسلمانوں کو خطاب کر کے یہ اطمینان دلایا جا رہا ہے کہ اس وقت کفار کو ملک میں جو غلبہ اور زور حاصل ہے اس سے کوئی مغالطہ نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ چمک دمک محض چند روزہ ہے۔ اس کے بعد ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ نہایت برا ٹھکانا ہے۔ حقیقی اور ابدی کامیابی انہی لوگوں کے لیے ہے جو تقویٰ اختیار کریں گے اور تقویٰ پر قائم رہیں گے۔ ان کے لیے پہلی پیشکش جو ہو گی وہ جنت کی ہو گی اور ایسے وفادار بندوں کے لیے ان کے رب کے پاس مزید جو کچھ ہے وہ ایک سے ایک بڑھ کر ہے۔

وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ط اُولٰٓئِكَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ط اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ (۱۹۹)

اچھے اہل کتاب کی تحسین

اوپر کی آیات اور بحیثیت مجموعی اس پوری سورہ میں اہل کتاب کے رویے کی چونکہ شدید مذمت ہوئی ہے اس وجہ سے یہ آخر میں ان اہل کتاب کی تحسین فرمائی جو اپنی سابقہ کتب پر بھی قائم رہے اور دولت اسلام سے بھی مشرف ہوئے۔ یہ اس بات کی طرف ایک نہایت لطیف اشارہ ہے کہ اس دودھ میں جتنا مکھن تھا وہ نکل آیا ہے۔ اب جو بچ رہا ہے وہ صرف چھاچھ ہے۔ ان کے بابت فرمایا کہ یہ لوگ اپنا وہ

اجر خدا کے ہاں پائیں گے جو ان کے لیے خاص ہے۔ پھر تسلی دی کہ یہ خیال نہ کریں کہ اس اجر کے ملنے میں بہت دیر ہے۔ جب یہ اجر ملے گا تو یہ معلوم ہوگا کہ یہ پسینہ خشک ہونے سے پہلے ہی مل گیا۔ اِنَّ اللّٰہَ سَرِیۡعُ الۡحِسَابِ جب تسلی کے موقع پر آتا ہے تو اس کا یہی مفہوم ہوتا ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اصۡبِرُوۡا وَصَابِرُوۡا وَرَابِطُوۡا ۟ وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ (۲۰۰)

شریعت کے حقوق ادا کرنے کے لیے بنیادی ہدایات

یہ اس سورہ کی آخری آیت ہے جس میں خاتمہ کلام کے طور پر وہ تمام بنیادی ہدایات جمع کر دی گئی ہیں جو شریعت کے حقوق ادا کرنے اور ان حالات و مشکلات سے عہدہ برا ہونے کے لیے ضروری تھیں جن میں مسلمان گھرے ہوئے تھے۔ یہ ہدایات چار چیزیں اختیار کرنے اور ان پر مضبوطی کے ساتھ جمے رہنے کے لیے ہیں۔

'صبر' کی حقیقت

پہلی چیز صبر ہے۔ اس لفظ پر سورۂ بقرہ کی تفسیر میں ہم بڑی تفصیل کے ساتھ گفتگو کر چکے ہیں۔ اس لفظ کی اصل روح کسی حق پر اپنے آپ کو مزاحمتوں کے مقابل میں جمائے رکھنا ہے۔ عام اس سے کہ یہ مزاحمتیں خود اپنے اندر سے سر اٹھائیں یا خارج سے حملہ آور ہوں اس خصلت کو پختہ کیے بغیر کوئی شخص کسی چھوٹے سے چھوٹے حق کا بھی حق ادا نہیں کر سکتا۔

'مصابرت' کی حقیقت

دوسری چیز مصابرت ہے۔ مصابرت کے معنی ہیں اپنے حریف کے مقابل میں ثابت قدمی کا مظاہرہ اور اس پر اس وصف میں بازی لے جانے کی کوشش کرنا۔ اس چیز کی تاکید اس موقع پر، خاص طور سے اس وجہ سے کی گئی کہ اس مرحلے میں مسلمانوں اور ان کے دشمنوں کے درمیان عملاً مسلح کشمکش شروع ہو چکی تھی اور اس کشمکش میں آخری کامیابی اس گروہ کے لیے مقدر تھی جو اپنے حریف پر استقلال و پامردی کے میدان میں بازی لے جا سکے۔ میدانِ جنگ میں فتح و شکست کا اصلی انحصار تعداد اور اسلحہ پر نہیں بلکہ اخلاق و کردار پر ہوتا ہے۔

'مرابطت' کی حقیقت

تیسری چیز مرابطہ ہے۔ مرابطہ، ربط الخیل سے ہے۔ اس کا اصلی ابتدائی مفہوم دشمن کے مقابلے اور اپنی سرحدوں کی حفاظت کے لیے جنگی گھوڑے تیار کر رکھنا ہے۔ اب گھوڑوں کی جگہ ٹینکوں اور ہوائی جہازوں نے لے لی ہے اس وجہ سے حالات کی تبدیلی سے اس لفظ کا مفہوم بھی تبدیل ہو جائے گا۔ مصابرت کی ہدایت کے بعد یہ مرابطت کی ہدایت دشمن کے مقابلے کے لیے اخلاقی تیاری کے ساتھ ساتھ مادی تیاری کی ہدایت ہے۔

'تقویٰ' کی حقیقت

چوتھی چیز تقویٰ ہے۔ اس لفظ پر تفسیر سورۂ بقرہ کے شروع میں ہم تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔ خدا کے مقرر کردہ تمام حدود و قیود کی اخلاص و خشیت کے ساتھ نگرانی کرنا تقویٰ ہے۔ یہی چیز تمام دین کا خلاصہ اور مقصود ہے۔

فرمایا کہ مسلمانو، یہ چیزیں اختیار کرو تاکہ تم دنیا اور آخرت دونوں میں فلاح پاؤ۔

یہ آخری سطریں ہیں جو آل عمران کی تفسیر میں اس بے مایہ کو لکھنے کی توفیق حاصل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ لغزشوں کو معاف فرمائے اور صحیح باتوں کے لیے دلوں میں جگہ پیدا کرے۔ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

لاہور
۲۳ ربیع الثانی ۱۳۸۶ھ
۱۱ اگست ۱۹۶۶ء

تدبّرِ قرآن

۴

النسآء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ اپنی سابق سورہ ــــ آلِ عمران ــــ کے بعد اس طرح شروع ہو گئی ہے کہ اس کے ابتدائی الفاظ ہی سے نمایاں ہو جاتا ہے کہ یہ آلِ عمران کا تکملہ و تتمہ ہے۔ آلِ عمران کی آخری اور نساء کی پہلی آیت پڑھیے تو معلوم ہو گا کہ جس اہم مضمون پر آلِ عمران ختم ہوئی ہے اسی مضمون سے سورۂ نساء کی تمہید استوار ہوئی ہے۔ گویا آلِ عمران کے خاتمے اور نساء کے آغاز نے ایک حلقۂ اتصال کی صورت اختیار کر لی ہے۔ آلِ عمران کی آخری آیت یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ہے جس میں مسلمانوں کو فوز و فلاح کی راہ یہ بتائی گئی ہے کہ وہ انفرادی و اجتماعی حیثیت سے ثابت قدمی دکھائیں، آپس میں جڑے، دشمن کے مقابل میں ڈٹے اور خدا سے ڈرتے رہیں۔ اب اس سورہ کو دیکھیے تو اسی 'اِتَّقُوا اللّٰهَ' کے مضمون سے شروع ہو گئی ہے۔ (یا یہا الناس اتقوا ربکم) اور آگے آپس میں جڑے رہنے اور مخالفین کے بالمقابل ثابت قدمی کے لئے جو باتیں ضروری ہیں وہ نہایت وضاحت و تفصیل کے ساتھ بیان ہوئی ہیں[1]۔

ثابت قدمی بالخصوص اجتماعی ثابت قدمی بغیر مضبوط جماعتی اتصال کے ممکن نہیں ہے اور جماعتی اتصال کوئی اتفاق سے پیدا ہو جانے والی چیز نہیں ہے بلکہ یہ بنیاد کا بھی محتاج ہے، مثبت تدابیر کا بھی متقاضی ہے اور اس کو ان فتنوں سے محفوظ رکھنے کی بھی ضرورت ہے جو اس کو درہم برہم کر سکتے ہوں۔ چنانچہ اس سورہ میں وہ ساری چیزیں بیان ہوئی ہیں جو اسلامی معاشرہ اور اس کے فطری نتیجہ اسلامی حکومت کو مستحکم رکھنے اور اس کو انتشار سے بچانے کے لئے ضروری ہیں۔

اس سورہ کے مطالب پر ایک سرسری نظر بھی ڈالئے تو معلوم ہو گا کہ اس کا آغاز اس حقیقت کے اظہار

---

[1] سابق اور لاحق سورہ میں ربط کی یہ صورت صرف انہی دو سورتوں کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ اس کی متعدد نہایت لطیف مثالیں قرآن مجید میں موجود ہیں جو اپنے مواقع پر بیان ہوں گی۔

سے ہوتا ہے کہ اسلامی معاشرہ اس عقیدے پر قائم ہے کہ مرد اور عورت سب کا خالق اللہ وحدہٗ لا شریک ہی ہے، اُسی نے سب کو ایک آدم و حوا سے وجود بخشا ہے۔ اس وجہ سے خدا اور رحم سب کے درمیان مشترک ہیں۔ اس کے بعد معاشرے کے سب سے زیادہ کمزور عناصر یتیموں اور عورتوں کے حقوق معین فرمائے ہیں اور ان کو ادا کرنے پر زور دیا ہے۔ پھر اسی تعلق سے وراثت کی تقسیم سے متعلق قانون کی وضاحت فرمائی ہے۔ پھر مسلمانوں کے باہمی حقوق و فرائض پر زور دیتے ہوئے اللہ، رسول اور اولوالامر کی اطاعت پر سب کو مجتمع و متفق رہنے کی تاکید فرمائی، اس لئے کہ اسی چیز پر اسلامی حکومت کی بنیاد ہے۔ اس کے بعد تفصیل کے ساتھ منافقین کی قلعی کھولی ہے جو اسلامی معاشرے کے اندر ناسور کی حیثیت رکھتے تھے اور مسلمانوں کے اندر ان کے دشمنوں ــــ یہود و نصاریٰ ــــ کے ایجنٹ کے طور پر کام کر رہے تھے۔ اس روشنی میں غور کیجئے تو اس سورہ میں گویا اس ارتباط باہمی کی بنیادیں استوار کی گئی ہیں جس کی ہدایت پر سابق سورہ ختم ہوئی تھی۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

یہ سورہ کے عمود اور سابق سورہ کے ساتھ اس کے تعلق کی طرف ایک اجمالی اشارہ تھا۔ اب ہم اس کے مطالب کا تجزیہ بھی کئے دیتے ہیں تاکہ پوری سورہ کے مضامین پر ایک سرسری نگاہ پڑ جائے۔

(۱-۶) اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنے کی ہدایت جس نے سب کو ایک ہی جان سے پیدا کیا، تمام مرد اور تمام عورتیں ایک ہی آدم و حوا کی اولاد ہیں اس وجہ سے خدا اور رشتۂ رحم سب کے درمیان مشترک ہے۔ اس کا بدیہی تقاضا یہ ہے کہ سب خدا سے ڈرتے رہیں اور سب رشتۂ رحم کا احترام ملحوظ رکھیں۔ انہی دو بنیادوں پر اسلامی معاشرہ کی عمارت قائم ہے۔

یتیموں کے حقوق ادا کرنے کی تاکید اور اس بات کی ممانعت کہ زورآور سرپرست اپنے رشتہ دار یتیموں کے اچھے مال اپنے بُرے مال سے بدلنے یا اپنے مال کے ساتھ ملا کر اس کو ہڑپ کرنے کی تدبیریں کریں۔ یتیموں کے حقوق کے تحفظ کے نقطۂ نظر سے ان کی ماؤں سے نکاح کی اجازت اور اس کے لئے چار تک کی قید، عدل اور ادائے مہر کے شرائط کے ساتھ تعدد ازواج کی رُخصت۔

سرپرستوں کو اس بات کی ہدایت کہ وہ اس وقت تک یتیموں کے مال و جائداد اُن کے حوالہ نہ کریں جب تک اُن کے اندر معاملات کی سُوجھ بُوجھ نہ پیدا ہو جائے لیکن اس دوران میں ان کی ضروریات اور ان کی دلداری کا پورا خیال رکھیں۔ جب اُن میں معاملات کی سُوجھ بُوجھ پیدا ہو جائے تو ان کا مال ان کے حوالہ کر دیا جائے۔ اس تولیت کے دوران میں اگر کوئی سرپرست غریب ہو تو یتیم کے مال میں سے بقدرِ کفاف لے سکتا ہے لیکن اس کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ یتیم کے بڑے ہو جانے کے اندیشے سے اس کے

بڑے ہونے سے پہلے ہی اس کی ساری املاک دبانے اڑا دینے کی کوشش کرے۔

(۷-۱۴) تقسیم وراثت کے ضابطے کی تفصیل تاکہ ضعیف و قوی سب کے حقوق معین ہو جائیں اور معاشرے میں ظلم و حق تلفی اور نزاع و مخاصمت کے دروازے بند ہو جائیں۔

(۱۵-۱۸) معاشرے کو فواحش سے پاک رکھنے کے لئے ایک ابتدائی حکم اور اس کے تعلق سے اس امر کی وضاحت کہ کن لوگوں کی توبہ قبول ہوتی ہے، کن کی نہیں؟

(۱۹-۲۱) اس امر کا بیان کہ عورت مالِ وراثت نہیں ہے کہ باپ کی منکوحہ بیٹے کو وراثت میں ملے عورتوں سے اپنا دیا ہوا مال واپس لینے کے لئے ان کو تنگ نہ کیا جائے۔ اگر کوئی شخص ایک عورت کو چھوڑنا اور دوسری سے نکاح کرنا چاہتا ہے تو محض مال اینٹھنے کے لئے پہلی کو تہمت اور بہتان کا ہدف نہ بنائے۔

(۲۲-۲۵) باپ کی منکوحہ کے ساتھ بیٹے کو نکاح کی ممانعت اور ان عورتوں کی تفصیل جن کے ساتھ نکاح ناجائز ہے۔ نیز شرائط نکاح کا بیان تاکہ معاشرہ بدکاری و بے حیائی اور ظلم و زیادتی کے مفاسد سے پاک رہے۔ جو لوگ اس وقت آزاد عورتوں سے نکاح کی استطاعت نہیں رکھتے تھے ان کو مسلمان لونڈیوں سے بعض شرائط کے ساتھ نکاح کی اجازت اور قید نکاح میں آجانے کے بعد اگر ان لونڈیوں سے بدکاری کا صدور ہو تو ان کے لئے تعزیر کا ضابطہ۔

(۲۶-۲۸) مسلمانوں کو آگاہی کہ اللہ تعالیٰ ان احکام و ہدایات کے ذریعے سے تمہاری رہنمائی ایمان، عمل صالح اور توبہ و اصلاح کی اس شاہ راہ کی طرف فرما رہا ہے جو اس نے ہمیشہ سے اپنے صالح بندوں کے لئے پسند فرمائی ہے۔ ان احکام و ہدایات میں اس نے وہ سہولت بھی ملحوظ رکھی ہے جو لوگوں کی طبعی کمزوری کے پیش نظر ضروری تھی تو خبردار ان نفس پرستوں کے ورغلانے میں نہ آجانا جو تمہیں پاکیزگی کی اس شاہ راہ سے ہٹا کر شہوات کی وادیوں میں بھٹکا دینے کے لئے اپنا ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے ہیں۔

(۲۹-۳۱) مسلمانوں کو ایک دوسرے کا مال ناجائز ذرائع سے کھانے اور ایک دوسرے کا خون بہانے کی ممانعت۔ خدا رحیم ہے اس وجہ سے وہ چاہتا ہے کہ اس کے بندے آپس میں ایک دوسرے کے لئے رحیم ہوں۔ جو لوگ معاشرے میں ظلم و عدوان کی تخم ریزی کریں گے وہ سب جہنم میں جھونک دیئے جائیں گے۔ البتہ جو لوگ بڑے گناہوں سے بچتے رہیں گے اللہ تعالیٰ ان کے چھوٹے گناہوں سے درگزر فرمائے گا۔

(۳۲-۳۳) شریعت میں عورت اور مرد دونوں کے لئے جو حدود و حقوق معین کر دیئے گئے ہیں سب ان کے اندر رہیں۔ اپنے اپنے حدود کے اندر ہر ایک خدا کے ہاں اپنی محنت کا اجر پائے گا۔ اس لئے ایک دوسرے کی ریس اور ایک دوسرے کا مقابلہ کرنے کی کوشش نہ کریں۔ خدا نے حقوق بھی معین فرما دیئے ہیں اور فرائض بھی اور وہ سب کو دیکھ بھی رہا ہے۔

(۳۴-۳۵) خاندان اور معاشرے میں سربراہی اور قوامیت کا مقام مرد کو حاصل ہے۔ اپنی خلقی صفات

اور کفالتی ذمہ داریوں کے لحاظ سے وہی اس کے لئے موزوں ہے۔ نیک بیبیاں اس حق کا احترام کرتی ہیں۔ جن عورتوں سے سرکشی کا اندیشہ ہو ان کو ان کے شوہر نصیحت کریں اور اگر ضرورت محسوس کریں تو ایک حد مناسب تک ان کو تنبیہ بھی کر سکتے ہیں اور اگر محسوس ہو کہ فریقین کے اختلاف کی نوعیت کچھ زیادہ شدید ہے تو اس کے لئے یہ تدبیر اختیار کی جائے کہ میاں اور بیوی دونوں کے خاندانوں سے ایک ایک پنچ مقرر کر دیا جائے، جو حالات کی اصلاح کی کوشش کریں۔

(۳۶-۴۰) خدا، والدین، اقربا، یتامیٰ، مساکین، پڑوسی (عام اس سے کہ قرابت مند ہو یا غیر قرابت مند، مستقل ہو یا عارضی اور وقتی) مسافر اور غلام، سب کے حقوق پہچاننے اور ادا کرنے کی تاکید۔ خدا کو وہی بندے پسند ہیں جو متواضع اور نرم مزاج ہوں، وہ اُن لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو اکڑنے والے، فخر کرنے والے، بخیل اور بخل کا مشورہ دینے والے ہوں، جو اول تو ادائے حقوق میں خرچ ہی نہ کریں اور اگر کریں تو محض ریا و نمائش کے لئے۔ ادائے حقوق اور خدا کی راہ میں خرچ کرنے والے گھاٹے میں رہنے والے نہیں۔ ان کے لئے خدا کے ہاں بڑا اجر ہے۔

(۴۱-۴۲) ان لوگوں کے حال پر اظہار افسوس جو آخرت سے بالکل بے پروا ہو کر اللہ اور اُس کے رسول کی نافرمانی پر اٹھے ہوئے تھے، ایمان و عمل صالح کی صحیح راہ خود اختیار کرتے تھے نہ دوسروں کو اختیار کرنے دینا چاہتے تھے۔

(۴۳-۴۵) خدا کے سب سے بڑے حق — نماز — کے بعض آداب و شرائط اور اس کے بعض مفسدات کا بیان اور ان مفسدات کے ازالہ کی تدبیر۔

(۴۶-۴۷) یہود کی بعض شرارتوں کا حوالہ جو وہ اسلام اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں کی نگاہوں سے گرانے کے لئے کر رہے تھے اور اس شرارت کے آخری نتائج سامنے آنے سے پہلے ان کو توبہ اور اصلاح کی دعوت۔

(۴۸-۵۷) یہود اپنی پاکی و برتری کے جھوٹے دعوے کر کے مسلمانوں کو گرانے کی جو کوشش کر رہے تھے، یہاں تک کہ مشرکین کو بھی ان پر ترجیح دیتے تھے، اُس کی تردید کہ یہ ساری باتیں محض ان کے حسد کا نتیجہ ہیں لیکن ان کے حسد کے علی الرغم اللہ تعالیٰ نے نبی خاتمؐ اور ان کی امت کے لئے یہ فیصلہ فرما لیا ہے کہ وہ ان کو کتاب و حکمت اور ایک عظیم حکومت عطا فرمائے گا اور یہ حاسد یہود ان کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکیں گے۔ یہ حکومت گویا اسلامی معاشرے کا قدرتی ثمرہ ہے۔

(۵۸-۵۹) مسلمانوں کو اس بات کی نصیحت کہ اب اہل کتاب سے چھین کر شریعت الٰہی کی یہ امانت تمہارے سپرد جو کی جا رہی ہے تو تم یہود کی طرح اس امانت میں خیانت کرنے والے نہ بن جانا بلکہ اس کو ٹھیک ٹھیک ادا کرنے والے بننا اور ہر حال میں عدل پر قائم رہنا۔ نیز اللہ اور رسول اور اپنے

اولوالامر کی اطاعت کرتے رہنا، اس کے بغیر اس امانت کی ذمہ داریاں ادا نہیں ہو سکتیں اور اگر کبھی امر میں اختلاف واقع ہو تو ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو اللہ و رسول ہی کی طرف لوٹانا تاکہ اس نزاع کا صحیح فیصلہ ہو سکے اور وہ تمھارے شیرازے کو درہم برہم نہ کرنے پائے۔

(۶۰ - ۷۰) منافقین کو ملامت کہ وہ اللہ اور رسول کی اطاعت پر مجتمع ہونے کے بجائے اسلام اور مسلمانوں کے دشمنوں سے میل جول رکھتے ہیں اور اس کو بڑی دانش مندانہ سیاست سمجھتے ہیں حالانکہ اس وقت تک اُن کا ایمان ہی معتبر نہیں ہے جب تک وہ پورے طور پر اپنے آپ کو پیغمبر کے حوالہ نہ کر دیں اور ہر معاملے میں اُن کی اطاعت نہ کریں۔

(۷۱ - ۷۶) مسلمانوں کو اپنی مدافعت اور دارالکفر میں گھرے ہوئے مظلوم مسلمانوں کی آزادی کے لئے جہاد کی تاکید۔ ان منافقین کو ملامت جو جہاد سے جی چراتے تھے، مسلمانوں کی ہمتیں پست کرتے تھے، مال غنیمت میں حصہ داری کے تو متمنی و مدعی تھے لیکن خطرہ کوئی بھی مول لینے کے لئے تیار نہ تھے۔

(۷۷ - ۸۰) منافقین کی اس متضاد روش پر ملامت کہ جب تک جہاد کا حکم نہیں ہوا تھا اس وقت تک تو وہ اپنی منافقت پر پردہ ڈالنے کے لئے جہاد کے لئے بڑی بے قراری کا اظہار کرتے تھے لیکن اب کہ جہاد کا حکم دے دیا گیا تو جس طرح خدا سے ڈرنا چاہیئے، اس طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ اسلام کے دشمنوں سے ڈرتے ہیں۔ حالانکہ موت سے کہیں بھی مفر نہیں۔ ان کی کج فہمی کا یہ حال ہے کہ اگر کوئی کامیابی حاصل ہوتی ہے تو اس کو تو خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں لیکن اگر کوئی ابتلا پیش آجائے تو اس کو پیغمبر کی بے تدبیری کا نتیجہ قرار دیتے ہیں حالانکہ خیر و شر سب خدا ہی کی طرف سے ہے البتہ شر جو پیش آتا ہے تو اُن کے اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے۔ آخر میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی کہ جو تمھاری اطاعت کریں وہی درحقیقت خدا کی اطاعت کرنے والے ہیں، جو تمھاری اطاعت سے گریز اختیار کریں ان کا معاملہ اللہ کے حوالے کرو۔ تم پر ان کی ذمہ داری نہیں ہے۔

(۸۱ - ۸۵) منافقین کی روش کی مزید تفصیل کہ جب پیغمبر کے سامنے ہوتے ہیں تب تو ان کی ہر بات پر سر تسلیم خم کرتے ہیں لیکن جب وہاں سے ہٹتے ہیں تو ہر بات میں مین میکھ نکالنا شروع کر دیتے ہیں حالانکہ پیغمبر جو کچھ بھی کہتے ہیں سب خدا ہی کی طرف سے ہے۔ قرآن کی کامل ہم آہنگی شاہد ہے کہ اس میں کوئی چیز بھی غیر اللہ کی طرف سے نہیں ہے۔

پھر منافقین کی اس شرارت کی طرف اشارہ کہ اگر ان کو امن یا خطرے کی کوئی خبر پہنچتی ہے تو سنسنی پیدا کرنے کے لئے اس کو فوراً پھیلا دیتے ہیں حالانکہ صحیح روش یہ ہے کہ اس کو رسولؐ اور ارباب حل و عقد کے سامنے پیش کرتے تاکہ وہ اس پر غور کر کے اس کے تدارک کے لیے صحیح قدم اٹھاتے لیکن یہ مسلمانوں کے دل بٹھانے کے لئے یہ شرارت کرتے ہیں۔ انھیں یاد رکھنا چاہیئے

کہ جو کسی حق کی تائید میں کوئی کلمۂ خیر کہے گا تو اس کو اس میں سے حصہ ملے گا اور جو کسی حق کی مخالفت میں کلمۂ شر زبان سے نکالے گا تو اس کو اس میں سے حصہ ملے گا۔

(۸۶-۸۷) منافقین کی مذکورہ بالا روش کے باوجود مسلمانوں کو یہ ہدایت کہ معاشرہ کے اندر ان کو نکو بنانے کی کوشش نہ کی جائے بلکہ ظاہری سلوک ان کے ساتھ وہی رکھا جائے جو مسلمانوں کے ساتھ ہونا چاہیئے۔ یعنی اُن کے ساتھ سلام کلام باقی رکھا جائے۔

(۸۸-۹۱) جو منافقین دارالکفر میں پڑے ہوئے ہیں اور جن کی ساری ہمدردیاں کفار کے ساتھ ہیں، دارالاسلام کے مسلمانوں کو ان کے ساتھ اس وقت تک دوستی و حمایت کا تعلق پیدا نہیں کرنا چاہیئے جب تک وہ دارالکفر کو چھوڑ کر دارالاسلام کی طرف ہجرت نہ کر آئیں۔ اگر وہ ہجرت نہ کریں تو ان کے ساتھ بھی اسی طرح جنگ جائز ہے جس طرح دشمن کے ساتھ۔ اس سے صرف وہ مستثنیٰ ہوں گے جن کا تعلق یا تو کسی ایسی قوم سے ہے جن کے ساتھ مسلمانوں کا معاہدہ ہے یا جن کے متعلق یہ علم ہے کہ یہ اپنی کمزوری کی وجہ سے نہ تو اپنی قوم کے ساتھ مل کر مسلمانوں سے لڑنا چاہتے ہیں نہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر اپنی قوم سے لڑنے کی ہمت رکھتے۔ مگر جن کے متعلق معلوم ہے کہ ان کے اوپر خود ان کی قوم کا یا دوسرے کفار کا دباؤ پڑ جائے گا تو وہ مسلمانوں سے لڑنے کے لئے آمادہ ہو جائیں گے تو وہ دشمن ہی کے حکم میں ہیں۔ ان سے جنگ جائز ہے۔

(۹۲-۹۴) دارالحرب میں پڑے ہوئے مسلمانوں کے جان و مال کے احترام سے متعلق بعض احکام۔

(۹۵-۱۰۰) دارالحرب کے مسلمانوں کو ہجرت اور جہاد کی تاکید تاکہ وہ کفر کے ماحول سے نکل کر اسلامی معاشرہ میں آئیں اور اپنے ایمان کی حفاظت کے ساتھ ساتھ اسلام اور مسلمانوں کو قوت بہم پہنچائیں۔

(۱۰۱-۱۰۴) جہاد کے لئے ہر وقت مستعد رہنے کے حکم کے تعلق سے خطرے کی حالت میں نماز کا طریقہ۔

(۱۰۵-۱۲۶) ان مسلمانوں کو تنبیہ جو کھلے ہوئے منافقین کے معاملے میں بھی مداہنت برتتے تھے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات ان کی طرف سے مدافعت کے لئے اُٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ فرمایا کہ پیغمبرؐ کے خلاف منافقین کی سرگوشیاں اور سرگرمیاں اور اسلام کی راہ چھوڑ کر دوسری راہ اختیار کرنے کی کوشش کوئی معمولی جرم نہیں ہے۔ یہ چیز اپنی فطرت کے لحاظ سے شرک ہے اور شرک کو اللہ تعالیٰ کبھی معاف فرمانے والا نہیں ہے۔ خدا کے ہاں جھوٹی آرزوئیں کام آنے والی نہیں ہیں بلکہ ایمان اور عمل صالح کام آنے والا ہے۔

(۱۲۷-۱۳۰) ابتدائے سورہ میں جو احکام یتیموں، ان کی ماؤں اور عورتوں سے متعلق بیان ہوئے

ان کے متعلق بعد میں پیدا ہونے والے بعض سوالوں کے جواب۔

(۱۳۱-۱۴۷) مسلمانوں کو پوری سختی کے ساتھ اس بات کی تاکید کہ جو کچھ حکم دیا جا رہا ہے اس پر بے چون وچرا عمل کرو، اس سے گریز و فرار کی راہیں نہ اختیار کرو اور منافقین کی کفر دوستی سے پوری شدت کے ساتھ اظہار بیزاری اور یہ تنبیہ کہ منافقین اور کفار دونوں کا ٹھکانا جہنم ہے۔

(۱۴۸-۱۴۹) مسلمانوں کو اس بات کی نصیحت کہ ہر چند منافقین ہر ملامت کے سزاوار ہیں لیکن بے ضرورت بدزبانی و سخت کلامی ان کے ساتھ جائز نہیں ہے۔

(۱۵۰-۱۶۲) اہل کتاب بالخصوص یہود کو، جو اس مرحلے میں طرح طرح کی سازشوں اور مختلف قسم کے اعتراضات سے مخالفت کے محاذ کو تقویت پہنچا رہے تھے سرزنش اور ان کے اعتراضات کے جواب۔

(۱۶۳-۱۷۵) قرآنی دعوت کے مرتبہ و مقام کی وضاحت اور اہل کتاب بالخصوص نصاریٰ کو دعوت و نصیحت کہ اس روشنی کی، جو اللہ نے اُتاری ہے، قدر کریں اور اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتے نہ پھریں۔

(۱۷۶) ایک آیت مبینہ جو شروع میں بیان کردہ احکام کی وضاحت کے طور پر نازل ہوئی۔

مذکورہ بالا تجزیے پر تدبر کی نگاہ ڈالئے تو یہ بات صاف نظر آئے گی کہ آیت ۱۰۴ تک تو معاشرہ سے متعلق احکام و قوانین بیان ہوئے ہیں اور ضمناً کہیں کہیں اس ردِ عمل کی طرف بھی اشارہ ہو گیا ہے جو ان احکام کا مخالفین پر ہوا لیکن آیت ۱۰۴ کے بعد کلام کا رُخ بالتدریج اسلامی نظامِ حکومت کی اساسات کی وضاحت اور اسلام کے مخالفین کی طرف مُڑ گیا ہے اور اس رویے پر تفصیل کے ساتھ تنقید کی گئی ہے جو اس نظامِ حق کی مزاحمت کے لئے اہل کتاب اور منافقین نے اختیار کیا۔ منافقین اس میں خاص طور پر زد میں آئے ہیں۔ اس کی وجہ، جیسا کہ ہم نے سورہ کے دیباچہ میں ظاہر کی، یہ ہے کہ معاشرے اور حکومت کے استحکام کے نقطۂ نظر سے اس مارِ آستین گروہ کی بیخ کنی ضروری تھی۔

قرآن مجید کے متعلق یہ بات یاد رکھئے کہ یہ صرف فقہی احکام کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ دعوت کا صحیفہ بھی ہے۔ اس وجہ سے اس کے لئے اس ردِ عمل سے تعرض ناگزیر ہے جس سے ان احکام کی تعلیم کے دوران میں سابقہ پیش آیا۔ چنانچہ قرآن ہر جگہ ان احکام کے پہلو بہ پہلو ان حالات سے بھی بحث کرتا ہے جو مخالفین نے اس وقت بالواسطہ یا بلاواسطہ پیدا کئے اور ان سے بحث کرنا تعلیم و دعوت کے نقطۂ نظر سے نہایت ضروری ہے۔ لیکن جو لوگ قرآن کی اس خصوصیت سے واقف نہیں ہیں وہ اس بات سے حیران ہوتے ہیں کہ ان فقہی احکام کے ساتھ منافقین و معاندین کے اس تفصیلی ذکر کا کیا موقع تھا۔

سُوْرَةُ النِّسَآءِ (۴)

مَدَنِيَّةٌ ——— اٰیاتھا ۱۷۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیت ۱

يَاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ①

ترجمۂ آیت ۱

اے لوگو، اپنے اس رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک ہی جان سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سارے مرد اور عورتیں پھیلا دیں اور ڈرو اس اللہ سے جس کے واسطے سے تم باہم گر طالبِ مدد ہوتے ہو اور ڈرو قطع رحم سے۔ بے شک اللہ تمھاری نگرانی کر رہا ہے۔ ۱

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت

'خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا' کے معنی ہیں اسی کی جنس سے۔ اگرچہ اس کے معنی لوگوں نے اور بھی لیے ہیں لیکن جس بنیاد پر لیے ہیں وہ نہایت کمزور ہے۔ ہم نے جو معنی لیے ہیں اس کی تائید خود قرآن میں موجود ہے

سورۂ نحل میں فرمایا ہے وَاللّٰہُ جَعَلَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا (۷۲) ظاہر ہے کہ اس کے معنی یہی ہو سکتے ہیں کہ اللہ نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں۔ اس کے یہ معنی کوئی بھی نہیں لے سکتا کہ یہ بیویاں ہر ایک کے اندر سے پیدا ہوئیں۔

تسآءلون کا مفہوم: 'تساءل' کے معنی باہدگر ایک دوسرے سے پوچھنے، سوال کرنے اور مانگنے کے ہیں۔ اسی سے ترقی کر کے ایک دوسرے سے طالبِ مدد ہونے کے معنی میں بھی یہ استعمال ہوتا ہے۔ سورۂ مومنون میں ہے فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَیْنَھُمْ یَوْمَئِذٍ وَّلَا یَتَسَآءَلُوْنَ (جب صور پھونکا جائے گا تو نہ ان کے نسبی تعلقات باقی رہیں گے اور نہ وہ ایک دوسرے سے طلبِ مدد ہی کر سکیں گے) ۱۰۱

ارحام کا مفہوم: 'ارحام' سے مراد رحمی رشتے ہیں۔ اس کو اللہ پر عطف کر کے اس کی وہ اہمیت واضح فرمائی ہے جو دین میں اس کی ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ خدا کے بعد پہلی چیز جو تقویٰ اور احترام کی سزاوار ہے وہ رشتۂ رحم اور اس کے حقوق ہیں۔ خدا سب کا خالق ہے اور رحم سب کے وجود میں آنے کا واسطہ اور ذریعہ ہے اس وجہ سے خدا اور رحم کے حقوق سب پر واجب ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اسی بنیاد پر رحم کا یہ درجہ رکھا ہے کہ جو اس کو جوڑتا ہے خدا اس سے جڑتا ہے اور جو اس کو کاٹتا ہے خدا اس سے کٹتا ہے۔ یہ بات ایک حدیثِ قدسی سے بھی ثابت ہے اور یہی بات قرآن سے بھی نکلتی ہے۔

معاشرہ کی تنظیم سے متعلق بنیادی حقائق: زیرِ بحث آیت ایک جامع تمہید ہے ان تمام احکامات و ہدایات کے لیے جو انسانی معاشرہ کی تنظیم کے لیے اللہ تعالیٰ نے اتارے ہیں اور جو آگے آ رہے ہیں۔ اس تمہید میں جو باتیں بنیادی حقائق کی حیثیت سے واضح کی گئی ہیں ان کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔

پہلی بات یہ ہے کہ اس آیت میں جس تقویٰ کی ہدایت کی گئی ہے اس کا ایک خاص موقع و محل ہے۔ اس تقویٰ سے مراد یہ ہے کہ یہ خلق آپ سے آپ وجود میں نہیں آگئی ہے بلکہ خدا کی پیدا کی ہوئی ہے جو سب کا خالق بھی ہے اور سب کا رب بھی۔ اس وجہ سے کسی کے لیے بھی یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اس کو ایک بے مالک اور بے راعی کا ایک آوارہ گلہ سمجھ کر اس میں دھاندلی مچائے اور اس کو اپنے ظلم و تعدی کا نشانہ بنائے بلکہ ہر ایک کا فرض ہے کہ وہ اس کے معاملات میں انصاف اور رحم کی روش اختیار کرے ورنہ یاد رکھے کہ خدا بڑا زور آور اور بڑا منتقم و قہار ہے۔ جو اس کی مخلوق کے معاملات میں دھاندلی مچائیں گے وہ اس کے قہر و غضب سے نہ بچ سکیں گے۔ وہ ہر چیز کی نگرانی کر رہا ہے۔

دوسری یہ کہ تمام نسلِ انسانی ایک ہی آدم کا گھرانا ہے۔ سب کو اللہ تعالیٰ نے ایک ہی آدم و حوا کی نسل سے پیدا کیا ہے۔ نسلِ آدم ہونے کے اعتبار سے سب برابر ہیں۔ اس پہلو سے عربی و عجمی، احمر و اسود اور افریقی و ایشیائی میں کوئی فرق نہیں، سب خدا کی مخلوق اور سب آدم کی اولاد ہیں۔ خدا اور رحم کا رشتہ سب کے درمیان مشترک ہے۔ اس کا فطری تقاضا یہ ہے کہ سب ایک ہی خدا کی بندگی کرنے والے

اور ایک ہی مشترک گھرانے کے افراد کی طرح آپس میں حق و انصاف اور مہر و محبت کے تعلقات رکھنے والے بن کر زندگی بسر کریں۔

تیسری یہ کہ جس طرح آدمؑ تمام نسلِ انسانی کے باپ ہیں اسی طرح حوا تمام نسلِ انسانی کی ماں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حوا کو آدمؑ ہی کی جنس سے بنایا ہے اس وجہ سے عورت کوئی ذلیل، حقیر، فروتر اور فطری گنہگار مخلوق نہیں ہے بلکہ وہ بھی شرفِ انسانیت میں برابر کی شریک ہے۔ اس کو حقیر و ذلیل مخلوق سمجھ کر نہ اس کو حقوق سے محروم کیا جا سکتا نہ کمزور خیال کر کے اس کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جا سکتا ہے۔

چوتھی یہ کہ خدا اور رِحم کا واسطہ ہمیشہ سے باہمی تعاون و ہمدردی کا محرک رہا ہے۔ جس کو بھی کسی مشکل یا خطرے سے سابقہ پیش آتا ہے وہ اس میں دوسروں سے خدا اور رِحم کا واسطہ دے کر اپیل کرتا ہے اور یہ اپیل چونکہ فطرت پر مبنی ہے اس وجہ سے اکثر حالات میں یہ مؤثر بھی ہوتی ہے۔ لیکن خدا اور رحم کے نام پر حق مانگنے والے اکثر یہ بھول جاتے ہیں کہ جس طرح ان واسطوں پر حق مانگنا حق ہے اسی طرح ان کا حق ادا کرنا بھی فرض ہے۔ جو شخص خدا اور رحم کے نام پر لینے کے لیے تو چوکس ہے لیکن دینے کے لیے آمادہ نہیں ہے وہ خدا سے دھوکا بازی اور رحم سے بے وفائی کا مجرم ہے اور اس جرم کا ارتکاب وہی کر سکتا ہے جس کا دل تقویٰ کی روح سے خالی ہو۔ خدا اور رِحم کے حقوق پہچاننے والے جس طرح ان ناموں سے فائدے اٹھاتے ہیں اسی طرح ان کی ذمہ داریاں بھی اٹھاتے ہیں اور درحقیقت حق طلبی و حق شناسی کا یہی توازن ہے جو صحیح اسلامی معاشرے کا اصلی جمال ہے۔ اسی حقیقت کی طرف وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ کا ٹکڑا اشارہ کر رہا ہے۔

۲۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۲-۱۰

آگے کی آیات میں تقویٰ، عدل، رِحم اور رُحم کی انہی بنیادوں پر جن کا ذکر اوپر ہوا، سب سے پہلے یتیموں کے سرپرستوں کو مخاطب کر کے ان کی ذمہ داریاں بتائیں اور اس مشکل فریضہ سے عہدہ برآ ہونے کے لیے عدل و انصاف کے اندر رہتے ہوئے جو صورتیں ممکن تھیں ان کی طرف رہنمائی فرمائی۔ مثلاً یہ کہ کوئی شخص اگر محسوس کرتا ہے کہ وہ اپنے زیرِ سرپرستی یتیموں کے مال اور حقوق کی پوری احتیاط کے ساتھ نگرانی اسی صورت میں کر سکتا ہے جب کہ وہ ان کی ماں کو بھی اپنے ساتھ اس ذمہ داری میں شریک کر لے تو اس مقصد کے لیے وہ تعددِ ازواج کی اجازت سے فائدہ اٹھا سکتا ہے بشرطیکہ وہ عدل، چار تک کی قید اور ادائے مہر کے عام قانون کی ان کے باب میں بھی پابندی کرے۔ یہ عذر نہ پیدا کرے کہ چونکہ ان میں سے کسی سے اس نے نکاح کیا ہے تو انہی کی اولاد کی مصلحت سے کیا ہے اس وجہ سے وہ ان کے بارے میں عدل اور مہر وغیرہ کی ذمہ داریوں سے آزاد ہے۔

اس کے بعد بتایا ہے کہ یتیم کا مال کب اس کے حوالے کرنا چاہیئے اور زمانۂ سرپرستی میں ایک نادار یا ایک مال دار سرپرست کو اس مال سے فائدہ اٹھانے کے معاملے میں کیا روش اختیار کرنی چاہیئے۔

پھر ہدایت فرمائی ہے کہ شریعت میں وارثوں کے حقوق معین ہو جانے کے بعد بھی اگر کسی مورث کے مال کی تقسیم کے وقت اقربا، یتامی اور مساکین آجائیں تو گو قانونی طور پر اس میں ان کا حق نہ بنتا ہو تاہم اخلاقی طور پر ان کو اس میں سے کچھ دے دلا کر رخصت کیا جائے اور ان کی دلداری کی جائے۔

آخر میں فرمایا کہ جو لوگ ظلم و زیادتی کر کے یتیموں کا مال ہڑپ کرتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ بھرتے ہیں اور بالآخر وہ دوزخ کی بھڑکتی آگ میں پڑیں گے۔

اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲-۱۰

وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۪ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ۝۲ وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِى الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا ۝۳ وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَىْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا ۝۴ وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِىْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝۵ وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ وَلَا تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا ؕ وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ

بِالْمَعْرُوْفِ ؕ فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا
عَلَيْهِمْ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ﴿۶﴾ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا
تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ۠ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا
تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ؕ
نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ﴿۷﴾ وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَ
الْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا
مَّعْرُوْفًا ﴿۸﴾ وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً
ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ ۠ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَلْيَقُوْلُوْا قَوْلًا
سَدِيْدًا ﴿۹﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا
يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ؕ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ﴿۱۰﴾ ع

ع ۱ — ۱۰ — ۱۲

ترجمۂ آیات ۲-۱۰

اور یتیموں کے مال ان کے حوالہ کرو، نہ اپنے بُرے مال کو ان کے اچھے مال سے بدلو اور نہ ان کے مال کو اپنے مال کے ساتھ گڈمڈ کرکے اس کو ہڑپ کرو۔ بے شک یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ ۲۔

اور اگر تمھیں اندیشہ ہو کہ تم یتیموں کے معاملے میں انصاف نہ کر سکو گے تو عورتوں میں سے جو تمھارے لیے جائز ہوں ان سے دو دو، تین تین، چار چار تک نکاح کر لو۔ اور اگر ڈر ہو کہ ان کے درمیان عدل نہ کر سکو گے تو ایک ہی پر بس کرو یا پھر کوئی لونڈی جو تمھاری ملک میں ہو۔ یہ طریقہ اس بات کے زیادہ قریب ہے کہ تم انصاف سے نہ ہٹو۔ اور ان عورتوں کو ان کے مہر دو مہر کی حیثیت سے

پس اگر وہ اس میں سے تمہارے لیے کچھ چھوڑ دیں اپنی خوشی سے تو تم اس کو کھاؤ کہ وہ تمہیں راس اور سازگار ہے۔ ۲-۴

اور تم وہ مال جس کو خدا نے تمہارے لیے قیام و بقا کا ذریعہ بنایا ہے، نادان یتیموں کے حوالہ نہ کرو۔ ہاں اس سے ان کو فراغت کے ساتھ کھلاؤ، پہناؤ اور دستور کے موافق ان کی دلداری کرتے رہو اور ان یتیموں کو جانچتے رہو یہاں تک کہ جب وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں تو اگر تم ان کے اندر سوجھ بوجھ پاؤ تو ان کا مال ان کے حوالے کر دو اور اس ڈر سے کہ وہ بڑے ہو جائیں گے اسراف اور جلد بازی کر کے اُن کا مال ہڑپ نہ کرو اور جو غنی ہو اس کو چاہیئے کہ وہ پرہیز کرے اور جو محتاج ہو تو وہ دستور کے مطابق اس سے فائدہ اٹھائے۔ پھر جب تم ان کا مال ان کے حوالے کرنے لگو تو ان پر گواہ ٹھہرا لو۔ ویسے اللہ حساب لینے کے لیے کافی ہے۔ ۵-۶

والدین اور اقربا کے ترکے میں سے مردوں کے لیے بھی ایک حصّہ ہے اور والدین اور اقربا کے ترکے میں سے عورتوں کا بھی ایک حصّہ ہے خواہ ترکہ کم ہو یا زیادہ۔ ایک مقررہ حصّہ۔ اور اگر تقسیم کے وقت قرابت مند، یتیم اور مسکین آموجود ہوں تو اس میں سے ان کو بھی کچھ دو اور ان سے دستور کے مطابق بات کرو۔ ان لوگوں کو ڈرنا چاہیئے جو اپنے پیچھے اگر ناتوان بچے چھوڑتے تو ان کے معاملے میں بہت اندیشہ ناک ہوتے، پس انھیں چاہیئے کہ اللہ سے ڈریں اور سیدھی بات زبان سے نکالیں۔ ۷-۹

جو لوگ ظلم و ناانصافی سے یتیموں کے مال ہڑپ کر رہے ہیں وہ تو بس اپنے پیٹوں میں آگ بھر رہے ہیں اور وہ دوزخ کی بھڑکتی آگ میں پڑیں گے۔ ۱۰

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاٰتُوا الْیَتٰمٰٓی اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِیْثَ بِالطَّیِّبِ ۠ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓی اَمْوَالِكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِیْرًا ۔ (۲)

آیت ۲ کا خطاب یتیموں کے سرپرستوں سے ہے

اس آیت میں خطاب یتیموں کے اولیاء اور سرپرستوں سے ہے اور اوپر والی آیت پر اس کا عطف اس بات کی دلیل ہے کہ اس میں جس بات کا حکم دیا جا رہا ہے یا جس چیز سے روکا جا رہا ہے اس کی بنیاد انھی اصولی حقائق پر ہے جو اُوپر مذکور ہوئے۔

خبیث و طیب کا مفہوم

'خبیث' اور 'طیب' کے الفاظ جس طرح ان اشیا اور ذوات کے لیے استعمال ہوتے ہیں جو اخلاقی و شرعی نقطۂ نظر سے خبیث یا طیب ہوتی ہیں اسی طرح، جیسا کہ بقرہ کی آیت ۲۶۷ کے تحت گزر چکا ہے، ان اشیا کے لیے بھی ان کا استعمال عربی میں معروف ہے جو مادی اعتبار سے ناقص یا عمدہ ہوتی ہیں۔

'اکل' کے ساتھ 'الیٰ' کا صلہ اس بات پر دلیل ہے کہ یہاں 'ضمًّا' یا اس کے ہم معنی کوئی لفظ محذوف ہے۔

یتیموں کے مال کی حفاظت کے لیے ضروری ہدایات

یتیموں کے بعض سرپرست، جن کے سینے خوفِ خدا سے خالی ہوتے ہیں اوّل تو یتیموں کا سارا حق ہی دبا بیٹھتے ہیں اور اگر دبا نہیں بیٹھتے تو اس میں خورد بُرد کرنے کی نیت سے، انتظامی سہولت کی نمائش کر کے، ان کے مال کو اپنے مال کے ساتھ ملا لیتے ہیں اور اس طرح اپنے لیے ہاتھ رنگنے کے نہایت آسان مواقع پیدا کر لیتے ہیں۔ ان کو ہدایت فرمائی کہ یتیموں کا مال یتیموں کو دو، خود ہضم کرنے کی کوشش نہ کرو۔ پھر اس مقصد کے لیے جو ہتھکنڈے استعمال ہوتے ہیں ان سے واضح لفظوں میں بھی روک دیا کہ نہ اپنا ناقص مال ان کے اچھے مال سے بدلنے کی تدبیریں کرو اور نہ ان کا مال اپنے مال کے ساتھ ملا کر اس کو خورد برد کرنے کی کوشش کرو۔

اگر کوئی سرپرست انتظامی سہولت کے نقطۂ نظر سے یتیم کا مال اپنے مال کے ساتھ ملانا چاہے تو اس کی اجازت اگرچہ، جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۲۰ کے تحت گزر چکی ہے، شریعت نے دی ہے، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ اس اختلاط و اشتراک سے مقصود اصلاح ہو نہ کہ افساد۔ بصورت دیگر یتیم کے حق کی حفاظت اسلامی حکومت پر عائد ہوتی ہے۔

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰٓی اَلَّا تَعُوْلُوْا ۔ (۳)

'یتامٰی' کا مفہوم

'یتٰمٰی' کا لفظ ان نابالغوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جن کا باپ فوت ہو چکا ہو، عام اس سے کہ وہ نابالغ، لڑکے ہیں یا لڑکیاں۔ صرف نابالغ لڑکیوں کے لیے اس کا استعمال نہ عربی زبان میں معلوم ہے، نہ قرآن مجید اور حدیث میں۔ قرآن میں یہ لفظ کم از کم پندرہ جگہ اسی جمع کی صورت میں

استعمال ہوا ہے لیکن کسی جگہ بھی صرف یتیم بچیوں کے مفہوم میں نہیں استعمال ہوا ہے۔

'ماطاب لکم' کا مفہوم

'مَا طَابَ لَکُمْ' کے معنی بعض اہل تاویل نے 'مَا حَلَّ لَکُمْ' (یعنی جو عورتیں تمہارے لیے جائز ہوں) لیے ہیں۔ یہ مفہوم لفظ کے استعمالات کے مطابق ہے۔ اگرچہ اندوئے لغت وانددوئے استعمال اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ جو راضی ہوں؛ آگے والی آیت میں 'فَاِنْ طِبْنَ لَکُمْ' کے الفاظ سے اس مفہوم کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ نیز یہ مفہوم بھی اس کا ہو سکتا ہے کہ جن سے تمہاری زندگی میں خوشگواری پیدا ہو۔ یہاں یہ تمام معانی بنتے ہیں لیکن ہم نے پہلے معنی کو ترجیح دی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ موقع و محل سے یہ زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

'نساء' سے مراد یتامی کی مائیں ہیں

'نِسَاء' کا لفظ اگرچہ بظاہر عام ہے لیکن قرینہ دلیل ہے کہ اس سے عام عورتیں مراد نہیں ہیں بلکہ یتیموں کی مائیں مراد ہیں۔ عام بول کر خاص مراد لینا، بشرطیکہ قرینہ موجود ہو، عربی زبان میں بہت معروف ہے۔ قرآن میں اس کی مثالیں بکثرت ہیں۔ یہ قرینہ چونکہ مضمون کے تدریجی ارتقا سے خود بخود واضح ہو جائے گا اس وجہ سے یہاں اس کے دلائل کے ذکر کی ضرورت نہیں ہے۔

مصلحت کے لیے تعددِ ازدواج کی اجازت

آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم (بخطاب یتیموں کے اولیا اور سرپرست ہی ہیں) بر بنائے احتیاط یہ اندیشہ رکھتے ہو کہ تمہارے لیے یتیموں کے مال اور ان کے واجبی حقوق کی کما حقہ نگہداشت ایک مشکل کام ہے، تم تنہا اپنی ذمہ داری پر اس سے بحسن و خوبی عہدہ برآ نہیں ہو سکتے، اگر یتیموں کی ماں بھی اس ذمہ داری میں تمہارے ساتھ شریک ہو جائے تو تم اس فرض سے عمدہ طریقے پر عہدہ برآ ہو سکتے ہو اس لیے کہ یتیموں کے ساتھ جو قلبی لگاؤ اس کو ہو سکتا ہے، کسی دوسرے کو نہیں ہو سکتا اور ان کے حقوق کی نگہداشت جس بیداری کے ساتھ وہ کر سکتی ہے کسی اور کے لیے ممکن نہیں تو ان میں سے جو تمہارے لیے جائز ہوں ان سے تم نکاح کر لو، بشرطیکہ عورتوں کی تعداد کسی صورت میں چار سے زیادہ نہ ہونے پائے اور تم ان کے درمیان عدل قائم رکھ سکو۔ اگر یہ اندیشہ ہو کہ عدل نہیں قائم رکھ سکو گے تو پھر ایک سے زیادہ نکاح نہ کرو۔ فرمایا کہ یہ طریقہ تمہیں حق و انصاف پر استوار رکھنے کے نقطۂ نظر سے زیادہ صحیح ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ بیویوں کے معاملے میں عدل کی شرط ایک ایسی اٹل شرط ہے کہ یتیموں کے حقوق کی نگہداشت جیسی اہم دینی مصلحت کے پہلو سے بھی اس میں کسی لچک کی شریعت نے گنجائش نہیں رکھی ہے۔

ایک شبہے کا ازالہ

یہاں بعض لوگوں کے ذہن میں یہ شبہ پیدا ہوگا کہ آیت کی تاویل اگر یہ ہے جو بیان ہوئی تو اس سے تو صاف یہ بات نکلتی ہے کہ اسلام میں تعدد ازواج کی اجازت مطلق نہیں بلکہ یتیموں کی مصلحت کے ساتھ مقید ہے۔ اس شبہے کا جواب یہ ہے کہ یہاں مسئلے کے بیان کی نوعیت یہ نہیں ہے کہ یتیموں

کی مصلحت کی قید کے ساتھ تعددِ ازواج کی اجازت دی گئی ہو اور بصورتِ دیگر یہ ممنوع ہو بلکہ یہ ہے کہ یتامیٰ کی مصلحت کے نقطۂ نظر سے تعددِ ازواج کے اس رواج سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دی گئی ہے جو عرب میں تھا البتہ اس کو چار تک محدود کر دیا گیا ہے۔ اگر مقصود تعددِ ازواج کو یتیموں کی مصلحت کے ساتھ مقید کرنا ہوتا تو اس کے لیے اسلوبِ بیان اس سے بالکل مختلف ہوتا۔ اس اسلوبِ بیان سے صرف یہ بات نکلتی ہے کہ تعددِ ازواج کی مروجہ وقت صورت پر ایک قید عائد کر کے اس سے ایک معاشرتی مصلحت میں فائدہ اٹھانے کی طرف رہنمائی فرمائی گئی ہے لیکن معاشرتی مصلحت صرف ایک یتیموں ہی کی مصلحت نہیں ہے بلکہ اور بھی ہو سکتی ہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس میں اس سے فائدہ اٹھانے کی ممانعت ہو۔

ایک اور شبہے کا جواب

ممکن ہے یہاں ایک اور شبہ بھی بعض لوگوں کو ہو کہ ہم نے یہاں ان لوگوں کے قول کو جنھوں نے یتامیٰ سے یتیم لڑکیوں کو مراد لیا ہے، محض اس دلیل کی بنیاد پر نظر انداز کر دیا ہے کہ اس لفظ کا استعمال صرف لڑکیوں کے لیے معروف نہیں ہے درآنحالیکہ 'نساء' سے ہم نے یتیموں کی ماؤں کو مراد لیا ہے جب کہ اس لفظ کا بھی استعمال اس معنی کے لیے معروف نہیں ہے۔ اس شبہے کا جواب یہ ہے کہ ہم نے اس قول کو صرف اسی بنیاد پر نظر انداز نہیں کیا ہے کہ لغت اور استعمال اس کے حق میں نہیں ہے بلکہ اس کی یہ وجہ بھی ہے کہ یہ معنی لینے میں آیت کی تاویل صحیح نہیں بنتی۔ کسی شخص کو یہ اندیشہ ہو کہ اگر وہ ایک یتیم بچی سے نکاح کرے گا تو چونکہ اس کا باپ یا بھائی موجود نہیں ہے اس وجہ سے وہ اس کے حقوق ادا کرنے میں کوتاہی کرے گا تو اس کو یہ ہدایت ہونی تھی کہ وہ اس وقت تک اس کے ساتھ نکاح کرنے میں توقف کرے جب تک وہ بالغ ہو کر اپنے حقوق و فرائض کو اپنے اختیار و ارادے کے ساتھ سمجھ نہ سکے یا صرف یہ ہدایت ہونی تھی کہ ایسا شخص کسی اور عورت سے نکاح کرے، اس کے ساتھ تعددِ ازواج کی اجازت اور اس کے قیود و شرائط کے بیان کے لیے کوئی ضرورت داعی نہیں تھی۔ اگر یہ کہا جائے کہ ایک یتیمہ بالغ ہونے کے بعد بھی باپ بھائی کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے بے بس ہی ہوتی ہے تو یہ ہدایت ہونی تھی کہ ایسی عورتوں سے نکاح کرو جن کے باپ بھائی زندہ ہوں، اس لیے کہ اس قسم کی بے بسی دوسری عورتوں کو بھی لاحق ہو سکتی ہے اگرچہ ان کو یتیمی کی بے بسی سے سابقہ نہ پیش آیا ہو۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ اگر کسی کی نگرانی میں کوئی یتیمہ ہو، وہ اس کی اچھی طرح تعلیم و تربیت کرے اور اس کے بالغ ہونے پر اس کی مرضی سے اس سے نکاح کرے تو شریعت میں یہ بات ناپسندیدہ نہیں بلکہ پسندیدہ ہے۔

بہرحال ہم نے اس قول کو صرف ایک ہی وجہ کی بنا پر نہیں بلکہ متعدد وجوہ کی بنا پر چھوڑا ہے

اور نساء کے لفظ کی جو تخصیص کی ہے وہ ان قرائن کی بنا پر ہے جن میں سے بعض اوپر مذکور ہوئے اور بعض آگے آرہے ہیں۔

'مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ' سے مراد لونڈیاں ہیں۔ چونکہ ان کے معاملے میں عدل وغیرہ کی شرط نہیں ہے اس وجہ سے ان کی اجازت دی۔ اس مسئلے کی صحیح نوعیت پر ہم بقرہ میں لکھ چکے ہیں۔ آگے موزوں مقام پر اس پر مزید بحث کریں گے۔

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِیْٓــًٔا مَّرِیْٓــًٔا (۴)

'نِحْلَةً' کا مفہوم

اس آیت میں بھی 'نساء' سے مراد یتیموں کی مائیں ہی ہیں۔ 'نحل' کے معنی کسی کو کچھ دینے کے ہیں اور جب عورت کے تعلق سے یہ لفظ استعمال ہو تو اس کے معنی مہر ادا کرنے کے ہوتے ہیں۔ 'نحلۃ' یہاں فعل کی تاکید کے لیے ہے یعنی ان کو اس طرح مہر دو جو مہر دینے کا طریقہ ہے۔ اس تاکید کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کہ جب ان کے ساتھ نکاح انہی کے بچوں کی مصلحت کے پہلو سے کیا گیا ہے تو ایک شخص خیال کر سکتا ہے کہ اس صورت میں مہر وغیرہ کی پابندی نہیں ہونی چاہیے۔ فرمایا کہ نہیں، جس طرح عدل شرط ہے اسی طرح مہر کی ادائیگی بھی شرط ہے اور یہ مہر، مہر کی طرح ادا ہونا چاہیے صرف چھدا اتارنے کی کوشش نہیں ہونی چاہیے۔

مہر کی ادائیگی کی شرط

'فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ' میں حرف 'عن' دستبرداری کے مفہوم کی طرف اشارہ کر رہا ہے یعنی وہ اپنی خوشی سے اگر اپنے مہر کا کوئی حصہ معاف کر دیں تو تم اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہو، یہ تمہارے لیے رچنے پچنے والی چیز ہو سکتی ہے۔

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِیٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِیْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا (۵)

'سُفَهَآء' سے مراد نادان یتامٰی ہیں

'سُفَهَآء' سے مراد وہی یتامٰی ہیں جن کا ذکر چل رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ حکم جو تمہیں دیا گیا ہے کہ یتیموں کا مال ان کو دو تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اگر وہ بالکل نادان و ناسمجھ ہوں جب بھی جو کچھ ان کا ہے ان کے حوالہ کر دو۔ مال کو اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے قیام و بقا کا ذریعہ بنایا ہے اس وجہ سے اس کے اندر انفرادی حق کے ساتھ خاندانی اور اجتماعی بہبود کا بھی ایک پہلو ہے۔ اس پہلو سے اس کی بربادی میں ایک ہی کا نقصان نہیں ہے بلکہ پورے خاندان اور بالآخر پورے معاشرے کا نقصان ہے یہ چیز مقتضی ہے کہ کوئی ایسی شکل اختیار نہ کی جائے جو کسی مال کی بربادی کا باعث ہو۔ اگر یتیم ابھی نادان اور ناسمجھ ہے تو سرپرست کا فرض ہے کہ وہ اس کا مال اپنی حفاظت و نگرانی میں رکھے البتہ اس کو کھلائے پہنائے اور اس کی دلداری کرتا رہے تاکہ اس کو اطمینان رہے کہ یہ نگرانی اسی کے فائدے کے لیے ہے۔ ذمہ داری سنبھالنے کے قابل ہو جانے کے بعد اس کی ہر چیز اسی کو ملنی ہے۔

مال کے اندر انفرادی اور اجتماعی بہبود کے پہلو

'فَارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا' میں 'فِيْهَا' کے لفظ سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ یتیموں کی ضروریات پوری کرنے میں سرپرستوں کو کشادہ دلی سے کام لینا چاہیے۔ خسیس اور مکھی چوس سرپرستوں کا سا رویہ اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ عربی میں جب کہیں گے کہ 'ارزقوھم فیھا' تو اس کے معنی ہوں گے ان کو فراخی سے کھلاؤ پہناؤ اور اگر کہیں 'وارزقوھم منھا' جیسا کہ آگے آیت ۸ میں آ رہا ہے، تو اس کے معنی ہوں گے ان کو اس میں سے کچھ دے دلا دو۔

وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ وَلَا تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا ۭ وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا (۶)

یتیموں کا مال کب ان کے حوالے کیا جائے

یہ وہ طریقہ بتایا ہے جو یتیموں کا مال ان کے حوالے کرنے کے معاملے میں سرپرستوں کو اختیار کرنا چاہیے۔ فرمایا کہ یتیموں کو جانچتے رہو یعنی کوئی چھوٹی موٹی ذمہ داری ان کے سپرد کر کے ان کی صلاحیت کا امتحان کرتے رہو کہ معاملات کی سوجھ بوجھ ان کے اندر پیدا ہو رہی ہے یا نہیں۔ نکاح کی عمر، یعنی بلوغ تک، ان کے ساتھ یہی معاملہ رکھنا چاہیے۔ جب بالغ ہو جائیں تو اس وقت اگر یہ محسوس ہو کہ ان کے اندر اب اپنی ذمہ داریوں کے اٹھانے کی صلاحیت پیدا ہو چکی ہے تو ان کا مال ان کے سپرد کر دینا چاہیے۔

جنسی بلوغ عقلی بلوغ کو متلزم نہیں ہے

آیت میں اس بات کا اشارہ صاف موجود ہے کہ جنسی بلوغ ہر حال میں عقلی بلوغ کو متلزم نہیں ہے۔ ایسے بھی کتنے بالغ ہو سکتے ہیں جو بالغ ہو جانے کو تو ہو جاتے ہیں لیکن ناک لگی ہی رہ جاتی ہے۔ ایسے الھڑ اور بالغ نادانوں کے معاملے میں جلدی نہیں کرنی چاہیے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اس چیز کو ان کے مال پر قابض رہنے کا بہانہ نہیں بنانا چاہیے بلکہ جو کچھ کرنا چاہیے ان کی بہبود پیش نظر رکھ کر کرنا چاہیے۔

غریب سرپرست کو یتیم کے مال سے معروف کے مطابق فائدہ اٹھانے کی اجازت

سرپرست اگر مستغنی آدمی ہو تو اس کو یتیم کے مال میں سے کچھ لینے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ اگر غریب ہو تو دستور کے مطابق اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ دستور کے مطابق سے مراد یہ ہے کہ ذمہ داریوں کی نوعیت، جائداد کی حیثیت، مقامی حالات اور سرپرست کے معیار زندگی کے اعتبار سے وہ فائدہ اٹھانا جو معقولیت کے حدود کے اندر ہو، یہ نوعیت نہ ہو کہ ہر معقول آدمی پر یہ اثر پڑے کہ یتیم کے بالغ ہو جانے کے اندیشے سے اسراف اور جلد بازی کر کے یتیم کی جائداد ہضم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مال کی حوالگی کے وقت گواہ مقرر کرنے کی ہدایت

آخر میں یہ ہدایت ہوئی کہ یتیم کا مال جب اس کے حوالے کرنے لگو تو اس پر کچھ ثقہ اور معتبر لوگوں کو گواہ بھی بنا لو تاکہ کسی سوئے ظن اور نزاع کا احتمال باقی نہ رہے۔ اور اس کے ساتھ یہ بات بھی یاد رکھو کہ سارے معاملات کا حساب خدا کے ہاں بھی دینا ہے۔ اگر کسی قسم کی خیانت ہوئی تو ہو سکتا ہے کہ دنیا

کے شاہدوں اور گواہوں کی نگاہ اس پر نہ پڑے لیکن خدا کی نگاہ کسی چیز سے بھی نہیں چوک سکتی۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ۝ وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُوا الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينُ فَارْزُقُوهُم مِّنْهُ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا ۝ وَلْيَخْشَ الَّذِينَ لَوْ تَرَكُوا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعَافًا خَافُوا عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا اللَّهَ وَلْيَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ۝ إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا ۖ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا (۷-۱۰)

یتامیٰ کے حقوق کے تحفظ نے دوسروں کے حقوق کی راہ کھول دی

یتیموں کے حقوق کے تحفظ کے بعد اب یہ تمہید ہے اس قانونِ وراثت کی جس میں مردوں اور عورتوں دونوں کے حقوق، ان کے والدین و اقربا کے ترکے میں سے معین کر دیے گئے تاکہ زورآور عصبات اور وارثوں کے لیے مورث کی تمام املاک و جائداد سمیٹ کر اس پر قابض ہو جانے کا کوئی موقع ہی باقی نہ رہے۔ اسلام سے پہلے نہ صرف عرب میں بلکہ ساری دنیا میں یہ حال رہا ہے کہ یتیموں اور عورتوں کا کیا ذکر، تمام کمزور ورثہ زورآور وارثوں کے رحم و کرم پر تھے۔ قرآن نے اس صورتِ حال کی طرف دوسرے مقام 'وَتَأْكُلُونَ التُّرَاثَ أَكْلًا لَّمًّا' کے الفاظ سے اشارہ فرمایا ہے۔ اس صورتِ حال کو ختم کر دینے کے لیے قرآن نے تمام وارثوں کے حقوق معین کر دیے۔ مردوں کے بھی، عورتوں کے بھی۔ اُوپر کی آیات کی تلاوت کرتا ہوا آدمی جب اس آیت پر پہنچتا ہے تو محسوس کرتا ہے کہ گویا یتیموں کی برکت سے دُوسروں کے حقوق معین کرنے کی بھی راہ کھل گئی۔ یعنی جو خود حقوق سے محروم تھے انھوں نے نہ صرف یہ کہ حقوق حاصل کیے بلکہ ان کی بدولت دوسروں کو بھی حقوق حاصل ہوئے۔

قانونِ وراثت کی تمہید

خاص طور پر عورتوں کا ذکر اس طرح آیا ہے گویا پہلی بار ان کو بھی مردوں کے پہلو بہ پہلو حق داروں کی صف میں جگہ ملی اور اپنے والدین و اقربا کے ترکے میں سے، خواہ کم ہو یا زیادہ، ان کا بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک معین حصہ فرض کر دیا گیا۔

حصے معین ہو جانے کے بعد قانونی حق دار تو وہی ہوں گے جو از روئے شریعت وارث قرار پائے ہیں لیکن صلہ رحم اور خاندانی و انسانی ہمدردی کے عام حقوق پھر بھی باقی رہیں گے۔ چنانچہ وارثوں کو خطاب کر کے ہدایت ہوئی کہ اگر کسی کی وراثت تقسیم کرتے وقت قرابت مند، یتیم اور مسکین آموجود ہوں تو ہرچند وراثت میں ان کا کوئی شرعی حق نہ ہو تاہم وہ ڈانٹے ڈپٹے نہ جائیں بلکہ اُن کو بھی اس میں سے کچھ دے دلا کر ان کی دلداری کی کوشش کی جائے۔ فرمایا کہ یہ بات بھولنی نہیں چاہیے کہ جس طرح دوسروں کے بچے یتیم ہوئے ہیں اسی طرح ان کے بچے بھی یتیم ہو سکتے تھے۔ پھر سوچیں کہ اگر یہ اپنے پیچھے یتیم چھوڑتے تو ان کے دل میں ان سے متعلق کیا کچھ اندیشے ہوتے۔ اس وجہ سے اللہ سے ڈرنا چاہیے اور سیدھی بات کرنی چاہیے۔

آخر میں آخری تنبیہ فرمائی کہ جو لوگ ظلم و حق تلفی کی راہ سے اپنے پیٹوں میں یتیموں کے مال بھر رہے ہیں وہ انجام کار کے اعتبار سے اپنے پیٹوں میں آگ بھر رہے ہیں اور آخرت میں وہ اس آگ کو لیے ہوئے دوزخ کی بھڑکتی آگ میں پڑیں گے۔

۴۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۱۱-۱۴

وراثت کی شرعی تقسیم

آگے تقویٰ عدل اور رحم کے انہی تقاضوں کے مطابق جن پر اسلامی معاشرے کی بنیاد قائم ہے اس شرعی تقسیم وراثت کی وضاحت فرمادی جس کی طرف ساتویں آیت میں اشارہ ہوا تھا تاکہ ظلم و حق تلفی اور نزاع و اختلاف کے ایک بہت بڑے سبب کا خاتمہ ہو جائے۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۱-۱۴

يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِيٓ أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ ۚ فَإِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۖ وَإِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ۚ وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ إِنْ كَانَ لَهُ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ لَمْ يَكُنْ لَهُ وَلَدٌ وَوَرِثَهُ أَبَوَاهُ فَلِأُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ فَإِنْ كَانَ لَهُ إِخْوَةٌ فَلِأُمِّهِ السُّدُسُ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِي بِهَآ أَوْ دَيْنٍ ۗ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ لَا تَدْرُونَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ۚ فَرِيضَةً مِنَ اللّٰهِ ۗ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا ⑪ وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِنْ لَمْ يَكُنْ لَهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِينَ بِهَآ أَوْ دَيْنٍ ۚ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِنْ لَمْ يَكُنْ لَكُمْ وَلَدٌ ۚ

فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُم مِّنۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَآ أَوْ دَيْنٍ ۗ وَإِن كَانَ رَجُلٌ يُورَثُ كَلَٰلَةً أَوِ امْرَأَةٌ وَلَهُۥٓ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ فَلِكُلِّ وَٰحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَإِن كَانُوٓا أَكْثَرَ مِن ذَٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِى الثُّلُثِ ۚ مِنۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصَىٰ بِهَآ أَوْ دَيْنٍ غَيْرَ مُضَآرٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَلِيمٌ ﴿١٢﴾ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ ۚ وَمَن يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُۥ يُدْخِلْهُ جَنَّٰتٍ تَجْرِى مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَٰرُ خَٰلِدِينَ فِيهَا ۚ وَذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿١٣﴾ وَمَن يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُۥ وَيَتَعَدَّ حُدُودَهُۥ يُدْخِلْهُ نَارًا خَٰلِدًا فِيهَا وَلَهُۥ عَذَابٌ مُّهِينٌ ﴿١٤﴾ ع ۲ ۱۳

ترجمۂ آیات ۱۱-۱۴

اللہ تمھاری اولاد کے باب میں تمھیں ہدایت دیتا ہے کہ لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے۔ اگر لڑکیاں دو سے زائد ہیں تو اُن کے لیے ترکے کا دو تہائی ہے اور اگر اکیلی ہے تو اُس کے لیے آدھا ہے اور میت کے ماں باپ کے لیے ان میں سے ہر ایک کے لیے اس کا چھٹا حصہ ہے جو مُورث نے چھوڑا، اگر میت کے اولاد ہو۔ اور اگر اُس کے اولاد نہ ہو اور اُس کے وارث ماں باپ ہی ہوں تو اُس کی ماں کا حصہ ایک تہائی اور اگر اُس کے بھائی بہنیں ہوں تو اُس کی ماں کے لیے چھٹا حصہ ہے۔ یہ حصے اس وصیت کی تعمیل یا ادائے قرض

کے بعد ہیں جو وہ کر جاتا ہے۔ تم اپنے باپوں اور بیٹوں کے متعلق یہ نہیں جان سکتے کہ تمھارے لیے سب سے زیادہ نافع کون ہوگا۔ یہ اللہ کا ٹھہرایا ہوا فریضہ ہے بے شک اللہ ہی علم و حکمت والا ہے۔ ۱۱

اور تمھارے لیے اس ترکے کا نصف ہے جو تمھاری بیویاں چھوڑیں، اگر اُن کے اولاد نہیں ہے۔ اور اگر اُن کے اولاد ہے تو اُن کے ترکے میں سے تمھارے لیے چوتھائی ہے۔ بعد اس وصیت کی تعمیل اور ادائے قرض کے جو وہ کر جائیں۔ اور اُن کے لیے چوتھائی ہے تمھارے ترکے کا اگر تمھارے اولاد نہیں ہے اور اگر تمھارے اولاد ہے تو اُن کے لیے آٹھواں حصہ ہے تمھارے ترکے کا۔ اس وصیت کی تعمیل اور ادائے قرض کے بعد جو تم کر جاؤ۔

اور اگر کسی مرد یا عورت کی وراثت اس حال میں تقسیم ہو کہ نہ اس کے اصول میں کوئی ہو، نہ فروع میں، اور ایک بھائی یا ایک بہن ہو تو اُن میں سے ہر ایک کے لیے چھٹا حصہ ہے اور اگر وہ اس سے زیادہ ہوں تو وہ ایک تہائی میں شریک ہوں گے۔ اس وصیت کی تعمیل کے بعد جو کی گئی یا ادائے قرض کے بعد، بغیر کسی کو ضرر پہنچائے۔ یہ اللہ کی طرف سے وصیت ہے اور اللہ علیم و حلیم ہے۔ ۱۲

یہ اللہ کی ٹھہرائی ہوئی حدیں ہیں۔ اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے رہیں گے اللہ اُن کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور یہی بڑی کامیابی ہے۔ اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کریں گے اور اس کے مقرر کردہ حدود سے تجاوز کریں گے،

اُن کو ایسی آگ میں داخل کرے گا جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور ان کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔ ۱۳-۱۴

۵- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

مذکورہ بالا مجموعۂ آیات میں وراثت کے جو احکام بیان ہوئے ہیں وہ خود بھی واضح ہیں اور ان کی تفصیل فرائض کی کتابوں میں بھی موجود ہے اس وجہ سے ہم صرف بعض اہم باتوں کی وضاحت پر کفایت کریں گے۔

وصیت کا صحیح مفہوم

پہلی قابلِ توجہ چیز یہ ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے تقسیمِ وراثت سے متعلق جو احکام دیے ہیں ان کو اپنی وصیت سے تعبیر فرمایا ہے۔ وصیت کا صحیح مفہوم عربی زبان میں یہ ہے کہ کوئی شخص کسی پر یہ ذمہ داری ڈالے کہ جب فلاں صورت پیش آئے تو وہ فلاں طریقہ یا فلاں طرزِ عمل اختیار کرے۔ اس میں وصیت کرنے والے کی پیش بینی، خیر خواہی اور شفقت کا پہلو بھی مضمر ہوتا ہے اور اس کے اندر ایک عہد اور معاہدے کی ذمہ داری بھی پائی جاتی ہے۔ لفظ کے ان تمام مضمرات کو ادا کرنے کے لیے اُردو میں کوئی لفظ مجھے نہیں مِلا۔ میں نے جو لفظ اختیار کیا ہے وہ اِس کے مفہوم پر پوری طرح حاوی نہیں ہے۔

لڑکیوں کے بالمقابل لڑکوں کا حصہ دونا رکھنے کی وجہ

دوسری چیز یہ ہے کہ وراثت میں لڑکوں کا حصہ اللہ تعالیٰ نے لڑکیوں کے بالمقابل دُونا رکھا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کے نظامِ معاشرت میں کفالتی ذمہ داریاں اللہ تعالیٰ نے تمام تر مرد ہی پر ڈالی ہیں۔ عورت پر کوئی ذمہ داری نہیں ڈالی ہے۔ مرد ہی بیوی کے نان نفقے کا بھی ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے اور وہی بچوں کا بھی کفیل بنایا گیا ہے۔ قرآن نے یہ بات بھی واضح طور پر بتا دی ہے کہ اپنی خلقی صفات کے اعتبار سے مرد ہی اِس کا اہل ہے کہ وہ خاندان کا سر دھرا اور قوام بنایا جائے اور یہ قوامیت خاندان کے نظم اور اس کے قیام و بقا کے لیے ناگزیر ہے۔ اگر خاندان کا کوئی قوام نہ ہو تو یہ بات خاندان کی فطرت کے خلاف ہے اور اگر خاندان کی قوام مرد کے بجائے عورت ہو تو یہ چیز انسانی فطرت کے خلاف ہے اور فطرت کی ہر مخالفت لازماً فساد و اختلال کا سبب ہوگی جس سے سارا معاشرہ درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔ یہ چیز مقتضی ہوئی کہ مرد کو اس کی ذمہ داریوں کے لحاظ سے بعض حقوق میں ترجیح ہو۔ جو لوگ ہر پہلو سے مرد و عورت کی کامل مساوات کے مدعی ہیں ان کا دعویٰ عقل و فطرت کے بالکل خلاف ہے۔ اس

موضوع پر آگے ہم اس سورہ میں بھی بحث کریں گے اور ہم نے اس پر ایک مستقل کتاب بھی لکھی ہے جس میں اس مسئلے کے سارے پہلو زیر بحث آئے ہیں[1]۔

خدا کی تقسیم کی خلاف ورزی خدا کی حکمت کی تحقیر ہے

تیسری چیز یہ ہے کہ قرآن حکیم نے یہ تنبیہ فرمائی ہے کہ یہ تقسیم اللہ تعالیٰ کے علم اور اس کی حکمت پر مبنی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا علم پیش و عقب ہر چیز پر حاوی اور حاضر و غائب سب پر محیط ہے۔ کسی کا علم بھی اس کے علم کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ اسی طرح اس کی ہر بات اور اس کے ہر کام میں نہایت گہری حکمت ہوتی ہے اور کسی کا بھی یہ مرتبہ نہیں ہے کہ اس کی حکمت کی تمام باریکیوں کو سمجھ سکے۔ اس وجہ سے خدا کی اس تقسیم پر نہ تو اپنے علم و فلسفے کے غرّے میں کسی کو معترض ہونا چاہیے نہ جذباتی جنبہ داری کے جوش میں کسی کو کوئی قدم اس کے خلاف اٹھانا چاہیے۔ بسا اوقات آدمی اپنے ذاتی میلان کی بنا پر ایک کو دوسرے پر ترجیح دیتا ہے لیکن یہ ترجیح دنیا اور آخرت دونوں ہی اعتبارات سے غلط ہوتی ہے، اسی طرح کسی کو اپنے ذاتی میلان کی بنا پر نظر انداز کرتا ہے حالانکہ بعد کے حالات ثابت کرتے ہیں کہ دنیا اور عقبیٰ دونوں ہی اعتبار سے اس کا رویہ زیادہ صحیح رہا جس کو اس نے نظر انداز کیا۔ پس صحیح روش یہی ہے کہ آدمی جو قدم بھی اٹھائے اپنے ذاتی میلانات کے بجائے شریعت کی ہدایت کے مطابق اٹھائے۔ اسی میں خیر و برکت ہے۔ جو لوگ شریعت کے خلاف قدم اٹھاتے ہیں وہ خدا کے علم و حکمت کی تحقیر کرتے ہیں جس کی سزا بالعموم انھیں دنیا میں بھی ملتی ہے اور آخرت میں تو بہر حال ملنی ہی ہے۔ لَا تَدْرُوْنَ اَیُّھُمْ اَقْرَبُ لَکُمْ نَفْعًا الایۃ پر اس روشنی میں غور فرمائیے۔

وارثوں کے حق میں وصیت جائز نہیں

چوتھی چیز یہ ہے کہ خدا نے جب اس تقسیم کو اپنی وصیت سے تعبیر فرمایا ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ جن کو اس نے کسی مورث کا وارث قرار دیا ہے ان کے لیے اس نے انصاف اور حکمت پر مبنی وصیت خود فرما دی ہے۔ رب کریم و حکیم کی اس وصیت کے بعد اگر کوئی مورث کسی وارث کے لیے وصیت کرتا ہے تو در حقیقت یہ خدا کی وصیت کی اصلاح بلکہ صحیح تر الفاظ میں اس کی مخالفت ہوئی جو تقویٰ کے بالکل منافی ہے۔ اس سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ مورثوں کو وصیت کی جو اجازت دی گئی ہے اس کا تعلق ان وارثوں سے نہیں ہے جن کے باب میں خود خدا کی وصیت موجود ہے بلکہ یہ غیر وارثوں کے لیے خاص ہے۔ چنانچہ اسی بنیاد پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ لا وصیۃ لوارث۔

'غیر مضار' کی قید کی حکمت

پانچویں یہ کہ مورث کی وصیت کی تعمیل اور اس کے قرض کی ادائگی کی تاکید جو بار بار آئی ہے اس کے ساتھ 'غیر مضار' کی شرط بھی لگی ہوئی ہے۔ اگرچہ اس شرط کا ذکر صرف کلالہ کے سلسلے میں ہوا ہے لیکن قرینہ دلیل ہے کہ یہ ہر جگہ مقصود ہے۔ کلالہ کے ساتھ اس کے ذکر کی وجہ صرف یہ ہے کہ جس مورث

---

[1] اس کے لیے ہماری کتاب 'اسلامی معاشرہ میں عورت کا مقام' کا باب: نظریہ مساوات مرد و زن پڑھیے۔

کے اصول میں کوئی ہو نہ فروع میں، اس کے اندر اس خواہش کے ابھرنے کا بڑا امکان ہوتا ہے کہ وہ اپنی جائداد ان لوگوں کی طرف نہ منتقل ہونے دے جن کی طرف اس کا طبعی میلان نہیں ہے اگرچہ قانونی حق دار وہی ہیں۔ اس کے لیے وہ وصیت میں بھی تجاوز کر سکتا ہے اور غلط قسم کے نمائشی قرض کا بھی مظاہرہ کر سکتا ہے۔ اس رجحان کو روکنے کے لیے قرآن نے وصیت اور قرض دونوں کے لیے یہ شرط لگا دی کہ ”غیر مضار“ ہو یعنی اس سے مقصود محض شرعی وارثوں کو نقصان پہنچانا نہ ہو۔ اسی بنیاد پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت کو ثلث مال تک محدود فرما دیا تاکہ اس سے اصلی وارثوں کی حق تلفی نہ ہو۔

۶۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۱۵-۱۸

صنفی انتشار کی روک تھام کے لیے ایک عارضی حکم

اوپر کی آیات میں ان مفاسد کے دروازے بند کیے تھے جو مال کی حد سے بڑھی ہوئی طمع سے پیدا ہوتے اور معاشرے میں فساد و اختلال اور قطع رحم کا سبب بنتے ہیں۔ اب آگے صنفی انتشار اور شہوانی بے قیدی پر پابندی عائد کی جا رہی ہے اس لیے کہ یہ بے قیدی بھی حرص مال ہی کی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ معاشرے کو شیطان کی بازی گاہ بنا دینے والی ہے۔

لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ یہ احکام اس باب کے ابتدائی احکام ہیں جو اس دور سے تعلق رکھتے ہیں جب کہ مدینہ میں اسلامی معاشرہ ابھی پوری طرح منظم و مستحکم نہیں ہوا تھا۔ مدینہ کے آس پاس غیر مسلم قبائل موجود تھے جو اس وقت تک اسلام کے زیر نگین نہیں ہوئے تھے اور مسلمانوں نے ابھی وہ قوت حاصل نہیں کی تھی کہ اسلامی حدود و تعزیرات ان پر بھی نافذ کر سکیں۔ یہ صورت حال ایک پیچیدہ صورت حال تھی۔ نہ یہ بات قرین مصلحت تھی کہ معاشرے کی تطہیر کے نقطۂ نظر سے جو حدود و تعزیرات ضروری ہیں وہ بے ڈھنگ نافذ کر دی جائیں اس لیے کہ مخالفین اس سے غلط فائدے اٹھا سکتے تھے اور نہ یہ بات ممکن تھی کہ فحشا اور منکر کے دروازے کھلے چھوڑ دیے جائیں اس لیے کہ اس سے بدکاری و بے حیائی کے اس رجحان کو شہ ملتی جس کا اس وقت عرب سوسائٹی میں زور تھا اور اسلام جس کو مٹانے کے لیے آیا تھا۔ ان دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے اسلام نے یہ حکیمانہ طریقہ اختیار کیا کہ جہاں تک مسلمانوں کی سوسائٹی کا تعلق تھا اس کو بدکاری و بے حیائی سے پاک رکھنے کے لیے کچھ ایسے ابتدائی نوعیت کے عارضی احکام دے دیے جو فی الجملہ مفاسد کے سد باب کے لیے بھی مفید تھے اور جو مسلمانوں کے ذہن کو ان احکام کے قبول کرنے کے لیے تیار کرنے والے بھی تھے جو بعد میں اس سلسلے میں نازل ہوئے اور ساتھ ہی ان کے اندر یہ پہلو بھی ملحوظ تھا کہ مخالفین ان کو اسلام کے خلاف وسوسہ اندازیوں اور ریشہ دوانیوں کا ذریعہ نہیں بنا سکتے تھے۔

اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۵-۱۸

وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِیْلًا ﴿۱۵﴾ وَالَّذٰنِ یَاْتِیٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ۗ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِیْمًا ﴿۱۶﴾ اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَی اللّٰهِ لِلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ یَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِیْبٍ فَاُولٰٓئِكَ یَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَكِیْمًا ﴿۱۷﴾ وَلَیْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓی اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّیْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِیْنَ یَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ ۗ اُولٰٓئِكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا ﴿۱۸﴾

ترجمۂ آیات ۱۵-۱۸

اور تمھاری عورتوں میں سے جو بدکاری کی مرتکب ہوں تو ان پر اپنے اندر سے چار گواہ طلب کرو۔ پس اگر وہ گواہی دے دیں تو ان کو گھروں کے اندر محبوس کر دو، یہاں تک کہ موت ان کا خاتمہ کرے یا اللہ اُن کے لیے کوئی راہ نکالے۔ ۱۵

اور جو دونوں تم میں سے اس بدکاری کا ارتکاب کریں تو ان کو ایذا پہنچاؤ پس اگر وہ توبہ کرلیں اور اصلاح کرلیں تو ان سے درگزر کرو۔ بے شک اللہ توبہ قبول

کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ ۱۶

اللہ پر توبہ قبول کرنے کی ذمہ داری تو انہی کے لیے ہے جو جہالت سے مغلوب ہو کر برائی کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں، پھر جلدی ہی توبہ کر لیتے ہیں، وہی ہیں جن کی توبہ اللہ قبول فرماتا ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے اور ان لوگوں کی توبہ نہیں ہے جو برابر برائی کرتے رہے، یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت سر پر آن کھڑی ہوئی تو بولا کہ اب میں نے توبہ کر لی اور نہ ان لوگوں کی توبہ ہے جو کفر ہی پر مر جاتے ہیں۔ ان کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ ۱۷-۱۸

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَۃَ مِنْ نِّسَآئِکُمْ فَاسْتَشْھِدُوْا عَلَیْھِنَّ اَرْبَعَۃً مِّنْکُمْ فَاِنْ شَھِدُوْا فَاَمْسِکُوْھُنَّ فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰھُنَّ الْمَوْتُ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰہُ لَھُنَّ سَبِیْلًا ۝ وَالَّذٰنِ یَاْتِیٰنِھَا مِنْکُمْ فَاٰذُوْھُمَا ج فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْھُمَا ط اِنَّ اللّٰہَ کَانَ تَوَّابًا رَّحِیْمًا ۝ (۱۵-۱۶)

'فاحشۃ' زنا کی تعبیر کے لیے معروف ہے

'فاحشۃ' کھلی ہوئی بے حیائی اور بدکاری کو کہتے ہیں اور زنا کی تعبیر کے لیے یہ لفظ معروف ہے۔

'من نسآئکم' کا مفہوم

'مِنْ نِّسَآئِکُمْ' (تمہاری عورتوں میں سے) یعنی بدکاری کا ارتکاب کرنے والی عورت مسلمانوں کے معاشرے سے تعلق رکھنے والی ہو۔

یہ اشارہ کہ یہ حکم عارضی ہے

"اَوْ یَجْعَلَ اللّٰہُ لَھُنَّ سَبِیْلًا" میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ حکم عارضی ہے۔ اس باب میں آخری حکم بعد میں نازل ہونے والا ہے۔ چنانچہ سورۂ نور میں زنا کی جو سزا بیان ہوئی ہے اس سے یہ وعدہ پورا ہوا۔

صیغہ کا استعمال تغلیب کے اعتبار سے

'وَالَّذٰنِ یَاْتِیٰنِھَا مِنْکُمْ' یعنی بدکاری کا ارتکاب کرنے والے دونوں فریق، مرد اور عورت، مسلمانوں ہی کے اندر کے ہوں۔ اس میں مذکر کا صیغہ عربی زبان کے معروف قاعدے کے مطابق تغلیب کے لحاظ سے استعمال ہوا ہے۔ جیسے کہ "والدین" کا لفظ ہے جو ہے تو مذکر لیکن ماں باپ دونوں ہی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

ایذاء کا مفہوم

'فَاٰذُوْھُمَا' میں توہین و تذلیل، ڈانٹ ڈپٹ اور نصیحت و ملامت سے لے کر اصلاح کے حد تک

مار پیٹ ہر چیز داخل ہے۔

ان آیات میں خطاب ظاہر ہے کہ معاشرہ کے ارباب حل وعقد اور ذمہ داروں سے ہے۔ ان کو خطاب کرکے بدکاری پر تعزیر کے لیے دو مختلف صورتوں میں دو الگ الگ ہدایات دی گئی ہیں۔

دو صورتوں کے لیے دو الگ الگ ہدایات

ایک صورت یہ ہے کہ بدکاری کا ارتکاب کرنے والی عورت تو مسلمانوں کے معاشرے سے تعلق رکھتی ہے لیکن اس کا شریک مرد، اسلامی معاشرے کے دباؤ میں نہیں ہے۔ ایسی صورت میں یہ ہدایت فرمائی کہ عورت کو گھر کے اندر محبوس کر دیا جائے، اس کی باہر کی آمد و شد پر پوری پابندی عائد کر دی جائے تا آنکہ موت اس کا خاتمہ کرے یا اس باب میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی نیا حکم نازل ہو۔

دوسری صورت یہ ہے کہ بدکاری کے دونوں فریق مسلمانوں ہی سے تعلق رکھتے ہوں۔ ایسی صورت میں ان کو زجر و توبیخ، تحقیر و تذلیل، ڈانٹ ڈپٹ اور اصلاح کے حد تک مار پیٹ سے درست کرنے کی کوشش کی جائے۔ اگر وہ اس کے اثر سے توبہ کرکے اپنے چال چلن درست کر لیں تو ان سے درگزر کیا جائے۔ اللہ توبہ قبول کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

عورت کے معاملے میں شدتِ احتیاط کی حکمت

ان دونوں صورتوں پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ پہلی صورت میں احتیاط کا پہلو زیادہ شدت کے ساتھ ملحوظ ہے۔ دوسری صورت میں تو عورت اور مرد دونوں کو یہ موقع دیا گیا ہے کہ اگر وہ توبہ کرکے اپنے چال چلن درست کر لیں تو ان سے درگزر کر لیا جائے لیکن پہلی صورت میں عورت کے بارے میں یہ نہیں فرمایا کہ اگر وہ توبہ و اصلاح کرے تو اس پر عائد کردہ قدغن اٹھالی جائے۔

اس کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ دوسری صورت میں تو دونوں فریق اسلامی معاشرہ کے دباؤ میں ہیں، ان کے رویے میں جو تبدیلی ہوگی وہ سب کے سامنے ہوگی، نیز ان کے اثرات اور وسائل معلوم و معین ہیں، ان کے لیے بہرحال اپنے خاندان اور قبیلے سے بے نیاز ہو کر کوئی اقدام ناممکن نہیں تو نہایت دشوار ہوگا۔ لیکن پہلی صورت میں مرد، جو اصل جرم میں شریک غالب کی حیثیت رکھتا ہے، مسلمانوں کے معاشرہ کے دباؤ سے بالکل آزاد ہے، نہ اس کے رویے کا کچھ پتہ نہ اس کے عزائم کا کچھ اندازہ، نہ اس کے اثرات و وسائل کے حدود معلوم و معین۔ ایسی حالت میں اگر عورت کو یہ موقع دے دیا جاتا کہ توبہ کے بعد اس سے درگزر کی جائے تو یہ بات نہایت خطرناک نتائج پیدا کر سکتی تھی۔ اول تو مرد کے رویہ کو نظر انداز کرکے عورت کی توبہ و اصلاح کا صحیح اندازہ ہی ممکن نہیں ہے اور ہو بھی تو جب مرد بالکل قابو سے باہر اور مطلق العنان ہے تو اغوا، فرار اور قتل و خون کے امکانات کسی حال میں بھی نظر انداز نہیں کیے جا سکتے۔ اس پہلو سے اس میں احتیاط کی شدت ملحوظ ہے۔

اگرچہ یہ تعزیرات سورۂ نور میں نازل شدہ حدود کے بعد منسوخ ہو گئیں لیکن بدکاری کے معاملے میں شہادت کا یہی ضابطہ بعد میں بھی باقی رہا۔

تعزیری مقاصد کے لیے جیل کے سسٹم کا جواز

علاوہ ازیں فَاَمۡسِکُوۡهُنَّ فِی الۡبُیُوۡتِ کے الفاظ سے تعزیری مقاصد کے لیے جیل کے سسٹم کا جواز بھی نکلتا ہے۔

اِنَّمَا التَّوۡبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِیۡنَ یَعۡمَلُوۡنَ السُّوۡٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ یَتُوۡبُوۡنَ مِنۡ قَرِیۡبٍ فَاُولٰٓئِكَ یَتُوۡبُ اللّٰهُ عَلَیۡهِمۡ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِیۡمًا حَكِیۡمًا ۝ وَلَیۡسَتِ التَّوۡبَةُ لِلَّذِیۡنَ یَعۡمَلُوۡنَ السَّیِّاٰتِ ۚ حَتّٰۤی اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الۡمَوۡتُ قَالَ اِنِّیۡ تُبۡتُ الۡـٰٔنَ وَلَا الَّذِیۡنَ یَمُوۡتُوۡنَ وَهُمۡ كُفَّارٌ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعۡتَدۡنَا لَهُمۡ عَذَابًا اَلِیۡمًا (۱۷-۱۸)

لفظ 'جہالت' کا مفہوم

'جہالت' کے معنی عربی میں صرف نہ جاننے کے نہیں آتے بلکہ اس کا غالب استعمال جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی شرارت یا ظلم یا گناہ کا کام کر گزرنے کے معنی میں ہے۔ یہ لفظ عام طور پر علم کے بجائے حلم کے ضد کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ ایک حماسی کا شعر ہے۔

وللحلم خیر فاعلمن مغبۃ من الجھل الا ان تشمس من ظلم

اور یاد رکھو کہ جہالت کے مقابلے میں تحمل و بُردباری انجام کار کے اعتبار سے بہتر ہے مگر یہ کہ تمھیں ظلم کی وجہ سے ذلیل کرنے کی کوشش کی جائے۔

معلقات کا مشہور شعر ہے۔

الا لا یجھلن احد علینا فنجھل فوق جھل الجاھلینا

آگاہ، کہ کوئی ہمارے خلاف جہالت کا اظہار نہ کرے کہ ہم بھی تمام جاہلوں سے بڑھ کر جہالت کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

توبہ کی قبولیت کے شرائط

اُوپر والی آیت میں یہ جو فرمایا تھا کہ اگر وہ توبہ اور اصلاح کر لیں تو ان سے درگزر کرو، اس سے اتنی بات تو بالکل واضح ہو گئی تھی کہ رویے کی اصلاح توبہ کے لازمی شرائط میں سے ہے، اگر کوئی شخص اس برائی سے باز نہ آئے جس کا وہ مرتکب ہوا ہے تو زبان سے لاکھ توبہ توبہ کا ورد کرے، اس کی توبہ بالکل غیر معتبر ہے۔ اسی تعلق سے توبہ کے آداب و خصوصیات کی مزید وضاحت فرما دی۔

فرمایا کہ اللہ کے اوپر صرف ان کی توبہ کا حق قائم ہوتا ہے جو جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی برائی کر گزرتے ہیں پھر فوراً توبہ کر لیتے ہیں۔ انہی لوگوں کی توبہ اللہ قبول فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ علیم اور حکیم ہے۔ نہ وہ کسی بات سے بے خبر نہ اُس کا کوئی کام حکمت سے خالی۔ پھر وہ ان لوگوں کی توبہ کی کوئی ذمہ داری اپنے اُوپر کیوں لے گا جو جانتے بوجھتے ٹھنڈے دل سے گناہ بھی کیے جا رہے ہیں اور توبہ کا وظیفہ بھی پڑھتے جا رہے ہیں۔

اسی طرح ان لوگوں کی توبہ بھی توبہ نہیں ہے جو زندگی بھر تو گناہوں میں ڈوبے رہے، جب

دیکھا کہ موت سر پر آن کھڑی ہوئی تو بولے کہ اب میری توبہ! علیٰ ہذا القیاس کفر کی حالت میں مرنے والوں کی بھی توبہ نہیں ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

ان دونوں آیتوں پر غور کرنے سے توبہ کی قبولیت اور عدم قبولیت کی دو صورتیں متعین ہو جاتی ہیں۔ جو لوگ جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی برائی کر بیٹھتے ہیں پھر فوراً توبہ اور اصلاح کر لیتے ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر ان کی توبہ قبول کرنے کی ذمہ داری لی ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ برابر گناہ کیے چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ جب ملک الموت ان کے سر پر آ دھمکتا ہے اس وقت وہ توبہ کرتے ہیں یا وہ لوگ جو کفر کی حالت ہی میں مرتے ہیں ان کی توبہ قبول نہیں ہوتی۔ ان دونوں حدوں کے معین ہو جانے کے بعد اب ایک سوال رہ جاتا ہے کہ ان لوگوں کی توبہ کا کیا حکم ہے جن کو گناہ کے بعد جلدی توبہ کرنے کی سعادت تو حاصل نہیں ہوئی لیکن اتنی دیر بھی انھوں نے نہیں لگائی کہ موت کا وقت آن پہنچا ہو۔ اس سوال کے جواب میں یہ آیت خاموش ہے اور یہ خاموشی جس طرح امید پیدا کرتی ہے اسی طرح خوف بھی پیدا کرتی ہے اور قرآن حکیم کا منشا یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاملہ بین الرجاء والخوف ہی رہے لیکن کبھی کبھی ذہن اس طرف جاتا ہے کہ اس امت کے اس طرح کے لوگ امید ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے نجات پا جائیں گے اس لیے کہ ان کے باب میں شفاعت کے ممنوع ہونے کی کوئی وجہ موجود نہیں ہے۔

۸۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۱۹-۲۲

عورتوں کے حقوق معاشرے کے اندر محفوظ کرنے اور ان کو ظلم و تعدی سے بچانے کے لیے جو ہدایات اوپر دی گئی ہیں اسی سلسلے میں مزید ارشاد ہوا۔

آیات ۱۹-۲۲

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا يَحِلُّ لَكُمْ أَن تَرِثُوا۟ ٱلنِّسَآءَ كَرْهًا ۖ وَلَا تَعْضُلُوهُنَّ لِتَذْهَبُوا۟ بِبَعْضِ مَآ ءَاتَيْتُمُوهُنَّ إِلَّآ أَن يَأْتِينَ بِفَٰحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ وَعَاشِرُوهُنَّ بِٱلْمَعْرُوفِ ۚ فَإِن كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰٓ أَن تَكْرَهُوا۟ شَيْـًٔا وَيَجْعَلَ ٱللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا ﴿١٩﴾ وَإِنْ أَرَدتُّمُ ٱسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ وَءَاتَيْتُمْ إِحْدَىٰهُنَّ قِنطَارًا فَلَا تَأْخُذُوا۟ مِنْهُ

شَيْـًٔا ۭ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۲۰﴾ وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴿۲۱﴾ وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَاۗؤُكُمْ مِّنَ النِّسَاۗءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ۭ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا ۭ وَسَاۗءَ سَبِيْلًا ﴿۲۲﴾ ع ۳ ۱۴

ترجمۂ آیات ۱۹-۲۲

اے ایمان والو، تمھارے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ تم عورتوں کے زبردستی وارث بن جاؤ اور نہ یہ بات جائز ہے کہ جو کچھ تم نے ان کو دیا ہے اس کا کچھ حصہ واپس لینے کے لیے ان کو تنگ کرو مگر اس صورت میں کہ وہ کسی کھلی ہوئی بدکاری کی مرتکب ہوئی ہوں اور ان کے ساتھ معقول طریقے کا برتاؤ کرو۔ اگر تم ان کو ناپسند کرتے ہو تو بعید نہیں کہ ایک چیز کو تم ناپسند کرو اور اللہ تمھارے لیے اس میں بہت بڑی بہتری پیدا کر دے۔ ۱۹

اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی بدلنا چاہو اور تم نے ایک کو ڈھیروں مال دے رکھا ہو تو بھی اس میں سے کچھ نہ لو، کیا تم بہتان لگا کر اور کھلی ہوئی حق تلفی کر کے اس کو لوگے ؟ اور کس طرح اس کو لوگے جب کہ تم ایک دوسرے کے آگے بے حجاب ہو چکے ہو اور انھوں نے تم سے مضبوط عہد لے رکھا ہے۔ ۲۰-۲۱

اور جن عورتوں سے تمھارے باپ نکاح کر چکے ہوں ان سے نکاح نہ کرو۔ مگر جو کچھ ہو چکا۔ بے شک یہ کھلی بے حیائی اور نفرت کی بات ہے اور نہایت بُرا طریقہ ہے۔ ۲۲

۹۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ لَا يَحِلُّ لَكُمْ أَن تَرِثُواْ ٱلنِّسَآءَ كَرْهًا ۖ وَلَا تَعْضُلُوهُنَّ لِتَذْهَبُواْ بِبَعْضِ مَآ ءَاتَيْتُمُوهُنَّ إِلَّآ أَن يَأْتِينَ بِفَٰحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ وَعَاشِرُوهُنَّ بِٱلْمَعْرُوفِ ۚ فَإِن كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰٓ أَن تَكْرَهُواْ شَيْـًٔا وَيَجْعَلَ ٱللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا (۱۹)

عضل کے معنی

'عضل یعضل' کے معنی تنگ کرنے، زچ کرنے اور روکنے کے ہیں۔

معاشرت بالمعروف

'عاشروھن بالمعروف' یعنی ان کے ساتھ اس طرح کا برتاؤ کرو جو شریفوں کے شایانِ شان، عقل و فطرت کے مطابق، رحم و مروت اور عدل و انصاف پر مبنی ہو۔ یہاں لفظ معروف کے استعمال سے یہ بات نکلتی ہے کہ اگرچہ عرب جاہلیت کے بعض طبقات میں عورتوں کے ساتھ سلوک کے معاملہ میں بعض نہایت ناروا قسم کی زیادتیاں رواج پا گئی تھیں تاہم وہ اس بات سے ناآشنا نہیں تھے کہ عورت کے ساتھ معقولیت کا برتاؤ کیا ہے۔

عرب جاہلیت کے ایک مکروہ رواج کی اصلاح

اس آیت میں پہلے عرب جاہلیت کی ایک نہایت مکروہ رسم کی اصلاح کی ہے۔ وہ یہ کہ ان کے بعض طبقات میں یہ رواج تھا کہ مورث کی جائداد اور اس کے مال مویشی کی طرح اس کی بیویاں بھی وارث کی طرف منتقل ہو جاتی تھیں۔ حد یہ ہے کہ باپ کی منکوحہ عورتوں پر بھی بیٹے قبضہ کر لیتے تھے۔ باپ کے مرنے پر خلفِ اکبر اس کی منکوحات میں سے جن پر اپنی چادر ڈال دیتا تھا وہ سب اس کے تصرف میں آجاتیں اور آگے آیت ۲۲ سے واضح ہوتا ہے کہ وہ ان سے زن و شو کے تعلقات قائم کرنے میں بھی قباحت محسوس نہیں کرتے تھے۔ قرآن نے یہاں واضح فرمایا کہ عورت متروکہ جائداد نہیں بلکہ آزاد ہستی ہے۔ اس کے ساتھ مورث کی بھیڑ بکریوں کی طرح کا معاملہ جائز نہیں ہے بلکہ وہ اپنی مرضی کی مالک اور شریعت کے حدود کے اندر آزاد ہے۔

ناپسند بیوی سے حسن سلوک کی ہدایت

دوسری بات یہ فرمائی کہ اگر کسی کو اس کی بیوی ناپسند ہو تو اس سے اپنا دیا دلایا اور کھلایا پہنایا اگلوانے کے لیے اس کو ضیق میں ڈالنے اور تنگ کرنے کی کوشش نہ کرے۔ اس قسم کا رویہ صرف اس شکل میں جائز ہے جب اس کی طرف سے کھلی ہوئی بدکاری کا صدور ہو۔ اگر اس قسم کی کوئی بات اس سے صادر نہیں ہوئی ہے، وہ بدستور اپنی وفاداری اور پاک دامنی پر قائم ہے تو مجرد اس بنیاد پر کہ بیوی پسند نہیں ہے اس سے کچھ اینٹھنے کے لیے اس کو تنگ کرنا عقل، انصاف، شرافت اور فتوت کے بالکل منافی ہے۔ قابل نفرت چیز صرف اخلاقی فساد ہے۔ محض شکل و صورت اور رنگ و روغن کے ناپسندیدہ ہونے کی بنا پر یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ شریفانہ معاشرت کے حقوق سے محروم کر دی جائے۔ ہو سکتا ہے کہ مجرد شکل و صورت کی بنا پر کوئی شخص اپنی بیوی کو ناپسند کرتا ہو لیکن اللہ تعالیٰ اس

کے ذریعے سے اس کے لیے دنیا و آخرت دونوں میں برکتوں کے بہت سے دروازے کھول دے۔ پس صحیح مومنانہ رویہ یہی ہے کہ اگر کسی کو اس طرح کی آزمائش پیش آ جائے تو ذوقی عدم مناسبت کے باوجود خدا کے خوف اور اپنی فتوت و شرافت کے پیش نظر ایسی بیوی سے نہایت اچھا برتاؤ کرے اور خدا سے خیر و برکت کی امید رکھے۔

ایک ادبی نکتہ

یہاں لفظ اگرچہ 'عسیٰ' استعمال ہوا ہے جو عربی میں صرف اظہار امید اور اظہار توقع کے لیے آتا ہے لیکن عربیت کے اداشناس جانتے ہیں کہ اس طرح کے مواقع میں، جیسا کہ یہاں ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک قسم کا وعدہ مضمر ہوتا ہے۔ اس اشارے کے پیچھے جو حقیقت جھلک رہی ہے وہ یہی ہے کہ جو لوگ ظاہری شکل و صورت کے مقابل میں اعلیٰ اخلاقی و انسانی اقدار کو اہمیت اور ان کی خاطر اپنے جذبات کی قربانی دیں گے ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے خیر کثیر کا وعدہ ہے۔ جن لوگوں نے اس وعدے کے لیے بازیاں کھیلی ہیں وہ گواہی دیتے ہیں کہ یہ بات سو فی صدی حق ہے اور خدا کی بات سے زیادہ سچی بات کس کی ہو سکتی ہے۔

وَإِنْ أَرَدْتُمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ وَآتَيْتُمْ إِحْدَاهُنَّ قِنطَارًا فَلَا تَأْخُذُوا مِنْهُ شَيْئًا ۚ أَتَأْخُذُونَهُ بُهْتَانًا وَإِثْمًا مُّبِينًا ۝ وَكَيْفَ تَأْخُذُونَهُ وَقَدْ أَفْضَىٰ بَعْضُكُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ وَأَخَذْنَ مِنكُم مِّيثَاقًا غَلِيظًا (۲۰-۲۱)

'قنطار' کا مفہوم

'قنطار' اصل میں تو ایک وزن ہے جس کی مقدار زمانے کے ساتھ گھٹتی بڑھتی رہی ہے لیکن عام استعمال میں اس سے مراد مال کثیر ہوتا ہے۔ جیسے ہم منوں مال، ڈھیروں مال، بولتے ہیں، عربی میں اسی مفہوم کی تعبیر کے لیے یہ لفظ ہے۔ اسی سے 'قناطیر مقنطرۃ' کی ترکیب بھی قرآن میں استعمال ہوئی ہے۔

'افضی بعضکم الی بعض' کا مفہوم

'اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ' افضی فلان الی فلان کے معنی ہیں وصل الیہ ودخل فی حیزہ اسی طرح افضی الی فلان بسرہ کے معنی ہیں 'اس نے فلاں کے آگے اپنے سارے بھید بے نقاب کر دیے' یہ میاں بیوی کے ازدواجی تعلقات کی نہایت جامع اور نہایت شائستہ تعبیر ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے اس طرح بے نقاب ہو جاتے ہیں کہ ان کے ظاہر و باطن اور احساسات و جذبات کا کوئی گوشہ اور کوئی پہلو ایک دوسرے سے مخفی نہیں رہ جاتا۔

بیوی سے دیا ہوا مال واپس لینا فتوت کے منافی ہے

اوپر کی آیت میں بتایا تھا کہ ناپسندیدگی کے باوجود اعلیٰ طریقہ یہی ہے کہ آدمی بیوی کے ساتھ شائستہ طریقے پر نباہنے کی کوشش کرے۔ اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ کوئی شخص اپنے حالات کے تقاضوں سے اگر اس فیصلہ پر پہنچ ہی گیا ہے کہ ایک بیوی کو چھوڑ کر کسی دوسری عورت سے شادی کرے تو یہ تو بہر حال وہ نہ کرے کہ جو کچھ پہلی بیوی کو اس نے دیا ہے اس کو واپس لینے کی کوشش کرے۔ یہاں تک کہ اگر اس کو ڈھیروں مال بھی اس نے دیا ہے جب بھی اس کے لیے جائز نہیں کہ وہ اس کے واپس لینے کے

لیے ہتھکنڈے استعمال کرے، خاص کر اس خیال سے اس پر بہتان لگانا کہ اس سے دیا ہوا مال واپس لینے کے لیے جواز پیدا ہو سکے اور بھی بڑا گناہ اور ظلم ہے۔ پھر فرمایا کہ یہ مرد کی فتوت کے بالکل منافی ہے کہ جس عورت کے ساتھ اس نے زندگی بھر کا پیمانِ وفا باندھا، جو ایک نہایت مضبوط میثاق کے تحت اس کے حبالۂ عقد میں آئی، جس نے اپنا سب ظاہر و باطن اس کے لیے بے نقاب کر دیا اور دونوں نے ایک مدت تک یک جان و دو قالب ہو کر زندگی گزاری، اس سے جب جدائی کی نوبت آئے تو اپنا کھلایا پہنایا اس سے اگلوانے کی کوشش کی جائے یہاں تک کہ اس ذلیل غرض کے لیے اس کو بہتانوں اور تہمتوں کا ہدف بھی بنایا جائے۔

عقدِ نکاح ایک محکم میثاق ہے

یہاں ایک اور چیز بھی قابلِ غور ہے وہ یہ کہ فرمایا ہے وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا (اور ان عورتوں نے تم سے مضبوط میثاق لیا ہے) ظاہر ہے کہ 'میثاق غلیظ' سے مراد یہاں عقدِ نکاح ہی ہے۔ اس کے سوا کسی اور میثاق کا نہ یہاں کوئی قرینہ ہے نہ اس کی کوئی تاریخی شہادت۔ پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ عقدِ نکاح کی ذمہ داری کو یہاں 'میثاق غلیظ' سے کیوں تعبیر فرمایا۔ میرے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ عقدِ نکاح کی اصل عرفی اور شرعی حقیقت یہی ہے کہ وہ میاں اور بیوی کے درمیان حقوق اور فرائض کا ایک مضبوط معاہدہ ہوتا ہے جس کے ذریعے سے دونوں زندگی بھر کے سنجوگ کے عزم کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ جڑتے ہیں اور دونوں یکساں طور پر حقوق بھی حاصل کرتے ہیں اور یکساں طور پر ایک دوسرے کے لیے ذمہ داریاں بھی اٹھاتے ہیں۔ بظاہر تو اس میثاق کے الفاظ نہایت سادہ اور مختصر ہوتے ہیں لیکن اس کے مضمرات و تضمنات بہت ہیں اور یہ مضمرات و تضمنات ہر مہذب سوسائٹی اور ہر شریعت میں معلوم و معروف ہیں۔ یہ امر بھی ایک حقیقت ہے کہ یہ میثاق بندھتا تو ہے میاں اور بیوی کے درمیان لیکن اس کی گرہ خدا کے حکم سے لگتی ہے اور جس طرح خلق اس کی گواہ ہوتی ہے اسی طرح خالق بھی اس کا گواہ ہوتا ہے۔ پھر اس کے 'میثاق غلیظ' ہونے میں کیا شبہ رہا؛ یہاں اس رشتے کو اس لفظ سے تعبیر فرما کر قرآن نے اس کی اصلی عظمت واضح فرمائی ہے کہ مرد کو کسی حال میں بھی یہ بھولنا نہیں چاہیے کہ بیوی کے ساتھ اس کا تعلق کچے دھاگے سے نہیں بندھا ہے بلکہ یہ رشتہ نہایت محکم رشتہ ہے اور اس کے تحت جس طرح مرد کے حقوق ہیں اسی طرح بیوی کے بھی حقوق ہیں جن سے مرد کے لیے فرار کی گنجائش نہیں ہے۔ اگر وہ ان سے بھاگنے کی کوشش کرے گا تو اپنی فتوت کو بھی رسوا کرے گا اور اپنے خدا کو بھی ناراض کرے گا۔

وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ۭ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا ۭ وَسَاۗءَ سَبِيْلًا (۲۲)

مقت اور ممقوت، مبغوض اور نفرت انگیز شے یا فعل کو کہتے ہیں۔ باپ کی منکوحہ سے نکاح کے

یے زواج المقت کی تعبیر مشہور رہی ہے۔ اسی طرح اُس شخص کو مقتی کہتے تھے جو اس فعلِ شنیع کا مرتکب ہوا ہو۔

'اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ' کا مفہوم

'اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ' کا مطلب یہ ہے کہ یہ قانون ماضی پر لاگو نہیں ہوگا کہ اس کو بنیاد قرار دے کر تمام پچھلے رشتوں کی تحقیق ہو اور اس کی روشنی میں جائز و ناجائز کے احکام صادر ہوں۔ یہ چیز عملاً ناممکن ہے۔ قانون اپنی فطرت ہی سے ایک ایسی چیز ہے کہ اس کا نفاذ حاضر و مستقبل ہی پر ہو۔ چنانچہ ماضی سے درگزر کر کے ان برائیوں کی اصلاح کر دی گئی جو بالفعل موجود تھیں اور آئندہ کے لیے اس بے حیائی کا سدِباب کر دیا گیا۔

زواج المقت

آیت ۱۹ کے تحت گزر چکا ہے کہ عرب جاہلیت کے بعض طبقات میں یہ رواج تھا کہ باپ کی منکوحات بیٹے کو وراثت میں ملتی تھیں اور بیٹے ان سے زن و شو کے تعلقات قائم کرنے میں بھی کوئی قباحت نہیں محسوس کرتے تھے۔ اس آیت نے اس فعلِ شنیع کی حتمی ممانعت کر دی۔ فرمایا کہ یہ فعل کھلی ہوئی بے حیائی و بدکاری، نہایت مبغوض اور نہایت برا رواج ہے۔

مخصوص طبقات کی برائیوں کا ذکر صیغۂ عام سے

یہ بات یہاں یاد رکھنے کی ہے کہ اس قسم کی برائیوں اور بے حیائیوں کا ذکر قرآن میں عام صیغے سے جو آتا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ اس میں لازماً پوری قوم مبتلا تھی۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ برائی کسی خاص طبقے کے اندر محدود ہوتی ہے لیکن اس سے متعلق قانون چونکہ سب پر حاوی ہوتا ہے اس سے خطاب عام ہوتا ہے۔ یہاں اس برائی کے لیے جو الفاظ استعمال فرمائے ہیں وہ خود شاہد ہیں کہ اس کا کھلی ہوئی بے حیائی اور مبغوض ہونا عرب کے شرفا کو بھی معلوم تھا۔

۱۰۔ آگے کا مضمون ـــــــ آیات ۲۳-۲۵

باپ کی منکوحات کے ساتھ نکاح کی ممانعت نے عورتوں میں جو حلال و حرام ہیں ان کے بیان کے لیے راہ ہموار کر دی تاکہ اس پہلو سے معاشرے میں جو گندگیاں اور ناانصافیاں ہیں وہ واضح ہو کر سامنے آجائیں اور ان کی اصلاح ہو سکے۔ فرمایا۔

آیات ۲۳-۲۵

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ وَبَنَاتُكُمْ وَأَخَوَاتُكُمْ وَعَمَّاتُكُمْ وَخَالَاتُكُمْ وَبَنَاتُ الْأَخِ وَبَنَاتُ الْأُخْتِ وَأُمَّهَاتُكُمُ اللَّاتِي أَرْضَعْنَكُمْ وَأَخَوَاتُكُمْ مِنَ الرَّضَاعَةِ وَأُمَّهَاتُ نِسَائِكُمْ وَرَبَائِبُكُمُ اللَّاتِي فِي حُجُورِكُمْ مِنْ نِسَائِكُمُ اللَّاتِي دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَإِنْ لَمْ تَكُونُوا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ ز

وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ ۙ وَاَنْ تَجْمَعُوْا
بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا
رَّحِيْمًا ﴿۲۳﴾ وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۚ الجزء ۵
كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ۚ وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا
بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ؕ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ
مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ؕ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا
تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا
حَكِيْمًا ﴿۲۴﴾ وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ
الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ
وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ؕ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَانْكِحُوْهُنَّ
بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ
غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ فَاِذَآ اُحْصِنَّ
فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ
مِنَ الْعَذَابِ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ؕ وَاَنْ تَصْبِرُوْا
خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۵﴾ ع ۴

ترجمۂ آیات ۲۳-۲۵

تم پر حرام کی گئیں تمھاری مائیں، تمھاری بیٹیاں، تمھاری بہنیں، تمھاری
پھوپھیاں، تمھاری خالائیں، تمھاری بھتیجیاں اور بھانجیاں اور تمھاری وہ مائیں جنھوں
نے تم کو دودھ پلایا، تمھاری رضاعی بہنیں، تمھاری ساسیں اور تمھاری ربیبائیں جو تمھاری

گودوں میں پلیں اور تمھاری مدخولہ بیویوں سے ہوں، اگر وہ تمھاری مدخولہ نہ رہی ہوں تو کچھ گناہ نہیں ـــ اور تمھارے صلبی بیٹوں کی بیویاں اور یہ کہ تم دو بہنوں کو بیک وقت جمع کرو مگر جو گزر چکا۔ بے شک اللہ غفور رحیم ہے۔ ۲۳

اور وہ عورتیں بھی حرام ہیں جو قید نکاح میں ہوں مگر یہ کہ وہ تمھاری ملک یمین بن جائیں۔ یہ تم پر اللہ کا لکھا ہوا فریضہ ہے۔ ان کے ماسوا جو عورتیں ہیں وہ تمھارے لیے حلال ہیں، اس طرح کہ تم اپنے مال کے ذریعے سے ان کے طالب بنو، ان کو قید نکاح میں لے کر، نہ بدکاری کے طور پر۔ پس ان میں سے جن سے تم نے تمتع کیا ہو تو ان کو ان کے مہر دو، فریضہ کی حیثیت سے۔ مہر کے ٹھہرانے کے بعد جو تم نے آپس میں راضی نامہ کیا ہو تو اس میں کوئی گناہ نہیں۔ بے شک اللہ علیم و حکیم ہے۔ ۲۴

اور جو تم میں سے آزاد مومنات سے نکاح کرنے کی مقدرت نہ رکھتا ہو تو وہ مومنہ کنیزوں میں سے جو تمھارے قبضہ میں ہوں ان سے نکاح کرے اور اللہ تمھارے ایمان سے خوب باخبر ہے۔ تم سب ایک ہی جنس سے ہو۔ سو ان سے ان کے مالکوں کی اجازت سے نکاح کرلو۔ اور دستور کے مطابق ان کو ان کے مہر دو۔ ان کو قید نکاح میں لا کر نہ کہ بدکاری کرنے والیاں اور آشنائی گانٹھنے والیاں ہوں۔ پس جب وہ قید نکاح میں آجائیں تو اگر وہ بدکاری کی مرتکب ہوں تو آزاد عورتوں کے لیے جو سزا ہے اس کی نصف سزا ان پر ہے۔ یہ اجازت تم میں سے اُن کے لیے ہے جن کو گناہ میں پڑ جانے کا اندیشہ ہو اور یہ کہ تم صبر کرو تو یہ تمھارے لیے زیادہ بہتر ہے اور اللہ غفور رحیم ہے۔ ۲۵

۱۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَأَخَوٰتُكُمْ وَعَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ وَبَنٰتُ الْأَخِ وَبَنٰتُ الْأُخْتِ وَأُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْ أَرْضَعْنَكُمْ وَأَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَأُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَإِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ وَحَلَآئِلُ أَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ أَصْلَابِكُمْ وَأَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْأُخْتَيْنِ إِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۲۳)

وہ عورتیں حرام ہیں جن کو رحمی رشتہ سے قربت قریبہ حاصل ہے

اس آیت میں جو حرمتیں بیان ہوئی ہیں وہ انسانی فطرت کے اس تقاضے پر مبنی ہیں کہ جہاں رحمی رشتے کی قربت قریبہ موجود ہو یا اس سے مشابہت پائی جاتی ہو وہاں باہمی ارتباط کی بنیاد صرف رحم، محبت اور رافت و شفقت کے اعلیٰ جذبات ہی پر ہونی چاہیے، اس میں نہ تو نفس کی شہوات و رغبات کی کوئی آمیزش ہونی چاہیے نہ رشک و رقابت کو اس میں خلل انداز ہونے کا موقع دینا چاہیے۔ یہ چیز اس فطرت اصلیہ کے خلاف ہے جس پر فاطر کائنات نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ اس وجہ سے ان تمام عورتوں سے ازدواجی تعلق کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے جن کو بلا واسطہ یا بالواسطہ رحمی قربت قریبہ حاصل ہے۔

رضاعت کے رشتہ کو مادرانہ رشتے سے مناسبت حاصل ہے

رضاعت کے تعلق کو لوگ ہمارے ہاں اس گہرے معنی میں نہیں لیتے جس معنی میں اس کو لوگ عرب میں لیتے تھے۔ اس کا سبب محض رواج کا فرق ہے۔ ورنہ حقیقت یہی ہے کہ اس کو مادرانہ رشتے سے بڑی گہری مناسبت ہے۔ جو بچہ جس ماں کی آغوش میں، اس کی چھاتیوں کے دودھ سے پلتا ہے وہ اس کی پوری نہیں تو آدھی ماں تو ضرور بن جاتی ہے۔ پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ جس کا دودھ اس کے رگ و پے میں جاری و ساری ہے اس سے اس کے جذبات و احساسات متاثر نہ ہوں۔ اگر نہ متاثر ہوں تو یہ فطرت کا بناؤ نہیں بلکہ بگاڑ ہے اور اسلام، جو دین فطرت ہے، اس کے لیے ضروری تھا کہ اس بگاڑ کو درست کرے۔

رضاعت کے رشتے نے معاشرہ کو عظیم فائدے پہنچائے

رضاعت کے تعلق کو اس کا صحیح مقام دینے سے معاشرت کو جو فوائد پہنچے ہیں ان کا صحیح اندازہ بھی عام طور پر نہیں کیا جاتا ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اس رشتے نے گڈریوں اور چرواہوں کی ماؤں بہنوں کو سرداروں بلکہ تاجداروں کی مائیں بہنیں بنا دیا۔ اس رشتے کی برکت سے دیہاتیوں اور شہریوں، غریبوں اور امیروں کے مابین ایسے روابط قائم ہو گئے جن کو کوئی چیز بھی توڑ نہیں سکتی تھی۔

معتبر رضاعت کے لیے ضروری شرط

لیکن یہ ضرور ہے کہ یہ تعلق مجرد کسی اتفاقی واقعے سے قائم نہیں ہو جاتا۔ قرآن نے یہاں جن لفظوں میں اس کو بیان کیا ہے اس سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ یہ اتفاقی طور پر نہیں بلکہ اہتمام کے ساتھ، ایک مقصد کی حیثیت سے عمل میں آیا ہو، تب اس کا اعتبار ہے۔ اول تو فرمایا ہے "تمھاری وہ مائیں

جنھوں نے تمھیں دودھ پلایا ہے " پھر اس کے لیے رضاعت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ وَاَخَوٰتُکُمْ مِّنَ الرَّضَاعَۃِ، عربی زبان کا علم رکھنے والے جانتے ہیں کہ ارضاع، باب افعال سے ہے جس میں فی الجملہ مبالغہ کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ اسی طرح رضاعت، کا لفظ بھی اس بات سے اِبا کرتا ہے کہ اگر کوئی عورت کسی روتے بچے کو بہلانے کے لیے اپنی چھاتی اس کے منہ سے لگا دے تو یہ رضاعت کہلائے۔

ربیبہ کس صورت میں حرام ہے

'ربیبہ' بیوی کی اس لڑکی کو کہتے ہیں جو اس کے سابق شوہر سے ہو۔ اس کو چونکہ خود اپنی لڑکی سے مشابہت حاصل ہوجاتی ہے اس وجہ سے اس کو بھی حرام قرار دیا ہے۔ ان لڑکیوں کی حرمت بیان کرتے ہوئے ان کو دو صفتوں کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ ایک یہ کہ وہ تمھارے آغوش تربیت میں پلی ہیں دوسری یہ کہ وہ تمھاری مدخولہ بیوی کے بطن سے ہیں۔ یہ دونوں صفتیں حرمت کے حکم کو مؤثر بنانے کے لیے مذکور ہوئی ہیں۔ عربی زبان میں ہر صفت کو لازماً قید و شرط کی حیثیت حاصل نہیں ہوجاتی کہ ان میں سے کوئی نہ پائی جائے تو وہ حکم کالعدم ہوجائے بلکہ اس کا انحصار قرینے پر ہوتا ہے۔ قرینہ بتاتا ہے کہ کون سی صفت قید اور شرط کا درجہ رکھتی ہے اور کون سی صفت محض تصویر حال کے لیے ہے۔ یہاں صرف قرینہ ہی نہیں بلکہ تصریح ہے کہ ربیبہ کی ماں اگر تمھاری مدخولہ نہ بنی ہو تو اس ربیبہ سے نکاح میں کوئی قباحت نہیں، اس سے یہ بات صاف ہوگئی کہ ربیبہ کی حرمت میں اصل مؤثر چیز اس کی ماں کا مدخولہ ہونا ہے۔ اگر وہ مدخولہ ہے تو اس کی لڑکی سے نکاح ناجائز ہوگا، قطع نظر اس سے کہ وہ آغوش تربیت میں پلی ہے یا نہیں۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اعلیٰ عربی بالخصوص قرآن حکیم میں اثبات کے بعد نفی کے اسلوب یا نفی کے بعد اثبات کے اسلوب میں جو باتیں بیان ہوتی ہیں وہ محض سخن گسترانہ نہیں ہوتیں بلکہ کسی خاص فائدے کے لیے ہوتی ہیں۔ ان سے مقصود اکثر صورتوں میں رفع ابہام ہوتا ہے۔ اس وجہ سے ان لوگوں کا خیال قرآن کے خلاف ہے جو ربیبہ کے ساتھ نکاح صرف اس صورت میں حرام سمجھتے ہیں جب وہ نکاح کرنے والے کے آغوش تربیت میں پلی ہو۔ بصورتِ دیگر وہ اس کے ساتھ نکاح کو جائز سمجھتے ہیں۔

جمع بین الاختین کی ممانعت کی علت

جمع بین الاختین کی ممانعت بھی اسی اصولِ حکمت پر مبنی ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے کہ قرآن حکیم انسانی فطرت کے اس تقاضے کو ابھارنا چاہتا ہے کہ جہاں رحمی رشتے کی قربت قریبہ موجود ہو وہاں باہمی ارتباط کی فطری بنیاد رافت و رحمت ہی ہونی چاہیے۔ یہ چیز مقتضی ہوئی کہ ان اسباب کو دبا دیا جائے جو رحمی رشتوں کے اندر رشک و رقابت کا زہر گھولنے والے ہوں۔ چونکہ دو بہنوں کے بیک وقت کسی کی قید نکاح میں ہونے کی صورت میں اس کا غالب امکان ہے کہ دو بہنیں، بہنیں ہوتے ہوئے بھی، سوکنوں کے جلاپے اور رشک و رقابت کے جذبات میں مبتلا ہوجائیں اس وجہ سے اس کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ چونکہ یہی صورت خالہ اور بھانجی، پھوپھی اور بھتیجی کے جمع کرنے کی شکل میں بھی موجود تھی اس وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جیساکہ حدیثوں سے واضح ہے، ان کے جمع

کرنے کی بھی ممانعت فرمادی۔

صلبی اور متبنّٰی بیٹوں کی بیویوں کے معاملے میں قرآن نے جو فرق کیا ہے اس پر تفصیلی بحث کے لیے موزوں مقام سورۂ احزاب میں آئے گا۔ یہاں صرف اتنی بات یاد رکھیے کہ بیٹوں کے ساتھ 'مِنْ اَصْلَابِكُمْ' کی قید نے متبنّٰی بیٹوں کی بیویوں کو اس حکم سے خارج کردیا۔

وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا (۲۴)

'احصان' کا مفہوم

احصان کے معنی کسی شے کو اپنی حفاظت و حمایت میں لینے کے بھی ہیں اور کسی کی حفاظت و حمایت میں ہونے کے بھی۔ اسی سے 'محصنٰت' کا لفظ ہے جو ان عورتوں کے لیے بولا جاتا ہے جو کسی کی قید نکاح میں ہوں۔ نیز یہ لونڈیوں کے مقابل لفظ کی حیثیت سے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس صورت میں اس کا اطلاق حرائر اور شریف زادیوں پر ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں یہ ان دونوں ہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اس آیت میں پہلے معنی میں، بعد والی آیت میں دوسرے مفہوم میں۔

'سفح' اور 'مسافحت' کا مفہوم

سفح کے لغوی معنی بہانے کے ہیں۔ اسی سے مسافحت ہے جس کے معنی عیاشی اور بدکاری کے ہیں اس لیے کہ اس میں بھی عورت اور مرد دونوں محض تلذذ کو مقصد قرار دے کر اپنا مادۂ منی برباد کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ سابق الذکر محرمات کی فہرست میں وہ عورتیں بھی شامل ہیں جو کسی کی قید نکاح میں ہوں اس لیے کہ کوئی عورت بیک وقت دو مردوں کی زوجیت میں نہیں ہو سکتی۔ صرف ملک یمین اس سے مستثنٰی ہے، اس کا کسی کی ملکیت میں آجانا ہی اس کے سابق نکاح کو، جو دارالحرب میں ہوا، کالعدم قرار دے دیتا ہے۔

نکاح کے لیے دو بنیادی شرطیں

ان عورتوں کے ماسوا عورتوں سے نکاح جائز ہے مگر اس کے ساتھ دو شرطیں ہیں اور یہ دونوں شرطیں بیک وقت مطلوب ہیں۔ ایک یہ کہ نکاح مال یعنی مہر کے ساتھ ہو۔ دوسری یہ کہ اس نکاح سے مقصود عورت کو اپنی حمایت و حفاظت میں لینا ہو نہ کہ وقتی طور پر شہوت رانی کرکے محض ہیجان نفس کو تسکین دے لینا۔

مہر کی شرط کا اصلی مقصد

مال اور مہر کی شرط لگانے سے ایک مقصد تو یہ ہے کہ عورتوں کے معاملے میں اکراہ یا توارث کے ان امکانات کا بالکل سدباب ہو جائے جن کی طرف اوپر اشارہ گزرا۔ ہرچند اس کا بہت کچھ سدباب رحمی رشتوں کو حرام قرار دینے سے بھی ہوگیا تھا لیکن اس شرط نے اس کو اور بھی مسدود کر دیا۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ نکاح کے معاملے کو ایک سنجیدہ معاہدے کی حیثیت حاصل ہو جائے، اس کو

لڑکوں کا کھیل نہ بنایا جا سکے۔ جس معاملے کے ساتھ ادائے مال کی شرط لگی ہو اور اس ادائے مال کی حیثیت محض ایک تبرع اور احسان کی نہ ہو بلکہ ایک فریضہ کی ہو، یہاں تک کہ اگر وہ مذکور نہ بھی ہو جب بھی لازماً مضمر سمجھا جائے اور عورت کی حیثیت عرفی کے اعتبار سے اس کی ادائیگی واجب قرار پائے، شرعاً و عرفاً ایک اہم اور سنجیدہ معاملہ بن جاتا ہے۔ کوئی بھی ذی ہوش آدمی ایسے معاہدے میں ایک پارٹی بننے کی جرأت نہ کرے گا جب تک وہ سو بار سوچ کر اس میں شرکت کی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لیے اپنے آپ کو تیار نہ کرے ـــــ ان مصالح سے مہر کی شرط ضروری ہوئی۔ جن لوگوں کی نظر ان مصالح کی طرف نہیں گئی وہ سمجھتے ہیں کہ اس شرط نے عورت کو ایک خریدنی و فروختنی شے کے درجے تک گرا دیا ہے۔ یہ خیال محض ناسمجھی کا نتیجہ ہے۔ یہ شرط تو ایک آگاہی ہے کہ جو بھی عورت کے حرم میں قدم رکھنا چاہے وہ اچھی طرح سوچ سمجھ کر قدم رکھے۔ نکاح و طلاق کے معاملے میں کسی مذاق کی گنجائش نہیں ہے، یہاں مذاق بھی حقیقت کی حیثیت رکھتا ہے۔ ؏

ہشدار کہ رہ بردم تیغ است قدم را

احصان کی شرط متعہ کی نفی ہے

'احصان' کی شرط اس لیے لگائی ہے کہ نکاح کو 'سفاح' سے ممیز کر دیا جائے۔ نکاح کا اصل مقصد اسی شکل میں پورا ہوتا ہے جب اس کے ساتھ 'احصان' پایا جائے۔ یعنی ایک مرد ایک عورت کو سنجیدہ ارادے اور زندگی بھر کے سنجوگ کے عزم کے ساتھ اپنی حفاظت و حمایت میں لے اور عورت اسی شعور و ارادے کے ساتھ اس کے حصن حمایت میں داخل ہو۔ اس احصان کے بغیر عورت اور مرد کے تعلق سے وہ مقصد پورا نہیں ہو سکتا جو قدرت نے اس سے پورا کرانا چاہا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی عورت سے ایک وقتی اور عارضی تعلق پیدا کرتا ہے تو گو اس کے لیے اس نے نکاح کی رسم بھی پوری کی ہو اور اس کو مال بھی دیا ہو لیکن یہ احصان نہیں ہوا۔ یہ محض پیشاب کرنے کے لیے ایک پیشاب خانہ تلاش کیا گیا ہے جس سے مقصود محض وقتی طور پر مثانے کے بوجھ کو ہلکا کر لینا ہے۔ قرآن نے یہ شرط لگا کر متعہ کے اس مکروہ رواج کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا جو جاہلیت میں رائج تھا۔

آگے فرمایا کہ مقرر شدہ مہر ایک فریضہ کی حیثیت سے ادا کیا جائے۔ البتہ مہر کے مقرر کرنے کے بعد میاں بیوی باہمی رضا مندی سے اگر اس میں کوئی کمی بیشی کر لیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ آخر میں علیم و حکیم کی صفات کا حوالہ اس قانون کی عظمت اور حکمت کے اظہار کے لیے ہے کہ جس نے یہ قانون اتارا ہے وہ علیم و حکیم ہے اس وجہ سے اس کی ہر بات بے خطا علم اور اتھاہ حکمت پر مبنی ہے۔ دوسروں کے لیے نہ یہ جائز ہے کہ اس کی خلاف ورزی کریں، نہ یہ جائز ہے کہ اس میں ترمیم و اصلاح کی کوشش کریں۔

وَمَنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ یَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَیٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِیْمَانِكُمْ ؕ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ

مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ۚ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ۚ وَاَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۲۵)

'طول' کے معنی قدرت، غنی اور فضل کے ہیں۔

'وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ' یعنی عزو شرف کی اصلی بنیاد ایمان پر ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک عورت لونڈی ہوتے ہوئے اپنے ایمان کے اعتبار سے بڑے بڑے شریف زادوں اور شریف زادیوں پر فوقیت حاصل کرے۔ اس وجہ سے مجرد اس خیال کی بنا پر کہ ایک عورت لونڈی ہے اس کے اندر شرف کے امکان کے اس پہلو کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ اور ایمان ایک ایسی چیز ہے جس کے ناپنے اور تولنے کا حقیقی پیمانہ اللہ ہی کے پاس ہے، دوسرے اس کا صحیح صحیح اندازہ نہیں کر سکتے۔

'بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ' میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ لونڈی اور غلام ہونا تو ایک حالت عارضی ہے۔ نسل کے اعتبار سے تو جتنے غلام اور آزاد اور جتنی بانویں اور باندیاں ہیں سب ایک ہی آدم اور ایک ہی حوا کی نسل سے ہیں۔

لفظ 'فاحشۃ' کی تنکیر

'فاحشۃ' سے مراد زنا ہے۔ اس کی تنکیر اظہار کراہت و نفرت کے لیے ہے جیسا کہ اسی سورہ کی آیت ۴۷ میں 'نطمس وجوھا' آیا ہے۔ وہاں ہم اس نکرہ کی وضاحت کریں گے۔ 'عنت' کے معنی زحمت و مشقت کے ہیں لیکن اس کا استعمال ایسی زحمتوں اور مشقتوں کے لیے ہوتا ہے جو آدمی کے لیے وجہ ابتلا اور مزلۂ قدم بن جائیں۔

دوسرے مالکوں کی لونڈیوں سے نکاح کی اجازت احتیاط کے ساتھ

آیت کا مدعا یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی شریف زادی سے نکاح کی قدرت نہیں رکھتا تو وہ کسی مسلمان لونڈی سے نکاح کر لے۔ عزت و شرافت کی اصل بنیاد ایمان ہے اور ایمان کا حال صرف اللہ کو معلوم ہے۔ جہاں تک جنس و نسل کا تعلق ہے، اس اعتبار سے سب ایک ہی ہیں اس لیے کہ سب ایک ہی آدم و حوا کی اولاد ہیں۔ پس لونڈی سے نکاح میں کوئی حرج نہیں ہے۔ البتہ یہ شرط ہے کہ یہ نکاح ان کے مالکوں کی اجازت سے ہو اور ان لونڈیوں کو دستور کے مطابق مہر دیا جائے۔ نیز یہ لونڈیاں بھی قید احصان کی پابند ہو کر رہیں محض وقتی تلذذ اور یاری آشنائی پیش نظر نہ ہو۔ اس قید احصان میں آجانے کے بعد اگر یہ زنا کی مرتکب ہوں تو سورۂ نور میں جو سزا شریف زادیوں کے لیے بیان ہوئی ہے یعنی سو کوڑے، اس کی نصف سزا ان کو بھی دی جائے گی۔

آخر میں فرمایا کہ لونڈیوں کے ساتھ نکاح کرنے کی یہ اجازت ان لوگوں کے لیے ہے جنھیں یہ اندیشہ ہو کہ اگر انھوں نے کہیں نکاح نہ کیا تو وہ مبتلائے معصیت ہو جائیں گے۔ جو لوگ اپنے آپ کو قابو میں رکھ سکتے ہوں ان کے لیے صبر ہی بہتر ہے۔

اسلامی معاشرہ میں لونڈیوں اور غلاموں کا درجہ

یہ خیال ہم اس سے پہلے کئی مقامات میں ظاہر کر چکے ہیں کہ غلام اور لونڈیاں اسلام کے اپنے نظام

معاشرت کا کوئی جزو نہیں ہیں بلکہ یہ چیز اس وقت کے بین الاقوامی حالات اور اسیران جنگ کے مسئلے کے ایک حل کی حیثیت سے پہلے سے موجود تھی جس کو اسلام نے گوارا کر لیا۔ اسلام اس کو اگر یک طرفہ طور پر اپنے ہاں ختم کر دیتا تو اس سے مسلمانوں کے معاشرے کے اندر بھی نہایت سخت قسم کی افراتفری پھیل جانے کا اندیشہ تھا اور دشمن قومیں بھی اس سے غلط قسم کا فائدہ اٹھا سکتی تھیں۔ اس کو مکمل طور پر ختم کر دینے کے لیے ضروری تھا کہ پہلے بین الاقوامی سطح پر لوگوں کے اندر انسانی مساوات کا شعور پیدا ہو۔ چنانچہ اسلام نے خود اپنے نظام میں ایسے قواعد و ضوابط رکھ دیے جن سے اس پست حال طبقہ سے متعلق لوگوں کے اندر انسانی مساوات کا شعور بھی بیدار ہو اور بالتدریج یہ ذہنی اور اخلاقی اعتبار سے اتنا بلند ہو جائے کہ اسلامی معاشرے میں اپنا صحیح مقام حاصل کرلے۔

غلاموں لونڈیوں کا درجہ اونچا کرنے کے بعض احکام

مکاتب اور ام الولد وغیرہ کے مسئلے پر ہم دوسرے مقام پر بحث کرتے ہوئے لکھ چکے ہیں کہ اس طرح اسلام نے تمام ذی صلاحیت غلاموں اور لونڈیوں کی آزادی کی ایک نہایت کشادہ راہ کھول دی تھی۔ اب اس آیت پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس میں اس پست حال طبقہ کے بلند کرنے کے لیے نہایت اہم حقائق کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

پہلی چیز تو یہ ہے کہ مسلمانوں کو یاد دلایا ہے کہ عزت و شرف کی بنیاد ایمان و اسلام پر ہے اور یہ چیز ایسی ہے کہ جس طرح ایک آزاد اس سے بہرہ ور ہو سکتا ہے اسی طرح ایک غلام بھی ہو سکتا ہے۔ رہا نسل و نسب کا معاملہ تو اس اعتبار سے آزاد و غلام بلکہ تمام انسان برابر ہیں۔ پھر یہ حقیر کیوں سمجھے جائیں؟

دوسری چیز یہ ہے کہ لونڈیوں کے لیے بھی مہر اور احصان کی وہی شرطیں مقرر ہوئیں جو آزاد عورتوں کے لیے تھیں تاکہ سوسائٹی کے اندر ان کا معیار اونچا ہو۔

ارتکاب زنا کی صورت میں ان کے لیے بھی سزا مقرر ہوئی تاکہ بالتدریج ان کا اخلاقی معیار سوسائٹی کے معیار پر آجائے۔ سزا میں ان کے لیے آزاد عورتوں کے بالمقابل جو رعایت رکھی گئی اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کو وہ تحفظ حاصل نہیں تھا جو قدرتی طور پر خاندانی عورتوں کو حاصل تھا۔

دوسرے مالکوں کی لونڈیوں کے ساتھ مسلمانوں کو نکاح کی اجازت دی گئی اور اس سے بھی مقصود لونڈیوں کے معاشرتی معیار کو اونچا کرنا تھا لیکن چونکہ اس صورت میں حقوق ملکیت اور حقوق نکاح میں تصادم کے اندیشے تھے اس وجہ سے اس طرح کے نکاح میں احتیاط کی تاکید فرمائی گئی۔

رجم کی سزا کا ماخذ

اس آیت کے تعلق سے ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ یہ آیت سورہ نور کی بیان کردہ حد زنا کو ہر قسم کے زانیوں کے لیے، شادی شدہ ہوں یا غیر شادی شدہ، عام کر دیتی ہے تو زنا کے لیے رجم کی سزا کا ماخذ کیا ہے؟ اس سوال پر ان شاء اللہ ہم سورۂ مائدہ اور سورۂ نور میں بحث کریں گے۔

۱۲۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۲۶-۲۸

معاشرتی اصلاح سے متعلق احکام و ہدایات کے بیچ میں یہ تین آیتیں بطور تنبیہ و تذکیر آگئی ہیں جن سے مقصود ایک طرف تو مسلمانوں کو ان احکام کی عظیم قدر و قیمت کی طرف توجہ دلانا ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ تمہاری طرف تمام انبیاء و صالحین کی وراثت منتقل کر رہا ہے تو اس کی سچے دل سے قدر کرو اور رحمت الٰہی کے مستحق بنو، دوسری طرف اس طوفان مخالفت سے آگاہ کرنا ہے جو ان اصلاحات کی مخالفت میں اس مفاد پرست طبقہ کی طرف سے اٹھ رہا تھا جو یتیموں، بیواؤں، کمزوروں اور غلاموں کے حقوق پر غاصبانہ تسلط جمائے بیٹھا تھا اور کسی طرح بھی اپنے اس تسلط سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات ۲۶-۲۸

يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَيَتُوبَ عَلَيْكُمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٢٦﴾ وَاللّٰهُ يُرِيدُ أَنْ يَتُوبَ عَلَيْكُمْ وَيُرِيدُ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الشَّهَوٰتِ أَنْ تَمِيلُوا مَيْلًا عَظِيمًا ﴿٢٧﴾ يُرِيدُ اللّٰهُ أَنْ يُخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ وَخُلِقَ الْإِنْسَانُ ضَعِيفًا ﴿٢٨﴾

ترجمۂ آیات ۲۶-۲۸

اللہ کا ارادہ یہ ہے کہ تم پر اپنی آیتیں واضح کردے اور تمہیں ان لوگوں کے طریقوں کی ہدایت بخشے جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں اور تم پر رحمت کی نگاہ کرے اور اللہ علیم و حکیم ہے۔ ۲۶

اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ تم پر رحمت کی نگاہ کرے اور وہ لوگ جو اپنی شہوات کی پیروی کر رہے ہیں یہ چاہتے ہیں کہ تم راہ حق سے بالکل ہی بھٹک کر رہ جاؤ۔ ۲۷

اللہ چاہتا ہے کہ تم پر سے بوجھ کو ہلکا کرے اور انسان کمزور بنایا گیا ہے۔ ۲۸

۱۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

لفظ ارادہ کے دو مفہوم

'یُرِیۡدُ اللّٰہُ لِیُبَیِّنَ لَکُمۡ' اور 'وَاللّٰہُ یُرِیۡدُ اَنۡ یَّتُوۡبَ عَلَیۡکُمۡ' کے اسلوب پر غور کیجیے تو دونوں میں ایک نمایاں فرق نظر آئے گا کہ ایک جگہ 'یُرِیۡدُ' کے بعد 'لِ' ہے اور دوسری جگہ 'اَنۡ' یہ فرق بے فائدہ نہیں ہے۔ قرآن مجید میں ان دونوں اسلوبوں کے تتبع سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ 'ارادہ' کا لفظ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک تو قطعی فیصلہ اور حتمی ارادہ کے معنی میں، دوسرے چاہنے کے معنی میں جب پہلے معنی مراد ہوتے ہیں تو اس کے بعد 'لِ' آتا ہے اور جب مجرد چاہنے کے معنی میں آتا ہے تو اس کے بعد 'اَنۡ' آتا ہے مثلاً۔

اِنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰہُ لِیُذۡہِبَ عَنۡکُمُ الرِّجۡسَ اَہۡلَ الۡبَیۡتِ۔ ۳۳۔ احزاب	اللہ کا ارادہ تو بس یہ ہے کہ اے اہل بیت نبی، کہ تم سے ناپاکی کو دور کرے۔
یُرِیۡدُ اللّٰہُ لِیُطَہِّرَکُمۡ وَلِیُتِمَّ نِعۡمَتَہٗ عَلَیۡکُمۡ۔ ۶۔ مائدہ	ارادہ الٰہی یہ ہے کہ تم کو پاک کرے اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دے۔
اِنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰہُ لِیُعَذِّبَہُمۡ بِہَا فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا۔ ۵۵۔ توبہ	اللہ تو بس یہ ارادہ کیے ہوئے ہے کہ اس کے ذریعے سے ان کو دنیا کی زندگی میں عذاب دے۔

اس اسلوب کی وضاحت کے بعد زیر بحث آیات کے مطلب پر غور فرمائیے۔ پہلے یہ واضح فرمایا کہ اللہ نے اپنے علم و حکمت سے تمھیں اس مقصد کے لیے منتخب فرمایا ہے کہ تمھارے لیے اپنی آیتیں اور اپنے احکام و ہدایات واضح فرمائے اور انبیاء و صالحین کے ذریعے سے ایمان و عمل صالح کی جو راہیں دنیا کے لیے کھولی گئی تھیں اور جو اب گم کر دی گئی تھیں ان کی تمھیں از سر نو ہدایت بخشے تاکہ تم اللہ کی طرف رجوع کرو اور اللہ تم پر رحمت کی نظر فرمائے۔ اس بات کو ایک فیصلہ الٰہی کی حیثیت سے ظاہر فرمایا ہے اس لیے کہ آخری بعثت کے ذریعہ سے ایک ایسی امت کا برپا کرنا جو پورے دین و شریعت کی حامل اور تمام اولین و آخرین کی وارث ہو پہلے سے اللہ تعالیٰ کی سکیم میں طے تھا اور سابق انبیاء نے اس کی خبر بھی دے دی تھی اور اس کا برپا ہونا خدا کے علم و حکمت کا مقتضیٰ بھی تھا اس لیے کہ وہ علیم و حکیم اس بات کو پسند نہیں کر سکتا تھا کہ وہ اپنی پیدا کی ہوئی مخلوق کو یوں ہی گمراہی میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دے، اس کی ہدایت کے لیے کوئی انتظام نہ فرمائے۔

اس بات کو ایک حتمی فیصلہ کی حیثیت سے ظاہر کرنے کا مقصد ایک تو مسلمانوں کی حوصلہ افزائی ہے، دوسرے اسلام کے ان معاندین و مخالفین کی ہمت شکنی جو ان معاشرتی اصلاحات کی وجہ سے، جو اس سورہ میں مذکور ہوئی ہیں، جھاڑ کے کانٹے کی طرح مسلمانوں کے پیچھے پڑ گئے تھے۔ معاشرتی اصلاحات کو عام طور پر

مفاد پرست طبقہ ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کرتا۔ اس وجہ سے یہود و نصاریٰ، مشرکین سب میں ان اصلاحات سے ایک آگ سی لگ گئی جنھوں نے بھی دیکھا کہ ان کی زد ان کی بے لگام آزادیوں اور بے قید شہوت پرستیوں پر پڑ رہی ہے وہ اس ارادے کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے کہ ان تمام اصلاحات کو ناکام کر کے خلق خدا کو پھر اسی تاریکی کے گڑھے میں دھکیل دیں جس سے نجات دینے کے لیے اسلام نے یہ روشنی دکھائی تھی۔ اسی طرح جن لوگوں نے اپنے اوپر اپنی خود ساختہ شریعتوں اور خانہ ساز رسموں اور رواجوں کے بوجھ لاد رکھے تھے انھوں نے جب دیکھا کہ یہ بوجھ لوگوں کے سر سے اُتر رہا ہے اور اصر و اغلال کی غیر فطری بیڑیاں کٹ رہی ہیں تو چیخنے لگے کہ اسلاف کا سارا سرمایہ معرضِ خطر میں ہے۔ قرآن نے ان سب کے جواب میں مسلمانوں کو بتایا کہ تم ان مخالفوں کی ہفوات کی پروا نہ کرو۔ انبیائے سابقین اور اسلاف صالحین کی اصلی وراثت یہی ہے جو تمھاری طرف منتقل ہو رہی ہے۔ خدا نے تمھیں رحمت سے نوازنا چاہا ہے لیکن یہ اشرار و مفسدین یہ چاہتے ہیں کہ تمھیں اس رحمت سے محروم کر دیں۔ آخری آیت میں یہ اشارہ بھی فرما دیا کہ ان اصلاحات سے جو بیڑیاں کاٹی جا رہی ہیں وہ اس لیے کاٹی جا رہی ہیں کہ یہ غیر فطری اور خود ساختہ تھیں۔ قدرت نے انسان کو جس فطرت سلیم پر پیدا کیا ہے وہ فطرت ان غیر فطری بوجھوں کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ آگے اسی سورہ میں آیت ۴۳ سے ان تمام مخالفتوں کی تفصیل آ رہی ہے۔

۱۴۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۲۹-۳۳

اس ضمنی تذکیر و تنبیہ کے بعد اصلاح معاشرہ ہی سے متعلق احکام و ہدایات کا مضمون پھر شروع ہو گیا اور چند ایسی ہدایات دی گئی ہیں جن سے پچھلی اصلاحات کی تائید و توثیق بھی ہو رہی ہے اور ان اصلاحات کا دائرہ وسیع بھی ہو رہا ہے۔ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۹-۳۳

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۣ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ﴿۲۹﴾ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿۳۰﴾ اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَاۗىِٕرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا ﴿۳۱﴾ وَلَا تَتَمَنَّوْا

مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ وَسْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿۳۲﴾ وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ؕ وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ﴿۳۳﴾ ع

ترجمۂ آیات ۲۹-۳۳

اے ایمان والو، اپنے مال آپس میں باطل ذریعے سے نہ کھاؤ مگر یہ کہ کوئی مال باہمی رضامندانہ تجارت کی راہ سے حاصل ہو جائے اور ایک دوسرے کو قتل نہ کرو، اللہ تم پر بڑا مہربان ہے اور جو لوگ تعدی اور ظلم کی راہ سے ایسا کریں گے ہم ان کو جلد ایک سخت آگ میں جھونک دیں گے اور یہ اللہ کے لیے بہت ہی آسان ہے۔ تم جن باتوں سے روکے جا رہے ہو اگر ان کے بڑے گناہوں سے تم بچتے رہے تو ہم تم سے تمھاری چھوٹی برائیاں جھاڑ دیں گے اور تمھیں ایک عزت کے مقام میں داخل کریں گے۔ ۲۹-۳۱

جس چیز میں اللہ نے ایک کو دوسرے پر ترجیح دی ہے اس کی تمنا نہ کرو۔ مردوں کو حصہ ملے گا اس میں سے جو انھوں نے کمایا اور عورتوں کو حصہ ملے گا اس میں سے جو انھوں نے کمایا اور اللہ سے اس کے فضل میں سے حصہ مانگو۔ بے شک اللہ ہر چیز سے باخبر ہے اور ہم نے والدین اور قرابت مندوں کے چھوڑے ہوئے میں سے ہر ایک کے لیے وارث ٹھہرا دیے ہیں اور جن سے تم نے کوئی پیمان باندھ رکھا ہو تو ان

کو ان کا حصہ دو۔ بے شک اللہ ہر چیز سے آگاہ ہے۔ ۳۱-۳۳

۱۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَأْكُلُوٓا۟ أَمْوَٰلَكُم بَيْنَكُم بِٱلْبَٰطِلِ إِلَّآ أَن تَكُونَ تِجَٰرَةً عَن تَرَاضٍ مِّنكُمْ ۚ وَلَا تَقْتُلُوٓا۟ أَنفُسَكُمْ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا۔ (۲۹)

حرمت مال اور حرمت جان میں نہایت گہرا رشتہ ہے

اس آیت میں باطل طریقے سے ایک دوسرے کا مال کھانے اور قتل نفس کو حرام ٹھہرایا ہے اور ان دونوں حرمتوں کو ایک ساتھ جمع کر دیا ہے۔ ان کو ایک ساتھ جمع کرنے کی حکمت یہ ہے کہ ان دونوں میں بڑا گہرا رشتہ ہے۔ مال کی حرص اس کے حصول کے جائز و ناجائز طریقوں کی تمیز اٹھا دیتی ہے اور پھر یہ بیماری لوگوں کو اس طرح اندھا کر دیتی ہے کہ اس کے لیے قتل و خون تک نوبت آ جاتی ہے۔ سماجی فسادات اور خون ریزیوں کے اسباب کا سراغ لگایا جائے تو معلوم ہوگا کہ حرص مال کو ان میں سب سے زیادہ دخل ہے۔ اسلام نے ان دونوں چیزوں کے اس گہرے باہمی رشتے کی وجہ سے ایک دوسرے کے مال اور ایک دوسرے کی جان دونوں چیزوں کی حرمت کی یکساں تاکید فرمائی ہے حرمة ماله کحرمة دمه (مومن کا مال بھی اسی طرح محترم ہے جس طرح اس کی جان محترم ہے)۔

کسی معاملت کے لیے فریقین کی حقیقی رضامندی شرط ہے

باطل طریقہ سے مراد لین دین، کاروبار اور تجارت کے وہ طریقے ہیں جن میں معاملت کے دونوں فریقوں کی حقیقی رضامندی یکساں طور پر نہیں پائی جاتی بلکہ اس میں ایک کا مفاد محفوظ ہوتا ہے، دوسرا ضرر یا غرر کا ہدف بنتا ہے۔ قرآن نے اس مفہوم کی طرف خود اشارہ فرما دیا ہے۔ چنانچہ باطل طریقے سے ایک دوسرے کا مال کھانے کی نہی کے بعد یہ جو فرمایا ہے کہ 'اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ' یہ مثبت پہلو سے اسی اجمال کی وضاحت ہے جو پہلے ٹکڑے میں پایا جاتا ہے۔ اس ٹکڑے نے واضح کر دیا کہ معاملت اور لین دین کی بنیاد جب حقیقی باہمی رضامندی پر ہو تب ہی اس سے جو نافع ہوتا ہے وہ جائز ہوتا ہے اور اگر اس میں کوئی دھوکا پایا جاتا ہے یا اس میں ایک فریق کی بے بسی اور مجبوری کو دخل ہے تو اگرچہ وہ بظاہر اس پر راضی بھی ہو لیکن یہ 'اکل اموال بالباطل' کے حکم میں داخل ہے۔ اسی بنا پر معاملت اور تجارت کی وہ تمام شکلیں اسلام میں ناجائز قرار پائیں جن میں ضرر یا غرر کا شائبہ ہے۔ ربا اس کاروبار کی ایک قبیح ترین شکل ہے۔ بقرہ کی تفسیر میں ربا اور تجارت کے فرق پر ہم جو بحث لکھ آئے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

'لا تقتلوا انفسکم' کا مفہوم

'وَلَا تَقْتُلُوٓا اَنْفُسَكُمْ' بالکل 'لَا تَاْكُلُوٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ' کا ہم وزن ٹکڑا ہے یعنی نہ آپس میں ایک دوسرے کا مال ہڑپ کرو نہ ایک دوسرے کو قتل کرو۔ اس کے معنی خودکشی کے لینے کا نہ

کوئی موقع ومحل بیان ہے نہ ان الفاظ میں اس مفہوم کی کوئی گنجائش ہے۔ اگر خودکشی کے مفہوم کو ادا کرنا چاہیں گے تو اس کے لیے اسلوب بالکل مختلف ہو گا۔ 'اَنْفُسَكُمْ' کا لفظ اس حقیقت کے اظہار کے لیے ہے کہ جو شخص معاشرہ کے اندر کسی قتل کا مرتکب ہوتا ہے وہ اپنوں ہی کے قتل کا مرتکب ہوتا ہے اس لیے کہ معاشرہ کے تمام افراد اپنے ہی بھائی بند ہیں 'اَلْمُسْلِمُ اَخُوالْمُسْلِمِ اور اَلْمُسْلِمُوْنَ كُلُّهُمْ اِخْوَةٌ' کے اصول پر ایک کا قاتل سب کا قاتل ہے۔ اسی وجہ سے قرآن نے ایک کے قاتل کو سب کا قاتل قرار دیا ہے۔

خدا کی صفتِ رحمت کے تقاضے

'اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا' درحقیقت علت بیان ہوئی ہے ان ممانعتوں کی جن کا ذکر اوپر ہوا۔ یعنی جب تمہارا رب تمہارے اوپر مہربان اور رحیم ہے تو وہ کس طرح یہ پسند کر سکتا ہے کہ تم ایک دوسرے کے مال ہڑپ کرو اور ایک دوسرے کو قتل کرو۔ رؤف و رحیم رب تو یہی چاہے گا کہ تم آپس میں 'رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ' بن کر رہو۔ پھر یہیں سے یہ بات بھی نکلی کہ اگر اس کے برخلاف لوگ آپس میں ظلم و عدوان کے مرتکب ہوں تو یہ عین اس کی رافت و رحمت ہی کا تقاضا ہے کہ وہ عدل و انصاف کا ایک ایسا دن لائے جس میں ان لوگوں کو کیفر کردار کو پہنچائے جو اس کے مرتکب ہوئے ہوں۔ چنانچہ آگے والی آیت اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا ۭوَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا - ۳۰

'ذٰلِكَ' کا اشارہ ان دونوں ہی چیزوں کی طرف ہے جن کا ذکر اوپر والی آیت میں ہوا ہے۔

'عدوان' اور 'ظلم' کا خاص مفہوم

'عدوان' اور 'ظلم' کے الفاظ جب ایک ساتھ آئیں تو جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں لکھ چکے ہیں، یہ گناہ کی دو الگ الگ صورتوں پر دلالت کرتے ہیں۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ کوئی شخص زور و زبردستی سے دوسرے کے جان یا مال پر دست درازی کرے، دوسری شکل یہ ہے کہ کوئی شخص دھاندلی سے کسی کا حق واجب ادا نہ کرے بلکہ اس کو دبا بیٹھے۔ پہلی صورت عدوان کی ہے دوسری ظلم کی۔ اگر یہ الگ الگ آئیں تو ایک دوسرے کے مضمون پر حاوی ہو جاتے ہیں۔

'نَارًا' کا لفظ نکرہ تفخیم کے لیے استعمال ہوا ہے یعنی ایسے لوگوں کو ایک سخت بھڑکتی ہوئی آگ میں ہم ڈالیں گے۔

ایک لطیف نکتہ

'وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا' (یہ اللہ کے لیے بہت آسان ہے) ایک مخفی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ وہ یہ کہ جو لوگ خدا کو مانتے ہیں لیکن خدا کی صفات عدل و رحم کا صحیح تصور نہیں رکھتے وہ اپنے آپ کو الاؤنس دینے میں بڑے فیاض ہوتے ہیں۔ وہ بڑے بڑے جرائم کرتے چلے جاتے ہیں لیکن یہود کی طرح توقع یہی رکھتے ہیں کہ خدا ان پر بڑا مہربان ہے اس لیے سب بخش دے گا۔ قرآن نے یہود کا قول 'سَيُغْفَرُ لَنَا' جو نقل کیا ہے وہ اسی ذہنیت کی غمازی کر رہا ہے۔ درحقیقت اس قماش کے لوگ شہ تو حاصل

کرتے ہیں اس ڈھیل اور مہلت سے جو ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ اپنی سنت کے مطابق عطا فرماتا ہے لیکن ان کی حیلہ جو طبیعت آڑ ڈھونڈتی ہے خدا کی رحمت کی۔ حالانکہ خدا رحیم ہے تو آخر وہ ظالموں پر کیوں رحم فرمائے گا۔ اس کی رحمت کے اصلی مستحق تو وہ مظلوم ہیں جو ان کے ہاتھوں زندگی بھر ستائے گئے اور آہ بھی نہ کر سکے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسی ہی ذہنیت رکھنے والوں کو خطاب کر کے فرمایا ہے کہ جو لوگ ظلم و عدوان کی زندگی بسر کر رہے ہیں ان کو جہنم میں جھونک دینا خدائے رحیم پر ذرا بھی شاق نہیں گزرے گا اس لیے کہ وہ جس طرح رحیم ہے اسی طرح عادل بھی ہے اور یہ عدل بھی اس کی رحمت ہی کا تقاضا ہے۔

اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا - ۳۱

'کبائر' اور 'صغائر' سے مراد

'سیّات' کا لفظ چونکہ یہاں کبائر کے مقابل میں آیا ہے اس وجہ سے اس سے مراد صغائر یعنی چھوٹے گناہ ہیں۔ جس طرح نیکیاں، جن کا حکم دیا گیا ہے، بڑی بھی ہیں اور چھوٹی بھی، اسی طرح بدیاں، جن سے روکا گیا ہے، چھوٹی بھی ہیں بڑی بھی۔ یہ چھوٹا اور بڑا ہونا اگرچہ حالات اور نسبتوں کے بدلنے سے تبدیل بھی ہوتا رہتا ہے اس وجہ سے ان کی منطقی حدبندی ذرا مشکل ہے تاہم یہ ایسی چیز نہیں جس کا سمجھنا دشوار ہو۔ جس طرح ہجرت اور جہاد بھی نیکی ہے اور راستے سے کسی تکلیف دہ چیز کو دور کر دینا بھی نیکی ہے لیکن دونوں میں بڑا فرق ہے اور اس فرق کو ہر شخص سمجھتا ہے، اسی طرح کسی کا گھر لوٹ لینا بھی برائی ہے اور راستے میں کوئی گندی چیز پھینک دینا اور کسی غلط جگہ تھوک دینا بھی برائی ہے لیکن دونوں برائیوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے اور اس فرق کو بھی ہر شخص سمجھتا ہے۔ درحقیقت نیکیوں اور بدیوں دونوں کی بڑائی چھٹائی کے ناپنے کے لیے پیمانہ ان کے اثرات و نتائج ہیں۔ اگر ہماری نگاہ دور رس ہو اور ہم خواہشات نفس کی جانبداری سے بالاتر ہو کر حقائق پر غور کریں تو اس کے سمجھنے میں کوئی التباس پیش نہیں آسکتا۔ لیکن بسا اوقات ہوتا یہ ہے کہ عقل پر خواہشاتِ نفس کا ایسا غلبہ ہو جاتا ہے کہ پربت رائی بن جاتا ہے اور رائی پربت۔ شریعت نے اس التباس سے بچنے کے لیے حرام بھی واضح کر دیئے اور حلال بھی۔ لیکن ان کے درمیان کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں جن کے بارے میں التباس پیش آسکتا ہے۔ ایسی چیزوں کے باب میں تقویٰ کا تقاضا تو یہی ہے کہ آدمی احتیاط کے پہلو کو اختیار کرے لیکن اگر بشری کمزوری سے کوئی غلطی صادر ہو گئی تو حدودِ حرام و حلال کے ملحوظ رکھنے والے کے دل پر اللہ تعالیٰ اس کا میل جمنے نہیں دیتا۔

جنت کی راہ

اس آیت میں یہ حقیقت واضح فرمائی ہے کہ خدائی گرفت سے بچنے اور اس کی جنت میں داخل ہونے کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ اپنے آپ کو بڑی فراخ دلی سے الاؤنس دیتے چلو بلکہ اس کا راستہ یہ ہے کہ جن چیزوں سے اس نے روکا ہے ان کے کبائر سے پرہیز رکھو۔ اگر کبائر سے پرہیز رکھو گے تو صغائر کو وہ اپنے

فضل و رحمت سے خود دور فرما دے گا ورنہ کبائر و صغائر سب تمہارے اعمال نامے میں درج ہوں گے اور سب کا تمہیں حساب دینا ہوگا۔

صغائر سے بچنے کی راہ بھی کبائر سے اجتناب ہے

یہاں یہ حقیقت بھی یاد رکھنی چاہیے کہ صغائر سے بچنے کی راہ بھی یہی ہے کہ آدمی کبائر سے اجتناب کرے۔ جو آدمی اپنے ہزاروں کے قرضے چکاتا رہتا ہے وہ اس بات پر کبھی راضی نہیں ہوتا کہ کسی کے پانچ روپے دبا کر نادہند کہلانے کی ذلت گوارا کرے۔ برعکس اس کے جو لوگ کبائر کے مرتکب ہوتے ہیں لیکن چھوٹی چھوٹی نیکیوں کا بڑا اہتمام کرتے ہیں ان کا حال زندگی بھر یہ رہتا ہے کہ مچھر کو چھانتے رہتے ہیں اور اونٹ کو نگلتے رہتے ہیں۔ دوسروں کو تو یہ زیرے اور سونف تک کی زکوٰۃ کا حساب سمجھاتے ہیں لیکن خود یتیموں کے مال اور اوقاف کی آمدنیوں سے اپنی کوٹھیاں بنواتے اور ان کو سجاتے ہیں۔

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۭ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ۭ وَلِلنِّسَاۗءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ۭ وَاسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِــيْمًا - ۳۲

تنافس کا اصلی میدان اکتسابی صفات کا میدان ہے

معاشرے میں بے شمار کشمکشیں اس وجہ سے پیدا ہوتی ہیں کہ لوگ اس بات سے واقف نہیں ہوتے کہ کون سا میدان قسمت آزمائی اور جد و جہد کا ہے اور کون سا نہیں ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غلط ارمان اور ایک اندھا بہرا حوصلہ لوگوں کو ایسے میدانوں میں ڈال دیتا ہے جن میں آدمی کی ساری جد و جہد اور اس کی تمام قابلیت و صلاحیت ایک لاحاصل تصادم اور بے فائدہ تنازع کی نذر ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بعض لوگوں کو ان کی خلقی صفات کے لحاظ سے بعض لوگوں پر ترجیح دی ہے۔ مثلاً بعض کو خوب صورت پیدا کیا، بعض کو بد صورت، بعض کو سلیم الاعضا پیدا کیا بعض کو ناقص الاعضا، بعض کو امیر گھرانوں میں پیدا کیا بعض کو غریب گھرانوں میں۔ ظاہر ہے کہ یہ چیزیں خلقی ہیں۔ ان میں مقابلے اور تنافس کی لاگ ڈانٹ تلخی اور ناگواری کے سوا اور کچھ نہیں دے سکتی۔ اسی طرح کسی کو مرد بنایا، کسی کو عورت، یہ چیز بھی خلقی ہے۔ اگر عورت مرد بننے کی کوشش کرے یا مرد، عورت، تو یہ بھی نری حماقت ہے۔ علیٰ ہذا القیاس خدا نے اپنے قانون میں ہر ایک کے لیے حدود و حقوق معین کر دیے ہیں۔ یہ حقوق و حدود فطرت اور حکمت پر مبنی ہیں۔ اگر مساوات طلبی کے غلط جوش میں ان حقوق اور حدود کو لانگنے کی کوشش کی جائے، عورت چاہے کہ مجھے مرد کے برابر حصہ ملے، اقربا چاہیں کہ سب کا ایک ہی درجہ قرار پائے تو یہ بھی فطرت اور خدا کی حکمت سے جنگ ہے جس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں نکل سکتا کہ سارا نظام تلپٹ ہو کر رہ جائے۔

آج دنیا میں جو ابتری و انتشار، جو تصادم و تنافس اور جو قتل و نہب ہے زیادہ تر اسی غلط اندیشی اور حدنا شناسی کا نتیجہ ہے۔ قرآن نے اس آیت میں یہی بتایا ہے کہ تنافس کا میدان خلقی صفات یا فطری ترجیحات کا نہیں بلکہ اکتسابی صفات کا میدان ہے۔ یہ میدان نیکی، تقویٰ، عبادت، ریاضت، توبہ،

انابت یا جامع الفاظ میں ایمان و عمل صالح کا میدان ہے اس میں بڑھنے کے لیے کسی پر کوئی روک نہیں ہے۔ مرد بڑھے وہ اپنی جدوجہد کا پورا پورا ثمرہ پائے گا۔ عورت بڑھے وہ اپنی سعی کا پھل پائے گی۔ آزاد، غلام، بانو، باندی، شریف، وضیع، اعمٰی، بصیر سب کے لیے یہ میدان یکساں کھلا ہوا ہے۔ اگر کسی میں کچھ فطری اور خلقی رکاوٹیں ہیں تو اس کے کسر کا جبر بھی یہاں موجود ہے۔ خدا نے خلقی طور پر جو فضیلتیں بانٹی ہیں ان سے ہزارہا اور لکھو کھا درجے زیادہ اس کا فضل یہاں ہے تو جو فضیلت کے طالب ہیں وہ اس میدان میں اتریں اور خدا کے فضل کے طالب بنیں (وَاسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ) دینے والا سب کی طلب، سب کے ذوق و شوق اور سب کی نیت اور سب کے اخلاص سے واقف ہے اور اس کے خزانے میں نہ کمی ہے، نہ وہ دینے میں بخیل ہے تو غلط میدان میں اپنی محنت برباد کرنے سے کیا حاصل ہے جس کو قسمت آزمائی کرنی ہو اس میدان میں کرے۔ وَفِیْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ۔

وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا (۳۳)

لفظ 'مولیٰ' کا مفہوم

لفظ 'مولیٰ' عربی میں بہت وسیع معنوں میں آتا ہے۔ زیادہ تر اس کا تعین موقع و محل اور قرینے سے ہوتا ہے۔ یہاں قرینہ دلیل ہے کہ اس سے مراد ہر مورث کے ورثہ ہیں۔

خدا کے مقرر کردہ وارث ہی اصلی وارث ہیں

اس آیت میں اشارہ تقسیم وراثت کے اس ضابطے کی طرف ہے جو آیت ۷ میں مذکور ہے۔ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ الایۃ اس حوالے سے مقصود اس کو مزید مؤکد کرنا ہے کہ ہر مورث کے جو وارث خدا نے ٹھہرا دیے ہیں وہی اصلی وارث ہیں۔ اب ان میں اپنے ذاتی رجحانات کی بنا پر نہ کسی ترمیم و تبدیلی کی گنجائش ہے اور نہ ان کے مقررہ حصوں میں کسی کمی بیشی کی۔ اگر کسی نے کسی غیر وارث سے کچھ دینے دلانے کا وعدہ کر رکھا ہے تو اس کو وہ حصہ دے جو اس کا ہے۔ 'اس کا حصہ' سے مراد ظاہر ہے کہ وہی حصہ ہو سکتا ہے جس کی مورث کو وصیت کی اجازت ملی ہوئی ہے اور جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی تقسیم سے علیحدہ کر رکھا ہے۔ یہ حصہ درحقیقت ایسے ہی لوگوں کے لیے خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے چھوڑا گیا ہے۔ اس وجہ سے اس کے لیے 'نَصِيْبَهُمْ' کا لفظ استعمال ہوا۔ آخر میں اپنی صفت 'عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا' کا حوالہ بطور تنبیہ دیا ہے کہ بے جا جانبداری کی مخفی سے مخفی کوشش بھی اللہ کے علم سے مخفی نہیں رہ سکتی۔ وہ ہر جگہ حاضر و ناظر اور ہر جلی و خفی سے آگاہ ہے۔

۱۶۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۳۴-۳۵

خاندان کی تنظیم کے لیے ہدایات

اوپر 'وَلَا تَتَمَنَّوْا' الایۃ، میں عورت اور مرد دونوں کو اپنے اپنے فطری اور شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے حصول سعادت و کمال کی جدوجہد کی جو ہدایت فرمائی تھی اسی ہدایت کو خاندانی زندگی کی

تشکیل و تنظیم کے لیے رہنما اصول تھا۔ اب یہ خاندان کی تنظیم کے لیے ہدایات دی جا رہی ہیں۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ معاشرہ خاندانوں سے مرکب ہوتا ہے اور معاشرے ہی سے ریاست وجود میں آتی ہے۔ گویا خاندان ہی وہ چیز ہے جو معاشرہ اور پھر ریاست کی بنیادی اینٹ ہے۔ اس وجہ سے نہایت ضروری ہے کہ یہ پہلی اینٹ نہایت صحیح رکھی جائے۔ اگر یہ ذرا بھی کج ہوگئی تو۔ ع تا ثریا مے رود دیوار کج۔ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت کیجیے۔

آیات ۳۴-۳۵

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا ﴿۳۴﴾ وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا ﴿۳۵﴾

ترجمۂ آیات ۳۴-۳۵

مرد عورتوں کے سرپرست ہیں، بوجہ اس کے کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت بخشی ہے اور بوجہ اس کے کہ انھوں نے اپنے مال خرچ کیے۔ پس جو نیک بیبیاں ہیں وہ فرمانبرداری کرنے والی، رازوں کی حفاظت کرنے والی ہوتی ہیں بوجہ اس کے کہ خدا نے بھی رازوں کی حفاظت فرمائی ہے اور جن سے تمھیں سرتابی کا اندیشہ ہو تو ان کو نصیحت کرو اور ان کو ان کے بستروں میں تنہا چھوڑ دو اور ان کو سزا دو۔ پس اگر وہ تمھاری اطاعت کریں تو ان کے خلاف راہ نہ ڈھونڈو۔ بے شک اللہ بہت بلند اور بہت بڑا ہے۔ ۳۴

اور اگر تمہیں میاں بیوی کے درمیان افتراق کا اندیشہ ہو تو ایک پنچ مرد کے لوگوں میں سے مقرر کرو اور ایک پنچ عورت کے لوگوں میں سے۔ اگر دونوں اصلاح کے طالب ہوئے تو اللہ ان کے درمیان سازگاری پیدا کر دے گا۔ بے شک اللہ علیم و خبیر ہے۔ ۳۵

۱۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ۭ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ۭ وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا (۳۴)

'قائم علیٰ' کا مفہوم

عربی میں قائم کے بعد علیٰ آتا ہے تو اس کے اندر نگرانی، محافظت، کفالت اور تولیت کا مضمون پیدا ہو جاتا ہے۔ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ میں بالاتری کا مفہوم بھی ہے اور کفالت و تولیت کا بھی اور یہ دونوں باتیں کچھ لازم و ملزوم سی ہیں۔

گھر کی ریاست کا سربراہ مرد ہے

گھر کی چھوٹی سی وحدت بھی، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، ایک چھوٹی سی ریاست ہے۔ جس طرح ہر ریاست اپنے قیام و بقا کے لیے ایک سربراہ کی محتاج ہوتی ہے اسی طرح یہ ریاست بھی ایک سربراہ کی محتاج ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ اس ریاست میں سربراہی کا مقام مرد کو حاصل ہو یا عورت کو؟ قرآن نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ مقام مرد کو حاصل ہے اور اس کے حق میں دو دلیلیں دی ہیں۔

مرد کی سربراہی کے حق میں دو دلیلیں

ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے مرد کو عورت پر فضیلت بخشی ہے۔ مرد کو بعض صفات میں عورت پر نمایاں تفوق حاصل ہے جن کی بنا پر وہی سزاوار ہے کہ قوامیت کی ذمہ داری اسی پر ڈالی جائے۔ مثلاً محافظت و مدافعت کی جو قوت و صلاحیت یا کمانے اور ہاتھ پاؤں مارنے کی جو استعداد و ہمت اس کے اندر ہے، وہ عورت کے اندر نہیں ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ یہاں زیر بحث کلی فضیلت نہیں ہے بلکہ صرف وہ فضیلت ہے جو مرد کی قوامیت کے استحقاق کو ثابت کرتی ہے۔ بعض دوسرے پہلو عورت کی فضیلت کے بھی ہیں لیکن ان کو قوامیت سے تعلق نہیں ہے۔ مثلاً عورت گھر در سنبھالنے اور بچوں کی پرورش و نگہداشت کی جو صلاحیت رکھتی ہے وہ مرد نہیں رکھتا۔ اسی وجہ سے قرآن نے یہاں بات ابہام کے انداز میں فرمائی ہے جس سے مرد اور عورت دونوں کا کسی نہ کسی پہلو سے صاحب فضیلت ہونا نکلتا ہے۔ لیکن قوامیت کے

پہلو سے مرد ہی کی فضیلت کا پہلو راجح ہے۔

دوسری یہ کہ مرد نے عورت پر اپنا مال خرچ کیا ہے۔ یعنی بیوی بچوں کی معاشی اور کفالتی ذمہ داری تمام اپنے سر اٹھائی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ذمہ داری مرد نے اتفاقیہ یا تبرعاً نہیں اٹھائی ہے بلکہ اس وجہ سے اٹھائی ہے کہ یہ ذمہ داری اسی کے اٹھانے کی ہے۔ وہی اس کی صلاحیتیں رکھتا ہے اور وہی اس کا حق ادا کر سکتا ہے۔

نیک بیبیاں وہ ہیں جو قوام کی اطاعت گزار اور رازدار ہیں۔

مرد کو قوامیت کے منصب پر سرفراز کرنے کے بعد نیک بیبیوں کا رویہ بتایا کہ وہ نہایت فرمانبرداری کے ساتھ اپنے قوام کی اطاعت کرتی، اس کے رازوں اور اس کی عزت و ناموس کی حفاظت کرتی ہیں۔ اس سے یہ بات آپ سے آپ نکلی کہ جو عورتیں، اس کے بالکل برعکس آج اس بات کے لیے زور لگا رہی ہیں کہ وہ عورت بن کر نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں مرد بن کر رہیں گی وہ صالحات نہیں بلکہ فاسقات ہیں اور انھوں نے اس نظام کو بالکل تلپٹ کر دینا چاہا ہے جس پر عائلی زندگی کی تمام برکتوں اور خوشحالیوں کا انحصار ہے [۱]

حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ کا مطلب

'حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ' کا مطلب میں نے یہ لیا ہے کہ وہ رازوں کی حفاظت کرنے والی ہیں۔ یہ معنی لینے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ 'غیب' کا لفظ راز کے مفہوم کے لیے مشہور ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہاں ترکیب کلام ایسی ہے کہ 'پیٹھ پیچھے' کے معنی لینے کی گنجائش نہیں، تیسری یہ کہ عورت اور مرد کے درمیان رازوں کی امانت داری کا مسئلہ سب سے زیادہ اہمیت رکھنے والا مسئلہ ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے قدرتی امین ہیں، بالخصوص عورت کا مرتبہ تو یہ ہے کہ وہ مرد کے محاسن و معائب، اس کے گھر در، اس کے اموال و املاک اور اس کی عزت و ناموس ہر چیز کی ایسی رازدان ہے کہ اگر وہ اس کا پردہ چاک کرنے پر آ جائے تو مرد بالکل ہی ننگا ہو کر رہ جائے۔ اس وجہ سے قرآن نے اس صفت کا خاص طور پر ذکر فرمایا۔ اس کے ساتھ بما حفظ اللہ کا جو اضافہ ہے اس سے اس صفت کی عالی نسبی کا اظہار مقصود ہے کہ ان کی اس صفت پر خدا کی صفت کا ایک پرتو ہے اس لیے کہ خدا نے بھی اپنے بندوں اور بندیوں کے رازوں کی حفاظت فرمائی ہے ورنہ وہ لوگوں کا پردہ چاک کرنے پر آ جاتا تو کون ہے جو کہیں منہ دکھانے کے قابل رہ جاتا۔

نشوز کی حقیقت

'نشوز' کے معنی سر اٹھانے کے ہیں لیکن اس لفظ کا غالب استعمال اس سرتابی و سرکشی کے لیے ہوتا ہے جو کسی عورت کی طرف سے اس کے شوہر کے مقابل میں ظاہر ہو۔ اگر کسی عورت کے رویے سے ظاہر ہو کہ وہ سرکشی کی راہ پر چل پڑی ہے تو مرد چونکہ قوام ہے اس وجہ سے اس کو عورت کی تادیب کے لیے بعض تادیبی اختیارات دیے گئے ہیں۔ لیکن یہ ملحوظ رہے کہ قرآن نے یہ اختیارات صرف اس صورت کے لیے دیے ہیں جب نشوز کا اندیشہ ہو۔ نشوز جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، عورت کی ہر کوتاہی!

---

[۱] مساوات مرد و زن کے جدید نظریے کے ہر پہلو پر مفصل بحث ہم نے اپنی کتاب 'اسلامی معاشرہ میں عورت کا مقام' میں کی ہے تفصیل کے طالب اس کو پڑھیں۔

غفلت یا بے پروائی یا اپنی شخصیت اور اپنی رائے اور ذوق کے اظہار کی قدرتی خواہش کر نہیں سکتے۔ نشوز یہ ہے کہ عورت کوئی ایسا قدم اٹھاتی نظر آئے جو مرد کی قوامیت کو چیلنج کرنے والا اور جس سے گھر کی مملکت میں بدامنی و اختلال پیدا ہونے کا اندیشہ ہو۔ اگر ایسی صورت پیدا ہوتی نظر آئے تو مرد تین صورتیں اختیار کر سکتا ہے اور قرآن کا انداز بیان دلیل ہے کہ ان تینوں میں ترتیب و تدریج ملحوظ ہے۔

نشوز کی صورت میں مرد کے تادیبی اختیارات

پہلا مرحلہ یہ ہے کہ نصیحت و ملامت کرے۔ قرآن میں 'وعظ' کا لفظ ہے جس کے اندر فی الجملہ زجر و توبیخ کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔ اگر اس سے کام چلتا نظر نہ آئے تو دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ ان سے بے تکلفانہ قسم کا خلا ملا ترک کر دے تاکہ انھیں اندازہ ہو جائے کہ انھوں نے اپنی روش نہ بدلی تو اس کے نتائج دور رس ہو سکتے ہیں۔ اگر معاملہ اس سے بھی بنتا نظر نہ آئے تو آخری درجے میں مرد کو جسمانی سزا دینے کا بھی اختیار ہے۔ لیکن یہ صرف اس حد تک ہونی چاہیے جس حد تک ایک معلم و مؤدب اپنے کسی زیر تربیت شاگرد کو دے سکتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے 'غیر مبرح' کے الفاظ سے اس کی حد واضح فرما دی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ سزا ایسی نہ ہو کہ وہ کوئی پائدار اثر چھوڑ جائے۔

اصلاح کے بعد پچھلی کدورتیں بھلا دی جائیں

مرد کے تادیبی اختیارات کی یہ آخری حد ہے۔ اگر اس کا نتیجہ مفید مطلب برآمد ہو، عورت بغاوت کے بجائے اطاعت کی راہ پر آجائے، تو پچھلی کدورتیں بھلا دینی چاہئیں۔ اس سے انتقام لینے کے بہانے نہیں ڈھونڈنے چاہئیں۔ مرد کو اپنی قوامیت کے زعم میں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ سب سے بلند اور سب سے بڑا خدا ہے۔ جب وہ قیم السمٰوٰت والارض ہو کر ہم سب کے نشوز سے درگزر فرماتا اور توبہ و اصلاح کے بعد سب کی نافرمانیوں کو معاف کر دیتا ہے تو بندے اپنی قوامیت کی لے حد سے آگے کیوں بڑھائیں۔

وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوا حَكَمًا مِّنْ أَهْلِهِ وَحَكَمًا مِّنْ أَهْلِهَا ۚ إِن يُرِيدَا إِصْلَاحًا يُوَفِّقِ اللَّهُ بَيْنَهُمَا ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا خَبِيرًا (۳۵)

اصلاح احوال کی ایک اور تدبیر

اگر مرد وہ سارے جتن، جو اوپر والی آیت میں مذکور ہوئے، کرنے کے بعد بھی عورت کے 'نشوز' پر قابو نہ پا سکا تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ خلیج اختلاف بہت وسیع ہے اور تعلقات ٹوٹنے کی حد پر پہنچے ہوئے ہیں۔ لیکن اس حد پر پہنچ جانے کے بعد بھی شریعت نے مرد کو یہ اجازت نہیں دی ہے کہ وہ بیوی کو طلاق دے کر اس سے پیچھا چھڑا لے۔ اسلام، میاں بیوی کے رشتے کو معاشرے کے استحکام کی بنیاد قرار دیتا ہے۔ اس وجہ سے اس کے ٹوٹنے کو صرف اسی صورت میں گوارا کرتا ہے جب اصلاح کی تمام ممکن تدبیریں اختیار کر چکنے کے بعد یہ ثابت ہو جائے کہ اب اس کا جڑا رہنا ناممکن یا مزید فساد کا باعث ہے۔ چنانچہ شوہر کی کوششوں کی ناکامی کے بعد اصلاح احوال کے لیے ایک دوسری تدبیر اختیار کرنے کی ہدایت فرمائی۔ یہ ہدایت میاں بیوی کے قبیلہ برادری اور ان کے رشتہ داروں اور خیر خواہوں کو دی گئی ہے کہ وہ آگے بڑھیں اور اپنے اثرات سے کام لے کر اس بگاڑ کی اصلاح کی کوشش کریں۔ اس کی عملی شکل یہ بتائی کہ ایک پنچ میاں کے

رشتہ داروں میں سے منتخب کیا جائے، دوسرا بیوی کے خاندان میں سے۔ یہ دونوں مل کر اصلاح کی کوشش کریں۔ بسا اوقات فریقین جس جھگڑے کو خود طے کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے دوسرے خیر خواہوں کی مداخلت سے وہ طے ہو جاتے ہیں۔ فریقین کو ان کی غیر جانبداری اور خیر خواہی کا احترام بھی کرنا پڑتا ہے اور بے جا ضد پر دوسروں کی ملامت کا اندیشہ بھی ہوتا ہے اس وجہ سے یہ شکل زیادہ مؤثر اور نتیجہ خیز ہوتی ہے۔

میاں اور بیوی کو ترغیب مصالحت

اَنۡ یُّرِیۡدَاۤ اِصۡلَاحًا یُّوَفِّقِ اللّٰہُ بَیۡنَہُمَا میں مراد اگرچہ حکمین بھی ہو سکتے ہیں لیکن میرا رجحان اس طرف ہے کہ اس سے مراد میاں بیوی ہی ہیں یعنی اگر یہ دونوں اپنی ضد چھوڑ کر اصلاحِ احوال کے طالب ہوں گے تو اللہ تعالیٰ ان میں سازگاری پیدا کر دے گا۔ یہ درحقیقت نہایت بلیغ اسلوب سے میاں بیوی کو تشویق و ترغیب ہے کہ وہ اس موقع سے فائدہ اٹھائیں اور افتراق کے بجائے خدائے کریم و کارساز کی طرف سے سازگاری کے طالب بنیں۔

اس آیت میں ہمارے نزدیک خطاب، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، میاں بیوی کے خویش و اقارب اور ان کی قوم و قبیلہ کے بڑے بوڑھوں سے ہے اور ان پنچوں کا اختیار تمام تر اصلاحِ حال کی کوشش ہی تک محدود ہے۔ اس کوشش کی ناکامی کے بعد شوہر اپنے شرعی اختیارات کے مطابق خود بھی کوئی قدم اٹھا سکتا ہے اور معاملہ عدالتی نوعیت کا ہو تو عدالت میں بھی جا سکتا ہے۔ البتہ اس بات کی گنجائش ہے کہ کوئی معاملہ عدالت میں جانے کے بعد عدالت کی طرف سے کسی پنچایت کے حوالہ کر دیا جائے اور عدالت پنچایت کو فیصلہ کا اختیار بھی تفویض کر دے۔

آخر میں علیم و خبیر کی صفات کے حوالے سے مقصود ہر ایک کو تنبیہ کرنا ہے کہ خدا اچھی طرح باخبر ہے کہ اس قضیے میں کس کا رول کیسا رہا ہے اور اسی کے مطابق وہ اس کے ساتھ معاملہ کرے گا۔

۱۸۔ آگے کا مضمون ___ آیات ۳۶-۴۳

اب آگے یہ خاتمۂ باب کی آیات ہیں۔ معاشرتی احکام و ہدایات کا سلسلہ جو شروع سے چلا آ رہا تھا وہ ان آیات پر ختم ہو رہا ہے جس طرح اللہ سے ڈرتے رہنے کی ہدایت سے اس باب کا آغاز فرمایا تھا اسی طرح اللہ کی عبادت کرتے رہنے کی ہدایت پر اس کو ختم کیا۔ اللہ تعالیٰ کا حق سب سے بڑا ہے جو لوگ اس حق کو کما حقہٗ ادا کرتے رہیں گے درحقیقت وہی دوسروں کے حقوق ادا کرنے کی توفیق پائیں گے۔ چنانچہ اس حق کی یاد دہانی کے بعد بالاجمال والدین، اقربا، یتامیٰ، مساکین، پڑوسی، مسافر اور لونڈی غلام سب کے حقوق کی یاد دہانی فرما دی۔ اللہ کا حق اس کی عبادت ہے اور اس کو باطل کرنے والی چیز شرک ہے اس وجہ سے اس حق کی یاد دہانی کے ساتھ شرک کی نفی کر دی۔ بندوں کا سب سے بڑا حق ان کے ساتھ

احسان اور ان کے لیے انفاق ہے۔ بخل، تکبر اور ریا اس کے ہادم ہیں اس وجہ سے احسان و انفاق کی تاکید کے ساتھ ان چیزوں کی نفی کر دی۔ اس کے بعد انفاق کی حوصلہ افزائی کے لیے فرمایا کہ یہ سودا خسارے کا سودا نہیں ہے۔ جو ایک خرچ کرے گا، دس پائے گا۔ پھر تنبیہ فرمادی کہ اس رسول کے ذریعے سے انذار و تبلیغ کا حق ادا ہو چکا ہے جو اب بھی نہیں سنیں گے وہ سوچ لیں کہ ایک ایسا دن بھی آنے والا ہے جس دن اللہ سب رسولوں کو ان کی اُمتوں پر گواہ ٹھہرا کر پوچھے گا کہ تم نے اپنی اپنی اُمتوں کو کیا دعوت دی اور انھوں نے کیا جواب دیا۔ پھر یہی سوال اس آخری اُمت کے متعلق اس آخری رسول سے بھی ہوگا۔ وہ دن ایسا ہوگا کہ نہ کسی کے لیے کوئی جائے پناہ ہوگی اور نہ کوئی شخص کوئی بات چھپا سکے گا۔

آخر میں اللہ کی عبادت، جس کا ذکر اوپر والی آیت میں گزرا، کے سب سے بڑے مظہر — نماز — کے بعض آداب و شرائط کا ذکر فرمایا۔ ان آداب و شرائط کے ذکر سے مقصود نماز کو اسی طرح مفسدات سے پاک کرنا ہے جس طرح اوپر انفاق کو اس کے موانع و مفسدات سے پاک کیا ہے — اب اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۳۶-۴۳

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ۙ۝۳۶ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۚ۝۳۷ وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَآءَ قَرِيْنًا ۝۳۸ وَمَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِيْمًا ۝۳۹ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝۴۰ فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى

وقف النبی علیہ السلام ع ۲

هٰٓؤُلَآءِ شَهِيدًا ﴿٤١﴾ يَوْمَئِذٍ يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَعَصَوُا الرَّسُولَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْأَرْضُ ۖ وَلَا يَكْتُمُونَ اللّٰهَ حَدِيثًا ﴿٤٢﴾ يٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَأَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ وَلَا جُنُبًا إِلَّا عَابِرِي سَبِيلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوا ۚ وَإِنْ كُنْتُمْ مَرْضٰٓى أَوْ عَلٰى سَفَرٍ أَوْ جَآءَ أَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ أَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوا مَآءً فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوا بِوُجُوهِكُمْ وَأَيْدِيكُمْ ۗ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُورًا ﴿٤٣﴾

ترجمۂ آیات ۴۳-۳۶

اور اللہ ہی کی بندگی کرو اور کسی چیز کو بھی اس کا شریک نہ ٹھہراؤ۔ اور والدین، قرابت مند، یتیم، مسکین، قرابت دار پڑوسی، بیگانہ پڑوسی، ہم نشین، مسافر اور اپنے مملوک کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ اللہ اترانے اور بڑائی مارنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ جو خود بھی بخل کرتے اور دوسروں کو بھی بخالت کا مشورہ دیتے ہیں اور اللہ نے اپنے فضل میں سے جو کچھ انھیں دے رکھا ہے اس کو چھپاتے ہیں، ہم نے ایسے ناشکروں کے لیے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے — جو اپنے مال لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرتے ہیں اور اللہ اور روز آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور جن کا ساتھی شیطان بن جائے تو وہ نہایت برا ساتھی ہے۔ اُن کا کیا نقصان تھا اگر یہ اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان لاتے اور اللہ نے ان کو جو کچھ بخش رکھا ہے اس میں سے خرچ کرتے! اللہ تو ان سے اچھی طرح باخبر ہے۔ اللہ ذرا بھی کسی کی حق تلفی نہیں کرے گا۔ اگر ایک نیکی ہوگی تو اس کو کئی گنا بڑھائے گا اور خاص اپنے پاس سے بہت بڑا اجر عطا فرمائے گا۔ ۳۶-۴۰

اس دن ان کا کیا حال ہوگا جب ہم ہر اُمت میں سے ایک گواہ کھڑا کریں گے اور تم کو ان لوگوں پر گواہ بنا کر کھڑا کریں گے! اس دن وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا اور جنھوں نے رسول کی نافرمانی کی، تمنا کریں گے کاش ان کے سمیت زمین برابر کر دی جائے اور اُس دن وہ خدا سے کوئی بات بھی چھپا نہ سکیں گے۔ ۴۱-۴۲

اے ایمان والو، نشے کے حال میں نماز کے پاس نہ جایا کرو یہاں تک کہ جو کچھ تم زبان سے کہتے ہو اس کو سمجھنے لگو اور جنابت کی حالت میں، مگر یہ کہ بس گزر جانا پیشِ نظر ہو، یہاں تک کہ غسل کر لو اور اگر تم مریض ہو، یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی جائے ضرور سے آئے یا عورتوں سے ہم صحبت ہوا ہو، پھر پانی نہ میسر آئے تو کوئی پاک جگہ دیکھو اور اپنے چہرے اور ہاتھوں کا مسح کر لو۔ بے شک اللہ درگزر کرنے والا، بخشنے والا ہے۔ ۴۳

۱۹۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ۙ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰىھُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۚ وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ رِئَاۗءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَاۗءَ قَرِيْنًا (۳۶-۳۸)

'بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا' میں 'ب' اس بات پر دلیل ہے کہ یہاں احسان کا لفظ 'بِرّ' کے مفہوم پر مشتمل ہے۔ یعنی یہ احسان ادائے حقوق کے ساتھ ہو، محض چھپا اتارنے کی کوشش نہ ہو۔ 'ب' کا استعمال لفظ بِرّ کے ساتھ ہی مناسبت رکھتا ہے۔ چنانچہ سورۂ مریم میں ہے وَبَرًّا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا (اور اپنے والدین کا فرماں بردار تھا، سرکش اور نافرمان نہ تھا) اردو ترجمے میں اس طرح کے اسالیب کے ترجمے کا حق مشکل ہی سے ادا ہوتا ہے۔

پڑوسی کی تین قسمیں

'الْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى': یعنی پڑوسی بھی ہے اور اس کے ساتھ رشتہ داری کا بھی تعلق ہے۔

'الْجَارِ الْجُنُبِ': جُنُب کے معنی اجنبی کے ہیں یعنی پڑوسی ہے لیکن رشتہ داری اور قرابت کا تعلق اس کے ساتھ نہیں ہے

'الصاحب بالجنب' 'جنب' کے معنی پہلو کے ہیں، جو شخص وقتی اور عارضی طور پر بھی کسی مجلس، کسی حلقے، کسی سواری، کسی دکان، کسی ہوٹل میں آپ کا ہم نشین و ہم رکاب ہو جاتے، وہ الصاحب بالجنب' ہے۔

اسلامی معاشرہ میں ان تینوں قسم کے لوگوں کو ایک دوسرے پر حقوق جوار حاصل ہو جاتے ہیں۔

خدا کا حق سب سے بڑا ہے

ان آیات میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنا حق ادا کرنے کا حکم دیا ہے اس لیے کہ خالق و مالک اور رب ہونے کی وجہ سے اس کا حق سب سے بڑا ہے اور اسی حق کی ادائیگی پر دوسرے حقوق کی ادائیگی کا انحصار ہے۔ جو لوگ خدا کا حق ادا نہیں کرتے وہ دوسروں کے حقوق بھی صحیح طور پر ادا کرنے کی توفیق نہیں پاتے۔ خدا کا حق عبادت ہے اور ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ عبادت میں پرستش اور اطاعت دونوں چیزیں شامل ہیں۔ اس عبادت کے لیے یہ شرط ہے کہ اس میں کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے اس لیے کہ خدا کی خدائی میں کوئی دوسرا ساجھی نہیں ہے۔ اگر اس حق میں کسی دوسرے کو شریک کر دیا جائے تو یہ عبادت باطل ہو کر رہ جاتی ہے۔

خدا کے بعد سب سے بڑا حق والدین کا ہے

خدا کے بعد سب سے بڑا حق والدین کا ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ انہی کو آدمی کے وجود میں آنے اور اس کی پرورش کا ذریعہ بناتا ہے۔ لیکن ان کا حق عبادت نہیں بلکہ بر و احسان ہے۔ اس کے بعد قرابت مندوں کے حقوق ہیں جو درحقیقت اسی حق سے پیدا ہوتے ہیں۔ پھر یتامیٰ، مساکین اور پڑوسیوں کے حقوق ہیں۔ پڑوسی تین طرح کے ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ جو پڑوسی بھی ہے اور قرابت مند بھی، دوسرا وہ جو پڑوسی تو ہے اگرچہ قرابت مند نہیں ہے، تیسرا وہ جو وقتی طور پر کسی سفر یا حضر میں ساتھی اور ہم نشین بن گیا ہے۔ ان سب کے ساتھ احسان کی ہدایت ہوئی۔ پھر مسافر اور غلاموں لونڈیوں کا ذکر ہے۔

'قرابت مندوں' مساکین اور پڑوسیوں کے حقوق

لونڈیوں اور غلاموں کے متعلق ہم ذکر کر چکے ہیں کہ غلامی، اسلام کے نظام کا کوئی جزو نہیں ہے۔ اسلام نے وقت کے بین الاقوامی حالات کے تحت اس کو گوارا کیا تھا اور خود اپنے نظام میں غلاموں کی ترقی و بہبود کی ایسی شکلیں تجویز کر دی تھیں جن سے وہ بالتدریج اسلامی معاشرے میں مساوی درجے کے رکن بن جائیں۔ اس آیت میں ان کو بھی احسان کے مستحقوں میں شامل کیا ہے اور مقصود اس سے یہی ہے کہ ان کے متعلق لوگوں کا زاویۂ نگاہ بدلے اور لوگ نیکی اور احسان کے مواقع میں ان کی اصلاح و ترقی کو ایک مستقل مسئلے کی حیثیت سے پیش نظر رکھیں۔

ادائے حقوق کے منافی ذہنیت

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ مَنْ کَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا۔ یہ ادائے حقوق اور احسان کے منافی ذہنیت کا بیان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اسباب و وسائل کی فراوانی کو اللہ کا انعام و احسان سمجھتے ہیں ان کے اندر تو شکر گزاری اور تواضع کا جذبہ ابھرتا ہے اور یہ جذبہ ان کو اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان پر احسان فرمایا ہے اسی طرح یہ دوسروں پر احسان کریں چنانچہ وہ لوگوں پر احسان کرتے اور اللہ تعالیٰ کی محبت کے سزاوار بنتے ہیں۔ برعکس اس کے جو لوگ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کو خود اپنی قوت و قابلیت اور اپنی تدبیر و حکمت کا کرشمہ سمجھنے لگتے ہیں ان کے اندر تواضع اور شکر گزاری کے جذبے کے بجائے گھمنڈ اور فخر پیدا ہو جاتا ہے اور وہ لوگوں پر احسان

کرنے کے بجائے ان پر دھونس اور رعب جمانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایسے ناشکروں اور کم ظرفوں کو دوست نہیں رکھتا۔ 'دوست نہیں رکھتا' کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایسے لوگوں سے نفرت کرتا ہے۔

اترانے اور فخر کرنے والوں کی چند خصوصیات

اَلَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ الایۃ۔ اکڑنے اور فخر کرنے والوں کی یہ چند مزید خصوصیات بیان ہوئی ہیں جو ہم بالترتیب واضح کریں گے۔

پہلی یہ کہ یہ خود بھی بخیل ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی بخل کا مشورہ دیتے ہیں۔ 'بخیل' اس شخص کو کہتے ہیں جو دوسروں کے حقوق ادا کرنے میں تنگ دل ہو۔ جو شخص دوسروں کے حقوق فیاضی اور کشادہ دلی کے ساتھ ادا کرتا ہے لیکن خود اپنی ذات کے معاملے میں احتیاط اور تنگی برتتا ہے اس کو بخیل نہیں کہتے۔ بخالت کا بڑا سبب یہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنے مال و اسباب کو خدا کی دین سمجھنے کے بجائے خود اپنی تدبیر و قابلیت کا کرشمہ سمجھنے لگتا ہے۔ اس وجہ سے اس کے اندر تواضع اور شکر گزاری کا وہ جذبہ ہی مردہ ہو جاتا ہے جو فیاضی اور جود و کرم کا اصل محرک ہے۔

بخیل آدمی دوسروں کو بھی بخالت کا مشورہ دیتا ہے اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ دوسروں کی فیاضی سے خود اس کی بخالت کا راز فاش ہوتا ہے۔ اپنے اس عیب پر پردہ ڈالے رکھنے کے لیے اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جس طرح وہ دوسروں کے حقوق دبائے بیٹھا ہے اسی طرح دوسرے بھی بیٹھے رہیں کہ نہ کوئی ناک والا ہوگا، نہ اس کو نکو بننا پڑے گا۔ قاعدہ ہے کہ جو آدمی بزدل ہوتا ہے وہ دوسروں کو بھی بزدلی ہی کا درس دیتا ہے تاکہ خود اس کی بزدلی کا بھانڈا نہ پھوٹے۔

بخیل مالداروں کا ایک نفسیاتی پہلو

دوسری یہ کہ یہ اللہ کے اس فضل کو چھپاتے ہیں جو اللہ نے ان کو دے رکھا ہے۔ یہ بخیل مالداروں کے ایک نہایت مخفی نفسیاتی پہلو کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ بخیل مالداروں کی خواہش ایک طرف تو یہ ہوتی ہے کہ ہر شخص پر ان کی ریاست و امارت کی دھونس جمی رہے، دوسری طرف یہ کوشش بھی وہ کرتے رہتے ہیں کہ کوئی شخص ادائے حقوق کے معاملے میں ان کو کوئی ملامت نہ کر سکے۔ چنانچہ یہ ہر ملنے جلنے والے اور ہر طالب و سائل کے سامنے اپنے وسیع اخراجات، کاروبار میں نقصانات، اپنی پھیلی ہوئی ذمہ داریوں اور طالبوں اور سائلوں کی کثرت کا دکھڑا روتے رہتے ہیں تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ ہے تو یہ شخص غنیٔ دریا دل لیکن بے چارہ کیا کرے، بڑی بھاری ذمہ داریوں کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے۔ اس وجہ سے ہزاروں لاکھوں کی آمدنی رکھنے کے باوجود اس کے پاس بچتا بچاتا کچھ بھی نہیں ہے۔

وَاَعْتَدْنَا لِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابًا مُّھِیْنًا۔ ایسے ناشکروں اور کافر نعمتوں کے لیے فرمایا کہ ہم نے ذلیل کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ 'ذلیل کرنے والا عذاب' اس وجہ سے کہ یہ اللہ کی نعمت پا کر اس کے شکر گزار اور حق گزار بندے بننے کے بجائے اکڑنے اور اترانے والے اور اس کے فضل کو چھپانے والے بنے۔

دکھاوے کا انفاق کاروباری خرچ ہے

وَالَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ الایۃ۔ یہ بھی اسی سلسلے کی بات ہے جس کا ذکر اوپر ہوا۔ یعنی یہ اگر خرچ کرتے ہیں تو محض دکھاوے کے لیے۔ دکھاوے کا خرچ ایک کاروباری خرچ ہوتا ہے۔ اول تو اس کا فائدہ شاذ و نادر ہی ان لوگوں کو

پہنچتا ہے جو اصلی حقدار ہوتے ہیں اس لیے کہ اصلی حقداروں کے معاملے میں نمائش اور دکھاوے کا کچھ زیادہ موقع نہیں ہوتا۔ پھر منافق کی نماز کی طرح نمائش کے انفاق کا بھی کوئی تعلق اللہ تعالیٰ سے نہیں ہوتا۔ اس طرح کے لوگ خدا اور آخرت پر ایمان کے تو مدعی ہوتے ہیں لیکن حقیقت میں نہ ان کا ایمان خدا پر ہوتا ہے نہ آخرت پر، اور انفاق اللہ تعالیٰ کے ہاں صرف وہ معتبر ہوتا ہے جو خدا اور آخرت پر ایمان کے ساتھ ہو اس لیے کہ وہی انفاق اس دنیا کے لیے بھی باعثِ خیر و برکت ہے اور وہی آخرت میں بھی موجبِ خیر و برکت ہوگا۔ جو لوگ خدا اور آخرت پر ایمان سے خالی ہوتے ہیں ان کا ساتھی شیطان بن جاتا ہے اور جس کا ساتھی شیطان بن جائے اس کے لیے خیر و برکت کا کوئی کام کرنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہ جاتا۔ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا۔ ۲۷۔ بنی اسرائیل۔

وَمَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِيْمًا ۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا (۳۹-۴۰)

یہ ان تنگ دلوں اور بخیلوں کی بدقسمتی پر اظہارِ افسوس ہے کہ یہ اللہ اور آخرت پر ایمان لانے اور اللہ کی راہ میں خود اسی کی بخشی ہوئی دولت کو خرچ کرنے میں بڑا خسارہ سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ خسارے کا سودا نہیں ہے بلکہ سرتاسر نفع ہی نفع ہے۔ اللہ تعالیٰ نہ کسی کے عمل سے بے خبر ہے، نہ ذرہ برابر وہ کسی کی حق تلفی کرنے والا ہے بلکہ کسی کی کوئی نیکی ہوگی تو وہ اس کو بڑھا کر کئی گنی کرے گا اور اس پر مزید وہ خود اپنی طرف سے ایک بہت بڑا اجر عطا فرمائے گا۔

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۢ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰي هٰٓؤُلَاۗءِ شَهِيْدًا ۔ يَوْمَىِٕذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ ۭ وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا (۴۱-۴۲)

قیامت میں انبیاء کی شہادت اپنی امتوں پر

مطلب یہ ہے کہ جہاں تک اتمامِ حجت کا تعلق ہے اللہ نے اپنے رسول کے ذریعے سے ان کو اپنے دین سے آگاہ کر دیا اور ان پر حجت تمام کر دی۔ اب دین و شریعت سے آگاہ کرنے کے معاملے میں کوئی کسر نہیں رہ گئی ہے۔ اس اتمامِ حجت کے بعد بھی اگر یہ لوگ اللہ اور رسول سے منحرف ہی رہے تو آج تو یہ اپنے کفر و نفاق کو چھپا سکتے ہیں لیکن کل کو یہ کیا کریں گے جب میدانِ حشر میں اللہ تمام امتوں اور ان کے پیغمبروں کو جمع کر کے پیغمبروں سے گواہی دلوائے گا کہ انھوں نے لوگوں کو دین پہنچا دیا تھا اور اسی طرح کی گواہی تم (خطاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے) اس امت کے لوگوں پر دینے کے لیے کھڑے کیے جاؤ گے۔ اس دن وہ سارے لوگ جنھوں نے کفر اور نافرمانیِ رسول کا ارتکاب کیا ہوگا یہ آرزو کریں گے کہ کاش وہ زمین میں دھنس جائیں اور زمین ان کے سمیت برابر کر دی جائے۔ اس دن کوئی شخص خدا سے کوئی بات چھپا نہ سکے گا۔

لَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا میں نفیِ فعل، عدمِ استطاعتِ فعل کے مفہوم میں ہے۔ کسی بات کو نہ چھپا سکنے کی وجہ یہ ہوگی کہ اس دن مجرموں کے ہاتھ پاؤں اور ان کے تمام اعضاء و جوارح خود ان کے خلاف گواہی دینے کے لیے

بول اٹھیں گے۔ اس حقیقت کو قرآن نے دوسرے مقام میں یوں واضح فرمایا ہے۔

حَتّٰٓى اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ	یہاں تک کہ جب وہ حاضر ہوں گے تو ان کے خلاف گواہی
سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ وَجُلُوْدُهُمْ (۲۰ حٰم السجدہ)	دیں گے ان کے کان، ان کی آنکھیں اور ان کے رونگٹے

یہاں اس لفظ کے اندر ایک لطیف تعریض بھی پوشیدہ ہے۔ یہ لوگ اللہ کے اس فضل کو چھپاتے ہیں جو اللہ نے ان کو دے رکھا ہے وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۳۷۔ یہاں فرمایا کہ اس دن اللہ سے کوئی چیز بھی چھپا نہ سکیں گے۔ ہر چیز خود بے نقاب اور گواہی دینے کے لیے ناطق ہو جائے گی۔

یہ بات کہ انبیاءؑ قیامت کے روز اپنی اپنی امتوں پر گواہ کی حیثیت سے کھڑے کیے جائیں گے قرآن مجید کے دوسرے مقامات سے بھی ثابت ہے۔ سورۂ مائدہ میں ہے۔

يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ؕ	جس دن اللہ تمام رسولوں کو جمع کرے گا اور ان سے پوچھے گا
قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ	کہ تمھیں کیا جواب ملا وہ کہیں گے کہ ہمیں علم نہیں، غیب
الْغُيُوْبِ (۱۰۹۔ مائدہ)	کی باتوں کا جاننے والا تو ہی ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ رسولوں سے قیامت کے دن سوال فرمائے گا کہ جب تم نے اپنی اپنی امتوں کو اللہ کا دین پہنچایا تو انھوں نے دین کے ساتھ کیا معاملہ کیا، رسول جواب دیں گے کہ ہم نے تو تیرا دین بے کم وکاست لوگوں کو پہنچا دیا۔ انھوں نے اس دین کے ساتھ کیا معاملہ کیا، اس کا علم تیرے ہی پاس ہے اس لیے کہ غیب کا جاننے والا تو ہی ہے۔

اس شہادت کی پوری حقیقت سیدنا مسیحؑ کی شہادت سے واضح ہو جاتی ہے جو سورۂ مائدہ میں یوں مذکور ہے۔

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ	جب کہ اللہ پوچھے گا کہ اے مریم کے بیٹے عیسیٰ، کیا تم نے
قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ	لوگوں سے یہ کہا تھا کہ اللہ کے سوا مجھے اور میری ماں کو
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ	بھی معبود ٹھہراؤ؟ وہ جواب دیں گے کہ تو پاک ہے،
اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ بِحَقٍّ ؕ اِنْ كُنْتُ	یہ مجھ سے کس طرح ہو سکتا ہے کہ میں وہ بات کہوں جس کا
قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ؕ تَعْلَمُ مَا فِيْ	مجھے کوئی حق نہیں۔ اگر میں نے یہ بات کہی ہوگی تو تجھ کو اس
نَفْسِيْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ؕ اِنَّكَ	کا علم ہوگا۔ تو میرے دل کی باتوں کو جانتا ہے، میں تیرے
اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ۝ مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا	دل کی باتوں کو نہیں جانتا۔ غیب کی باتوں کو جاننے والا تو
مَآ اَمَرْتَنِيْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ	ہی ہے۔ میں نے ان سے نہیں کہی مگر وہی بات جس کا تو
وَرَبَّكُمْ ۚ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ	نے مجھے حکم دیا، یہ کہ اللہ ہی کی بندگی کرو جو میرا بھی رب
فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ	ہے اور تمھارا بھی۔ میں جب تک ان کے اندر رہا اسی بات
عَلَيْهِمْ ؕ وَاَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ	کی گواہی دینے والا رہا، پھر جب تو نے مجھے وفات دی تو

شَهِيْدًا (۴۰-۴۱) ان کا گواہ لائیں گے اور تم کو ان پر گواہ بنا کر لائیں گے؟ اُس دن جنہوں نے کفر کیا اور رسول کی نافرمانی کی، تمنا کریں گے کہ کاش زمین ان پر برابر کر دی جاتی اور وہ اللہ سے کوئی بات بھی چھپا نہ سکیں گے۔ اللہ ہر چیز پر حاضر و ناظر ہے۔

نساؤکی اس آیت سے متعلق روایات میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابن مسعودؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن سنا رہے تھے جب اس آیت پر پہنچے تو حضورؐ شدت تاثر سے آبدیدہ ہو گئے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ آیت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک عظیم شرف کے ساتھ ساتھ ایک عظیم ذمہ داری کی بھی حامل ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا ۭ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰي سَفَرٍ اَوْ جَاۗءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَاۗىِٕطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَاۗءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَاۗءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا (۴۳)

لفظ 'صلوٰۃ' نماز اور موضع نماز دونوں معنی میں

'صلوٰۃ' کے معنی نماز کے ہیں لیکن جس طرح کبھی ظرف بولتے ہیں اور مظروف اس کے مفہوم میں آپ سے آپ شامل ہوتا ہے اسی طرح کبھی مظروف، اگر قرائن موجود ہوں، ظرف پر بھی مشتمل ہو جاتا ہے۔ یہاں دو قرینے موجود ہیں جو اس بات کی دلیل ہیں کہ 'صلوٰۃ' کا لفظ موضع صلوٰۃ یعنی مسجد پر بھی مشتمل ہے۔ ایک تو یہ کہ فرمایا نشے اور جنابت کی حالت میں نماز کے قریب بھی نہ پھٹکو۔ ظاہر ہے کہ اگر 'صلوٰۃ' سے مراد مجرد نماز ہوتی تو اس کے لیے 'نماز نہ پڑھو' کہہ دینا کافی تھا۔ 'لَا تَقْرَبُوْا' کے الفاظ سے اس مطلب کو ادا کرنے کا کوئی خاص فائدہ سمجھ میں نہیں آیا۔ دوسرا یہ کہ اس کے ساتھ 'اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ' کا استثنا بھی ہے۔ یعنی اگر نماز کی جگہ سے مجرد گزر جانا مدِّنظر ہو تو اس میں مضائقہ نہیں۔ یہ گزر جانا، نماز کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتا بلکہ اس کی واضح مناسبت ہو سکتی ہے تو موضع نماز ہی کے ساتھ ہو سکتی ہے۔ بعض لوگوں نے اسی عدم مناسبت سے بچنے کے لیے 'عَابِرِيْ سَبِيْلٍ' سے مراد حالتِ سفر کو لیا ہے لیکن یہ محض تکلف ہے۔ اول تو سفر کے لیے یہ تعبیر بالکل اجنبی ہے، دوسرے یہ کہ حالتِ سفر کے لیے جو رخصت ہے وہ اسی آیت میں 'اَوْ عَلٰي سَفَرٍ' کے الفاظ سے مستقلاً بیان ہوئی ہے۔ پھر یہاں اس کے ذکر کی کیا ضرورت تھی۔

تحریم شراب کی راہ میں اسلام کا ابتدائی قدم

'سُكٰرٰى'، 'سکران' کی جمع ہے۔ 'سکران'، شراب کے نشہ میں دھت کو کہتے ہیں۔ نشے کی حالت میں نماز اور موضع نماز سے روک کر اسلام نے تحریم شراب کی راہ میں یہ ابتدائی قدم اٹھایا۔ یہود کے ہاں شراب کی ممانعت صرف اوقاتِ عبادت میں اماموں کے لیے تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس راہ میں اسلام کا پہلا قدم بھی اُن کے آخری قدم سے آگے ہے۔

نشہ عقل کی نجاست ہے، جنابت بدن کی

نشہ اور جنابت دونوں کو ایک ساتھ ذکر کر کے اور دونوں کو یکساں مفسد نماز قرار دے کر قرآن نے اس حقیقت کی طرف رہنمائی فرمائی ہے کہ یہ دونوں حالتیں نجاست کی ہیں، بس فرق یہ ہے کہ نشہ عقل کی نجاست ہے اور جنابت جسم کی۔ شراب کو قرآن نے جو 'رجس' کہا ہے یہ اس کی وضاحت ہو گئی۔

'جُنُب' کا لفظ جس طرح اجنبی کے لیے آتا ہے، جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، اسی طرح جُنبی کے لیے بھی آتا ہے اور واحد، جمع، مذکر، مؤنث سب میں اس کی شکل ایک ہی رہتی ہے۔

تیمم کی حکمت

'تیمم' کے معنی قصد اور رخ کرنے کے ہیں۔ 'صعید' سطح ارض کو کہتے ہیں۔ مرض، سفر اور پانی نہ ملنے کی صورت میں

طہارت حاصل کرنے کے لیے یہ ہدایت ہوئی کہ کوئی پاک صاف جگہ دیکھ کر چہرے اور ہاتھوں کا مسح کر لو۔ اگرچہ یہ مسح پاکیزگی کے حصول کے نقطۂ نظر سے کوئی اہمیت نہیں رکھتا لیکن اصل طریقۂ طہارت کی یادداشت ذہن میں قائم رکھنے کے پہلو سے اس کی بڑی اہمیت ہے۔ شریعت کے اکثر عبادات میں یہ امر ملحوظ رکھا ہے کہ جب اصلی صورت میں ان کی تعمیل ناممکن یا دشوار ہو تو شبہی صورت میں ان کی یادگار باقی رکھی جائے تاکہ جب حالات درست ہو جائیں، ان کی طرف پلٹنے کے لیے طبیعت میں آمادگی باقی رہے۔

تیمم کے تین مواقع

تیمم کے یہاں تین مواقع بیان ہوئے ہیں۔ مرض، سفر اور پانی کی نایابی۔ اس سے یہ بات خود بخود نکلتی ہے کہ مرض اور سفر کی حالت میں پانی موجود ہوتے ہوئے بھی آدمی تیمم کر سکتا ہے۔ مرض میں وضو یا غسل سے ضرر کا اندیشہ ہوتا ہے اس وجہ سے یہ رعایت ہوئی ہے۔ اسی طرح سفر میں مختلف حالتیں ایسی پیش آ سکتی ہیں کہ آدمی کو تیمم ہی پر قناعت کرنی پڑے۔ مثلاً یہ کہ پانی نایاب تو نہ ہو لیکن کمیاب ہو۔ اندیشہ ہو کہ اگر غسل وغیرہ کے کام میں لایا گیا تو پینے کے لیے پانی تھڑ جائے گا یا یہ ڈر ہو کہ اگر نہانے کے اہتمام میں لگے تو قافلے کے ساتھیوں سے بچھڑ جائیں گے، یا ریل اور جہاز کا ایسا سفر ہو کہ غسل کرنا شدید زحمت کا باعث ہو۔

حدث اور جنابت، دونوں حالتوں میں تیمم کی اجازت

نجاست کی یہاں دو حالتیں مذکور ہوئی ہیں۔ ایک یہ کہ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ (یا تم میں سے کوئی جائے ضرور سے آئے) لفظ 'غائط' اصلاً نشیبی زمین کے لیے آتا ہے۔ یہاں یہ قضائے حاجت سے کنایہ ہے اس لیے کہ سادہ دیہاتی زندگی میں لوگ رفع حاجت کے لیے عموماً نشیبی زمینوں اور جھاڑیوں ہی میں جاتے ہیں۔ دوسری اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ (یا تم نے عورتوں سے ملاقات کی ہو) 'ملامست' کے معنی اصلاً چھونے اور ہاتھ لگانے کے ہیں لیکن یہاں یہ کنایہ ہے مباشرت سے۔ نجاست کی ان دونوں حالتوں کے ذکر سے مقصد یہ ہے کہ تیمم ہر قسم کی نجاست میں کفایت کرتا ہے۔ اگر یہ وضاحت نہ ہوتی تو یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ معمولی حدث میں تو تیمم جائز ہے لیکن دوسری صورت میں جائز نہیں ہے۔

آیت ۴۳ کا موقع و محل اور نظم

اجزا کی وضاحت کے بعد آیت کے موقع اور اس کے نظم کو ایک مرتبہ پھر سمجھ لیجیے۔ آیت ۳۶ میں اللہ ہی کی عبادت اور والدین و اقربا وغیرہ کے ساتھ احسان و انفاق کا حکم دیا۔ اس کے ساتھ جو چیزیں عبادت اور احسان و انفاق کو باطل کر دینے والی ہیں مثلاً شرک اور ریا وغیرہ ان کا ذکر فرمایا۔ اب یہ عبادتِ الٰہی کے سب سے بڑے مظہر۔ نماز۔ کے ان مفسدات کا ذکر فرمایا جو نماز کو باطل کر دینے والے ہیں۔ اوپر شرک کا ذکر ہو چکا ہے جو عقائدی نجاست ہے۔ اس آیت میں ظاہری نجاستوں اور ان کے ازالہ کی تدابیر کی طرف رہنمائی فرمائی۔ فرمایا کہ نشے اور جنابت کی حالت میں نماز اور جائے نماز کے پاس نہ جاؤ۔ نشے کی حالت میں، جب کہ آدمی کو کچھ ہوش نہیں کہ زبان سے کیا کلمات نکال رہا ہے اور کس کام کے کرنے اور نہ کرنے کا اللہ سے عہد کر رہا ہے، نماز پڑھنا ایک کارِ عبث ہے۔ اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ آیت اس زمانے میں نازل ہوئی ہے جب شراب کی قطعی حرمت کا حکم نازل نہیں ہوا تھا۔ اس حکم نے گویا لوگوں کو متنبہ کر دیا کہ اب شراب

کی قطعی حرمت کے لیے لوگ اپنی تربیت کریں۔ اسی طرح منع فرمایا کہ جنابت کی حالت میں بھی نماز اور جائے نماز کے پاس نہ جاؤ۔ یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ جس طرح شراب کا نشہ مبطل نماز ہے، اسی طرح جنابت کا کسل اور انقباض بھی اس انشراح اور حضور قلب کے منافی ہے جو نماز کے لیے مطلوب ہے۔ اس ممانعت کے ساتھ اتنا استثنا رکھ دیا کہ اس حالت میں کوئی شخص اگر کسی ضرورت سے نماز کی جگہ سے گزر جانا چاہے تو اس کی رخصت ہے۔ جنابت کے لیے طہارت غسل ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص بیمار یا سفر میں ہے یا اسے پانی نہیں مل رہا ہے تو وہ تیمم کر سکتا ہے۔ اس کے ساتھ قضائے حاجت اور مباشرت کا ذکر اس لیے فرمایا کہ یہ ظاہر ہو جائے کہ تیمم ہر قسم کی نجاست میں جائز ہے۔ تیمم کا طریقہ یہ بتایا ہے کہ کوئی پاک جگہ دیکھ کر چہرے اور ہاتھوں کا مسح کر لو۔ آخر میں فرمایا کہ اللہ معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔ یعنی بندوں کے ساتھ اس نے یہ جو رعایت فرمائی ہے تو اس لیے کہ وہ عفوّ اور غفور ہے۔

۲۰۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۴۴-۵۷

آیت ۴۳ پر، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں، اصلاح معاشرہ سے متعلق احکام کا باب ختم ہو گیا۔ آگے اس ردِ عمل کا بیان آ رہا ہے جو ان اصلاحات کے مخالفین کی طرف سے ظاہر ہوا اور ساتھ ہی مسلمانوں کو ایک عظیم مملکت کی بشارت سنائی جا رہی ہے جو معاشرہ کے بلوغ اور کمال کا قدرتی نتیجہ ہے۔ مخالفین میں سب سے پہلے یہود کو لیا ہے اس لیے کہ حامل کتاب ہونے کی وجہ سے سب سے زیادہ انہی کو ان اصلاحات کا حامی ہونا چاہیے تھا لیکن بدقسمتی سے سب سے زیادہ مخالفت انہی کی طرف سے ہوئی۔ چنانچہ ان کی مخالفانہ شرارتوں کا ذکر کرنے کے بعد ان کو براہِ راست خطاب کر کے دھمکی دی کہ اے اہل کتاب، اگر تم اس کتاب پر ایمان نہ لائے تو یاد رکھو کہ تمھارے لیے وقت آگیا ہے کہ اصحاب سبت کی طرح تم پر لعنت کر دی جائے اور تمھارے چہرے مسخ کر دیے جائیں۔

اس کے بعد یہود کے بعض مشرکانہ اعمال و عقاید اور ان کے اس زعم پر ان کو سرزنش کی ہے کہ یہ اپنے آپ کو ایک برگزیدہ امت سمجھے بیٹھے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ان کے عقاید و اعمال خواہ کچھ ہوں، یہ خدا کے محبوبوں کی اولاد ہیں اس وجہ سے بغیر کسی حساب کتاب کے جنت میں جا براجیں گے۔ فرمایا کہ ان کے اس زعم باطل نے، جو سرتا سر اللہ پر افترا ہے، ان کو ایمان و عمل کی ذمہ داریوں سے بالکل بے فکر کر دیا ہے اور انھوں نے اپنے آپ کو بندگی کے دائرے سے نکال کر الوہیت کے دائرہ میں شامل کر رکھا ہے۔

اس کے بعد اس بات پر تعجب کا اظہار کیا کہ ایک طرف تو تقدس اور برتری کا یہ ادعا ہے، دوسری طرف ذہنی اور اخلاقی پستی کا یہ حال ہے کہ اہل کتاب ہو کر جبت و طاغوت پر ایمان رکھتے اور مسلمانوں کے خلاف حسد میں ایسے اندھے ہو گئے ہیں کہ کفار و مشرکین تک کو مسلمانوں سے زیادہ ہدایت یافتہ قرار دیتے

ہیں۔ فرمایا کہ اگر یہ حسد سے اندھے ہو رہے ہیں تو ہو جائیں، اب تو تقدیر الٰہی کا یہ فیصلہ ہو چکا ہے کہ اللہ اولاد اسمٰعیل کو کتاب و حکمت اور ایک عظیم خلافت کا وارث بنا کے رہے گا۔

اس کے بعد اولاد اسمٰعیل میں سے جن لوگوں نے یہ دعوت قبول کر لی تھی ان کی حوصلہ افزائی فرمائی اور جو لوگ اس کی مخالفت پر اڑے ہوئے تھے ان کو آخرت کے عذاب کی دھمکی دی۔ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات ۴۴-۵۷

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يَشْتَرُونَ الضَّلَالَةَ وَيُرِيدُونَ أَن تَضِلُّوا السَّبِيلَ ﴿٤٤﴾ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِأَعْدَائِكُمْ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَلِيًّا وَكَفَىٰ بِاللَّهِ نَصِيرًا ﴿٤٥﴾ مِّنَ الَّذِينَ هَادُوا يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَن مَّوَاضِعِهِ وَيَقُولُونَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَرَاعِنَا لَيًّا بِأَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِي الدِّينِ ۚ وَلَوْ أَنَّهُمْ قَالُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَأَقْوَمَ وَلَٰكِن لَّعَنَهُمُ اللَّهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُونَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿٤٦﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ آمِنُوا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُم مِّن قَبْلِ أَن نَّطْمِسَ وُجُوهًا فَنَرُدَّهَا عَلَىٰ أَدْبَارِهَا أَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّا أَصْحَابَ السَّبْتِ ۚ وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ مَفْعُولًا ﴿٤٧﴾ إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَن يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَن يَشَاءُ ۚ وَمَن يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدِ افْتَرَىٰ إِثْمًا عَظِيمًا ﴿٤٨﴾ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يُزَكُّونَ أَنفُسَهُم ۚ بَلِ اللَّهُ يُزَكِّي مَن يَشَاءُ وَلَا يُظْلَمُونَ فَتِيلًا ﴿٤٩﴾ انظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ ۖ وَكَفَىٰ بِهِ إِثْمًا مُّبِينًا ﴿٥٠﴾ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يُؤْمِنُونَ بِالْجِبْتِ

ع ۷ / ۴

وَالطَّاغُوتِ وَيَقُولُونَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا هَٰؤُلَاءِ أَهْدَىٰ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا سَبِيلًا ﴿٥١﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ ۖ وَمَن يَلْعَنِ اللَّهُ فَلَن تَجِدَ لَهُ نَصِيرًا ﴿٥٢﴾ أَمْ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّنَ الْمُلْكِ فَإِذًا لَّا يُؤْتُونَ النَّاسَ نَقِيرًا ﴿٥٣﴾ أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَىٰ مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ ۖ فَقَدْ آتَيْنَا آلَ إِبْرَاهِيمَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَآتَيْنَاهُم مُّلْكًا عَظِيمًا ﴿٥٤﴾ فَمِنْهُم مَّنْ آمَنَ بِهِ وَمِنْهُم مَّن صَدَّ عَنْهُ ۚ وَكَفَىٰ بِجَهَنَّمَ سَعِيرًا ﴿٥٥﴾ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا سَوْفَ نُصْلِيهِمْ نَارًا كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُم بَدَّلْنَاهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَزِيزًا حَكِيمًا ﴿٥٦﴾ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۖ لَّهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۖ وَنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيلًا ﴿٥٧﴾

الربع

ترجمۂ آیات ۴۴-۵۷

کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو کتاب الٰہی کا ایک حصہ ملا۔ وہ گمراہی کو ترجیح دیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تم بھی راہ کھو بیٹھو! اللہ تمھارے دشمنوں سے خوب واقف ہے اور اللہ کافی ہے حمایت کے لیے اور اللہ کافی ہے مدد کے لیے۔ ۴۵

یہودیوں سے ایک گروہ زبان کو توڑ مروڑ کر اور دین پر طعن کرتے ہوئے الفاظ کو ان کے موقع و محل سے ہٹا دیتا ہے اور "سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا" "اسمع غیر مسمع" اور "رَاعِنَا" کہتا ہے اور اگر وہ "سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا" "اسمع" اور "انظرنا" کہتے تو یہ

ان کے حق میں بہتر ہوتا اور بات برمحل ہوتی لیکن اللہ نے ان کے کفر کے سبب سے ان پر لعنت کر دی ہے اس وجہ سے وہ شاذ ہی ایمان لائیں گے۔ ۴۶

اے وہ لوگو جن کو کتاب دی گئی اس چیز پر ایمان لاؤ جو ہم نے اتاری ہے، مصداق اُن پیشین گوئیوں کی جو خود تمھارے پاس موجود ہیں، قبل اس کے کہ ہم چہروں کو بگاڑ دیں اور ان کو ان کے پیچھے کی جانب اُلٹ دیں یا ان پر بھی اسی طرح لعنت کر دیں جس طرح ہم نے سبت والوں پر لعنت کر دی اور خدا کی بات شدنی ہے۔ ۴۷

اللہ اس بات کو نہیں بخشے گا کہ اس کا شریک ٹھہرایا جائے۔ اس کے سوا جو کچھ ہے اس کو جس کے لیے چاہے گا بخش دے گا اور جو اللہ کا شریک ٹھہراتا ہے وہ ایک بہت بڑے گناہ کا افترا کرتا ہے۔ ذرا ان کو تو دیکھو جو اپنے آپ کو بڑا پاکیزہ ٹھہراتے ہیں! بلکہ اللہ ہی ہے جو پاک کرتا ہے جس کو چاہتا ہے، اور ان پر ذرا بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ دیکھو، یہ اللہ پر کیسا جھوٹ باندھ رہے ہیں اور صریح گناہ ہونے کے لیے تو یہی کافی ہے۔ ۴۸-۵۰

ذرا ان کو دیکھو جنھیں کتاب الٰہی کا ایک حصہ ملا۔ یہ جبت اور طاغوت پر عقیدہ رکھتے ہیں اور کافروں کے متعلق کہتے ہیں کہ ایمان والوں سے زیادہ ہدایت پر تو یہ ہیں۔ یہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کر دی ہے اور جن پر اللہ لعنت کر دے تو تم ان کا کوئی مددگار نہیں پا سکتے۔ کیا خدا کے اقتدار میں کچھ اُن کا بھی دخل ہے کہ یہ لوگوں کو کچھ بھی دینے کو تیار نہیں؟ کیا یہ لوگوں پر حسد کر رہے ہیں، اس فضل پر جو اللہ نے اُن کو بخشا؟ تو ہم نے تو بخش دی آلِ ابراہیم کو کتاب و حکمت اور ہم نے ان کو ایک

عظیم سلطنت بھی بخشی۔ ۵۱-۵۴

پس ان میں سے ایسے بھی ہیں جو اس پر ایمان لائے اور ایسے بھی ہیں جنھوں نے اس سے منہ موڑا۔ ایسوں کے لیے جہنم کی بھڑکتی آگ ہی کافی ہے۔ جن لوگوں نے ہماری آیتوں کا انکار کیا ہم ان کو ایک سخت آگ میں جھونک دیں گے۔ جب جب ان کی کھالیں پک جائیں گی ہم ان کو دوسری کھالیں بدل دیں گے تاکہ یہ عذاب کا مزا خوب چکھیں۔ بے شک اللہ عزیز و حکیم ہے۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے اچھے عمل کیے ہم ان کو ایسے باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، اس میں ہمیشہ رہیں گے، اس میں ان کے لیے پاک بیویاں ہوں گی اور ہم ان کو گھنی چھاؤں میں رکھیں گے۔ ۵۵-۵۷

۲۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَلَمْ تَرَاِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَةَ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا السَّبِيْلَ ۝ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَآئِكُمْ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا ۡوَّكَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيْرًا (۴۴-۴۵)

قرآن اور دوسرے آسمانی صحیفوں میں نسبت جزو اور کل کی ہے

اَلَمْ تَرَ کا خطاب، جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں لکھ چکے ہیں، عموماً جمع اور اظہارِ تعجب و افسوس کے لیے آتا ہے۔ یہاں خطاب مسلمانوں سے ہے اور اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ سے مراد یہود ہیں۔ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ پچھلے آسمانی صحیفوں اور قرآن عظیم میں نسبت جزو اور کل کی ہے۔ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی کامل کتاب ہے، دوسرے آسمانی صحیفے اس کے اجزا و حصص کی حیثیت رکھتے ہیں، اس وجہ سے جو لوگ اس کتاب کامل کے اجزا و حصص کے حامل بنائے گئے تھے ان سے سب سے زیادہ توقع اس بات کی ہو سکتی تھی کہ جب یہ کتاب کامل ان کے پاس آئے گی تو وہ اس کا آگے بڑھ کر خیر مقدم کریں گے لیکن ان کا عجیب حال ہے کہ وہ اس ہدایت پر گمراہی کو ترجیح دیتے ہیں اور اس کو قبول کرنا تو الگ رہا، دل و جان سے ان کی کوشش یہ ہے کہ تم بھی اس پائی ہوئی صراط مستقیم کو کھو بیٹھو۔ اوپر آیت ۲۷ میں یہ اشارہ گزر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ تو اس کتاب کے ذریعے سے پچھلے انبیاء و صالحین

کے طریقوں کی طرف رہنمائی فرما رہا ہے لیکن خواہشات نفس کے پیرو یہ کوشش کر رہے ہے کہ تم راہ حق سے بالکل ہی دور ہٹ جاؤ۔ اب یہ اسی اشارے کی تفصیلات آ رہی ہیں۔

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَآئِكُمْ الآیۃ: مسلمانوں کے لیے تسکین و تسلی کا جملہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ان دشمنوں سے بے خبر نہیں ہے۔ ان سے اور ان کی چالوں اور شرارتوں سے خوب واقف ہے، وہ ان کی ہر شرارت کو ناکام بنا دے گا۔ جس کا حامی و ناصر اللہ ہو اس کے لیے اللہ کی حمایت و نصرت کافی ہے۔ پس اپنی راہ پر آگے بڑھے چلو اور اللہ کی کارسازی اور مدد پر بھروسہ رکھو۔

مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِي الدِّيْنِ ۭ وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَقْوَمَ ۙ وَلٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا (۴۶)

یہود کی ایک شرارت

اس آیت کے تمام الفاظ سورۂ بقرہ کی تفسیر میں زیر بحث آ چکے ہیں۔ یہ ان شرارتوں کی طرف اجمالاً اشارہ ہے جو یہودی اشرار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں کی نگاہوں سے گرانے اور اسلام کو بے وزن اور حقیر بنانے کے لیے کرتے تھے۔

اچھے مجلسی الفاظ کا استعمال طنز کے طور پر

'سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا'، 'اِسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ'، اور 'رَاعِنَا' وغیرہ الفاظ، جیسا کہ ہم سورۂ بقرہ کی تفسیر میں واضح کر چکے ہیں، عرب کے مجلسی الفاظ میں سے تھے جو متکلم کی تحسین و قدر افزائی، سامع کے اظہار ذوق و شوق اور مخاطب کے اعتراف و قبول پر دلیل ہوتے تھے۔ جس طرح ہمارے ہاں کہتے ہیں۔ بجا ارشاد ہے۔ سر تسلیم خم ہے۔ سنیے، کیا خوب بات فرمائی ہے۔ نادر نکتہ ہے۔ مکرر ارشاد ہو۔ پھر فرمائیے۔ اسی طرح عرب میں بھی مذکورہ الفاظ و کلمات رائج تھے۔ یہ الفاظ اصلاً تو اظہار تحسین یا اعتراف و قبول کے لیے ہیں لیکن اگر کوئی گروہ شرارت اور بدتمیزی کرنا چاہے تو ذرا زبان کو توڑ مروڑ کر، تلفظ کو بگاڑ کر، یا لب و لہجہ میں ذرا مصنوعی انداز پیدا کر کے بڑی آسانی سے تحسین کو تقبیح اور اعتراف و اقرار کو طنز و استہزا بنا سکتا ہے۔ اس سے متکلم کے وقار کو کوئی نقصان پہنچے یا نہ پہنچے لیکن شرارت پسند اشخاص اس طرح اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کی کوشش کر کے خوش ہو جاتے ہیں۔ اب ان الفاظ کو کسی قدر وضاحت کے ساتھ سمجھ لیجیے۔

'سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا' کا مفہوم

'سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا' کے لفظی معنی ہیں، ہم نے سنا اور اطاعت کی۔ اہل عرب یہ اس موقع پر بولتے تھے جب اپنے کسی بڑے، کسی سردار، کسی بادشاہ کے حکم و ارشاد پر اپنی طرف سے امتثال امر کے لیے آمادگی اور مستعدی کا اظہار کرنا چاہتے۔ عربی میں اس کے لیے 'طَاعَة' کا لفظ بھی ہے جو قرآن میں بھی استعمال ہوا ہے۔ یہودی اشرار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجالس میں جاتے تو اپنی سعادت مندی اور وفاداری کی نمائش کے لیے 'سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا' تو بات بات پر کہتے لیکن لب و لہجہ کے تصرف سے اس کو ادا اس طرح کرتے کہ 'اَطَعْنَا' کو 'عَصَيْنَا' بنا لیتے۔ چونکہ دونوں کے حروف ہم آہنگ اور قریب المخرج ہیں اس وجہ سے اس تحریف

میں ان کو کامیابی ہو جاتی۔ اس طرح وہ تسلیم و اطاعت کے جملہ کو نافرمانی و سرکشی کے قالب میں ڈھال دیتے اور سمجھنے والے ان کی اس شرارت پر کوئی گرفت بھی نہ کر سکتے اس لیے کہ وہ بڑی آسانی سے یہ بہانہ بنا سکتے تھے کہ ہم نے سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا کہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں شریف اور خوددار آدمی بات کو سُن اور سمجھ کر بھی خاموشی سے ٹال دینے ہی کو بہتر خیال کرتا ہے۔

'اِسْمَعْ غَیْرَ مُسْمَعٍ' کا مفہوم

'اِسْمَعْ غَیْرَ مُسْمَعٍ' کے لفظی معنی ہیں، سُنو وہ بات جو پہلے سنائی نہیں گئی۔ اس فقرے کا اچھا محل یہ ہے کہ مجلس میں متکلم یا خطیب کی کوئی حکیمانہ بات سُن کر ایک سامع دوسرے سامع کو متوجہ کرے کہ یہ دانشمندانہ اور حکیمانہ بات سُنیے، یہ بات پہلی بار ہمارے کانوں نے سُنی ہے، اس سے پہلے یہ بات کبھی ہم نے نہیں سنی۔ ظاہر ہے کہ یہ بات نہ صرف متکلم اور خطیب کی قدر دانی کی دلیل ہے بلکہ دوسروں کو اس کی قدردانی کے لیے تشویق و ترغیب بھی ہے لیکن کوئی شخص ہوٹنگ (HOOTING) کے انداز میں یا انداز تمسخر یہی بات کہے تو اس کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ 'ذرا اس کی ناشنیدنی سنو، یہ کیسی بے پرکی اُڑا رہا ہے، ایسی بات کاہے کو کبھی کسی نے سنی ہو گی!' ظاہر ہے کہ محض انداز اور لب و لہجہ کی تبدیلی نے اس نہایت اعلیٰ فقرے کو طعن و طنز کا ایک زہر آلود نشتر بنا دیا لیکن اس پر بھی کوئی گرفت نہیں ہو سکتی اس لیے کہ گرفت ہو تو کہنے والا صفائی پیش کر سکتا ہے کہ میں نے تو طنز کے طور پر نہیں بلکہ تحسین کے طور پر کہا ہے۔ چونکہ اس فقرے میں طنز کا پہلو 'غَیْرَ مُسْمَعٍ' کے الفاظ سے پیدا ہوتا تھا اس لیے قرآن نے اس کی یہ نوک توڑ دی اور ہدایت کی کہ صرف 'اسمع' کہا جائے۔

'رَاعِنَا' کا مفہوم

'رَاعِنَا' کے لفظی معنی ہیں، ذرا ہماری رعایت فرمائیے۔ اس لفظ کا اچھا محل استعمال یہ ہے کہ اگر مخاطب نے متکلم کی بات اچھی طرح سنی یا سمجھی نہ ہو یا بات ایسی لطیف اور حکیمانہ ہو کہ خود متکلم کی زبان سے اس کو مکرر سُننا چاہے تو اس کو دوبارہ متوجہ کرنے کے لیے جس طرح ہمارے ہاں کہتے ہیں، پھر ارشاد ہو، پھر فرمائیے، اسی طرح عربی میں 'رَاعِنَا' کہتے ہیں۔ یہ لفظ سامع کے ذوق و شوق اور اُس کی رغبت علم کی دلیل ہے۔ لیکن یہودی اشرار 'لَیّ لسان' یعنی زبان کے توڑ مروڑ کے ذریعہ سے اس کو بھی طنز کے قالب میں ڈھال لیتے تھے۔ اس کی شکل یہ ہوتی کہ 'رَاعِنَا' میں 'ع' کے کسرہ کو ذرا دبا دیجیے تو یہ لفظ 'رَاعِیْنَا' بن جائے گا اور اس کے معنی ہوں گے 'ہمارا چرواہا'۔ قرآن نے یہود کی اس شرارت کی وجہ سے اس لفظ کو سرے سے مسلمانوں کے مجلسی الفاظ ہی سے خارج کر دیا اور اس کی جگہ 'اُنْظُرْنَا' کے استعمال کی ہدایت فرمائی جس کے معنی ہیں ذرا ہمیں مُہلت عنایت ہو، ذرا پھر توجہ فرمائیے۔ یعنی مفہوم کے لحاظ سے یہ ٹھیک ٹھیک 'رَاعِنَا' کا قائم مقام ہے اور اس میں لہجہ کے بگاڑ سے کسی بگاڑ کے پیدا کیے جانے کا کوئی موقع نہیں ہے۔[1]

---

[1] اس لفظ پر آیت ۱۰۴ کے تحت سورۂ بقرہ کی تفسیر میں ہم نے جو کچھ لکھا ہے ایک نظر اس پر بھی ڈال لیجیے۔ وہاں ہم نے اس مجلسی اصلاح کے فوائد پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

آخر میں فرمایا کہ حاملِ کتاب گروہ ہو کر یہ جسارت اور بدتمیزی جو آخری پیغمبر کے ساتھ یہ لوگ کر رہے ہیں، یہ یونہی نہیں ہے بلکہ یہ اللہ کی لعنت کا نتیجہ ہے جو ان کے کفر کے سبب سے ان پر ہوئی ہے۔ خدا نے ان کو اپنے دروازے سے دھتکار دیا ہے۔ اب مشکل ہی سے ان میں سے کچھ لوگوں کو ایمان کی دولت نصیب ہو گی۔

نبی پر طعن خود دین پر طعن ہے

اس آیت میں ایک اور نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے۔ وہ یہ کہ یہود کی یہ تمام شرارتیں تھیں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر طنز کی نوعیت کی لیکن قرآن نے ان کو طَعْنًا فِی الدِّیْنِ کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے جس سے اس حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ نبی درحقیقت مجسمۂ دین اور مظہرِ شریعت ہوتا ہے اس وجہ سے اس پر طعن خود دین پر طعن ہے۔ اس نکتے پر انشاء اللہ ہم سورۂ حدید کی تفسیر میں بحث کریں گے۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَکُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰٓی اَدْبَارِهَآ اَوْ نَلْعَنَهُمْ کَمَا لَعَنَّآ اَصْحٰبَ السَّبْتِ ؕ وَکَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا (۴۷)

چہروں کو مسخ کر دینے کی علت

'طمس الشئ' کے معنی ہیں کسی شے کے آثار و علامات کو مٹا دینا۔ چہروں کو مٹا دینے کے معنی یہ ہیں کہ یہ جو آنکھ، کان، ناک اور منہ کے نشانات ہیں یہ سب مٹا کر برابر کر دیے جائیں اس لیے کہ اللہ نے یہ قوتیں نہایت اعلیٰ مقصد سے بخشی تھیں لیکن جب ان سے وہ کام نہیں لیا گیا جس کے لیے یہ عطا ہوئی تھیں بلکہ اس کے بالکل برعکس یہ سب چیزیں ٹھوکر کھانے کے گڑھے بن کر رہ گئی ہیں تو آخر یہ گڑھے کیوں باقی رکھے جائیں؟ یہ بھر کیوں نہ دیے جائیں؟ یہ ملحوظ رہے کہ سورۂ بقرہ میں ان لوگوں کو صُمٌّ، بُکْمٌ، عُمْیٌ کہا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب سب کچھ رکھتے ہوئے یہ گونگے، بہرے اور اندھے بن چکے ہیں تو یہ اسی کے سزاوار ہیں کہ یہ نشانات بھی مٹا ہی دیے جائیں۔

'وُجُوْهًا' کے نکرہ لانے کی بلاغت

'وُجُوْهًا' کی تنکیر میں بھی بڑی بلاغت ہے۔ یہ تنکیر نفرت و کراہت کے اظہار کے لیے ہے۔ اوپر والی آیت میں ان پر لعنت کا ذکر ہو چکا ہے۔ اس تنکیر سے اس امر کا اظہار مقصود ہے کہ یہ ملعون چہرے اس درجہ قابلِ نفرت ہیں کہ متکلم تعین کے ساتھ ان کی طرف اشارہ کرنا بھی پسند نہیں کرتا۔ چنانچہ 'وُجُوْهَهُمْ' نہیں کہا بلکہ ان سے منہ پھیر کر 'وُجُوْهًا' کہا۔ اس قسم کی تنکیر اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا (۲۴ محمد) میں لفظ 'قُلُوْبٍ' میں بھی ہے۔ اس کی بلاغت پر ہم اس کے محل میں انشاء اللہ بحث کریں گے۔

'فَنَرُدَّهَا عَلٰٓی اَدْبَارِهَا' کا مفہوم

'فَنَرُدَّهَا عَلٰٓی اَدْبَارِهَا' اسی اوپر والی بات کی تفصیل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب ان کے چہرے اور گدی میں کوئی فرق ہی نہیں، جس طرح پیچھے کا حصہ سپاٹ ہے اسی طرح عملاً آگے کا حصہ بھی سپاٹ ہی ہے تو یہ آگے کا حصہ بھی پیچھے ہی کی طرف کیوں نہ موڑ دیا جائے۔

'اَصْحٰبَ السَّبْتِ' پر لعنت کی وجہ اور اس کے اثرات پر بقرہ کی آیات ۶۵-۶۶ کے تحت مفصل بحث گزر چکی ہے۔

یہود کو آخری دھمکی

یہ آیت یہود کے لیے دعوت کی نہیں بلکہ تہدید و وعید کی آیت ہے۔ دعوت کا ذکر اس میں محض اتمامِ حجت کے طور پر ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اب یہ آخری موقع ہے کہ تم سنبھلنا چاہو تو سنبھل جاؤ۔ یہ موقع نکل گیا تو پھر

یہ کبھی میسر نہ آئے گا بہتر ہے کہ اس کتاب پر ایمان لاؤ جو تمھاری اپنی کتاب کی پیشین گوئیوں کی تصدیق کرتی ہوئی اتری ہے۔ ورنہ یاد رکھو کہ اب تمھارے لیے وہ وقت آ پہنچا ہے کہ تمھارے چہرے بگاڑ دیے جائیں یا تمھارے اوپر بھی اسی طرح کی لعنت کر دی جائے جس طرح کی لعنت سبت والوں پر کر دی گئی کہ وہ ذلیل بندر ہو کر رہ گئے۔

وہ لعنت جس کے یہود مستحق تھے

رحمت کی طرح لعنت اور نقمت کے بھی مختلف مدارج ہوتے ہیں۔ یہاں ان کو جس درجے کی لعنت کی دھمکی دی گئی ہے یہ وہ لعنت ہے جس کے فی الواقع وہ اپنی شرارتوں کی وجہ سے مستحق بن چکے تھے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے اس سے کم درجے کی لعنت ان پر کی تو یہ ان کو گویا تھوڑی سی مہلت دی گئی اور ہر مہلت جو کسی قوم کو ملتی ہے اگر وہ اس کی قدر نہیں کرتی تو یہ اس کے اخروی عذاب میں زیادتی کا باعث ہوتی ہے۔

عمل اور سزا میں مشابہت

یہ آیت تلاوت کرتے ہوئے مجھے بار بار یہ خیال ہوتا ہے کہ چہروں کو بگاڑ دینے کی دھمکی جو ان کو دی گئی اس میں عمل اور سزا کی مشابہت پائی جاتی ہے۔ اوپر والی آیت میں ان کی یہ حرکت جو بیان ہوئی ہے کہ پیغمبر کا مذاق اڑانے کے لیے منہ بنا بنا کر اور لہجے بگاڑ بگاڑ کر الفاظ کو کچھ سے کچھ کر دیتے ہیں اور اس منہ بنانے اور الفاظ کے بگاڑنے کو انھوں نے ہنر سمجھ رکھا ہے اس کی بنا پر وہ مستحق ہوئے کہ واقعی ان کے چہرے مسخ ہی کر دیے جائیں۔ علیٰ ہذا القیاس جنھوں نے حق سے منہ موڑنے ہی کو شیوہ بنا لیا ہے تو وہ سزاوار ہیں کہ ان کے چہرے پیچھے ہی کی طرف الٹ دیے جائیں۔

'وَکَانَ اَمْرُ اللّٰہِ مَفْعُوْلًا' میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ آدمیوں کے چہروں کو گدیوں کی طرح سپاٹ کر دینا، ان کو الٹ دینا یا ان کو مسخ کر کے بندروں کی شکل کا کر دینا خدا کے لیے کوئی مشکل کام ہے۔ اس کے کسی حکم اور اس کے وقوع میں کوئی فاصلہ نہیں ہے۔ ادھر حکم ہوا ادھر اس کا نتیجہ موجود۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ ۚ وَمَنْ یُّشْرِکْ بِاللّٰہِ فَقَدِ افْتَرٰٓی اِثْمًا عَظِیْمًا ۝ اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ یُزَکُّوْنَ اَنْفُسَھُمْ ۭ بَلِ اللّٰہُ یُزَکِّیْ مَنْ یَّشَآءُ وَلَا یُظْلَمُوْنَ فَتِیْلًا ۝ اُنْظُرْ کَیْفَ یَفْتَرُوْنَ عَلَی اللّٰہِ الْکَذِبَ ۭ وَکَفٰی بِہٖٓ اِثْمًا مُّبِیْنًا ۝ اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْکِتٰبِ یُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَیَقُوْلُوْنَ لِلَّذِیْنَ کَفَرُوْا ھٰٓؤُلَآءِ اَھْدٰی مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سَبِیْلًا ۝ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ لَعَنَھُمُ اللّٰہُ ۭ وَمَنْ یَّلْعَنِ اللّٰہُ فَلَنْ تَجِدَ لَہٗ نَصِیْرًا (۴۸-۵۲)

جبت اور طاغوت کا مفہوم

جبت سے مراد اعمال سفلیہ، مثلاً سحر، شعبدہ، ٹونے ٹوٹکے، رمل جفر، فال گیری، نجوم، آگ پر چلنا اور اس قسم کی دوسری خرافات ہیں۔ ہاتھ کی لکیروں کا علم بھی اسی میں شامل ہے۔

سورۂ بقرہ کی تفسیر میں آیات ۲۸۶-۲۸۸ کے تحت ہم تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں کہ یہود اپنے دورِ زوال میں کتاب الٰہی کو پس پشت ڈال کر بس انھی چیزوں کے ہو کر رہ گئے تھے۔ ان کے انبیاء نے نہایت درد انگیز الفاظ میں ان کی اس حالت پر نوحہ کیا ہے۔ اس سے متعلق ضروری حوالے وہاں نقل ہوئے ہیں۔ یہاں اعادے میں طوالت ہو گی۔

'طاغوت'، پر تفصیلی بحث بقرہ کی آیت ۲۵۶ کے تحت گزر چکی ہے۔

دین کی بنیاد توحید پر ہے

دین کی بنیاد توحید پر ہے۔ یہ صرف عقیدوں میں سے ایک عقیدہ ہی نہیں ہے بلکہ سارے دین کے قیام و بقا کا انحصار اسی پر ہے۔ جو لوگ ہر پہلو سے اس کی حفاظت کرتے ہیں وہی اپنی دوسری کوتاہیوں کے باوجود اپنے اصل دین کی حفاظت کرتے ہیں۔ برعکس اس کے جو لوگ توحید میں رخنہ پیدا کر دیتے ہیں وہ اصل دین کو ہدم کر دیتے ہیں۔ چنانچہ ان کے دوسرے کام بھی، جو بظاہر دینداری کے ہوں، بالکل بے سود ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ شرک کو معاف نہیں فرمائے گا لیکن دوسرے گناہوں کو جن کے لیے چاہے گا معاف فرمادے گا۔ "جن کے لیے چاہے گا" کی قید اس بات کی دلیل ہے کہ دوسرے گناہوں کے معاملے میں بھی کسی کو دلیر نہیں ہونا چاہیے اس لیے کہ ان کی معافی بھی اللہ ہی کی مشیت پر منحصر ہے۔ اس کی مشیت میں نہ تو کسی دوسرے کو کوئی دخل ہے، نہ اس کی کوئی مشیت حکمت سے خالی ہے۔ علاوہ ازیں گناہوں کے معاملے میں یہ دلیری اور ڈھٹائی بجائے خود بھی شرک کی ایک قسم ہے۔

شرک کو اللہ تعالیٰ معاف نہیں فرمائے گا

یہ تمہید اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے بیان ہوئی ہے کہ یہود جو لعنت کے مستحق قرار پائے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ حامل کتاب ہوتے ہوئے انھوں نے دین کی جو بنیاد ہے وہی اکھاڑ دی ہے اور اس کی جگہ انھوں نے شرک کو اختیار کر لیا ہے۔ 'شرک' اللہ پر ایک افترائے عظیم ہے جس کو اللہ تعالیٰ کبھی معاف فرمانے والا نہیں ہے۔ شرک کو افترا کہنے کی وجہ ہم دوسری جگہ واضح کر چکے ہیں کہ شرک کرنے والے اپنی تمام مشرکانہ حرکات کو دین کی سند دینے کے لیے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان باتوں کا حکم ان کو اللہ تعالیٰ نے دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ پر صریح تہمت ہے۔ اور اگر کوئی گروہ جو اللہ کے دین کی گواہی دینے پر مامور ہو، وہ خدا پر تہمت باندھنے کا پیشہ اختیار کر لے تو وہ لعنت کے سوا اور کس چیز کا مستحق ہو سکتا ہے!

اس تمہید کے بعد یہاں ان کے تین قسم کے شرک گنائے ہیں۔

یہود کے شرک کا ذاتی و اعلیٰ عقائد

ایک یہ کہ یہ اپنے آپ کو ایک برتر اور برگزیدہ گروہ سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ یہ اللہ کے محبوبوں کی اولاد اور خود خدا کے محبوب اور چہیتے ہیں اس وجہ سے ان کے لیے خدا کے ہاں کوئی بازپرس یا سزا نہیں ہے۔ ان کے اعمال و اخلاق خواہ کچھ ہوں، اول تو یہ دوزخ میں ڈالے ہی نہیں جائیں گے، اگر ڈالے بھی گئے تو محض تھوڑی مدت کے لیے۔ اس گھمنڈ نے ان کو عمل اور اطاعت کی ذمہ داریوں سے بالکل فارغ کر دیا ہے اور انھوں نے اپنے آپ کو بندگی کے دائرے سے نکال کر الوہیت کے زمرے میں داخل کر لیا ہے حالانکہ کہیں بھی اللہ نے ان کو برگزیدگی کی یہ سند عطا نہیں فرمائی ہے۔ جس کسی کو بزرگی عطا ہوتی ہے وہ خدا ہی کی طرف سے ہوتی ہے اور خدا نے اس چیز کو ایمان و عمل اور نیکی و تقویٰ سے وابستہ کیا ہے نہ کہ نسل و نسب سے۔ ہر شخص جو کرے گا وہ بھرے گا۔ اللہ ان کے ساتھ ذرہ برابر بھی ناانصافی کرنے والا نہیں۔ اپنی برتری کا یہ عقیدہ جو انھوں نے گھڑا ہے، یہ ان کا اپنا طبع زاد ہے۔ اس کو خدا سے جو وہ منسوب کرتے ہیں تو یہ خدا

پر جھوٹا افترا ہے اور ان کے مجرم ہونے کے لیے، دوسرے جرائم سے قطع نظر، یہی جرم کافی ہے۔

اعمالِ سفلیہ اور ارواحِ خبیثہ

دوسرا یہ کہ حاملِ کتاب ہوتے ہوئے یہ جبت اور طاغوت پر عقیدہ رکھتے اور اعمالِ سفلیہ کے قائل اور ان پر عامل ہیں۔ اعمالِ سفلیہ کے متعلق یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ان کا تعلق بیشتر شیطانی قوتوں اور ارواحِ خبیثہ سے ہوتا ہے۔ انھی کو یہاں طاغوت کہا گیا ہے۔ جو لوگ ان اعمال کے درپے ہوتے ہیں اوّل تو وہ ارواحِ خبیثہ کو بالذات مؤثر مانتے ہیں پھر ان سے تعلق پیدا کرنے اور ان کو اپنے مقاصد میں استعمال کرنے کے لیے ان کو نہ صرف خلافِ شرع بلکہ صریح مشرکانہ اعمال کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے جس سے عقیدہ اور عمل دونوں یک قلم تباہ ہو کے رہ جاتے ہیں۔ تفسیر سورۂ بقرہ میں اس پر جو کچھ لکھا جا چکا ہے اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

تیسرا یہ کہ یہ لوگ اہلِ ایمان کے مقابل میں کفار و مشرکین کی حمایت کرتے اور ان کو مسلمانوں سے زیادہ حق و ہدایت پر سمجھتے ہیں۔ یہ بات سورۂ بقرہ اور آلِ عمران میں بھی گزر چکی ہے۔

اہلِ ایمان کے بالمقابل مشرکین کی حمایت

یہود اسلام کی مخالفت میں اتنے اندھے ہو گئے تھے کہ کھلم کھلا مشرکینِ مکہ کو مسلمانوں پر ترجیح دیتے تھے اور اپنی اس مخالفت کے لیے آڑ اسلام کی ان تعلیمات اور رخصتوں کو بناتے تھے جو ان کی بدعات یا ان کی شریعت کے تشددات کے خلاف تھیں۔ مثلاً حدث اور جنابت کی حالت میں، اسلام نے پانی میسر نہ آنے کی صورت میں، تیمم کی اجازت دی تو اس کو بھی انھوں نے فتنہ انگیزی کا ذریعہ بنا لیا اور یہ کہنا شروع کر دیا کہ بھلا جو مذہب جنابت کی حالت میں زمین پر ہاتھ مار کر نماز تک پڑھ لینے کی اجازت دیتا ہو وہ بھی کوئی خدائی مذہب ہو سکتا ہے، ان سے زیادہ اچھا مذہب تو ان بت پرستوں کا ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ طہارت کے باب میں یہود کے فقہا نے اتنے تشددات پیدا کر لیے تھے کہ آدمی حالتِ جنابت میں بالکل ہی اچھوت بن کے رہ جاتا تھا۔ جنابت تو درکنار انجیل سے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہودی فقہا حضرت مسیح کے صحابہ پر اس بات کے لیے بھی معترض ہوتے تھے کہ یہ لوگ بعض اوقات ہاتھ دھوئے بغیر ہی کھانا کھا لیتے ہیں۔ سیدنا مسیح نے ان کی اسی طرح کی خردہ گیریوں پر ان کو سفیدی پھری ہوئی قبروں سے تشبیہ دی تھی کہ جس طرح قبروں کے اوپر سفیدی پھری ہوئی ہوتی ہے لیکن اندر سڑی گلی ہوئی ہڈیاں ہوتی ہیں اسی طرح یہ لوگ اوپر سے تو بڑے اُجلے اور صاف معلوم ہوتے ہیں لیکن ان کے اندر لوٹ کا مال بھرا ہوا ہے۔ یہود کی یہی ذہنیت مسلمانوں کے خلاف نمایاں ہوئی۔ وہ مشرکین تک کو گوارا کرنے کے لیے تیار تھے نہیں تیار تھے تو مسلمانوں کو گوارا کرنے کے لیے! ظاہر ہے کہ جس طرح حق کی حمایت حق پرستی ہے اسی طرح شرک کی حمایت شرک پرستی ہے۔

اس کے بعد فرمایا کہ یہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے اور جن پر اللہ لعنت کر دے ان کا کوئی مددگار ان کے کچھ کام نہیں آسکتا۔ جس پر خدا کی لعنت ہو جائے خدا کے ہاں سے اس کی جڑ کٹ جاتی ہے اور جس درخت کی جڑ کٹ جائے اسے کوئی لاکھ پانی دے اس کا ہرا ہونا ممکن نہیں۔

اَمۡ لَهُمۡ نَصِيۡبٌ مِّنَ الۡمُلۡكِ فَاِذًا لَّا يُؤۡتُوۡنَ النَّاسَ نَقِيۡرًا ۙ اَمۡ يَحۡسُدُوۡنَ النَّاسَ عَلٰى مَاۤ اٰتٰٮهُمُ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ‌ۚ فَقَدۡ اٰتَيۡنَاۤ اٰلَ اِبۡرٰهِيۡمَ الۡـكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَاٰتَيۡنٰهُمۡ مُّلۡكًا عَظِيۡمًا (۵۳-۵۴)

'ملک' سے مراد یہاں خدائی اقتدار و اختیار ہے اور 'الناس' سے مراد یہاں مسلمان ہیں۔

یہود بنی اسمٰعیل کے حاسد تھے

مطلب یہ ہے کہ کیا خدا کے اقتدار و اختیار میں کچھ ان کی بھی حصہ داری ہے کہ اس کے فضل و انعام میں سے یہ جس کو چاہیں حصہ دیں، جس کو چاہیں محروم کر دیں، چنانچہ اپنے اسی اختیار کی بنا پر وہ مسلمانوں کو خدا کے فضل و کرم سے محروم رکھنا چاہتے ہیں؟ اگر ایسا نہیں ہے۔ اور ظاہر ہے کہ نہیں ہے۔ تو پھر اس تمام لا یعنی فضولی سے کیا حاصل؟ تقدیر الٰہی سے پنجہ آزمائی کر کے کون جیتا ہے جو یہ جیت سکیں گے!

اس کے بعد اصل راز سے پردہ اٹھا دیا ہے کہ یہ سارا طوفان اس حسد کا نتیجہ ہے جو یہ مسلمانوں سے رکھتے ہیں۔ ان کو یہ غم و غصہ ہے کہ نبوت تو ان کے خاندان کا حصہ تھی، یہ ان کے خاندان سے نکل کر بنی اسمٰعیل کے اندر کس طرح چلی گئی؟ انھیں خبر نہیں ہے کہ نبوت اور شریعت اللہ کا فضل ہے، اللہ جس کو چاہے اپنا فضل بخشے۔ اللہ کے بخشے ہوئے فضل پر حسد کرنا اور اس حسد کے بحران میں مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہونا خود اللہ سے لڑنے کے مرادف ہے۔ اگر یہ اللہ سے لڑنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں تو لڑیں، ہم نے تو آل ابراہیم کو کتاب و حکمت بھی بخش دی اور ان کو ایک عظیم سلطنت بھی بخش دی۔ یعنی جو کچھ انھیں کرنا ہے کر لیں، ہم نے تو جو کچھ کرنا تھا کر دیا۔

زبان کا ایک اسلوب

فَقَدۡ اٰتَيۡنَاۤ اٰلَ اِبۡرٰهِيۡمَ الاٰیۃ۔ شرطیہ اور انشائیہ جملوں میں جب اس طرح 'فقد' آتا ہے تو اس سے پہلے کلام میں کچھ حذف ہوتا ہے جس کی تفصیل بعد کے جملہ سے ہوتی ہے۔ یہاں مدعا یہ ہے کہ اگر بنی اسمٰعیل پر حسد کی وجہ سے یہ لوگ اس نبی کی مخالفت کر رہے ہیں تو جتنا حسد کرنا ہے کر لیں، ہم نے تو آلِ ابراہیم کو کتاب و حکمت بھی بخش دی اور ایک عظیم بادشاہی بھی۔

آل ابراہیم سے مراد بنی اسمٰعیل ہیں

'آلِ ابراہیم' اگرچہ عام ہے لیکن یہاں مراد بنی اسمٰعیل ہیں۔ قرینہ اس پر دلیل ہے۔ اس لیے کہ یہ بات بنی اسرائیل کو بطور سرزنش کہی جا رہی ہے۔ اس وجہ سے وہ اس میں شامل نہیں ہو سکتے اور جب وہ شامل نہیں ہو سکتے تو اس کے واحد مصداق صرف بنی اسمٰعیل رہ جاتے ہیں۔ پھر یہاں کتاب و حکمت اور خلافت کے عطا کیے جانے کا ذکر ہے اور یہ عطا کیا جانا بنی اسرائیل پر لعنت کے بعد ہے اس وجہ سے ان کے اس میں شامل ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں تورات سے خود ثابت ہے کہ یہود نے اپنے آپ کو حضرت ابراہیمؑ کے بجائے ہمیشہ حضرت اسحٰقؑ ہی سے منسوب کیا۔ تورات میں ہے کہ "ابراہیمؑ کی اولاد اسحٰقؑ کے نام سے پکاری جائے گی۔" اس کے برعکس اہلِ عرب اپنے آپ کو ہمیشہ حضرت ابراہیمؑ کی طرف منسوب کرتے رہے، اس لیے کہ حضرت ابراہیمؑ نے وہیں قیام کیا، وہیں بیت اللہ کی تعمیر فرمائی اور وہیں اپنے تمام مناسک ادا کیے۔

اس اسلوب بیان سے ایک تو یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ بنی اسرائیل یہ نہ خیال کریں کہ آل ابراہیمؑ والے شرف انھی کو حاصل ہے۔ یہ شرف بنی اسمٰعیل کو بھی حاصل ہے۔ دوسری یہ کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اس وعدے کی طرف اشارہ ہے جو اس نے حضرت ابراہیمؑ سے فرمایا تھا اور جو صریحاً حضرت اسمٰعیلؑ اور ان کی اولاد ہی سے متعلق تھا۔ تورات میں یہ وعدہ یوں مذکور ہے۔

"اور خداوند کے فرشتے نے آسمان سے دوبارہ ابراہام کو پکارا اور کہا کہ خداوند فرماتا ہے کہ چونکہ تو نے یہ کام کیا کہ اپنے بیٹے کو بھی جو تیرا اکلوتا ہے دریغ نہ رکھا اس لیے میں نے بھی اپنی ذات کی قسم کھائی کہ میں تجھے برکت پر برکت دوں گا اور تیری نسل کو بڑھاتے بڑھاتے آسمان کے تاروں اور سمندر کے کنارے کی ریت کے مانند کر دوں گا اور تیری اولاد دشمنوں کے پھاٹک کی مالک ہو گی اور تیری نسل کے وسیلہ سے زمین کی سب قومیں برکت پائیں گی کہ تو نے میری بات مانی" کتاب پیدائش باب ۲۲

تورات کے اس بیان سے صاف واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ وعدۂ برکت حضرت ابراہیمؑ سے اس وقت فرمایا ہے جب انھوں نے اپنے اکلوتے بیٹے ــ حضرت اسمٰعیل ــ کی قربانی کے امتحان میں کامیابی حاصل کی ہے۔ اس وجہ سے لازماً یہ وعدہ حضرت اسمٰعیلؑ اور انہی کی نسل سے متعلق ہو سکتا ہے۔

بنی اسمٰعیلؑ کے لیے اللہ تعالیٰ کے تین وعدے

اس وعدے میں تین باتوں کا ذکر ہے۔

ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ ان کو ایک عظیم امت بنائے گا۔

دوسری یہ کہ ان کو عظیم فتوحات حاصل ہوں گی اور دشمنوں کے پھاٹکوں پر ان کا قبضہ ہو گا۔

تیسری یہ کہ اس نسل کے وسیلہ سے زمین کی سب قومیں برکت پائیں گی۔

یہ تینوں وعدے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پورے ہوئے۔ آپؐ کی بعثت سے ایک عظیم امت ظہور میں آئی، یہ امت دشمنوں کے پھاٹکوں کی مالک بنی، اور آپؐ کی دعوت سے تمام عالم انسانی کو دین و شریعت کی برکت نصیب ہوئی۔

وعدے کا ذکر بشکل واقعہ

اسی وعدے کا عملی ظہور ہے جس کی طرف آیت زیر بحث میں اشارہ ہے۔ اگرچہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی ہے اس وقت تک یہ وعدہ مکمل طور پر ظاہر نہیں ہوا تھا لیکن اس کے پورے ہونے کے لیے فیصلۂ الٰہی صادر ہو چکا تھا اس وجہ سے اس کو تعبیر اس طرح فرمایا ہے کہ گویا یہ عملاً پورا ہو چکا ہے۔ اس اسلوب بیان کی قرآن مجید میں متعدد مثالیں ہیں۔ ہم ایک مثال یہاں پیش کرتے ہیں۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا	اور یاد کرو جب کہ موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا اے
نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ	میری قوم کے لوگو، اپنے اوپر اللہ کے فضل کو یاد
اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖ وَّاٰتٰىكُمْ	کرو کہ اس نے تم میں انبیا اٹھائے، تمھیں بادشاہ بنایا
مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ يٰقَوْمِ	اور تمھیں وہ کچھ بخشا جو دنیا والوں میں سے کسی کو نہیں

ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِیْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰۤى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِیْنَ (۲۰-۲۱ مائدہ)

بخشا۔ اے میری قوم کے لوگو، اس ارض مقدس میں داخل ہو جاؤ جو اللہ نے تمھارے لیے لکھ دی ہے اور پیچھے نہ پلٹو کہ نامراد ہو جاؤ۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ تقریر قوم کے سامنے اس وقت فرمائی ہے جب وہ اس کو ارض مقدس پر حملہ کرنے کی دعوت دے رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس وقت تک ان باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی ظہور میں نہیں آئی تھی لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں ان باتوں کا فیصلہ ہو چکا تھا اور اس نے حضرت موسیٰ کو اس فیصلے سے آگاہ بھی فرما دیا تھا اس وجہ سے حضرت موسیٰ نے ان کا ذکر اس طرح فرمایا ہے گویا یہ وعدے پورے ہو چکے ہیں۔

حکومت کتاب و حکمت کے ثمرات میں سے ہے

اس آیت سے ایک لطیف نکتہ یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ سلطنت و خلافت کتاب و حکمت کے ثمرات و نتائج میں سے ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کو کتاب و حکمت کی نعمت عطا فرماتا ہے اور وہ قوم سچی شکر گزاری کے ساتھ اس کو قبول بھی کر لیتی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کو امامت و خلافت کا منصب بھی سونپ دیا گیا۔ یہ مضمون بیان تو قرآن مجید میں کئی جگہ ہوا ہے لیکن یہاں خاص اہتمام سے بیان ہوا ہے۔ جو لوگ عربی زبان کا ذوق رکھتے ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہاں اٰتَیْنَا کے فعل کے اعادے میں بڑی بلاغت ہے۔ یہود کا سارا حسد تو اسی وجہ سے تھا کہ وہ جانتے تھے کہ اس قرآن کے ساتھ اس زمین کی بادشاہی بھی بندھی ہوئی ہے چنانچہ ان کے اسی حسد پر کاری ضرب لگانے کے لیے فرمایا کہ ہم نے نہ صرف کتاب و حکمت ان کو دی بلکہ اس کے ساتھ ہی ایک عظیم سلطنت بھی ان کو دی۔ تمھارے حسد کے علی الرغم!

فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ ؕ وَكَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِیْرًا ۝ اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِاٰیٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِیْهِمْ نَارًا ؕ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَیْرَهَا لِیَذُوْقُوا الْعَذَابَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِیْزًا حَكِیْمًا ۝ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اَبَدًا ؕ لَهُمْ فِیْهَاۤ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ؗ وَّنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِیْلًا (۵۵-۵۷)

بنی اسمٰعیل کو تنبیہ

یہ آیات بنی اسمٰعیل سے متعلق ہیں۔ فرمایا کہ ان میں سے ایک گروہ تو اس کتاب و حکمت کو قبول کر کے ایمان سے مشرف ہو چکا ہے لیکن ایک گروہ ابھی اس سے رُوگرداں ہے۔ اس گروہ کے متعلق فرمایا کہ اگر یہ اپنے کفر پر اڑا رہا تو اللہ تعالیٰ اس کو دوزخ میں داخل کرے گا جہاں ان کے عذاب میں کوئی کمی نہیں ہو گی۔ جب جب ان کی کھالیں پک جائیں گی، ان کو دوسری کھالیں پہنا دی جائیں گی تاکہ ان کا عذاب تازہ ہوتا رہے۔ اللہ عزیز یعنی غالب ہے کوئی اس کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا۔ حکیم ہے یعنی اس کا کوئی فعل عدل و حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔

دوسرا گروہ جو ایمان لایا ان کے متعلق فرمایا کہ ان کو ہم جنت میں داخل کریں گے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور اس میں ان کے لیے پاکیزہ بیویاں ہوں گی۔ ان تمام اجزا کی تشریح سورۂ بقرہ میں ہو چکی ہے۔

قرآن نے جہاں کہیں بنی اسمٰعیل پر اپنے اس احسانِ عظیم کا ذکر فرمایا ہے وہاں اس امر کی وضاحت ضرور فرما دی ہے کہ اس احسان کا تعلق ایمان و اسلام سے ہے۔ مجرد خاندان و نسب سے نہیں ہے بنی اسمٰعیل میں سے بھی وہی لوگ اس انعامِ الٰہی میں حصہ دار ہیں جو اس قرآن اور اس نبی پر ایمان لائے ہیں، جو ایمان نہیں لائے وہ سب دوزخ میں جائیں گے، اسرائیلی ہوں یا اسمٰعیلی۔ سورۂ جمعہ میں فرمایا ہے۔

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۙ وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ (۲-۳ جمعہ)	وہی خدا ہے جس نے اُمیوں (بنی اسمٰعیل) میں انہی میں سے ایک رسول اٹھایا جو سناتا ہے ان کو اس کی آیتیں اور ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور بے شک وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔ اور ان دوسروں میں بھی جو ابھی تک ان سے ملے نہیں ہیں اور اللہ عزیز و حکیم ہے۔

یہاں بھی آخری ٹکڑے میں کفارِ قریش کی طرف اشارہ ہے جو ابھی تک اس نعمت کو قبول کرنے والوں میں شامل نہیں ہوئے تھے اور الفاظ کچھ تنبیہ کا پہلو لیے ہوئے ہیں۔ یہ تنبیہ اسی لیے ہے کہ بنی اسمٰعیل اس حقیقت سے آگاہ رہیں کہ اللہ نے بہت بڑا فضل ان پر فرمایا ہے لیکن یہ فضل انہی لوگوں کے لیے ہے جو اس کی قدر کریں، جو اس کی قدر نہ کریں گے ان کو بہ مجرد اس بنیاد پر حاصل نہیں ہو جائے گا کہ وہ بنی اسمٰعیل میں سے ہیں۔ چونکہ یہود اسی طرح کی غلط فہمی میں مبتلا ہو کر اللہ تعالیٰ کے فضل سے محروم ہوئے تھے اس وجہ سے پہلے ہی مرحلے میں قرآن نے یہ آگاہی بنی اسمٰعیل کو سنا دی۔

۲۲- آگے کا مضمون ــــــ آیات ۵۸-۷۰

آگے مسلمانوں کو خطاب کر کے پہلے ان کو یہ نصیحت کی گئی ہے کہ شریعتِ الٰہی کی یہ امانت یہود سے چھین کر اب تمہارے حوالہ جو کی جا رہی ہے تو تم یہود کی طرح قومی اور گروہی تعصب کی بیماری میں مبتلا نہ ہو جانا بلکہ ہمیشہ حق و انصاف کو نگاہ میں رکھنا۔ اب تم کتاب و حکمت کے ساتھ ایک ملک عظیم کے وارث بھی بنائے جا رہے ہو اور تم پر لوگوں کے معاملات کی ذمہ داری ڈالی جا رہی ہے تو تم لوگوں کے حقوق ادا کرنا اور ہمیشہ اپنے فیصلوں میں عدل کو ملحوظ رکھنا اور اس بات کو یاد رکھنا کہ جس خدا نے تم کو اس ذمہ داری پر مامور کیا ہے وہ سمیع و بصیر ہے۔

اس کے بعد وہ طریقہ بتایا ہے جس کو اختیار کر کے مسلمان بحیثیت امتِ مسلمہ کے منظم و مستحکم، حق و عدل پر استوار اور اختلاف و نزاع سے اُبھرنے والی آفتوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ یہ گویا ان اساسات کی تفصیل ہے جن پر اسلامی نظامِ حکومت مبنی ہے۔

اس کے بعد ان لوگوں کی طرف توجہ فرمائی ہے جو مسلمانوں میں شامل تو ہو گئے تھے لیکن ان کی وفاداری ابھی تقسیم تھی، وہ پوری طرح اللہ و رسول اور امت کے اولوالامر کی اطاعت پر ابھی مطمئن نہیں ہوئے تھے۔ چونکہ امت کی وحدت اور اسلامی حکومت کے اندر اصل رخنہ انہی کی طرف سے پیدا ہونے کا اندیشہ تھا اس وجہ سے ان کی طرف تفصیل کے ساتھ توجہ فرمائی۔ اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

آیات ۵۸-۷۰

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمٰنٰتِ إِلٰٓى أَهْلِهَا ۙ وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ ۚ إِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ۗ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ﴿۵۸﴾ يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا أَطِيْعُوا اللّٰهَ وَأَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّأَحْسَنُ تَأْوِيْلًا ﴿۵۹﴾ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ أَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَآ أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ أَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا إِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ أُمِرُوْٓا أَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ۚ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ أَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًا بَعِيْدًا ﴿۶۰﴾ وَإِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلٰى مَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ وَإِلَى الرَّسُوْلِ رَأَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ﴿۶۱﴾ فَكَيْفَ إِذَآ أَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيْهِمْ ثُمَّ جَآءُوْكَ يَحْلِفُوْنَ ۖ بِاللّٰهِ إِنْ أَرَدْنَآ إِلَّآ إِحْسَانًا وَّتَوْفِيْقًا ﴿۶۲﴾ أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۚ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ أَنْفُسِهِمْ قَوْلًاۢ بَلِيْغًا ﴿۶۳﴾ وَمَآ أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَلَوْ

ع ۹ ۵

أَنَّهُمْ إِذْ ظَّلَمُوا أَنْفُسَهُمْ جَاءُوكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللَّهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُولُ لَوَجَدُوا اللَّهَ تَوَّابًا رَحِيمًا ﴿۶۴﴾ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ﴿۶۵﴾ وَلَوْ أَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ أَنِ اقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ أَوِ اخْرُجُوا مِنْ دِيَارِكُمْ مَا فَعَلُوهُ إِلَّا قَلِيلٌ مِنْهُمْ ۖ وَلَوْ أَنَّهُمْ فَعَلُوا مَا يُوعَظُونَ بِهِ لَكَانَ خَيْرًا لَهُمْ وَأَشَدَّ تَثْبِيتًا ﴿۶۶﴾ وَإِذًا لَآتَيْنَاهُمْ مِنْ لَدُنَّا أَجْرًا عَظِيمًا ﴿۶۷﴾ وَلَهَدَيْنَاهُمْ صِرَاطًا مُسْتَقِيمًا ﴿۶۸﴾ وَمَنْ يُطِعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ ۚ وَحَسُنَ أُولَٰئِكَ رَفِيقًا ﴿۶۹﴾ ذَٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللَّهِ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ عَلِيمًا ﴿۷۰﴾

ع ۹ / ۱۱ / ۶

ترجمۂ آیات ۵۸-۷۰

اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے حق داروں کو ادا کرو۔ اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ فیصلہ کرو۔ خوب بات ہے یہ جس کی اللہ تمھیں نصیحت کرتا ہے۔ بے شک اللہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔ ۵۸

اے ایمان والو، اللہ کی اطاعت کرو، رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اولوالامر کی۔ پس اگر کسی امر میں اختلاف رائے واقع ہو تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ، اگر تم اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ طریقہ بہتر اور باعتبار مآل اچھا ہے۔ ۵۹

ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ وہ اس چیز پر بھی ایمان رکھتے ہیں

جو تم پر اتاری گئی ہے اور اس پر بھی جو تم سے پہلے اتاری گئی ہے لیکن چاہتے ہیں کہ اپنے معاملات فیصلہ کے لیے طاغوت کے پاس لے جائیں حالانکہ انھیں اس کے انکار کا حکم دیا گیا ہے۔ شیطان چاہتا ہے کہ انھیں نہایت دور کی گمراہی میں ڈال دے اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی اتاری ہوئی کتاب اور رسول کی طرف آؤ تو تم منافقین کو دیکھتے ہو کہ تم سے کترا جاتے ہیں۔ اس وقت کیا ہو گا جب ان کے اعمال کی پاداش میں ان کو کوئی مصیبت پہنچے گی، پھر یہ تمھارے پاس قسمیں کھاتے ہوئے آئیں گے کہ خدا کی قسم ہم نے تو صرف بہتری اور سازگاری چاہی۔ ان لوگوں کے دلوں کے اندر جو کچھ ہے اللہ اس سے خوب واقف ہے تو ان سے اعراض کرو، ان کو سمجھاؤ اور ان سے خود ان کے باب میں دل میں دھنسنے والی بات کہو۔ ۶۰-۶۳

اور ہم نے جو رسول بھی بھیجا تو اسی لیے بھیجا کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔ اور اگر وہ، جب کہ انھوں نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھایا، تمھاری خدمت میں حاضر ہوتے اور خدا سے معافی مانگتے اور رسول بھی ان کے لیے معافی چاہتا تو وہ خدا کو بڑا توبہ قبول کرنے والا اور مہربان پاتے۔ پس نہیں، تیرے رب کی قسم، یہ لوگ مومن نہیں ہیں جب تک اپنی نزاعات میں تمھی کو حکم نہ مانیں اور جو کچھ تم فیصلہ کر دو اس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس کیے بغیر اس کے آگے سر تسلیم خم نہ کر دیں۔ اور اگر ہم ان پر یہ فرض کرتے کہ اپنے آپ کو قتل کر دو یا اپنے گھروں کو چھوڑ دو تو ان میں سے بس تھوڑے ہی اس کی تعمیل کرتے اور اگر یہ لوگ وہ کرتے جس کی ہدایت کی جاتی تو ان کے لیے یہ بات بہتر اور ایمان پر قدم جمانے والی ہوتی۔ اس وقت ہم انھیں اپنے پاس سے بڑا اجر دیتے اور انھیں

صراط مستقیم کی ہدایت بخشتے۔ ۶۸-۶۴

اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں گے وہی ہیں جو انبیاء، صدیقین اور شہدا و صالحین کے اس گروہ کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے اپنا فضل فرمایا اور کیا ہی اچھے ہیں یہ رفیق! یہ اللہ کی طرف سے فضل ہے اور اللہ کا علم کفایت کرتا ہے۔ ۷۰-۶۹

۲۲۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا (۵۸)

امانت کا لفظ اپنے وسیع مفہوم میں

'امانت' کا لفظ یہاں اپنے محدود مفہوم میں نہیں ہے بلکہ جس طرح اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، الآیۃ (ہم نے امانت کو پیش کیا آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر) والی آیت میں یہ آیا ہے اسی طرح یہاں بھی نہایت وسیع مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ تمام حقوق و فرائض، خواہ حقوق اللہ سے تعلق رکھتے ہوں یا حقوق العباد سے، انفرادی نوعیت کے ہوں یا اجتماعی نوعیت کے، اپنوں سے متعلق ہوں یا بیگانوں سے، مالی معاملات کی قسم سے ہوں یا سیاسی معاہدات کی قسم کے، صلح و امن کے دور کے ہوں یا جنگ کے۔ غرض جس نوعیت اور جس درجے کے حقوق و فرائض ہوں وہ سب امانت کے مفہوم میں داخل ہیں اور مسلمانوں کو شریعت اور اقتدار کی امانت سپرد کرنے کے بعد اجتماعی حیثیت سے سب سے پہلے جو ہدایت ہوئی وہ یہ ہے کہ تم جن حقوق و فرائض کے ذمہ دار بنائے جا رہے ہو ان کو ٹھیک ٹھیک ادا کرنا۔

امانت کا حق

اگر اس سورہ کے پچھلے مطالب ذہن میں محفوظ ہیں تو یہ بات سمجھنے میں کوئی زحمت نہیں ہو سکتی کہ اس ہدایت کے اندر یہ تلمیح بھی مضمر ہے کہ یہ امانت جن سے چھین کر تمھیں دی جا رہی ہے انھوں نے اس کا حق ادا نہیں کیا۔ جس منصب شہادت پر ان کو مامور کیا گیا اس کو انھوں نے چھپایا، جو کتاب ان کی تحویل میں دی گئی اس میں انھوں نے تحریف کی، جس شریعت کا ان کو حامل بنایا گیا اس میں انھوں نے اختلاف پیدا کیا، جن حقوق کے وہ امین بنائے گئے ان میں انھوں نے خیانت کی، جو فرائض ان کے سپرد ہوئے ان میں وہ چور ثابت ہوئے، جو عہد انھوں نے باندھے وہ سب توڑ ڈالے۔ اس وجہ سے تمہاری اولین ذمہ داری یہ ہے کہ اس عظیم امانت کی صورت میں جن حقوق و فرائض کے اب تم حامل بنائے جا رہے ہو ان کو ٹھیک ٹھیک ادا کرنا۔

حقوق و فرائض کے لیے امانت کا لفظ ایک تو یہ تصور پیدا کرتا ہے کہ یہ سب خدا کی سپرد کردہ امانتیں ہیں اس لیے کہ ان کا عائد کرنے والا خدا ہی ہے۔ دوسرا یہ کہ ان ساری امانتوں سے متعلق ایک دن لازماً امانت سونپنے والے کی طرف سے پرسش ہونی ہے، اگر ان میں کوئی خیانت ہوگی تو کوئی نہیں ہے جو خدا کی پکڑ سے بچا سکے۔

امانت کا سب سے اہم پہلو

وَاِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ الایۃ یہ امانت کے سب سے اہم پہلو کی تفصیل بھی ہے اور اقتدار کے ساتھ جو ذمہ داری وابستہ ہے اس کی وضاحت بھی۔ جن کو اللہ تعالیٰ اپنی زمین میں اقتدار بخشتا ہے ان پر اولین ذمہ داری جو عاید ہوتی ہے وہ یہی ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان پیدا ہونے والے جھگڑوں کو عدل و انصاف کے ساتھ چکائیں۔ عدل کا مطلب یہ ہے کہ قانون کی نگاہ میں امیر و غریب، شریف و وضیع، کالے اور گورے کا کوئی فرق نہ ہو، انصاف خریدنی و فروختنی چیز نہ بننے پائے، اس میں کسی جنبہ داری، کسی عصبیت، کسی سہل انگاری کو راہ نہ مل سکے۔ کسی دباؤ، کسی زور و اثر اور کسی خوف و طمع کو اس پر اثر انداز ہونے کا موقع نہ ملے۔

جن کو بھی اللہ تعالیٰ اس زمین میں اقتدار بخشتا ہے، اسی عدل کے لیے بخشتا ہے۔ اس وجہ سے سب سے بڑی ذمہ داری اسی چیز کے لیے ہے۔ خدا کے ہاں عادل حکمران کا اجر بھی بہت بڑا ہے اور غیر عادل کی سزا بھی بہت سخت ہے۔ اسی وجہ سے تنبیہ فرمائی ہے کہ یہ بہت ہی اعلیٰ نصیحت ہے جو اللہ تعالیٰ تمھیں کر رہا ہے اس میں کوتاہی نہ ہو۔ آخر میں اپنی صفات سمیع و بصیر کا حوالہ دیا ہے کہ یاد رکھو کہ خدا سب کچھ سنتا اور دیکھتا ہے، کوئی مخفی سے مخفی ناانصافی بھی اس سے مخفی رہنے والی نہیں۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِکَ خَیْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِیْلًا (۵۹)

'اولوالامر' سے مراد

اولوالامر سے مراد اسلامی معاشرے کے ارباب حل و عقد، ذمہ دار اور سربراہ کار ہیں۔ معاشرے کے حالات کے لحاظ سے اس کے مصداق ارباب علم و بصیرت بھی ہو سکتے ہیں اور ارباب اقتدار و سیاست بھی۔ جو لوگ بھی اس پوزیشن میں ہوں کہ عوام کی سربراہی کر سکیں وہ اس لفظ کے مصداق ہیں۔ اگر امام و خلیفہ موجود ہو تو وہ اور اس کے حکام اولوالامر ہیں اور اگر یہ موجود نہ ہوں تو جماعت کے اندر جو معاملہ فہم اور صاحب بصیرت ہوں وہ اس سے مراد ہوں گے۔ اسی سورہ میں ایک اور مقام میں بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔

وَاِذَا جَآءَھُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ	اور جب ان کو امن یا خطرے کی کوئی خبر ملتی ہے اس کو
اَذَاعُوْا بِہٖ وَلَوْ رَدُّوْہُ اِلَی الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓی	لے اڑتے ہیں حالانکہ اگر وہ اس کو رسول اور اپنے اولوالامر
اُولِی الْاَمْرِ مِنْھُمْ لَعَلِمَہُ الَّذِیْنَ یَسْتَنْۢبِطُوْنَہٗ	کے سامنے پیش کرتے تو جو لوگ بات کی تہ کو پہنچنے والے
مِنْھُمْ (۸۳۔ نساء)	ہیں وہ صورت معاملہ کو سمجھ لیتے۔

اولوالامر کی امتیازی خصوصیت

جس زمانہ میں یہ آیت نازل ہوئی ہے اس زمانے میں ظاہر ہے کہ نہ ابھی خلافت کا وجود تھا نہ باضابطہ امراو حکام تھے۔ اس وجہ سے اولوالامر سے مراد صحابہؓ میں سے وہ لوگ ہوں گے جو دینی و اجتماعی معاملات کی گہری سوجھ بوجھ رکھنے والے اور لوگوں کے مرجع اعتماد تھے۔ یہاں 'استنباط' کا لفظ 'اولوالامر' کی امتیازی خصوصیت کو ظاہر کرتا ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اسلام میں مذہبی و سیاسی قیادت کا منصب اصلاً انھیں لوگوں کے لیے ہے جو بصیرت و اجتہاد کی صلاحیت کے مالک ہیں۔ طبقے، برادری، خاندان اور جائداد وغیرہ کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔

تاویل کا مفہوم

''تاویل'' کے لفظ پر سورۂ آل عمران کی آیت ۷ کے تحت بحث گزر چکی ہے۔ آل، یؤول اولاً و مآلاً کے معنی ہیں کسی چیز کی طرف لوٹنا، رجوع کرنا۔ اسی سے تاویل کا لفظ ہے جس کے معنی بات کو اس کے اصل مآل و مرجع کی طرف لوٹانے کے ہیں۔ اسی مفہوم سے یہ خواب کی تعبیر، کسی بات کی حقیقت اور کسی کلام کی تفسیر و توضیح کے لیے استعمال ہونے لگا اس لیے کہ ان صورتوں میں بھی بات اپنے اصل مآل اور مدعا کی طرف لوٹائی جاتی ہے۔ آیت زیر بحث میں 'اَحْسَنُ تَاْوِیْلًا' کا مطلب یہ ہے کہ اختلافی مسائل میں اللہ و رسول کی بات کی طرف رجوع کرنا حقیقت رسی اور مآل کار دونوں اعتبار سے بہتر ہے۔ خدا ہی کا علم تمام علم و حقیقت کا مرجع بھی ہے اور اسی کی ذات سب کا ملجا و ماویٰ بھی، اور اسی کو حقیقی حاکمیت بھی حاصل ہے۔

اسلام میں امر و طاعت کے تین مرکز

ہر اجتماعی و سیاسی نظام کی تشکیل امر اور طاعت سے ہوتی ہے۔ اسلام میں امر و طاعت کے مرکز تین ہیں۔ اللہ، رسول، اولوالامر۔ ان میں سے دو سابق الذکر مستقل اور بالذات مرکز اطاعت ہیں۔ اس وجہ سے ان کے ساتھ 'اَطِیْعُوْا' کا فعل مستقلاً استعمال ہوا۔ اولوالامر کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت کے تحت ہے اس وجہ سے ان کے لیے 'اطیعوا' کا فعل الگ نہیں استعمال ہوا بلکہ اس کو صرف سابق پر عطف کر دیا ہے۔ یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ اولوالامر صرف اللہ و رسول کے احکام کی تنفیذ کا ذریعہ ہیں اس وجہ سے ان کی اطاعت خدا اور رسول کے احکام کے خلاف جائز نہیں[1]۔

اختلاف رائے کی صورت میں کتاب اللہ اور سنت کی مراجعت کی ہدایت

فان تنازعتم فی شیء ــ تنازع فی الشیء، تنازع فی الحدیث، تنازع فی الامر' کے معنی، جیسا کہ ہم سورۂ آل عمران کی تفسیر میں واضح کر چکے ہیں، اختلاف رائے کے آتے ہیں یعنی کسی معاملے میں کسی کی رائے کچھ ہو، کسی کی کچھ۔ موقع دلیل ہے کہ یہاں اس سے مراد وہ اختلاف رائے ہے جو کسی معاملے میں حکم شریعت معین کرنے کے باب میں ہو سکتا ہے۔ مثلاً کسی نص شرعی کی تعبیر و تاویل میں اختلاف رائے ہو جائے۔ یا کسی امر اجتہادی میں اختلاف پیدا ہو جائے۔ یہ اختلاف قرآن کی کسی آیت یا رسول کی کسی سنت کی تاویل میں بھی ہو سکتا ہے اور غیر منصوص معاملات میں کتاب و سنت سے اوفق کے تعین میں بھی۔ علیٰ ہذا القیاس

---

[1] یہ ملحوظ رہے کہ اللہ و رسول کے احکام کے خلاف کسی کے حکم کی اطاعت جائز نہیں ہے لیکن امرا و حکام کے معاملے میں شریعت کے اس حکم کے ساتھ کچھ تفصیلات بھی بیان ہوئی ہیں جن کا جاننا نہایت ضروری ہے۔ ہم نے اس مسئلہ پر اپنی کتاب "اسلامی ریاست" کے باب 'اطاعت کے حدود و شرائط' میں تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔

یہ اولوالامر اور عوام کے درمیان بھی ہو سکتا ہے اور خود اولوالامر کے اندر آپس میں بھی ہو سکتا ہے۔ اس طرح کا جب کوئی اختلاف واقع ہو تو اس کے حل کے لیے امت کو یہ ہدایت ہوئی کہ اس معاملے کو اللہ و رسول کی طرف لوٹاؤ۔ "اللہ و رسول کی طرف لوٹاؤ" کا مطلب یہ ہے کہ اگر کتاب و سنت کے نصوص میں اس معاملے کے لیے کوئی قطعی رہنمائی موجود نہیں ہے تو ان کے اشارات، مقتضیات، فحوٰی اور امثال و نظائر کو پیش نظر رکھ کر اس میں اوفق بالکتٰب والسنۃ کا تعین کرو اور اس کو اختیار کر لو۔ فرمایا کہ یہ طریقہ تاویل کے پہلو سے سب سے زیادہ بہتر اور اعلیٰ ہے۔ اس لیے کہ ظن غالب یہی ہے کہ یہ بات اللہ و رسول کی بات کے موافق ہوگی اور اختلاف کا فیصلہ اس قانون کے مطابق ہوگا جو اسلام میں اصل قانون اور تمام فقہ و اجتہاد کا مرکز و مرجع ہے اور یہی طریقہ ہے نظامِ اجتماعی و سیاسی میں حاکمیتِ الٰہی کے پوری مضبوطی کے ساتھ پکڑنے اور اعتصام بحبل اللہ کا اور یہی حقیقی توحید ہے۔

اجماع رفع اختلاف کا منصوص طریقہ ہے

یہاں یہ بات بھی ملحوظ رکھنے کی ہے کہ یہ ہدایت امت کو بحیثیت امت دی گئی ہے۔ اس طرح کی ہدایات میں خطاب اگرچہ عام ہوتا ہے لیکن ان کی عملی تنفیذ کی ذمہ داری امت کے ارباب حل و عقد یا قرآن کے الفاظ میں اولوالامر ہی پر عاید ہوتی ہے۔ اس وجہ سے یہ انھی کی ذمہ داری ہے کہ اگر کسی امر میں اختلاف رائے واقع ہو تو وہ اصل قانون شریعت یعنی کتاب و سنت کی طرف رجوع کریں اور جو بات اس سے اوفق نظر آئے اس کو اختیار کریں۔ اربابِ حل و عقد یا ان کی اکثریت کا صاحبِ امر یعنی خلیفہ اور امام کی رہنمائی میں، کسی امر کے اوفق بالشریعت ہونے پر اتفاق کر لینا شریعت میں اجماع کہلاتا ہے جو رفع اختلاف کے لیے ایک منصوص طریقہ ہے اور اس کی مخالفت کسی کے لیے جائز نہیں ہے۔[1]

کتاب، سنت اور اجتہاد

'رد الی اللہ والرسول' کا طریقہ یہ ہے کہ جب کسی امر میں شریعت کا حکم معلوم کرنا ہو تو پہلے کتاب اللہ کی طرف رجوع کرے۔ اگر اس میں نہ ملے تو نبی کی سنت کی طرف رجوع کرے۔ اگر اس میں بھی نہ ملے تو پھر اس کے معلوم کرنے کا راستہ اجتہاد ہے۔ اجتہاد کے آداب و شرائط جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور صحابہؓ کے تعامل سے معلوم ہوتے ہیں وہ اصولِ فقہ کی کتابوں میں موجود ہیں اور ایسے فطری اور عقلی ہیں کہ کسی معقول آدمی کے لیے اس سے انکار کی گنجائش نہیں ہے۔[2]

کتاب اللہ کی طرح سنت کی حیثیت بھی دائمی ہے

اس آیت سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ قانون اسلامی کے مرجع کی حیثیت سے کتاب اللہ کی طرح سنت رسول کی حیثیت بھی مستقل اور دائمی ہے۔ اس لیے کہ فرمایا ہے کہ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ (پس اس کو اللہ و رسول کی طرف لوٹاؤ) ظاہر ہے کہ یہ ہدایت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارک ہی تک کے لیے محدود نہیں ہو سکتی اس لیے کہ اس اختلاف کے پیدا ہونے کا غالب امکان تو حضورؐ کی وفات کے بعد ہی تھا

---

[1] اجماع پر مفصل بحث ہم نے اپنی کتاب 'اسلامی قانون کی تدوین' میں کی ہے۔ تفصیل کے طالب اس کو پڑھیں۔

[2] ہم نے اپنی کتاب 'اسلامی قانون کی تدوین' میں اس پر مفصل بحث کی ہے۔

اور آیت خود شہادت دے رہی ہے کہ اس کا تعلق مستقبل ہی سے ہے۔ ظاہر ہے کہ حضورؐ کی وفات کے بعد آپؐ کی سنت ہی ہے جو آپ کے قائم مقام ہو سکتی ہے۔ یہ تسلیم کرنے کی یہاں کوئی گنجائش نہیں ہے کہ وقت کے اولوالامر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قائم مقام ہو سکتے ہیں اس لیے کہ یہاں اولوالامر کو حذف کر دیا ہے جو اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ اولوالامر قانون کے مرجع کی حیثیت سے دین میں کوئی مستقل حیثیت نہیں رکھتے۔ مستقل حیثیت صرف اللہ اور رسول کی ہے اور رسول کی بھی اس وجہ سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنے قانون کی تعلیم و تبیین پر مامور فرمایا اور اس منصب کی ذمہ داریاں ٹھیک ٹھیک ادا کرنے کے لیے اسے غلطی اور گناہ سے محفوظ کیا۔ گویا اصل حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے، رسول صرف اللہ کے احکام اور اس کی مرضیات کے بتانے کا ایک معصوم ذریعہ ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ؕ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًا بَعِيْدًا ۶۰ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ؕ فَكَيْفَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ثُمَّ جَآءُوْكَ يَحْلِفُوْنَ ۖ بِاللّٰهِ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّآ اِحْسَانًا وَّتَوْفِيْقًا ۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۗ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًاۢ بَلِيْغًا (۶۰-۶۳)

'تحاکم الی الحاکم' کے معنی ہیں 'تخاصم الیہ' یعنی اپنا قضیہ اور معاملہ حاکم کے سامنے پیش کیا۔

تحاکم الی الطاغوت ایمان کے منافی ہے

'طاغوت' کی تحقیق سورۂ بقرہ کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔ یہاں اس کے مقابل میں فرمایا ہے تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہاں 'طاغوت'، کتاب اللہ اور رسول کی ضد کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ مدینہ اور اطراف مدینہ میں آیت کے زمانۂ نزول تک یہ حیثیت صرف یہود کے سرداروں اور لیڈروں ہی کو حاصل تھی کہ جو لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت سے بچنا چاہتے، وہ اپنے معاملات ان کے پاس لے جاتے اس وجہ سے طاغوت سے مراد وہی ہو سکتے ہیں اور ہر اعتبار سے وہ اس لفظ کے بالکل ٹھیک ٹھیک مصداق تھے۔

یہ باندازِ تعجب منافقین کا ذکر ہو رہا ہے (اور قرائن سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ یہ منافقین اہل کتاب ہی میں سے آئے ہوئے لوگ تھے) جو دعویٰ تو یہ کرتے تھے کہ وہ قرآن پر بھی ایمان رکھتے ہیں اور پچھلے صحیفوں پر بھی ایمان رکھتے ہیں لیکن اپنے معاملات میں اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرنے کے بجائے یہود کے سرداروں اور ان کی عدالتوں کی طرف رجوع کرتے تھے۔ حالانکہ جس اللہ و رسول پر وہ ایمان کے مدعی تھے ان کی طرف سے یہ واضح ہدایت اُتر چکی ہے کہ اللہ اور رسول پر ایمان کے لیے لازم ہے کہ طاغوت کا انکار کیا جائے، بغیر اس انکار کے ایمان معتبر نہیں۔ لیکن یہ دونوں کو جمع کرنا چاہتے تھے اور شیطان یہ چاہتا ہے کہ اس طرح ان کو بھٹکا کر صراط مستقیم سے اتنی دور کر دے کہ پھر ان کے لیے اس کو ماننے کا کوئی امکان ہی باقی نہ رہ جائے۔

فرمایا کہ آج تو جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اپنے معاملات اللہ اور رسول ہی کے سامنے پیش کرو، ایمان کا یہی تقاضا ہے، تو کسی نہ کسی بہانے سے کترا جاتے ہیں لیکن اس وقت کیا ہوگا جب ان کی ان خرابیوں کی پاداش میں ان پر ایسا وقت آجائے گا کہ یہ بھاگے ہوئے تمہارے پاس آئیں گے اور قسمیں کھا کھا کے یقین دلائیں گے کہ جو کچھ یہ کرتے رہے ہیں کسی بری نیت سے نہیں کرتے رہے ہیں بلکہ بھلائی اور سازگاری کی نیت سے کرتے رہے ہیں۔

منافقین کو دھمکی

جس مصیبت کے پیش آنے کا یہاں ذکر ہے وہ بعد میں اس طرح پیش آئی کہ جب اسلام نے طاقت پکڑلی اور یہود کی سیاسی طاقت بالکل کمزور ہوگئی تو مسلمانوں کو یہ ہدایت کر دی گئی کہ اب منافقین کے معاملے میں چشم پوشی اور اغماض کی روش وہ بدل دیں۔ چنانچہ مسلمانوں نے اپنی روش بدل لی اور قدم قدم پر منافقین کا احتساب شروع کر دیا۔ منافقین اس صورتِ حال سے بہت پریشان ہوئے۔ نہ یہود میں اتنا دم خم باقی رہا تھا کہ ان کی سرپرستی کر سکیں، نہ مسلمان اب ان کے چکموں میں آنے کے لیے تیار تھے۔ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ نتیجہ یہ ہوا کہ منافقین بھاگ بھاگ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آتے اور قسمیں کھا کھا کے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کرتے کہ وہ یہود سے جو ربط ضبط اب تک رکھتے اور کبھی کبھی اپنے معاملات میں ان کی بالاتری تسلیم کرتے رہے ہیں اس میں کسی فسادِ نیت کو دخل نہیں تھا بلکہ ان کی خواہش صرف یہ رہی ہے کہ اس سے مسلمانوں کو فائدہ پہنچے گا اور جو خلیج اختلاف و عناد یہود اور مسلمانوں کے درمیان حائل ہوگئی ہے وہ زیادہ وسیع نہ ہونے پائے گی۔ اس طرح وہ اپنی منافقت کو مصالحت کے پردے میں چھپانے کی کوشش کرتے اور اس کو احسان اور توفیق کے خوب صورت الفاظ سے تعبیر کرتے لیکن واقعات کے تشت از بام ہوجانے کے بعد اس سخن سازی کا موقع بالکل نکل چکا تھا چنانچہ آگے اس سورہ میں بھی اور پھر تفصیل کے ساتھ سورۂ براءت میں منافقین کے چہرے کی یہ نقاب نوچ کر پھینک دی گئی اور ان کے لیے منہ چھپانا ناممکن ہوگیا۔

منافقین کا طرزِ عمل

اس سے یہ بات نکلی کہ حریف طاقتوں کے ساتھ اختلاف یا رواداری کی پالیسی بنانا امت کے ارباب حل و عقد اور اس کے سربراہوں کا کام ہے، نہ کہ عوام کی کسی ٹولی کا۔ اگر اربابِ حل و عقد کسی حریف طاقت سے برسرِ جنگ ہیں اور عوام کے اندر کے کچھ افراد ان کی طرف محبت و اعتماد کی پینگیں بڑھائیں اور اس کو امت کی خیر خواہی اور باہمی سازگاری کی کوشش کا نام دیں تو یہ صریح بدخواہی اور کھلی ہوئی منافقت ہے۔

ایک سیاسی نکتہ

آخر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ ان کے دلوں میں کیا ہے، یہ امت کی خیر خواہی اور سازگاری پیدا کرنے کا جذبہ ہے جو ان سے یہ پاپڑ بلوا رہا ہے یا منافقت اور طاغوت پرستی کا فساد ہے جو انھیں اسلام کی طرف ابھی یکسو ہونے نہیں دے رہا ہے اور یہ دل میں اس امید کی پرورش کر رہے ہیں کہ شاید اس کشمکش کا نتیجہ یہود اور کفار کی فتمندی کی شکل میں نکلے تو ان کی یہ منافقت کی پالیسی کامیاب رہے گی۔ فرمایا کہ ان کی اس حرکت سے اعراض کرو، ان کو نیک و بد اچھی طرح سمجھا دو، اور ان کے حق میں جو کچھ بہتر ہے اس سے

منافقین کے دل کا اصل راز

ایسے انداز میں ان کو آگاہ کر دو کہ ان کے کان کھلیں اور بات، دلوں میں اترے ہیں۔

فَكَيْفَ إِذَآ أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ الاية میں جو دھمکی ہے وہ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُل لَّهُمْ فِيٓ أَنفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيغًا میں اور زیادہ تیز و تند ہو گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ اپنی اس منافقت کے لیے جو بہانہ سازی کر رہے ہیں، خدا اس کی حقیقت سے خوب واقف ہے، اس وجہ سے تم معاملہ خدا کے حوالہ کرو اور ابھی ان سے اعراض کرو، البتہ ان کو نیک و بد اچھی طرح سمجھا دو کہ جو کھیل یہ کھیل رہے ہیں یہ خود ان کے لیے مستقبل میں نہایت خطرناک ثابت ہوگا۔ وعظ کے لفظ کے متعلق ہم کہیں یہ لکھ آئے ہیں کہ عربی میں یہ لفظ زجر اور تنبیہ کے مفہوم کا بھی حامل ہے۔

قولاً بلیغاً کی بلاغت

وَقُل لَّهُمْ فِيٓ أَنفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيغًا میں فِيٓ أَنفُسِهِمْ کے الفاظ اس حقیقت کو ظاہر کر رہے ہیں کہ ان پر یہ حقیقت واضح کر دی جائے کہ یہ نصیحت خود ان کے حق میں بہتر ہے، ان کی اس روش سے اسلام کو کوئی ضرر پہنچنے والا نہیں ہے، اللہ اپنے دین کی حفاظت کے لیے کافی ہے، البتہ یہ خود اپنے آپ کو تباہ کر لیں گے۔ قَوْلًا بَلِيغًا کے الفاظ اس حقیقت کو ظاہر کر رہے ہیں کہ اب نصیحت کا انداز کان کھولنے والا اور دل میں دھنسنے والا ہونا چاہیے، یہ بہرے اور بلید لوگ ہیں اس وجہ سے کریمانہ انداز نصیحت ان پر اثر انداز نہیں ہوتا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت اس وجہ سے ہوئی کہ آپ اگر کسی کی غلطی پر کوئی گرفت فرماتے تو کمال درجہ رافت و شفقت کی وجہ سے نہایت ہی نرم اور کریمانہ انداز میں اس کی طرف اشارہ فرماتے۔ اگرچہ حضورؐ کے شایانِ شان انداز یہی تھا اور ذی صلاحیت لوگوں کے لیے یہ اشارہ کافی بھی ہو جاتا تھا لیکن منافقین اس کریم النفسی کے نہ اہل تھے نہ قدردان، بلکہ وہ اس سے غلط فائدہ اٹھاتے اور روز بروز اپنی شرارتوں میں دلیر ہوتے جا رہے تھے۔ اس وجہ سے یہ ہدایت ہوئی کہ اب ان کے ساتھ زیادہ نرمی برتنے کا موقع نہیں ہے بلکہ وقت آگیا ہے کہ ان کو واضح الفاظ میں تنبیہ کی جائے اور ان کے نیک و بد سے ان کو اچھی طرح آگاہ کر دیا جائے تاکہ یہ سنبھلنا چاہیں تو تباہی کے گڑھے میں گرنے سے پہلے پہلے سنبھل جائیں۔

وَمَآ أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ ٱللَّهِ ۚ وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذ ظَّلَمُوٓا۟ أَنفُسَهُمْ جَآءُوكَ فَٱسْتَغْفَرُوا۟ ٱللَّهَ وَٱسْتَغْفَرَ لَهُمُ ٱلرَّسُولُ لَوَجَدُوا۟ ٱللَّهَ تَوَّابًا رَّحِيمًا ۝ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا۟ فِيٓ أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا۟ تَسْلِيمًا (۶۴-۶۵)

رسول کا اصل مرتبہ

اب یہ رسول کا صحیح مرتبہ واضح فرمایا کہ رسول صرف مان لینے کے لیے نہیں ہوتا بلکہ وہ اس لیے آتا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے۔ وہ صرف عقیدت ہی کا مرکز نہیں بلکہ اطاعت کا مرکز بھی ہوتا ہے۔ اس کی حیثیت صرف ایک واعظ و ناصح ہی کی نہیں بلکہ ایک واجب الاطاعت ہادی کی بھی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے اذن کے تحت اس کو اس لیے مامور فرماتا ہے کہ لوگ جملہ معاملات میں اس کے احکام کی اطاعت کریں اس لیے کہ اس کی اطاعت ہی بالواسطہ خدا کی اطاعت ہے۔ جو لوگ رسول کو ماننے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن اس کے

سیاسی اقتدار کو تسلیم نہیں کرتے یا اس سے اپنے آپ کو آزاد رکھنا چاہتے ہیں ان کا دعوائے ایمان جھوٹا ہے۔

یہاں 'باذن اللہ' کی قید اس حقیقت کو ظاہر کر رہی ہے کہ اصل حاکمیت اللہ ہی کی ہے لیکن اپنے اذن سے اپنے رسول کو یہ منصب بخشتا ہے کہ وہ لوگوں کو اس کے امر و نہی سے آگاہ فرمائے اور اس مقصد کے لیے وہ اس کو غلطی اور خطا سے محفوظ فرماتا ہے اس وجہ سے رسول، خدا کی قانونی و تشریعی حاکمیت کا مظہر ہوتا ہے اور اس پر ایمان اور ساتھ ہی اس کی بے چون و چرا اطاعت خدا پر ایمان اور خدا کی اطاعت کے ہم معنی بن جاتی ہے۔

رسول، خدا کی تشریعی حاکمیت کا مظہر ہے

ظاہر ہے کہ جب رسول، خدا کی حاکمیتِ قانونی و تشریعی کا مظہر ہے تو اس امر کی کوئی گنجائش کسی صاحبِ ایمان کے لیے باقی نہیں رہ جاتی کہ وہ رسول کی عدالت کو چھوڑ کر اپنے کسی معاملے کو فیصلہ کے لیے طاغوت کی عدالت میں لے جائے۔ جو شخص ایسا کرتا ہے وہ اپنی جان پر بہت بڑا ظلم ڈھاتا ہے اس لیے کہ فی الحقیقت یہ چیز خدا کی حاکمیت کا انکار اور بالواسطہ شرک اور کفر کا ارتکاب ہے۔ چنانچہ ان منافقین سے متعلق، جو اپنے معاملات یہود کی عدالتوں میں لے جاتے تھے، فرمایا کہ جن لوگوں نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھایا ان کے لیے اس کی اصلاح اور اس کے عواقب سے نجات کی واحد شکل یہ تھی کہ وہ رسول کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی غلطی کا اعتراف کرتے، خدا سے مغفرت کے طالب ہوتے اور رسول بھی ان کے لیے دعائے مغفرت کے ذریعہ سے ان کی سفارش کرتے تو اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول کرتا اور ان پر رحم فرماتا۔ اس کے سوا اس کی تلافی کی کوئی اور شکل نہیں۔

ایمان کی بنیادی شرط۔ رسول کی اطاعت ظاہراً و باطناً

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی قسم کھا کر فرمایا کہ یہ لوگ اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے جب تک یہ اپنے درمیان پیدا ہونے والی تمام نزاعات میں تمھی کو حکم نہ مانیں اور پھر ساتھ ہی ان کے اندر یہ ذہنی تبدیلی نہ واقع ہو جائے کہ وہ تمھارے فیصلے کو بے چون و چرا پورے اطمینانِ قلب کے ساتھ مانیں اور اپنے آپ کو بلا کسی استثنا و تحفظ کے تمھارے حوالے کر دیں۔ رسول کی اطاعت خود خدا کی اطاعت کے ہم معنی ہے اس وجہ سے اس کا حق صرف ظاہری اطاعت سے ادا نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے دل کی اطاعت بھی شرط ہے۔

یہاں 'فَلَا وَرَبِّكَ' کی قسم کا موقع و محل بھی ملحوظ رہے۔ اس سے صرف رسول کی ظاہری و باطنی اطاعت کی تاکید ہی مقصود نہیں ہے بلکہ یہ منافقین کی جھوٹی قسم کی جو آیت ۶۲ میں مذکور ہے، سچی قسم کے ساتھ تردید بھی ہے۔ پھر 'وَرَبِّكَ' کے خطاب میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے التفاتِ خاص کی جو دل نوازی ہے اس کی بلاغتوں کا اندازہ تو صرف اہلِ ذوق ہی کر سکتے ہیں، قلم ان کی تعبیر سے قاصر ہے۔

رسول کا استغفار بمنزلہ شفاعت ہے

'فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُولُ' میں ان کے لیے رسول کے استغفار کی جو شرط لگائی گئی ہے اس میں دو پہلو ہیں۔ ایک تو یہ کہ رسول کا یہ استغفار ان کے لیے اس دنیا میں بمنزلہ شفاعت ہے جس سے

ان کے اس گناہِ عظیم کے بخشے جانے کی توقع ہے، دوسرا یہ کہ رسول کی عدالت کے ہوتے ان کا تحاکم الی الطاغوت رسول کی صریح توہین ہے اس وجہ سے یہ ضروری ہُوا کہ وہ رسول کی رضا اور ان کی دعا بھی حاصل کریں۔ منافقین سوچتے تو ان کو رسول کی برکتوں سے متمتع ہونے کا بڑا موقع حاصل تھا لیکن ان میں سے بہتوں نے اس موقع کی قدر نہیں کی جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس سے بعد میں محروم کر دیا۔ سورۂ منافقون میں اس کا ذکر اس طرح ہُوا ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ وَرَاَيْتَهُمْ يَصُدُّوْنَ وَهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ۝ سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ لَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ (۵-۶)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اللہ کا رسول تمہارے لیے اللہ سے مغفرت مانگے گا تو وہ اپنی گردنیں موڑ لیتے ہیں اور تم ان کو گھمنڈ کے ساتھ اعراض کرتے دیکھتے ہو، ان کے لیے برابر ہے، تم ان کے لیے مغفرت مانگو یا نہ مانگو، اللہ ان کو معاف کرنے والا نہیں ہے، اللہ نافرمانوں کو بامراد کرنے والا نہیں ہے۔

وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ ۭ وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَشَدَّ تَثْبِيْتًا ۝ وَّاِذًا لَّاٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ لَّدُنَّآ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ وَّلَهَدَيْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۝ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰۗىِٕكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاۗءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰۗىِٕكَ رَفِيْقًا ۝ ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا (۶۶-۷۰)

منافقین کی بنیادی کمزوری

اب یہ ان منافقین کے اصل سبب نفاق سے پردہ اٹھایا ہے کہ یہ بننے کو تو اسلام کے مدعی بن بیٹھے ہیں لیکن ابھی یہ جاہلیت کے سابق روابط و تعلقات کے پھندوں سے پوری طرح آزاد نہیں ہوئے ہیں ابھی تک خاندان، برادری، قبیلہ اور قوم کی زنجیریں بھی ان کے پاؤں میں ہیں اور وطن اور سرزمین کی وابستگیاں بھی دامن گیر ہیں اس وجہ سے یہ آگے بڑھنے کی بجائے بار بار پیچھے مڑ مڑ کر دیکھ رہے ہیں حالانکہ اسلام کا اول مطالبہ یہی ہے کہ آدمی ہر زنجیر کو توڑ کر صرف اللہ کے لیے اُٹھ کھڑا ہو جس طرح مہاجرین اولین اُٹھ کھڑے ہُوئے۔

حق کی دوستی کا اصل تقاضا

یہ ملحوظ رہے کہ یہ منافقین زیادہ تر یہود اور اطراف مدینہ کے قبائل سے تعلق رکھنے والے لوگ تھے۔ یہ اسلام کی اُبھرتی ہُوئی طاقت کو دیکھ کر اسلام کے اظہار پر تو مجبور ہو گئے تھے لیکن جیسا کہ اُوپر گزرا یہ اپنے روابط یہود اور اپنے قبائلی سرداروں کے ساتھ بھی رکھنا چاہتے تھے اور اسی غرض کے لیے اپنے معاملات و مقدمات میں بھی ان سے رجوع کرتے تھے۔ قرآن نے یہ ان کی اسی کمزوری سے پردہ اٹھایا ہے کہ ان کو اپنوں سے لڑنے اور اپنے گھر بار چھوڑ کر مسلمانوں کے ساتھ آملنے کا حکم دیا جائے تو اس جہاد

اور ہجرت کے لیے ان میں سے بہت تھوڑے آمادہ ہوں گے۔ 'اقتلوا انفسکم' کے مفہوم پر ہم بقرہ آیت ۵۴ اور نساء آیت ۲۹ کے تحت جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ جہاد اول تو اپنی فطرت ہی سے ایک سخت آزمائش ہے لیکن جب یہ تلوار ان کے خلاف اٹھانی پڑے جن سے خون اور قرابت کے رشتے ہوں اور جن کی حمیت و حمایت کا جذبہ رگ و ریشہ میں سرایت کیے ہوتے ہو تو یہ آزمائش سخت تر ہو جاتی ہے اس لیے کہ اس صورت میں تلوار گویا اپنی ہی گردنوں پر چلانی پڑتی ہے۔ لیکن اسلام حق کے مقابل میں خون اور نسب کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ اس وجہ سے خدا کی وفاداری کا امتحان پاس کرنے کے لیے اہل ایمان کو اس مرحلے سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ اسلام کی تاریخ شاہد ہے کہ بدر کے موقع پر ماموں کی تلوار بھانجے کے اور بھتیجے کی تلوار چچا کے مقابل میں بے نیام ہوئی اور عصبیت جاہلیت کے تمام روابط حق کے آگے بالکل بے حقیقت ہو کے رہ گئے۔

اسلام کی اسی حقیقت کی طرف یہاں ان منافقین کو بھی توجہ دلائی جا رہی ہے کہ اگر یہ بھی اپنے خاندان و قبیلہ اور گھر در کی وابستگیوں سے آزاد اور یکسو ہو کر کلیۃً مسلمانوں کے معاشرے میں شامل ہو جائیں تو یہ ان کے حق میں بہتر ہے اور اسلام پر ان کے قدم جمانے میں یہ چیز نہایت کارگر ہوگی۔ فاسد ماحول سے نکل کر جب یہ پاکیزہ ماحول میں پہنچ جائیں گے تو ان کی کمزوریاں دور ہوں گی اور یہ بھی اسلام کے جاں نثاروں کے ساتھ مل کر خدا کے وفادار اور حق کے خدمت گزار بن جائیں گے۔

ہجرت اور جہاد کی برکات

اس کے بعد ان کی حوصلہ افزائی کے لیے فرمایا کہ یہ نہ خیال کریں کہ یہ کوئی تباہی و خودکشی کا راستہ ہے۔ اگر وہ اللہ کے لیے اپنے گھر در چھوڑ دیں گے تو اللہ ان کو خاص اپنے پاس سے اجر عظیم دے گا اور ان کو صراط مستقیم کی ہدایت نصیب کرے گا۔ جو لوگ سب سے کٹ کر اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں ان کو اللہ کے انعام یافتہ بندوں ــــ انبیاء، صدیقین، شہدا اور صالحین ــــ کی معیت و رفاقت حاصل ہوتی ہے اور کیا ہی خوش قسمت ہیں وہ لوگ جن کو اس پاک گروہ کی معیت و رفاقت حاصل ہو! یہ اللہ کا فضل ہے اور اللہ اس فضل خاص کے مستحق بندوں سے بے خبر نہیں ہے۔ جو لوگ اس فضل کے حاصل کرنے کے لیے ہجرت اور جہاد کی بازیاں کھیلیں گے وہ مطمئن رہیں کہ اللہ ان کی جاں بازیوں سے اچھی طرح باخبر ہے۔

۲۴۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۷۱-۷۶

وہی اوپر والا مضمون آگے چل رہا ہے۔ خطاب اگرچہ عام مسلمانوں سے ہے لیکن تبصرہ انہی منافقین کے رویے پر ہے جن کی بابت اوپر فرمایا ہے کہ یہ اسلام کا دعویٰ تو کرتے ہیں لیکن اس راہ میں کوئی چوٹ کھانے اور ہجرت و جہاد کی آزمائشوں سے گزرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

پہلے مسلمانوں کو جہاد کے لیے لیس ہونے اور جنگ کے لیے اٹھنے کا حکم دیا۔ فرمایا کہ اگر جماعتی حیثیت سے جنگ کے لیے اٹھنے کی ضرورت پیش آئے تو جماعتی شکل میں اٹھو اور اگر ٹکڑیوں اور دستوں کی شکل میں نکلنے کا موقع ہو تو ٹکڑیوں اور دستوں کی صورت میں نکلو اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو۔ اس کے بعد منافقین کا ذکر فرمایا کہ یہ لوگ خود بزدل ہیں اور دوسروں کو بھی بزدل بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا حال یہ ہے کہ اگر تم کو کوئی گزند پہنچ جائے تو خوش ہوتے ہیں کہ خوب ہوا کہ اس فوج یا دستے میں ہم شامل نہیں ہوئے اور اگر تمھیں کوئی کامیابی حاصل ہوتی ہے تو حاسدانہ یہ کہتے ہیں کہ کاش ہم بھی اس فوج یا دستے میں شامل ہوتے کہ اس کے حاصل کردہ مالِ غنیمت میں حصہ دار بن سکتے۔

اس کے بعد جہاد پر ابھارنے کے لیے اس کے اجرِ عظیم کا بھی ذکر فرمایا اور ساتھ ہی نہایت موثر الفاظ میں اس ضرورت کی طرف بھی توجہ دلائی جو اس وقت اس کی داعی تھی۔ وہ ضرورت یہ تھی کہ جگہ جگہ مسلمان مرد، عورتیں اور بچے کفار کے نرغے میں گھرے ہوئے، اسلام لانے کے جرم میں، ان کے ہاتھوں طرح طرح کے مظالم کا ہدف بنے ہوئے تھے اور ان کے پنجۂ ستم سے نجات حاصل کرنے کے لیے فریادیں کر رہے تھے۔ اس ظلم و ستم سے ان کو نجات دلانا ایک عظیم انسانی و اسلامی فریضہ تھا۔

پھر مسلمانوں کے جہاد اور کفار کی جنگ کے فرق کو واضح فرمایا کہ مسلمانوں کا جہاد اللہ کی راہ میں ہے اور کفار کی جنگ شیطان کی راہ میں ہے۔ شیطان خواہ کتنی ہی چالیں چلے لیکن خدا کے مقابل میں اس کی ہر چال بودی ثابت ہو کے رہے گی۔ آخری کامیابی بہرحال انہی لوگوں کو حاصل ہوگی جو اللہ کے دین کا ساتھ دینے کے لیے اٹھیں گے ـــــ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۷۱ - ۷۶

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ خُذُوا۟ حِذْرَكُمْ فَٱنفِرُوا۟ ثُبَاتٍ أَوِ ٱنفِرُوا۟ جَمِيعًا ﴿٧١﴾ وَإِنَّ مِنكُمْ لَمَن لَّيُبَطِّئَنَّ فَإِنْ أَصَٰبَتْكُم مُّصِيبَةٌ قَالَ قَدْ أَنْعَمَ ٱللَّهُ عَلَىَّ إِذْ لَمْ أَكُن مَّعَهُمْ شَهِيدًا ﴿٧٢﴾ وَلَئِنْ أَصَٰبَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ ٱللَّهِ لَيَقُولَنَّ كَأَن لَّمْ تَكُنۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُۥ مَوَدَّةٌ يَٰلَيْتَنِى كُنتُ مَعَهُمْ فَأَفُوزَ فَوْزًا عَظِيمًا ﴿٧٣﴾ فَلْيُقَٰتِلْ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ ٱلَّذِينَ يَشْرُونَ ٱلْحَيَوٰةَ ٱلدُّنْيَا بِٱلْءَاخِرَةِ ۚ وَمَن يُقَٰتِلْ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ فَيُقْتَلْ أَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا

عَظِيْمًا ﴿٧٤﴾ وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۙ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ﴿٧٥﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ﴿٧٦﴾

ع ۱۰ / ۷

ترجمۂ آیات ۷۱-۷۶

اے ایمان والو، اپنے اسلحہ سنبھالو اور جہاد کے لیے نکلو، ٹکڑیوں کی صورت میں یا جماعتی شکل میں۔ اور تم میں ایسے لوگ بھی ہیں جو ڈھیلے پڑ جاتے ہیں، پس اگر تم کو کوئی گزند پہنچ جائے تو کہتے ہیں کہ مجھ پر اللہ نے فضل کیا کہ میں ان کے ساتھ شریک نہ ہوا اور اگر تمھیں اللہ کا کوئی فضل حاصل ہو تو، اس طرح کہ گویا تمھارے اور ان کے درمیان کوئی رشتۂ محبت ہے ہی نہیں، کہتے ہیں کہ اے کاش میں بھی ان کے ساتھ ہوتا کہ ایک بڑی کامیابی حاصل کرتا۔ پس چاہیے کہ اللہ کی راہ میں جنگ کے لیے وہ لوگ اٹھیں جو دنیا کی زندگی آخرت کے لیے تج چکے ہیں اور جو اللہ کی راہ میں جنگ کرے گا تو خواہ مارا جائے یا غالب ہو ہم اس کو اجر عظیم دیں گے۔ ۷۱-۷۴

اور تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں اور ان بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کے لیے جنگ نہیں کرتے جو دعا کر رہے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہمیں اس ظالم باشندوں کی بستی سے نکال اور ہمارے لیے اپنے پاس سے ہمدرد پیدا کر اور ہمارے لیے

اپنے پاس سے مددگار کھڑے کر۔ ۷۵

جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں اور جنھوں نے کفر کیا وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں تو تم شیطان کے حامیوں سے لڑو، شیطان کی چال تو بالکل بودی ہوتی ہے۔ ۷۶

۲۵- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا ۝ وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ ۚ فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ اِذْ لَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِيْدًا ۝ وَلَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ يّٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا (۷۱-۷۳)

لفظ 'حذر' کی تحقیق 'حذر' کے اصل معنی کسی خطرہ اور آفت سے بچنے کے ہیں۔ اپنے اسی مفہوم سے ترقی کر کے یہ لفظ ان چیزوں کے لیے استعمال ہوا جو جنگ میں دشمن کے حملوں سے بچنے کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ مثلاً زرہ بکتر، سپر، خود وغیرہ۔ اس کا خاص استعمال تو دفاعی آلات ہی کے لیے ہے لیکن اپنے عام استعمال میں یہ ان اسلحہ پر بھی بولا جاتا ہے جو حملے کے کام آتے ہیں۔ مثلاً تیر، تفنگ، تلوار وغیرہ۔ یہاں یہ لفظ اپنے عام مفہوم ہی میں معلوم ہوتا ہے۔ اس پر مزید بحث اسی سورہ کی آیت ۱۰۲ کے تحت آ رہی ہے۔ وہاں اس کے عام اور خاص دونوں استعمالات کو قرآن نے خود واضح کر دیا ہے۔

'ثبات' کا مفہوم 'ثبات'، 'ثبۃ' کی جمع ہے۔ 'ثبۃ' کے معنی سواروں کی جماعت، ٹکڑی اور دستے کے ہیں۔

عرب میں جنگ کے دو طریقے معروف تھے۔ ایک منظم فوج کی شکل میں لشکر آرائی، دوسرا وہ طریقہ جو گوریلا جنگ (GUERRILLA WARFARE) میں اختیار کیا جاتا ہے یعنی ٹکڑیوں اور دستوں کی صورت میں دشمن پر چھاپہ مارنا۔ یہاں 'ثبات' کے لفظ سے اسی طریقے کی طرف اشارہ ہے۔ مسلمانوں نے یہ دونوں طریقے استعمال کیے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منظم فوج کشی بھی فرمائی اور وقتاً فوقتاً سریے بھی بھیجے۔

'بطأ یبطئ' کا مفہوم 'بطأ یبطئ' کے معنی ڈھیلے پڑنے، سست پڑنے اور پیچھے رہ جانے کے بھی ہیں اور دوسرے کو سست کرنے کے بھی۔ لسان العرب میں ہے 'بطأ فلان بفلان اذا ثبطه' فلاں نے فلاں کو سست اور پست ہمت کر دیا۔ ایک حدیث میں ہے کہ 'من بطأ به عمله لم يسرع به نسبه' (جس کا عمل اس کو پیچھے کر دے گا اس کا نسب اس کو آگے نہ بڑھا سکے گا)

یہ مسلمانوں کو من حیث الجماعت خطاب کر کے مسلح ہونے اور جنگ کے لیے اٹھنے کا حکم دیا ہے۔ فرمایا کہ اگر دستوں اور ٹولیوں کی صورت میں دشمن پر چھاپے مارنے کی نوبت آئے تو اس کے لیے بھی نکلو، اور اگر منظم ہو کر جماعتی شکل میں فوج کشی کی ضرورت پیش آئے تو اس سے بھی دریغ نہ کرو۔

منافقین کی بزدلی اور مسلمانوں کی کامیابی پر ان کا حسد

پھر فرمایا کہ تم میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو جنگ سے خود بھی جی چراتے ہیں اور دوسروں کو بھی پست ہمت کرتے ہیں۔ ان کا حال یہ ہے کہ اگر تمہیں کسی مہم میں کوئی گزند پہنچ جائے تو خوش ہوتے ہیں کہ اللہ نے ہمیں خوب بچایا کہ ہم اس مہم میں ان کے ساتھ شریک نہیں ہوئے اور اگر تمہیں کامیابی حاصل ہوتی ہے تو حاسدانہ کہتے ہیں کہ کاش ہم بھی اس میں شامل ہوتے تاکہ خوب مالِ غنیمت حاصل کرسکتے۔ اس دوسری بات کے ساتھ کَاَنْ لَّمْ تَكُنْۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ کے الفاظ اس بات کے کہنے والوں کے باطن پر عکس ڈال رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ اپنی شامتِ اعمال سے کسی مہم میں شامل نہیں ہوتے تو ایمانی و اسلامی اخوت کا کم از کم تقاضا یہ ہے کہ مسلمانوں کی کامیابی پر خوش ہوں کہ اللہ نے ان کے دینی بھائیوں کو سرخرو کیا لیکن انھیں اس بات کی کوئی خوشی نہیں ہوتی بلکہ جس طرح حریف کی کسی کامیابی پر آدمی کا دل جلتا ہے کہ وہ اس میں حصہ دار نہ ہوسکا اسی طرح یہ لوگ اس کو اپنی کامیابی نہیں بلکہ حریف کی کامیابی سمجھتے ہیں اور اپنی محرومی پر سر پیٹتے ہیں۔ گویا اسلام اور مسلمانوں سے ان کا کوئی رشتہ ہی نہیں۔

فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۭ وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا (۷۴)

'شریٰ یشری' کا مفہوم

'اَلَّذِیْنَ' یہاں مفعول کے محل میں نہیں بلکہ فاعل کی حیثیت میں ہے اور 'شریٰ یشری' یہاں بیچنے کے معنی میں ہے۔ سورۂ یوسف میں ہے وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍۢ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ ۚ وَكَانُوْا فِيْهِ مِنَ الزّٰهِدِيْنَ (اور انھوں نے یوسف کو نہایت حقیر قیمت پر بیچ دیا، گنتی کے چند درہموں پر، اور وہ اس کی قدر سے ناآشنا تھے) دُنیا کی زندگی کو آخرت سے بیچتے ہیں یعنی دنیا کی زندگی پر آخرت کو ترجیح دیتے ہیں۔

خدا کی راہ میں جہاد کے سزاوار کون ہیں؟

آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہ منافقین تو صرف اس جنگ کے غازی بننا چاہتے ہیں جس میں نکسیر بھی نہ پھوٹے اور مالِ غنیمت بھی بھرپور ہاتھ آئے۔ خدا کے دین کو ایسے نام نہاد غازیوں کی ضرورت نہیں ہے۔ خدا کی راہ میں جہاد کے لیے وہ اٹھیں جو آخرت کے لیے اپنی دُنیا تج چکے ہوں۔ جو لوگ دُنیا کو تج کر صرف آخرت کی کامیابی کے لیے جہاد کریں گے وہ مارے جائیں یا فتحمند ہوں، دونوں ہی صورتوں میں ان کے لیے اجرِ عظیم ہے۔ رہے یہ لوگ جو صرف اس وقت تک کے لیے مجنوں بنے ہیں جب تک لیلیٰ کی طرف سے ان کو دودھ کا پیالہ ملتا ہے، خونِ جگر کا مطالبہ نہ ہو، تو ایسے مجنوں یہاں درکار نہیں ہیں۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاۗءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ښ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا (۷۵)

'وَمَا لَكُمْ (تمھیں کیا ہوا ہے)' کا اسلوب کسی کام پر اُبھارنے اور شوق دلانے کے لیے ہے۔

'مُسْتَضْعَف' سے مراد مظلوم، مجبور اور بے بس کے ہیں۔ 'مُستضعفین' کا عطف 'فی سبیل اللہ' پر اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ جو لوگ دین کی وجہ سے ستائے جا رہے ہوں ان کی آزادی کے لیے جنگ، قتال

فی سبیل اللہ' میں سب سے اول درجہ رکھتی ہے۔ ہم بقرہ کی تفسیر میں واضح کر چکے ہیں کہ اسلامی جہاد کا اصلی مقصد دنیا سے فتنہ (PERSECUTION) کو مٹانا ہے۔ 'قریہ' کو یہاں صرف مکہ کے لیے خاص کر دینے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ ان آیات کے نزول کے زمانے میں مکہ کے علاوہ اور بھی بستیاں تھیں جن میں بہت سے مرد، عورتیں اور بچے مسلمان ہو چکے تھے اور وہ اپنے کافر سرپرستوں یا اپنے قبیلے کے کافر زبردستوں کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے ہوئے تھے۔ 'من لدنک' کا موقع استعمال اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ ظاہر حالات تو بالکل خلاف ہیں، کسی طرف سے امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی لیکن اللہ تعالیٰ اپنی قدرت اور اپنی عنایت سے کوئی راہ کھول دے تو کچھ بعید نہیں۔

جہاد کے لیے ایک اہم محرک

مطلب یہ ہے کہ تم ان مردوں، عورتوں اور بچوں کو کفار کے ظلم و ستم سے نجات دلانے کے لیے کیوں نہیں اٹھتے جو کفار کے اندر بے بسی کی حالت میں گھرے ہوئے اور ان سے چھوٹ کر مسلمانوں سے آملنے کی کوئی راہ نہیں پا رہے ہیں؛ جن کا حال یہ ہے کہ رات دن نہایت بے قراری کے ساتھ یہ دعا کر رہے ہیں کہ اے پروردگار ہمیں ان ظالم باشندوں کی بستی سے نکال اور غیب سے ہمارے ہمدرد پیدا کر اور غیب سے ہمارے مددگار کھڑے کر۔

آیت ۵۷ کے اشارات

اس آیت سے کئی باتیں ظاہر ہو رہی ہیں۔

ایک یہ کہ ظالم کفار نے کمزور مسلمانوں پر خود ان کے وطن کی زمین اس طرح تنگ کر دی تھی کہ وہ وطن ان کو کاٹے کھا رہا تھا اور باوجودیکہ وطن کی محبت ایک فطری چیز ہے لیکن وہ اس سے اس قدر بیزار تھے کہ اس کو ظالم باشندوں کی بستی کہتے ہیں اس کی طرف کسی قسم کا انتساب اپنے لیے گوارا کرنے پر تیار نہیں ہیں۔

دوسری یہ کہ کوئی وطن اسی وقت تک اہل ایمان کے لیے وطن کی حیثیت رکھتا ہے جب تک اس کے اندر ان کے دین و ایمان کے لیے امن ہو۔ اگر دین و ایمان کو اس میں امن حاصل نہ ہو تو وہ وطن نہیں بلکہ وہ خونخوار درندوں کا بھٹ، سانپوں اور اژدہوں کا مسکن اور شیطانوں کا مرکز ہے۔

تیسری یہ کہ اس زمانے میں حالات اس قدر مایوس کن تھے کہ مظلوم مسلمانوں کو ظاہر میں نجات کی کوئی راہ بھی سجھائی نہیں دے رہی تھی۔ سارا بھروسہ بس اللہ کی مدد پر تھا کہ وہی غیب سے ان کے لیے کوئی راہ کھولے تو کھولے۔ اس کے باوجود یہ مسلمان اپنے ایمان پر ثابت قدم رہے۔ اللہ اکبر! کیا شان تھی ان کی استقامت کی! پہاڑ بھی اس استقامت کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

چوتھی یہ کہ اگر کہیں مسلمان اس طرح کی مظلومیت کی حالت میں گھر جائیں تو ان تمام مسلمانوں پر جو ان کی مدد کرنے کی پوزیشن میں ہوں جہاد فرض ہو جاتا ہے۔ اگر وہ ان کی مدد کے لیے نہ اٹھیں تو یہ صریح نفاق ہے۔

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا

أَوْلِيَاءَ الشَّيْطٰنِ ۚ إِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيفًا (۷۶)

طاغوت کے لفظ پر بحث بقرہ اور آل عمران دونوں کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔ یہاں قرآن نے فَقَاتِلُوْا أَوْلِيَاءَ الشَّيْطٰنِ کہہ کر خود واضح فرما دیا کہ طاغوت سے مراد شیطان ہے۔

یہ آیت اہل ایمان کی حوصلہ افزائی کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان کی جنگ خدا کی راہ میں ہوتی ہے اور خدا ان کے سر پر ہوتا ہے۔ برعکس اس کے اہل کفر کی جنگ شیطان کی راہ میں ہوتی ہے اور شیطان ان کے سر پر ہوتا ہے۔ گویا مقابلہ اصلاً رحمان اور شیطان کے درمیان ہوتا ہے۔ چونکہ خدا نے شیطان کو بھی ایک محدود دائرے کے اندر مہلت دی ہے اس وجہ سے وہ اپنے حامیوں کو کچھ چالیں بتاتا اور سکھاتا ہے لیکن آخر خدا کے کید متین کا مقابلہ وہ اور اس کے اولیا کیا کر سکتے ہیں؟ اس وجہ سے اہل ایمان کو ان سے ڈرنا نہیں چاہیے۔ اگر انھوں نے خدا کی وفاداری میں کوئی کمزوری نہیں دکھائی تو بہر حال کامیابی انھی کی ہے۔

شیطان کی چالوں میں کمزوری کے جو فطری اسباب مضمر ہیں ان پر گفتگو کے لیے موزوں مقام دوسرا ہے۔ یہاں صرف اتنی بات یاد رکھیے کہ کسی کام کی کوئی مضبوط بنیاد اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتی جب تک وہ بنیاد حق پر نہ ہو۔ شیطان کے ہر کام کی بنیاد چونکہ باطل پر ہوتی ہے اس وجہ سے اس کے مستحکم ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۲۶۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۷۷-۸۵

آگے انھیں منافقین کی مزید کمزوریاں اور شرارتیں واضح کی جا رہی ہیں تاکہ مسلمان ان کے فتنوں سے آگاہ ہو جائیں اور ان کی وسوسہ اندازیوں سے مسلمانوں کے اندر جو غلط اور منافیِ توحید و اسلام رجحانات ابھر سکتے ہیں ان کا اچھی طرح ازالہ ہو جائے۔

پہلے ان منافقین کے اس عجیب و غریب رویے پر توجہ دلائی کہ اب تک تو یہ اپنے ایمان و اخلاص کی دھونس جمانے کے لیے بہت بڑھ بڑھ کر جہاد کے لیے مطالبہ کر رہے تھے، معلوم ہوتا تھا کہ ان میں سے ایک ایک شخص جہاد کے عشق سے سرشار ہے لیکن پیغمبر کی طرف سے ان کو صبر و انتظار کی ہدایت کی جاتی تھی کہ ابھی اس کا وقت نہیں آیا ہے، ابھی نماز اور زکوٰۃ کے اہتمام کے ذریعے سے اپنے آپ کو مضبوط اور منظم کرو تاکہ وقت آنے پر پوری مومنانہ شانِ استقامت کے ساتھ خدا کی راہ میں لڑ سکو۔ لیکن اب جب کہ جنگ کا حکم دے دیا گیا ہے تو چھپتے پھرتے ہیں اور خدا سے زیادہ انسانوں سے ڈرتے ہیں اور شاکی ہیں کہ اتنی جلدی جہاد کا حکم کیوں دے دیا گیا ہے۔

اس کے بعد ان کو مخاطب کر کے فرمایا کہ فرائض سے فرار موت سے بچنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

موت اپنے وقت ہی پر آئے گی اور جب اس کا وقت آجائے گا تو وہ ہر شخص کو ڈھونڈھ نکالے گی خواہ وہ کتنے ہی مضبوط قلعوں کے اندر چھپا بیٹھا ہو۔

پھر منافقین کے ایک خاص ذہنی الجھاؤ سے پردہ اٹھایا ہے کہ ان لوگوں کا عقیدہ یہ نہیں ہے کہ پیغمبر جو کچھ بھی کرتے ہیں خدا ہی کے حکم اور خدا ہی کی رہنمائی ہیں کرتے ہیں۔ اس وجہ سے اگر انھیں کامیابی حاصل ہو تو اس کو تو یہ خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں اور اگر کوئی افتاد پیش آجائے تو اس کو پیغمبرؐ کی بے تدبیری کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ محض ان کی ناسمجھی ہے۔ خیر ہو یا شر سب خدا ہی کی مشیت سے ظہور میں آتا ہے۔ اس کارخانہ کائنات میں دو مشیتیں کار فرما نہیں ہیں، صرف ایک ہی کی مشیت کارفرما ہے۔ البتہ یہ بات ہے کہ شر جب ظہور میں آتا ہے تو وہ انسان کے اپنے اعمال پر مترتب ہوتا ہے۔

اس کے بعد اس بات کی طرف اشارہ فرمایا کہ اگران کو تمھاری رسالت کے باب میں تردد ہے تو ہوا کرے۔ بہرحال تم اللہ کے رسول ہو اور تمھاری رسالت پر اللہ کی گواہی کافی ہے۔ اب اللہ کی اطاعت کی راہ یہی ہے کہ لوگ تمھاری اطاعت کریں، جو تمھاری اطاعت سے گریز کرنا چاہتا ہے وہ جہاں چاہے بھٹکتا پھرے، تمھارے اوپر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

پھر فرمایا کہ ان لوگوں کے دوغلے پن کا یہ حال ہے کہ جب تمھارے پاس ہوتے ہیں اور تم اللہ کی آیات اور اس کے احکام ان کو سناتے ہو تو ہر بات پر سر تسلیم خم کرتے ہیں لیکن جب تمھارے پاس سے ہٹتے ہیں تو قرآن کے خلاف آپس میں طرح طرح کی سرگوشیاں کرتے اور باتیں بناتے ہیں، اس کی جو باتیں اپنے اغراض و خواہشات کے خلاف پاتے ہیں انھیں اپنی نجی مجلسوں میں نکتہ چینیوں اور اعتراضات کا ہدف بناتے ہیں۔ ایک طرف قرآن کو اللہ کی کتاب بھی مانتے ہیں اور اس کے آگے سر تسلیم خم کرنے کا اظہار بھی کرتے ہیں، دوسری طرف اس کی بہت سی باتوں کی مخالفت بھی کرتے ہیں۔ گویا انھوں نے قرآن کو بیک وقت دو ارادوں کا ملغوبہ سمجھ رکھا ہے، جس میں کچھ حصہ تو اللہ کی طرف سے ہے جسے یہ مانتے ہیں اور کچھ حصہ غیر اللہ کی طرف سے ہے جس کی یہ مخالفت کرتے ہیں۔ حالانکہ قرآن کی وحدت اور اس کی ہم رنگی و ہم آہنگی اس بات کی نہایت قطعی شہادت ہے کہ اس میں مختلف ارادوں کی کارفرمائی نہیں ہے بلکہ یہ ایک ہی خدائے علیم و حکیم کا اتارا ہوا ہے۔ اگر اس میں اللہ کے سوا غیر اللہ کی بھی کوئی مداخلت ہوتی تو اس میں قدم قدم پر تناقض ہوتا اس لیے کہ دو مختلف ارادوں اور دماغوں کی لکھی ہوئی چیز میں اختلاف و تناقض کا پایا جانا لازمی ہے۔

اس کے بعد منافقین کی ایک شرارت کا ذکر فرمایا کہ یہ لوگ مسلمانوں سے متعلق امن یا خطرے کی کوئی بات سنتے ہیں تو اس کو لے اڑتے ہیں اور لوگوں کے اندر سنسنی پیدا کرنے کے لیے اس کو پھیلا

دیتے ہیں، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ ملت کے بدخواہ اور اس کے اندر انتشار کے خواہاں ہیں۔ اگر یہ خیر خواہ ہوتے تو اس طرح کی کوئی بات اگر ان کے علم میں آتی تو پہلے اس کو رسولؐ اور امت کے اربابِ حل و عقد کے سامنے لاتے تاکہ وہ اس کے تمام پہلوؤں پر غور کر کے فیصلہ کر سکتے کہ اس صورت میں کیا قدم اٹھانا چاہیے۔

آخر میں فرمایا کہ جنگ کا جو حکم تمہیں دیا جا رہا ہے اس میں تم پر اصل ذمہ داری تمہارے اپنے ہی نفس کی ہے، تم خود اٹھو اور مومنین مخلصین کو اٹھنے کی ترغیب دو۔ اللہ چاہے گا تو تمہارے ہی ذریعہ سے وہ ان کفار کا زور توڑ دے گا۔ اللہ بڑی زبردست طاقت والا ہے۔ رہے یہ منافقین تو ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ جو کسی کارِ خیر میں تعاون کرتا اور اس کے حق میں لوگوں کو ابھارتا ہے وہ اس میں سے حصہ پائے گا اور جو کسی کارِ خیر سے خود رکتا ہے اور دوسروں کو روکنے کی کوشش کرتا ہے وہ اپنے اس عمل سے حصہ پائے گا ــــ اب اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

آیات ۷۷-۸۵

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ قِيلَ لَهُمْ كُفُّوا أَيْدِيَكُمْ وَأَقِيمُوا الصَّلَوٰةَ وَآتُوا الزَّكَوٰةَ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللَّهِ أَوْ أَشَدَّ خَشْيَةً ۚ وَقَالُوا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْلَا أَخَّرْتَنَا إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ ۗ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقَىٰ وَلَا تُظْلَمُونَ فَتِيلًا ﴿٧٧﴾ أَيْنَمَا تَكُونُوا يُدْرِككُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنتُمْ فِي بُرُوجٍ مُّشَيَّدَةٍ ۗ وَإِن تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَقُولُوا هَٰذِهِ مِنْ عِندِ اللَّهِ ۖ وَإِن تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَقُولُوا هَٰذِهِ مِنْ عِندِكَ ۚ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِندِ اللَّهِ ۖ فَمَالِ هَٰؤُلَاءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ حَدِيثًا ﴿٧٨﴾ مَّا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللَّهِ ۖ وَمَا أَصَابَكَ مِن سَيِّئَةٍ فَمِن نَّفْسِكَ ۚ وَأَرْسَلْنَاكَ لِلنَّاسِ

رَسُوْلًا ۚ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿۷۹﴾ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ
اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ﴿۸۰﴾ وَيَقُوْلُوْنَ
طَاعَةٌ ۡ فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ
الَّذِىْ تَقُوْلُ ۭ وَاللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ ۚ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ
عَلَى اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۸۱﴾ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۭ وَلَوْ
كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ﴿۸۲﴾
وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ۭ وَلَوْ
رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ
يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ۭ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ
لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۸۳﴾ فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا
تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ
بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَاللّٰهُ اَشَدُّ بَاْسًا وَّاَشَدُّ تَنْكِيْلًا ﴿۸۴﴾
مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ
يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى
كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا ﴿۸۵﴾

ترجمۂ آیات ۷۷ - ۸۵

تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن سے کہا جاتا تھا کہ اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز کا اہتمام رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو تو جب ان پر جنگ فرض کر دی گئی تو ان میں سے ایک گروہ لوگوں سے اس طرح ڈرتا ہے جس طرح اللہ سے

ڈرا جاتا ہے، یا اس سے بھی زیادہ۔ وہ کہتے ہیں اے ہمارے رب تو نے ہم پر جنگ کیوں فرض کر دی، کچھ اور مہلت کیوں نہ دی۔ کہہ دو اس دنیا کی متاع بہت قلیل ہے اور جو لوگ تقویٰ اختیار کریں گے ان کے لیے آخرت اس سے کہیں بڑھ کر ہے، اور تمھارے ساتھ ذرا بھی حق تلفی نہ ہوگی۔ اور موت تم کو پالے گی تم جہاں کہیں بھی ہو گے، اگرچہ مضبوط قلعوں کے اندر ہی ہو۔ اور اگر ان کو کوئی کامیابی حاصل ہوتی ہے تو کہتے ہیں یہ خدا کی طرف سے ہے اور اگر کوئی گزند پہنچ جائے تو کہتے ہیں یہ تمھارے سبب سے ہے۔ کہہ دو ان میں سے ہر ایک اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ کوئی بات سمجھنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ تمھیں جو سکھ بھی پہنچتا ہے خدا کی طرف سے پہنچتا ہے اور جو دکھ پہنچتا ہے وہ تمھارے اپنے نفس کی طرف سے پہنچتا ہے اور اے رسول ہم نے تم کو لوگوں کے لیے رسول بنا کر بھیجا ہے اور اللہ کی گواہی کافی ہے اور جو رسول کی اطاعت کرتا ہے اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے روگردانی کی تو ہم نے اس پر تم کو نگران نہیں مقرر کیا۔ ۷۷-۸۰

اور یہ کہتے ہیں کہ سر تسلیم خم ہے، پھر جب تمھارے پاس سے ہٹتے ہیں تو ان میں سے ایک گروہ بالکل اپنے قول کے برخلاف مشورت کرتا ہے اور اللہ لکھ رہا ہے جو سرگوشیاں وہ کر رہے ہیں۔ تو ان سے اعراض کرو اور اللہ پر بھروسہ رکھو اور اللہ بھروسہ کے لیے کافی ہے۔ اور کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے اور اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں وہ بڑا اختلاف پاتے۔ ۸۱-۸۳

اور جب ان کو کوئی بات امن یا خطرے کی پہنچتی ہے تو وہ اسے پھیلا دیتے ہیں اور اگر یہ اس کو رسول اور اپنے اولوالامر کے سامنے پیش کرتے تو جو لوگ ان میں سے بات کی تہہ کو پہنچنے والے ہیں وہ اس کو اچھی طرح سمجھ لیتے۔ اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تھوڑے سے لوگوں کے سوا تم شیطان کے پیچھے لگ جاتے۔ ۸۳

پس اللہ کی راہ میں جنگ کرو۔ تم پر اپنی جان کے سوا کسی کی ذمہ داری نہیں ہے اور مومنوں کو اس کے لیے ابھارو۔ توقع ہے کہ اللہ کافروں کے دباؤ کو روک دے اور اللہ بڑے زور والا اور عبرت انگیز سزا دینے والا ہے۔ جو کسی اچھی بات کے حق میں کہے گا اس کے لیے اس میں سے حصہ ہے اور جو اس کی مخالفت میں کہے گا اس کے لیے اس میں سے حصہ ہے اور اللہ ہر چیز کی طاقت رکھنے والا ہے۔ ۸۵

۲۷- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۚ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً ۚ وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۭ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۣ وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا (۷۷)

گفتار کے غازی عمل کے بودے

اس دور میں کفار کے علاقوں میں مسلمانوں کی مظلومیت اور بے بسی کا جو حال تھا اس کا ذکر اوپر کی آیات میں گزر چکا ہے۔ ان حالات سے مدینہ کے مسلمانوں کے اندر جنگ کا احساس پیدا ہونا ناگزیر تھا۔ مسلمان اپنے اس احساس کا ذکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کرتے تو منافقین بھی پورے جوش و خروش سے جذبۂ جنگ کا اظہار کرتے بلکہ اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کے لیے کچھ زیادہ ہی جوش و خروش کا اظہار کرتے۔ قاعدہ ہے کہ جس کا عمل کمزور ہو وہ ایک قسم کے احساسِ کمتری میں مبتلا ہو جاتا ہے جس

کے سبب سے اسے لاف زنی کا سہارا لینا پڑتا ہے تاکہ اس کی بزدلی کا راز دوسروں پر کھلنے نہ پائے۔ چنانچہ منافقین بھی زبان سے بڑے ولولے کا اظہار کرتے لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم انھیں روکتے کہ ابھی انتظار کرو اور نماز کے اہتمام اور زکوٰۃ کے ذریعے سے اپنے تعلق باللہ، اپنی تنظیم اور اپنے جذبۂ انفاق کو ترقی دو۔ لیکن جب اس کا وقت آگیا اور جنگ کا حکم دیا گیا تو زبان کے ان غازیوں کا سارا جوش سرد پڑ گیا، اب یہ چھپنے کی کوشش کرتے اور دل میں جو رعب اور خشیت خدا کے لیے ہونی چاہیے اس سے زیادہ دہشت ان کے دلوں پر انسانوں کے لیے طاری تھی۔ یہ دل ہی دل میں کہتے کہ اے خدا اتنی جلدی تو نے یہ جنگ کا حکم کیوں دے دیا، کچھ اور مہلت کیوں نہ دی۔ 'قَالُوْا' کا لفظ یہاں ان کی ذہنی حالت کی تعبیر کر رہا ہے۔ عربی زبان اور قرآن میں اس کی مثالیں بہت ہیں۔ فرمایا کہ ان سے کہہ دو کہ اس دنیا کی زندگی اور اس کا عیش و آرام تو چند روزہ ہے۔ اس کے لیے اتنی بے قراری کیوں ہے۔ عیشِ دوام تو آخرت میں ہے جو لوگوں سے ڈرنے والوں کے بجائے اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے ہے۔ اس کے لیے کمر باندھیں اور اطمینان رکھیں کہ جو کریں گے اس میں سے رتی رتی کا صلہ پائیں گے۔ ذرا بھی ان کے ساتھ کمی نہیں کی جائے گی۔

جہاد اور نماز و زکوٰۃ میں گہری مناسبت

اس آیت سے یہ بات نکلتی ہے کہ اسلامی جنگ کی روح اور نماز و زکوٰۃ میں نہایت گہری مناسبت ہے۔ جو لوگ خدا کی راہ میں لڑنے کے لیے تیار ہو رہے ہوں ان کے لیے اسلحہ کی ٹریننگ سے زیادہ ضروری اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ ہے۔ جہاد میں جو للّٰہیت، اخلاص اور نظم و طاعت کی جو پابندی مطلوب ہے اس کی بہترین تربیت نماز سے ہوتی ہے اور اس کے لیے انفاق فی سبیل اللہ کا جو جذبہ درکار ہے وہ ایتائے زکوٰۃ کی پختہ عادت سے نشوونما پاتا ہے۔ ان صفات کے بغیر اگر کوئی گروہ جنگ کے لیے اٹھ کھڑا ہو تو اس جنگ سے کوئی اصلاح وجود میں نہیں آسکتی، اس سے صرف فساد فی الارض میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ یہی حکمت ہے کہ اسلامی جنگ کے سخت سے سخت حالات میں بھی نماز کے اہتمام و التزام کی تاکید ہوئی۔ آگے اسی سورہ میں اس مسئلے پر ہم بحث کرنے والے ہیں اس وجہ سے یہاں اشارے پر کفایت کرتے ہیں۔

اَیْنَ مَا تَكُوْنُوْا یُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِیْ بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَةٍ ؕ وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ یَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَیِّئَةٌ یَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ؕ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ فَمَالِ هٰۤؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا یَكَادُوْنَ یَفْقَهُوْنَ حَدِیْثًا (۷۸)

'بروج'، 'برج' کی جمع ہے۔ اپنے ابتدائی مفہوم میں تو یہ کسی نمایاں اور واضح چیز کے لیے استعمال ہوا، لیکن پھر یہ بلند عمارتوں اور قلعوں کے لیے معروف ہو گیا۔ اس کے ساتھ 'مُشَیَّدَة' کی صفت بلندی اور استحکام دونوں مفہوموں پر مشتمل ہے۔

خوفِ موت کی علت اور اس کا علاج

اب یہ ان منافقین کے خوفِ موت کی علت بھی واضح فرمائی ہے اور اس عقیدے کو بھی بیان فرمایا ہے جو اس خوف کا واحد علاج ہے۔ فرمایا کہ موت سے کسی کے لیے مفر نہیں ہے، جس کی موت جس گھڑی، جس مقام اور جس شکل میں لکھی ہے وہ آکے رہے گی، آدمی مضبوط سے مضبوط قلعوں کے اندر چھپ کے بیٹھے وہاں بھی موت اس کو ڈھونڈھ لے گی، اس وجہ سے اس سے ڈرنا اور بھاگنا بے سود ہے۔ آدمی پر جو فرض جس وقت عاید ہوتا ہے اس کو عزم و ہمت سے ادا کرے اور موت کے مسئلے کو خدا پر چھوڑے۔ آدمی کے لیے یہ بات تو جائز نہیں ہے کہ وہ تدابیر اور احتیاطوں سے گریز اختیار کرے اس لیے کہ اس کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ خدا کو آزمائے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بات بھی جائز نہیں ہے کہ وہ یہ گمان رکھے کہ وہ اپنی تدابیر سے اپنے آپ کو موت سے بچا سکتا ہے۔

رسول کا ہر کام خدا کی رہنمائی میں ہوتا ہے

پھر منافقین کی ایک اور حماقت کی طرف بھی اشارہ فرمایا جس کو ان کی اس بزدلی کی پرورش میں بڑا دخل تھا وہ یہ کہ حق و باطل کی اس کشمکش کے دوران میں جو نرم و گرم حالات پیش آ رہے تھے وہ ان سب کو خدا کی طرف سے نہیں سمجھتے تھے بلکہ کامیابیوں کو تو خدا کی طرف سے سمجھتے، لیکن کوئی مشکل یا کوئی آزمائش پیش آ جاتی تو اسے پیغمبر کی بے تدبیری پر محمول کرتے کہ یہ مدبر لیڈر نہیں ہیں اس وجہ سے غلط اندازے اور غلط فیصلے کرتے ہیں جس کے نتائج غلط نکلتے ہیں (چنانچہ سورۂ آل عمران میں یہ بات گزر چکی ہے کہ منافقین نے احد کی شکست کی ساری ذمہ داری آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ڈالنے کی کوشش کی کہ انھی کی بے تدبیری سے یہ شکست پیش آئی) اس سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ یہ لوگ نہ تو یہ مانتے تھے کہ کائنات میں صرف خدا ہی کی مشیت کارفرما ہے اور نہ یہ مانتے تھے کہ رسول کا ہر کام خدا کے حکم کے تحت ہوتا ہے۔ بظاہر تو آپ کی رسالت کا اقرار کرتے لیکن باطن میں ان کے یہی خیال چھپا ہوا تھا کہ آپ سارے کام اپنی رائے اور تدبیر سے کرتے ہیں۔ ان کے اس واہمے کی تردید کے لیے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی گئی کہ ان پر واضح فرما دیجیے کہ کامیابی ہو یا ناکامی، دکھ ہو یا سکھ، ان میں سے کوئی چیز بھی میری طرف سے نہیں ہے بلکہ سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے ہے اس لیے بھی کہ میں کوئی کام خدا کے حکم کے بغیر نہیں کرتا اور اس لیے بھی کہ متصرفِ حقیقی اس کائنات کا اللہ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ہی ہے، اس کی مشیت کے بغیر نہ اس دنیا میں کسی کو دکھ پہنچ سکتا ہے نہ سکھ۔ لیکن ان لوگوں کا حال تو یہ ہے کہ کسی بات کو سمجھنے کے پاس ہی نہیں پھٹکتے۔

مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ز وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ط وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ط وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ج وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۝ (۷۹-۸۰)

یہ آیتیں اوپر والی آیت ہی کے بعض اجمالات کو واضح کر رہی ہیں۔ پہلے ان لوگوں کو، جو کامیابیوں

کو اللہ تعالیٰ کی طرف اور ناکامیوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر رہے تھے، مخاطب کرکے فرمایا کہ اصل حقیقت تو یہی ہے کہ خیر و شر ہر چیز کا ظہور خدا ہی کی مشیت سے ہوتا ہے۔ اس کے حکم و اذن کے بغیر کوئی چیز بھی ظہور میں نہیں آ سکتی۔ لیکن خیر اور شر میں یہ فرق ہے کہ خیر خدا کی رحمت کے تقاضا سے ظہور میں آتا ہے اور شر انسان کے اپنے اعمال پر مترتب ہوتا ہے۔ اس پہلو سے شر کا تعلق انسان کے اپنے نفس سے ہے۔

خیر خدا کی رحمت کا تقاضا ہے اور شر انسان کے اپنے اعمال پر مترتب ہوتا ہے

یہ حقیقت یہاں ملحوظ رہے کہ اللہ تعالیٰ خیر مطلق ہے۔ اس نے یہ دنیا اپنی رحمت کے لیے بنائی ہے۔ اس وجہ سے اس کی طرف کسی شر کی نسبت اس کی پاکیزہ صفات کے منافی ہے۔ شر جتنا کچھ بھی ظہور میں آتا ہے وہ صرف انسان کے اپنے اختیار کے سوء استعمال سے ظہور میں آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک خاص دائرے کے اندر آزادی بخشی ہے۔ یہ آزادی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ اسی پر انسان کے تمام شرف کی بنیاد ہے۔ اسی کی وجہ سے انسان آخرت میں جزا و سزا کا مستحق ٹھہرے گا۔ اگر یہ آزادی انسان کو حاصل نہ ہوتی تو حیوان اور انسان کے درمیان کوئی فرق نہ ہوتا۔ لیکن اس آزادی کے متعلق یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ یہ غیر محدود اور غیر مقید نہیں ہے بلکہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، ایک خاص دائرے کے اندر محدود ہے۔ پھر اس دائرے کے اندر بھی یہ خدا کی مشیت اور اس کی حکمت کے تحت ہے۔ خدا کے اذن و مشیت کے بغیر انسان اپنے کسی ارادے کو پورا نہیں کر سکتا۔ نیک ارادے بھی اسی کی توفیق بخشی سے پورے ہوتے ہیں اور برے ارادے بھی اسی کے مہلت دینے سے بروئے کار آتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کسی کے کسی برے ارادے کو بروئے کار آنے دیتا ہے تو اس پہلو سے تو وہ خدا کی طرف منسوب ہوتا ہے کہ اس کا بروئے کار آنا خدا ہی کے اذن و مشیت سے ہوا لیکن دوسرے پہلو سے وہ انسان کا فعل ہے کیونکہ اس کا ارادہ انسان نے خود کیا۔

شر کو مہلت دینے کی حکمت

پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی فرد یا جماعت کے کسی شر کو سر اٹھانے کی مہلت دیتا ہے تو اس لیے دیتا ہے کہ اس میں بحیثیت مجموعی اس کی خلق کے لیے کوئی حکمت و مصلحت مدنظر ہوتی ہے۔ بعض اوقات اس ڈھیل سے اہل حق کی آزمائش ہوتی ہے کہ اس سے ان کی کمزوریاں دور ہوں اور ان کی خوبیاں نشو و نما پائیں۔ بعض اوقات اس سے اہل باطل پر حجت تمام کرنا اور ان کے پیمانے کو لبریز کرنا ہوتا ہے۔ بعض اوقات قدرت خود ایسے حالات پیدا کرتی ہے جن سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ طبائع کے اندر جو کچھ دبا ہوا ہے وہ ابھرے۔ اس سے نیکیاں بھی ابھرتی ہیں اور جن کے اندر بدیاں مضمر ہوتی ہیں، ان کی بدیاں بھی ابھرتی ہیں۔

رسول کی کسی بات پر اقتناض اس کی رسالت کے انکار کو مستلزم ہے

منافقین کو مخاطب کرنے کے بعد آگے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے فرمایا کہ اگر یہ منافقین تمہاری رسالت کے باب میں متردد ہیں اور تمہارے ہر قول و فعل کو خدا کی طرف سے نہیں سمجھتے تو اس بات کی پروا نہ کرو۔ تمہاری رسالت ان کی گواہی کی محتاج نہیں ہے۔ اس پر خدا کی گواہی کافی ہے۔ یہ لوگ

مانیں یا نہ مانیں، اب اللہ کی اطاعت کی واحد راہ یہی ہے کہ لوگ تمہاری اطاعت کریں۔ خدا کی اطاعت رسول ہی کی اطاعت کے واسطے سے ہوتی ہے۔ جو لوگ تم سے اعراض کریں تم ان کی ہدایت کے ذمہ دار بنا کے نہیں بھیجے گئے ہو، ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ اب ذمہ داری تمہاری نہیں بلکہ خود ان کی ہے۔

اگر التباس نہ ہو تو ضمیر کے انتشار میں کوئی قباحت نہیں

یہاں خطاب ایک ہی سیاق میں منافقین سے بھی ہوا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی۔ لیکن ایسے مواقع میں اس طرح کے خطاب میں کوئی حرج نہیں ہے جہاں التباس کا اندیشہ نہ ہو۔ چونکہ پہلی بات واضح طور پر منافقین ہی کو مخاطب کر کے کہی جا سکتی تھی اس لیے کہ یہ انہی کے شبہے کا جواب ہے اس وجہ سے یہاں کسی التباس کا اندیشہ نہیں تھا۔ پھر دوسرے ٹکڑے میں آنحضرت صلعم کو مخاطب کر کے جو بات کہی گئی ہے اس میں بھی غور کیجیے تو روئے سخن درحقیقت منافقین ہی کی طرف ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان سے اعراض کے اظہار کے طور پر ان کو مخاطب کرنے کے بجائے اپنے رسول کو مخاطب کر لیا۔ گویا ان کی طرف سے رسول کی اس ناقدری کے بعد اب وہ اس بات کے اہل نہیں رہے کہ ان کو خطاب کر کے ان سے رسول کے باب میں کوئی بات کہی جائے۔

وَيَقُولُونَ طَاعَةٌ فَإِذَا بَرَزُوا مِنْ عِندِكَ بَيَّتَ طَائِفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِي تَقُولُ ۖ وَاللَّهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُونَ ۖ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَكِيلًا ۝ أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ ۚ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِندِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا (۸۱-۸۲)

مبتدا کے حذف کا فائدہ

'طاعۃ' خبر ہے۔ مبتدا اس کا محذوف ہے اور یہ بات ہم واضح کر چکے ہیں کہ جب مبتدا کو حذف کر دیا جائے تو مقصود سارا زور خبر پر دینا ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب وہ پیغمبر کی مجلس میں ہوتے ہیں اور پیغمبر ان کو خدا کا کلام اور اس کے احکام سناتے ہیں تو وہ ہر بات پر کہتے ہیں کہ سر تسلیم خم ہے۔

'بیّت یبیّت' کا مفہوم

'بَیَّتَ یُبَیِّتُ' کے معنی اصلاً تو کوئی عمل رات میں کرنے کے آتے ہیں لیکن اپنے عام استعمال میں یہ لفظ رات کی قید سے مجرد ہو کر چھپ کر کوئی کام، کوئی مشورہ، کوئی رائے کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ الفاظ کے اس طرح اپنے ابتدائی مفہوم سے مجرد ہو جانے کی مثالیں عربی زبان میں بہت ہیں۔ اضحی اور بات بھی اپنے عام استعمال میں دن اور رات کی قید سے مجرد ہو کر استعمال ہوتے ہیں۔ یہاں مطلب یہ ہے کہ نبی کی مجلس میں تو یہ ہر بات پر سر تسلیم خم کرتے ہیں لیکن جب وہاں سے ہٹتے ہیں تو اپنی مجلسوں میں ان آیات و احکام کے خلاف مشورے کرتے ہیں جن کو اپنی خواہشات اور اپنے مفاد ذاتی کے خلاف پاتے ہیں۔

ان کے اس رویے پر قرآن نے پہلے تو ان کو دھمکی دی کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کی یہ ساری باتیں نوٹ ہو رہی ہیں، وہ یہ نہ سمجھیں کہ اگر وہ چھپ کر یہ سرگوشیاں کر رہے ہیں تو خدا سے بھی یہ چھپی ہوئی ہیں، ایک دن یہ سارا ریکارڈ ان کے سامنے آ جائے گا۔ اس کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی کہ آپ

ان سے اعراض فرمائیے اور خدا پر بھروسہ کیجیے، خدا کا بھروسہ کافی ہے، یہ شامت زدہ لوگ ان سرگوشیوں سے دینِ حق کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکیں گے، جو بگاڑیں گے، اپنا ہی بگاڑیں گے۔

قرآن میں منہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے ارادے کا کوئی دخل نہیں

پھر منافقین کے اس تضادِ فکر کی طرف ان کو توجہ دلائی کہ ایک طرف قرآن اور پیغمبرؐ کی باتوں پر مہرِ تسلیم ثبت کرنا اور دوسری طرف اسی قرآن اور اسی پیغمبر کی باتوں کو ہدفِ اعتراض بنانا آخر کیا معنی رکھتا ہے؟ کیا ان کا خیال ہے کہ اس قرآن میں بیک وقت دو ارادوں (two minds) کی کارفرمائی ہے اس کی کچھ باتیں دانشمندانہ اور حکیمانہ ہیں جو سراہنے کے قابل ہیں اور کچھ باتیں خلافِ حکمت و مصلحت ہیں جو اعتراض و تنقید کی سزاوار ہیں؟ کیا وہ قرآن پر غور نہیں کرتے؟ اگر غور کرتے تو خود دیکھ لیتے کہ قرآن کی ہر بات اپنے اصول اور فروع میں اتنی مستحکم اور مربوط ہے کہ ریاضی اور اقلیدس کے فارمولے بھی اتنے مستحکم و مربوط نہیں ہو سکتے۔ وہ جن عقائد کی تعلیم دیتا ہے وہ ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ و پیوستہ ہیں کہ اگر ان میں سے کسی ایک کو بھی الگ کر دیجیے تو پورا سلسلہ ہی درہم برہم ہو جائے۔ وہ جن عبادات و طاعات کا حکم دیتا ہے وہ عقائد سے اس طرح پیدا ہوتی ہیں جس طرح تنے سے شاخیں پھوٹتی ہیں، وہ جن اعمال و اخلاق کی تلقین کرتا ہے وہ اپنے اصول سے اس طرح ظہور میں آتے ہیں جس طرح ایک شے سے اس کے قدرتی اور فطری لوازم ظہور میں آتے ہیں۔ اس کی مجموعی تعلیم سے زندگی کا جو نظام بنتا ہے وہ ایک بنیان مرصوص کی شکل میں نمایاں ہوتا ہے جس کی ہر اینٹ دوسری اینٹ سے اس طرح جڑی ہوتی ہے کہ ان میں سے کسی کو بھی الگ کرنا بغیر اس کے ممکن نہیں کہ پوری عمارت میں خلا پیدا ہو جائے۔

جس طرح اس کائنات کے اجزائے مختلفہ کا باہمی توافق اور ان کی سازگاری اس بات کی نہایت واضح شہادت ہے کہ اس کے اندر ایک ہی خدائے حی و قیوم کا ارادہ کارفرما ہے، کوئی اور اس میں شریک نہیں ہے اسی طرح اس کتابِ عزیز کے مختلف اجزا کی باہمی سازگاری و ہم آہنگی اس بات کی نہایت واضح دلیل ہے کہ یہ ایک ہی خدائے علیم و حکیم کی وحی ہے، اس میں کسی اور جن یا بشر کی کوئی مداخلت نہیں ہے۔ اس کائنات میں اگر مختلف ارادے کارفرما ہوتے تو یہ درہم برہم ہو کر رہ جاتی۔ اسی طرح اس کتاب عزیز میں بھی اگر کسی اور فکر کی دراندازی ہوتی تو یہ تناقضات اور اختلافات کا ایک پراگندہ دفتر بن کے رہ جاتی۔

یہ آیت اس زمانے کے ان لوگوں کے لیے اپنے اندر بڑی تنبیہ کا سامان رکھتی ہے جو ایک طرف تو قرآن کو اللہ کی کتاب مانتے ہیں، دوسری طرف اس کی ان تمام تعلیمات کو ہدفِ تنقید بھی بناتے ہیں جو ان کی خواہشات یا ان کے مزعومہ مصالح کے خلاف ہیں۔ ان کا یہ طرزِ عمل اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ وہ بھی ان منافقین ہی کی طرح اس کتاب میں خدا کے ساتھ غیر خدا کا ہاتھ بھی شریک مانتے ہیں، ورنہ آخر اس کے کیا معنی کہ اس کو خدا کی کتاب بھی مانا جائے اور پھر اس کی بہت سی باتوں کو اعتراض، تنقید، تضحیک اور استہزا کا نشانہ بھی بنایا جائے!

وَإِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَىٰ أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنبِطُونَهُ مِنْهُمْ وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطَانَ إِلَّا قَلِيلًا (۸۳)

اُولُوالْاَمْر پر بحث

'اُولُوالْاَمْر' پر بحث اسی سورہ کی آیت ۵۹ کے تحت گزر چکی ہے۔

استنباط کا مفہوم

'استنباط' کا اصل مفہوم کنواں کھود کر اس سے پانی نکالنا اور کسی پوشیدہ چیز کو ظاہر کرنا ہے۔ اپنے اسی مفہوم سے ترقی کر کے کسی بات کی تہ کو پہنچنے اور اس کی حقیقت کو پانے کے معنی میں یہ استعمال ہوا۔

منافقین کی دلچسپی افواہوں سے

منافقین چونکہ ملت کے خیر خواہ نہیں تھے اس وجہ سے افواہیں پھیلانے کے معاملے میں بڑے چابکدست تھے۔ امن یا خطرے کی جو بات بھی ان کو پہنچتی آن کی آن میں جنگل کی آگ کی طرح ان کے ذریعے سے لوگوں میں پھیل جاتی۔ جماعتی زندگی میں افواہیں عام حالات میں بھی بڑے خطرناک نتائج پیدا کر سکتی ہیں اور جب حالات جنگ کے ہوں، جیسے کہ اس وقت تھے، تب تو ان کی خطرناکی وہ چند ہو جاتی ہے۔ منافقین ان افواہوں سے یوں تو مختلف فائدے اٹھانے کی کوشش کرتے لیکن خاص طور پر مسلمانوں، بالخصوص کمزور مسلمانوں کے حوصلے پست کرنے کے لیے یہ ان کا خاص حربہ تھا۔ بعض مرتبہ وہ اس طرح کی افواہوں سے مسلمانوں کے اندر غلط قسم کا اطمینان بھی پیدا کرنے کی کوشش کرتے اور ظاہر ہے کہ بے جا تشویش کی طرح غلط اطمینان بھی ایک خطرناک چیز ہے۔

افواہوں کے بارے میں صحیح طرزِ عمل

فرمایا کہ اگر یہ اللہ، رسول اور ملت کے خیر خواہ ہوتے تو ان کے لیے صحیح طریقہ یہ تھا کہ اس طرح کی جو باتیں ان کے علم میں آئیں ان کو عوام میں سنسنی پیدا کرنے کا ذریعہ بنانے کے بجائے ان کو رسولؐ اور امت کے ارباب حل و عقد کے سامنے پیش کرتے تاکہ ان کے اندر جو لوگ معاملات کی گہری سوجھ بوجھ رکھتے ہیں ان کے موقع و محل کا تعین کرتے اور ان کے باب میں صحیح پالیسی اختیار کرتے۔ 'علم' کے معنی کسی شے کے موقع و محل کے تعین کے بھی آتے ہیں۔ ہم بقرہ میں 'قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ' (اور بنی اسرائیل کے ہر قبیلے نے اپنا اپنا گھاٹ متعین کر لیا) کے تحت لفظ کے اس مفہوم کی طرف اشارہ کر چکے ہیں۔

'وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ' الآیہ سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ اب بھی ان کے لیے سنبھل جانے کا موقع ہے۔ یہ اللہ کا فضل و احسان ہے کہ ابھی اس نے ان کو شیطان کے پیچھے بگ ٹٹ چل کھڑے ہونے کے لیے چھوڑ نہیں دیا ہے، ویسے ہے یہ بھی شیطان ہی کی راہ۔

اسلام میں سیاسی نظام کی اہمیت اور اولوالامر کا درجہ

اس آیت سے اسلام میں سیاسی نظام کی اہمیت و عظمت واضح ہوتی ہے کہ عوام کو اجتماعی نفع و ضرر کے معاملات میں مرجع و معتمد اپنے اولوالامر کو بنانا چاہیے۔ بطورِ خود اس طرح کی چیزوں کو عوام میں پھیلانا جائز نہیں ہے۔ اسی طرح اس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اسلام میں اولوالامر کے لیے ضروری ہے کہ وہ دین اور دنیا دونوں کی ایسی سوجھ بوجھ رکھنے والے ہوں کہ پیش آنے والے حالات و معاملات میں شریعت و مصلحت کے تقاضوں کے مطابق قدم اٹھا سکیں۔

فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ وَاللّٰهُ اَشَدُّ بَاْسًا وَّاَشَدُّ تَنْكِيْلًا ۝ مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ۚ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا (۸۴-۸۵)

'شفع' کا مفہوم

'شفع' کے معنی ہم سورۂ بقرہ کی تفسیر میں واضح کر چکے ہیں کہ ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ جوڑنے کے ہیں۔ اسی مفہوم سے ترقی کر کے کسی کی بات کی تائید و حمایت یا اس کے حق میں سفارش کرنے کے معنی میں یہ استعمال ہوا۔ یہاں شفاعت حسنہ اور شفاعت سیئہ دو قسم کی شفاعتوں کا ذکر ہے۔ شفاعت حسنہ تو ظاہر ہے کہ یہ ہوگی کہ کسی مقصدِ حق کو اس سے تائید و تقویت حاصل ہو۔ اس کے برعکس شفاعت سیئہ یہ ہے کہ اس سے تقویت و تائید کے بجائے اس مقصد کو نقصان پہنچے۔ منافقین، قرآن کی دعوتِ جہاد کے لیے لوگوں کو ابھارنے کے بجائے، جیسا کہ اوپر اشارہ ہوا اور آگے تفصیل آ رہی ہے، لوگوں کا حوصلہ پست کرنے کی کوشش کر رہے تھے اس وجہ سے قرآن نے ان کی اس کوشش کو شفاعت سیئہ سے تعبیر کیا۔

شفاعت حسنہ اور شفاعت سیئہ

'مقیت' کا مفہوم

'مقیت' کے معنی شہید و حفیظ اور مقتدر کے ہیں۔

یاد ہوگا، اس مجموعۂ آیات کا آغاز اس مضمون سے ہوا تھا کہ پہلے تو منافقین بہت بڑھ بڑھ کر جنگ و جہاد کی باتیں بناتے تھے لیکن اب جب کہ جنگ کا حکم دے دیا گیا ہے تو چھپتے پھرتے ہیں اور دوسروں کا حوصلہ بھی پست کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس کے بعد اسی سلسلہ کی دوسری باتیں زیر بحث آ گئی تھیں۔ اب یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا جا رہا ہے کہ آپ پر ذمہ داری صرف اپنے نفس کی ہے، آپ خود جنگ کے لیے اُٹھیے اور مسلمانوں کو اٹھنے کے لیے ابھاریے، جس کو توفیق ہوگی وہ اٹھے گا، جو نہیں اٹھے گا اس کی ذمہ داری آپ پر نہیں ہے۔ اللہ کے کام دوسروں پر منحصر نہیں ہوتے، وہ خود بڑی قوت رکھنے والا ہے اور مخالفوں کو عبرت انگیز سزا دینے والا ہے۔ وہ آپ کے اور آپ کے مخلص ساتھیوں ہی کے اندر اتنی قوت پیدا کر دے گا کہ اسی سے کفار کا زور ٹوٹ جائے گا۔

حق کی حمایت میں زبان سے کچھ کہنا بھی موجب اجر ہے

اس کے بعد فرمایا کہ منافقین جو ریشہ دوانیاں اور افواہ بازیاں مسلمانوں کا حوصلہ پست کرنے اور جہاد سے روکنے کے لیے کر رہے ہیں اس کی پروا نہ کیجیے۔ جو آج حق کی تائید و حمایت میں اپنی زبان کھولیں گے وہ اس کا اجر پائیں گے اور جو اس کے خلاف کہیں گے وہ اس کی سزا بھگتیں گے، خدا سب کچھ دیکھ رہا ہے اور ہر چیز پر قادر ہے۔

۲۸۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۸۶-۱۰۰

آیت ۸۱ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو منافقین سے اعراض کا جو حکم دیا گیا تھا اس کا اثر قدرتی طور پر جاں نثار صحابہؓ پر یہ پڑ سکتا تھا کہ جن کے باب میں ان کو شبہ بھی ہو جاتا کہ ان کا تعلق منافقین سے ہے،

ان سے وہ ربط ضبط اور سلام و کلام ختم کر دیتے اور اس طرح ایک معاشرتی بائیکاٹ کی شکل پیدا ہو جاتی جو ابھی اس مرحلے میں مطلوب نہیں تھی۔ اس وجہ سے ضروری ہوا کہ اس موقع پر مسلمانوں کو ایسی ہدایات دی جائیں جو ان کو اعتدال پر قائم رکھیں۔ وہ منافقین سے ہوشیار تو رہیں لیکن ان سے سلام و کلام بند نہ کریں۔ ابھی ان کو اصلاح حال کا اور موقع دیں۔ چنانچہ سب سے پہلے مسلمانوں کو یہ ہدایت فرمائی کہ جو تمہیں سلام کرے اس کو اس کے سلام کا اس سے بہتر جواب دو یا کم از کم یہ کہ اس کے سلام کو لوٹا دو۔

پھر ان لوگوں کو خطاب کر کے جو دارالحرب کے منافقین کے لیے اپنے دل میں بڑا نرم گوشہ رکھتے تھے، اور ان کی منافیٔ اسلام حرکات کے واضح ہونے کے باوجود یہ توقع رکھتے تھے کہ ان کے ساتھ روابط قائم رکھے جائیں گے تو بالآخر یہ اچھے مسلمان بن جائیں گے، فرمایا کہ یہ لوگ تو مسلمان بننے سے رہے البتہ اس بات کا اندیشہ ہے کہ تم ان کے ساتھ بندھے رہے تو یہ تمھیں بھی لے ڈوبیں گے۔ پھر ان کے مخلص سمجھے جانے کے لیے یہ کسوٹی قرار دی کہ یہ اپنے ماحول سے ہجرت کر کے تمھارے ساتھ آملیں۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو پھر ان سے تعلق رکھنے کے بجائے ان کو دشمن اور دشمنوں کا ساتھی سمجھو، ان کے ساتھ جنگ کرو۔

اس حکم عام سے صرف ان مسلمانوں کو مستثنیٰ کیا جن کا تعلق ایسے غیر مسلم قبائل سے ہو جن کے ساتھ مسلمانوں کا معاہدہ ہو یا معاہدہ تو نہ ہو لیکن ان قبائل کے مسلمان فی الحال اپنی غیر جانبداری باقی رکھنا چاہتے ہوں، نہ اپنی قوم کے ساتھ مل کر مسلمانوں سے لڑنے کے لیے تیار ہوں، نہ مسلمانوں کے ساتھ ہو کر اپنی قوم سے لڑنے کی جرأت کر رہے ہوں۔ فرمایا کہ اگر یہ اپنی غیر جانبداری باقی رکھیں، تم سے تعرض نہ کریں، تمھارے ساتھ ان کے تعلقات مصالحانہ رہیں تو تم بھی اُن کے خلاف کوئی جارحانہ اقدام نہ کرو۔ اس کے ساتھ یہ وضاحت بھی فرما دی کہ ضروری ہے کہ یہ غیر جانبداری واقعی اور حقیقی ہو۔ بعض جماعتیں ایسی ہیں جو بظاہر تو غیر جانبداری کی مدعی ہیں لیکن جب ان پر کفار کا دباؤ پڑ جاتا ہے تو یہ اسلام دشمنی کے لیے آمادہ ہو جاتی ہیں۔ ان کے بابت فرمایا کہ ان کے ساتھ دشمنوں ہی کا سا معاملہ کرو، اگر یہ تمھارے خلاف جارحانہ اقدام سے باز نہ آئیں تو تم بھی ان کو قتل کرو۔

اس کے بعد دارالحرب میں خطأً یا عمداً قتل ہو جانے والے مسلمانوں کی دیت کا حکم بیان فرمایا اور نہایت سخت الفاظ میں وعید فرمائی کہ جو شخص عمداً کسی مسلمان کو قتل کر دے گا اس کے لیے دائمی عذاب جہنم اور اس پر خدا کا غضب اور اس کی لعنت ہے۔ ساتھ ہی مسلمانوں کو ہدایت فرمائی کہ تم کفار کے جس علاقے پر حملہ کرو اس کے اندر کے مسلمانوں کے بارے میں پہلے اچھی طرح تحقیق کر لو تاکہ مسلمان تمھاری تلوار سے محفوظ رہیں اور اگر کوئی شخص اپنے ایمان کے اظہار کے لیے تمھیں سلام کرے تو تم محض طمع مال میں اس کو مسلمان تسلیم کرنے سے انکار نہ کرو۔

اس کے بعد تمام غیر معذور مسلمانوں کو جان و مال دونوں کے ساتھ خدا کی راہ میں جہاد پر ابھارا اور تمام غیر معذور

مسلمانوں کو دارالحرب اور دارالکفر سے ہجرت پر ابھارا ہے اور ان کے مراتب و مدارج بیان فرمائے ہیں۔ اب اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

آیات ۸۶-۱۰۰

وَإِذَا حُيِّيتُم بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوا بِأَحْسَنَ مِنْهَا أَوْ رُدُّوهَا ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ حَسِيبًا ﴿۸۶﴾ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ لَيَجْمَعَنَّكُمْ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَا رَيْبَ فِيهِ ۗ وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ حَدِيثًا ﴿۸۷﴾ فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنَافِقِينَ فِئَتَيْنِ وَاللَّهُ أَرْكَسَهُم بِمَا كَسَبُوا ۚ أَتُرِيدُونَ أَن تَهْدُوا مَنْ أَضَلَّ اللَّهُ ۖ وَمَن يُضْلِلِ اللَّهُ فَلَن تَجِدَ لَهُ سَبِيلًا ﴿۸۸﴾ وَدُّوا لَوْ تَكْفُرُونَ كَمَا كَفَرُوا فَتَكُونُونَ سَوَاءً ۖ فَلَا تَتَّخِذُوا مِنْهُمْ أَوْلِيَاءَ حَتَّىٰ يُهَاجِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۚ فَإِن تَوَلَّوْا فَخُذُوهُمْ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ وَجَدتُّمُوهُمْ ۖ وَلَا تَتَّخِذُوا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا ﴿۸۹﴾ إِلَّا الَّذِينَ يَصِلُونَ إِلَىٰ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيثَاقٌ أَوْ جَاءُوكُمْ حَصِرَتْ صُدُورُهُمْ أَن يُقَاتِلُوكُمْ أَوْ يُقَاتِلُوا قَوْمَهُمْ ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقَاتَلُوكُمْ ۚ فَإِنِ اعْتَزَلُوكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوكُمْ وَأَلْقَوْا إِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيلًا ﴿۹۰﴾ سَتَجِدُونَ آخَرِينَ يُرِيدُونَ أَن يَأْمَنُوكُمْ وَيَأْمَنُوا قَوْمَهُمْ كُلَّ مَا رُدُّوا إِلَى الْفِتْنَةِ أُرْكِسُوا فِيهَا ۚ فَإِن لَّمْ يَعْتَزِلُوكُمْ وَيُلْقُوا إِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَيَكُفُّوا أَيْدِيَهُمْ فَخُذُوهُمْ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ ۚ وَأُولَٰئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطَانًا مُّبِينًا ﴿۹۱﴾ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ أَن يَقْتُلَ مُؤْمِنًا

النصف

ع ۱۱ / ۸

ع ۱۲ / ۹

إِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ
مُّسَلَّمَةٌ إِلَىٰٓ أَهْلِهِۦٓ إِلَّآ أَن يَصَّدَّقُوا ۚ فَإِن كَانَ مِن قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ
وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۖ وَإِن كَانَ مِن قَوْمٍۭ بَيْنَكُمْ وَ
بَيْنَهُم مِّيثَٰقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلَىٰٓ أَهْلِهِۦ وَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۖ
فَمَن لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ۗ وَ
كَانَ اللّٰهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿۹۲﴾ وَمَن يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهُۥ
جَهَنَّمُ خَٰلِدًا فِيهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُۥ وَأَعَدَّ لَهُۥ عَذَابًا
عَظِيمًا ﴿۹۳﴾ يَٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ ءَامَنُوٓا إِذَا ضَرَبْتُمْ فِى سَبِيلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوا
وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ أَلْقَىٰٓ إِلَيْكُمُ السَّلَٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ تَبْتَغُونَ عَرَضَ
الْحَيَوٰةِ الدُّنْيَا ۚ فَعِندَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيرَةٌ ۚ كَذَٰلِكَ كُنتُم مِّن
قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوا ۚ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ
خَبِيرًا ﴿۹۴﴾ لَّا يَسْتَوِى الْقَٰعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ غَيْرُ أُولِى الضَّرَرِ وَ
الْمُجَٰهِدُونَ فِى سَبِيلِ اللّٰهِ بِأَمْوَٰلِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ ۚ فَضَّلَ اللّٰهُ
الْمُجَٰهِدِينَ بِأَمْوَٰلِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ عَلَى الْقَٰعِدِينَ دَرَجَةً ۚ وَكُلًّا
وَعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنَىٰ ۚ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجَٰهِدِينَ عَلَى الْقَٰعِدِينَ أَجْرًا
عَظِيمًا ﴿۹۵﴾ دَرَجَٰتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَرَحْمَةً ۚ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ﴿۹۶﴾ ع ۵ ۱۰
إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّىٰهُمُ الْمَلَٰٓئِكَةُ ظَالِمِىٓ أَنفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنتُمْ ۖ
قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِى الْأَرْضِ ۚ قَالُوٓا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللّٰهِ

وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ۚ فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۗ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ﴿۹۷﴾ اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا ﴿۹۸﴾ فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿۹۹﴾ وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ۗ وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۰۰﴾

۱۴ ع ۱۱

ترجمۂ آیات ۸۶-۱۰۰

اور جب تمھیں سلامتی کی کوئی دعا دی جائے تو تم بھی سلامتی کی اس سے بہتر دعا دو یا اسی کو لوٹا دو۔ اللہ ہر چیز کا حساب کرنے والا ہے۔ اللہ ہی معبود ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ تم سب کو قیامت کے دن کی طرف لے جا کے رہے گا جس کے آنے میں کوئی شک نہیں اور اللہ سے بڑھ کر سچی بات کہنے والا کون ہو سکتا ہے۔ ۸۶-۸۷

پس تمھیں کیا ہوا ہے کہ تم منافقین کے باب میں دو گروہ ہو رہے ہو۔ اللہ نے تو انھیں ان کے کیے کی پاداش میں پیچھے لوٹا دیا ہے، کیا تم ان کو ہدایت دینا چاہتے ہو جن کو خدا نے گمراہ کر دیا ہے؛ جن کو خدا گمراہ کر دے، تم ان کے لیے کوئی راہ نہیں پا سکتے۔ یہ تو آرزو رکھتے ہیں کہ جس طرح انھوں نے کفر کیا ہے تم بھی کفر کرو کہ تم سب برابر ہو جاؤ تو تم ان میں سے کسی کو اپنا ساتھی نہ بناؤ جب تک وہ اللہ کی راہ میں ہجرت نہ کریں۔ اگر وہ اس سے اعراض کریں تو ان کو گرفتار کرو اور قتل کرو جہاں کہیں بھی پاؤ اور ان میں سے کسی کو ساتھی اور مددگار نہ بناؤ۔ صرف وہ

لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں جن کا تعلق کسی ایسی قوم سے ہو جن کے ساتھ تمہارا کوئی معاہدہ ہے۔ یا وہ لوگ جو تمہارے پاس اس حال میں آئیں کہ نہ اپنے اندر تم سے لڑنے کی ہمت پا رہے ہیں نہ اپنی قوم ہی سے۔ اگر اللہ چاہتا تو ان کو تم پر دلیر کر دیتا تو وہ تم سے لڑتے۔ پس اگر وہ تم سے کنارہ کش رہیں، تم سے جنگ نہ کریں، تمہارے ساتھ صلح جویانہ رویہ رکھیں تو اللہ تم کو بھی ان کے خلاف کسی اقدام کی اجازت نہیں دیتا۔ ۸۸۔۔۹۰

اور دوسرے کچھ ایسے لوگوں کو بھی تم پاؤ گے جو چاہتے ہیں کہ تم سے بھی محفوظ رہیں اور اپنی قوم سے بھی محفوظ رہیں لیکن جب جب فتنے کی طرف موڑے جاتے ہیں اس میں گر پڑتے ہیں۔ پس اگر یہ تم سے کنارہ کش نہ رہیں، تم سے صلح جویانہ رویہ نہ رکھیں اور اپنے ہاتھ نہ روکیں تم ان کو گرفتار کرو اور قتل کرو جہاں کہیں پاؤ۔ یہ لوگ ہیں جن کے خلاف ہم نے تم کو کھلا اختیار دیا ہے۔ ۹۱

اور کسی مومن کے لیے روا نہیں کہ وہ کسی مومن کو قتل کرے مگر یہ کہ غلطی سے ایسا ہو جائے۔ اور جو کوئی کسی مومن کو غلطی سے قتل کر دے تو اس کے ذمہ ایک مسلمان غلام کو آزاد کرنا اور خوں بہا ہے جو اس کے وارثوں کو دیا جائے الّا یہ کہ وہ معاف کر دیں۔ پس اگر مقتول تمہاری دشمن قوم کا فرد ہو لیکن وہ بذاتِ خود مسلمان ہو تو ایک مسلمان غلام کو آزاد کرنا ہے۔ اور اگر وہ کسی ایسی قوم کا فرد ہے جس کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہے تو خوں بہا بھی ہے جو اس کے وارثوں کو دیا جائے اور ایک مسلمان غلام کا آزاد کرنا بھی۔ جس کو یہ استطاعت نہ ہو تو وہ لگاتار دو مہینے کے روزے رکھے۔ یہ اللہ

کی طرف سے ٹھہرائی ہوئی توبہ ہے۔ اللہ علیم و حکیم ہے۔ اور جو کوئی کسی مسلمان کو عمداً قتل کرے گا تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس پر خدا کا غضب اور اس کی لعنت ہے اور اللہ نے اس کے لیے ایک عذاب عظیم تیار کر رکھا ہے۔ ۹۲-۹۳

اے ایمان والو، جب تم خدا کی راہ میں نکلا کرو تو اچھی طرح تحقیق کر لیا کرو اور جو تمھیں سلام کرے اس کو دنیوی زندگی کے سامان کی خاطر یہ نہ کہو کہ تو مومن نہیں ہے۔ اللہ کے پاس بہت سامان غنیمت ہے۔ تمھارا حال بھی پہلے ایسا ہی رہ چکا ہے۔ اللہ نے تم پر فضل فرمایا تو تحقیق کر لیا کرو۔ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے اچھی طرح باخبر ہے۔ ۹۴-

مسلمانوں میں غیر معذور بیٹھ رہنے والے اور اللہ کی راہ میں اپنے جان و مال سے جہاد کرنے والے برابر نہیں ہیں۔ مال و جان سے جہاد کرنے والوں کو اللہ نے بیٹھ رہنے والوں پر ایک درجہ فضیلت کا بخشا ہے۔ یوں دونوں سے اللہ کا وعدہ اچھا ہے لیکن اللہ نے مجاہدین کو بیٹھ رہنے والوں پر ایک اجر عظیم کی فضیلت دی ہے۔ اس کی طرف سے درجے بھی اور مغفرت و رحمت بھی۔ اور اللہ غفور رحیم ہے۔ ۹۵-۹۶

جن لوگوں کی جان فرشتے اس حال میں قبض کریں گے کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے ہوئے ہیں وہ ان سے پوچھیں گے کہ تم کس حال میں پڑے رہے۔ وہ جواب دیں گے ہم تو اس ملک میں بالکل بے بس تھے۔ وہ کہیں گے کہ خدا کی زمین کشادہ نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے۔ یہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ کیا ہی برا ٹھکانا ہے۔ البتہ وہ بے بس مرد، عورتیں اور بچے جو نہ تو کوئی تدبیر کر سکتے اور نہ کوئی راہ پا رہے ہیں، یہ لوگ توقع ہے کہ اللہ ان سے درگزر فرمائے۔ بے شک اللہ معاف کرنے والا اور

بخشنے والا ہے۔ اور جو اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں بڑے ٹھکانے اور بڑی وسعت پائے گا اور جو اپنے گھر سے اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کر کے نکلے گا پھر اس کو موت آجائے تو اس کا اجر اللہ کے ذمے لازم ہو گیا اور اللہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ ۹۷-۱۰۰

۲۹- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَإِذَا حُيِّيتُم بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوا بِأَحْسَنَ مِنْهَا أَوْ رُدُّوهَا إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ حَسِيبًا ۝ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ لَيَجْمَعَنَّكُمْ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَا رَيْبَ فِيهِ وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ حَدِيثًا ۝ ۸۶-۸۷

'تحیت' کا مفہوم: حیّاہ تحیۃ کے اصل معنی کسی کو زندگی کی دعا دینے کے ہیں۔ اسی سے دعائیہ کلمہ 'حیاک اللہ' ہے جس کے معنی ہیں، اللہ تمہاری عمر دراز کرے۔ سلام اور اس کے ہم معنی دوسرے دعائیہ کلمات بھی چونکہ کم و بیش یہی یا اسی سے ملتے جلتے مفہوم اپنے اندر رکھتے ہیں اس وجہ سے لفظ کے عام مفہوم میں وہ سب اس کے اندر شامل ہو جاتے ہیں۔

اسلامی معاشرہ میں سلام کی اہمیت: ہر معاشرے میں کچھ ایسے دعائیہ کلمات مروج ہوتے ہیں جو معاشرے کے افراد آپس میں ملتے جلتے وقت ابتدائی تعارف، اظہارِ محبت و اعتماد، نشانِ اخوت و مودت اور علامتِ وحدت فکر و عقیدہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ معاشرتی اتصال و ارتباط کے نقطۂ نظر سے ان کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ معاشرے کے افراد، خواہ ان کے اندر کتنی ہی دوری و بے گانگی ہو، آمنے سامنے ہوتے ہی ان کے واسطے سے اس طرح باہم ایک دوسرے سے جڑ جاتے ہیں گویا ان کے اندر کوئی اجنبیت و بیگانگی تھی ہی نہیں۔ عربوں میں اس مقصد کے لیے بہت سے الفاظ اور فقرے معروف تھے۔ مثلاً 'حیاک اللہ'، اہلاً و سہلاً مرحبا، وغیرہ۔ سلام کا لفظ بھی معروف تھا۔ جب اسلامی معاشرہ ظہور میں آیا تو بجز ان کلمات کے جن میں شرک کی کوئی آلائش تھی باقی تمام پاکیزہ کلمات باقی رہے البتہ 'السلام علیکم' کو ایک خاص اسلامی شعار کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ یہ کلمہ گویا مومن و کافر کے درمیان ایک علامتِ فارقہ بن گیا۔ جب ایک شخص نے دوسرے کے سامنے السلام علیکم کہہ دیا اور اس نے وعلیکم السلام سے اس کا جواب دے دیا تو گویا من و تو کا فرق اٹھ گیا اور دونوں دو قالب و یک جان ہو گئے اور جواب نہ دیا تو اس کے معنی صرف یہی نہیں ہوتے تھے کہ اس نے اس کا سلام قبول نہیں کیا بلکہ اس کے معنی یہ بھی ہوتے تھے کہ اس نے اس کے اسلام کو بھی تسلیم نہیں کیا۔

کلمہ تحیت کی اس اہمیت کی وجہ سے اس موقع پر جب کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو، جیسا کہ ہم نے

اشارہ کیا۔ منافقین سے اعراض کی ہدایت ہوئی تو ساتھ ہی مسلمانوں کو یہ تنبیہ بھی کر دی گئی کہ جب کوئی شخص تمھیں سلام و تحیت سے مخاطب کرے تو اس کا اسلامی و معاشرتی حق یہ ہے کہ اس کے سلام و تحیت کا اس کو جواب دو، اس کا اعلیٰ طریقہ تو یہ ہے کہ اس سے بہتر طریقہ پر جواب دو، اگر یہ نہیں تو کم از کم اسی کے الفاظ اس کی طرف لوٹا دو۔ اس تنبیہ کی ضرورت اس لیے تھی کہ زیادہ پرجوش لوگوں کی طرف سے اس مرحلے میں منافقین کے ساتھ معاشرتی بائیکاٹ کی نوبت نہ آنے پائے۔ خاص طور پر اس کا یہ پہلو بہت نازک تھا کہ بعض حالات میں اس کی زد میں وہ لوگ بھی آ سکتے تھے جو فی الحقیقت تو منافق نہ ہوتے لیکن زیادہ حساس لوگوں کو کسی سبب سے ان پر منافقت کا شبہ ہو جاتا۔

یہ پیچیدگی تو ان منافقین کے معاملے میں تھی جو دارالاسلام میں تھے۔ ان سے زیادہ پیچیدہ معاملہ ان مسلمانوں کا تھا جو دارالحرب میں تھے۔ ان مسلمانوں کے اندر بھی، جیسا کہ آگے آ رہا ہے، منافق اور مخلص دونوں ہی قسم کے تھے۔ قرآن نے اگرچہ ان کے درمیان امتیاز کے لیے نہایت واضح کسوٹیاں مقرر کر دیں تاہم اس کا اندیشہ باقی رہتا تھا کہ کوئی مخلص مسلمان مسلمانوں کی تلوار کی زد میں آ جائے، اس لیے مسلمانوں کو آگے آیت ۹۴ میں یہ ہدایت کی گئی کہ جس علاقے پر حملہ کرو اس کے مسلمانوں کے متعلق اچھی طرح معلومات حاصل کر لو، اگر کوئی تمھیں سلام کرے اور اس طرح تمھارے ساتھ اپنی دینی اخوت و مودت کا اظہار کرے تو بے تحقیق کیے اس کے مسلمان ہونے سے انکار نہ کرو۔

الغرض یہ سلام اور جواب سلام کا معاملہ کوئی رسمی حیثیت نہیں رکھتا تھا بلکہ اسلامی معاشرہ میں یہ وصل و فصل کی بنیاد تھا اس وجہ سے قرآن نے اہمیت کے ساتھ اس کو بیان فرمایا اور تنبیہ فرمائی کہ خدا ہر چیز کا حساب کرنے والا ہے اور قیامت کے دن سب کو اپنے اعمال و اقوال کی جواب دہی کرنی ہے۔

'لَيَجْمَعَنَّكُمْ' کے بعد 'اِلٰی' کا صلہ، جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں اس اسلوب کی وضاحت کر چکے ہیں، اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں کوئی لفظ ہانکنے، دھکیلنے اور لے جانے کے معنی میں محذوف ہے۔

فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ۭ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ۝ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَاۗءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَاۗءَ حَتّٰي يُھَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْھُمْ وَاقْتُلُوْھُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْھُمْ ۠ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْھُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ۝ (۸۸-۸۹)

'فِئَتَيْنِ' ضمیر مجرور سے حال پڑا ہوا ہے۔ مثلاً کہیں گے 'مالک قائماً'۔

'رکس الشئ' کے معنی ہیں چیز کو الٹ دیا۔ 'ارکسہ' اس کو اوندھا کر دیا۔ 'رکس الشئ' چیز کو اس کی

سابقہ حالت پر لوٹا دیا۔

دارالکفر کے مسلمانوں کے کفر و ایمان کے لیے کسوٹی ہجرت ہے

اب یہ ذکر ہو رہا ہے ان منافقین کا جو بلا کسی عذرِ معقول کے، محض اپنے رشتوں اور قرابتوں یا جائداد و املاک کی محبت میں ہجرت سے گریزاں اور مدینہ میں دارالاسلام قائم ہو جانے کے باوجود، اب تک بدستور دارالکفر یا دارالحرب میں پڑے ہوئے تھے۔ ان لوگوں کے پاس چونکہ کوئی عذر شرعی موجود نہیں تھا اس وجہ سے ان کا نفاق واضح تھا لیکن مسلمانوں میں سے کچھ لوگ، جو ان کے ساتھ رشتہ داریاں اور قرابتیں یا خاندانی اور قبائلی نسبتیں رکھتے تھے، ان کے معاملے میں بہت نرم تھے۔ ان کی خواہش یہ تھی کہ ان کو نہ صرف ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے بلکہ ان کے ساتھ ربط ضبط بھی قائم رکھا جائے، آہستہ آہستہ یہ لوگ سچے اور پکے مسلمان بن جائیں گے۔ قرآن نے اس خیال کے لوگوں کو تنبیہ کی کہ جو لوگ اس طرز پر سوچ رہے ہیں، غلط سوچ رہے ہیں۔ اب یہ منافقین اسلام کی طرف بڑھنے والے نہیں ہیں، انھوں نے اسلام کی طرف جو قدم بڑھایا تھا، دنیا کی محبت میں انھوں نے اپنے اٹھائے ہوئے قدم کو پھر پیچھے ہٹا لیا جس کی سزا میں اللہ نے اپنی سنت کے مطابق ان کو پھر اسی کفر میں دھکیل دیا جس میں وہ پہلے تھے۔ جو لوگ خدا کے قانون اور اس کی سنت کی زد میں آ چکے ہوں وہ اب راہِ راست پر نہیں آ سکتے، کوئی لاکھ چاہے ان کو راہ ملنی ناممکن ہے۔ فرمایا کہ تم ان کی ہدایت کی توقع رکھتے ہو اور ان کا حال یہ ہے کہ وہ تمھیں بھی اسی کفر میں واپس لے جانے کی آرزو رکھتے ہیں جس میں وہ خود ہیں اس وجہ سے جب تک وہ ہجرت نہ کریں اس وقت تک تم ان کے ساتھ کوئی تعلق نہ رکھو۔ یہ ہجرت ہی ان کے ایمان و اسلام کی کسوٹی ہے۔ اگر وہ اس سے گریز کرتے ہیں تو تم ان کو دشمن اور دشمنوں کا ساتھی سمجھو اور ان کو جہاں پاؤ گرفتار اور قتل کرو۔

إِلَّا الَّذِينَ يَصِلُونَ إِلَىٰ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيثَاقٌ أَوْ جَاءُوكُمْ حَصِرَتْ صُدُورُهُمْ أَن يُقَاتِلُوكُمْ أَوْ يُقَاتِلُوا قَوْمَهُمْ ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقَاتَلُوكُمْ ۚ فَإِنِ اعْتَزَلُوكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوكُمْ وَأَلْقَوْا إِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيلًا (۹۰)

'حَصِرَ حَصَرًا' کے معنی عاجز ہونا، تنگ ہونا، بے ہمت ہونا۔ حصر الرجل ضاق صدرہ' اس کا سینہ تنگ ہوا، اس نے ہمت چھوڑ دی۔

'سَلَم' کے معنی انقیاد و اطاعت اور حوالگی و سپردگی کے ہیں۔ 'القاء السلم' سے مراد کسی کے آگے سپر ڈال دینا، گھٹنے ٹیک دینا، سپر انداز ہونا اور اس سے صلح کی درخواست کرنا۔

مذکورہ بالا حکم کے بعض مستثنیات

اب یہ ان لوگوں کا حکم بیان ہو رہا ہے جو مذکورہ بالا اخذ و قتل کے حکم سے مستثنیٰ ہیں۔ یہ دو قسم کے لوگ ہیں۔

ایک وہ جو کسی ایسی قوم اور قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں جن کے ساتھ مسلمانوں کا معاہدہ صلح ہے۔ ایسے لوگوں کی جان بخشی محض معاہدے کے احترام میں کی گئی۔ اس لیے کہ معاہدے کے قیام تک ان کے کسی فرد کو گرفتار یا قتل کرنا عہد شکنی ہوتی، عام اس سے کہ وہ کافر ہے یا منافق۔

دوسرے وہ لوگ جو اپنی کمزوری اور پست ہمتی کی وجہ سے مسلمانوں کے پاس غیر جانبداری کی درخواست لے کر آئیں، نہ وہ اپنی قوم اور قبیلے کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے ساتھ لڑنے کے لیے تیار ہوں اور نہ مسلمانوں میں شامل ہو کر اپنی قوم سے جنگ کے لیے آمادہ ہوں۔ ان کو مہلت دیے جانے کی یہ مصلحت واضح فرمائی کہ ایسے کمزور لوگوں کی طرف سے یہ غیر جانبداری کا رویہ بھی غنیمت ہے۔ آخر یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ اللہ ان کو جرأت دے دیتا تو یہ کھلم کھلا دشمن بن کر تم سے جنگ کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے تو جب تک یہ تم سے تعرض کرنے سے کنارہ کش رہیں، تم سے جنگ نہ کریں تمہارے ساتھ صلح جویانہ روش رکھیں تم بھی ان کے خلاف کوئی اقدام نہ کرو۔

سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ وَيَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ كُلَّمَا رُدُّوْٓا اِلَى الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا فِيْهَا ۚ فَاِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ وَيُلْقُوْٓا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَيَكُفُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ ۭ وَاُولٰٓئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ۝ (۹۱)

’فتنہ‘ سے مراد

’فتنہ‘ کے لفظ پر ہم سورہ بقرہ کی تفسیر میں مفصل بحث کر چکے ہیں، یہاں اس سے مراد کفار کے وہ جارحانہ اور ظالمانہ اقدامات ہیں جو وہ مسلمانوں کو اسلام سے پھیرنے اور بزعم خویش اسلام کو مٹانے کے لیے کر رہے تھے۔

’سلطان‘ کا مفہوم

’سُلطان‘ کا لفظ قرآن میں دلیل، حجت کے معنی میں بھی آیا ہے اور اختیار و اقتدار کے معنی میں بھی۔ اس دوسرے معنی کے لیے بھی متعدد نظیریں موجود ہیں مثلاً مَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ ۲۲ ابراہیم (مجھے تم پر کوئی اختیار حاصل نہیں تھا) وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا ۳۳ اسراء (جو مظلومانہ قتل کیا گیا تو ہم نے اس کے وارث کے لیے قاتل پر اختیار بخشا)

غیر جانبداری کے جھوٹے دعویداروں کا حکم

یہ ان جھوٹے غیر جانبداروں کی طرف اشارہ ہے جو اسلام کا دعویٰ کر کے مسلمانوں کے خطرے سے بھی اپنے آپ کو محفوظ رکھنا چاہتے تھے اور اپنی قوم کے اندر شامل رہ کر اس سے بھی مامون رہنا چاہتے تھے۔ یہ لوگ بظاہر تو غیر جانبداری کے مدعی تھے لیکن یہ غیر جانبداری محض نمائشی

تھی۔ جب ان پر ان کی قوم کا دباؤ پڑ جاتا یہ ان شرارتوں میں شریک ہو جاتے جو وہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کرنا چاہتی۔ ان لوگوں کی بابت فرمایا کہ یہ لوگ اس رعایت کے مستحق نہیں ہیں جو مذکورہ بالا جماعت کے لیے بیان ہوئی ہے۔ بلکہ یہ بھی کھلے ہوئے دشمنوں ہی کے حکم میں داخل ہیں۔ اگر یہ تمھاری مخالفت نہ چھوڑیں، تمھارے ساتھ صلح جویانہ رویہ نہ اختیار کریں اور اپنے ہاتھ نہ روکیں تو تم جہاں کہیں پاؤ ان کو گرفتار اور قتل کرو، ان کو گرفتار کرنے اور ان کے قتل کرنے کا خدا نے تم کو کھلا ہوا اختیار بخشا۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ أَنْ يَقْتُلَ مُؤْمِنًا إِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلَىٰٓ أَهْلِهِۦٓ إِلَّآ أَن يَصَّدَّقُوا۟ ۚ فَإِن كَانَ مِن قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۖ وَإِن كَانَ مِن قَوْمٍۭ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيثَٰقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلَىٰٓ أَهْلِهِۦ وَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۖ فَمَن لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ تَوْبَةً مِّنَ ٱللَّهِ ۗ وَكَانَ ٱللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ۝ وَمَن يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهُۥ جَهَنَّمُ خَٰلِدًا فِيهَا وَغَضِبَ ٱللَّهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُۥ وَأَعَدَّ لَهُۥ عَذَابًا عَظِيمًا (۹۲-۹۳)

دارالحرب کے مخلص مسلمانوں کی جان کا تحفظ

اوپر جو احکام بیان ہوئے ہیں اگرچہ اہل ایمان اور منافقین کے درمیان التباس رفع کر دینے کے لیے کافی تھے لیکن کفار کے علاقوں میں بہت سے مخلص مسلمان بھی تھے جو خود تو ہجرت کے دل سے آرزومند تھے لیکن مجبوریوں نے ان کی راہ روک رکھی تھی۔ جنگ پیش آجانے کی صورت میں اندیشہ تھا کہ مبادا ان کو خود مسلمانوں ہی کے ہاتھوں کوئی گزند پہنچ جائے۔ اس وجہ سے قرآن نے قتل مومن کے جرم کی سنگینی بھی واضح فرما دی اور اس سلسلے میں ایسے واضح احکام بھی دے دیے جن کے بعد کسی خدا ترس مسلمان کے لیے اس معاملے میں کسی بے احتیاطی و سہل انگاری کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔

پہلے فرمایا کہ کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کسی مسلمان کو قتل کرے، غلطی سے یہ فعل صادر ہو جائے تو اس کی بات دوسری ہے۔ غلطی کی صورت میں بھی لازم ہے کہ جس سے یہ غلطی صادر ہوئی ہے وہ ایک مسلمان غلام کو آزاد کرے اور مقتول کے وارثوں کو اس کا خوں بہا ادا کرے الا آنکہ وارثانِ مقتول خون بہا معاف کر دیں۔

پھر اس اجمال کی وضاحت فرمائی کہ اگر مقتول مسلمان، دشمن قوم یا قبیلہ کا فرد ہو تب تو ایک مسلمان غلام کا آزاد کر دینا ہی کافی ہے۔ لیکن اس کا تعلق اگر معاہد قوم اور قبیلے سے ہے تو اس صورت میں خوں بہا ادا کرنا بھی ضروری ہوگا اور ایک مسلمان غلام کا آزاد کرنا بھی۔ اگر کوئی شخص غلام آزاد کرنے کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اس صورت میں اس کو لگاتار دو ماہ کے روزے رکھنے

ہوں گے۔ فرمایا کہ یہ اللہ کی مشروع کی ہوئی توبہ ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے۔

قتل عمد کے جرم کی سنگینی

قتل خطا کے احکام بیان کرنے کے بعد قتل عمد کے بارے میں فرمایا کہ جو مسلمان کسی مسلمان کو عمداً قتل کرے گا اس کی سزا جہنم ہے وہ اس میں ہمیشہ رہے گا اور اس پر خدا کا غضب اور اس کی لعنت ہے اور اس کے لیے عذاب دردناک خدا نے تیار کر رکھا ہے۔

یہاں قتلِ عمد کے جرم کی جو سزا بیان ہوئی ہے وہ بعینہٖ وہی سزا ہے جو کٹر کافروں کے لیے قرآن میں بیان ہوئی ہے۔ اس آیت کو پڑھ کر ہر مسلمان کا دل لرز اٹھتا ہے۔ اس سزا کی سنگینی کی علت سمجھنے کے لیے اس امر کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر سب سے بڑا حق اس کی جان کا احترام ہے، کوئی مسلمان اگر دوسرے مسلمان کی جان لے لیتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ حقوق العباد میں سے اس نے سب سے بڑے حق کو تلف کیا جس کی تلافی و اصلاح کی بھی اب کوئی شکل باقی نہیں رہی اس لیے کہ جس شخص کے حق کو اس نے تلف کیا وہ دنیا سے رخصت ہو چکا اور حقوق العباد کی اصلاح کے لیے تلافی مافات ناگزیر ہے۔ پھر اس کا ایک اور پہلو بھی بڑا اہم ہے، وہ یہ کہ یہ ایک ایسے مسلمان کے قتل کا معاملہ ہے جو دارالکفر اور دارالحرب میں گھرے ہوئے ہونے کی وجہ سے اسلامی شریعت کے ان تحفظات سے بھی محروم تھا جو دارالاسلام میں ایک مسلمان کو حاصل ہوتی ہیں۔ اپنے دین اور اپنے نفس کے معاملے میں اس کو اگر کسی سے خیر کی امید ہو سکتی تھی تو وہ مسلمانوں ہی سے ہو سکتی تھی۔ اب اگر کوئی مسلمان ہی اس کو قتل کر دے اور وہ بھی عمداً اور ایسی جگہ پر جہاں اس کو اسلامی قانون کی حفاظت بھی حاصل نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ نہ ایسے مقتول سے بڑھ کر کوئی مظلوم ہو سکتا ہے اور نہ ایسے قاتل سے بڑھ کر کوئی ظالم!

عرف پر مبنی احکام حالات کی تبدیلی سے متغیر ہوتے ہیں

خوں بہا کے مسئلے کے بعض پہلوؤں پر ہم سورۂ بقرہ کی تفسیر میں بھی گفتگو کر چکے ہیں۔ اسلام نے اس معاملے میں عرب کے معروف کو قانون کی حیثیت دے دی تھی۔ اور یہ بات ہم دوسرے مقام میں لکھ چکے ہیں کہ جن معاملات کا تعلق معروف سے ہو وہ زمانہ اور حالات کے تغیر سے اپنے اصل مقصد کو باقی رکھتے ہوئے متغیر ہو جاتے ہیں۔ مثلاً خوں بہا میں اونٹوں اور بکریوں کی جگہ نقد بھی دیا جا سکتا ہے اور نقد کی مقدار بھی معاشی حالات کی تبدیلی سے تبدیل ہو سکتی ہے۔ اس تغیر کی نوعیت کو طے کرنا ارباب اجتہاد کا کام ہے اور سلف کے اجتہادات کی نظیریں اس باب میں موجود ہیں۔

غلام کا بدل

زیر بحث آیت میں توبہ کے طور پر غلام آزاد کرنے کا حکم بھی ہے۔ اس زمانے میں چونکہ غلامی ختم ہو چکی ہے اور یہ بات ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ اس کا ختم ہونا

عین منشائے اسلام کے مطابق ہوا ہے اسی وجہ سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس زمانے میں وہ شخص کیا کرے جو غلام آزاد کرنے کی مقدرت تو رکھتا ہو لیکن غلام میسر نہیں ہیں اور شریعت نے اس کا کوئی بدل بھی معین نہیں فرمایا ہے۔ ہمارے نزدیک اس زمانے میں اس کا بدل صدقہ ہے جو غلام کی قیمت کے تناسب سے ہو اور اگر یہ صدقہ غریب و نادار مسلمانوں کے قرضوں کی ادائیگی اور ان کے رہن شدہ مکانوں اور سامانوں کے چھڑانے پر صرف کیا جائے تو ان شاء اللہ یہ طریقہ شریعت کے منشا کے خلاف نہ ہوگا۔

توبہ کی تاکید اور اس کے لوازمات

'تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا' کا ٹکڑا بھی خاص طور پر قابل غور ہے۔ ہم دوسرے مقام میں لکھ چکے ہیں کہ جب مفعول اس طرح فعل کے بغیر آئے تو اس پر خاص تاکید اور عزم کے ساتھ زور دینا مقصود ہوتا ہے۔ یہاں خوں بہا کے ساتھ ساتھ ایک غلام آزاد کرنے اور غلام آزاد کرنے کی مقدرت نہ ہونے کی صورت میں مسلسل دو مہینے کے روزے رکھنے کی جو ہدایت ہوئی تو اس پر خاص تاکید کے ساتھ زور دیا کہ یہ خدائے علیم و حکیم کی طرف سے مقرر کردہ توبہ ہے، نہ کوئی اس کو شاق سمجھے، نہ اس کی خلاف ورزی کرے۔ قتل مومن، غلطی ہی سے سہی، عظیم گناہ ہے۔ اس گناہ کو دھونے کے لیے صرف خوں بہا کافی نہیں ہے بلکہ غلام بھی آزاد کیا جائے اور اگر اس کی مقدرت نہ ہو تو لگاتار دو مہینے کے روزے رکھے جائیں تاکہ دل پر سے ہر داغ اس گناہ کا دھل جائے۔ گویا ایسے سنگین معاملے میں زبانی توبہ کافی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ اس کے مؤیدات بھی ہونے ضروری ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۡ فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ ۭ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا (۹۴)

دار الحرب کے مسلمانوں کے تحفظ کے لیے مزید اہتمام

دار الحرب میں چھپے ہوئے مسلمانوں کے تحفظ ہی کے پہلو سے مزید ہدایت یہ ہوئی کہ جب کسی علاقے پر حملہ کے لیے نکلو تو اس علاقے کے اندر جو مسلمان ہوں ان کے متعلق پوری تحقیق کر لو کہ مسلمان کہاں کہاں اور کس حال میں ہیں تاکہ تمہارے حملے سے وہ محفوظ رہیں۔ مزید ارشاد ہوا کہ اگر کوئی مسلمان اپنے ایمان کی شہادت کے لیے تمہیں سلام کرے تو مال غنیمت کی طمع میں اس کے ایمان کا انکار نہ کرو۔ مال غنیمت کے طالبوں کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ خدا کے پاس غنیمت کے بڑے ذخیرے ہیں۔ اس کے بعد فرمایا کہ یہ بات بھولنی نہیں چاہیے کہ کل تک یہی حال تمہارا بھی رہ چکا ہے۔ تم بھی انہی مظلوموں کی طرح کفار کے

حصار میں گھرے ہوئے تھے۔ اب اللہ نے تمھیں دارالاسلام کی آزاد اور کھلی ہوئی فضا نصیب کی ہے تو تمھیں کسی احساسِ برتری میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ اچھی طرح تحقیق کر کے اقدام کرنا چاہیے۔ اگر کسی نے اس معاملے میں بے پروائی اور سہل انگاری کو راہ دی یا مالِ غنیمت کی طمع میں کسی مسلمان کو قتل کر دیا تو یاد رکھو کہ خدا تمھارے ہر عمل سے باخبر ہے۔

مومن کی جان کے احترام کی آخری حد یہی ہو سکتی ہے جو اس آیت سے ظاہر ہوتی ہے۔ دارالحرب میں عین دورانِ جنگ میں بھی اگر ایک شخص اپنے ایمان کے اظہار کے لیے سلام کر دے یا کلمہ پڑھ دے تو مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ بغیر تحقیق کے اس کے خلاف تلوار اٹھائے۔ جنگ کے ہنگامی حالات میں اس طرح کی تحقیق اگرچہ نہایت مشکل کام ہے اور یہ اندیشہ بھی ہے کہ اس سے دشمن فائدہ اٹھائے لیکن اسلامی غزوات میں اس ہدایت کی پوری پابندی کی گئی۔ ایک غزوہ میں ایک صحابیؓ سے اس معاملے میں بے احتیاطی ہوگئی تو حضورؐ نے اس طرح اس پر تنبیہ فرمائی کہ سننے والوں کے دل دہل گئے۔ اصل یہ ہے کہ اسلامی غزوات کا اصل مقصود فتوحات حاصل کرنا اور مالِ غنیمت جمع کرنا نہیں تھا بلکہ، جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، مظلوم مسلمانوں کو کفار کے پنجہ سے چھڑانا تھا۔ جب اصل مقصد یہ تھا تو اس کے لیے تو ہر خطرہ گوارا کیا جا سکتا تھا لیکن یہ بات کس طرح گوارا کی جا سکتی تھی کہ کسی مسلمان کی جان خطرے میں پڑے۔

لَا يَسْتَوِى الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِى الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۭ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ۭ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ۭ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ۙ دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۹۵-۹۶)

اب یہ تمام غیر معذور مسلمانوں کو جہاد پر ابھارا ہے۔ گویا آیت ۷۱ میں جہاں سے بات چلی تھی اور پھر جہاد سے جان چرانے والوں کا ذکر آگیا تھا، کلام پھر اسی طرف لوٹ آیا۔ فرمایا کہ جن مسلمانوں کے پاس کوئی معقول عذر نہیں ہے، پھر بھی وہ جہاد کے لیے نہیں اُٹھ رہے ہیں انھیں یاد رکھنا چاہیے کہ وہ خدا کے ہاں اجر کے لحاظ سے ان لوگوں کے برابر نہیں ہو سکیں گے جو آج خدا کی راہ میں جان و مال دونوں سے جہاد کر رہے ہیں۔ اگرچہ اس اعتبار سے دونوں گروہ اللہ کے ہاں اچھے اجر کے مستحق ہیں کہ دونوں اسلام کے مخلص ہیں، ان

ہیں سے منافق اور اسلام کا بدخواہ کوئی بھی نہیں ہے تاہم مجاہدین کا درجہ اللہ کے ہاں بہت اونچا ہے۔ ان کے لیے خدا کے ہاں اجر عظیم ہے۔

اس آیت نے جہاد کی ترغیب و تشویق کے ساتھ یہ بات بھی واضح فرما دی کہ اگرچہ وہ مسلمان جو بغیر کسی عذر و مجبوری کے جہاد میں عملاً حصہ نہیں لے رہے ہیں درجے اور مرتبے میں ان مسلمانوں کے برابر نہیں ہو سکتے جو عملاً جہاد میں حصہ لے رہے ہیں، ان کے درجے خدا کے ہاں بہت بلند ہیں تاہم جہاد میں حصہ نہ لینے کی وجہ سے یہ منافق نہیں سمجھے جا سکتے۔ اس لیے کہ جہاد میں عملاً حصہ نہ لینا اس صورت میں نفاق ہے جب آدمی اس سے جی چرائے، دوسروں کی ہمت پست کرے یا جہاد کی نفیرِ عام ہو جانے کے باوجود گھر میں بیٹھا رہے۔ اگر یہ صورت نہ ہو تو جہاد ایک فضیلت ضرور ہے جس کے حاصل کرنے کا جذبہ ہر شخص کے اندر ہونا چاہیے لیکن اس کی حیثیت ایک درجۂ فضیلت ہی کی ہے، یہ شرائطِ ایمان میں سے نہیں ہے کہ جو اس کو حاصل نہ کرے وہ منافق خیال کیا جائے۔ 'وَکُلًّا وَّعَدَ اللّٰہُ الْحُسْنٰی' کے الفاظ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ اس تنبیہ کی ضرورت اس وجہ سے تھی کہ اوپر منافقین کو اس جہاد ہی کے معاملے میں جس طرح ملامت کی گئی ہے اور ان سے مسلمانوں کو جس طرح متنبہ رہنے کی ہدایت کی گئی ہے اس سے بعض لوگوں کے اندر یہ تاثر پیدا ہو سکتا تھا کہ ان مخلص مسلمانوں کے بارے میں بھی ان کا زاویۂ نگاہ بدل جاتا جو نہایت سچے مسلمان تھے لیکن اب تک جہاد میں حصہ نہیں لے سکے تھے۔ اس آیت نے ایک طرف تو ان کو جہاد پر ابھارا، دوسری طرف یہ واضح کر دیا کہ یہ مخلص مسلمان ہیں، ان کے اخلاص کے بارے میں کسی کو بدگمانی نہیں ہونی چاہیے، اللہ کے ہاں ان کے درجے اور مرتبے کے لحاظ سے ان کے لیے بھی اجر ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنْفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنْتُمْ ۖ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ ۚ قَالُوا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا ۚ فَأُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ۝ إِلَّا الْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيعُونَ حِيلَةً وَلَا يَهْتَدُونَ سَبِيلًا ۝ فَأُولَٰئِكَ عَسَى اللَّهُ أَنْ يَعْفُوَ عَنْهُمْ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَفُوًّا غَفُورًا ۝ وَمَنْ يُهَاجِرْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يَجِدْ فِي الْأَرْضِ مُرَاغَمًا كَثِيرًا وَسَعَةً ۚ وَمَنْ يَخْرُجْ مِنْ بَيْتِهِ مُهَاجِرًا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ أَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ ۗ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا (۹۷-۱۰۰)

جمع کے استعمال کا ایک خاص محل

'تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ' میں لفظ 'مَلٰٓئِكَة' اسی طرح جمع آیا ہے جس طرح آلِ عمران کی آیات ۳۹، ۴۲ اور ۴۵ میں آیا ہے۔ وہاں 'فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ' کے تحت ہم اس کے جمع لانے کی وجہ بیان کر چکے ہیں۔ بعض مرتبہ جمع سے مقصود صرف جنس کا اظہار ہوتا ہے۔

'ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ' حال ہے۔ اپنی جانوں پر ظلم سے مقصود یہاں ہجرت کی استطاعت کے باوجود دارالکفر میں پڑے رہنا اور اس طرح اپنے ایمان کو خطرے میں ڈالنا ہے۔

سوال بطور زجر و توبیخ

'فِيْمَ كُنْتُمْ' (تم کہاں پڑے رہے) یہ سوال زجر و توبیخ کی نوعیت کا ہے۔

'مُرَاغَم' کے معنی ایسی جگہ کے ہیں جہاں انسان نکل کے جا سکے۔

'مُسْتَضْعَف' کے معنی ہیں بے بس، مجبور، دبا ہوا، زیردست۔

تمام غیر معذور مسلمانوں کو ہجرت کا حکم

اب ان تمام غیر معذور مسلمانوں کو جو اب تک دارالحرب میں پڑے ہوئے تھے، ہجرت پر ابھارا ہے اور یہ گویا ان کے لیے آخری تنبیہ ہے۔ اس کی تمہید اس طرح اٹھائی ہے کہ جو لوگ اسلام کا دعویٰ کرنے کے باوجود بلا کسی شدید مجبوری و عذر شرعی، کے اب تک دارالکفر میں پڑے ہوئے ہیں، اسی حالت میں ان کی موت آئی تو فرشتے ان سے سوال کریں گے کہ یہ تم کس حال میں پڑے رہے؟ یہ جواب دیں گے کہ ہم تو بے بس و مجبور تھے۔ فرشتے جواب دیں گے، کیا خدا کی زمین میں تمہارے لیے کہیں سمائی نہیں تھی کہ تم وہاں ہجرت کر جاتے۔ پھر فرمایا کہ ایسے لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہوگا اور وہ نہایت برا ٹھکانا ہے۔

اس کے بعد ان لوگوں کا ذکر فرمایا جو حقیقتہً بے بس اور معذور ہیں۔ فرمایا، خدا کے ہاں معذور صرف وہ مرد، عورتیں اور بچے قرار پائیں گے جو نہ تو کوئی تدبیر کر سکنے کی قدرت رکھتے ہیں اور نہ ان کے لیے کوئی راہ کھل رہی ہے، یہ لوگ امید ہے کہ اللہ ان سے درگزر فرمائے گا۔

اس کے بعد ہجرت کی راہ میں کمر ہمت باندھ کر اٹھ کھڑے ہونے والوں کی حوصلہ افزائی فرمائی کہ جو اللہ کی راہ میں ہجرت کے لیے اٹھ کھڑا ہوگا وہ خدا کی زمین میں بہت ٹھکانے اور بڑی وسعت پائے گا آخر میں یہ اطمینان بھی دلا دیا کہ ہجرت کے اجر عظیم کے لیے یہ ضروری نہیں کہ آدمی دارالہجرت میں پہنچ ہی جائے بلکہ صرف یہ کافی ہے کہ اللہ و رسول کی طرف ہجرت کے ارادے سے آدمی گھر سے نکل کھڑا ہو جو گھر سے نکل کھڑا ہوا اگر فوراً ہی اس کی موت آگئی یا وہ قتل کر دیا گیا تو اس سے اس کے اجر میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔ اللہ کے اوپر اس کا اجر لازم ہو گیا۔

ان آیات سے ہجرت کے متعلق مندرجہ ذیل امور سامنے آتے ہیں۔

ہجرت سے متعلق بعض حقائق

ایک یہ کہ ہر نقل مکانی ہجرت نہیں ہے۔ ہجرت یہ ہے کہ مسلمان ایک ایسے مقام کو جہاں اس کے لیے اپنے دین و ایمان پر قائم رہنا جان جوکھوں کا کام بن گیا ہو، چھوڑ کر ایک ایسے مقام کو منتقل ہو جائے جہاں اسے توقع ہو کہ وہ اپنے ایمان کی حفاظت کر سکے گا۔

دوسرا یہ کہ اگر دارالاسلام موجود ہو، اس کی طرف ہجرت کی راہ باز ہو، کوئی سخت مجبوری بھی نہ ہو تو ایسے مقام سے ہجرت کر کے دارالاسلام میں منتقل ہو جانا واجب ہے ورنہ ایسے شخص کا ایمان معتبر نہیں۔

تیسرا یہ کہ ہجرت کے معاملے میں ہر عذر، عذر نہیں ہے، معتبر عذر یہ ہے کہ آدمی اتنا بے بس ہو کہ نہ اس سے خود کوئی تدبیر بن آ رہی ہو نہ اس کے لیے کوئی راہ کھل رہی ہو۔ ایسی مجبوری میں بھی اس پر اپنے ایمان کی حفاظت بہرحال لازم ہے۔ اگرچہ اس کو اصحاب کہف کی طرح کسی غار ہی میں پناہ لینی پڑ جائے۔

چوتھا یہ کہ ہجرت کا اجر آخرت میں تو جو ہے وہ ہے، دنیا میں بھی مہاجر کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص بدرقہ فراہم ہوتا ہے۔ خدا کی زمین اس کے لیے راہیں کھولتی ہے اور غیب سے اس کے لیے اسباب و سامان فراہم ہوتے ہیں۔

پانچویں یہ کہ اس راہ میں پہلا قدم بھی منزل کی حیثیت رکھتا ہے۔ نیت خالص اور ارادہ راسخ ہو تو گھر سے نکلتے ہی مہاجر کو موت آ جائے تو ہجرت کا اجر اس کے لیے لازم ہو گیا۔

۳۰۔ آگے کا مضمون ـــــــ آیات ۱۰۱-۱۰۴

آگے صلوٰۃ الخوف یعنی جنگ کے خطرات کے دوران نماز باجماعت کی شکل بتائی گئی ہے۔ جہاد کے اس ذکر کے ساتھ نماز، بالخصوص نماز باجماعت، کے اس اہتمام سے کئی حقیقتیں سامنے آتی ہیں جن میں سے بعض کی طرف ہم اشارہ کریں گے۔

جہاد کی اصل روح نماز ہے

پہلی یہ کہ اس سے نماز کی دین میں عظمت و اہمیت واضح ہوتی ہے۔ اس سورہ کی آیت ۷۷ کے تحت نماز اور جہاد کے باہمی ظاہری و باطنی تعلق پر ہم گفتگو کر چکے ہیں۔ یہاں یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ نماز وہ چیز ہے کہ جنگ کے خطرات کے اندر بھی یہ نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام میں جنگ، خونریزی اور لوٹ مار کے لیے نہیں ہے بلکہ جیسا کہ دوسرے مقامات میں واضح ہو چکا ہے، اس لیے ہے کہ خدا کی زمین سے اس ظلم و جبر کا خاتمہ کیا جائے جو اللہ کے بندوں کو اللہ کی بندگی سے روکنے کے لیے اللہ کے دشمنوں کی طرف سے برپا کیا جاتا ہے۔ اس پہلو سے غور کیجیے تو جہاد کی اصل روح نماز ہی ہے۔ اسی سے جہاد، اللہ کی عبادت بنتا ہے۔ اگر اس کے اندر یہ روح نہ ہو تو یہ بھی اسی طرح فساد فی الارض ہے جس طرح اللہ کے باغیوں کی ہر جنگ فساد فی الارض ہے۔ اس روح کے تحفظ کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ عین میدان جنگ میں بھی تا حدِ امکان نماز سے غفلت نہ ہو تاکہ ہر مجاہد کو اس حقیقت کی یاددہانی ہوتی رہے کہ اس کی میدانِ جنگ کی صفیں بھی اپنے اصل مقصد کے لحاظ سے اس کی نماز کی صفوں سے مختلف نہیں ہیں۔

نماز باجماعت کی اہمیت

دوسری یہ کہ اس سے نماز باجماعت کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ سورہ بقرہ کی آیت ۲۳۹ فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا الآیۃ کے تحت یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ لڑائی کے دوران میں حالات بہت پرخطر ہوں،

نماز اس کے آداب کے مطابق ادا کرنی ممکن نہ ہو تو سوار، پیادہ، کھڑے، بیٹھے، چلتے، بھاگتے جس طرح ممکن ہو ادا کرنے کی کوشش کی جائے، یہاں تک کہ قبلہ رُو ہونے کی پابندی بھی ضروری نہیں ہے لیکن ان سب رخصتوں کے ساتھ زیر بحث آیات سے یہ حقیقت بھی واضح ہو رہی ہے کہ اگر نماز باجماعت کا اہتمام ممکن ہو تو میدانِ جنگ میں بھی اس کا اہتمام باقی رکھا جائے چنانچہ اس کے لیے قرآن نے ایک ایسی شکل بیان فرمائی ہے جس سے نماز باجماعت کا مقصد بھی حاصل ہوتا ہے اور دفاع کا بھی۔

دفاع کی اہمیت

تیسری یہ کہ اس سے دفاع کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ اول تو یہی بات اس کی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے کہ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے نماز جیسی اہم عبادت میں تخفیف فرما دی [1] دوسری یہ کہ نماز کی جو شکل بیان فرمائی ہے اس میں اس امر کا پورا اہتمام ملحوظ ہے کہ دشمن کو اس سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں پر حملہ کر دینے کا کوئی موقع نہ ملے۔ گویا اس مضمونِ جہاد کے آغاز میں مسلمانوں کو خُذُوا حِذْرَكُمْ (اپنے سامان دفاع سے لیس رہو) کا جو حکم دیا تھا تو اس کا اہتمام نماز میں بھی پوری طرح قائم رکھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس دینِ فطرت میں توکل اور تدبیر، شجاعت اور حکمت، تہور اور احتیاط کا کیسا معتدل اور حسین امتزاج ہے کہ نماز بھی جہاد بن جاتی ہے۔

پیغمبر صلعم کے اقتداء کی اہمیت

چوتھی یہ کہ اس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا کے جذبے اور اس کی اہمیت کا اظہار ہوتا ہے۔ آگے ہم واضح کریں گے کہ نماز کی یہ خاص شکل جو یہاں بیان ہوئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ میدانِ جنگ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی کی صورت میں صحابہؓ کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ حضورؐ نماز باجماعت کی امامت کرائیں اور کوئی مسلمان اس جماعت کی شرکت سے محروم رہنے پر راضی ہو۔ صحابہؓ کا یہ جذبہ چونکہ فطری تھا اور دین میں اس جذبے کی اہمیت بالکل واضح ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے نماز کی ایک ایسی شکل بیان فرما دی جس سے اس جذبے کی حوصلہ افزائی بھی ہو اور دفاع کے مقصد کو بھی کوئی نقصان نہ پہنچے — اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمایئے۔

آیات ۱۰۱-۱۰۴

وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلٰوةِ ۖ إِنْ خِفْتُمْ أَنْ يَفْتِنَكُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ إِنَّ الْكٰفِرِينَ كَانُوا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِينًا ﴿١٠١﴾ وَإِذَا كُنْتَ فِيهِمْ فَأَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ

---

[1] یہ امر ملحوظ رہے کہ نماز میں قصر کی رخصت اصلاً سفر جہاد کے تعلق ہی سے نازل ہوئی ہے۔ دوسرے سفروں میں اس کی حیثیت اصل کی نہیں بلکہ جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد سے واضح ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک صدقے کی سی ہے۔ ہم اس پر آگے بحث کریں گے۔

فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَأْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ فَاِذَا سَجَدُوْا
فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ وَلْتَاْتِ طَآئِفَةٌ اُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا
مَعَكَ وَلْيَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَاَسْلِحَتَهُمْ وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ
تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَاَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً
وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى
اَنْ تَضَعُوْٓا اَسْلِحَتَكُمْ وَخُذُوْا حِذْرَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ
عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿۱۰۲﴾ فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ
قُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ اِنَّ الصَّلٰوةَ
كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ﴿۱۰۳﴾ وَلَا تَهِنُوْا فِى ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ
اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ يَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ وَتَرْجُوْنَ مِنَ
اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۰۴﴾ ع ۱۵ / ۱۴

ترجمۂ آیات ۱۰۱-۱۰۴

اور جب تم سفر میں نکلو تو اس امر میں کوئی گناہ نہیں کہ نمازیں قصر کرو۔ اگر تمھیں اندیشہ ہو کہ کافر تمھیں فتنہ میں ڈال دیں گے۔ بے شک یہ کفار تمھارے کھلے ہوئے دشمن ہیں۔ ۱۰۱

اور جب تم ان کے درمیان موجود ہو اور نمازیں ان کی امامت کر رہے ہو تو چاہیے کہ ان میں سے ایک گروہ تمھارے ساتھ کھڑا ہو اور وہ اپنے ہتھیار لیے ہوئے ہو، پس جب وہ سجدہ کر چکیں تو وہ تمھارے پیچھے ہو جائیں اور دوسرا گروہ آگے آئے جس نے ابھی نماز نہیں پڑھی ہے اور وہ تمھارے ساتھ نماز پڑھے اور یہ بھی اپنی حفاظت کا سامان اور اپنے اسلحہ لیے ہوئے ہوں۔ کافر یہ تمنا رکھتے ہیں کہ تم اپنے اسلحہ اور اپنے سامان سے

ذرا غافل ہو تو وہ تم پر یکبارگی ٹوٹ پڑیں اور اس بات میں تمہارے اوپر کوئی گناہ نہیں کہ اگر تمہیں بارش کے سبب سے تکلیف ہو یا تم بیمار ہو تو اپنے اسلحہ اتار دو البتہ اپنی حفاظت کا سامان لیے رہو۔ اللہ نے کافروں کے لیے رسوا کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ ۱۰۲

پس جب تم نماز ادا کر چکو تو اللہ کو یاد کرو کھڑے، بیٹھے اور لیٹے۔ پس جب حالتِ اطمینان میں ہو جاؤ تو پوری نماز قائم کرو۔ بے شک نماز اہلِ ایمان پر وقت کی پابندی کے ساتھ فرض ہے۔ ۱۰۳

اور دشمن کے تعاقب میں تھڑدلا پن نہ دکھاؤ۔ اگر تم دکھ اٹھاتے ہو تو آخر وہ بھی تمہاری ہی طرح دکھ اٹھاتے ہیں اور تم خدا سے وہ توقع رکھتے ہو جو توقع وہ نہیں رکھتے اور اللہ علم والا اور حکمت والا ہے۔ ۱۰۴

۳۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ ۖ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ اِنَّ الْكٰفِرِيْنَ كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِيْنًا (۱۰۱)

نماز میں قصر کی اجازت دفاع کے تعلق سے

اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ نماز میں قصر کی یہ اجازت خُذُوْا حِذْرَكُمْ کے حکم کے تعلق سے نازل ہوئی۔ جب حکم ہوا کہ اپنے سامانِ دفاع سے لیس اور کفار کے مقابلے کے لیے مستعد رہو تو یہ سوال آپ سے آپ پیدا ہوا کہ اس حکم میں اور نماز میں تطبیق کی کیا صورت ہوگی۔ کیونکہ نماز کی حالت میں دفاع کے لوازم پورے نہیں ہو سکتے۔ اس کے لیے ایک تو نماز میں قصر کی اجازت ہوئی اور آگے کی آیات میں نماز باجماعت اور بیماری اور بارش وغیرہ کے حالات میں جو شکلیں اختیار کی جانی چاہئیں وہ بیان ہوئیں۔

قصر کی شکل جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے عملی تواتر سے ثابت ہے وہ یہ ہے کہ جو نمازیں چار رکعت والی ہیں وہ دو رکعت پڑھی جائیں۔ مغرب اور فجر میں قصر نہیں ہے۔

قصر کی اجازت ایک رخصت ہے

فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ کے الفاظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ قصر کی اجازت ایک قسم کی رخصت ہے۔ رخصتوں کے متعلق سورہ بقرہ کی تفسیر میں، ایک مستقل فصل میں، ہم واضح کر چکے ہیں کہ ان سے فائدہ اٹھانے

کو تقویٰ کے خلاف سمجھنا دین میں تشدد اور غلو کے رجحان کی غمازی کرتا ہے جس کو قرآن و حدیث دونوں میں مذموم ٹھہرایا گیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بات بھی غلو سے خالی نہیں قرار دی جا سکتی کہ کسی رخصت کو عزیمت اور وجوب کا درجہ دے دیا جائے یہاں تک کہ اس کی خلاف ورزی سے گناہ لازم آئے۔ اس باب میں تفصیل کے طالب مذکورہ فصل پر ضرور ایک نظر ڈال لیں۔

قصر کی اجازت سفرِ جہاد ہی کے ساتھ خاص نہیں ہے

قصر کی یہ اجازت اس میں شبہ نہیں ہے کہ نازل تو ہوئی ہے سفر جہاد ہی کے تعلق سے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ بس سفر جہاد ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ سفر کوئی بھی ہو اس میں فی الجملہ بے اطمینانی، آپادھاپی اور سر و سامان کی فکر ہوتی ہی ہے۔ بس یہ فرق ہوتا ہے کہ کسی میں کم، کسی میں زیادہ۔ یہ عین ممکن ہے کہ جہاد کا ایک سفر زیادہ اطمینان سے گزر جائے اور تجارت یا حج کے سفر میں زیادہ الجھنیں پیش آ جائیں۔ اس اشتراکِ علت کی وجہ سے دوسرے سفر بھی اصلاً نہ سہی تبعاً اسی حکم میں داخل ہیں۔ چنانچہ اسی بنیاد پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے قسم کے سفروں میں بھی قصر کی اجازت دی۔ خود بھی اس پر عمل فرمایا اور صحابہ نے بھی اس پر عمل کیا۔

یہ بات بھی یہاں ملحوظ رکھنے کی ہے کہ الفاظ یہاں وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ (جب تم سفر میں نکلو) کے استعمال ہوئے ہیں جو ہر سفر کے لیے عام ہیں۔ اس میں سفر جہاد کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ جہاد کے سفر کے لیے خاص لفظ اِذَا ضَرَبْتُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ (جب تم اللہ کی راہ میں نکلو) کا ہے جو آیت ۹۴ میں گزر چکا ہے۔ اس وجہ سے الفاظ کا تقاضا یہی ہے کہ قصر کی اجازت ہر سفر کے لیے عام ہو۔ رہی اس کے بعد اِنْ خِفْتُمْ کی شرط تو وہ صرف آیت کے موقع نزول کے اعتبار سے اس علت کو ظاہر کر رہی ہے جس کے سبب سے یہ اجازت مرحمت ہوئی۔ اس سے یہ بات تو ضرور نکلتی ہے کہ یہ رخصت بہر حال رخصت ہے جو حالات کے تابع ہے لیکن یہ بات نہیں نکلتی کہ یہ سفر جہاد ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ تقریباً یہی صورت تعددِ ازواج والے مسئلے میں بھی ہے جس کی بحث سورہ کے شروع میں گزر چکی ہے۔ اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ ۣ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ ۠ وَلْتَاْتِ طَآئِفَةٌ اُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ وَلْيَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَاَسْلِحَتَهُمْ ۚ وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَاَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً ۭ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَنْ تَضَعُوْٓا اَسْلِحَتَكُمْ ۚ وَخُذُوْا حِذْرَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا (۱۰۲)

'حذر' کا مفہوم

لفظ حِذْر پر آیت ۷۱ کے تحت گفتگو ہو چکی ہے۔ یہ لفظ جب تنہا استعمال ہو تو اس سے ہر قسم کے اسلحہ مراد ہو سکتے ہیں، خواہ مجرد دفاعی و حفاظتی نوعیت کے ہوں مثلاً سپر، خود اور زرہ وغیرہ یا جارحانہ نوعیت

کے ہوں مثلاً تلوار اور بندوق وغیرہ۔ لیکن جب لفظ اسلحہ، کے ساتھ استعمال ہو، جیسا کہ زیر بحث آیت میں ہے اَنْ تَضَعُوْٓا اَسْلِحَتَكُمْ وَخُذُوْا حِذْرَكُمْ (اپنے اسلحہ رکھ دو اور اپنے احتیاطی و حفاظتی سامان لیے رہو) تو اس سے مراد صرف وہی چیزیں ہوں گی جن کو ایک سپاہی اپنے دشمن سے بچاؤ کے لیے استعمال کرتا ہے۔

دفاع اور نماز با جماعت کے تقاضوں میں تطبیق جب کہ امامت پیغمبر صلعم فرمائیں

اس آیت میں وہ شکل بیان ہوئی ہے جو نماز با جماعت کے لیے میدان جنگ میں اختیار کی جا سکتی ہے۔ میدانِ جنگ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی کی صورت میں ایک مشکل یہ پیدا ہونے کا امکان تھا کہ قیام جماعت کے امکان کی شکل میں جب حضور نماز کی امامت کے لیے کھڑے ہوتے، ہر سپاہی کی یہ آرزو ہوتی کہ وہ آپ ہی کی اقتدا میں نماز ادا کرے۔ یہ آرزو ایک فطری آرزو تھی جس کا لحاظ بھی ضروری تھا اور ساتھ ہی دفاعی تدبیروں کا اہتمام بھی ناگزیر تھا کہ دشمن مسلمانوں کی مصروفیت نماز سے فائدہ اٹھا کر اچانک کوئی حملہ نہ کر دے۔ یہ دونوں تقاضے ملحوظ رکھتے ہوئے قیامِ جماعت کی تدبیر یہ بتائی کہ ایک گروہ اسلحہ کے ساتھ امام کے پیچھے نماز کے لیے کھڑا ہو، دوسرا گروہ حفاظت کا فرض انجام دے، جب پہلا گروہ سجدہ کر چکے تو پیچھے ہٹ کر وہ حفاظت و نگرانی کا کام سنبھالے اور دوسرا گروہ، جس نے نماز نہیں پڑھی ہے، امام کے پیچھے اسی مسلح حالت میں نماز کے لیے کھڑا ہو۔

اس صورت میں نماز با جماعت کے قیام، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا اور دفاع، تینوں کے تقاضے پورے ہو جاتے ہیں۔ لیکن مقتدیوں اور امام کی نماز کی رکعتوں کی تعداد کیا ہو گی؟ اس سوال کا جواب اس آیت سے پوری طرح واضح نہیں ہوتا جس کے سبب سے اس باب میں فقہا کی رائیں مختلف ہوئیں جس کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں موجود ہے۔ ہمارے لیے یہ ساری تفصیل نہ یہاں پیش کرنے کی گنجائش ہی ہے اور نہ چنداں اس کی ضرورت ہی ہے اس لیے کہ یہ شکل، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، اس مشکل کے حل کرنے کے لیے بتائی گئی تھی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی کی صورت میں پیدا ہو سکتی تھی۔ حضور کے بعد کسی ایک ہی امام کی اقتدا کی خواہش نہ تو اتنی شدید ہو سکتی اور نہ اس کی اتنی اہمیت ہی ہے، اس وجہ سے دفاع کے تقاضوں کے مطابق اہل لشکر الگ الگ اماموں کی اقتدا میں نماز ادا کر سکتے ہیں۔

صلوٰۃ خوف کی شکل آیت ۱۰۲ کی روشنی میں

آیت کے الفاظ سے جو بات نکلتی ہے وہ یہ ہے کہ امام قصر نماز دو رکعت ادا کرے اور مقتدیوں کے دونوں گروہ ایک ایک رکعت امام کے پیچھے اور ایک ایک رکعت بطور خود ادا کر کے اپنی نماز پوری کریں۔ امام دوسری رکعت کے لیے کھڑے ہونے سے پہلے اتنا توقف کرے کہ پہلی جماعت اپنی دوسری رکعت اختصار کے ساتھ ختم کر کے پیچھے ہٹ سکے اور دوسری جماعت اس کی جگہ لے سکے۔ اس طرح مقتدی اور امام دونوں کی دو دو رکعتیں ہوں گی۔

بعض لوگوں کی رائے یہ ہے کہ امام چار رکعت پڑھے گا اور مقتدیوں کے دونوں گروہ دو دو رکعتوں میں اس کی اقتدا کریں گے۔ اس صورت میں یہ بات کھٹکتی ہے کہ امام تو اتمام کرے گا اور مقتدی قصر کریں گے۔

حالانکہ قصر کی اجازت جس طرح مقتدیوں کے لیے ہے اسی طرح امام کے لیے بھی ہے۔ امام و مقتدی دونوں کے حالات بھی بعینہٖ ایک ہی طرح کے ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں، امام دو رکعتیں ادا کرے گا اور مقتدیوں کے دونوں گروہ اس کے پیچھے ایک ایک رکعت ادا کر کے اپنی نماز ختم کر دیں گے۔ اس شکل میں مقتدیوں کی نماز صرف ایک رکعت کی ہو جاتی ہے حالانکہ قصر میں بھی کوئی نماز ایک رکعت نہیں ہے۔

ہمارے اس رجحان کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس طرح امام اور مقتدی دونوں کی نماز میں کامل توافق ہوگا، نیت کے اعتبار سے بھی اور ظاہر کے اعتبار سے بھی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ آیت میں فَاِذَا سَجَدُوْا کے الفاظ سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ ایک رکعت مقتدیوں کو اپنے طور پر بھی ادا کرنی ہے۔ اگر یہ رکعت ادا نہ کرنی ہوتی یا امام کی اقتدا ہی میں ادا کرنی ہوتی تو فَاِذَا سَجَدُوْا کی جگہ فَاِذَا سَجَدْتَ کے الفاظ ہوتے۔ اس امر کی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے کہ سجدہ درحقیقت رکعت کی تعبیر ہے اس لیے کہ رکعت سجدہ ہی سے پوری ہوتی ہے۔

اس خاص شکل کا تعلق نبی صلعم کی موجودگی سے تھا

اس اشارے پر ہم بیان اکتفا کرتے ہیں۔ اس کی زیادہ تفصیل میں ہم اس لیے نہیں جانا چاہتے کہ ہمارے نزدیک باجماعت صلوٰۃ الخوف کی شکل لازماً ہر حالت میں اور ہر زمانے میں یہی نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، خاص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی سے تھا۔ آیت کے الفاظ میں خود اس کی تصریح موجود ہے وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ ظاہر ہے کہ یہ خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے ہے۔ آپ کو مخاطب کر کے ارشاد ہو رہا ہے کہ جب تم موجود ہو اور لوگوں کو جماعت کے ساتھ نماز پڑھانے کے لیے کھڑے ہو تب یہ شکل اختیار کی جائے۔ آنحضرت کی موجودگی میں اس شکل کے اختیار کرنے کی ضرورت وہی تھی جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا کہ ہر شخص آپ کی اقتدا کا ثواب بھی حاصل کر سکے اور دفاع کے مقصد کو بھی کوئی نقصان نہ پہنچے۔ اس زمانے میں اول تو جنگ کی صورت ہی بالکل تبدیل ہو چکی ہے۔ دوسرے حضور کی موجودگی کا سوال بھی نہیں ہے۔ اس وجہ سے حالات کے تقاضے کے مطابق قیامِ جماعت کی جو شکل اختیار کی جائے وہ اختیار کی جا سکتی ہے اور اگر قیامِ جماعت کا امکان نہ ہو تو جس طرح ممکن ہو پڑھی جا سکتی ہے۔

وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا الاٰية یہ وجہ بیان ہوئی ہے حالتِ نماز میں اس شدت کے ساتھ دفاع کے اس اہتمام کی۔ اس سے یہ بات صاف واضح ہوتی ہے کہ اسلام میں احتیاط کے تقاضوں سے بے پروا ہونے کی اجازت کسی حال میں نہیں ہے۔ یہاں تک کہ بیماری اور بارش وغیرہ کی تکلیف کے سبب سے اگر اسلحہ اتارنے کے لیے مجبور ہونا پڑے تو صرف اسلحہ اتار سکتا ہے: حذر یعنی حفاظتی نوعیت کی چیزوں سے پھر بھی بے پروا ہونے کی اجازت نہیں ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ۔ الاٰية کے ٹکڑے میں یہ بات واضح فرمائی گئی ہے کہ ان کفار کی سرکوبی

کے لیے جہاں تک تمھارا تعلق ہے تم پوری طرح مستعد رہو۔ ویسے اللہ نے ان کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب تیار کر ہی رکھا ہے۔ یہ بات اہل ایمان کی حوصلہ افزائی کے لیے فرمائی گئی ہے۔

فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ ۚ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۚ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا (۱۰۳)

قصر کے کسر کا جبر ذکر الٰہی کی کثرت سے

قصر کی اجازت سے نماز کے ظاہر میں جو کمی واقع ہوئی تو نماز سے فراغت کے بعد اس کی اصل حقیقت ـــ ذکر الٰہی ـــ کے اہتمام میں زیادہ سرگرم ہونے کی ہدایت فرمائی تاکہ اس کسر کا جبر بھی ہو جائے اور دوام ذکرِ الٰہی، جو روح دین ہے، کی یاددہانی بھی ہو جائے۔ بالخصوص میدانِ جنگ میں اس کی خاص اہمیت اِس وجہ سے بھی ہے کہ تمام عزم و حوصلہ کا منبع درحقیقت اللہ تعالیٰ کی یاد ہی ہے۔

نبی صلعم کا مقرر کردہ فریضہ عین اللہ کا فریضہ ہے

حالتِ خوف دُور ہو جانے کے بعد جب حالتِ امن و اطمینان عود کر آئے تو معاً اقامتِ صلوٰۃ کا حکم بھی عود کر آئے گا۔ یعنی پُوری نماز، جماعت اور وقت کی پابندی کے ساتھ ادا کرنی ہو گی۔ اس آیت سے ایک تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اوقات کی پابندی اقامتِ صلوٰۃ کے شرائط میں سے ہے۔ دُوسری یہ بات نکلتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ ایمان پر جو کچھ فرض کیا ہے وہ عین اللہ تعالیٰ کا مقرر کردہ فریضہ ہے۔ یہ بات اس طرح نکلتی ہے کہ نمازوں کے متعلق فرمایا ہے کہ یہ اوقات کے اہتمام کے ساتھ فرض ہیں۔ درآنحالیکہ اوقاتِ نماز تمام تر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کردہ ہیں، قرآن میں ان کی کوئی صراحت نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ کچھ اشارات ہیں۔

وَلَا تَهِنُوْا فِي ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ ۭ اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّھُمْ يَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ ۚ وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِــيْمًا حَكِـيْمًا (۱۰۴)

'القوم' سے مراد دشمن

'اَلْقَوْمُ' کا لفظ، جب اِس سیاق و سباق میں آئے گا جس سیاق و سباق میں یہاں ہے تو اس سے مراد دشمن اور حریف ہو گا۔ کلامِ عرب میں اس مخصوص استعمال کی مثالیں بہت ہیں۔ قرآن میں بھی اس کی مثال موجود ہے۔ مثلاً اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ۔ ۱۴۰۔ آل عمران (اگر تمھیں کوئی چوٹ پہنچی تو کوئی تعجب کی بات نہیں، آخر دشمن کو بھی اِسی طرح کی چوٹ پہنچی)

ترغیب جہاد کے مضمون کی مزید تاکید

یہ اسی ترغیبِ جہاد کے مضمون کی تاکید مزید ہے جو اُوپر سے چلا آ رہا ہے بلکہ یہاں صلوٰۃ الخوف کا ذکر بھی، جیسا کہ ہم نے واضح کیا، اسی سِلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اب یہ فرمایا کہ اگر تمھیں دشمن کے ہاتھوں کوئی نقصان پہنچ جائے تو اُس سے بددِل ہو کر اس کے تعاقب میں تمھیں پست ہمت نہیں ہونا چاہیئے۔ نقصان جس طرح تمھیں پہنچتا ہے انھیں بھی پہنچتا ہے۔ اِس اِعتبار سے تم اور وہ یکساں ہوا رہی عاقبت کار کی کامیابی تو اس دُنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، وہ سو فی صد تمھاری ہی ہے، اس میں ان کا سرے سے کوئی حصہ ہی نہیں ہے تو اس وقتی اور عارضی نقصان سے کیوں پست ہمت ہو۔

یاد رکھو کہ اللہ علیم و حکیم ہے۔ اگر وہ اپنی راہ میں جہاد کرنے والوں کو کسی آزمائش میں ڈالتا ہے، ان کو کوئی نقصان پہنچ جاتا ہے تو یہ چیز اس کے علم و حکمت کا تقاضا ہوتی ہے جس سے اہل ایمان کی اصلاح و تربیت مقصود ہوتی ہے۔

۳۲- آگے کا مضمون ____ آیات ۱۰۵-۱۱۵

آگے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے یہ ہدایت فرمائی کہ اللہ نے تمہیں جو کتاب عطا فرمائی ہے اب یہی حق و باطل کی کسوٹی ہے، تم اسی کسوٹی پر پرکھ کے لوگوں کے ساتھ معاملہ کرو جو اس پر پورے اتریں وہ مومن و مخلص ہیں، جو اس پر کھوٹے ثابت ہوں وہ عہد شکن اور غدار ہیں، تم خدا کے حضور میں ان کے سفارشی اور وکیل نہ بنو۔ خدا ایسے بدعہدوں اور گناہگاروں کو پسند نہیں کرتا۔ آیت ۸۸ فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ الآیۃ میں جس بات کی طرف اجمالاً اشارہ فرمایا تھا اب یہ اس کی تفصیل آگئی۔ وہاں یہ بات گزر چکی ہے کہ مسلمانوں میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو اپنے دل میں منافقین کے لیے بڑا نرم گوشہ رکھتے تھے، وہ ان کو جا و بیجا رعایت دینے کی کوشش کرتے اور لبا اوقات ان معاملات میں بھی انھیں معذور ٹھہراتے جن میں معذور ٹھہرانے کی کوئی بھی گنجائش نہ ہوتی۔ یہ رویہ اگرچہ طبیعت کی نرمی ہی کی بنا پر ہو لیکن خدا کی کتاب جنھیں معذور نہ ٹھہراتی ہو انھیں معذور ٹھہرانا اور ان کی حمایت کرنا نفاق کو شہ دینے بلکہ اس کی پرورش کرنے کے ہم معنی ہے۔ چنانچہ یہاں سب سے پہلے خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اس چیز سے روکا۔ حضورؐ کی طرف یہ خطاب اسی طرح کا ہے جس کی مثالیں ایک سے زیادہ اس کتاب میں گزر چکی ہیں اور ہم نے واضح کیا ہے کہ ان میں خطاب کا رخ تو حضورؐ کی طرف ہوتا ہے لیکن جو عتاب ان میں مضمر ہوتا ہے اس کا رخ ان لوگوں کی طرف ہوتا ہے جو اس غلطی کے مرتکب ہو رہے ہوتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرنے کے بعد براہِ راست ان منافقین کی حمایت کرنے والے مسلمانوں کو مخاطب کیا کہ اس دنیا میں تو تم ان کی حمایت کر رہے ہو لیکن آخرت میں ان کی حمایت کون کرے گا؟ اس کے بعد فرمایا کہ صحیح طریقہ نہ تو یہ ہے کہ اپنی غلطی کی حمایت کی جائے اور نہ یہ ہے کہ جب کسی پر گرفت ہو تو وہ اپنا بوجھ کسی دوسرے بے گناہ پر لادنے کی کوشش کرے، بلکہ توبہ و استغفار ہے۔ یہ تنبیہ اس لیے فرمائی گئی کہ منافقین اول تو اپنی کوئی غلطی تسلیم کرتے ہی نہیں تھے اور اگر کوئی غلطی اس طرح گرفت میں آجاتی کہ اس کی ذمہ داری سے بچنے کی کوئی سبیل ان کو نظر ہی نہ آتی تو جھوٹ اور بہتان کے ذریعے سے اس کو کسی بے گناہ کے سر تھوپنے کی کوشش کرتے۔

اس کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا کہ یہ محض اللہ کا فضل و احسان اور اس کی

بخشی ہوئی کتاب و حکمت کی برکت ہے کہ ان منافقین کے فتنوں اور ان کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ ہے ورنہ انھوں نے تو تمھیں راہ حق سے ہٹانے کی کوشش میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔

اس کے بعد منافقین کی مفسدانہ سرگرمیوں پر ان کو تنبیہ فرمائی ہے کہ جو لوگ حق واضح ہو جانے کے بعد رسول کی عداوت اور مسلمانوں کے طریقہ کی مخالفت میں یہ سرگرمیاں دکھا رہے ہیں ان کو اللہ اسی راہ پر موڑ دے گا جو انھوں نے اپنے لیے اختیار کی ہے اور یہ راہ جہنم کی راہ ہے۔ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۰۵-۱۱۵

إِنَّآ أَنزَلۡنَآ إِلَيۡكَ ٱلۡكِتَٰبَ بِٱلۡحَقِّ لِتَحۡكُمَ بَيۡنَ ٱلنَّاسِ بِمَآ أَرَىٰكَ ٱللَّهُۚ وَلَا تَكُن لِّلۡخَآئِنِينَ خَصِيمٗا ﴿١٠٥﴾ وَٱسۡتَغۡفِرِ ٱللَّهَۖ إِنَّ ٱللَّهَ كَانَ غَفُورٗا رَّحِيمٗا ﴿١٠٦﴾ وَلَا تُجَٰدِلۡ عَنِ ٱلَّذِينَ يَخۡتَانُونَ أَنفُسَهُمۡۚ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يُحِبُّ مَن كَانَ خَوَّانًا أَثِيمٗا ﴿١٠٧﴾ يَسۡتَخۡفُونَ مِنَ ٱلنَّاسِ وَلَا يَسۡتَخۡفُونَ مِنَ ٱللَّهِ وَهُوَ مَعَهُمۡ إِذۡ يُبَيِّتُونَ مَا لَا يَرۡضَىٰ مِنَ ٱلۡقَوۡلِۚ وَكَانَ ٱللَّهُ بِمَا يَعۡمَلُونَ مُحِيطًا ﴿١٠٨﴾ هَٰٓأَنتُمۡ هَٰٓؤُلَآءِ جَٰدَلۡتُمۡ عَنۡهُمۡ فِي ٱلۡحَيَوٰةِ ٱلدُّنۡيَا فَمَن يُجَٰدِلُ ٱللَّهَ عَنۡهُمۡ يَوۡمَ ٱلۡقِيَٰمَةِ أَم مَّن يَكُونُ عَلَيۡهِمۡ وَكِيلٗا ﴿١٠٩﴾ وَمَن يَعۡمَلۡ سُوٓءًا أَوۡ يَظۡلِمۡ نَفۡسَهُۥ ثُمَّ يَسۡتَغۡفِرِ ٱللَّهَ يَجِدِ ٱللَّهَ غَفُورٗا رَّحِيمٗا ﴿١١٠﴾ وَمَن يَكۡسِبۡ إِثۡمٗا فَإِنَّمَا يَكۡسِبُهُۥ عَلَىٰ نَفۡسِهِۦۚ وَكَانَ ٱللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمٗا ﴿١١١﴾ وَمَن يَكۡسِبۡ خَطِيٓـَٔةً أَوۡ إِثۡمٗا ثُمَّ يَرۡمِ بِهِۦ بَرِيٓـٔٗا فَقَدِ ٱحۡتَمَلَ بُهۡتَٰنٗا وَإِثۡمٗا مُّبِينٗا ﴿١١٢﴾ وَلَوۡلَا فَضۡلُ ٱللَّهِ عَلَيۡكَ وَرَحۡمَتُهُۥ لَهَمَّت طَّآئِفَةٞ مِّنۡهُمۡ أَن يُضِلُّوكَ وَمَا يُضِلُّونَ إِلَّآ أَنفُسَهُمۡۖ وَمَا

ع ۱۶ ۱۴

يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ؕ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ﴿۱۱۳﴾ لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۱۴﴾ وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ﴿۱۱۵﴾

الثلثة

ع ۱۴

ترجمۂ آیات ۱۰۵-۱۱۵

ہم نے یہ کتاب تم پر حق کے ساتھ اتاری ہے تاکہ تم لوگوں کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کرو جو اللہ نے تمہیں دکھایا ہے اور تم بدعہدوں کے حمایتی نہ بنو۔ اور اللہ سے مغفرت مانگو، بے شک اللہ غفور رحیم ہے۔ اور ان لوگوں کی وکالت نہ کرو جو اپنے آپ سے خیانت کر رہے ہیں۔ اللہ ان لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو بدعہد اور حق تلف ہیں۔ یہ لوگوں سے تو چھپتے ہیں اور اللہ سے نہیں چھپتے حالانکہ وہ اُن کے ساتھ ہوتا ہے جب کہ وہ ناپسندیدہ سرگوشیاں کرتے ہیں اور اللہ جو کچھ وہ کرتے ہیں، سب کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ ۱۰۵-۱۰۸

یہ تم ہو جنھوں نے دنیا کی زندگی میں ان کی مدافعت کی تو قیامت کے دن اللہ سے کون ان کی مدافعت کرے گا یا کون ان کا ذمہ دار بنے گا اور جو کسی بدی کا ارتکاب کرے یا اپنی جان پر کوئی ظلم ڈھائے، پھر اللہ سے مغفرت چاہے تو وہ اللہ کو بخشنے والا، رحم کرنے والا پائے گا اور جو کسی بدی کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کا وبال اسی

پر آتا ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے اور جو کسی غلطی یا گناہ کا ارتکاب کرتا ہے، پھر اس کی تہمت کسی بے گناہ پر لگاتا ہے تو اس نے اپنے سر ایک بہت بڑا بہتان اور گناہ لیا۔ ۱۰۹-۱۱۲

اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو ان میں سے ایک گروہ نے تو یہ ٹھان ہی لی تھی کہ تمھیں بے راہ کر کے رہے گا حالانکہ یہ اپنے آپ ہی کو بے راہ کر رہے ہیں، تمھارا کچھ نہیں بگاڑ رہے ہیں۔ اور اللہ نے تم پر کتاب و حکمت نازل فرمائی اور تمھیں وہ چیز سکھائی جو تم نہیں جانتے تھے اور اللہ کا تم پر بڑا فضل ہے۔ ۱۱۳

ان کی سرگوشیوں کا زیادہ حصہ ایسا ہے جس میں کوئی خیر نہیں۔ خیر والی سرگوشی تو صرف اس کی ہے جو صدقہ کی صلاح دے یا کسی نیکی کی راہ سجھائے یا اصلاح ذات البین کی دعوت دے۔ جو اللہ کی رضا جوئی میں ایسا کریں گے تو ہم ان کو اجر عظیم عطا فرمائیں گے اور جو کوئی راہ ہدایت واضح ہو چکنے کے بعد رسول کی مخالفت کرے گا اور مسلمانوں کے راستے کے سوا کسی اور راستے کی پیروی کرے گا تو ہم اس کو اسی راہ پر ڈالیں گے جس پر وہ پڑا اور اس کو جہنم میں داخل کریں گے اور وہ برا ٹھکانا ہے۔ ۱۱۴-۱۱۵

۳۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ ۚ وَلَا تَكُن لِّلْخَائِنِينَ خَصِيمًا ۝ وَاسْتَغْفِرِ اللَّهَ ۖ إِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَّحِيمًا ۝ وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِينَ يَخْتَانُونَ أَنفُسَهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَن كَانَ خَوَّانًا أَثِيمًا ۝ يَسْتَخْفُونَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُونَ مِنَ اللَّهِ وَهُوَ مَعَهُمْ إِذْ يُبَيِّتُونَ مَا لَا يَرْضَىٰ مِنَ الْقَوْلِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطًا (۱۰۵-۱۰۸)

'ارادت' کا مفہوم

'ارادت' کا لفظ قرآن میں اس وحی کے لیے بھی آیا ہے جو انبیاء علیہم السلام کو رویا میں ہوتی ہے جیسا کہ

انفال آیت ۴۲ میں ہے اور اس رہنمائی کے لیے بھی آیا ہے جو وحیٔ متلو کے ذریعے سے ہوتی ہے، جیسا کہ اس آیت میں ہے۔ اس لفظ کے معنی چونکہ دکھا دینے کے ہیں اس وجہ سے اس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ پیغمبر کو وحی کے ذریعے سے جو رہنمائی ملتی ہے وہ گویا چشم سر سے حقائق کا مشاہدہ ہوتا ہے اس وجہ سے اس کے لیے اس سے ہٹ کر کوئی راہ اختیار کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ آگے آیت ۱۱۳ میں بھی یہ مضمون آ رہا ہے۔

لفظ مجادلہ اچھے اور برے دونوں معنوں میں

مجادلۃ کا لفظ قرآن میں اچھے اور برے دونوں معنوں میں آیا ہے۔ اس کے معنی مناظرہ، کٹ حجتی اور جھگڑنے کے بھی ہیں اور اعتماد و تذلل کی بنیاد پر کسی سے شکوہ کرنے اور اصرار و الحاح کے ساتھ کسی کے حق میں سفارش کرنے کے بھی ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کا مجادلہ قوم لوطؑ کے بارے میں اور سورۂ مجادلہ میں جس مجادلہ کا ذکر ہے وہ اسی نوع کا ہے۔

منافقت خود اپنے ضمیر سے خیانت ہے

'اَلَّذِیْنَ یَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَھُمْ' سے مراد منافقین ہیں جن کا ذکر 'خائنین' کے لفظ سے ہوا ہے۔ خیانت اس بے وفائی اور غداری کے لیے ایک معروف لفظ ہے جو بیوی اپنے شوہر سے کرتی ہے جس طرح ایک بے وفا عورت اپنے آپ کو حبالۂ عقد میں تو کسی اور مرد کے دیتی ہے لیکن عشق کی پینگیں کسی اور کی طرف بڑھاتی ہے اسی طرح منافقین اطاعت و وفاداری کا عہد تو اللہ اور رسول سے کرتے ہیں لیکن دم دوسروں کا بھرتے ہیں۔ ان کی اس خیانت کی بابت ارشاد ہوا کہ یہ خود اپنے آپ سے خیانت کر رہے ہیں اس لیے کہ ان کی اس خیانت سے خدا اور رسول کا کچھ نہیں بگڑتا، بگڑتا انہی کا ہے لیکن ان کو نظر نہیں آتا۔ علاوہ ازیں اس میں یہ پہلو بھی ہے کہ یہ خود اپنے ضمیر کی نگاہوں میں مجرم ہیں۔ یہ جانتے ہیں کہ یہ سامنے کیا کر رہے ہیں اور پیٹھ پیچھے کیا کر رہے ہیں۔ ایسے لوگوں کی وکالت کرنا 'مدعی سست گواہ چست' کا مصداق بنتا ہے۔

خطاب پیغمبرؐ سے، عتاب دوسروں پر

'وَلَا تَکُنْ'، 'وَاسْتَغْفِرِ اللّٰہَ' اور 'وَلَا تُجَادِلْ' میں بظاہر خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے لیکن اس میں عتاب کا رخ ان مسلمانوں کی طرف ہے جو منافقین کی حمایت کرتے تھے۔ اس طرح کے خطاب جیسا کہ ہم اس کتاب میں متعدد مقامات میں واضح کر چکے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بحیثیت امت کے وکیل کے ہوتے ہیں۔ بات آپ کو مخاطب کر کے کہی جاتی ہے لیکن مقصود یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ یہ حرکتیں کر رہے ہیں وہ ان سے باز آئیں۔ اس اسلوب میں یہ بلاغت بھی ہوتی ہے کہ ان لوگوں سے ایک قسم کی بے التفاتی و بے پروائی کا اظہار ہو جاتا ہے جن کو سرزنش مقصود ہوتی ہے۔ گویا وہ لائق خطاب نہیں اس وجہ سے اللہ نے اپنے رسولؐ کو مخاطب کر کے جو بات فرمانی تھی وہ فرما دی۔ قرآن مجید میں اس طرح کے جو خطاب وارد ہوئے ہیں بالعموم کلام کے تدریجی ارتقا سے ان کا اصلی رخ بھی واضح ہو گیا ہے کہ خطاب فی الحقیقت کن سے ہے۔ چنانچہ یہاں بھی آگے

والی آیت ھَاَنْتُمْ ھٰۤؤُلَآءِ جٰدَلْتُمْ عَنْھُمْ الآیۃ نے واضح کر دیا ہے کہ اس میں اشارہ کن کی طرف ہے۔

اللہ اور اہل ایمان کا معیار پسند و ناپسند الگ الگ نہیں ہو سکتا

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الایۃ کے اسلوب میں اس حقیقت کا اظہار ہے کہ اللہ اور رسول اور مومنین کی پسند اور ناپسند کا معیار الگ الگ نہیں ہو سکتا۔ جن صفات و کردار کے لوگوں کو اللہ پسند نہیں کرتا، کس طرح ممکن ہے کہ رسول اور مومنین انھیں پسند کریں۔ اگر کچھ لوگ ایسے ہیں جو ایمان کا دعویٰ رکھتے ہیں اور ساتھ ہی ان لوگوں کو بھی پسند کرتے ہیں جو اللہ کے نزدیک ناپسندیدہ ہیں تو وہ خود سوچ لیں کہ ان کی یہ بات کہاں تک پہنچتی ہے۔

مومن و منافق کے درمیان امتیاز کے لیے کسوٹی قرآن ہے

اجزائے کلام کی وضاحت کے بعد آیات کا مدعا چنداں وضاحت طلب نہیں رہا۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے کتاب جو اتاری ہے حق کے ساتھ اتاری ہے، اس وجہ سے اب حق و باطل کے درمیان امتیاز کے لیے کسوٹی یہی ہے، اسی کسوٹی پر پرکھ کر تمھیں لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنا ہے کہ کون حق پر ہے کون باطل پر، کون مخلص ہے کون منافق۔ یہ اللہ کی دی ہوئی روشنی اور اس کی دکھائی ہوئی راہ ہے جس کے بعد تمھارے لیے بھٹکنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔ اس وجہ سے تم ان لوگوں کے حمایتی اور وکیل نہ بنو جو اللہ اور رسول سے بدعہدی اور خیانت کر رہے ہیں۔ تم اللہ سے مغفرت مانگو، اللہ بڑا غفور رحیم ہے۔ جو لوگ اللہ سے بدعہدی کر رہے ہیں وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ رہے ہیں بلکہ خود اپنے ہی نفس سے بدعہدی کر رہے اور اپنے ہی قلب و ضمیر کے مجرم ہیں۔ خدا ایسے بدعہدوں اور حق تلفوں کو پسند نہیں کرتا۔ تو جو خود اپنے ضمیر کی عدالت میں مجرم اور خدا کے مبغوض ہیں، ان کی مدافعت تم کیوں کرو؟ فرمایا کہ یہ انسانوں سے تو چھپتے ہیں اور چھپ چھپ کر اللہ و رسول کے خلاف سرگوشیاں کرتے ہیں لیکن اس اللہ سے کہاں چھپ سکتے ہیں جو اس وقت بھی ان کے ساتھ ہوتا ہے جب وہ اپنی ناپسندیدہ سرگوشیوں میں مصروف ہوتے ہیں۔ اللہ کا علم تو ہر چیز کو محیط ہے۔

ان منافقین کی درپردہ سازشوں اور سرگوشیوں کا ذکر اسی سورہ کی آیت ۸۱ میں بھی گزر چکا ہے۔ وہاں بھی دیکھیے۔ اس پر تفصیلی بحث ان شاء اللہ سورۂ مجادلہ میں ہوگی۔

ھٰۤاَنْتُمْ ھٰۤؤُلَآءِ جٰدَلْتُمْ عَنْھُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا فَمَنْ یُّجَادِلُ اللّٰہَ عَنْھُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ اَمْ مَّنْ یَّکُوْنُ عَلَیْھِمْ وَکِیْلًا ۝ وَمَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ یَظْلِمْ نَفْسَہٗ ثُمَّ یَسْتَغْفِرِ اللّٰہَ یَجِدِ اللّٰہَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ۝ وَمَنْ یَّکْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا یَکْسِبُہٗ عَلٰی نَفْسِہٖ ۭ وَکَانَ اللّٰہُ عَلِیْمًا حَکِیْمًا ۝ وَمَنْ یَّکْسِبْ خَطِیْٓئَۃً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ یَرْمِ بِہٖ بَرِیْٓئًا فَقَدِ احْتَمَلَ بُھْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِیْنًا ۝ (۱۰۹-۱۱۲)

'ھا' کلمۂ تنبیہ ہے

'ھَا' عربی میں کلمۂ تنبیہ ہے۔ اس پر دوسرے مقام میں بحث گزر چکی ہے۔ یہ جملہ کے شروع میں آتا ہے اور مقصود اس سے یہ ہوتا ہے کہ مخاطب کان کھول کر بات سنے۔

لفظ وکیل کے تین معنی

لفظ 'وکیل' کے ساتھ جب 'علیٰ' ہو تو موقع کے لحاظ سے یہ تین معنوں میں آتا ہے۔

۱۔ مسئول اور ذمہ دار کے معنی میں۔ مثلاً وَمَا جَعَلْنٰکَ عَلَیْھِمْ حَفِیْظًا وَمَآ اَنْتَ عَلَیْھِمْ بِوَکِیْلٍ ۱۰۷ انعام۔

(ہم نے تم کو ان پر نگران نہیں بنایا ہے اور تم ان کے ایمان کے باب میں مسئول نہیں ہو)

۲- نگران کے معنی میں۔ مثلاً خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوهُ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ وَكِيلٌ ۱۰۲ انعام (وہ ہر چیز کا خالق ہے، پس اسی کی بندگی کرو اور وہی ہر چیز پر نگران ہے)

۳- ضامن کے معنی میں۔ مثلاً أَيَّمَا الْأَجَلَيْنِ قَضَيْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ وَاللَّهُ عَلَى مَا نَقُولُ وَكِيلٌ ۲۸ قصص (دونوں میں سے جو مدت بھی میں پوری کر دوں تو مجھ پر کوئی زیادتی نہیں ہوگی اور ہم جو قول و اقرار کر رہے ہیں اس پر اللہ ضامن ہے)

ظاہر ہے کہ اَمْ مَنْ يَكُونُ عَلَيْهِمْ وَكِيلًا میں یہ پہلے معنی میں ہے۔ یعنی آج تو ان کی حمایت کرنے والے ان کی حمایت میں لڑ جھگڑ سکتے ہیں لیکن قیامت کے دن جب خدائے علیم و خبیر کی عدالت میں ان کا مقدمہ پیش ہوگا تو ان کی طرف سے کون مسئول اور جواب دہ بن کر کھڑا ہوگا، اس دن تو بہر حال انھیں خود ہی جواب دہی کرنی ہوگی۔

منافقین کی حمایت کرنے والوں سے خطاب

اب بات سامنے کھل کر آگئی کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے اوپر کی آیات میں کن کے رویے پر سرزنش کی گئی ہے۔ معلوم ہوا کہ مخاطب نبی صلی اللہ علیہ وسلم شخصاً نہیں ہیں بلکہ مسلمانوں میں سے وہ لوگ ہیں جو وقتاً فوقتاً اپنے ذاتی تعلقات کی بنا پر منافقین کی حمایت میں آستینیں چڑھا لیتے اور ان کی صریح غلطیوں کے باوجود ان کی برأت کے لیے کوئی نہ کوئی عذر تلاش کرنے کی کوشش کرتے۔ چنانچہ ان کو مخاطب کر کے فرمایا کہ لوگو، کان کھول کر سن لو کہ آج تو تم ان کی حمایت میں لڑ جھگڑ سکتے ہو لیکن کل جب خدا کے ہاں ان کی روبکاری ہوگی تو خدا سے ان کی مدافعت میں کون جھگڑے گا یا کون ان کی طرف سے مسئول بنے گا۔ اس کے بعد فرمایا کہ خدا سے چھوٹنے کا راستہ یہ نہیں ہے کہ مجرم کی حمایت میں دوسرے پشت پناہ بن کر کھڑے ہوں بلکہ یہ ہے کہ اگر کسی سے کوئی برائی یا کسی ظلم نفس (شرک) کا ارتکاب ہو جائے تو وہ اللہ کی طرف رجوع کرے اور اس سے مغفرت مانگے، جو شخص خلوص کے ساتھ استغفار کرے گا وہ اللہ کو بخشنے والا اور مہربان پائے گا۔ خدا کے ہاں ایک کا بوجھ دوسرا نہیں اٹھائے گا، جو کسی گناہ کا مرتکب ہوگا اس کا وبال اسی پر آئے گا، اس لیے کہ خدا علیم بھی ہے اور حکیم بھی۔ اس کے علم اور اس کے عدل و حکمت کا تقاضا یہی ہے کہ زید کا حساب بکر کے کھاتے میں نہ پڑنے پائے بلکہ ہر ایک اپنے عمل کا جواب دہ خود بنے۔

سازشی گروہ کا ایک خاص حربہ

وَمَنْ يَكْسِبْ خَطِيئَةً الآية' میں منافقین کی ایک اور شرارت سے پردہ اٹھایا کہ یہ لوگ اپنی کسی غلطی یا کسی حق تلفی پر جب گرفت میں آجاتے ہیں تو اعتراف کے بجائے جھوٹ اور بہتان کی راہ اختیار کرتے ہیں اور اس کا بوجھ کسی بے گناہ پر لادنے کی کوشش کرتے ہیں۔ فرمایا کہ خدا سے برأت کا یہ راستہ بھی غلط ہے۔ اس بہتان اور جھوٹ سے دنیا کو دھوکا دیا جا سکتا ہے، خدا کو دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔ خدا کے ہاں ایسے مجرم نہ صرف اپنے جرم کا بوجھ اٹھائیں گے بلکہ اپنے اصل جرم پر بہتان اور جھوٹ کا بھی اضافہ کر لیں گے۔

یہ بات یہاں یاد رکھنی چاہیے کہ اوپر منافقین کی سازشوں اور سرگوشیوں کا ذکر گزر چکا ہے۔ سازشی گروہوں کا خاص حربہ اپنے دفاع کے لیے یہی ہوتا ہے کہ جب وہ پکڑے جاتے ہیں تو اس کا الزام یا تو دوسرے بے گناہوں کے سر تھوپنے کی کوشش کرتے ہیں یا کم از کم ان کو بھی اس میں ملوث کرنے کے لیے بہتان طرازی کرتے ہیں تاکہ اپنا بارِ گناہ کچھ ہلکا کریں۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ؕ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا (۱۱۳)

آنحضرت صلعم کی طرف التفات اور مسلمانوں کو آگاہی

یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف التفات اور آپ کے واسطے سے مسلمانوں کو تنبیہ ہے کہ یہ اللہ کا تمہارے اوپر خاص فضل و احسان ہے کہ تم ان منافقین کے شر سے محفوظ رہے ورنہ ان کی ایک جماعت کی تو رات دن کوشش اور سازش یہی ہے کہ تمہیں راہ سے بے راہ کر کے رہے لیکن اللہ نے اپنے فضل خاص سے تمہیں کتاب و حکمت کی جو روشنی عطا فرمائی ہے اس نے تمہیں لغزش سے محفوظ رکھا۔ اس میں مسلمانوں کو یہ تنبیہ ہے کہ اس گروہ کی آفتوں اور فتنوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھیں اور ساتھ ہی اس سے محفوظ رہنے کی تدبیر بھی بتا دی کہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ کتاب و حکمت کی جو نعمت ان کو ملی ہے اس کی سچے دل سے قدر کریں اور ان لوگوں کے چکموں میں نہ آئیں جو اس سے ہٹ کر اپنی راہ نکال رہے ہیں۔

راہِ حق سے ہٹ کر چلنے والے خود اپنے کو گمراہ کرتے ہیں

'وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ' میں اس حقیقت نفس الامری کا بیان ہے کہ راہِ حق سے منحرف ہو کر چلنے والے اگر راہِ حق پر چلنے والوں کو حق سے ہٹانے میں کامیاب نہ ہو سکیں تو پھر وہ اپنی تمام دانش فروشیوں کے باوجود صرف اپنے ہی کو گمراہ کرتے ہیں، جادۂ حق پر استوار رہنے والوں کو وہ کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ مطلب یہ ہے کہ تم اپنے موقفِ حق پر ڈٹے ہوئے دیکھتے رہو کہ یہ تباہی کے کس کھڈ میں جا کر گرتے ہیں۔

لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۭ بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا (۱۱۴ - ۱۱۵)

نجویٰ کا مفہوم اور اس میں خیر و شر کا پہلو

'نجویٰ' کے معنی سرگوشی اور راز داری کے انداز میں کسی سے بات کرنے کے ہیں۔ اس میں بجائے خود کوئی برائی نہیں ہے اس لیے کہ ایسے مواقع بہت سے ہو سکتے ہیں جہاں راز داری اور سرگوشی کا طریقہ ہی قرینِ مصلحت ہو۔ ہر جگہ اور ہر موقع پر اذان دینا ہی ضروری نہیں ہے۔ اس میں برائی یا بھلائی بات کی نوعیت سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر بات نیکی اور تقویٰ کی ہے تو وہ نجوائے خیر ہے اور اگر بات شرارت اور فتنے کی ہے تو وہ نجوائے شیطانی ہے۔ قرآن نے اس حقیقت کی وضاحت سورۂ مجادلہ میں فرما دی ہے۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَنَاجَيْتُمْ

فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۹ (اے ایمان والو، جب تم آپس میں رازداری کے ساتھ بات کرو تو گناہ اور تعدی کی مشورت نہ کرو بلکہ نیکی اور تقوی کی بات کرو)

نجوی نیک مقاصد سے

'اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ' میں ایک مضاف محذوف ہے جس طرح 'وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ' میں ہے، جس کا ذکر بقرہ میں گزر چکا ہے۔ یعنی ان کا نجوی تر بیشتر شیطانی ہوتا ہے البتہ ان کے نجوی میں خیر ہے جو صدقہ، نیکی اور اصلاح کے لیے نجوی کریں۔

'مشاقة' اور 'الهدى' کا مفہوم

'مُشَاقَّة' اور 'اَلْهُدٰى' کے الفاظ پر سورۂ بقرہ میں بحث گزر چکی ہے۔ رسول کے ساتھ 'شاقة' کے معنی ہیں رسول کے مقابل میں اپنی ایک پارٹی کھڑی کرنے کی کوشش کرنا اور 'الهدى' کے معنی 'هُدَى اللّٰهِ' یعنی اللہ کی ہدایت کے ہیں جس طرح 'الْكِتٰب' کے معنی کتاب اللہ کے۔

'سبیل المؤمنین' سے مراد

'سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ' میں مومنین سے مراد صحابۂ رسول ہیں۔ انھوں نے زندگی کا جو طریقہ اختیار کیا وہ سرتا سر ہدایت الٰہی پر مبنی تھا اس وجہ سے اس کی اتباع ہی اللہ اور رسول کی اتباع ہے اس سے ہٹ کر کوئی راہ نکالنا گمراہی ہے۔

'نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى' کا اسلوب

'نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى' میں وہی اسلوب ملحوظ ہے جو 'فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ' میں ہے یعنی جو لوگ اہل ایمان کے راستہ سے ہٹ کر کوئی راہ نکالنے کی کوشش کریں گے خدا ان کو اسی راہ پر موڑ دے گا جس پر وہ جانا چاہتے ہیں۔ حق کے ترک و اختیار کے معاملے میں خدا کے ہاں جبر نہیں ہے جو خدا کی راہ پر چلنا چاہتا ہے اللہ اس کو اس کی توفیق ارزانی فرماتا ہے، جو اس سے الگ ہو کر اپنی پسند کردہ کوئی راہ اختیار کرنا چاہتا ہے تو وہ اس کے لیے بھی اس کو ڈھیل دے دیتا ہے۔

منافقین کی سرگوشیوں کی نوعیت

اوپر آیت ۱۰۸ میں 'اِذْ يُبَيِّتُوْنَ مَا لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ' کے الفاظ سے منافقین کی جن سرگوشیوں اور سازشوں کی طرف اشارہ فرمایا تھا اب یہ اس کی وضاحت ہو رہی ہے کہ ان کی سرگوشیوں کا اکثر حصہ خیر سے بالکل خالی محض فتنہ و فساد کی باتوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ بابرکت سرگوشی تو وہ ہو سکتی ہے جو صدقے کی ترغیب، نیکی کی تشویق اور باصلاح ذات البین کے مقصد سے ہو اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو اللہ کی رضا جوئی کے لیے درپردہ ان اعلیٰ مقاصد کے لیے کام کریں اللہ ان کو بڑا اجر دے گا۔

اس کے بعد فرمایا کہ جو لوگ یہ اچھی طرح سمجھ چکنے کے بعد کہ رسول جس طریق ہدایت کے داعی ہیں یہ اللہ کی اتاری ہوئی ہدایت ہے، رسول کی مخالفت کر رہے ہیں اور اہل ایمان کے اختیار کیے ہوئے طریقے کو چھوڑ کر کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہتے ہیں اللہ ان کو ان کی اختیار کی ہوئی راہ پر جانے کے لیے چھوڑ دے گا اور یہ اس راہ سے سیدھے جہنم میں پہنچ جائیں گے جو نہایت برا ٹھکانا ہے۔

ان دونوں آیتوں پر تدبر کی نگاہ ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ قرآن نے نہایت بلیغ اسلوب سے ان منافقین کے نجوی کی نوعیت بھی واضح کر دی ہے اور اس کا مقصد بھی بے نقاب کر دیا ہے۔ جب یہ فرمایا کہ ان کے

نجویٰ میں کوئی خیر نہیں، بنجوائے خیر تو ان کا نجویٰ ہے جو صدقہ پر ابھاریں، معروف پر چلنے کی ترغیب دیں اور اصلاح ذات البین کی کوشش کریں تو اس سے یہ بات آپ سے آپ نکل آئی کہ یہ لوگ جو سرگوشیاں کرتے ہیں اس میں یہ لوگوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے روکتے ہیں، معروف کے بجائے منکر کی ترغیب دیتے ہیں اور اصلاح ذات البین کے بجائے مسلمانوں میں نفاق ڈلوانے کی سازش کرتے ہیں۔

اسی طرح جب یہ فرمایا کہ جو لوگ اللہ کی ہدایت اچھی طرح واضح ہو چکنے کے بعد رسولؐ کی اور اللہ کی ہدایت کی مخالفت کر رہے ہیں اور مسلمانوں کے راستہ سے الگ اپنی ایک پگڈنڈی نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں اللہ ان کو ان کی پسند کی راہ پر جانے کے لیے چھوڑ دے گا جو ان کو سیدھے جہنم میں لے جاکے گرائے گی تو گویا یہ واضح کر دیا کہ ان لوگوں کی ان تمام سازشوں اور سرگوشیوں کا مدعا درحقیقت یہ ہے کہ یہ رسول کے بالمقابل اپنی ایک الگ پارٹی بنانا، ہدی اللہ کے بالمقابل اپنی ایک علیحدہ ڈگر نکالنا اور طریقۂ مومنین کے بالمقابل طریقۂ جاہلیت کی پیروی کرنا چاہتے ہیں۔

یں جب یہ آیتیں پڑھتا ہوں تو میرا ذہن بار بار اس طرف جاتا ہے کہ یہ ان لوگوں کو جواب دیا گیا ہے جو ان منافقین کی حمایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین مخلصین سے بحثیں اور مناظرے کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان منافقین کی ان خفیہ مجلسوں اور درپردہ سازشوں کی اطلاعات جب حضورؐ کو اور صحابہؓ کو پہنچتی رہی ہوں گی تو ان پر کسی نہ کسی نوعیت سے گرفت بھی ہوتی رہی ہوگی۔ اس وقت ان کے یہ حمایتی جن کا اوپر ذکر ہوا، ان کی صفائی میں کہتے رہے ہوں گے کہ یہ لوگ تو بڑے مخلص ہیں، یہ تو ملت کے بڑے ہوا خواہ ہیں، ان کی مجلسوں میں جو باتیں ہوتی ہیں وہ اسلام اور مسلمانوں کی بہبود اور خیرخواہی کی ہوتی ہیں اور اگر اس ذیل میں کوئی ایسی بات گرفت میں آتی رہی ہوگی جس کا جواب نہ بن آتا ہوگا تو اس کا الزام، جیسا کہ اوپر اشارہ گزرا، کسی ایسے بھلے مانس پر ٹھونک دیتے رہے ہوں گے جس کے حاشیہ خیال میں بھی وہ بات کبھی نہیں آئی ہوگی۔ ان لوگوں کی اس وکالت کے جواب میں قرآن نے نہایت بلیغ طریقے سے ان اندرونِ خانہ سرگوشیوں سے پردہ اٹھایا اور دیکھیے کتنی خوبصورتی سے پردہ اٹھایا ہے کہ ساری بات بھی سامنے آگئی اور مخاطب کے لیے کسی بحث و تردید کی گنجائش بھی باقی نہیں رہی۔

۴۴۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۱۶-۱۲۶

آگے پہلے وجہ بیان ہوئی ہے اس بات کی کہ یہ منافقین جو اللہ کی ہدایت واضح ہو چکنے کے بعد رسول کی مخالفت اور مومنین کی راہ سے الگ اپنی راہ نکالنا چاہتے ہیں جہنم میں پڑیں گے تو کیوں پڑیں گے؟ اس کا جواب یہ دیا ہے کہ اللہ کی ہدایت کے خلاف کوئی راہ اختیار کرنا، خدا کے رسولؐ کے خلاف اپنی پارٹی کھڑی کرنا اور مومنین کے راستے سے الگ راہ نکالنا اپنی حقیقت کے لحاظ سے شرک ہے اور

اللہ تعالیٰ کا شرک کے متعلق یہ فیصلہ ہے کہ وہ اس کو معاف فرمانے والا نہیں۔

شرک کی حقیقت

اس کے بعد شرک کے ذکر کے تعلق سے شرک کی حقیقت واضح فرمائی کہ جو لوگ شرک کرتے ہیں وہ درحقیقت شیطان کے پیرو ہیں۔ اس نے ان کے لیے آرزوؤں کے جو پر فریب دام بچھائے ہیں اس میں وہ پھنس گئے ہیں اور جو کچھ وہ انھیں سجھاتا ہے بالکل اندھے بہرے ہو کر اس کی تعمیل کر رہے ہیں حالانکہ اس کے تمام وعدے بالکل فریب ہیں۔ ان لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے جس میں داخل ہونے کے بعد اس سے ان کو نکلنا نصیب نہ ہو گا۔

فوز و فلاح آخرت صرف اہل توحید کے لیے

پھر اہل توحید کی فوز و فلاح کا ذکر فرمایا کہ یہ لوگ بے شک خدا کی ابدی بہشت میں داخل ہوں گے اور ان کے لیے اللہ کے جو وعدے ہیں وہ شیطان کے وعدوں کی طرح محض فریب نہیں ہیں بلکہ سر تا سر حقیقت ہیں اور خدا کی بات سے زیادہ سچی بات کس کی ہو سکتی ہے؟

خدا کے ہاں کام آنے والی چیز ایمان و عمل صالح

اس کے بعد فرمایا کہ جھوٹی آرزوؤں پر جو لوگ جی رہے ہیں، خواہ منافقین ہوں یا اہل کتاب، سب دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں۔ ان میں سے کسی کی آرزو بھی پوری ہونے والی نہیں۔ خدا کے ہاں کام آنے والی چیز ایمان اور عمل صالح ہے۔ خدا کی بہشت میں وہی داخل ہوں گے جن کے پاس یہ متاع ہو گی جو اس سے محروم ہوں گے وہ اپنی برائیوں کی سزا بھگتیں گے خواہ کوئی ہوں۔

ملت ابراہیم سے بڑھ کر کوئی ملت توحید کی حامل نہیں

آخر میں فرمایا کہ اصل دین اُن لوگوں کا ہے جو اسلام کے پیرو ہیں۔ یہی ملت ابراہیم ہے۔ ابراہیم خدائے واحد کے پرستار تھے اور ان کی اس توحید ہی کی وجہ سے خدا نے ان کو دوست بنایا تھا۔ اس کائنات کی ہر چیز خدا ہی کی ہے اور خدا ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اب اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۱۶-۱۲۶

إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ ۚ وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا ﴿١١٦﴾ إِنْ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ إِلَّا إِنَاثًا وَإِنْ يَدْعُونَ إِلَّا شَيْطَانًا مَرِيدًا ﴿١١٧﴾ لَعَنَهُ اللَّهُ ۘ وَقَالَ لَأَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيبًا مَفْرُوضًا ﴿١١٨﴾ وَلَأُضِلَّنَّهُمْ وَلَأُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَآمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ آذَانَ الْأَنْعَامِ وَلَآمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللَّهِ ۚ وَمَنْ يَتَّخِذِ الشَّيْطَانَ وَلِيًّا مِنْ دُونِ اللَّهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُبِينًا ﴿١١٩﴾

وقف لازم

يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيهِمْ ۖ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۱۲۰﴾ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۫ وَلَا يَجِدُوْنَ عَنْهَا مَحِيْصًا ﴿۱۲۱﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ۭ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ﴿۱۲۲﴾ لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ۭ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْۗءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۱۲۳﴾ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ﴿۱۲۴﴾ وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۭ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ﴿۱۲۵﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطًا ﴿۱۲۶﴾ ۱۸ ع ۱۱ ۱۵

ترجمۂ آیات ۱۱۶-۱۲۶

بے شک اللہ اس چیز کو نہیں بخشے گا کہ اس کا شریک ٹھہرایا جائے، اس کے نیچے جس کے لیے چاہے گا بخش دے گا اور جو اللہ کا شریک ٹھہرائے گا وہ بہت دور کی گمراہی میں جا پڑا۔ یہ اس کے سوا پکارتے بھی ہیں تو دیویوں کو اور پکارتے بھی ہیں تو شیطان سرکش کو۔ اس پر اللہ کی پھٹکار ہے! اور اس نے کہہ رکھا ہے کہ میں تیرے بندوں میں سے ایک معین حصہ ہتھیا کے رہوں گا، ان کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا، ان کو آرزوؤں کے جال میں پھنساؤں گا، ان کو سجھاؤں گا تو وہ چوپایوں کے کان کاٹیں گے اور ان کو سجھاؤں گا تو وہ خدا کی بنائی ہوئی ساخت کو بگاڑیں گے اور جو اللہ کے سوا

شیطان کو اپنا کارساز بنائے تو وہ کھلی ہوئی نامرادی میں پڑا۔ وہ ان کو وعدوں کے بہلاوے دیتا ہے، آرزوؤں میں پھنساتا ہے اور شیطان کے وعدے سرتاسر فریب ہیں۔ ان کا ٹھکانا جہنم ہوگا اور وہ اس سے گریز کی کوئی راہ نہیں پائیں گے۔ ۱۱۶-۱۲۱

اور جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک کام کیے ہم ان کو ایسے باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ اللہ کا وعدہ حق ہے اور اللہ سے زیادہ وعدے کا سچا کون ہو سکتا ہے۔ ۱۲۲

آرزوئیں نہ تمھاری پوری ہونی ہیں نہ اہل کتاب کی۔ جو کوئی برائی کرے گا اس کا بدلہ پائے گا اور وہ اپنے لیے اللہ کے مقابل کوئی کارساز اور مددگار نہ پا سکے گا۔ اور جو نیکی کرے گا، خواہ مرد ہو یا عورت اور وہ مومن بھی ہے تو یہی لوگ ہیں جو جنت میں داخل ہوں گے اور ان کی ذرا بھی حق تلفی نہ ہوگی۔ ۱۲۳-۱۲۴

اور باعتبارِ دین اس سے بڑھ کر کون ہو سکتا ہے جو اپنے آپ کو اللہ کے حوالہ کر دے درآنحالیکہ خوب کار بھی ہو اور ابراہیم کی ملت کی پیروی کرے جو بالکل یکسو تھا اور اللہ نے ابراہیم کو اپنا دوست بنایا اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ ۱۲۵-۱۲۶

۳۵- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ ؕ وَمَنْ یُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِیْدًا (۱۱۶)

'دون' کا لفظ اپنے استعمالات کے لحاظ سے ورے اور پرے، نیچے اور اوپر، آگے اور پیچھے دونوں معنوں

لفظ دُون کا مفہوم

میں آتا ہے۔ قرینہ معین کرتا ہے کہ کہاں کیا مراد ہے۔ یہاں ظاہر ہے کہ ورے یا نیچے کے معنی میں ہے۔

شرک کے ناقابلِ معافی جرم ہونے کی وجہ

جس طرح تمام خیر کا منبع توحید ہے یعنی خدا کی ذات، صفات اور اس کے حقوق میں کسی کو ساجھی نہ ٹھہرانا اسی طرح تمام شر کا منبع شرک ہے یعنی خدا کی ذات، صفات اور اس کے حقوق میں کسی کو شریک ٹھہرانا۔ توحید پر قائم رہتے ہوئے انسان اگر کوئی ٹھوکر کھاتا ہے تو وہ غلبۂ نفس و جذبات سے اتفاقی ہوتی ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنی غلطی ہی کو اوڑھنا بچھونا بنا لے۔ اس وجہ سے وہ گرنے کے بعد لازماً اٹھتا ہے۔ برعکس اس کے شرک کے ساتھ اگر کسی سے کوئی نیکی ہوتی ہے تو وہ اتفاقی ہوتی ہے جس کا اصل منبع خیر یعنی خدا سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اس وجہ سے وہ بے بنیاد ہوتی ہے۔ مشرک خدا سے کٹ جانے کی وجہ سے لازماً اپنی باگ نفس اور شیطان کے ہاتھ میں دے دیتا ہے اس وجہ سے وہ درجہ بدرجہ صراطِ مستقیم سے اتنا دور ہو جاتا ہے کہ اس کے لیے خدا کی طرف لوٹنے کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہ جاتا تاآنکہ وہ شرک سے توبہ کرے۔ اس وجہ سے خدا کے ہاں شرک کی معافی نہیں ہے۔ البتہ توحید کے ساتھ اگر کسی سے گناہ ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ جس کے لیے چاہے گا معاف فرما دے گا۔

خدا کی ہدایت کے برخلاف کسی طریقے کی پیروی کرنا شرک ہے

اوپر ہم نے اشارہ کیا ہے کہ یہاں یہ شرک کا ذکر ان منافقین کے تعلق سے ہوا ہے جو رسول کی ہدایت الٰہی کی اور طریقۂ اہلِ ایمان کی مخالفت کر رہے تھے۔ خدا کی شریعت اور اس کے قانون کے ہوتے ہوئے کسی اور کے قانون و شریعت کی پیروی کی جائے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ جو حق خدا کا ہے اس میں دوسرے کو شریک کر دیا گیا ہے۔ رسول، اللہ کی شریعت لاتا ہے، ہدی اللہ، اللہ کی شریعت ہے اور اہلِ ایمان کا طریقہ اسی شریعت پر قائم ہے۔ اب جو لوگ اس سے الگ کوئی راہ نکالنے کے درپے ہیں وہ راہ اللہ کی نہیں بلکہ شیطان کی ہے اور اس پر چلنے والے شیطان اور طاغوت کے پیرو ہیں اور یہ چیز اسی طرح شرک ہے جس طرح تحاکم الی الطاغوت شرک ہے جس کا ذکر پیچھے گزر چکا ہے۔[1]

وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ میں لِمَنْ يَّشَآءُ کی قید بھی قابلِ غور ہے۔ ایمان کے ساتھ جو گناہ صادر ہو جاتے ہیں ان کی معافی کے ذکر کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے لِمَنْ يَّشَآءُ (جس کے لیے چاہے گا) کی قید بھی لگائی ہے جو نہایت اہمیت رکھنے والی قید ہے۔ ہم اس کتاب میں بار بار ذکر کر چکے ہیں کہ قرآن سے یہ بات بالکل غیر مشتبہ طور پر ثابت ہے کہ خدا کی کوئی مشیت بھی اس کی حکمت سے الگ نہیں ہے اس وجہ سے یہ معافی انہی کو حاصل ہو گی جو اس کے عدل و حکمت کے تحت اس کے سزاوار ٹھہریں گے۔ اس قید نے اس معاملے میں بے جا جسارت کے تمام دروازے بند کر دیے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس مشیت کے لیے جو قاعدے ضابطے رکھے ہیں وہ اس نے خود قرآن میں بیان فرما دیے ہیں۔

---

[1] توحید اور شرک کی حقیقت اچھی طرح سمجھنے کے لیے ہماری کتاب 'حقیقتِ شرک و توحید' پڑھیے۔

إِن يَدْعُونَ مِن دُونِهِ إِلَّا إِنَاثًا ۚ وَإِن يَدْعُونَ إِلَّا شَيْطَانًا مَّرِيدًا ۝ لَّعَنَهُ اللَّهُ ۘ وَقَالَ لَأَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ۝ وَلَأُضِلَّنَّهُمْ وَلَأُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَآمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ آذَانَ الْأَنْعَامِ وَلَآمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللَّهِ ۚ وَمَن يَتَّخِذِ الشَّيْطَانَ وَلِيًّا مِّن دُونِ اللَّهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِينًا ۝ يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيهِمْ ۖ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطَانُ إِلَّا غُرُورًا ۝ أُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَلَا يَجِدُونَ عَنْهَا مَحِيصًا (۱۱۷-۱۲۱)

'ان یدعون' یہاں پکارنے سے مراد وہ پکارنا ہے جو دعا، فریاد، استغاثہ، استعانت، احترام وغیرہ کے قصد سے اس معنی میں ہو جس معنی میں معبود کو پکارا جاتا ہے۔

'اناث' سے مراد مزعومہ دیویاں ہیں

اناث، انثی کی جمع ہے۔ انثی، لغوی مفہوم میں تو نرم و نازک اور ڈھیلی ڈھالی چیز کے لیے استعمال ہوا ہے لیکن معروف استعمال اس کا عورت کے لیے ہے۔ یہاں چونکہ مشرکین کے دیویوں دیوتاؤں کے ذکر کے سیاق میں ہے اس وجہ سے اس سے مراد دیویاں ہیں۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ مشرکین کی دیومالائیں، خواہ وہ کسی قوم و ملک کے مشرکین ہوں، دیویوں کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل رہی ہے۔ چین، ہندوستان، عرب، مصر اور بابل و نینوا وغیرہ کے مشرکانہ مذاہب کی جو تاریخ موجود ہے اس پر ایک سرسری نظر ڈال کر اس کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔ یہ بات بھی خاص طور پر ملحوظ رکھنے کی ہے کہ زندگی کی جو اصل ضرورتیں ہیں وہ بیشتر انھیں دیویوں سے متعلق سمجھی جاتی رہی ہیں۔ عرب جاہلیت میں بھی خدائی کے نظام پر بیشتر دیویوں ہی کا قبضہ تھا۔ لات، منات، عزیٰ وغیرہ دیویوں ہی کے نام ہیں۔ یہ، جیسا کہ سورۂ نجم کی تفسیر میں واضح ہوگا، فرشتوں کے بت تھے جن کے متعلق مشرکین کا عقیدہ تھا کہ یہ خدا کی لاڈلی اور چہیتی بیٹیاں ہیں جن کی بات خدا کبھی نہیں ٹالتا اس وجہ سے ان کے واسطہ سے جو کچھ مانگا جائے اگر یہ راضی ہوں تو وہ مل کے رہتا ہے۔ قرآن میں ان کے اس عقیدہ کا جگہ جگہ حوالہ ہے مثلاً وَجَعَلُوا الْمَلَائِكَةَ الَّذِينَ هُمْ عِبَادُ الرَّحْمَٰنِ إِنَاثًا۔ ۱۹ زخرف (اور انھوں نے فرشتوں کو جو خدائے رحمان کے بندے ہیں دیویاں بنا ڈالا ہے) پیچھے جبت و طاغوت کی بحث کے ضمن میں ہم یہ بات بھی واضح کر چکے ہیں کہ اہل کتاب نے بھی، جب مشرک قوموں سے ان کو سابقہ پیش آیا، ان کے بہت سے مشرکانہ طریقے اختیار کر لیے اور انھی کی طرح بہت سے دیوی دیوتا اپنے لیے بنا لیے جس کا ماتم ان کے انبیا نے کیا ہے اور یہ ماتم خود ان کے صحیفوں میں موجود ہے۔ نصاریٰ حضرت مریم کی نسبت جو عقیدہ رکھتے ہیں وہ بھی معلوم ہے۔

شرک کا امام شیطان ہے

'وَإِن يَدْعُونَ إِلَّا شَيْطَانًا مَّرِيدًا' شیطان کے پکارنے کا ذکر اصل مرشدِ شرک کی حیثیت سے ہے اس لیے کہ وہی ہے جس نے آدم کو سجدہ کرنے کے معاملے میں خدا کے حکم کی رو در رو نافرمانی کی اور جب خدا نے اس کے اس تمرد و سرکشی پر اس کو لعنت کی تو اس نے دھمکی دی کہ میں تیرے بندوں کو مختلف طریقوں سے توحید سے ہٹا کر شرک میں مبتلا کروں گا۔ اس وجہ سے شرک جہاں کہیں بھی اور جس شکل میں بھی پایا جاتا ہے اس کا امام درحقیقت شیطان ہی ہے اور اس اعتبار سے ہر وہ دعا اور التجا اور ہر وہ عبادت و اطاعت جو

کسی غیر اللہ سے یا کسی غیر اللہ کے لیے کی جا رہی ہے وہ بالواسطہ شرک کے اس امام ہی سے اور اسی کے لیے ہوتی ہے۔

'لَعَنَهُ اللّٰهُ' 'لَعَنَهُ اللّٰهُ' صفت بھی ہو سکتا ہے اس لیے کہ جس وقت شیطان نے اللہ کے بندوں کو شرک میں مبتلا کرنے کی دھمکی دی تھی اسی وقت اللہ تعالیٰ نے، جیسا کہ قرآن میں مذکور ہے، اس پر لعنت بھی کر دی تھی اس وجہ سے وہ اس صفت کا دائمی موصوف ہے لیکن میں نے اس کو جملہ معترضہ کے مفہوم میں لیا ہے اور اسی اعتبار سے اس کا ترجمہ کیا ہے۔ اس میں بلاغت کا یہ پہلو ہے کہ گویا جوں ہی اس امام شرک کا نام آیا اللہ تعالیٰ نے عین اس کے عابدوں کے منہ پر اس پر لعنت کر دی۔ یہ اظہارِ نفرت کا سب سے زیادہ موثر طریقہ ہے۔

جملہ معترضہ کے مفہوم میں

شیطان کی دھمکی بنی آدم کو

وَقَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ الایۃ میں شیطان کی اس دھمکی کا حوالہ ہے جو اس نے اس وقت دی تھی جب اس نے آدم کو سجدہ کرنے کے معاملے میں کھلم کھلا خدا کے حکم کی نافرمانی کی اور خدا نے اس کو راندۂ درگاہ قرار دیا۔ اس دھمکی کا ذکر قرآن نے متعدد مقامات میں کیا ہے۔ مثلاً

قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ	خدا نے پوچھا کہ جب میں نے تجھے سجدے کا حکم دیا تو تجھے
قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِيْ مِنْ	سجدے سے کس چیز نے روکا؟ شیطان نے جواب دیا
نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ۝ قَالَ	کہ میں آدم سے بہتر ہوں تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور
فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ	اس کو مٹی سے بنایا ہے۔ خدا نے فرمایا تو یہاں سے اتر
تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ	تجھے یہ حق نہیں ہے کہ تو اس میں اپنی بڑائی کا گھمنڈ کرے
الصّٰغِرِيْنَ ۝ قَالَ اَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ	پس تو یہاں سے نکل، تو خوار ہونے والوں میں سے ہے
يُبْعَثُوْنَ ۝ قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ۝	اس نے کہا مجھے لوگوں کے اٹھائے جانے کے دن تک
قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ	مہلت دے دے۔ خدا نے فرمایا تجھے مہلت دی گئی۔
صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ	شیطان نے کہا چونکہ تو نے مجھے گمراہ کیا ہے اس وجہ سے
مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ	میں ان کی گھات میں تیری سیدھی راہ پر بیٹھوں گا۔ پھر میں
اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ۭ وَلَا	ان کے آگے سے، ان کے پیچھے سے، ان کے دہنے سے،
تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ۝ قَالَ	ان کے بائیں سے ان پر گھیرے ڈالوں گا اور تو ان میں سے
اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۭ	اکثر کو اپنا شکر گزار نہ پائے گا۔ خدا نے فرمایا تو ذلیل و
لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ	خوار ہو کر یہاں سے دور ہو۔ ان میں سے جو تیری پیروی
مِنْكُمْ اَجْمَعِيْنَ (۱۲-۱۸ اعراف)	کریں گے تو میں تم سب سے جہنم کو بھر دوں گا۔

شیطان کے اس مناظرے سے اس کے اس جوش و سرگرمی کا بھی پورا پورا اظہار ہو رہا ہے جو وہ بنی آدم کو گمراہ کرنے کے لیے اپنے اندر رکھتا ہے اور یہ بات بھی ظاہر ہو رہی ہے کہ اس کی تمام مساعی ضلالت کا خاص

ہدف توحید کا عقیدہ ہے۔ چنانچہ اس نے یہ جو کہا کہ میں تیری سیدھی راہ پر ان کی گھات میں بیٹھوں گا تو یہ "سیدھی راہ" وہی توحید کی راہ ہے جس کو قرآن نے صراطِ مستقیم سے تعبیر کیا ہے۔ اور یہ جو اس نے کہا کہ تو ان میں سے اکثر کو اپنا شکر گزار نہ پائے گا، تو یہ بھی اس بات کی تعبیر ہے کہ میں ان کو شرک میں مبتلا کر دوں گا اور یہ تیری حمد کے بجائے دوسروں کی حمد کے ترانے گائیں گے۔

امانیِ باطلہ

وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ (میں ان کو جھوٹی آرزوؤں میں پھنساؤں گا) میں اس طرح کی جھوٹی آرزوؤں کی طرف اشارہ ہے جن میں بالعموم مشرک قومیں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ مثلاً عربوں کا یہ عقیدہ کہ وہ جن دیویوں اور دیوتاؤں کو پوجتے ہیں وہ خدا سے ان کے لیے سفارش کرتے ہیں۔ انھی کی سفارش سے ان کو دنیا کی نعمتیں بھی ملتی ہیں اور اگر آخرت کوئی چیز ہے تو انھی کی سفارش سے آخرت میں بھی وہ جنت کے حقدار ٹھہریں گے۔ اسی طرح یہود اس وہم میں مبتلا ہو گئے تھے کہ وہ ابراہیم خلیل اللہ اور خدا کے برگزیدہ بندوں کی اولاد ہیں اس وجہ سے وہ خدا کے بیٹوں اور محبوبوں کی حیثیت رکھتے ہیں اور جنت کے پشتینی حق دار ہیں، ان کے اعمال کچھ ہوں دوزخ کی آگ اول تو ان کو چھوئے گی ہی نہیں اور اگر چھوئے گی تو محض عارضی طور پر۔ ان کی ان باطل آرزوؤں پر ہم بقرہ کی آیت ۸۰ اور ۱۱۱ کے تحت بحث کر چکے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس نصاریٰ کا یہ عقیدہ کہ خدا نے اپنے بیٹے کو ان کے تمام گناہوں کا کفارہ بنا دیا ہے، اب وہ عمل و اطاعت کی تمام ذمہ داریوں سے سبکدوش ہیں۔

مشرکانہ نذریں

فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ ۔ بتک کے معنی کاٹنے، چیرنے اور پھاڑنے کے ہیں۔ مشرک قوموں میں یہ مشرک روایت رہی ہے کہ وہ خاص خاص جانوروں کو ان کے کان چیر کر اپنے فرضی معبودوں کے نام پر بطور نذر چھوڑ دیتی رہی ہیں۔ یہ کان چیرنا اس مقصد کے لیے ہوتا تھا کہ دوسرے ان کو نذر سمجھ کر ان سے تعرض نہ کریں۔

تغییر خلق اللہ کا مفہوم

فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ (پس وہ اللہ کی بنائی ہوئی ساخت کو بدلیں گے) اللہ کی بنائی ہوئی ساخت کو بدلنے سے اصلاً مراد اس فطرت اللہ کو بدلنا ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے تمام خلائق کو پیدا کیا ہے۔ مثلاً توحید دینِ فطرت ہے لیکن شیطان اور اس کے ایجنٹوں نے اس کو شرک سے مسخ کیا۔ سورۂ روم میں شرک کی تردید کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۙ مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (۳۰-۳۱ روم)	پس تم یکسو ہو کر اپنا رخ دینِ حنیفی کی طرف کرو۔ یہی اللہ کی بنائی ہوئی فطرت ہے جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا۔ اللہ کی بنائی ہوئی ساخت کو بدلنا جائز نہیں۔ یہی سیدھا فطری دین ہے۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ اسی کی طرف توجہ کرتے ہوئے اور اسی سے ڈرو اور نماز قائم کرو اور مشرکین میں سے نہ بنو۔

اس آیت میں توحید کو "دین فطرت" اور "دین قیم" سے تعبیر فرمایا ہے اور اس کی دلیل یہ دی ہے کہ اسی پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ پھر فرمایا کہ اللہ کی بنائی ہوئی فطرت اور ساخت کو بدلنا جائز نہیں۔ ہمارے نزدیک زیر بحث ٹکڑے میں بھی یہی مراد ہے۔ ضمناً اس کے تحت وہ ساری چیزیں آ جائیں گی جو فطرت اللہ کی تبدیلی کے حکم میں ہیں۔ مثلاً عورتوں کا مرد بننا یا مردوں کا عورت بننا یا عورتوں اور مردوں کو ناقابل اولاد بنانا اور اس قبیل کی دوسری خرافات۔

لفظ امر کے مختلف مفہوم

'وَلَاٰمُرَنَّھُمْ' میں شیطان کے جس امر کا ذکر ہے اس کے متعلق یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ عربی میں امر کا لفظ حکم دینے، مشورہ دینے اور سمجھانے، سب معنوں میں آتا ہے۔ شیطان ان تمام طریقوں سے توحید کی راہ مارتا ہے۔ وہ اپنے القائے شیطانی سے دلوں میں وسوسہ بھی ڈالتا ہے اور جنوں اور انسانوں میں سے جو لوگ اس کے ایجنٹ بن جاتے ہیں ان کے واسطے سے مشورے بھی دیتا ہے اور اگر اس کے ایجنٹ زور آور اور با اقتدار ہوتے ہیں تو ان کے ہاتھوں قانون بھی بنواتا ہے اور اس قانون کو نافذ بھی کرواتا ہے۔

اجزا کی تشریح کے بعد اب ان آیات کے نظام اور ان کے مفہوم پر بحیثیت مجموعی بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

شرک کا بودا پن اور اس کا حسب و نسب

اوپر کی آیت میں شرک کے ناقابل مغفرت جرم ہونے کا ذکر ہوا تو لگے ہاتھوں شرک کے بودے پن اور اس کے حسب و نسب کا بھی ذکر فرما دیا تاکہ اس کا مکروہ چہرہ اچھی طرح بے نقاب ہو جائے۔

بودے پن کا ذکر دو پہلوؤں سے فرمایا۔ ایک تو یہ کہ شرک کا یہ سارا کارخانہ دیویوں کے بل بوتے پر قائم ہے، اول تو یہی پرلے سرے کی حماقت ہے کہ خدائے واحد کے سوا کسی اور کا سہارا انسان ڈھونڈھے پھر حماقت در حماقت یہ کہ سہارا بھی فرضی عورتوں کا جن کی بے بسی اور ناتوانی خود ضرب المثل ہے۔ دوسرا یہ کہ اس کی تمام تر بنیاد شیطان کی پیدا کی ہوئی جھوٹی آرزوؤں اور اس کے پر فریب وعدوں پر ہے اور شیطان کے سارے وعدے بالکل بے حقیقت ہیں۔ جب حقیقت کھلے گی تو نظر آئے گا کہ نہ ابراہیمؑ کا حسب و نسب کچھ نافع ہے اور نہ لات و منات اور ان کی شفاعت کا کوئی وجود ہے بلکہ سارا معاملہ ایمان و عمل صالح پر منحصر ہے۔ جن کے پاس یہ متاع نہیں ہے ان کے لیے صرف جہنم ہے جس سے فرار کی کوئی راہ نہیں ہے۔

اس کے حسب و نسب کا بیان اس طرح فرمایا کہ اس کا موجد اور امام ابلیس لعین ہے جس نے جوش حسد میں پہلے ہی روز یہ دھمکی دی تھی کہ میں تیرے بندوں میں سے اپنا حصہ بٹا کر رہوں گا، میں ان کو گمراہ کروں گا، ان کو طرح طرح کی جھوٹی آرزوؤں میں مبتلا کروں گا، وہ میرے حکم سے بتوں کو نذرانے پیش کریں گے اور میرے القا سے فطرت اللہ کو مسخ کریں گے۔ فرمایا کہ جو لوگ اس شیطان لعین و متمرد کو اپنا مرجع اور کارساز بنائیں ان سے زیادہ بدبخت اور نامراد کون ہو سکتا ہے۔ فرمایا کہ شیطان ان کو وعدوں کے سبز باغ دکھا رہا ہے اور آرزوؤں کے جال ان کے آگے بچھا رہا ہے حالانکہ شیطان کے سارے وعدے محض فریب ہیں۔ نہ شفاعت ان کے کام آنی ہے نہ بزرگوں سے نسبت۔ ان کا ٹھکانا جہنم ہے جس سے کوئی مفر نہ ہوگا۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۖ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ۚ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ۝ لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ۗ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ۝ (۱۲۲-۱۲۴)

نجات کی راہ ایمان وعمل صالح ہے۔

یعنی شیطان کے وعدے اور اس کی پیدا کی ہوئی آرزوئیں تو محض جھوٹ اور فریب ہیں۔ البتہ اللہ کا وعدہ یہ ہے کہ جو ایمان اور عمل صالح کی راہ اختیار کریں گے ان کو وہ جنت میں داخل کرے گا اور یہ وعدہ بالکل حق ہے اس لیے کہ یہ اللہ کا وعدہ ہے اور اللہ کے وعدے سے زیادہ سچا وعدہ کس کا ہو سکتا ہے۔

کو جھوٹی آرزوئیں

پھر فرمایا کہ نجات سے متعلق یہ جھوٹی آرزوئیں خواہ تمہاری ہوں (اشارہ منافقین کی طرف ہے) یا اہل کتاب کی، ان میں سے کوئی بھی پوری ہونے والی نہیں ہے۔ جو بھی برائی کرے گا وہ اپنے کیے کی سزا بھگتے گا اور خدا کے سوا کوئی اس کا کارساز و مددگار نہ بن سکے گا۔ اسی طرح جو عمل صالح کرے گا، خواہ مرد ہو یا عورت، اگر وہ مومن ہے تو یہ لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ذرا بھی ان کے اجر میں کوئی کمی نہ ہو گی۔

منافقین اور اہل کتاب دونوں کی آرزوؤں کا ایک ساتھ ذکر کر کے قرآن نے یہ واضح کر دیا کہ شرک، شفاعت اور خاندانی برگزیدگی کے بل پر جنت کے خواب دیکھنے والے سب ایک ہی جنت الحمقا کے بسنے والے اور ایک ہی دامِ فریب کے گرفتار ہیں اور ان سب کی نامرادی ایک ہی طرح کی ہے۔ آخرت کی بازی ان لوگوں کی ہے جو ایمان اور عمل صالح کی راہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔ جس کے پاس یہ دولت ہو گی، وہ فائز المرام ہے خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اسرائیلی ہے یا اسمٰعیلی، عربی ہے یا عجمی۔ اس طرح کی کسی نسبت کی وجہ سے اس کے ساتھ کوئی کمی نہیں ہو گی۔

وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۗ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ۝ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطًا ۝ (۱۲۵-۱۲۶)

ملتِ ابراہیم

اب یہ اس هُدَى اللّٰهِ اور سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ کی سند اور اس کا درجہ و مرتبہ واضح فرمایا جس کی مخالفت کو شرک قرار دیا ہے اور جس سے یہ اوپر والی بحث پیدا ہوئی تھی۔ مطلب یہ ہے کہ اس کی مخالفت اور اس سے انحراف کے کیا معنی؟ آخر اس کے دین سے بڑھ کر کس کا دین ہو سکتا ہے جو اپنے آپ کو یک قلم اللہ کے سپرد کر دے اور ساتھ ساتھ وہ محسن بھی ہو یعنی اپنے رب کے ہر حکم کی تعمیل اس طرح کرے جس طرح اس کے کرنے کا حق ہے۔ یہی ملت ابراہیمؑ ہے۔ جس نے یہ راہ اختیار کی اس نے ملت ابراہیمؑ کی پیروی کی اور ابراہیمؑ کی ذات تو وہ ہے جن کو خدا نے اپنا دوست بنایا تو ان کی ملت سے بڑھ کر کس کی ملت ہو سکتی ہے۔ آخر میں اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ کی علت واضح فرما دی کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ واحد ہی کا ہے اور وہ ہر چیز کا احاطہ بھی کیے ہوئے ہے تو اس کے سوا

حق دار بھی کون ہے کہ اپنے آپ کو اس کے حوالہ کر دیا جائے۔

حضرت ابراہیم کے خلیل اللہ ہونے کی وجہ

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ حضرت ابراہیم کے خلیل اللہ ہونے کا ذکر تورات میں بھی بار بار ہوا ہے اور یہ چیز منجملہ ان چیزوں کے ہے جن کے سبب سے بنی اسرائیل اس آرزوئے باطل میں مبتلا ہوئے کہ چونکہ وہ اللہ کے دوست کے خاندان سے ہیں اس وجہ سے ان کی حیثیت اَبْنَاءُ اللهِ اور اَحِبَّاءُ اللهِ کی ہے اور جب ان کی حیثیت یہ ہے تو دوزخ کی آگ کی کیا مجال ہے کہ وہ ان کو چھوئے۔ اس وہم کی تردید کے لیے یہاں یہ بھی واضح فرمایا کہ ابراہیم کو اللہ نے اپنا جو دوست بنایا تو اس وجہ سے بنایا کہ انھوں نے ہر طرف سے کٹ کر اور بالکل یکسو ہو کر اپنے آپ کو بالکلیہ اپنے رب کے حوالے کر دیا۔ ان کی ملت اسلام اور توحید کی ملت ہے اور وہ اس ملت توحید کے امام ہیں۔ اس وجہ سے دینِ حق ان کا دین ہے جو اس امامِ توحید کی ملت کے پیرو ہیں نہ کہ ان کا جو امامِ شرک ابلیس کے پیرو ہیں۔

۳۶۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۲۷-۱۳۴

اسلامی معاشرہ کی تاسیس، تنظیم اور تطہیر سے متعلق جو باہیں اصولی تھیں وہ اوپر کی آیات پر تمام ہوئیں۔ اب آگے کا حصہ، سورہ کے آخر تک، خاتمۂ سورہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں پہلے بعض سوالات کے جواب دیے ہیں جو اسی سورہ کی آیات ۲-۴ میں بیان کردہ احکام سے متعلق بعد میں پیدا ہوئے، اس کے بعد آخر سورہ تک مسلمانوں کو، منافقین کو اور اہل کتاب کو خطاب کر کے آخری تنبیہ کی نوعیت کی نصیحتیں فرمائی ہیں۔ یہ سوالات بعد میں پیدا ہوئے اس وجہ سے ان کے جواب سورہ کے آخری باب کے ساتھ رکھے گئے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ یہ بعد میں نازل ہوئے ہیں۔ اس سے احکام کی حکمت سمجھنے میں رہنمائی ملتی ہے۔

زیر بحث مجموعہ آیات کو سمجھنے کے لیے آیات ۲-۴ پر ایک نظر پھر ڈال لیجیے۔ وہاں یتامیٰ کی مصلحت اور بہبود کے پہلو سے ان کی ماؤں سے نکاح کرنے کی اجازت دی گئی ہے تو اس کے ساتھ چار کی قید اور ادائے مہر اور عدل کی شرط لگی ہوئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے، مہر اور عدل دونوں ہی چیزوں سے متعلق لوگوں کے اندر سوالات پیدا ہوئے۔ مہر سے متعلق یہ کہ جن عورتوں سے نکاح انہی کے یتیم بچوں کی مصلحت سے کیا جائے، انھیں مہر ادا کرنے کی پابندی ایک بھاری شقت ہے جس کو اولیا برداشت نہیں کر سکیں گے۔ اسی طرح اگر عدل کا مفہوم قلبی میلان اور ظاہری سلوک دونوں میں کامل مساوات ہے تو یہ بھی ناممکن ہے۔ ایک شخص نے اپنی ایک پسندیدہ بیوی رکھتے ہوئے اگر ایک عورت سے صرف اس خیال سے نکاح کیا ہے کہ اس کے یتیم بچوں کی تربیت اور ان کے حقوق کی نگہداشت میں سہولت ہو جائے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ اپنی چہیتی بیوی اور اس دوسری بیوی دونوں سے یکساں محبت اور یکساں سلوک کر سکے۔ قرآن نے یہاں ان دونوں سوالوں کا جواب دیا ہے۔ پہلے سوال کا یہ جواب دیا کہ اگر ایک شخص ایک عورت

کو پسند نہیں کرتا تو اس سے نکاح ہی کیوں کرے، اگر پسند کر کے نکاح کرتا ہے تو پھر پورا ادا کرے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بات بھی واضح فرما دی کہ مہر کا معاملہ اصلاً عورت کا معاملہ ہے۔ وہ اگر اپنی مصلحت کے تحت اپنے شوہر سے کوئی سمجھوتہ کر لے تو اس کا اس کو اختیار ہے اور یہی بہتر ہے۔ ویسے مرد کے شایانِ شان بات یہ ہے کہ وہ دبے ہوئے کو دبانے کے بجائے احسان اور تقویٰ کی راہ اختیار کرے۔

دوسرے سوال کا جواب یہ دیا کہ عدل سے مراد یہ نہیں ہے کہ قلبی میلان اور ظاہری سلوک بالکل کانٹے کی تول برابر برابر ہو۔ اس طرح کا عدل کوئی پوری نیک نیتی سے کرنا چاہے بھی تو نہیں کر سکتا۔ مطلوب جو چیز ہے وہ یہ ہے کہ ظاہری سلوک و معاملات میں روش ایسی رہے کہ دونوں کے حقوق ادا ہوتے رہیں، یہ نہ ہو کہ ایک بیوی بالکل معلقہ بن کے رہ جائے نہ اسے دل کی محبت حاصل ہو، نہ ظاہر کا سلوک، نہ بیوی رہے نہ مطلقہ۔

اس کے بعد بانداز تنبیہ نصیحت فرمائی کہ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے سب خدا ہی کا ہے۔ اس نے اہل کتاب کو بھی اپنے حدود کی پابندی کی ہدایت فرمائی تھی اور اسی کی ہدایت وہ تمہیں بھی کر رہا ہے اگر تم ان کی پابندی کرو گے تو اپنا بناؤ گے، اگر نافرمانی کرو گے تو خدا کا کچھ بھی نہ بگاڑو گے۔ خدا سب سے بے نیاز اور ستودہ صفات ہے۔ اگر وہ چاہے تو تم سب کو فنا کر دے اور تمہاری جگہ دوسروں کو بخش دے۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جو دنیا ہی کے طالب بنتے ہیں وہ دنیا میں سے جتنا مقدر ہوتا ہے اتنا پاتے ہیں اور جو آخرت کے طالب بنتے ہیں تو خدا کے پاس دنیا اور آخرت دونوں کے خزانے ہیں ـــــ اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۲۷-۱۳۴

وَيَسْتَفْتُونَكَ فِي النِّسَآءِ ۖ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيكُمْ فِيهِنَّ ۙ وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ فِي يَتٰمَى النِّسَآءِ الّٰتِي لَا تُؤْتُونَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُونَ أَنْ تَنْكِحُوهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الْوِلْدَانِ ۙ وَأَنْ تَقُومُوا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ۚ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِيمًا ﴿۱۲۷﴾ وَإِنِ امْرَأَةٌ خَافَتْ مِنْ بَعْلِهَا نُشُوزًا أَوْ إِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يُصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ۚ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ۗ وَأُحْضِرَتِ الْأَنْفُسُ الشُّحَّ ۚ وَإِنْ تُحْسِنُوا وَتَتَّقُوا

فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۲۸﴾ وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ؕ وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۲۹﴾ وَاِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيْمًا ﴿۱۳۰﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ ؕ وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَاِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَنِيًّا حَمِيْدًا ﴿۱۳۱﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۱۳۲﴾ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ وَيَاْتِ بِاٰخَرِيْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى ذٰلِكَ قَدِيْرًا ﴿۱۳۳﴾ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ﴿۱۳۴﴾ ع

۱۹ ع ۱۶

ترجمۂ آیات ۱۳۴-۱۲۷

اور لوگ تم سے عورتوں کے باب میں فتویٰ پوچھتے ہیں، کہہ دو کہ اللہ اُن کے باب میں بھی اور اس حکم کے باب میں بھی جو تمھیں کتاب میں ان عورتوں کے یتیموں کے بارے میں دیا جا رہا ہے جن کو تم وہ نہیں دیتے جو ان کے لیے لکھا گیا ہے لیکن ان سے نکاح کرنا چاہتے ہو اور بے سہارا بچوں کے باب میں یہ فتویٰ دیتا ہے کہ ان کے مہر دو اور یتیموں کے ساتھ انصاف کرو اور جو مزید بھلائی تم کرو گے تو اللہ اس سے باخبر ہے۔

اور اگر کسی عورت کو اپنے شوہر سے بیزاری یا بے پروائی کا اندیشہ ہو تو اس بات میں کوئی

حرج نہیں کہ دونوں آپس میں کوئی سمجھوتا کرلیں اور سمجھوتا ہی بہتر ہے۔ طبیعتوں میں حرص رچی بسی ہوتی ہے۔ اور اگر تم حسن سلوک کروگے اور تقویٰ اختیار کروگے تو جو کچھ کروگے اللہ اس سے باخبر ہے۔ ۱۲۷-۱۲۸

اور تم پورا پورا عدل تو بیویوں کے درمیان کر ہی نہیں سکتے اگرچہ تم اس کو چاہو بھی تو یہ تو نہ ہو کہ بالکل ایک ہی کی طرف جھک پڑو کہ دوسری کو بالکل معلقہ بنا کر رکھ دو اور اگر تم اصلاح کرتے رہو گے اور خدا سے ڈرتے رہو گے تو خدا بخشنے والا اور مہربان ہے اور اگر وہ دونوں جدا ہو جائیں گے تو اللہ ان میں سے ہر ایک کو اپنی وسعت سے بے نیاز کردے گا۔ اللہ بڑی سمائی رکھنے والا اور حکیم ہے۔ ۱۲۹-۱۳۰

اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ اور تم سے پہلے جن کو کتاب دی گئی ہم نے انھیں بھی ہدایت کی اور تم کو بھی کہ اللہ سے ڈرتے رہو اور اگر تم کفر کروگے تو یاد رکھو کہ اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ بے نیاز، ستودہ صفات ہے اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور بھروسے کے لیے اللہ کافی ہے۔ اگر وہ چاہے تو تم سب کو فنا کردے، اے لوگو، اور دوسروں کو لائے، اللہ اس چیز پر قادر ہے۔ جو دنیا کے صلے کا طلبگار ہے تو اللہ کے پاس دنیا اور آخرت دونوں کا صلہ موجود ہے اور اللہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔ ۱۳۱-۱۳۴

۳۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِى النِّسَآءِ ۭ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ ۙ وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ فِيْ يَتٰمَى النِّسَاۗءِ الّٰتِيْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْھُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ ۙ وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى

بِالْقِسْطِ ۭ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِيْمًا (۱۲۷)

سوال کے نقل کرنے میں اجمال ہی بلاغت ہے

'وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَاۗءِ' (وہ تم سے عورتوں کے بارے میں فتویٰ پوچھتے ہیں) میں اسی طرح کا اجمال ہے جس طرح کا اجمال وَيَسْــَٔـلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ (اور وہ تم سے اشہر حرم کے بارے میں سوال کرتے ہیں) میں ہے۔ وہاں ہم بیان کر آئے ہیں کہ قرآن میں لوگوں کے سوال بالعموم نہایت اجمال کے ساتھ بیان ہوتے ہیں اور یہی طریقہ قرین بلاغت ہے۔ جب جواب سے سوال کی نوعیت خود واضح ہو جاتی ہے تو سوال کے نقل کرنے میں طولِ کلام کی کیا ضرورت باقی رہی۔

'الکتٰب' سے یہاں مراد یہی سورہ کی آیات ۲-۴ ہیں

'وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ' کا عطف، فِيْهِنَّ کی ضمیر مجرور پر ہے اور الکتٰب سے مراد قرآن ہے اور یہاں اشارہ ہے اسی سورۃ کی آیات ۲-۴ کی طرف جن میں بیان کردہ حکم سے متعلق ہی سوالوں کے یہاں جواب دیے گئے ہیں۔ یعنی اللہ عورتوں سے متعلق سوال کا جواب بھی دے رہا ہے اور اس حکم سے متعلق بھی جو تمھیں اسی سورہ کی ابتدائی آیات میں سنایا گیا ہے۔ یُتْلٰی حال کا صیغہ تصویرِ حال کے لیے ہے اس لیے کہ اس وقت یہ آیتیں زیرِ تعلیم بھی تھیں اور ہر حلقے میں زیرِ بحث بھی۔

نکاح میں ادائے مہر اور عدل کی شرائط کی وضاحت

'فِيْ يَتٰمَى النِّسَاۗءِ الّٰتِيْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ' یہ ان آیات میں بیان کردہ حکم کی طرف اجمالی اشارہ ہے۔ یعنی یہ فتویٰ اس حکم کے بارے میں بھی ہے جو تمھیں ان عورتوں کے یتیم بچوں کے بارے میں دیا گیا ہے جن عورتوں کو تم ان کا حق تو دینے کے لیے تیار نہیں ہو لیکن ان سے نکاح کرنے کے خواہشمند ہو۔ اس سے ضمناً یہ بات بھی نکل آئی کہ وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاۗءِ اور وَاٰتُوا النِّسَاۗءَ صَدُقٰتِهِنَّ میں 'نِسَاء' سے مراد یتیموں کی مائیں ہیں، جیسا کہ ہم نے اختیار کیا ہے، اور یہ اشارہ بھی نکلا کہ لوگ یتیموں کی مصلحت سے ان سے نکاح تو کرنا چاہتے تھے لیکن مہر اور عدل کی شرط ان پر شاق تھی۔ مَا كُتِبَ لَهُنَّ کے معنی ہیں جو ان کے لیے خدا کی طرف سے ٹھہرائی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ جس طرح ان کے معاملے میں مہر کی شرط ضروری قرار دی گئی ہے اسی طرح عدل کی شرط بھی ہے۔ اس وجہ سے یہ دونوں چیزیں اس کے مفہوم میں داخل ہوں گی۔

سوال کا جواب اور عربی زبان کا ایک اسلوب

'وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ' یہ وہ فتویٰ ہے جو استفتا کے جواب میں ارشاد ہوا ہے لیکن یہاں عربی زبان کا یہ اسلوب یاد رکھنا چاہیئے کہ جب معطوف اس طرح آئے کہ کلام میں اس کا معطوف علیہ موجود نہ ہو تو وہاں وہ باتیں معطوف علیہ کی حیثیت سے محذوف مان لینے کی گنجائش ہوتی ہے جن پر قرینہ دلیل ہو۔ اس کی ایک سے زیادہ مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں اور آگے بھی اس کتاب میں اس کی نہایت واضح مثالیں آئیں گی۔ یہاں کلام میں کوئی ایسا لفظ موجود نہیں ہے جو وَاَنْ تَقُوْمُوْا کا معطوف علیہ بن سکے۔ اس وجہ سے لازماً یہاں محذوف ماننا پڑے گا اور یہ محذوف سیاق کلام کی روشنی میں متعین کیا

جائے گا۔ چنانچہ یہاں وَاَنْ تَقُوْمُوْا سے پہلے یہ مضمون محذوف ہوگا کہ ان عورتوں کو ان کے مہر دو، ان کے ساتھ عدل کا معاملہ کرو، پھر اس کے اوپر وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْیَتٰمٰی بِالْقِسْطِ کا عطف موزوں ہوگا یعنی اور یتیموں کے لیے عدل کی حفاظت کرنے والے بنو۔ گویا فتوے میں یہ بات واضح کر دی گئی کہ مہر اور عدل کی شرط جس طرح عام عورتوں کے معاملے میں ہے اسی طرح یتیموں کی ماؤں کے بارے میں بھی ہے اور آیات وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوا الآیۃ میں عورتوں کے ساتھ عدل کا اور آیت وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ الآیۃ میں ادائے مہر کا جو حکم ہے تو وہ یتیموں کی ماؤں سے متعلق ہی ہے، جن سے تم نکاح تو کرنا چاہتے ہو لیکن مہر اور عدل کی کھکیڑ میں پڑنے کے لیے تیار نہیں ہو۔ اس طرح گویا قرآن نے آیات ۳۔۴ کے اجمال کو کھول دیا اور اس فتوے کے ذریعے سے ان میں دیے ہوئے احکام کو مزید مؤکد کر دیا۔

آیت ۱۲۷ کا مطلب تالیف کلام کی روشنی میں

اس آیت کی تاویل میں چونکہ بڑا اختلاف ہے اور یہ اختلاف زیادہ تر نتیجہ ہے کلام کی تالیف نہ سمجھنے کا، اس وجہ سے ہماری توضیح کی روشنی میں کلام کی تالیف پر غور کر کے اس کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے۔ اس روشنی میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ لوگ عورتوں کے مہر اور مختلف بیویوں کے درمیان عدل کے بارے میں تم سے سوالات کر رہے ہیں، خاص طور پر یتیموں کی ماؤں کے مہر اور ان کے درمیان عدل کے بارے میں کہ جب ان کے ساتھ نکاح میں اصل مصلحت انہی کے بچوں کی ہے تو کیا مہر اور عدل کی شرط ان کے معاملے میں بھی اسی طرح لازمی ہوگی جس طرح دوسری عورتوں کے بارے میں ہے؟ فرمایا کہ ان کو بتا دو کہ اللہ عام عورتوں کے بارے میں بھی اور یتامیٰ کی ان ماؤں کے بارے میں بھی جن کا حکم آیات ۳۔۴ میں بیان ہوا ہے، جن سے تم نکاح تو کرنا چاہتے ہو لیکن ان کے لیے عدل و مہر کے حق کو تسلیم نہیں کرنا چاہتے، نیز بے بس یتیموں کے باب میں یہ فتویٰ دیتا ہے کہ ان کے مہر دو، ان کے ساتھ عدل کا معاملہ کرو اور یتیموں کے لیے حق و انصاف کے قائم کرنے والے بنو۔ مزید براں جو نیکی اور حسن سلوک تم کرو گے اللہ اس سے باخبر ہوگا اور خدا کے ہاں اس کا صلہ پاؤ گے۔

وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ۭ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ۭ وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ۭ وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا (۱۲۸)

نُشُوْز کے لفظ پر پیچھے بحث گزر چکی ہے۔ نُشُوْز عورت کی طرف سے ہو تو اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ وہ شوہر کی قوامیت کو تسلیم نہ کرے۔ مرد کی طرف سے ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ بیوی کے حقوق تسلیم کرنے سے انکار کرے اور اس سے پیچھا چھڑانے پر آمادہ ہو جائے۔

وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ، شُحّ کے معنی بخل کے بھی ہیں اور حرص کے بھی۔ بخل تو یہ ہے کہ آدمی ادائے حقوق میں تنگ دلی برتے یہ چیز ہر حال میں مذموم ہے۔ لیکن حرص اچھی چیز کی بھی ہو سکتی ہے، بری چیز کی بھی، حد کے اندر بھی ہو سکتی ہے اور حد سے باہر بھی، اس وجہ سے اس کا اچھا اور برا ہونا ایک امر اضافی ہے۔ اپنے اچھے پہلو کے اعتبار سے یہ انسانی فطرت کے اندر اپنا ایک مقام رکھتی ہے لیکن اکثر

طبائع پر اس کا ایسا غلبہ ہو جاتا ہے کہ یہ ایک بیماری بن کے رہ جاتی ہے۔ اُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ میں اس کے اسی پہلو کی تعبیر ہے۔

رشتۂ نکاح کو برقرار رکھنے کے لیے عورت اور مرد دونوں کو ایثار کی ترغیب

یعنی مہر اور عدل تو ہر عورت کا ایک حق شرعی ہے لیکن کسی عورت کو اپنے شوہر کی طرف سے اگر یہ اندیشہ ہو کہ ان پابندیوں کا بوجھ اگر اس پر اس نے لادے رکھا تو وہ اس کو چھوڑ دے گا یا اس سے بے پرواہی برتے گا تو اس امر میں کوئی حرج نہیں کہ دونوں مل کر آپس میں کوئی سمجھوتہ کرلیں۔ یعنی عورت اپنے حق مہر، عدل اور نان نفقہ کے معاملے میں ایسی رعایتیں شوہر کو دے دے کہ قطع تعلق کا اندیشہ رفع ہو جائے۔ فرمایا کہ صلح اور سمجھوتے ہی میں بہتری ہے اس لیے کہ میاں اور بیوی کا رشتہ ایک مرتبہ قائم ہو جانے کے بعد فریقین کی فلاح اسی میں ہے کہ یہ قائم ہی رہے اگرچہ اس کے لیے کتنا ہی ایثار کرنا پڑے۔ فرمایا کہ حرص، طبائع کی عام بیماری ہے جو باہمی تعلقات پر اثر انداز ہوتی ہے اور اس کا علاج یہی ہے کہ یا تو دونوں فریق ایثار پر آمادہ ہوں اور اگر ایک فریق کا مرض لا علاج ہے تو دوسرا قربانی پر آمادہ ہو۔ غرض رشتۂ نکاح کو برقرار رکھنے کے لیے اگر عورت کو قربانی بھی دینی پڑے تو بہتری اس کے برقرار رہنے ہی میں ہے۔ اس کے بعد وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا الآیہ کے الفاظ سے مرد کو اُبھارا ہے کہ ایثار و قربانی اور احسان و تقویٰ کا میدان اصلاً اسی کے شایانِ شان ہے، وہ اپنی فتوت اور مردانگی کی لاج رکھے اور عورت سے لینے والا بننے کی بجائے اس کو دینے والا بنے۔ اللہ ہر ایک کے ہر عمل سے باخبر ہے اور ہر نیکی کا وہ بھرپور صلہ دے گا۔

وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ۭ وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ وَاِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيْمًا ۝ (۱۲۹-۱۳۰)

بیویوں کے معاملے میں عدل کا معیار

اب یہ عدل کا مفہوم واضح فرمادیا کہ جس عدل کو تم ناممکن سمجھ رہے ہو وہ تمہارا اپنا ذہنی عدل ہے۔ تم یہ سمجھ رہے ہو کہ دل کا لگاؤ اور ظاہر کا سلوک دونوں بالکل برابر برابر مطلوب ہیں۔ اس وجہ سے یہ بات ناممکن نظر آ رہی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس معنی میں عدل کا لحاظ تمہاری طاقت سے باہر ہے۔ اگر تم اس طرح کا عدل کرنا چاہو بھی تو نہیں کر سکو گے۔ دل کا میلان آدمی کے اپنے اختیار کی چیز نہیں ہے۔ مطلوب جو چیز ہے وہ یہ ہے کہ ایک بیوی کی طرف اس طرح نہ جھک جاؤ کہ دوسری بالکل اُدھر میں لٹکتی رہ جائے بلکہ سلوک اور حقوق میں توازن قائم رکھنے اور اگر کوئی حق تلفی اور کوتاہی ہو جائے تو اس کی اصلاح اور تلافی کرنے کی کوشش کرو اور خدا سے ڈرتے رہو۔ اصلاح اور تقویٰ کی اس کوشش کے باوجود اگر کوئی فروگزاشت ہو گئی تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

ایثار کی حد

اس کے بعد فرمایا کہ شریعت میں مطلوب تو یہی ہے کہ ازدواجی رشتہ ٹوٹنے نہ پائے لیکن حالات اگر مجبور ہی کر دیتے ہیں اور دونوں میں علیحدگی ہو ہی جاتی ہے تو بہر حال اصل رزاق اور کارساز میاں اور بیوی دونوں کا اللہ ہے۔ وہ ہر ایک کو اپنے فضل سے مستغنی کر دے گا وہ بڑی سمائی رکھنے والا اور حکیم

ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس رشتے کو قائم رکھنے کے لیے میاں اور بیوی دونوں سے ایثار اور کوشش تو مطلوب ہے لیکن یہ غیرت اور خودداری کی حفاظت کے ساتھ مطلوب ہے۔ میاں اور بیوی میں سے کسی کے لیے جس طرح اکڑنا جائز نہیں ہے اسی طرح ایک حد خاص سے زیادہ دبنا بھی جائز نہیں ہے۔ اگرچہ الفاظ میں عمومیت ہے لیکن سیاقِ کلام دلیل ہے کہ اس میں عورتوں کی خاص طور پر حوصلہ افزائی ہے کہ وہ حتی الامکان نباہنے کی کوشش تو کریں اور مصالحت کے لیے ایثار بھی کریں لیکن یہ حوصلہ رکھیں کہ اگر کوشش کے باوجود نباہ کی صورت پیدا نہ ہوئی تو رزاق اللہ تعالیٰ ہے، وہ اپنے خزانۂ جود سے ان کو مستغنی کردے گا۔

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَاِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَنِيًّا حَمِيْدًا ۝ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۝ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ وَيَاْتِ بِاٰخَرِيْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى ذٰلِكَ قَدِيْرًا ۝ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ۝ (۱۳۱-۱۳۴)

ان آیات میں دو باتیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

'لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ الآیۃ' کی تکرار کی بلاغت

ایک تو یہ کہ 'لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ' (اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے) بار بار دہرایا گیا ہے۔ دو مرتبہ تو آیت ۱۳۱ ہی میں اور پھر آیت ۱۳۲ میں۔ علاوہ ازیں جہاں سے یہ مضمون چلتا ہے یعنی آیت ۱۲۶، وہاں بھی بعینہٖ یہی ٹکڑا ہے۔ اس مضمون کا بار بار اعادہ بلا سبب نہیں ہے بلکہ خاتمہ سورہ کا مزاج اس کا مقتضی ہوا۔ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ اس خاتمے میں مسلمانوں کو، منافقین کو اور اہل کتاب کو آخری تنبیہ کی گئی ہے کہ جو ہدایات تمھاری رہنمائی کے لیے ضروری تھیں، وہ دلائل کی وضاحت کے ساتھ، دے دی گئیں، اب ماننا نہ ماننا تمھارا کام ہے، مانو گے تو تمھارا نفع ہے، نہ مانو گے تو خدا کا کچھ بھی نہ بگاڑو گے۔ خدا اس پوری کائنات کا بلا شرکتِ غیرے مالک ہے، اس کی حکومت اپنے بل بوتے پر قائم ہے، وہ کسی کا محتاج نہیں۔ وہ چونکہ پوری کائنات کا مالک ہے اس وجہ سے اس نے تم سے پہلے اہل کتاب کو بھی اپنے احکام و حدود سے آگاہ کیا اور اب تمھیں بھی اس سے آگاہ کر دیا کہ خدا سے ڈرتے رہو۔ اہل کتاب نے نافرمانی کی تو انھوں نے خود اپنی شامت بلائی۔ خدا کا کچھ نہیں بگاڑا۔ اسی طرح اگر تم بھی کفر کرو گے تو یاد رکھو کہ خدا تمھارا محتاج نہیں بلکہ بے نیاز اور ستودہ صفات ہے۔ وہ تمھارے لیے کسی چیز کو پسند کرتا ہے تو اس لیے نہیں کہ اس کو اس کی احتیاج ہے بلکہ اس لیے کہ وہ حمید ہے۔ اس کی اس صفت کا تقاضا ہے کہ بے نیاز ہونے کے باوجود ساری خلق کو اپنے جود و کرم سے نوازے۔ ساری کائنات کا مالک ہونے کی وجہ سے وہی سزاوار ہے کہ اس پر بھروسہ کیا جائے اور زندگی کی باگ اس کے حوالہ کی جائے۔ نافرمانی کی صورت میں اگر وہ چاہے تو سب کو فنا کر دے اور اس دنیا میں دوسری مخلوق لا بسائے۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اس کا ہاتھ کون پکڑ سکتا ہے۔

حذف کا ایک اسلوب

دوسری قابلِ غور چیز آیت مَنْ کَانَ یُرِیْدُ ثَوَابَ الدُّنْیَا الآیۃ میں حذف کا اسلوب ہے ہم پیچھے کسی مقام میں اشارہ کر آئے ہیں کہ عربی میں کلام کے دو متقابل اجزا میں سے بعض اجزا کو اس طرح حذف کر دیتے ہیں کہ مذکور جزو، محذوف کی طرف خود اشارہ کر دیتا ہے ہمارے نزدیک اس آیت کے محذوفات کھول دیے جائیں تو تالیفِ کلام یہ ہو گی مَنْ کَانَ یُرِیْدُ ثَوَابَ الدُّنْیَا فَعِنْدَ اللّٰہِ ثَوَابُ الدُّنْیَا وَمَنْ کَانَ یُرِیْدُ ثَوَابَ الْاٰخِرَۃِ فَعِنْدَ اللّٰہِ ثَوَابُ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ، پہلے میں سے فَعِنْدَ اللّٰہِ ثَوَابُ الدُّنْیَا کو حذف کر دیا اور دوسرے میں سے وَمَنْ کَانَ یُرِیْدُ ثَوَابَ الْاٰخِرَۃِ کو۔ اس حذف کی وجہ وہی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا کہ مذکور ٹکڑے محذوف ٹکڑوں کی نشان دہی خود کر رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو دنیا ہی کے صلے کا طالب ہوتا ہے تو دنیا کا مالک بھی خدا ہی ہے، وہ اس میں سے اس کو جتنا چاہتا ہے دیتا ہے اور جو آخرت کا طالب ہوتا ہے تو اللہ اس کو دنیا میں بھی جو چاہتا ہے دیتا ہے اور آخرت کا صلہ بھی بھرپور عطا فرمائے گا۔ یہ ان لوگوں کو تنبیہ و موعظت ہے جو اپنے دنیوی مفادات کی خاطر خدا کی شریعت سے فرار اختیار کر رہے ہوں۔ فرمایا جو صرف دنیا کا طالب بنتا ہے تو بہرحال اس میں سے وہ پاتا اتنا ہی ہے جتنا خدا کو منظور ہوتا ہے اور آخرت سے وہ بالکل محروم ہی رہتا ہے تو آخرت کا طالب کیوں نہ بنے کہ آخرت کا بھرپور صلہ بھی ملے اور دنیا میں سے جو مقدر ہو وہ بھی ملے۔ یہی مضمون بعینہ آلِ عمران کی آیات ۱۴۵ اور ۱۴۸ میں بھی گزر چکا ہے۔ اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔ اس کے ساتھ سمیع و بصیر کی صفات کے حوالہ سے مقصود اس حقیقت کی یاددہانی ہے کہ خدا نہ کسی کی دعا و فریاد سے بے خبر ہے نہ کسی کی احتیاج اور حالت اس سے مخفی ہے تو آخر انسان اسی سے کیوں نہ چاہے اور مانگے، دوسروں سے کیوں آرزومند اور دادخواہ ہو۔

۳۸۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۳۵-۱۵۲

آگے پہلے مسلمانوں کو اس فریضۂ منصبی کی یاددہانی فرمائی ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو، اہلِ کتاب کو معزول کر کے، مامور فرمایا ہے۔ پھر منافقین کے خطرات سے ان کو ہوشیار بھی کیا ہے اور منافقین کو تنبیہ بھی کی ہے۔ نظمِ کلام بالکل واضح ہے۔

آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۳۵-۱۵۲

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُھَدَآءَ لِلّٰہِ وَلَوْ عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ ۚ اِنْ یَّکُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا

فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۫ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ
تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۳۵﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ
الْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَ
كُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿۱۳۶﴾ اِنَّ
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا
لَّمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيْلًا ﴿۱۳۷﴾ بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ
بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۳۸﴾ الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَاۗءَ
مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ
لِلّٰهِ جَمِيْعًا ﴿۱۳۹﴾ وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ
اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى
يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ ڮ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ
الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعَۨا ﴿۱۴۰﴾ الَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ
بِكُمْ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْٓا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ڮ وَاِنْ
كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ ۙ قَالُوْٓا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَنَمْنَعْكُمْ
مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَلَنْ يَّجْعَلَ
اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ﴿۱۴۱﴾ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ
اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَاۗءُوْنَ

ع ۲۰ ۱۷

النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُونَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۴۲﴾ مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۖ
لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ
سَبِيْلًا ﴿۱۴۳﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ
دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۴۴﴾
اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِى الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ
نَصِيْرًا ﴿۱۴۵﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَاَخْلَصُوْا
دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَسَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ
اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۴۶﴾ مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ۚ
وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۷﴾ لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ
الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۸﴾ اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا
اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ﴿۱۴۹﴾
اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا
بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّ
يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ﴿۱۵۰﴾ اُولٰٓئِكَ هُمُ
الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿۱۵۱﴾ وَالَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ
سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۵۲﴾

الجزء ٦

ع ۲۱ / ۱۱ / ۱

ترجمۂ آیات ۱۳۵-۱۵۲

اے ایمان والو، حق پر جمے رہو اللہ کے لیے اس کی شہادت دیتے ہوئے۔

اگرچہ یہ شہادت خود تمھاری اپنی ذات، تمھارے والدین اور تمھارے قرابت مندوں کے خلاف ہی پڑے۔ کوئی امیر ہو یا غریب، اللہ ہی دونوں کا سب سے زیادہ حق دار ہے تو تم خواہش کی پیروی نہ کرو کہ حق سے ہٹ جاؤ اور اگر کج کرو گے یا اعراض کرو گے تو یاد رکھو کہ اللہ، جو کچھ تم کر رہے ہو اس سے اچھی طرح باخبر ہے۔ اے ایمان والو، ایمان لاؤ اللہ پر، اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر اتاری اور اس کتاب پر جو اس نے پہلے اتاری۔ اور جو اللہ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں اور روز آخرت کا انکار کرے وہ بہت دور کی گمراہی میں جا پڑا۔ بے شک جو لوگ ایمان لائے پھر کفر کیا، پھر ایمان لائے، پھر کفر کیا، پھر کفر میں بڑھتے گئے، اللہ نہ ان کی مغفرت فرمانے والا ہے اور نہ ان کو راہ دکھانے والا ہے۔ منافقوں کو خوش خبری دے دو کہ ان کے لیے ایک دردناک عذاب ہے۔ ان کے لیے جو مسلمانوں کے مقابل میں کافروں کو دوست بنائے ہوئے ہیں۔ کیا ان کے ہاں عزّت و رسوخ چاہتے ہیں، عزت تو سراسر اللہ کے لیے ہے۔ ۱۳۵- ۱۳۹

اور وہ کتاب میں تم پر یہ ہدایت نازل کر چکا ہے کہ جب تم سنو کہ آیات الٰہی کا انکار کیا جا رہا ہے اور ان کا مذاق اُڑایا جا رہا ہے تو تم ان کے ساتھ نہ بیٹھو تاآنکہ وہ کسی اور بات میں مشغول ہو جائیں ورنہ تم بھی انہی کے مانند ہو جاؤ گے۔ اللہ منافقوں اور کافروں سب کو جہنم میں جمع کرنے والا ہے۔ ان کو جو تمھارے لیے گردشوں کے منتظر ہیں۔ اگر تمھیں اللہ کی طرف سے کوئی فتح حاصل ہوتی ہے تو کہتے ہیں کیا ہم تمھارے ساتھ نہ تھے اور اگر کافروں کو کوئی جیت ہو جائے تو کہتے ہیں کیا ہم تم پر چھائے نہیں رہے اور

ہم نے مسلمانوں سے تم کو بچایا نہیں ؟ تو اللہ ہی فیصلہ کرے گا تمہارے درمیان قیامت کے دن اور اللہ کافروں کو مومنوں پر کوئی راہ نہیں دے گا۔ ۱۴۰-۱۴۱

منافقین خدا سے چالبازی کرنا چاہتے ہیں حالانکہ چال وہ ان سے چل رہا ہے اور جب یہ نماز کے لیے اٹھتے ہیں تو الکسائے ہوئے اٹھتے ہیں محض لوگوں کے دکھانے کے لیے اور اللہ کو کم ہی یاد کرتے ہیں۔ درمیان ہی میں لٹک رہے ہیں، نہ ادھر ہیں نہ ادھر۔ اور جسے اللہ گمراہ کر دے تو تم ان کے لیے کوئی راہ نہیں پا سکتے۔ ۱۴۲-۱۴۳

اے ایمان والو، مسلمانوں کے مقابل میں کافروں کو اپنا دوست نہ بناؤ۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اپنے اوپر اللہ کی صریح حجت قائم کرالو۔ ۱۴۴

منافقین دوزخ کے سب سے نیچے کے طبقے میں ہوں گے اور تم ان کا کوئی مددگار نہ پاؤ گے۔ البتہ جو توبہ اور اصلاح کرلیں گے اور اللہ کو مضبوطی سے پکڑیں گے اور اپنی اطاعت کو اللہ کے لیے خالص کرلیں گے وہ ایمان والوں کے ساتھ ہوں گے اور اللہ ایمان والوں کو اجر عظیم عطا فرمائے گا۔ ۱۴۵-۱۴۶

خدا کو تمہیں عذاب دینے سے کیا نفع ہے اگر تم شکر گزاری اختیار کرو اور ایمان لاؤ۔ اللہ تو بڑا قبول فرمانے والا اور جاننے والا ہے۔ ۱۴۷

اللہ بدزبانی کو پسند نہیں کرتا مگر یہ کہ کوئی مظلوم ہو۔ اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ اگر تم نیکی کو ظاہر کرو گے یا اس کو چھپاؤ گے یا کسی برائی سے درگزر کرو گے تو اللہ معاف کرنے والا اور قدرت رکھنے والا ہے۔ ۱۴۸-۱۴۹

جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کا کفر کر رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے

رسولوں کے درمیان تفریق کریں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض پر ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ ان کے درمیان کوئی راہ نکالیں، یہی لوگ درحقیقت پکے کافر ہیں اور ہم نے ان کافروں کے لیے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے۔ اور جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے اور ان میں سے کسی کے درمیان کوئی تفریق نہیں کی ان کو ان کا اجر دے گا اور اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ ۱۵۰-۱۵۲

۳۹۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۫ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا (۱۳۵)

'كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ' 'قسط' کے لفظ پر آل عمران کی آیات ۱۸ اور ۲۱ کے تحت بحث گزر چکی ہے۔ یہاں اس سے مراد حق و عدل کی وہ میزان ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کی شکل میں عطا فرمائی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اب تمہارا ہر قول و فعل اسی باٹ اور اسی ترازو سے تولا ہوا ہو اور تم اسی پر قائم رہنے والے اور اسی کو قائم کرنے والے بنو۔ 'شُهَدَآءَ لِلّٰهِ' یعنی مجرد اس پر قائم رہنا ہی تمہاری ذمہ داری نہیں ہے بلکہ تم دنیا کے سامنے اللہ کی طرف سے اس کے داعی اور گواہ بھی ہو جیسا کہ فرمایا ہے 'وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا' اور اسی طرح ہم نے تم کو وسط شاہراہ پر قائم رہنے والی امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو اور رسول تم پر گواہی دے۔

عدل پر قائم رہو خواہ اپنے حق میں ہو یا اپنے خلاف

'وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ' یعنی یہ میزان عدل صرف لینے ہی کے لیے نہیں ہے بلکہ دینے کے لیے بھی ہے۔ اگر اس کا فیصلہ کسی معاملے میں تمہارے، تمہارے والدین کے اور تمہارے اقربا کے خلاف ہو جب بھی تمہیں اسی پر قائم رہنا اور اسی کی گواہی دینا ہے۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ بھی ہے کہ یہود کو جو کتاب دی گئی تو وہ اس کی وہ باتیں تو مانتے تھے جو اپنی خواہشوں کے مطابق پاتے لیکن جو باتیں ان کی خواہشوں کے خلاف پڑتیں ان سے کنی کاٹ جاتے۔

امیر و غریب دونوں کے لیے ایک ہی باٹ اور ایک ہی ترازو

'اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا' یعنی یہ جائز نہیں ہے کہ امیر کے لیے اور باٹ سے تولو، غریب کے لیے اور باٹ سے، قوی اور با اثر کے لیے الگ قانون و شریعت ہو، کمزور و بے اثر کے لیے الگ حکم و ذری

بلکہ سب کو اللہ کے ایک ہی قانونِ عدل کے تحت ہونا چاہیے اس لیے کہ اللہ کا حق سب پر یکساں قائم ہے اور یہ حق دوسرے تمام حقوق سے بڑا ہے۔ اگر کوئی شخص امیر اور با اثر ہے تو اس وجہ سے وہ خدا کے حق سے بری الذمہ نہیں ہو جاتا کہ وہ خدا کے قانون کی ذمہ داریوں سے بری کر دیا جائے اور اس کے ساتھ کسی اور قانون کے تحت معاملہ کیا جائے۔ یہ بات اچھی طرح سمجھنے کے لیے حضور کے اس ارشاد کو سامنے رکھیے جو حضرت عائشہؓ سے مروی ہے۔ وہ فرماتی ہیں۔

> جب ایک مخزومیہ عورت نے چوری کی تو اس کے معاملے کی قریش کو بڑی فکر ہوئی۔ لوگوں نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ کون شخص ایسا ہو سکتا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی سفارش کرے۔ بالآخر یہ طے پایا کہ اس کی جرأت صرف اسامہؓ بن زید کر سکتے ہیں۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑے چہیتے ہیں۔ لوگوں کے کہنے پر اسامہؓ نے حضورؐ سے اس کی سفارش کی۔ حضورؐ نے فرمایا، اسامہ، تم اللہ کی مقرر کی ہوئی حدود میں سے ایک حد کے معاملے میں سفارش کرنے آئے ہو، پھر آپ خطبہ کے لیے کھڑے ہوئے اور فرمایا، لوگو، تم سے پہلے قوموں کو اسی چیز نے تباہ کیا کہ ان کا حال یہ ہو گیا تھا کہ اگر ان میں کوئی معزز آدمی چوری کرتا تو اس کو چھوڑ دیتے اور اگر کوئی معمولی آدمی چوری کرتا تو اس پر حد جاری کرتے۔ خدا کی قسم میں ایسا نہیں کرنے کا۔ میں تو اگر فاطمہؓ بنت محمدؐ بھی چوری کرتی تو اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا۔ (متفق علیہ)

اتباعِ ہویٰ ہدی اللہ کی ضد ہے

فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰۤى اَنْ تَعْدِلُوْا ۔ 'ھویٰ'، 'ھدی اللہ' کی ضد ہے یعنی اگر تم نے اللہ کی یہ ہدایت چھوڑ کر اپنی خواہشوں اور بدعتوں کی پیروی کی تو تم اس قسط سے ہٹ جاؤ گے جس پر اللہ تعالیٰ نے تم کو قائم کیا ہے اور جس کی دعوت اور شہادت پر تم مامور کیے گئے ہو۔

نظامِ قسط کو بگاڑنے کی دو صورتیں

وَاِنْ تَلْوٗۤا اَوْ تُعْرِضُوْا اس میں اس نظامِ قسط کو بگاڑنے کی دو شکلوں کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ ایک تو یہ کہ اس کو کج کرنے، بگاڑنے اور مسخ کرنے کی کوشش کی جائے جیسا کہ یہود نے کیا اور جس کا ذکر آلِ عمران کی آیت ۷۸، يَلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ الآیۃ میں ہوا ہے۔ دوسری شکل یہ ہے کہ اس کو بگاڑنے کی کوشش تو نہ کی جائے، اس کی شکل باقی رہے لیکن زندگی کے معاملات میں اس کو کوئی اہمیت نہ دی جائے۔ فرمایا کہ ان میں سے جو ظلم بھی کرو گے خدا اس سے بے خبر نہیں رہے گا اور جب بے خبر نہیں رہے گا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ اس جرم عظیم کی سزا دیے بغیر بھی نہ چھوڑے گا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا (۱۳۶)

زبان کا ایک اسلوب

'يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا' ہم دوسرے مقام پر زبان کا یہ اسلوب واضح کر چکے ہیں کہ فعل اپنے

ابتدائی اور ظاہری معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور اپنے حقیقی اور کامل معنی میں بھی۔ یہاں مسلمان من حیث الجماعت مخاطب ہیں جن میں خام و پختہ، ناقص و کامل اور مخلص و منافق ہر قسم کے عناصر شامل تھے۔ ان سب کو خطاب کر کے تنبیہ فرمائی ہے کہ اے ایمان کا دعویٰ کرنے والو، سچے اور پکے مومن بن جاؤ۔ گویا خطاب تو عام ہے لیکن روئے سخن خام کاروں اور مدعیوں کی طرف ہے۔

قرآن سے پہلے اصل کتاب الٰہی کی حیثیت صرف تورات کو حاصل ہے

'وَالْکِتٰبِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ' میں کتاب سے مراد تورات ہے۔ واحد سے ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ قرآن سے پہلے اصل کتاب الٰہی کی حیثیت درحقیقت تورات ہی کو حاصل ہے، دوسرے انبیا کے صحیفوں کی حیثیت مستقل بالذات صحیفوں کی نہیں ہے اس لیے کہ ان انبیا میں سے سب تورات ہی کے داعی بن کر آئے۔ یہاں تک کہ حضرت مسیحؑ بھی درحقیقت تورات ہی کو قائم کرنے کے لیے آئے تھے۔ ان انبیا کے صحیفوں میں جو تعلیم ہے وہ تورات سے کوئی الگ شے نہیں بلکہ اسی کے احیاء و تجدید کی دعوت اور اسی کے حِکَم و اسرار کا اظہار و بیان ہے۔ اس وجہ سے باعتبارِ حقیقت تو ایک ہی کتاب ہے لیکن ظاہر کا لحاظ کیا جائے تو جمع بھی قرار دے سکتے ہیں۔ قرآن نے دونوں طرح سے ذکر کیا ہے اور اس سے مقصود اصل حقیقت کی طرف توجہ دلانا ہے تاکہ ظاہری تعدد کو جن نادانوں نے تفریق بین الرسل کا ذریعہ بنایا ان کو اپنی حماقت پر تنبیہ ہو۔

'اَنْزَلَ' اور 'نَزَّلَ' میں فرق

یہاں 'نَزَّلَ' اور 'اَنْزَلَ' کا فرق بھی قابل توجہ ہے۔ جو لوگ عربی زبان کی باریکیوں سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ 'اَنْزَلَ' کا مفہوم تو صرف اتار دینا ہے لیکن 'نَزَّلَ' کے اندر اہتمام اور تدریج کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔ لفظوں کا یہ فرق تورات اور قرآن دونوں کے اتارے جانے کی نوعیت کو واضح کر رہا ہے۔ یہاں یہ اشارہ کافی ہے۔ کسی موزوں محل میں ہم اس پر وضاحت سے گفتگو کریں گے۔

آیت سباق اور لحاق کے درمیان بیچ کی کڑی ہے

اس آیت میں ایمان کے جو اجزا مذکور ہوئے ہیں ان سب پر تفصیل کے ساتھ سورۂ بقرہ میں بحث ہو چکی ہے۔ یہاں جو بات سمجھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ یہ آیت اوپر کی آیت اور آگے کی آیات کے درمیان بیچ کی کڑی کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایک طرف تو یہ اس کلمۂ جامعہ کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو امت وسط اور قائم بالقسط امت کا کلمہ ہے یعنی بلا تفریق تمام انبیاء و رسل اور تمام آسمانی صحیفوں پر ایمان جو اس بات کی شہادت ہے کہ یہ امت عدل و قسط پر قائم ہے، یہود و نصاریٰ کی طرح تعصب و تحزب کے جنون میں مبتلا ہو کر اس نے حق و عدل کی شاہراہ نہیں چھوڑی۔ دوسری طرف یہ ان منافقین کے ذکر کی تمہید ہے جو یا تو خود یہود میں سے تھے یا درپردہ ان کے زیر اثر تھے۔ اس وجہ سے بعینہٖ انہی گمراہیوں میں مبتلا تھے جو یہود کا ورثہ تھیں چنانچہ بعد کی آیات سے اس حقیقت کا پوری طرح انکشاف ہو گیا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ کَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ کَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا کُفْرًا لَّمْ یَکُنِ اللّٰہُ لِیَغْفِرَ لَھُمْ وَلَا لِیَھْدِیَھُمْ سَبِیْلًا ۝ بَشِّرِ الْمُنٰفِقِیْنَ بِاَنَّ لَھُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا (۱۳۷-۱۳۸)

اہل کتاب کے اندر سے آئے ہوئے منافقین کا کردار

اہل ایمان کا صحیح موقف و مقام واضح کرنے کے بعد منافقین کی طرف توجہ فرمائی کہ جو لوگ ایمان لائے پھر کفر کیا، پھر ایمان لائے پھر کفر کیا، پھر اپنے کفر ہی میں بڑھتے گئے، یہ خدا کی مغفرت اور ہدایت کے سزاوار نہیں ہیں، ان منافقین کو خدا کے دردناک عذاب کی بشارت پہنچا دو۔ یہ بات کہ یہاں ذکر منافقین ہی کا ہے خود قرآن کی ان آیات ہی سے واضح ہے۔ 'بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ' کے الفاظ سے خود یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ یہ کن لوگوں کا کردار بیان ہوا ہے۔ البتہ یہ سوال قابل غور ہے کہ یہ ایمان پھر کفر، پھر ایمان، پھر کفر کی حالت جو ان کی بیان ہوئی ہے یہ محض ان کے تذبذب کی ایک تصویر ہے یا بیان واقعہ ہے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ یہ بیان واقعہ ہے۔ اس کی وجہ، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، یہ ہے کہ یہ منافقین زیادہ تر اہل کتاب بالخصوص یہود میں سے تھے اور انہی کے زیر اثر بھی تھے۔ اس پہلو سے دیکھیے تو ان کے ایمان و کفر کا ایک کھیل تو وہ ہے جو وہ تورات کے ساتھ پہلے کھیل چکے ہیں اور دوسرا کھیل یہ ہے جو وہ اسلام کے ساتھ کھیل رہے ہیں کہ پہلے آگے بڑھ کر اس کے ماننے کا اقرار کیا اور اب رات دن اس کے خلاف سازشیں کرنے کے درپے ہیں۔ فرمایا کہ اب ان کو خدا نہ تو بخشنے کا ہے نہ ان کو کوئی اور راہ دکھانے کا ہے۔ کوئی اور راہ دکھانے سے مطلب یہ ہے کہ اب ان پر حجت تمام ہو چکی ہے، اب ان کے مزید امتحان کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اب ان کے لیے صرف جہنم کی راہ باقی رہ گئی ہے۔ آگے اس مضمون کو اس طرح واضح فرما دیا ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا اِلَّا طَرِيْقَ جَهَنَّمَ ۱۶۷-۱۶۸ (جن لوگوں نے کفر کیا اور اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے، اللہ نہ تو ان کو بخشنے کا ہے اور نہ کوئی اور راستہ ان کو دکھانے کا ہے بجز جہنم کے راستے کے) اسی مضمون کو یہاں بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا سے تعبیر فرمایا ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ؕ وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ ۖ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعًا (۱۳۹-۱۴۰)

وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ میں سورۂ انعام آیت ۶۸ کا حوالہ ہے

'وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ' میں حوالہ ہے سورۂ انعام کی آیت ۶۸ کا۔ وہاں فرمایا ہے۔ وَاِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ ؕ وَاِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ (اور جب تم ان کو دیکھو جو ہماری آیتوں میں کج بحثیاں کر رہے ہیں تو ان سے اعراض کرو یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں لگ جائیں اور اگر تمہیں شیطان یہ بات فراموش کرا دے تو یاد آنے کے بعد ان ظالموں کے پاس نہ بیٹھو) پھر یہی مضمون اسی انعام کی آیت ۷۰ میں بھی بیان ہوا ہے۔

مجالس میں اللہ کی آیات کا مذاق

'اَلَّذِیۡنَ یَتَّخِذُوۡنَ الۡاٰیَۃ'، یہ منافقین کی صفت بیان ہوئی ہے کہ یہ مسلمانوں کے بالمقابل کفار یعنی یہود کو اپنا دوست اور کارساز بنائے ہوئے ہیں۔ ان کی نگاہوں میں عزت و سرخروئی حاصل کرنے کے آرزومند ہیں حالانکہ عزت و ذلت سب خدا کے اختیار میں ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے ذلیل کر دیتا ہے۔ یہ ان کی مجالس میں حاضری دیتے ہیں جہاں اللہ کی آیات کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ حالانکہ قرآن میں یہ صریح ہدایت نازل ہو چکی ہے کہ جب دیکھو کہ اللہ کی آیات کا کفر کیا جا رہا ہے اور ان کا مذاق اڑایا جا رہا ہے تو ایسے لوگوں کے ساتھ نہ بیٹھو، یہاں تک کہ یہ مذاق اڑانے والے کسی اور بات میں لگ جائیں۔ اگر کوئی شخص ایسا کرتا ہے تو یہ بھی انھیں کا ساتھی بن جاتا ہے اس لیے اللہ ایسے منافقوں کو انہی کافروں کے ساتھ دوزخ میں جمع کرے گا۔

جن مجلسوں میں اللہ کے دین اور اس کی شریعت کا تمسخر ہو ان میں اگر کوئی مسلمان شریک ہو تو یہ اس کی بے حمیتی اور بے غیرتی کی دلیل ہے۔ اگر کوئی شخص ان میں شرکت کو اپنے لیے وجہ عزت و شرف سمجھے تو یہ صرف بے حمیتی کی ہی نہیں بلکہ اس کے مسلوب الایمان ہونے کی بھی دلیل ہے۔ اس قسم کے منافقوں کا حشر انھی لوگوں کے ساتھ ہو گا جن کے ساتھ خدا کے دین کے استہزا میں یہ شریک رہے ہیں۔ اس آیت سے دعوتِ دین کے بعض اہم اصول بھی نکلتے ہیں لیکن ان پر گفتگو کے لیے موزوں مقام سورۂ انعام میں آئے گا۔

اَلَّذِیۡنَ یَتَرَبَّصُوۡنَ بِکُمۡ ۚ فَاِنۡ کَانَ لَکُمۡ فَتۡحٌ مِّنَ اللّٰہِ قَالُوۡۤا اَلَمۡ نَکُنۡ مَّعَکُمۡ ۫ۖ وَ اِنۡ کَانَ لِلۡکٰفِرِیۡنَ نَصِیۡبٌ ۙ قَالُوۡۤا اَلَمۡ نَسۡتَحۡوِذۡ عَلَیۡکُمۡ وَ نَمۡنَعۡکُمۡ مِّنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ؕ فَاللّٰہُ یَحۡکُمُ بَیۡنَکُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ ؕ وَ لَنۡ یَّجۡعَلَ اللّٰہُ لِلۡکٰفِرِیۡنَ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ سَبِیۡلًا ﴿۱۴۱﴾

استحوذ علیہ کا مفہوم

'اِسۡتَحۡوَذَ عَلَیۡہِ' کے معنی ہیں اَحَاطَ بِہٖ، غلبہ، استولیٰ علیہ' اس کو گھیرے میں لے لیا۔ اس پر غالب آگیا۔ نر، مادہ کو جب اپنے گھیرے میں لے لیتا ہے، کسی دوسرے نر کو اس کی طرف بڑھنے نہیں دیتا تو اس کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔

'یَتَرَبَّصُوۡنَ بِکُمۡ' یعنی یَتَرَبَّصُوۡنَ بِکُمُ الدَّوَآئِر تمہارے لیے گردشوں کے منتظر رہتے ہیں۔

منافقین کی دوطرفہ سازباز

یہ انھی منافقین کے کردار کی مزید تفصیل ہے کہ یہ اسلام اور مسلمانوں کے نہایت بدخواہ ہیں۔ یہ ہمیشہ اس انتظار میں رہتے ہیں کہ تمھیں کوئی افتاد پیش آئے، کوئی ٹھوکر لگے، تم شکست کھاؤ۔ تمھیں فتح حاصل ہو تو کہیں گے کہ کیا ہم تمھارے ساتھ نہیں تھے اور اگر کہیں دشمن کا پلہ بھاری ہو جائے تو ان کے پاس پہنچیں گے اور ان کو یقین دلائیں گے کہ یہ تو ہماری تدبیر تھی کہ تم مسلمانوں سے محفوظ رہے۔ ہم اس طرح تمھیں بچاتے رہے کہ مسلمان تم پر کھل کر حملہ نہ کر سکے اور ان کا پورا دباؤ تم پر نہ پڑ سکا۔ فرمایا کہ آج یہ ان سخن سازیوں سے کام چلا رہے ہیں لیکن ایک دن آئے گا کہ سارے حالات بے نقاب ہو جائیں گے اس دن خدا تمھارے اور ان کے درمیان فیصلہ کر دے گا اور تمھارے مقابل میں ان کی کچھ پیش نہ جائے گی۔ اس دن یہ اَلَمۡ نَکُنۡ مَّعَکُمۡ کا دعویٰ نہ کر سکیں گے۔

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ۙ مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۖ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا (۱۴۲-۱۴۳)

'يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ' کے ہر پہلو پر پوری تفصیل کے ساتھ سورہ بقرہ کی آیت ۹ کے تحت بحث گزر چکی ہے۔

منافقین کے تذبذب کی تصویر

مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ۔ ذَبْذَبَ الشَّیْءُ کے معنی ہیں، چیز فضا میں ٹنگی ہوئی حرکت کر رہی ہے۔ 'ذَبْذَبَ الرَّجُلُ' کے معنی ہیں آدمی حیران و متردد ہے۔

'بَيْنَ ذٰلِكَ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ' یعنی نہ مسلمانوں کے ساتھ نہ کفار کے ساتھ، دونوں کے بیچ میں حیران و درماندہ، کبھی مسلمانوں کے پاس جا کر ان کو اطمینان دلاتے ہیں کہ ہم آپ کے ساتھ ہیں، کبھی کفار کے پاس پہنچ کر ان کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم آپ کے ساتھ ہیں حالانکہ ساتھ کسی کے بھی نہیں، دو گلوں کے بیچ میں بھٹکنے والی بکری کے مانند کبھی اس گلے میں شامل ہو جاتے ہیں کبھی دوسرے گلے میں۔ یہ ملحوظ رہے کُسَالٰی، يُرَآءُوْنَ اور مُّذَبْذَبِيْنَ تینوں حال پڑے ہوئے ہیں۔ ان تینوں کو بیک وقت چشم تصور کے سامنے لائیے تب صحیح تصویر سامنے آئے گی۔

اللہ کے ساتھ دھوکا بازی کرنے والا خود دھوکے میں ہے

مطلب یہ ہے کہ یہ منافقین صرف اللہ کے بندوں ہی کو دھوکا نہیں دے رہے ہیں بلکہ خدا کو بھی دھوکا دینا چاہتے ہیں حالانکہ جو خدا کو دھوکا دینا چاہتا ہے وہ خدا کو دھوکا نہیں دیتا بلکہ خود اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے اس لیے کہ خدا اس کی رسی دراز کر دیتا ہے جس سے وہ سمجھتا ہے کہ اس نے خدا کو دھوکا دے دیا ہے حالانکہ دھوکا اس نے خدا سے کھایا۔ 'وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ الآیۃ' یہ ان کی اس دھوکا بازی کی مثال ہے یعنی نماز کے لیے اٹھتے ہیں تو طبیعت پر جبر کر کے، الکسائے ہوئے، مارے باندھے محض اس ڈر سے اٹھتے ہیں کہ اگر شریک جماعت نہ ہوئے تو مسلمانوں کے رجسٹر سے نام ہی خارج ہو جائے گا۔ یہ محض دکھاوے کی نماز ہوتی ہے کہ مسلمان ان کو اپنے اندر شامل سمجھیں اس وجہ سے اس میں اللہ کا ذکر اتنا ہی ہوتا ہے جتنا مجبوری اور دکھاوے کی نماز میں ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اللہ کے ساتھ صریح دھوکہ بازی ہے۔ فرمایا یہ خدا کے راندے ہوئے ہیں، اس نے ان کو بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ اور جن کو خدا نے بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا ہو اب ان کو راہ پر کون لا سکتا ہے۔

صدر اول میں مسجد کی حاضری ایمان اور کفر کے درمیان علامت فارق تھی

اس آیت سے یہ بات صاف واضح ہوتی ہے کہ اس دور میں مسجد کی حاضری ایمان اور کفر کے درمیان ایک علامت فارق کی حیثیت رکھتی تھی۔ جو شخص بلا کسی عذر معلوم کے مسجد سے غیر حاضر رہتا اس کے لیے اپنے آپ کو مسلمانوں میں شمار کرانا ہی ناممکن ہو جاتا۔ ایک یہ دور تھا یا اب یہ دور آیا ہے جماعت کی حاضری تو درکنار سرے سے نماز پڑھنا ہی مسلمان سمجھے جانے بلکہ مسلمانوں کا لیڈر

مانے جانے کے لیے بھی ضروری نہیں رہا۔ یا للعجب!

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ ؕ اَتُرِیْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَیْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِیْنًا (۱۴۴)

'الکافرین' اگرچہ عام ہے لیکن قرینہ دلیل ہے کہ مراد اس سے وہی اہل کتاب ہیں جن سے منافقین کا سانباز تھا۔

'مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ' کی قید یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ کفار کو دوست اور حلیف بنانا اسی حالت میں ممنوع ہے جب یہ مسلمانوں کے بالمقابل ہو۔ اگر یہ صورت نہ ہو تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

'سُلْطٰنًا مُّبِیْنًا' واضح اور قطعی حجت۔

مسلمانوں کے بالمقابل کفار سے دوستی دلیل کفر ہے

خطاب اگرچہ عام ہے لیکن روئے سخن منافقین ہی کی طرف ہے کہ مسلمانوں کے بالمقابل کفار کو اپنا دوست اور ساتھی نہ بناؤ۔ یہ جرم کوئی معمولی جرم نہیں ہے۔ اس جرم کا ارتکاب کر کے تم اپنے خلاف اللہ کو ایک ایسی حجت قاطع دے دو گے کہ پھر تمہارے لیے کسی عذر کی گنجائش باقی نہ رہ جائے گی۔ تمہارا کفر بالکل قطعی اور تمہارا سزاوار دوزخ ہونا بالکل مبرہن ہو جائے گا۔

اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِیْرًا ۙ اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَاَخْلَصُوْا دِیْنَهُمْ لِلّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِیْنَ ؕ وَسَوْفَ یُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِیْنَ اَجْرًا عَظِیْمًا ۝ مَا یَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِیْمًا (۱۴۵-۱۴۷)

'الدرک الاسفل' کا مفہوم

'الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ'، درک، کے معنی اقصیٰ قعر الشیء یعنی کسی شے کا سب سے نچلا حصہ۔

'دین' بمعنی اطاعت

'وَاَخْلَصُوْا دِیْنَهُمْ' لفظ 'دین' کے مختلف معانی پر ہم کہیں بحث کر چکے ہیں۔ از آن جملہ اس کے معنی اطاعت کے بھی ہیں مثلاً قُلْ اِنِّیْۤ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّیْنَ (۱۱- زمر) (کہہ دو مجھے یہ حکم ملا ہے کہ میں اللہ ہی کی بندگی کروں اس کی مخلصانہ اطاعت کے ساتھ)

منافقین کا درجہ کفار سے بھی نیچے ہے

یہ منافقین کو آخری تنبیہ ہے کہ کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ کفر صریح کے بالمقابل ان کا یہ مذبذب ایمان بھی تو بہرحال کچھ قیمت رکھتا ہی ہے۔ فرمایا کہ نہیں، یہ منافقین دوزخ کے سب سے نچلے طبقہ میں ہوں گے یعنی ان کا درجہ کٹر اور معاند کفار کے درجے سے بھی نیچے ہے۔ توبہ کے سوا کوئی چیز بھی ان کو اس انجام سے نہیں بچا سکتی۔ اور اس توبہ کے لیے اصلاح، اعتصام باللہ اور اخلاص کی شرط ہے۔ اصلاح یعنی اپنے رویے کی اصلاح کریں، اعتصام یعنی اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑیں، اخلاص یعنی اللہ و رسول کی مخلصانہ اطاعت کریں، بغیر کسی تذبذب اور ریا کے۔ فرمایا کہ تب یہ آخرت میں مسلمانوں کے ساتھ ہو سکتے ہیں۔ اور یہ اطمینان رکھیں کہ اللہ کے ہاں اہل ایمان کے لیے بڑا اجر ہے۔ اس کے بعد خود ان منافقین کو مخاطب کر کے، باندازِ التفات فرمایا کہ خدا کو تمہیں عذاب دینے میں کوئی نفع نہیں ہے اگر تم شکر گزار بنو اور ایمان اختیار کرو تو اللہ بڑا قدردان اور ہر ایک کے ایمان و عمل سے اچھی طرح باخبر ہے۔

یہ ملحوظ رہے کہ فلسفیوں کے اعتبار سے شکر ہی سچے ایمان کا سرچشمہ ہے۔ نیز یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ بعض مرتبہ نسبت کے بدل جانے سے الفاظ کے معنی بدل جاتے ہیں۔ چنانچہ شکر کی نسبت جب خدا کی طرف ہوتی ہے تو اس کے معنی قبول کرنے کے ہو جاتے ہیں۔ ان دونوں باتوں پر دوسرے مقام میں بحث گزر چکی ہے۔

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِـيْمًا ۝ اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْۗءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا (۱۴۸-۱۴۹)

تعین اشخاص کے ساتھ برائی کا اظہار صرف مظلوم کے لیے جائز ہے

یہ مسلمانوں کو اسی طرح کی ایک تنبیہ ہے جس طرح کی تنبیہ آیت ۸۶ میں گزر چکی ہے جس طرح وہاں منافقین سے عبث اعراض کا حکم ہوا تو ساتھ ہی مسلمانوں کو یہ ہدایت کر دی گئی کہ جو شخص سلام کرے تم اس کے سلام کا جواب دو اور مقصود اس سے یہ تھا کہ مبادا پرجوش مسلمان ان لوگوں سے سلام کلام ہی بند کر دیں جن پر ان کو منافقت کا شبہ ہو جائے۔ اسی طرح یہاں اوپر والی آیات میں منافقین کے لیے چونکہ فِی الدَّرْکِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ تک کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جس سے اس بات کا اندیشہ تھا کہ مسلمان علانیہ سخت الفاظ میں منافقین کی برائیوں کا اظہار و اعلان شروع کر دیں گے اس وجہ سے یہ ہدایت کر دی گئی کہ تعین اشخاص کے ساتھ برائی کا اظہار صرف مظلوم کے لیے جائز ہے، دوسروں کے لیے اللہ اس کو پسند نہیں فرماتا۔

یہ بات چونکہ جماعتی زندگی کے نہایت اہم مسائل میں سے ہے اس وجہ سے اس کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔

جماعتی زندگی کی ایک اہم ہدایت

جماعتی زندگی میں کسی گروہ کے اندر اگر کوئی ایسی برائی جڑ پکڑ رہی ہو یا پکڑ چکی ہو جو پوری جماعت کے لیے خطرہ بن سکتی ہو تو اس کا تدارک ضروری ہوتا ہے اور اس تدارک کے لیے یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ اس برائی کی قباحت و شناعت، اس کے نتائج بد اور اس کے مرتکبین کے انجام کو اچھی طرح واضح کر دیا جائے تاکہ جماعت کے افراد اس کے شر سے محفوظ رہیں لیکن ساتھ ہی اس امر کو ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے کہ جماعت کے عام افراد عام صیغہ سے کہی ہوئی بات کو مجرد اپنے اندازے، قیاس اور گمان کی بنا پر معین اشخاص پر منطبق کرنا نہ شروع کر دیں۔ اس سے نہ صرف اس بات کا اندیشہ ہے کہ بہت سے بے گناہ اشخاص تہمتوں کے ہدف بن جائیں گے بلکہ جماعت میں انتشار و فساد پیدا ہو جانے کا خطرہ بھی ہے۔ یہاں منافقین سے متعلق جو باتیں بیان ہوئی ہیں، دیکھ لیجیے، بالکل عام صیغے سے بیان ہوئی ہیں اور مقصود یہ ہے کہ جو لوگ یہ حرکتیں کر رہے ہیں وہ اگر اپنی اصلاح کرنا چاہیں تو اصلاح کر لیں اور اگر وہ اصلاح نہ کریں تو کم از کم مسلمان اپنے آپ کو ان فتنوں سے محفوظ رکھیں۔ اس حد تک یہ چیز نہ صرف یہ کہ ٹھیک ہے بلکہ جماعتی بقا کے لیے ناگزیر ہے لیکن اگر یہی چیز یہ شکل اختیار کر لے کہ اس کو دلیل بنا کر عام افراد تعین کے ساتھ ایک دوسرے کو ہدف مطاعن بنانا شروع کر دیں کہ تو منافق ہے، تو کافر ہو گیا اور فلاں فِی الدَّرْکِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ کا سزاوار ہے تو پوری جماعت میں ایک طوفان برپا ہو جائے گا۔ اس فتنے کے سدباب کے لیے یہ ہدایت فرما دی گئی کہ تعین اشخاص کے ساتھ برائی کا اظہار و اعلان صرف اس شخص کے لیے جائز ہے جس

پر شخصاً ظلم ہوتا ہے۔ اس صورت میں ظلم، ظالم اور مظلوم تینوں متعین ہوں گے اور قانون اس کا مداوا کر سکے گا جب تک یہ شکل نہ ہو بات عام صیغے ہی سے کہنی چاہیے جس طرح قرآن نے کہی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں بھی جب اس طرح کی کوئی برائی آتی تو آپ ہمیشہ عام صیغے ہی سے اس پر لوگوں کو ملامت فرماتے۔ آپ کا عام انداز کلام یہ ہوتا، مَا بَالُ قَوْمٍ يَفْعَلُوْنَ كَذَا وَكَذَا ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے جو اس اس طرح کے کام کرتے ہیں۔ البتہ جب کوئی متعین شخص کسی متعین جرم کے ساتھ سامنے آتا تو اس پر قانون کے مطابق گرفت فرماتے۔

صفاتِ الٰہی کے ذکر سے مقصود ان کا لازم ہے

وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا بطور تنبیہ ہے یعنی کوئی شخص اگر اس ہدایت کے خلاف روش اختیار کرے گا تو وہ یاد رکھے کہ خدا سننے والا اور جاننے والا ہے۔ ہم ایک سے زیادہ مقامات پر یہ اصول بیان کر چکے ہیں کہ اس طرح جب صفاتِ الٰہی کا حوالہ آتا ہے تو مقصود اس سے ان کا لازم ہوتا ہے یعنی جب خدا سب کچھ سنتا اور جانتا ہے تو اس پر وہ گرفت بھی لازماً فرمائے گا۔

پسندیدہ روش کا بیان

اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا الاٰية خدا کو جو روش ناپسند ہے اس کو بیان فرمانے کے بعد یہ پسندیدہ روش کا بیان ہے۔ فرمایا کہ پسندیدہ روش یہ ہے کہ آدمی اچھی بات کا اظہار کرے، اچھا جذبہ دل میں پرورش کرے اور دوسروں کی برائیوں سے درگزر کرے۔ اس کے بعد اپنی دو صفتوں — عفو اور قدیر — کا حوالہ دیا ہے جس سے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہو رہا ہے کہ خدا ہر طرح کی قدرت رکھنے کے باوجود لوگوں کی برائیوں سے درگزر فرماتا ہے۔ اس وجہ سے وہ چاہتا ہے کہ اس کی ان صفات کا عکس اس کے بندوں کے اندر بھی پایا جائے۔ آدمی طاقت رکھتا ہو کہ وہ کسی کو ترکی بہ ترکی جواب دے سکے لیکن اس کے باوجود وہ درگزر کر جائے تو یہ عفو ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۝ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۱۵۰-۱۵۲)

اہل کتاب کے کفر کا فریب

ان آیات میں اہل کتاب کی جو فرد قرارداد جرم بیان ہوئی ہے اس کے ہر جزو پر مفصل بحث پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہے۔ البتہ ان کا موقع و محل وضاحت طلب ہے۔ اوپر آیت ۱۴۴ کے تحت یہ بات گزر چکی ہے کہ لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ میں کافرین سے مراد اہل کتاب ہیں۔ اگرچہ اہل کتاب کا کفر بالکل واضح ہے لیکن حیلہ جو طبیعتیں، جو ان سے ساز باز رکھنا چاہتی تھیں، اپنے روابط ان سے کاٹنے کے لیے تیار نہ تھیں، وہ اپنے اس رویے کو جائز ثابت کرنے کے لیے یہ حیلہ شرعی تراشتی تھیں کہ اہل کتاب بہرحال اہل کتاب ہیں، ان کے اندر دین کے نقطۂ نظر سے کچھ خرابیاں ہو سکتی ہیں اور ہیں لیکن ان خرابیوں کی بنا پر ان کو

بالکل کفار کی صف میں کھڑا کر دینا اور ان کے ساتھ وہی معاملہ کرنا قرین انصاف نہیں ہے۔ قرآن نے ان کی حیلہ بازوں کے اس فریب کا ان آیات میں پردہ چاک کیا ہے اور نہایت صراحت کے ساتھ بتایا ہے کہ پکے کافر تو درحقیقت یہ اہل کتاب ہی ہیں اس لیے کہ یہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کرتے ہیں جن کو خدا نے اپنا رسول بنا کر بھیجا ہے ان میں سے جس کو چاہتے ہیں مانتے ہیں جس کو چاہتے ہیں نہیں مانتے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ خدا پر ایمان اپنے شرائط پر لانا چاہتے ہیں نہ کہ خدا کے شرائط پر، حالانکہ ایمان صرف وہ معتبر ہے جو خدا کے شرائط پر ہو۔ اگر ایمان کی شرطیں یہی مقرر کریں گے اور رسولوں کا انتخاب یہ اپنی ہی صواب دید پر کریں گے تو پھر خدا کی خدائی کہاں رہی۔ پھر تو خدا کا منصب انھوں نے خود ہی سنبھال لیا۔ فرمایا کہ ان کے کٹر کافر ہونے میں ذرا شبہ نہیں اور ایسے برخود غلط اور مغرور کافروں کے لیے ہم نے رسوا کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ مومن صرف وہ لوگ شمار ہوں گے جو اللہ اور اس کے تمام رسولوں پر ایمان لائے، ان کے درمیان کوئی تفریق نہیں کی۔ یہ لوگ بے شک اپنا اجر پائیں گے۔ خدا غفور رحیم ہے۔

اس آیت سے یہ حقیقت واضح ہوئی ہے کہ کفر صرف یہی نہیں ہے کہ کوئی شخص صریح لفظوں میں خدا اور رسولوں کا انکار کرے بلکہ یہ بھی کفر اور صریح کفر ہے کہ وہ خدا اور اس کے رسولوں کو تو مانے لیکن اپنی شرائط پر۔

۴۰۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۵۳-۱۶۲

آگے اہل کتاب ـــ یہود اور نصاریٰ ـــ کو تنبیہ ہے اور یہ تنبیہ اتنی سخت و شدید ہے کہ لفظ لفظ سے جوش غضب اُبلا پڑ رہا ہے۔ پوری تقریر از ابتدا تا انتہا صرف فرد قرار داد جرائم پر مشتمل ہے اور کلام کے جوش اور روانی کا یہ عالم ہے کہ بات شروع ہونے کے بعد یہ متعین کرنا مشکل ہوتا ہے کہ ختم کہاں ہوتی۔ اس قسم کے پرجوش اور پر غضب کلام میں عموماً خبر حذف ہو جاتی ہے، گویا متکلم کا جوش ہی خبر کا قائم مقام بن جاتا ہے اور مبتدا ہی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ متکلم کیا کہنا چاہتا ہے ـــ آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات ۱۵۳-۱۶۲

يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰٓى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ ۚ وَاٰتَيْنَا مُوْسٰى سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۵۳﴾ وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِيْثَاقِهِمْ وَقُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُلْنَا

لَهُمْ لَا تَعْدُوْا فِی السَّبْتِ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّیْثَاقًا غَلِیْظًا ﴿۱۵۴﴾ فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّیْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِیَآءَ بِغَیْرِ حَقٍّ وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَیْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا یُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِیْلًا ﴿۱۵۵﴾ وَّبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلٰی مَرْیَمَ بُهْتَانًا عَظِیْمًا ﴿۱۵۶﴾ وَّقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِیْحَ عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ؕ وَاِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِیْهِ لَفِیْ شَكٍّ مِّنْهُ ؕ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ یَقِیْنًا ﴿۱۵۷﴾ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِیْزًا حَكِیْمًا ﴿۱۵۸﴾ وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَیُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَیَوْمَ الْقِیٰمَةِ یَكُوْنُ عَلَیْهِمْ شَهِیْدًا ﴿۱۵۹﴾ فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِیْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَیْهِمْ طَیِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ كَثِیْرًا ﴿۱۶۰﴾ وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ؕ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِیْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا ﴿۱۶۱﴾ لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُوْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَالْمُقِیْمِیْنَ الصَّلٰوةَ وَالْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ اُولٰٓئِكَ سَنُؤْتِیْهِمْ اَجْرًا عَظِیْمًا ﴿۱۶۲﴾ ع

۲۲ ع ۱۰ ۲

ترجمۂ آیات ۱۵۳-۱۶۲

اہل کتاب تم سے یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ تم ان پر براہِ راست آسمان سے ایک کتاب اتار دو۔ یہ تعجب کی بات نہیں، موسیٰ سے تو انھوں نے اس سے بھی بڑا مطالبہ کیا تھا۔

انھوں نے مطالبہ کیا کہ ہمیں تم اللہ کو کھلم کھلا دکھا دو۔ توان کوان کی اس زیادتی کے باعث کڑک نے آدبوچا۔ پھر نہایت واضح نشانیاں آچکنے کے بعد انھوں نے گوسالے کو معبود بنا لیا۔ ہم نے اس سے درگزر کیا اور موسٰی کو ہم نے نہایت واضح حجت عطا کی۔ اور ہم نے ان کے اوپر طور کو معلق کیا ان کے عہد کے ساتھ اور ہم نے ان کو کہا کہ دروازے میں داخل ہو سر جھکائے ہوئے اور ان کو کہا کہ سبت کے معاملے میں حکم عدولی نہ کرنا۔ اور ہم نے ان سے ایک مضبوط عہد لیا۔ ۱۵۳-۱۵۴

پس بوجہ اس کے کہ انھوں نے اپنے عہد کو توڑا، بوجہ اس کے کہ انھوں نے اللہ کی آیات کا انکار کیا، بوجہ اس کے کہ انھوں نے انبیاء کو ناحق قتل کیا اور بوجہ اس کے کہ انھوں نے کہا کہ ہمارے دل تو بند ہیں ــــ بلکہ اللہ نے ان کے کفر کے سبب ان کے دلوں پر مہر کر دی ہے تو وہ کم ہی ایمان لائیں گے ــــ اور بوجہ ان کے کفر کے اور بوجہ ان کے مریم پر ایک بہتان عظیم لگانے اور بہ سبب ان کے اس دعوے کے کہ ہم نے مسیح بن مریم اللہ کے رسول کو قتل کیا ــــ حالانکہ نہ تو انھوں نے اس کو قتل کیا، نہ سولی دی بلکہ معاملہ ان کے لیے گھپلا کر دیا گیا اور جو لوگ اس کے بارے میں اختلاف کر رہے ہیں وہ اس کے معاملے میں شک میں پڑے ہوئے ہیں، ان کو اس بارے میں کوئی قطعی علم نہیں بس گمان کی پیروی کر رہے ہیں۔ قتل اس کو انھوں نے ہرگز نہیں کیا بلکہ اللہ نے اس کو اپنی طرف اٹھا لیا اور اللہ غالب اور حکیم ہے۔ ۱۵۵-۱۵۸

اور اہل کتاب میں سے کوئی نہیں ہے جو اس کی موت سے پہلے اس کا یقین نہ کر لے اور قیامت کے دن وہ ان پر گواہ ہوگا۔ ۱۵۹

پس ان یہودیوں کے ظلم کے سبب سے ہم نے بعض پاکیزہ چیزیں ان پر حرام کر دیں جو ان کے لیے حلال تھیں اور بوجہ اس کے کہ وہ اللہ کی راہ سے بہت روکتے ہیں اور بوجہ اس کے کہ وہ سود لیتے ہیں حالانکہ اس سے ان کو روکا گیا ہے اور بوجہ اس کے کہ وہ لوگوں کا مال باطل طریقہ سے کھاتے ہیں اور ہم نے ان میں سے کافروں کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ البتہ ان میں جو علم میں راسخ اور صاحب ایمان ہیں وہ ایمان لاتے ہیں اس چیز پر جو تم پر اتاری گئی اور جو تم سے پہلے اتاری گئی اور خاص کر نماز قائم کرنے والے اور زکوٰۃ دینے والے اور اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھنے والے۔ یہ لوگ ہیں جن کو ہم اجر عظیم دیں گے۔ ۱۶۰-۱۶۲

۴۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰٓى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ ۚ وَاٰتَيْنَا مُوْسٰى سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ۝ وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِيْثَاقِهِمْ وَقُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوْا فِي السَّبْتِ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۝ فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ۭ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ (۱۵۳-۱۵۵)

ان آیات میں تاریخ بنی اسرائیل کے جن واقعات کا حوالہ ہے وہ بلا استثنا سب کے سب سورۂ بقرہ کی تفسیر میں زیر بحث آ چکے ہیں۔ ملاحظہ ہو تفسیر آیات ۴۷-۹۶۔

'بظلمہم' کا مفہوم

'بِظُلْمِهِمْ' یعنی اس کڑک کو انھوں نے اپنی بدبختی سے خود دعوت دی۔ یہ اللہ نے ان کے اوپر ظلم نہیں کیا بلکہ انھوں نے خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھایا۔ انھوں نے ایک ایسے تجربے کے لیے ضد کی جس کی وہ تاب نہیں لا سکتے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اس کی زد میں آ گئے۔

'سلطان مبین' سے مراد

'سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا' سے مراد وہ حجت قاطع ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو معجزات کی شکل

ہیں عطا فرمائی۔ یہ معجزات ایسے مسکت اور قاہر تھے کہ ان کے بعد کسی انصاف پسند کے لیے کسی تردد کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔

رفع طور اور میثاق

'وَرَفَعۡنَا فَوۡقَهُمُ ٱلطُّورَ بِمِيثَٰقِهِمۡ' میں 'ب' میرے نزدیک تلبس کے مفہوم میں ہے۔ بقرہ آیت ۶۳ کے تحت ہم نے رفع طور کی حقیقت بھی واضح کی ہے اور اس کا مقصد بیان کیا ہے کہ اس قدرت قاہرہ کے اظہار سے مقصود بنی اسرائیل پر یہ واضح کرنا تھا کہ جس خدا سے یہ معاہدہ کر رہے ہو اس کے ہاتھ میں یہ پہاڑ کو ہلا دینے والی طاقت بھی ہے۔ اگر معاہدہ کر چکنے کے بعد اس کو توڑا تو یاد رکھو کہ اس عہد شکنی کی سزا سے تمھیں کوئی نہ بچا سکے گا۔ یہاں اسی حقیقت کو اس طرح مصور کیا ہے کہ خدا نے ان کے اوپر طور کو بھی اٹھایا اور اس کے ساتھ معاہدہ کو بھی کہ یہ معاہدہ ہے اور یہ پہاڑ، اگر اس معاہدے کی بے حرمتی ہوئی تو اسی پتھر سے تمھارا سر کچل دیا جائے گا۔

'بَلۡ طَبَعَ ٱللَّهُ عَلَيۡهَا' جملہ معترضہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے قول 'قُلُوبُنَا غُلۡفٌ' کا مفہوم اور اس جملہ معترضہ کی بلاغت اور اس کی حقیقت سورۂ بقرہ میں بیان ہو چکی ہے۔

بلاغت کا ایک اسلوب

اس پورے رکوع میں بلاغت کا یہ اسلوب قابل توجہ ہے کہ بنی اسرائیل کے جرائم کی ایک طویل فہرست تو سنا دی گئی ہے لیکن الفاظ میں یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ اس فہرست کے سنانے سے مدعا کیا ہے۔ جرائم کی فہرست کے بیچ میں ایک جملہ معترضہ آ گیا ہے اور اس کے ختم ہوتے ہی پھر ان کے جرائم کے بیان کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ اس کے بعد اقتضائے کلام سے ایک اور طویل جملہ معترضہ آ گیا ہے اور اس کے بند ہوتے ہی پھر فہرست جرائم شروع ہو گئی۔ یہ اسلوب بیان، جیسا کہ ہم نے تمہید میں اشارہ کیا، متکلم کے زور بیان اور جوش، سامع کی ذہانت اور ہوش، دعوے کی قوت اور وضاحت اور فیصلہ کے مستغنی عن البیان ہونے کو ظاہر کرتا ہے۔ خطبائے عرب کے خطبات میں اس کی نہایت عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ قرآن میں بھی آگے اس کی نہایت بلیغ مثالیں آئیں گی۔ اس طرح کے پر زور کلام کو ایک صاحب ذوق سامع سمجھ تو سکتا ہے لیکن اس کے زور اور اس کی بلاغت کو کسی دوسری زبان میں منتقل کرنا ممکن نہیں ہوتا۔

کلام کا مدعا اپنے الفاظ میں

مطلب یہ ہے کہ یہود تم سے یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ وہ قرآن اور تمھاری رسالت پر اس وقت ایمان لائیں گے جب تم ان کے اوپر آسمان سے اس طرح ایک کتاب اتار دو کہ وہ اس کو اترتے ہوئے خود اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ تم ان کے اس مطالبے پر تعجب نہ کرو۔ یہ جن اسلاف کے خلف ہیں وہ اپنے پیغمبر سے اس سے بھی کہیں بڑھ چڑھ کر مطالبہ کر چکے ہیں۔ یہ تو صرف کتاب ہی اترتے دیکھنا چاہتے ہیں، انھوں نے تو یہ مطالبہ کیا تھا کہ ہمیں خدا کو کھلم کھلا دکھاؤ، جب تک تم خدا کو نہ دکھاؤ گے ہم یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ وہ تم سے ہم کلام ہوتا ہے اور تم اس کے فرستادہ ہو۔ چنانچہ اس طرح انھوں نے خود اپنی شامت بلائی اور ان کو ایک کڑک نے آ دبوچا۔ پھر اس سے بھی عجیب تر بات یہ ہے کہ انھوں نے نہایت واضح معجزات دیکھنے

کے بعد بھی ایک بچھڑے کو معبود بنالیا لیکن ہم نے ان سے درگزر کیا اور موسٰی کو نہایت واضح حجت عطا کی تاکہ ان کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہے۔ ہم نے ان سے میثاق لینے کے موقع پر ان کے سروں پر طور کو لٹکا دیا، ان کو خیمۂ عبادت میں فروتنی کے ساتھ داخل ہونے کی ہدایت کی، ان کو حکم دیا کہ سبت کی بے حرمتی نہ کرنا اور ان سب باتوں کے لیے ان سے نہایت مضبوط میثاق لیا لیکن انھوں نے کسی عہد کی بھی پروا نہ کی بلکہ ہر عہد کو توڑا، اللہ کی آیات کا انکار کیا، انبیاء کو بے گناہ قتل کیا، اور کہا کہ ہمارے دلوں کے دروازے تو تمھاری باتوں کے لیے بند ہیں۔ یہ بند نہیں ہیں بلکہ اللہ نے ان کے کفر کے سبب سے ان پر مہر کر دی ہے تو یہ شاذ و نادر ہی ایمان لائیں گے ـــــ ان باتوں کے حوالہ دینے سے مقصود یہ ہے کہ جن کی تاریخ یہ ہے، جن کا قومی مزاج یہ ہے، ان سے کس خیر کی امید کی جا سکتی ہے؟ ان کے ان مسلسل جرائم کے سبب سے، جن کا سلسلہ اسلاف سے لے کر اخلاف تک کہیں ٹوٹا نہیں ہے، خدا نے ان پر لعنت کر دی ہے، اب کوئی سا معجزہ بھی تم ان کو دکھا دو، معجزات دیکھنے کی تو نس باقی ہی رہے گی، ایمان کی سعادت ان کو ہرگز حاصل نہیں ہوگی۔

وَبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلَىٰ مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيمًا ۝ وَقَوْلِهِمْ إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُولَ اللَّهِ وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلَٰكِن شُبِّهَ لَهُمْ ۚ وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ ۚ مَا لَهُم بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوهُ يَقِينًا ۝ بَل رَّفَعَهُ اللَّهُ إِلَيْهِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا (۱۵۶-۱۵۸)

'وبکفرہم' کا عطف

'وَبِكُفْرِهِمْ' کا عطف اوپر کے سلسلۂ کلام پر ہے۔ بیچ میں جملہ معترضہ آ گیا تھا اس کے ختم ہونے کے بعد پھر فہرست جرائم شروع ہو گئی۔

حضرت مریمؑ پر بہتان کی نوعیت

'وَقَوْلِهِمْ عَلَىٰ مَرْيَمَ' میں جس بہتان عظیم کا ذکر ہے اس کے متعلق سورۂ آل عمران کی تفسیر میں ہم ذکر کر چکے ہیں کہ یہود نے یہ الزام سیدنا مسیحؑ کے دور میں لگانے کی جرأت نہیں کی۔ یہ تمام تر بعد کی ایجادات میں سے ہے۔

'إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُولَ اللَّهِ' میں 'رَسُولَ اللَّهِ' کا لفظ ہمارے نزدیک یہود کے قول کا جزو نہیں ہے بلکہ ان کے جرم کی سنگینی کو واضح تر کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ سیدنا مسیحؑ کے مرتبہ کو واضح فرمادیا ہے۔

واقعۂ قتل مسیح کی تردید کا مقصد

'وَمَا قَتَلُوهُ' سے 'عَزِيزًا حَكِيمًا' تک جملہ معترضہ ہے۔ اس میں یہود کے دعوائے قتل مسیح کی فوری تردید کر دی گئی ہے۔ اس فوری تردید سے دو پہلو سامنے آتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اللہ کے رسول اس کی حفاظت میں ہوتے ہیں، ان کے خلاف اس کے دشمنوں کی چالیں خدا کامیاب نہیں ہونے دیتا۔ اس وجہ سے یہود کا یہ دعویٰ کہ انھوں نے ان کو قتل کیا، یا سولی دی بالکل بے بنیاد ہے۔ وہ اپنی اس شرارت میں بالکل ناکام رہے۔ البتہ ایک جھوٹے دعوے کا بار اپنے سر لے کر ہمیشہ کے لیے منحوس و ملعون بن گئے۔ دوسرا یہ کہ نہ کہیں مسیحؑ کے قتل کا واقعہ پیش آیا نہ سولی کا لیکن پال (Paul) کے متبع نصاریٰ نے اس فرضی افسانے کو لے کر اس پر ایک پوری دیومالا (Mythology) تصنیف کر ڈالی اور اس طرح پرائے شگون پر خود اپنی ناک کٹوا بیٹھے۔

ولٰکن شُبِّہَ لَہُم کا مفہوم

'وَلٰکِنْ شُبِّهَ لَهُمْ' یعنی یہود جو کچھ کرنا چاہتے تھے وہ تو وہ کر نہ پائے البتہ صورت حالات ایسی بنا دی گئی کہ وہ یہی سمجھے کہ انھوں نے مسیح کو سولی دلوا دی ہے۔ یہ متعین کرنا مشکل ہے کہ اس کی شکل کیا ہوئی۔ جس واقعہ کے بارے میں خود ان لوگوں کے درمیان، جیسا کہ انجیلوں سے ثابت ہے، شدید اختلاف ہو جو اس وقت موجود تھے اب دو ہزار سال کے بعد اس کی شکل متعین کرنے کی کوشش کرنا محض اٹکل کے تیر تکے چلانا ہے۔ قطعی بات بس اتنی ہی ہے جو قرآن نے بتائی ہے کہ حضرت مسیح کو یہود نہ تو قتل کر سکے نہ سولی دے سکے بلکہ معاملہ ان کے لیے گھپلا کر دیا گیا۔

واقعہ کی نوعیت انجیلوں کی روشنی میں

واقعے کی جو روداد انجیلوں میں موجود ہے اس سے چند باتیں بالکل واضح طور پر سامنے آتی ہیں۔

ایک یہ کہ اس وقت ملک پر رومیوں کی حکومت تھی اور وہی تمام سیاسی و تعزیری اختیارات کے مالک تھے۔

دوسری یہ کہ رومی حکام اور پولیس کو نہ صرف یہ کہ حضرت مسیح کو سولی دینے سے کوئی دلچسپی نہ تھی بلکہ رومی حاکم پیلاطوس اور دوسرے حکام اس ظلم کی ذمہ داری کسی طرح بھی اپنے اوپر لینے کے لیے تیار نہیں تھے۔

تیسری یہ کہ گرفتاری اور سزا کے وقت کے جو حالات بیان کیے گئے ہیں وہ ایسے ہنگامہ خیز ہیں کہ ایسے حالات کے اندر عوام کو ہر بات باور کرائی جا سکتی تھی اور وہ بڑی آسانی سے جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ مان سکتے تھے۔

چوتھی یہ کہ سولی کے مزعومہ واقعے کے بعد بھی انجیلوں سے ثابت ہے کہ حضرت مسیح کے شاگردوں نے ان کو دیکھا۔

پانچویں یہ کہ سیدنا مسیح کے وعظوں، ان کے معجزوں اور ان کے کارناموں کی تو بڑی دھوم تھی لیکن اس وقت تک صورۃً نہ وہ عوام ہی میں اچھی طرح متعارف تھے اور نہ رومی حکام اور ان کی پولیس کے آدمی ہی ان کو پہچانتے تھے۔

چھٹی یہ کہ خود نصاریٰ میں بھی ایک جماعت شروع سے اس بات کی قائل رہی ہے کہ سولی حضرت مسیح کو نہیں دی گئی بلکہ ایک اور ہی شخص کو دی گئی لیکن مشہور یہ کر دیا گیا کہ انھی کو سولی دی گئی۔

ان تمام باتوں کے دلائل خود انجیلوں میں موجود ہیں اور نہایت آسانی سے ہم ان کو جمع کر سکتے ہیں لیکن اس سے بس اتنی ہی بات ثابت ہو گی جو قرآن نے بتا دی ہے کہ معاملہ ان کے لیے گھپلا کر دیا گیا۔ رہا یہ سوال کہ اس گھپلے کی شکل کیا ہوئی تو اس باب میں جو کچھ بھی کہا جائے گا اس کی حیثیت ظن و گمان سے کچھ زیادہ نہیں ہے اور ہم گمان کے پیچھے پڑنا پسند نہیں کرتے۔

یہی پرائے شگون پر اپنی ناک کٹوا بیٹھے

'وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ' سے مراد نصاریٰ ہیں۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ نصاریٰ میں نفس واقعے سے متعلق بھی، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، بڑا اختلاف ہے اور اس پر جو دیومالا (MYTHOLOGY) انھوں نے تصنیف کی ہے اس میں بھی بڑے اختلافات ہیں اور یہ اختلاف قدرتی نتیجہ ہے اس بات کا کہ انھوں نے اپنے سارے علم کلام کی بنیاد حقیقت کے بجائے محض ظن پر رکھی اور اس طرح جس سولی سے اللہ تعالیٰ نے سیدنا مسیح کو محفوظ رکھا نصاریٰ نے اس پر خود چڑھ کر خودکشی کر لی۔

رفع سے مجرد ترقی درجات لینا عربیت کے خلاف ہے

بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا، رَفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ کے ٹکڑے پر ہم سورۂ آل عمران کی تفسیر میں بحث کر چکے ہیں۔ وہاں ہم نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ اس سے مجرد ترقی درجات و مراتب لینا عربیت کے خلاف ہے۔ عزیز و حکیم کی صفات کے حوالے سے مقصود یہاں یہ ہے کہ خدا جب کسی کام کو کرنا چاہے تو وہ اپنے ارادے پر غالب ہے۔ اس کے لیے کوئی راہ بھی بند نہیں ہے، وہ جہاں سے چاہے اپنی تدبیر و حکمت سے راہ کھول لیتا ہے۔

اصل سلسلۂ کلام

یہ امر ملحوظ رہے کہ اصل مسئلہ زیر بحث ان آیات میں حضرت مسیحؑ کے قتل یا سولی کی تردید یا ان کے رفع و قبول کا نہیں ہے۔ یہ بات، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، محض ایک ضمنی بات کے طور پر، سلسلۂ کلام کے بیچ میں آگئی ہے۔ اصل سلسلۂ کلام جو يَسْئَلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ سے چل رہا ہے وہ یہ ہے کہ اہل کتاب قرآن اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان نہ لانے کے لیے جو بہانے بنا رہے ہیں وہ سب بہانے ان کی اس کھوٹے پن کے کرشمے ہیں جو ابتدا ہی سے ان کی سرشت میں داخل ہے۔ انھوں نے ایک سے ایک بڑھ کر معجزے دیکھے لیکن کوئی معجزہ ان کو مطمئن نہ کر سکا۔ انھوں نے ہمیشہ عہد شکنی کی، ہمیشہ تکذیب کی اور ہر حق کا مقابلہ ضد اور مکابرت، تکبر اور سرکشی سے کیا۔ یہاں تک کہ مریم پر بہتان لگایا اور خدا کے رسول مسیح ابن مریم کے قتل کرنے کے خود مدعی ہیں۔ —— جب بات یہاں تک پہنچی تو ضمنی طور پر قتل اور سولی کے واقعہ کی تردید فرما دی اور ساتھ ہی نصاریٰ کو بھی تنبیہ فرما دی کہ انھوں نے بھی بے سمجھے بوجھے اسی جھوٹ کو سچ مان کر اس پر پورے علم کلام کا محل تعمیر کر دیا۔

وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا (۱۵۹)

وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ سے مراد یہود اور نصاریٰ دونوں ہیں

وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ کا اسلوب بیان تعمیم کو ظاہر کر رہا ہے، یعنی یہ یہود و نصاریٰ دونوں گروہوں پر مشتمل ہے اگرچہ اوپر سے ذکر یہود ہی کا چلا آ رہا تھا لیکن چونکہ جملہ معترضہ میں، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا نصاریٰ کی حماقت کا بھی ذکر آگیا تھا اس وجہ سے ان کے حوالے کے لیے بھی تقریب پیدا ہو گئی اور یہاں جو بات بیان ہوئی ہے وہ دونوں گروہوں سے بحیثیت گروہ کے متعلق ہے، بحیثیت افراد کے نہیں۔

ایمان کا لفظ یقین کرنے کے معنی میں

لَيُؤْمِنَنَّ میں لام، تاکید اور قسم کا ہے اور ایمان کا لفظ یہاں یقین کرنے کے معنی میں ہے۔ دین میں معتبر ایمان صرف وہ ہے جو یقین، تصدیق اور اقرار تینوں اجزا پر مشتمل ہو۔ اس کے علاوہ ایک وہ ایمان ہے جس کے اندر یقین اور تصدیق کے اجزا تو نہیں پائے جاتے لیکن اظہار و اقرار کا جزو پایا جاتا ہے، یہ منافقین کا ایمان ہے۔ اسی طرح ایک وہ ایمان بھی ہے جس کے اندر یقین تو پایا جاتا ہے لیکن اس کے اندر تصدیق اور اقرار کے اجزا مفقود ہوتے ہیں، یہ منکرین اور متمردین کا ایمان ہے۔ ان پر حق کا حق ہونا تو بالکل واضح ہو جاتا ہے لیکن وہ اپنی رعونت اور شرارت کی وجہ سے اس کی تصدیق و اقرار سے گریز کرتے ہیں اور اپنی اس شرارت کو مختلف بہانوں کے پردوں میں چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ سورۂ نمل میں اسی گروہ کا ذکر ہوا ہے وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ۱۴ (اور ان لوگوں نے ظلم اور گھمنڈ کے سبب سے ان نشانیوں کا انکار کیا حالانکہ ان کے دلوں نے ان کا یقین کر لیا تھا) اسی کے تحت وہ ایمان بھی ہے جو غرق ہوتے وقت فرعون لایا تھا۔

ہر چند اس کے ایمان میں ایمان کے تمام اجزا موجود تھے لیکن جو ایمان پانی سر سے گزر چکنے کے بعد لایا جائے اس ایمان کا دین میں کوئی درجہ نہیں ہے۔ آیت زیرِ بحث میں ہمارے نزدیک جیسا کہ ہم نے عرض کیا، ایمان سے مراد یقین ہے۔

'یُؤْمِنَنَّ بِہٖ' میں ضمیر کا مرجع

لَیُؤْمِنَنَّ بِہٖ اور قَبْلَ مَوْتِہٖ میں پہلی ضمیر کا مرجع ہمارے نزدیک قرآن مجید ہے اور دوسری کا مرجع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آج یہ اہل کتاب قرآن اور نبی کی صداقت تسلیم کرنے کے لیے یہ شرط ٹھہراتے ہیں کہ وہ آسمان سے کتاب اترتی ہوئی دکھائیں تب وہ یقین کریں گے کہ قرآن فی الواقع اللہ کی کتاب ہے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) واقعی اللہ کے رسول ہیں اور اس حیلے سے وہ ان تمام عقلی، نقلی، فطری اور تاریخی دلائل کو نظر انداز کر رہے ہیں جو قرآن اور پیغمبر کی صداقت کے ثبوت میں موجود ہیں لیکن وہ وقت بھی دور نہیں ہے جب یہ یہود اور نصاریٰ قرآن اور پیغمبر کی کہی ہوئی ایک ایک بات کو واقعات کی شکل میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے اور قرآن ان کے لیے جس رسوائی و نامرادی اور جس ذلت و شکست کی خبر دے رہا ہے وہ پیغمبر کے دنیا سے اٹھنے سے پہلے پہلے اس طرح ان کی آنکھوں کے سامنے آجائے گی کہ اس کو جھٹلانا ان کے لیے ممکن نہیں رہے گا اگرچہ ایمان کی سعادت ان کو یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد بھی حاصل نہیں ہوگی۔

یہ مجرد خبر نہیں بلکہ تہدید ہے

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ یہ جملہ قسمیہ ہے اس وجہ سے اس کو مجرد خبر یہ جملہ کے مفہوم میں لینا ٹھیک نہیں ہے۔ اس کا صرف یہ مفہوم نہیں ہے کہ پیغمبر کے دنیا سے اٹھنے سے پہلے پہلے یہ لوگ قرآن کا یقین کر لیں گے بلکہ اس کے اندر تہدید اور وعید بھی ہے۔ یعنی آج جو باتیں دلیل سے انھیں سمجھائی جا رہی ہیں لیکن ان کی سمجھ میں نہیں آرہی ہیں کل واقعات کی شکل میں جب ان کے سامنے آجائیں گی تب یہ کیا کریں گے، اس وقت تو انھیں ماننی ہی پڑیں گی اگرچہ وہ زبانوں سے لاکھ انکار کرتے رہیں۔

عکرمہ کی رائے

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ سلف میں سے عکرمہ پہلی ضمیر کا مرجع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مانتے ہیں لیکن عام طور پر لوگوں نے اس بُعد کے سبب سے جو ایک طویل جملہ معترضہ نے پیدا کر دیا ہے، اس قول کو اہمیت نہیں دی، حالانکہ جملہ معترضہ سے جو بُعد پیدا ہوتا ہے وہ قابل لحاظ نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں اس سے صرفِ نظر کر کے سلسلۂ کلام کو ملحوظ رکھنا پڑتا ہے۔

آنحضرت صلعم کی شہادت دنیا و آخرت دونوں میں

وَیَوْمَ الْقِیٰمَةِ یَكُوْنُ عَلَیْهِمْ شَهِیْدًا یہ اس شہادت کا ذکر ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم قیامت کے دن ان تمام لوگوں پر دیں گے جن پر آپ نے اس دنیا میں دینِ حق کی شہادت دی ہے۔ اس شہادت کا ذکر اسی سورہ کی آیت ۴۱ میں گزر چکا ہے اور وہاں ہم نے وضاحت کے ساتھ اس پر بحث کی ہے۔ یہ شہادت اگرچہ تمام انبیا اپنی اپنی امتوں پر دیں گے، چنانچہ حضرت مسیح جو شہادت دیں گے اس کا ذکر بھی مائدہ کی آیات ۱۱۷-۱۱۶ میں ہوا ہے لیکن آنحضرت صلعم چونکہ خاتم الانبیاء ہیں اور آپ نے یہود، نصاریٰ اور اہل عرب سب پر یہ واضح فرمایا ہے کہ اللہ کا اصل دین کیا ہے اس وجہ سے آپ ہی کا یہ منصب ہے کہ آپ قیامت کے دن یہ بتائیں کہ آپ نے لوگوں کو اللہ کی طرف سے کیا بتایا اور آپ کی اسی شہادت سے لوگوں پر حجت قائم ہوگی۔

یہ جملہ بھی ہمارے نزدیک اسی تہدید و وعید کا حامل ہے جس کا حامل پہلا جملہ ہے۔ یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت و حقانیت اس دنیا میں بھی ان اہل کتاب پر اس طرح واضح ہو جائے گی کہ ان کے لیے مجال انکار باقی نہ رہے گی اور آخرت میں بھی آپ شہادت دیں گے کہ یہود و نصاریٰ کی ایک ایک ضلالت پر آپ نے ان کو اچھی طرح متنبہ کر دیا تھا، ان تنبیہات کے بعد بھی اگر یہ اپنی انھی گمراہیوں میں پڑے رہے تو یہ ان کی اپنی ذمہ داری ہے، ان پر حجت تمام ہو چکی تھی۔

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِیْنَ ہَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَیْہِمْ طَیِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَہُمْ وَبِصَدِّہِمْ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ کَثِیْرًا ۙ وَّاَخْذِہِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُہُوْا عَنْہُ وَاَکْلِہِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ؕ وَاَعْتَدْنَا لِلْکٰفِرِیْنَ مِنْہُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا (۱۶۰-۱۶۱)

یہود پر جائز چیزوں کے حرام ہونے کی نوعیت

'فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِیْنَ ہَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَیْہِمْ' میں لفظ ظُلْم کی تقدم سے یہ مفہوم پیدا ہوتا ہے کہ وہ یہود پر حلال چیزیں جو حرام ہوئیں تو یہ بھی خود انھی کے اپنے نفس پر ظلم کرنے کے سبب سے حرام ہوئیں اللہ نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا۔ جائز چیزوں کے حرام کیے جانے کی ان کے ہاں جو صورتیں پیدا ہوئیں ان پر ہم بقرہ کی تفسیر میں بھی گفتگو کر چکے ہیں اور آل عمران کی آیت ۵۰ کے تحت بھی اس پر بحث ہو چکی ہے۔

سود کی حرمت کا حکم احبار میں

'وَّاَخْذِہِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُہُوْا عَنْہُ' سود کی حرمت کا صریح حکم احبار باب ۲۵: ۳۵-۳۸ میں ملاحظہ ہو۔

'وَاَکْلِہِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ' کے مفہوم پر اسی سورہ کی آیت ۲۹ کے تحت گفتگو ہو چکی ہے۔

یہود کے اصلی موانع ایمان

ان باتوں کا تعلق بھی یہود کی اسی فہرست جرائم سے ہے جو اوپر گزر چکی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن اور پیغمبر پر ایمان لانے میں ان کے لیے جو چیزیں مانع ہیں وہ دراصل ان کے یہ جرائم ہیں نہ یہ کہ تم ان کو آسمان سے کوئی صحیفہ اترتا ہوا نہیں دکھا رہے ہو۔ یہ ہمیشہ سے گردن کش اور نافرمان ہیں۔ انھوں نے اپنی گردن کشی ہی سے اپنے اوپر حلال چیزیں حرام کرائیں، اور اپنی گردن کشی ہی کے سبب سے ہمیشہ حق کی راہ میں روڑا بنے اور یہی چیز ہے جس نے ان کو آمادہ کیا کہ انھوں نے سود کو جائز کر لیا حالانکہ تورات میں ان کو صریح الفاظ میں اس کی ممانعت کی گئی تھی اور اسی کے سبب سے انھوں نے حرام خوری کے دوسرے تمام دروازے بھی کھول لیے حالانکہ یہ ان دروازوں کو بند کرنے پر مامور کیے گئے تھے۔ جن کا کردار یہ ہو ان سے کس طرح توقع کرتے ہو کہ وہ کوئی بڑے سے بڑا معجزہ دیکھ کر بھی قرآن پر ایمان لائیں گے۔ فرمایا کہ ان میں سے جتنے بھی کفر پر جم گئے ہیں، ہم نے ان کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

لٰکِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ مِنْہُمْ وَالْمُؤْمِنُوْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَاۤ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ وَالْمُقِیْمِیْنَ الصَّلٰوۃَ وَالْمُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ اُولٰٓئِکَ سَنُؤْتِیْہِمْ اَجْرًا عَظِیْمًا (۱۶۲)

راسخون فی العلم سے مراد اہل کتاب کے علمائے حقانی ہیں

'لٰکِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ مِنْہُمْ وَالْمُؤْمِنُوْنَ' 'رٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ' سے مراد وہ علما ہیں جن کے قدم علم شریعت میں خوب جمے ہوئے ہو جو عقیدہ اور عمل ہر چیز میں راسخ اور کردار و اخلاق ہر پہلو سے جادۂ مستقیم پر استوار تھے۔ یہود میں علما کم نہیں تھے، بے شمار تھے، لیکن شریعت ان کے لیے بس ایک نمائشی جامے

کی حیثیت رکھتی تھی جس کو چن کر وہ باہر بازاروں اور عوام میں نکلا کرتے۔ ان کے فکر و نظر اور ان کے قلب و روح سے اس علم کو کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ علماء ان تمام جرائم میں، جو اوپر مذکور ہوئے، اپنی قوم کے نہ صرف شریک تھے بلکہ وہی ان میں ان کے مرشد تھے اس وجہ سے ان سے تو اگر کسی چیز کی توقع کی جا سکتی تھی تو صرف اسی چیز کی کہ وہ قرآن اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں اپنی قوم کی پیشوائی کریں۔ البتہ ان میں جو نفوس قدسیہ حکمت دین کی لذت سے آشنا تھے ان کے قدم علم شریعت میں راسخ تھے۔ اس وجہ سے ان کو اپنی قوم کی متفقہ مخالفت کے طوفان کے مقابلے کے لیے کھڑے ہونے کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے توفیق ملی۔ یہاں انھی نفوس قدسیہ کو عام علمائے یہود سے ممتاز کرنے کے لیے علما کے بجائے 'رٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ' کے لقب سے مشرف فرمایا ہے۔ یعنی یہ آندھی کے خس و خاشاک کی طرح ہوا کے رخ پر اڑنے والے نہیں ہیں بلکہ چٹانوں کی طرح اپنے موقفِ حق پر جمنے والے ہیں۔

'وَالْمُؤْمِنُوْنَ' سے مراد سلیم الفطرت اور خدا ترس افراد ہیں

'اَلْمُؤْمِنُوْنَ' سے مراد وہ سلیم الفطرت لوگ ہیں جو اگرچہ رٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ کا درجہ تو نہیں رکھتے تھے لیکن اپنی فطرت کی سلامتی، دل کی صلاحیت اور کردار کی پاکیزگی کے اعتبار سے تمام سوسائٹی میں ممتاز تھے اور یہود کے عام بگاڑ کے باوجود وہ خدا کی ہدایت و شریعت پر قائم رہے اور جب اسلام کی دعوت ان کے کانوں میں پڑی تو وہ اس کو بھی قبول کرنے کے لیے آگے بڑھے۔

'یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ' یہ خبر ہے۔ یعنی یہ راسخین فی العلم علماء اور سلیم الفطرت لوگ اس قرآن پر بھی ایمان لاتے ہیں اور اس سے پہلے کی کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔ اہل کتاب کا یہی گروہ ہے جس کی تعریف جگہ جگہ قرآن نے فرمائی ہے۔ آل عمران کی آیت ۱۱۳ کے تحت بھی اس گروہ کا ذکر گزر چکا ہے۔

'وَالْمُقِیْمِیْنَ الصَّلٰوۃَ' کا اسلوب اور اس کے فوائد

'وَالْمُقِیْمِیْنَ الصَّلٰوۃَ' عطف تو ہے 'اَلْمُؤْمِنُوْنَ' پر لیکن یہ منصوب ہو گیا ہے فصیح عربی کے اس قاعدے کے مطابق جس کو ہمارے اہل نحو 'علیٰ سبیل الاختصاص' یا 'علیٰ سبیل مدح' کی اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں۔ شعرائے عرب کے کلام میں اس کی مثالیں کثرت سے موجود ہیں۔ اسلوب کی اس تبدیلی کا لفظی اثر تو سامع پر یہ پڑتا ہے کہ یہ تنوع اس کو لفظ پر متوجہ کر دیتا ہے اور معنوی فائدہ یہ ہوتا ہے کہ محض اسلوب کی تبدیلی سے، بغیر ایک حرف کے اضافے کے، اس کے اندر اختصاص اور مدح و تعریف کا مضمون پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً یہی لفظ اپنے عام اسلوب کے مطابق 'وَالْمُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ' ہوتا تو اس کے معنی صرف یہ ہوتے کہ "اور نماز کے قائم کرنے والے" لیکن جب اسلوب بدل کر 'اَلْمُقِیْمِیْنَ الصَّلٰوۃَ' کہہ دیا تو اس کے معنی یہ ہو گئے کہ "اور خاص کر نماز کو قائم کرنے والے" جس سے ان موصوفین کی غیر معمولی تعریف اور ان کی خصوصیت بھی واضح ہوئی اور نماز کی وہ اہمیت و عظمت بھی جو دین کے نظام میں اس کو حاصل ہے۔ اس اسلوب کی ایک نہایت عمدہ مثال سورۂ بقرہ میں بھی گزر چکی ہے۔ وہاں فرمایا ہے۔ 'وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ' ۱۷۷۔ بقرہ (اور اپنے عہد کو پورا کرنے والے جب کہ عہد کر بیٹھیں اور خاص کر وہ لوگ جو ثابت قدم رہنے والے ہیں فقر و فاقہ، جسمانی تکالیف اور جنگ کی آزمائشوں میں)۔ یہاں بھی دیکھ لیجیے 'وَالصّٰبِرِیْنَ' معطوف تو ہے

'وَالْمُوْفُوْنَ' پر، اس اعتبار سے اس کو 'وَالصّٰبِرُوْنَ' ہونا تھا لیکن اسی قاعدے کے مطابق جس کا ہم نے اوپر حوالہ دیا 'الصّٰبِرِيْنَ' ہو گیا۔

شریعت میں صبر اور نماز کا درجہ

یہاں حکمتِ دین کے اس رمز کو سمجھنے کے لیے کہ شریعت میں صبر اور نماز کا کیا درجہ ہے آیت اِسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ الآیہ کی تفسیر، جو بقرہ میں گزر چکی ہے، پڑھیے تاکہ بات اچھی طرح سمجھ میں آ جائے کہ ان دونوں چیزوں کے اس اہتمام و تاکید کے ساتھ ذکر کرنے کی کیا وجہ ہے۔ جہاں تک صبر کا تعلق ہے یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ جس شخص کے اندر صبر کی صفت نہ ہو اس کے دین کی عمارت تمام تر ریت پر ہے، وہ کسی بھی جھٹکے سے آسانی سے گر سکتی ہے۔ رہی نماز تو درحقیقت یہی وہ چیز ہے جو اس عہد کی برابر یاد دہانی کرتی ہے جو بندہ اپنے رب سے کرتا ہے اس وجہ سے جو شخص اس کو ضائع کر دے گا وہ بالآخر پورے دین کو ضائع کر بیٹھے گا۔ یہود کے متعلق قرآن میں بیان ہوا ہے کہ انھوں نے نماز بالکل ضائع کر دی تھی (اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ ۵۹۔ مریم) جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پورے دین ہی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ان میں سے صرف وہی لوگ دین پر قائم رہے جو نماز پر قائم رہے اور یہی لوگ ہیں جو بالآخر اسلام کی دعوت قبول کرنے والے بھی بنے۔ اسی گروہ کا ذکر آلِ عمران میں اس طرح ہوا ہے۔ لَيْسُوْا سَوَآءً مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ ۱۱۳ (سب اہلِ کتاب یکساں نہیں ہیں۔ ان میں ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی ہے جو دین پر قائم ہیں، شب کے وقتوں میں آیاتِ الٰہی کی تلاوت کرتے اور سجدہ کرتے ہیں) 'وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ'، بالکل بقرہ کی آیت ۴ 'وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ' کی طرح ہے۔ جس طرح وہاں 'يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ' اور دوسری صفات کے ذکر کے بعد بظاہر اس ٹکڑے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی لیکن یقینِ آخرت کو، جو تمام خیر و تقویٰ کا اصل محرک ہے، نمایاں کرنے کے لیے اس کا ذکر فرمایا اسی طرح یہاں بھی بظاہر 'وَالْمُؤْمِنُوْنَ' کے بعد دوبارہ اس کے اعادے کی ضرورت نہیں تھی لیکن آخرت کی تذکیر کے لیے اس کا اعادہ فرمایا اس لیے کہ دین میں تمام زندگی اور حرکت آخرت پر ایمان ہی سے ہے۔

۴۲۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۶۳-۱۷۵

آگے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے پہلے تسلی دی ہے کہ تم ان مخالفوں کی کوئی پروا نہ کرو جو آج تم پر نازل شدہ وحی کو نہیں مانتے بلکہ آسمان سے اتری ہوئی کھلی کتاب کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ نہ وحی دنیا میں ایسی انجانی چیز ہے جس کا تجربہ دنیا میں کبھی کہ ہوا ہو اور نہ نبوت و رسالت ایسی اجنبی چیز ہے جس کا اظہار تمہی نے کیا ہو۔ وحی بھی دنیا میں تم سے پہلے آ چکی ہے اور رسول بھی بے شمار آ چکے ہیں، اگر ایک ایسی جانی پہچانی ہوئی چیز سے لوگ بھڑکتے ہیں اور جس کے جانچنے اور پرکھنے کے لیے اتنے معیارات اور اتنی کسوٹیاں موجود ہیں لوگ اس کو پہچاننے سے انکار کر رہے ہیں تو قصور تمہارا نہیں بلکہ خود انھی کا ہے۔ تمہارے اطمینان

کے لیے تو یہ چیز بس کرتی ہے کہ اللہ اور اس کے فرشتوں کی شہادت تمھارے حق میں ہے۔ رہے یہ لوگ جو کفر اور مخالفت پر اڑ گئے ہیں تو انھوں نے خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے ہیں اور اس کے سبب سے اب یہ اس قابل نہیں رہ گئے ہیں کہ ان کے لیے ایمان و ہدایت کی راہ کھلے۔ اب تو ان کے لیے صرف جہنم کی راہ باقی رہ گئی ہے۔

اس کے بعد لوگوں کو عام طور پر اور نصاریٰ کو خاص طور پر خطاب کر کے تنبیہ فرمائی ہے کہ اللہ نے قرآن کی شکل میں جو نور مبین خلق کی رہنمائی کے لیے اتارا ہے اس کی قدر کرو اور ضلالت کی راہ چھوڑ کر ہدایت کی راہ پر آجاؤ ورنہ یاد رکھو کہ جو لوگ اس سے اعراض و انکار کریں گے وہ بڑے ہی دردناک عذاب سے دوچار ہوں گے ـــــ اب آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۶۳-۱۷۵

إِنَّآ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ كَمَآ أَوْحَيْنَآ إِلَىٰ نُوحٍ وَٱلنَّبِيِّـۧنَ مِنۢ بَعْدِهِۦ ۚ وَأَوْحَيْنَآ إِلَىٰٓ إِبْرَٰهِيمَ وَإِسْمَٰعِيلَ وَإِسْحَٰقَ وَيَعْقُوبَ وَٱلْأَسْبَاطِ وَعِيسَىٰ وَأَيُّوبَ وَيُونُسَ وَهَٰرُونَ وَسُلَيْمَٰنَ ۚ وَءَاتَيْنَا دَاوُۥدَ زَبُورًا ﴿١٦٣﴾ وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنَٰهُمْ عَلَيْكَ مِن قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ۚ وَكَلَّمَ ٱللَّهُ مُوسَىٰ تَكْلِيمًا ﴿١٦٤﴾ رُّسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى ٱللَّهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ ٱلرُّسُلِ ۚ وَكَانَ ٱللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ﴿١٦٥﴾ لَّٰكِنِ ٱللَّهُ يَشْهَدُ بِمَآ أَنزَلَ إِلَيْكَ ۖ أَنزَلَهُۥ بِعِلْمِهِۦ ۖ وَٱلْمَلَٰٓئِكَةُ يَشْهَدُونَ ۚ وَكَفَىٰ بِٱللَّهِ شَهِيدًا ﴿١٦٦﴾ إِنَّ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ وَصَدُّوا۟ عَن سَبِيلِ ٱللَّهِ قَدْ ضَلُّوا۟ ضَلَٰلًۢا بَعِيدًا ﴿١٦٧﴾ إِنَّ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ وَظَلَمُوا۟ لَمْ يَكُنِ ٱللَّهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيقًا ﴿١٦٨﴾ إِلَّا طَرِيقَ جَهَنَّمَ خَٰلِدِينَ فِيهَآ أَبَدًا ۚ وَكَانَ ذَٰلِكَ عَلَى ٱللَّهِ يَسِيرًا ﴿١٦٩﴾ يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ ٱلرَّسُولُ بِٱلْحَقِّ مِن رَّبِّكُمْ فَـَٔامِنُوا۟ خَيْرًا لَّكُمْ ۚ وَإِن تَكْفُرُوا۟ فَإِنَّ لِلَّهِ مَا فِى ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ ۚ وَكَانَ ٱللَّهُ عَلِيمًا

حَكِيْمًا ﴿۱۷۰﴾ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا
الْحَقَّ ۭ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰىهَآ
اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ ۡ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ڟ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ۭ
اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ۭ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۭ سُبْحٰنَهٗٓ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ
وَلَدٌ ۘ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۱۷۱﴾ لَنْ
يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰۗىِٕكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ۭ
وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ
جَمِيْعًا ﴿۱۷۲﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ
اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا
وَاسْتَكْبَرُوْا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ڏ وَّلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ
اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۱۷۳﴾ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاۗءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ
رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا ﴿۱۷۴﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ
وَاعْتَصَمُوْا بِهٖ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِيْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ ۙ وَّيَهْدِيْهِمْ
اِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿۱۷۵﴾

ترجمۂ آیات ۱۶۳-۱۷۵

ہم نے تمھاری طرف اسی طرح وحی کی ہے جس طرح نوح اور اس کے بعد آنے والے نبیوں کی طرف وحی کی اور ہم نے ابراہیم، اسمٰعیل، اسحٰق، یعقوب، اولادِ یعقوب، عیسٰی، ایوب، یونس، ہارون اور سلیمان پر وحی بھیجی۔ اور ہم نے داؤد کو زبور عطا کی اور دوسرے بھی بہت سے رسولوں پر وحی بھیجی جن کا حال ہم تم کو پہلے سنا چکے ہیں اور بہت سے رسولوں کا حال

نہیں سنایا اور موسیٰ سے تو اللہ نے کلام کیا۔ اللہ نے رسولوں کو خوشخبری دینے والے اور ہوشیار کرنے والے بنا کر بھیجا تاکہ ان رسولوں کے بعد لوگوں کے لیے اللہ کے سامنے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے۔ اللہ غالب اور حکیم ہے۔ ۱۶۳-۱۶۵

پر اللہ گواہی دیتا ہے اس چیز کی جو اس نے تم پر نازل کی ہے۔ اس نے اس کو اپنے علم کے ساتھ نازل کیا ہے اور فرشتے بھی گواہی دیتے ہیں اور گواہی کو تو اللہ ہی کافی ہے بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کے راستے سے روکا وہ بہت دور کی گمراہی میں جا پڑے۔ جن لوگوں نے کفر کیا اور اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے ان کو تو خدا نہ بخشنے کا ہے اور نہ جہنم کے سوا جس میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے، ان کو کوئی اور رستہ دکھانے کا ہے اور اللہ کے لیے یہ بات آسان ہے۔ ۱۶۶-۱۶۹

اے لوگو، رسول تمہارے پاس تمہارے رب کے پاس سے حق لے کر آ گیا ہے۔ پس ایمان لاؤ، اسی میں تمہاری بہتری ہے اور اگر کفر پر جمے رہو گے تو یاد رکھو کہ اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے۔ اے اہل کتاب اپنے دین میں غلو نہ کرو اور اللہ پر حق کے سوا کوئی اور بات نہ ڈالو۔ مسیح عیسیٰ ابن مریم تو بس اللہ کے ایک رسول اور اس کا ایک کلمہ ہیں جس کو اس نے مریم کی طرف القا فرمایا اور اس کی جانب سے ایک روح ہیں۔ پس اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور تثلیث کا دعویٰ نہ کرو۔ باز آ جاؤ۔ یہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔ معبود تو بس تنہا اللہ ہی ہے۔ وہ اس سے پاک ہے کہ اس کے اولاد ہو، اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ کارساز بس ہے اور مسیح کو ہرگز اللہ کا بندہ بننے سے عار نہ ہوگا اور نہ مقرب فرشتوں کو عار ہوگا اور جو اللہ کی بندگی سے عار کرے گا اور تکبر کرے گا

تو اللہ ان سب کو اپنے پاس اکٹھا کرے گا۔ پس جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے ہوں گے تو ان کو تو ان کا پورا پورا اجر بھی دے گا اور اپنے فضل میں سے بھی ان کو مزید بخشے گا اور جنھوں نے عار اور تکبر کیا ہو گا ان کو دردناک عذاب دے گا اور وہ اللہ کے بالمقابل نہ کسی کو اپنا دوست پائیں گے نہ مددگار۔ ۱۷۰-۱۷۳

اے لوگو، تمھارے پاس تمھارے رب کی جانب سے ایک حجت آچکی ہے اور ہم نے تمھاری طرف ایک نورِ مبین اُتار دیا تو جو لوگ اللہ پر ایمان لائے اور اس کو اُنھوں نے مضبوطی سے پکڑ لیا ان کو وہ اپنی رحمت اور اپنے فضل میں داخل کرے گا اور انھیں اپنی طرف سیدھی راہ کی ہدایت بخشے گا۔ ۱۷۴-۱۷۵

۴۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَعِيْسٰى وَاَيُّوْبَ وَيُوْنُسَ وَهٰرُوْنَ وَسُلَيْمٰنَ ۚ وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ۚ وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ۭ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا (۱۶۳-۱۶۴)

لفظ 'اسباط' پر سورۂ بقرہ میں بحث گزر چکی ہے۔

زبور — 'زبور' کے نام سے ایک صحیفہ حضرت داؤد کی دعاؤں اور مناجاتوں پر مشتمل تورات کے مجموعہ میں شامل ہے۔ قرآن میں اس کا نام معرفہ کی شکل میں بھی آیا ہے۔ یہاں نکرہ کی صورت میں میرے نزدیک تفخیم شان کے لیے ہے جس سے زبور کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ اگرچہ موجودہ زبور کو تورات کے دوسرے صحیفوں ہی کے درجے میں رکھنا صحیح ہے۔ اس میں ترجمہ کے نقائص بھی ہیں اور کمی بیشی کا بھی خاصا امکان ہے تاہم اس کو پڑھیے تو سینہ ایمان و توکل کے نور سے لبریز ہو جاتا ہے۔

حضرت موسیٰ سے مکالمۂ الٰہی کی نوعیت — 'وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا' پر ہم دوسرے مقام میں گفتگو کر چکے ہیں۔ تورات اور قرآن دونوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے خاص خطاب و کلام سے نوازا ہے اور اس خطاب و کلام کی شان اس وحی سے مختلف تھی جس سے دوسرے انبیا مشرف ہوئے

ہیں۔ اگرچہ قرآن اور تورات دونوں سے ثابت ہے کہ یہ خطاب و کلام بھی خدا سے رو در رو نہیں بلکہ من وراء حجاب، یعنی پردے کی اوٹ ہی سے تھا۔

انبیاء کے ناموں میں ترتیب کی نوعیت

یہاں حضرات انبیا کے جو نام گنائے گئے ہیں ان کی ترتیب حضرت نوح سے لے کر حضرت یعقوبؑ اور ان کی اولاد کے ذکر تک تو تاریخی ہے لیکن اس کے بعد ترتیب صفاتی ہو گئی ہے۔ حضرت عیسٰیؑ، حضرت ایوبؑ، حضرت یونسؑ، حضرت ہارونؑ اپنے خاص نوع کے ابتلا اور خاص نوع کی تائیدالٰہی میں فی الجملہ اشتراک رکھتے ہیں۔ حضرت سلیمانؑ اور حضرت داؤدؑ دونوں نبی بھی ہیں اور دونوں بادشاہ بھی۔ حضرت داؤد علیہ السلام کا ذکر حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد لانے کی وجہ خاص اہتمام کے ساتھ زبور کی طرف توجہ دلانا ہے۔ سب سے آخر میں حضرت موسٰیؑ کا ذکر ہے اس لیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت موسٰیؑ مماثل نبی ہیں۔ اس بات کا ذکر قرآن اور احادیث دونوں میں ہے۔

انبیاء کے ذکر سے مقصود

یہاں اگرچہ تمام انبیا کا ذکر نہیں ہوا ہے لیکن ان کے اندر اشتراک کے ساتھ ساتھ باعتبارِ صفات جو تنوع ہے وہ بھی نمایاں ہو گیا ہے اور باعتبار وحی و خطاب اور کلام ان میں سے اگر کسی کو کوئی اختصاص و امتیاز حاصل ہوا ہے تو وہ بھی سامنے آگیا ہے۔ اس تمام حوالے سے قرآن کا مقصود یہ ہے کہ یہ انبیاء ہیں جن کے نام اور کام تورات کے صحیفوں میں بھی بیان ہوئے ہیں اور یہ طریقہ رہا ہے جس طریقہ پر اللہ نے ان نبیوں کو اپنی وحی اور اپنے خطاب و کلام سے نوازا ہے[1] ان سب سے اہل کتاب واقف ہیں، بھلا ہے اس میں کہیں ذکر اس بات کا کہ اللہ نے کسی نبی پر اس طرح کتاب اتاری ہو کہ اس کو اترتے سب نے دیکھا ہو؟ موسٰیؑ سے بے شک اللہ تعالیٰ نے کلام کیا، جس طرح کلام کیا جاتا ہے، لیکن ان یہود کا اطمینان اس سے بھی نہ ہوا۔ انھوں نے اس پر بھی یہ شبہ وارد کر دیا کہ جب تک خدا ہم سے رُو در رُو ہو کر کلام نہ کرے ہم کس طرح باور کریں کہ وہ تم سے کلام کرتا ہے۔ شک کے ایسے مریضوں کا کیا علاج؟

ان آیات میں استدلال کا پہلو

ان آیات میں استدلال کا پہلو جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، یہ ہے کہ اگر وحی کوئی ایسی چیز ہوتی جس کا تجربہ تنہا تمھی نے پیش کیا ہوتا اور نبوت و رسالت کوئی ایسی چیز ہوتی جس کا دعویٰ دنیا میں اکیلے تمھی نے کیا ہوتا تب تو ایک حد تک گنجائش تھی کہ ان لوگوں کو معذور خیال کیا جائے جو تمھارے دعوے پر اضطراب کا اظہار کریں اور اس انوکھے دعوے کو اس وقت تک تسلیم نہ کریں جب تک ہر پہلو سے اپنا اطمینان نہ کرلیں لیکن جب انبیاء کا ایک طویل سلسلہ موجود ہے اور ان پر جن شکلوں میں اور جن باتوں کی وحی آئی ان کے بھی دفاتر موجود ہیں تو ان لوگوں کی طرف سے تمھاری صداقت کے ثبوت کے لیے ایسے بے سروپا مطالبات کے کیا معنی جو ان تمام رسولوں اور نبیوں کے نام لیوا بھی ہیں اور ان تمام کتابوں کے حامل ہونے کے مدعی بھی

---

[1] وحی کی حقیقت اور اس کے اقسام پر ان شاءاللہ ہم سورۂ شوریٰ میں بحث کریں گے۔

جو ان انبیا پر نازل ہوئیں جس طرح ہر گروہ کی کچھ مشترک خصوصیات و صفات ہوتی ہیں اسی طرح انبیا کے گروہ کی بھی مشترک خصوصیات و صفات ہیں اور یہ ایسی نمایاں ہیں کہ ان کے حامل تمام دنیا سے الگ نظر آتے ہیں۔ نہ تو یہ ممکن ہے کہ کوئی جھوٹا مدعی ان کے اندر داخل ہو سکے اور نہ اس کا امکان ہے کہ جو ان کے اندر شامل ہو اس کو ان کے زمرے سے الگ کیا جا سکے۔

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا (۱۶۵)

رُسُلًا، فعل محذوف سے منصوب بھی ہو سکتا ہے اور بدل بھی ہو سکتا ہے۔ دونوں ہی شکلوں میں معنی کے لحاظ سے کوئی خاص فرق نہیں ہوگا۔

انبیا کا مشترک مشن

اس آیت میں رسولوں کا مشترک مشن بھی بتا دیا اور وہ ضرورت بھی جو ان کے بھیجنے کی داعی ہوئی۔ ان کا مشترک مشن لوگوں کو بشارت دینا اور خطرے سے آگاہ کرنا ہے۔ بشارت اس بات کی کہ جو لوگ ایمان و عمل صالح کی زندگی اختیار کریں گے ان کے لیے ابدی زندگی کی خوشیاں اور کامرانیاں ہیں۔ آگاہی اس بات کی کہ جو لوگ کفر اور بدعملی کی راہ اختیار کریں گے ان کے لیے دائمی عذاب نار ہے۔

انبیا کی بعثت کی ضرورت

اس کی ضرورت یہ بتائی کہ لوگوں پر اللہ کی حجت تمام ہو جائے۔ یہ کہنے کا موقع کسی کے لیے باقی نہ رہے کہ ان کے پاس اس خطرے سے آگاہ کرنے والا کوئی نہیں آیا ورنہ وہ ہرگز کفر و بدعملی کی راہ نہ اختیار کرتے۔ اگرچہ خدا عزیز ہے، وہ انبیا کے بھیجے بغیر بھی لوگوں کو ان کی نافرمانیوں پر سزا دیتا تو کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں تھا لیکن وہ حکیم بھی ہے، اس کی حکمت کا تقاضا یہ ہوا کہ وہ کسی کو سزا دے تو اتمام حجت کے بعد ہی دے۔ یہ حجت رسولوں کے آنے کے بعد پوری ہو گئی۔ عقل و فطرت کی جو شہادت ایمان باللہ، ایمان بالآخرت، اور نیکی اور عدل سے محبت، ظلم و گناہ سے نفرت کی انسان کے اندر ودیعت تھی وہ ان انبیا نے پوری طرح آشکارا کر دی۔ ان کے جو تقاضے ہو سکتے تھے وہ بھی پوری تفصیل سے بیان کر دیے۔ اب اگر کوئی ٹھوکر کھاتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ دونوں آنکھیں رکھتے ہوئے پورے دن کی روشنی میں ٹھوکر کھاتا ہے۔

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ انسانی فطرت خیر و شر کے شعور سے محروم نہیں ہے اور نہ عقل حق و باطل میں امتیاز سے قاصر ہے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے احسن تقویم پر پیدا کیا ہے اور اس کو خیر و شر کی معرفت بخشی ہے لیکن اس کی رحمت کا تقاضا یہ ہوا کہ وہ عقل و فطرت کی رہنمائی کے ساتھ وحی اور انبیا کی رہنمائی سے بھی اس کو نوازے تاکہ عقل و فطرت کے تقاضے اس کے سامنے بالکل مبرہن ہو کر آ جائیں اور گمراہی کے لیے ادنیٰ عذر بھی باقی نہ رہ جائے۔

لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَشْهَدُوْنَ ۚ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۞ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلًا بَعِيْدًا ۞ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا ۞ اِلَّا طَرِيْقَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۚ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى

اللّٰہِ یَسِیْرًا (۱۶۶ - ۱۶۹)

استدراک کا پہلو

حرف 'لٰکِنْ' استدراک کے لیے آتا ہے۔ یہ استدراک اس بات پر ہے جو اوپر والے ٹکڑے سے نکلتی ہے۔ اوپر انبیا کے سلسلے اور ان کی طرف وحی بھیجے جانے کا تفصیل کے ساتھ جو حوالہ دیا ہے اس سے مقصود، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، اہل کتاب کے مکذبین پر یہ واضح کرنا تھا کہ جو حقیقت ایسی جانی پہچانی ہوئی ہے، جس کو پرکھنے اور جانچنے کے لیے اتنے معیارات اور اتنی کسوٹیاں موجود ہیں، اگر یہ اس کو جھٹلاتے ہیں تو بس ان کی شامت ہی آئی ہوئی ہے۔

اس کے بعد اس پر استدراک کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر یہ جھٹلاتے ہیں تو جھٹلائیں اللہ تو اس چیز کی گواہی دیتا ہے جو اس نے تمھاری طرف اتاری ہے۔ یعنی اس بات کی گواہی کہ یہ من جانب اللہ ہے، اس میں نفس اور شیطان کو کوئی دخل نہیں ہے، اللہ نے اس کو اپنے علم کے ساتھ اتارا ہے، اس میں کسی وسوسۂ نفسانی یا کسی دخل شیطانی کی کوئی آمیزش نہیں ہے، اس کا تعلق علمِ الٰہی کے پاک سرچشمہ سے ہے اور یہ آبِ حیات کی طرح بالکل خالص اور بے آمیز ہے۔ مزید فرمایا کہ اس کے حق میں گواہی تو اللہ ہی کی کافی ہے لیکن اللہ کے ساتھ فرشتے بھی اس کے گواہ ہیں۔

یہ کلام پیغمبر کی تسلی کے لیے ہے

یہ ارشاد، جیسا کہ واضح ہے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لیے ہے کہ یہ مخالفین تمھاری وحی کو وحی نہیں مانتے تو نہ مانیں، اس کی صحت و صداقت ان کے ماننے نہ ماننے پر منحصر نہیں ہے۔ تمھارے اطمینان کے لیے یہ بس ہے کہ خدا اور فرشتے اس کے گواہ ہیں۔ تم جس بزم قدس سے وابستہ ہو تمھارے لیے سند ان کی سند ہے نہ کہ ان محروم القسمت لوگوں کی جو گہر اور پتھر میں امتیاز سے قاصر ہیں۔ یہ لوگ تو حق سے دور ہوتے ہوتے اتنے دور ہو چکے ہیں کہ اب ان کے لیے راہ حق کی طرف مڑنے کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہا ہے۔ اُنھوں نے اپنے کفر اور اپنی جانوں پر خود اپنے ہاتھوں ظلم سے اپنے آپ کو اس قابل ہی نہیں چھوڑا ہے کہ خدا ان کی مغفرت فرمائے یا جہنم کے راستے کے سوا کوئی اور راہ ان کو دکھائے۔ اب یہ جہنم ہی میں ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔ اور خدا کے لیے یہ معاملہ بہت آسان ہے۔ اس نے ان پر حجت تمام کر دی، اب یہ چیز ذرا بھی اس پر شاق نہیں گزرے گی کہ یہ جہنم میں پڑیں اور اس میں ہمیشہ رہیں۔ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا کے ٹکڑے پر ہم دوسری جگہ بھی بحث کر چکے ہیں۔

نبی کی صداقت کی ایک باطنی دلیل

یہ کلام اگرچہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، تسلی کے محل میں ہے لیکن یہ وحی کی صداقت کی ایک دلیل بھی ہے جس کا تعلق پیغمبر کی ذات سے ہے۔ اوپر وحی کی صداقت کی جو دلیل بیان ہوئی ہے اس کی نوعیت تاریخی شہادت کی ہے۔ یعنی انبیا کی تاریخ اور ان کی وحی کی کسوٹی پر جانچ کر قرآن اور پیغمبر کا درجہ متعین کیا گیا ہے۔ اب یہ ایک دوسری دلیل بیان ہوئی ہے جس کی نوعیت ایک باطنی دلیل کی ہے۔ اس کا مدعا یہ ہے کہ پیغمبر اپنے باطن میں خدا اور فرشتوں کی شہادت اس طرح سنتا سمجھتا اور پرکھتا ہے کہ اس کے

لیے اپنی وحی کی صداقت پر کسی شبہے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اس طرح کی شہادت کسی غیر نبی کو حاصل نہیں ہوتی اس وجہ سے کسی غیر نبی کے الہام اور نبی کی وحی میں آسمان و زمین کا فرق ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص اپنی جس کیفیت کو الہام سمجھ رہا ہے وہ محض ایک وسوسۂ نفسانی یا شیطانی ہو لیکن پیغمبر پر وحی جس افق سے آتی ہے، جس زور و قوت کے ساتھ آتی ہے اور ماللہ اور ملائکہ کی جس تائید و شہادت کے ساتھ آتی ہے وہ بجائے خود ایک ایسی برہان ہوتی ہے جس کے بعد کسی شبہے کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ وحی کی صداقت کا یہی پہلو ہے جس کی وجہ سے ساری خدائی بھی نبی کی تکذیب کرے تب بھی اس کے اعتماد میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا۔ اس کی بزم و انجمن اس کے باطن کے اندر ہوتی ہے جہاں اس کو خدا اور روح القدس کی معیت حاصل ہوتی ہے۔ اس مسئلے پر مزید بحث انشاءاللہ ہم سورۂ تحریم میں کریں گے۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ قَدۡ جَآءَكُمُ ٱلرَّسُولُ بِٱلۡحَقِّ مِن رَّبِّكُمۡ فَـَٔامِنُواْ خَيۡرٗا لَّكُمۡۚ وَإِن تَكۡفُرُواْ فَإِنَّ لِلَّهِ مَا فِي ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلۡأَرۡضِۚ وَكَانَ ٱللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمٗا (۱۷۰)

ایک عام تبیر میں روئے سخن عیسائیوں کی طرف ہے

خطاب اگرچہ عام ہے لیکن آگے والی آیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ روئے سخن اہل کتاب بالخصوص نصاریٰ کی طرف ہے۔ فرمایا کہ اے لوگو، اللہ کا رسول تمہارے پاس حق لے کر آگیا ہے۔ اللہ کے دین میں تم نے جو ملاوٹیں کر دی تھیں اور جن کے سبب سے یہ معلوم کرنا ناممکن ہو گیا تھا کہ حق کیا ہے، اب ان تمام ملاوٹوں سے پاک ہو کر دین از سر نو اپنی کامل شکل میں تمہارے پاس آگیا ہے۔ اس پر ایمان لاؤ، اس میں تمہاری ہی بہتری ہے۔ اگر تم اس کا انکار کرو گے تو یاد رکھو کہ خدا کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ تمہارا ہی بگڑے گا۔ خدا تو سب سے بے نیاز ہے۔ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے اسی کا ہے۔ سب اس کے قابو میں ہیں اور وہ ہر ایک کے اعمال سے واقف ہے، وہ ہر نفس کو اس کے اعمال کی جزا دے گا۔ اگر یہ چیز آج ٹل رہی ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ جزا ہے ہی نہیں۔ بلکہ یہ اس کی حکمت کے تحت ٹل رہی ہے، خدا حکیم بھی ہے۔

يَٰٓأَهۡلَ ٱلۡكِتَٰبِ لَا تَغۡلُواْ فِي دِينِكُمۡ وَلَا تَقُولُواْ عَلَى ٱللَّهِ إِلَّا ٱلۡحَقَّۚ إِنَّمَا ٱلۡمَسِيحُ عِيسَى ٱبۡنُ مَرۡيَمَ رَسُولُ ٱللَّهِ وَكَلِمَتُهُۥٓ أَلۡقَىٰهَآ إِلَىٰ مَرۡيَمَ وَرُوحٞ مِّنۡهُۖ فَـَٔامِنُواْ بِٱللَّهِ وَرُسُلِهِۦۖ وَلَا تَقُولُواْ ثَلَٰثَةٌۚ ٱنتَهُواْ خَيۡرٗا لَّكُمۡۚ إِنَّمَا ٱللَّهُ إِلَٰهٞ وَٰحِدٞۖ سُبۡحَٰنَهُۥٓ أَن يَكُونَ لَهُۥ وَلَدٞۘ لَّهُۥ مَا فِي ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَمَا فِي ٱلۡأَرۡضِۗ وَكَفَىٰ بِٱللَّهِ وَكِيلٗا (۱۷۱)

غلو کا مفہوم

'لَا تَغۡلُواْ فِي دِينِكُمۡ'، 'غَلَا يَغۡلُو' کے معنی بڑھنے، زیادہ ہونے، متجاوز ہونے کے ہیں۔ جب یہ لفظ دین کے تعلق سے آئے تو اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ دین میں جس چیز کا جو درجہ، مرتبہ یا جو وزن و مقام ہے اس کو بڑھا کر کچھ سے کچھ کر دیا جائے۔ جو چیز پاؤ سیر ہے وہ من بھر کر دی جائے، جو حکم صرف استحباب و استحسان کا درجہ رکھتا ہے اس کو فرض اور واجب کا درجہ دے دیا جائے، جو شخص ایک فقیہ یا مجتہد یا

صحابی ہے اس کو امام معصوم بنا دیا جائے، جس کو اللہ نے نبی اور رسول بنایا اس کو شریکِ خدا یا خدا بنا ڈالا جائے، جس کی صرف تعظیم مطلوب ہے اس کی عبادت شروع کر دی جائے۔ یہ اور اس قبیل کی ساری باتیں غلو میں داخل ہیں اور جس طرح مذہب کے معاملات میں تفریط بہت بڑا جرم ہے، اسی طرح یہ افراط بھی بہت بڑا فتنہ ہے۔ اس سے مذہب کا وہ مزاج، جو سرتاسر اعتدال ہے، بالکل درہم برہم ہو جاتا ہے اور اس کی وہ خدائی ترکیب و تالیف جو اس کے اجزا کو حسن و جمال کا ایک دلآویز پیکر بناتی ہے بالکل مسخ ہو جاتی ہے۔ یوں تو اس غلو میں تمام اہل مذاہب مبتلا ہوئے ہیں، یہاں تک کہ ہم مسلمان بھی، جن کو عدل و قسط پر قائم رہنے کی سب سے زیادہ تاکید ہوئی ہے، اس فتنے میں مبتلا ہو گئے لیکن نصاریٰ کو تو یوں سمجھئے کہ اس فساد میں امامت کا درجہ حاصل ہے۔ ان کی اصلی بیماری یہی ہے کہ انھوں نے اپنے اس غلو کے سبب سے پورے دین کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کے بندے اور اس کے رسول تھے۔ ان کو انھوں نے خدا کا بیٹا بنایا اور پھر ان کو لے جا کر خدائی کے عرش پر بٹھا دیا، حضرت مریم، حضرت عیسیٰؑ کی والدہ تھیں، ان کو نعوذ باللہ خدا کی ماں بنایا، حضرت جبریلؑ خدا کے بندے اور فرشتے ہیں ان کو بھی ایک اقنوم کی حیثیت دے کر خدائی کی تثلیث میں شریک کر دیا، سیدنا مسیح نے دنیا اور دنیوی زندگی کے زخارف سے بچتے رہنے کی تاکید فرمائی تو انھوں نے رہبانیت کا ایک پورا نظام کھڑا کر دیا۔ غرض اس غلو کے ہاتھوں انھوں نے مذہب کی کوئی چیز بھی ایسی نہیں چھوڑی جو اپنی جگہ پر برقرار رہ گئی ہو۔ فرش کی چیز عرش پر پہنچ گئی اور عرش کی چیز فرش پر آ رہی۔

غلو کے فتنہ کا راستہ

لَا تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰہِ اِلَّا الْحَقَّ: دین میں غلو کا فتنہ جس راہ سے پیدا ہوتا ہے اور پھر اس کی تائید و تقویت کا ساز و سامان جہاں سے فراہم ہوتا ہے، یہ اس کا سدِباب ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ کی طرف وہی بات منسوب کی جائے جو اس نے فرمائی ہے تو اس سے کسی فتنے کا دروازہ نہیں کھل سکتا۔ فتنے کا دروازہ اس وقت کھلتا ہے جب اس کی طرف وہ بات منسوب کی جائے جو اس نے نہیں فرمائی ہے۔ یہی چیز بدعت ہے اور یہیں سے شیطان کو دین میں گھسنے اور اس میں فساد برپا کرنے کی راہ کھلتی ہے۔ نصاریٰ جہاں سے ہلاک ہوئے ہیں وہ یہی دروازہ ہے۔ انھوں نے پال کی تمام خرافات کو اپنے دین کا جزو بنا دیا اور پھر اس پر اپنے سارے علم کلام کی عمارت کھڑی کر لی۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ انجیلوں میں تحریفات کے باوجود، اس فتنے کی آرائش کے لیے کچھ زیادہ مواد موجود نہیں ہے جس میں مسیحی مبتلا ہوئے بعض چیزیں تحریف کی راہ سے ان میں داخل بھی کی گئیں تو ان کی تردید کا سامان بھی، جیسا کہ ہم نے آل عمران میں واضح کیا ہے، ان میں موجود ہے۔ اصل گمراہی کا مواد پال کی تعلیمات میں ہے اور ان کا تعلق نہ خدا سے ہے نہ مسیح سے۔

مسیح کی اصل حقیقت

اِنَّمَا الْمَسِیْحُ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ الایۃ: اب یہ مسیح کے بارے میں وہ صحیح بات بتائی گئی ہے جو اللہ

نے ان کے باب میں فرمائی ہے۔ وہ یہ ہے کہ وہ اللہ کے رسول ہیں، ان کی ولادت اللہ کے کلمۂ 'کن' سے ہوئی جس کو اللہ تعالیٰ نے مریم کی طرف القا فرمایا، اور ان کو روح بھی خدا ہی کی جانب سے عطا ہوئی۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی خارق عادت ولادت کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کی بنا پر ان کو خدائی کا درجہ دے دیا جائے۔ ان کی ولادت اسی طرح خدا کے کلمۂ 'کن' سے ہوئی ہے جس طرح آدم کی ولادت کلمۂ 'کن' سے ہوئی ہے اور ان کے اندر بھی خدا نے اسی طرح روح پھونکی ہے جس طرح آدم کے اندر روح پھونکی۔ اسباب تو محض ظاہر کا پردہ ہیں، وجود اور زندگی تو جس کو بھی ملتی ہے خدا ہی کے حکم اور اسی کی عطا کردہ روح سے ملتی ہے۔ آل عمران آیت ۵۹ کے تحت بھی یہ بحث گزر چکی ہے۔

'فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ' یعنی اپنے چند توہمات کو بنیاد بنا کر یہ تثلیث کا گورکھ دھندا جو تم نے کھڑا کیا ہے اس سے تائب ہو کر اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ۔ 'رسولوں پر ایمان لاؤ' کے الفاظ سے اس حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ جب خدا کے تمام رسولوں کی تعلیم تورات و انجیل میں موجود ہے اور اس تعلیم میں مسیح سے لے کر آدم تک کہیں تثلیث کا سراغ نہیں ملتا تو آخر یہ فتنہ تم نے کہاں سے گھڑ لیا۔ پس صحیح راستہ تو یہ ہے کہ یہ الگ پگڈنڈی نکالنے کے بجائے تم بھی اس صراط مستقیم پر چلو جس پر تمام نبی اور رسول چلے۔ آخر یہ کس طرح ممکن ہے کہ مسیح کی تعلیم اللہ اور اس کے رسولوں کی متفقہ تعلیم سے بالکل الگ ہو۔

تثلیث کا عقیدہ

'ثَلٰثَةٌ' سے مراد نصاریٰ کا عقیدۂ تثلیث ہے جو پال کی اختراعات میں سے ہے۔ اس عقیدے کی رو سے الوہیت میں باپ، بیٹے اور روح القدس تینوں شریک ہیں۔ یہ عقیدہ یوں تو بالکل مشرکین کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے لیکن ساتھ ہی اس بات کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ انجیلوں میں توحید کی تعلیم جو نہایت واضح الفاظ میں دی گئی ہے، کچھ اس کی بھی لاج رکھی جائے[1]۔

'اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ' میں 'خَيْرًا' اسی طرح فعل محذوف سے منسوب ہے جس طرح اوپر والی آیت میں

---

[1] ہمارے مخدوم مولانا عبدالماجد دریا بادی نے اپنی تفسیر میں مسیحیوں کا یہ عقیدہ خود ان کے الفاظ میں اس طرح نقل کیا ہے۔

"باپ بیٹے اور روح القدس کی الوہیت ایک ہی ہے۔ جلال برابر، عظمت ازلی یکساں، جیسا باپ ہے ویسا ہی بیٹا اور ویسا ہی روح قدس ہے۔ باپ غیر مخلوق، بیٹا غیر مخلوق اور روح القدس غیر مخلوق۔ باپ غیر محدود، بیٹا غیر محدود اور روح القدس غیر محدود۔ باپ ازلی، بیٹا ازلی، اور روح القدس ازلی۔ تاہم تینوں ازلی نہیں بلکہ ایک ازلی۔ اس طرح تین غیر محدود نہیں اور نہ تین غیر مخلوق بلکہ ایک غیر مخلوق اور ایک غیر محدود۔ یوں ہی باپ قادر مطلق، بیٹا قادر مطلق، اور روح القدس قادر مطلق۔ تو بھی تین قادر مطلق نہیں بلکہ ایک قادر مطلق۔ ویسا باپ خدا، بیٹا خدا اور روح القدس خدا۔ بس یہی تین خدا نہیں بلکہ ایک خدا۔"

اس کی ایک تعبیر، خود نصاریٰ ہی کے الفاظ میں، ہم نے اپنی کتاب حقیقت شرک میں بھی نقل کی ہے وہ ابتدائی تعبیر ہے۔ ایک نظر اس پر بھی ڈال لیجیے۔

ہے۔ یہ بات یہاں دھمکی کے اسلوب میں ہے۔ یعنی یہ تین میں ایک اور ایک میں تین کے چکر سے باہر نکلو ورنہ شامت آجائے گی۔ اللہ ہی واحد الٰہ ہے۔ اس کی الوہیت میں کوئی شریک نہیں ہے۔ اس کی صفات الوہیت کے یہ بات بالکل منافی ہے کہ اس کے اولاد مانی جائے۔ وہ ازلی و ابدی اور سب سے مستغنی اور بے نیاز ہے۔ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے سب اسی کا ہے تو اسے بیٹوں اور بیٹیوں کی کیا ضرورت ہے، وہ سب کی کارسازی، سب کی مدد، اور سب کے بھروسے کے لیے کافی ہے تو اس کے ساتھ کسی دوسرے کو جوڑنے کے کیا معنی؟ یعنی یا تو خدا اپنی ذات میں کوئی خلا رکھتا ہو تب شرک کی گنجائش پیدا ہوتی ہے یا دوسروں کی ضروریات کے اعتبار سے کوئی کمی اس کے اندر ہو تب اس کی گنجائش پیدا ہوتی ہے، اگر وہ اپنی ذات اور صفات میں بھی کامل ہے اور اپنی خلق کے لیے بھی کافی و وافی ہے تو شرک کی گنجائش کدھر سے نکلی؟

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ؕ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ۝ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا وَاسْتَكْبَرُوْا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا (۱۷۲-۱۷۳)

غلو کا بڑا سبب استکبار ہے

'اِسْتِنْكَاف' کے معنی ہیں کسی چیز سے غیرت، حمیت، خودداری یا استکبار کے سبب سے اعراض کرنا۔ اس آیت کا صحیح زور سمجھنے کے لیے 'لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ' والی آیت نگاہ میں رکھیے۔ غلو کے فتنے میں مبتلا ہونے کا بڑا سبب درحقیقت استکبار ہے۔ جو لوگ کسی چیز یا کسی شخص کو مان لیتے ہیں، وہ اگر حدود سے واقف یا ان کو ملحوظ رکھنے والے نہ ہوں تو ان کی خواہش اور کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس چیز یا شخص کو سب چیزوں اور تمام اشخاص سے بڑھ کر ثابت کر دکھائیں۔ پھر وہ اپنے استکبار کے اعتبار سے اس کو بڑھانا شروع کر دیتے ہیں یہاں تک کہ اس کو بڑھاتے بڑھاتے اس حد تک پہنچا دیتے ہیں جہاں پہنچ کر ان کے استکبار کو تسلی ہو جاتی ہے کہ اب برتری کے میدان میں کوئی ان کا حریف نہیں رہا اور یہاں کوئی ان کو چیلنج نہیں کر سکتا۔ عیسائیوں کو یہی فتنہ پیش آیا۔ انھوں نے جب حضرت عیسیٰؑ کو مانا تو صرف اتنے ہی پر قانع نہ رہ سکے کہ ان کو اللہ کا بندہ اور اس کا رسول مانیں۔ انھوں نے خیال کیا کہ اللہ کے بندے اور رسول تو بہت سے ہیں اگر مسیح بھی اللہ کے بندے اور رسول ہی ہیں تو پھر ان کا اور ان کے ماننے والوں کا امتیاز کیا ہوا؟ اس محرک نے، جو کھلا ہوا استکبار ہے، انھیں آمادہ کیا کہ وہ کھینچ تان کر ان کو شریک خدا ثابت کریں۔

قرآن نے عیسائیوں کی اسی ذہنیت کو سامنے رکھ کر فرمایا ہے کہ خدا کی بندگی کو تو مسیح نے نہ عار سمجھا نہ سمجھیں گے، نہ روح القدس اور دوسرے مقرب فرشتے اس کو عار سمجھیں گے۔ وہ اپنے درجے اور مرتبے کو خوب جانتے ہیں۔ البتہ جن لوگوں نے خدا کی بندگی کو عار سمجھا اور اپنے استکبار کے نشے میں یہ سارا فساد

برپا کیا ہے ایسے سارے لوگوں کو خدا اپنے حضور میں جمع کرے گا۔ اس دن ان لوگوں کو جنھوں نے ایمان اور عمل صالح کی راہ اختیار کی ہوگی اللہ پورا پورا اجر بھی دے گا اور ان کو اپنے فضل سے بھی نوازے گا۔ رہے وہ لوگ جنھوں نے خدا کی بندگی کو عار سمجھا اور غرور میں آکر بات کا بتنگڑ بنایا تو اللہ ان کو دردناک عذاب دے گا اور ان کا کوئی کارساز و مددگار نہ ہوگا جو ان کی طرف سے اللہ کے مقابل میں کھڑا ہو سکے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا ۝ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَاعْتَصَمُوْا بِهٖ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِيْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ وَّيَهْدِيْهِمْ اِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا (۱۷۴-۱۷۵)

'برہان' اور 'نور مبین' سے مراد

'برہان' اور 'نور مبین' سے مراد قرآن مجید ہے۔ 'برہان' کے لفظ سے اس کے عقلی و استدلالی پہلو کو واضح فرمایا ہے کہ وہ ایک حجت قاطع ہے، اس کے اندر ہر شبہ، ہر اعتراض اور ہر سوال کا مسکت اور تشفی بخش جواب موجود ہے بشرطیکہ آدمی اس پر کھلے دل سے غور کرے۔

'نور مبین' سے اس کے عملی پہلو کو واضح فرمایا ہے کہ وہ زندگی کے تمام نشیب و فراز میں حق و باطل کو واضح کر کے صراط مستقیم کی طرف رہنمائی فرماتا ہے اور تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے۔

'ہدایت' سے مراد مطلوب و مقصود کی ہدایت

'وَيَهْدِيْهِمْ اِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا' میں ہدایت کا لفظ میرے نزدیک اس ہدایت کے لیے ہے جو اہل ایمان کو آخرت میں حاصل ہوگی۔ قرآن میں یہ لفظ اس مفہوم میں متعدد مقامات میں استعمال ہوا ہے۔ بقرہ میں ہدایت کے مختلف مدارج پر بحث گزر چکی ہے۔ آخرت کی ہدایت مقصود و مطلوب کی طرف ہدایت ہے۔ یہ بات کہ اس ہدایت کا تعلق آخرت سے ہے اس سے نکلتی ہے کہ اس کا عطف 'فَسَيُدْخِلُهُمْ' پر ہے جس کا تعلق صریحاً آخرت سے ہے اور یہ بات کہ یہ ہدایت مطلوب و مقصود کی طرف ہے 'اِلَيْهِ' کے لفظ سے نکلتی ہے۔ یعنی جو لوگ اللہ پر ایمان اور اس حبل اللہ کو، جو قرآن کی شکل میں ان کی طرف نازل ہوئی ہے، مضبوطی سے پکڑ لیں گے خدا ان کو اپنی رحمت اور فضل بے پایاں سے بھی نوازے گا اور براہ مستقیم اور براہ راست ان کی رہنمائی اپنے قرب کی طرف بھی فرمائے گا اور یہ آخرت کی نعمتوں میں سے سب سے بڑی نعمت ہوگی اس لیے کہ تمام ہدایت و شریعت کی اصل غایت اور اہل ایمان کی تمام مساعی کا اصل مقصود و مطلوب یہی قرب الٰہی ہے۔ اس آیت کا خطاب عام ہے جس میں مسلمان، اہل کتاب اور اہل عرب سب آگئے ہیں۔

۴۴۔ آگے کا مضمون ــــــ آیت ۱۷۶

آخری آیت بطور ضمیمہ

اوپر والی آیت پر یہ سورہ تمام ہوئی۔ اب آگے ایک آیت بطور ضمیمہ لگا دی گئی ہے جو ابتدائے سورہ کے بیان کردہ احکام وراثت کے ایک خاص مسئلے کی وضاحت کے لیے بعد میں نازل ہوئی۔ اس کے

آخر میں کذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ کے الفاظ سے اشارہ بھی فرما دیا ہے کہ یہ توضیحی آیت ہے جو بعد میں توضیح کے طور پر نازل ہوئی ہے۔ اس قسم کے ضمیمے کی مثال سورۂ بقرہ میں بھی گزر چکی ہے۔ آیت کی تلاوت فرمایئے۔

آیت ۱۷۶

یَسْتَفْتُوْنَکَ ؕ قُلِ اللّٰہُ یُفْتِیْکُمْ فِی الْکَلٰلَۃِ ؕ اِنِ امْرُؤٌا هَلَکَ لَیْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗۤ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَکَ ۚ وَهُوَ یَرِثُهَاۤ اِنْ لَّمْ یَکُنْ لَّهَا وَلَدٌ ؕ فَاِنْ کَانَتَا اثْنَتَیْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَکَ ؕ وَاِنْ کَانُوْۤا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَآءً فَلِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ ؕ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ؕ وَاللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۱۷۶﴾

۲۴ ع ۴

ترجمۂ آیت ۱۷۶

وہ تم سے فتویٰ پوچھتے ہیں۔ کہہ دو اللہ تمھیں کلالہ کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے۔ اگر کوئی شخص مرے، اس کے کوئی اولاد نہ ہو، اس کے ایک بہن ہو تو اس کے لیے اس کے ترکہ کا نصف ہے اور وہ مرد اس بہن کا وارث ہوگا اگر اس بہن کے کوئی اولاد نہ ہو۔ اور اگر بہنیں دو ہوں تو ان کے لیے اس کے ترکہ کا دو تہائی ہوگا اور اگر کئی بھائی بہن مرد عورتیں ہوں تو ایک مرد کے لیے دو عورتوں کے برابر حصہ ہے۔ اللہ تمھارے لیے اس کی وضاحت کرتا ہے کہ مبادا تم گمراہی میں پڑ جاؤ اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔ ۱۷۶

۴۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت

کلالہ کی میراث کا حکم

کلالہ کی میراث کا حکم آیت ۱۲ میں گزر چکا ہے۔ کلالہ سے مراد وہ مورث ہے جس کے نہ اصول میں کوئی ہو، نہ فروع میں، صرف بھائی بہن وغیرہ ہوں۔ اگر آیت ۱۲ کے حکم کو صرف اخیافی بہن

کے ساتھ مخصوص مان لیا جائے تو اس توضیحی حکم کے بعد کلالہ کی وراثت کے حکم کا ہر پہلو واضح ہو جاتا ہے۔ اس کی تفصیلات فقہ و فرائض کی کتابوں میں موجود ہیں۔

سورۂ نساء کی تفسیر کی یہ آخری سطریں ہیں جو اس گنہگار کے قلم سے حوالۂ قرطاس ہوئیں۔ اللہ تعالیٰ لغزشوں کو معاف فرمائے اور صحیح باتوں کے لیے دلوں میں جگہ پیدا کرے۔ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔

تدبرِ قرآن

۵

المآئدۃ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود

یہ سورہ، جیساکہ مقدمۂ کتاب میں واضح ہوچکا ہے، پہلے گروپ کی آخری سورہ ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے امت مُسلمہ سے، آخری امت کی حیثیت سے، اپنی آخری اور کامل شریعت پر پوری پابندی کے ساتھ قائم رہنے اور اس کو قائم کرنے کا عہد و پیمان لیا ہے۔ اِس سے پہلے یہ عہد و پیمان اہل کتاب سے لیا گیا تھا لیکن وہ، جیساکہ پچھلی سورتوں سے واضح ہوا، اس کے اہل ثابت نہ ہوئے اس وجہ سے معزول کیے گئے اور ان کی جگہ اللہ تعالیٰ نے اس اُمّت کو دی اور اس کو اپنی آخری اور مکمل شریعت کا حامل اور امین بنایا۔ اب اس سورہ (مائدہ) میں عہد و پیمان لیا جا رہا ہے کہ تم پچھلی اُمتوں کی طرح خدا کی شریعت کے معاملے میں خائن اور غدار نہ بن جانا بلکہ پوری وفا داری اور کامل استواری کے ساتھ اس عہد کو نباہنا، اِس پر خود بھی قائم رہنا، دوسروں کو بھی قائم رکھنے کی کوشش کرنا اور اس راہ میں پوری عزیمت و پامردی کے ساتھ تمام آزمائشوں اور تمام خطرات کا مقابلہ کرنا۔

ب۔ سورہ کے مطالب کی نوعیّت

سورہ کے موضوع کے تقاضے سے اس میں جو مطالب بیان ہوئے ہیں ان پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے بھی چند باتیں بالکل نمایاں طور پر سامنے آتی ہیں۔

ایک یہ کہ اس میں جو احکام و قوانین بیان ہوئے ہیں وہ دعوتِ اسلامی کے اس دور سے تعلق رکھنے والے ہیں جب تکمیلِ دین اور اتمامِ نعمتِ الٰہی کا مرحلہ سامنے آچکا تھا۔ ظاہر ہے کہ عہد و پیمان لینے کے لیے سب سے زیادہ موزوں احکام یہی ہو سکتے تھے۔ ان پر عہد و پیمان لینے کے معنی یہ ہیں، گویا پوری شریعت پر عہد و پیمان ہوگیا۔

دوسری یہ کہ ان احکام میں امتحان و ابتلا کا پہلو بہت نمایاں ہے۔ پچھلی امتوں کو اس طرح کے جو احکام دیے گئے تھے ان میں انھوں نے ٹھوکریں کھائیں جن کے نتیجے میں وہ خدا کی معتوب و مغضوب ہوئیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس امت پر یہ فضل فرمایا کہ عہد و پیمان لیتے وقت ایسے احکام خاص طور پر سامنے کر دیے تاکہ یہ امت پاؤں پھسلنے کے ان مقامات سے اچھی طرح ہوشیار رہے۔ ظاہر ہے کہ جو خطرے کی جگہوں پر اپنے کو سنبھال سکے گا اس سے توقع یہی ہے کہ وہ ہموار جگہوں میں ٹھوکر نہیں کھائے گا۔

تیسری یہ کہ اس میں تفصیل کے ساتھ یہود و نصاریٰ کے نقضِ عہد کی تاریخ بھی بیان ہوئی ہے اور اس کے

اسباب و محرکات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے تاکہ یہ تاریخ اس امت کے لیے سبق آموزی اور عبرت پذیری کا ذریعہ بن سکے
چوتھی یہ کہ اس میں انفرادی و اجتماعی زندگی کے ان مخفی گوشوں کی خاص طور پر نشان دہی کی گئی ہے جہاں سے شیطان اور اس کے ایجنٹوں کو در آنے کا موقع ملتا ہے اور پھر وہ فتنے سر اٹھاتے ہیں جو روکے نہ جائیں تو پوری شریعت تاراج ہو کے رہ جاتی ہے۔

پانچویں یہ کہ اس میں وہ اصول و ضوابط پوری طرح واضح کر دیے گئے ہیں جن کا اہتمام عہد الٰہی پر قائم و استوار رہنے کے لیے ضروری ہے۔

یہ پانچ باتیں سامنے رکھ کر جو طالب حق تدبر کے ساتھ اس سورہ کی تلاوت کرے گا وہ اس کے موضوع اور اس کے نظام کے سمجھنے میں ان شاء اللہ کوئی الجھن نہیں محسوس کرے گا۔ اگرچہ سورہ کے نظام کو سمجھنے کے لیے یہ اشارات بھی کافی ہیں تاہم پوری سورہ کے مضامین کا تجزیہ بھی ہم کیے دیتے ہیں تاکہ تمام مطالب بیک نظر سامنے آجائیں۔

ج۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۵) اللہ سے باندھے ہوئے ہر عہد کو پورا کرنے کی تاکید۔ اشہر حرم اور تمام شعائر الٰہی کی نگہداشت کی ہدایت یہاں تک کہ حالتِ احرام میں شکار بھی ناجائز ہے اور دوسروں کی انگیخت بھی اس بات کے لیے عذر نہیں ہو سکتی کہ شعائر الٰہی کی حرمت کو کوئی بٹہ لگے۔ تعاون نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ہونا چاہیے، نہ کہ گناہ اور حدود الٰہی سے تجاوز کے کاموں میں۔

اس امت کے لیے کھانے پینے کی چیزوں میں سے جو چیزیں حرام ہیں ان کی تفصیل و تکمیل اور یہ ہدایت کہ اب تمہیں کسی کی پروا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب تمہارے مخالفین نہ یہ توقع رکھتے کہ ان کے دین اور تمہارے دین میں کوئی مفاہمت ہو سکے گی اور نہ یہ امید وہ کرتے کہ وہ اس دین کو شکست دے سکیں گے۔ اب تمہارا دین کامل ہو گیا اور تم پر اللہ نے اپنی شریعت کی نعمت تمام کر دی۔ اب تم بس اسی کی پیروی کرو اور دوسروں سے بے پروا ہو جاؤ۔

تربیت کردہ شکاری جانوروں کے شکار، اہل کتاب کے کھانے اور کتابیہ سے نکاح کے بارے میں حکم اور یہ تنبیہ کہ جو ایمان کے ساتھ کفر کو جمع کریں گے ان کے سارے عمل اکارت جائیں گے۔

(۶-۷) نماز کے لیے وضو کا حکم اور عذر و مجبوری کی حالت میں تیمم کی اجازت اور تنبیہ کہ اس حکم اور اس رخصت سے اللہ نے تمہیں پاکیزہ بنانا اور تم پر اپنی شریعت کی نعمت کو کامل کرنا چاہا ہے تو اللہ کے شکر گزار رہنا، اس کے اس انعام کو یاد رکھنا، اور سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا کا اقرار کر کے اپنے رب سے جو عہد تم نے باندھا ہے اس پر مضبوطی سے جمے رہنا۔

(۸ - ۱۱) مسلمانوں کو مخالفوں اور دشمنوں کی شرانگیزیوں کے باوجود حق و عدل پر قائم رہنے کی ہدایت۔ اللہ کا وعدۂ مغفرت انہی کے لیے ہے جو ایمان و عمل صالح پر قائم رہیں گے۔ مسلمانوں کو یہ یاددہانی کہ دشمن کے ایک گروہ نے تم کو زک پہنچانی چاہی تو خدا نے اس کو بے بس کر دیا تو اللہ ہی سے ڈرو اور اسی پر بھروسہ کرو۔

(۱۲ - ۱۳) بنی اسرائیل سے میثاق کا حوالہ کہ اللہ نے ان سے عہد لیا کہ اگر وہ اللہ کی شریعت پر قائم رہیں گے تو اللہ ان کے ساتھ ہوگا اور اگر وہ اِس عہد کو توڑ دیں گے تو گمراہ اور خدا کی معیت سے محروم ہو جائیں گے لیکن انھوں نے اس عہد کو توڑ دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے ان پر لعنت کر دی۔

(۱۴) نصاریٰ کے میثاق کا حوالہ کہ خدا نے ان سے بھی میثاق لیا لیکن وہ اس کا ایک حصّہ بھلا بیٹھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے اندر قیامت تک کے لیے عناد و اختلاف کی آگ بھڑک اُٹھی اور وہ آخرت میں بھی اس کی سزا بھگتیں گے۔

(۱۵ - ۱۶) اہل کتاب کو دعوت کہ اللہ نے اپنے آخری پیغمبر اور قرآن کے ذریعہ سے جو روشنی تمھیں دکھائی ہے اس کی قدر کرو اور اندھیرے میں بھٹکنے کے بجائے سلامتی کی راہ اور صراط مستقیم کی طرف آؤ۔

(۱۷ - ۱۹) نصاریٰ کو ملامت کہ انھوں نے مسیح کو خدا بنا لیا اور یہود و نصاریٰ دونوں کے اس زعم کی تردید کہ وہ خدا کے بیٹے اور چہیتے ہیں، نیز تنبیہ کہ خدا نے اپنا رسول بھیج کر ان پر حجت تمام کر دی ہے۔ اب ذمہ داری تمام تر ان کی ہے۔

(۲۰ - ۲۶) بنی اسرائیل کو ان کی تاریخ کے اس واقعہ کی یاددہانی کہ خدا نے ان کو اپنے عظیم فضل سے نوازا، ان کو فتح و نصرت کے وعدے کے ساتھ ارض مقدس میں داخل ہونے کا حکم دیا لیکن انھوں نے بزدلی دکھائی اور اپنے اندر کے دو اولوالعزم آدمیوں کی ہمت افزائی کے باوجود اپنے پیغمبر کے حکم کی تعمیل سے انکار کر دیا جس کی سزا ان کو یہ ملی کہ چالیس سال تک صحرا ہی میں بھٹکتے رہ گئے اور ان کو ارض مقدس میں داخل ہونے کی سعادت نہ حاصل ہوئی۔

(۲۷ - ۳۱) آدم کے دو بیٹوں کا قصہ جس سے یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ ایک خدا ترس انسان کس طرح دشمن کی انگیخت کے باوجود خدا کے عہد پر قائم رہتا ہے اور ایک شریر انسان کس طرح فاسد جذبات سے مغلوب ہو کر اپنے بھائی کو قتل کر دیتا اور پھر اعتراف گناہ کے بجائے اس کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔

(۳۲) اس امر کا بیان کہ نفس انسانی کی مذکورہ بالا خرابی کے سدباب کے لیے اللہ نے بنی اسرائیل کے لیے یہ قانون بنایا کہ ایک کا قاتل سب کا قاتل اور ایک کا بچانے والا سب کا بچانے والا ہے یعنی قتل جماعتی جرم اور حفاظت جان جماعتی ذمہ داری ہے لیکن بنی اسرائیل نے اس قانون کا احترام نہیں کیا بلکہ اپنے رسولوں کی کھلی ہوئی ہدایات و تنبیہات کے باوجود خدا کی زمین میں فساد مچاتے رہے۔

(۳۳ - ۳۴) ان لوگوں کی سزا کا بیان جو جسارت اور ڈھٹائی کے ساتھ خدا کا قانون توڑنے اور ملک میں فساد برپا کرنے کی کوشش کریں۔

(۳۵ - ۴۰) مسلمانوں کو اس بات کی تاکید کہ حدودِ الٰہی پر قائم رہو، پابندئ شریعت کو حصولِ قربِ الٰہی کا وسیلہ بناؤ اور اس شریعت کے قیام کے لیے ہمیشہ سرگرم عمل رہو۔ خدا کے عذاب سے یہی چیز نجات دینے والی ہے۔ اِس کے

سوا کوئی چیز بھی نفع پہنچانے والی ثابت نہیں ہو گی۔

(۳۸ - ۴۰) چوری کی سزا قطع ید ہے۔ اس کی بے رو رعایت تنفیذ کی تاکید اور یہ تنبیہ کہ خدا کے قانون سے بھاگنے والوں کو آخرت میں کوئی بچانے والا نہ ہو گا۔

(۴۱ - ۴۵) منافقین اور یہود کی ان چالوں اور شرارتوں کا بیان جو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت سے گریز کے لیے کر رہے تھے۔ ان محرکات کی پردہ دری جو ان شرارتوں کے پیچھے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی کہ آپ ان لوگوں کی شرارتوں سے آزردہ نہ ہوں اور یہ خواہ کچھ کریں، آپ جب بھی ان کے معاملے کا فیصلہ کریں ٹھیک قانونِ عدل کے مطابق کریں۔ یہود کو ملامت کہ یہ ان کی کیسی بدبختی ہے کہ جس کتاب کے وہ شاہد اور امین بنائے گئے اس کے واضح احکام کے مطابق اپنے معاملات کے فیصلے کرانے سے گریز اختیار کر رہے ہیں۔

(۴۶ - ۴۷) نصاریٰ کو تنبیہ کہ انھیں بھی یہ حکم ہوا تھا کہ وہ تمام معاملات کے فیصلے انجیل کے مطابق کریں اور جو اس کی خلاف ورزی کریں گے وہ نافرمان اور عہد شکن قرار پائیں گے۔

(۴۸ - ۵۰) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کہ قرآن تمام اختلافات کے درمیان قولِ فیصل بن کر نازل ہوا ہے۔ اب یہی تمام پچھلے صحیفوں کے لیے کسوٹی ہے۔ اہل کتاب کی بدعات کی کوئی پروا نہ کرو۔ ہر معاملے کا فیصلہ اسی کی روشنی میں کرو۔ اگر یہ اہل کتاب اپنی بدعات چھوڑنا نہیں چاہتے تو تم ان کو ان کے حال پر چھوڑو۔ ان کا فیصلہ قیامت میں ہو گا۔ ہوشیار رہو کہ یہ تمھیں اپنی بدعات و خواہشات کی طرف موڑنے نہ پائیں۔

(۵۱ - ۵۶) مسلمانوں کو تنبیہ کہ یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست نہ بناؤ۔ جو ان کو اپنا دوست بنائے گا اس کا شمار انھی میں ہو گا۔ منافقین کے اس راز کا اظہار کہ یہ ڈرتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ سے کھلم کھلا بگاڑ کر لیا اور کل کو پلہ انھی کا بھاری رہا تو کیا ہو گا حالانکہ انھیں یہ سوچنا چاہیے کہ اسلام کی فتح کے بعد اگر ان کا سارا پول کھول دیا گیا تب کیا ہو گا۔ منافقین کو دھمکی کہ یہ مرتد ہونا چاہتے ہیں تو ہو جائیں، خدا کو کوئی پروا نہیں، خدا اسلام کی حمایت کے لیے ایسے لوگوں کو کھڑا کرے گا جن سے خدا محبت کرے گا اور جو خدا سے محبت کریں گے۔

(۵۷ - ۶۶) منافقین کی بے حمیتی پر ملامت کہ ان یہود کو یہ اپنا دوست بناتے ہیں جو اپنی مجلسوں میں اسلام اور اس کے شعائر کا مذاق اڑاتے ہیں۔ یہود کو سرزنش کہ انھیں آخرت میں پتہ چلے گا کہ خدا کے نزدیک سب سے زیادہ بدانجام کون ہے۔ یہود کی دھوکہ بازی اور ان کے علماء کی بے حسی و بے غیرتی کی طرف اشارہ۔ یہود کا طنز اللہ تعالیٰ پر اور اس کا جواب۔ یہ اشارہ کہ حسد کے جوش میں یہود برابر جنگ کی آگ بھڑکاتے رہیں گے لیکن خدا ان کی کسی سازش کو کامیاب نہیں ہونے دے گا۔ اہل کتاب کو ملامت کہ ان کی شامت ہی ہے کہ انھوں نے اسلام کو اپنے لیے خطرہ سمجھا۔ اگر وہ اس کو قبول کرتے تو درحقیقت تورات و انجیل کو قائم کرتے اور ان کے لیے دنیا اور آخرت دونوں کی کامیابیوں کے دروازے کھل جاتے لیکن ان میں عدل پسند تھوڑے نکلے، اکثریت بروں ہی کی ہے۔

(۶۷ - ۷۱) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کہ تم بالکل نڈر ہو کر ان اہل کتاب کو حق پہنچا دو کہ جب تک تم

تورات و انجیل اور اس قرآن کو قائم نہ کرو تمہاری کوئی حیثیت نہیں۔ خدا سے نسبت صرف ان کو حاصل ہوگی جو ایمان و عمل سے نسبت پیدا کریں گے۔ یہود کی تاریخ کا حوالہ کہ ان سے میثاق لینے کے بعد اللہ نے اس میثاق کی تجدید کے لیے برابر رسول بھیجے لیکن انھوں نے اپنی خواہشوں کی پیروی کی۔ رسولوں کے ایک گروہ کی انھوں نے تکذیب کر دی اور بعض کو قتل کر دیا۔ انھوں نے خدا کی ڈھیل سے یہ گمان کر لیا کہ اب کوئی پکڑ نہیں ہوگی اور وہ برابر اندھے بہرے بنے رہے۔

(۷۲-۷۷) نصاریٰ کے کفر کا بیان کہ انھوں نے مسیح کی تعلیمات کے بالکل خلاف حلول اور تثلیث کے عقیدے ایجاد کر لیے۔ حضرت مسیح اور ان کی والدہ کے اصل مرتبہ کی وضاحت اور نصاریٰ کو یہ تنبیہ کہ ایک گمراہ قوم کی ایجاد کردہ بدعات کی تقلید میں انھوں نے اپنے کو ہلاکت میں مبتلا کیا۔

(۷۸-۸۶) بنی اسرائیل پر حضرت داؤدؑ اور حضرت مسیحؑ کی لعنت کا حوالہ۔ کفر دوستی اور اسلام دشمنی کے جوش میں مشرکین مکہ تک سے ان کی دوستی کی طرف اشارہ۔ اسلام دشمنی میں یہود، مشرکین، قریش اور نصاریٰ کے مزاج کا فرق۔ حق پرست نصاریٰ کی حق پرستی اور اسلام دوستی کی تحسین۔

(۸۷-۱۰۵) سورہ کے شروع میں بیان کردہ احکام حلت و حرمت کے بعض پہلوؤں کی وضاحت اور ان سے متعلق سوالوں کے جواب۔ خدا کی مباح کردہ چیزوں کو اپنے جی سے حرام ٹھہرانے کی ممانعت۔ احترام عہد و پیمان کے پہلو سے قسم کے معاملے میں احتیاط کی تاکید اور ارادی قسموں کا کفارہ۔ شراب، جوا، اور انصاب و ازلام کی قطعی حرمت کا اعلان۔ شراب اور جوئے کے شرعی اور معاشرتی مفاسد۔ جو لوگ درجہ بدرجہ تحریم و تحلیل کے معاملے میں خدا کے احکام کا احترام کرتے آئے ہیں ان کی پچھلی غلطیوں پر کوئی گرفت نہیں۔ حالت احرام میں شکار کی ممانعت ایک سخت آزمائش ہے اس وجہ سے اس معاملے میں بیدار رہنے کی ہدایت اور اگر غلطی ہو جائے تو اس کے کفارے کی صورت، نیز اس ممانعت میں جس حد تک رخصت ہے اس کا بیان۔ خانہ کعبہ اور اس سے متعلق تمام شعائر کے برابر احترام کرتے رہنے کی تاکید اور یہ تنبیہ کہ رسول کا کام اللہ کی ہدایات کا پہنچا دینا تھا، اس نے پہنچا دیں اب ذمہ داری لوگوں کی اپنی ہے۔ برائی کی کثرت برائی کے جواز کی دلیل نہیں بن سکتی اس وجہ سے دانشمندی اور فلاح کی راہ یہی ہے کہ برائی سے بچا جائے۔ غیر ضروری سوالات کرنے کی ممانعت، اس سے یہود کو جو نقصانات پہنچے اُن کی طرف اشارہ۔ تحریم و تحلیل سے متعلق قریش کی بعض بدعات کا حوالہ اور ان کی اندھی تقلید آبا پر سرزنش۔ مسلمانوں کو ہدایت کہ جو نہیں سُنتے ان کو ان کے حال پر چھوڑو۔

(۱۰۶-۱۰۸) شہادت حق اور عہد و قسم کے تحفظ کے پہلو سے حالت سفر کی وصیت اور اس سے متعلق گواہی کا ضابطہ اور اگر اس کے بارے میں کوئی اشتباہ پیش آ جائے تو اس کے تدارک کا طریقہ۔

(۱۰۹-۱۲۰) خاتمۂ سورہ ـــــ قیامت کے دن انبیاء اپنی اپنی اُمتوں کے باب میں شہادت دیں گے کہ انھوں نے اللہ کی طرف سے لوگوں کو کیا بتایا اور سکھایا اور لوگوں سے کن باتوں کے کرنے اور کن باتوں کے نہ کرنے کا عہد و اقرار لیا تاکہ ہر اُمت پر حجت قائم ہو سکے کہ جس نے بھی کوئی بدعہدی کی ہے اس کی ذمہ داری تمام تر اسی

پر ہے، اللہ کے رسول اس سے بری ہیں۔ اس شہادت کی نوعیت واضح کرنے کے لیے بطور مثال حضرت عیسیٰ کی شہادت کا تفصیلی تذکرہ تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ اللہ نے اپنے نبیوں اور رسولوں پر جس شہادتِ حق کی ذمہ داری ڈالی ہے وہ اس کے بارے میں عنداللہ مسئول ہوں گے اور ان کے واسطہ سے اُمتوں نے جس قیام بالقسط اور شہادتِ حق کا عہد و پیمان خدا سے باندھا ہے وہ اس کے لیے مسئول ہوں گی اور آخرت کی فلاح اور خدا کی خوشنودی ان کو حاصل ہوگی جو اس عہد کا حق ادا کرنے والے ثابت ہوں گے۔

اس فہرستِ مطالب پر سرسری نظر ڈالنے سے بھی سورہ کے تمام اجزاء کا ربط اس کے موضوع سے بالکل واضح نظر آتا ہے۔ اب ہم اللہ کی توفیق اور اس کی رہنمائی کے بھروسے پر سورہ کی تفسیر شروع کرتے ہیں۔

سُورَۃُ المَآئِدَۃِ (۵)

مَدَنِیَّۃٌ ______ اٰیَاتُھَا ۱۲۰

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

المنزل ۲ آیات ۱-۵

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَوۡفُوۡا بِالۡعُقُوۡدِ ؕ اُحِلَّتۡ لَـکُمۡ بَهِيۡمَةُ الۡاَنۡعَامِ اِلَّا مَا يُتۡلٰى عَلَيۡكُمۡ غَيۡرَ مُحِلِّى الصَّيۡدِ وَاَنۡتُمۡ حُرُمٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَحۡكُمُ مَا يُرِيۡدُ ﴿۱﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تُحِلُّوۡا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهۡرَ الۡحَـرَامَ وَلَا الۡهَدۡىَ وَلَا الۡقَلَۤائِدَ وَلَاۤ آٰمِّيۡنَ الۡبَيۡتَ الۡحَـرَامَ يَبۡتَغُوۡنَ فَضۡلًا مِّنۡ رَّبِّهِمۡ وَرِضۡوَانًا ؕ وَاِذَا حَلَلۡتُمۡ فَاصۡطَادُوۡا ؕ وَلَا يَجۡرِمَنَّكُمۡ شَنَاٰنُ قَوۡمٍ اَنۡ صَدُّوۡكُمۡ عَنِ الۡمَسۡجِدِ الۡحَـرَامِ اَنۡ تَعۡتَدُوۡا ‌ۘ وَتَعَاوَنُوۡا عَلَى الۡبِرِّ وَالتَّقۡوٰى‌ ۖ وَلَا تَعَاوَنُوۡا عَلَى الۡاِثۡمِ وَالۡعُدۡوَانِ‌ ۖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ‌ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيۡدُ الۡعِقَابِ ﴿۲﴾ حُرِّمَتۡ عَلَيۡكُمُ الۡمَيۡتَةُ وَالدَّمُ وَلَحۡمُ الۡخِنۡزِيۡرِ وَمَاۤ اُهِلَّ لِغَيۡرِ اللّٰهِ بِهٖ وَالۡمُنۡخَنِقَةُ وَالۡمَوۡقُوۡذَةُ وَالۡمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيۡحَةُ وَمَاۤ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيۡتُمۡ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَاَنۡ تَسۡتَقۡسِمُوۡا بِالۡاَزۡلَامِ‌ ؕ ذٰ لِكُمۡ فِسۡقٌ‌ ؕ اَلۡيَوۡمَ يَئِسَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا مِنۡ دِيۡنِكُمۡ فَلَا تَخۡشَوۡهُمۡ وَاخۡشَوۡنِ‌ ؕ

د تقف لازم

الربع

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ
لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ
لِّاِثْمٍ ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٣﴾ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ ۭ
قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۙ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ
تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ ۡ فَكُلُوْا مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا
اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿٤﴾ اَلْيَوْمَ
اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۭ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ
وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۡ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ
مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ
مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ
بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ۡ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿٥﴾ ع ۵

ترجمۂ آیات ۱ - ۵

اے ایمان والو! اپنے عہد و پیمان پورے کرو۔ تمہارے لیے انعام کی قسم کے تمام چوپائے حلال ٹھہرائے گئے بجز ان کے جن کا حکم تم کو پڑھ کر سنایا جا رہا ہے۔ نہ جائز کرتے ہوئے شکار کو حالتِ احرام میں۔ اللہ حکم دیتا ہے جو چاہتا ہے۔ ۱

اے ایمان والو! شعائر الٰہی کی بے حرمتی نہ کیجیو، نہ محترم مہینوں کی، نہ قربانیوں کی، نہ پٹے بندھے ہوئے نیاز کے جانوروں کی، نہ بیت اللہ کے عازمین کی، جو اپنے رب کے فضل اور اس کی خوشنودی کے طالب بن کر نکلتے ہیں۔ اور جب تم حالتِ احرام سے باہر آجاؤ تو شکار کرو۔ اور کسی قوم کی دشمنی، کہ اس نے تمہیں مسجد حرام سے روکا ہے

تمھیں اس بات پر نہ ابھارے کہ تم حدود سے تجاوز کرو۔ تم نیکی اور تقویٰ میں تعاون کرو، گناہ اور تعدی میں تعاون نہ کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ اللہ سخت پاداش والا ہے۔ ۲

تم پر مردار اور خون اور سور کا گوشت اور وہ جانور حرام کیا گیا جس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو، اور وہ جو گلا گھٹنے سے مرا ہو، جو چوٹ سے مرا ہو، جو اوپر سے گر کر مرا ہو، جو سینگ لگ کر مرا ہو، جس کو کسی درندے نے کھایا ہو بجز اس کے جس کو تم نے ذبح کر لیا ہو اور وہ جو کسی تھان پر ذبح کیا گیا ہو اور یہ کہ تقسیم کرو تیروں کے ذریعے سے، یہ سب باتیں فسق ہیں۔ اب یہ کافر تمھارے دین کی طرف سے مایوس ہو گئے تو ان سے نہ ڈرو، مجھی سے ڈرو، اب میں نے تمھارے لیے تمھارے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمھارے لیے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند فرمایا۔ پس جو بھوک میں مضطر ہو کر، بغیر گناہ کی طرف مائل ہوئے، کوئی حرام چیز کھا لے تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ ۳

وہ پوچھتے ہیں ان کے لیے کیا چیز حلال ٹھہرائی گئی ہے۔ کہو تمھارے لیے پاکیزہ چیزیں حلال ٹھہرائی گئی ہیں۔ اور شکاری جانوروں میں سے جن کو تم نے سدھایا ہے اس علم میں سے کچھ سکھا کر جو خدا نے تم کو سکھایا تو تم ان کے اس شکار میں سے کھاؤ جو وہ تمھارے لیے روک رکھیں اور ان پر اللہ کا نام لے لیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو، اللہ بہت جلد حساب چکانے والا ہے۔ ۴

اب تمھارے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کر دی گئیں اور اہل کتاب کا کھانا تمھارے

لیے حلال ہے اور تمہارا کھانا ان کے لیے حلال ہے اور شریف عورتیں مسلمان عورتوں میں سے اور شریف عورتیں ان اہل کتاب میں سے جن کو تم سے پہلے کتاب ملی تمہارے لیے حلال ہیں بشرطیکہ ان کو قیدِ نکاح میں لا کر ان کے مہران کو دو، نہ کہ بدکاری کرتے ہوئے اور آشنائی گانٹھتے ہوئے۔ اور جو ایمان کے ساتھ کفر کرے گا تو اس کا عمل ڈھے جائے گا اور وہ آخرت میں نامرادوں میں ہوگا۔ ۵

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ۭ اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ (۱)

لفظ 'عقد' کا مفہوم اور اس کی وسعت

'اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ' عقد کا لفظ عہد و میثاق کے الفاظ کے مقابل میں عام ہے۔ اس میں قول قرار، قسم اور کسی معاملے میں گواہی کی ذمہ داری سے لے کر اس عہد و میثاق تک، جو خدا اور اس کے بندوں کے درمیان ہوا ہے، سب آگیا۔ چنانچہ اس سورہ میں میثاق شریعت کی پوری تاریخ بھی اس کے تمام نتائج و عواقب کے ساتھ بیان ہوئی ہے، قسم اور شہادت کی ذمہ داریاں بھی واضح کی گئی ہیں۔

'انعام' اور 'بہیمہ' میں فرق

'اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ' 'اَنْعَامٌ' کا لفظ عربی میں بھیڑ بکری، اونٹ اور گائے بیل کے لیے معروف ہے۔ اس کی تصریح خود قرآن نے سورۂ انعام کی آیات ۱۴۳، ۱۴۴ میں فرما دی ہے۔ 'بہیمہ' کا لفظ اس سے عام ہے۔ اس میں 'انعام' کی نوع کے دوسرے چوپائے بھی داخل ہیں۔ انعام کی طرف اس کی اضافت سے یہ مفہوم پیدا ہوتا ہے کہ اونٹ، گائے، بکری اور اس قبیل کے سارے ہی چوپائے، خواہ گھریلو ہوں یا وحشی، تمہارے لیے جائز ٹھہرائے گئے۔ "جائز ٹھہرائے گئے" سے مطلب یہ ہے کہ وہ پابندیاں جو تم نے اپنے اوہام کی بنا پر عائد کی ہیں وہ بھی ختم اور جو پچھلے صحیفوں کی روایات کی بنا پر تھیں وہ بھی کالعدم۔

'اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ' یہ اشارہ ہے آگے آیت ۳ میں بیان کردہ حرمتوں کی طرف۔

حالتِ احرام میں شکار کی ممانعت اور اس کی اہمیت

'غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ' یہ ان حرمتوں میں سب سے پہلی حرمت کا ذکر ہے۔ یعنی تمہارے لیے انعام کے قسم کے تمام چوپائے خواہ پالتو ہوں یا وحشی جائز ہیں بایں پابندی کہ حالتِ احرام میں شکار کو جائز کر لینے والے نہ بن جانا۔ اس کے حالیہ اسلوب بیان اور اس کے سب سے پہلے ذکر کرنے سے اس کی اہمیت

ظاہر ہوتی ہے ہیں کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے تھوڑی سی تفصیل کی ضرورت ہے۔

ہم اوپر تمہیدی گفتگو میں اشارہ کر چکے ہیں کہ اس سورہ میں جو احکام بیان ہوتے ہیں وہ تکمیلی و اتمامی نوعیت کے بھی ہیں اور ان ہیں امتحان و آزمائش کا پہلو بھی نمایاں ہے۔ اپنے اسی پہلو سے وہ اس سورہ کے لیے، جو سورۃ المیثاق ہے، موزوں قرار پائے ہیں۔ ان پر عہد لینے کے معنی ایک طرف تو یہ ہیں کہ پوری شریعت کی پابندی کا عہد لیا گیا، دوسری طرف یہ کہ ان چیزوں پر عہد لے لیا گیا جو دوسری ملتوں کے لیے مزلۂ قدم ثابت ہو چکی تھیں۔ چنانچہ یہاں غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ یہ دونوں ہی پہلو ملحوظ ہیں۔

کھانے پینے کے باب میں یہاں جو حرمتیں اور حلتیں بیان ہوئی ہیں وہ بالکل آخری نوعیت کی ہیں۔ اس سے پہلے اس باب کے بہت سے احکام بقرہ میں گزر چکے ہیں بلکہ بقرہ سے بھی زیادہ تفصیل کے ساتھ سورۂ انعام میں بیان ہوئے ہیں جو ایک مکی سورہ ہے[1]۔ صرف کچھ جزئیات و تفصیلات باقی رہ گئی تھیں جو اس سورہ میں بیان ہو گئی ہیں اور ان کے بعد یہ باب گویا بالکل مکمل ہو گیا۔ یہ حقیقت آگے کی آیات سے خود اس قدر واضح ہو جائے گی کہ دلیل کی محتاج نہیں رہے گی۔

ابتلا و امتحان کے زاویہ سے دیکھیے تو معلوم ہو گا کہ حالتِ احرام میں شکار کی ممانعت کا معاملہ بالکل اس حکم سے مشابہ ہے جو یہود کو سبت کے احترام سے متعلق دیا گیا تھا۔ ان کو سبت کے دن شکار کی ممانعت تھی لیکن وہ اس عہد کو نباہ نہ سکے بلکہ مختلف حیلے ایجاد کر کے انھوں نے اس کو جائز بنا لیا جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت کر دی۔ سبت کے حکم سے اس کی مشابہت خود قرآن نے اسی سورہ میں آگے آیات ۹۴-۹۶ میں واضح کر دی ہے۔

آیت کا مطلب یہ ہوا کہ اے ایمان والو، اپنے رب سے اس کی شریعت کی پابندی کا جو عہد و میثاق تم نے کیا ہے وہ پورا کرنا۔ تمہارے لیے انعام کی قسم کے تمام چوپائے، بجز ان کے جو آگے بیان کیے جا رہے ہیں، اس پابندی کے ساتھ حلال ٹھہرائے گئے کہ احرام کی حالت میں شکار نہ کرنا۔ آخر میں اِنَّ اللّٰہَ یَحۡکُمُ مَا یُرِیۡدُ فرما کر اس حکم کے امتحانی پہلو کی طرف اشارہ فرما دیا کہ یہ حکم تمہاری وفاداری کی جانچ کے لیے ہے، اس میں مین میکھ نکالنے اور اس سے گریز و فرار کی راہیں نہ ڈھونڈنا۔ خدا جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے اور اس کے احکام کی بے چون و چرا اطاعت ہی میں اس کے بندوں کے لیے خیر و برکت ہے۔ یہ بات یہاں ملحوظ رہے کہ جو احکام امتحان کے مقصد سے ہوتے ہیں ان میں بندوں کی مصلحت کا پہلو مخفی ہوتا ہے اس وجہ سے جب تک یہ عقیدہ دل میں مضبوط نہ ہو کہ خدا کو حکم دینے کا اختیارِ مطلق حاصل ہے اور اس کا ہر حکم بندوں

---

[1] ملاحظہ ہو سورۂ بقرہ آیت ۱۷۳ اور سورۂ انعام آیات ۱۴۲-۱۴۳

ہی کی مصلحت کے لیے ہوتا ہے اس وقت تک سچی وفاداری کے ساتھ ان کی تعمیل نہیں ہو سکتی۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَآئِدَ وَلَآ آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا ۭ وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا ۭ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ وَتَعَاوَنُوْا عَلَي الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۠ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَي الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۲)

شعائر کا احترام ظاہر و باطن دونوں پہلوؤں سے مطلوب ہے

'وَلَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ' بقرہ آیت ۱۵۸ کے تحت 'شَعَآئِرَ اللّٰهِ' پر تفصیل کے ساتھ بحث ہو چکی ہے۔ شعائر کسی اہم دینی و روحانی حقیقت کے مظہر اور پیکر ہیں۔ ان میں اصل مقصود کی حیثیت تو ان روحانی و معنوی حقائق کی ہے جو ان مظاہر کے اندر مضمر ہیں اس لیے کہ ان حقائق ہی کا احساس دلانے کے لیے ان کو بطور نشان اور علامت کے مقرر کیا گیا ہے لیکن یہ مقرر کردہ خدا کے ہیں اس وجہ سے ان کے ظاہر و باطن دونوں کا یکساں احترام مطلوب ہے۔ کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ ان کے احترام کے جو آداب و شرائط مقرر ہیں ان کی خلاف ورزی کرے یا جو چیزیں یا جو باتیں ان کے تعلق سے حرام ہیں ان کو جائز کرے۔ مثلاً چار محترم مہینوں — ذی قعدہ، ذی الحجہ، محرم اور رجب جو حج و عمرہ کے تعلق سے محترم مہینے قرار دیے گئے ہیں، ان میں لڑائی بھڑائی ممنوع ہے۔ اگر کوئی گروہ ان میں لڑائی چھیڑ دے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس نے ان حرام مہینوں کو اپنے لیے جائز کر لیا اور ان کی بے حرمتی کی۔

ہدی اور قلائد کا مفہوم

'ھَدْی' قربانی کے جانوروں کو کہتے ہیں جو بطور ہدیہ خدا کے حضور پیش کرنے کے لیے بیت اللہ لے جائے جاتے ہیں۔ 'قَلَآئِد' قلادہ کی جمع ہے جس کے معنی پٹے کے ہیں۔ اس میں مضاف محذوف ہے یعنی — ذوات القلائد، یعنی قربانی اور نذر و نیاز کے وہ جانور جن کو تخصیص کے طور پر پٹے باندھ دیے گئے ہیں کہ پہچانے جائیں، کوئی ان سے تعرض نہ کرے۔ 'ہدی' کے بعد 'قلائد' کا ذکر عام کے بعد خاص کے ذکر کی نوعیت رکھتا ہے اور مقصود اس سے تعرض کی سنگینی کو واضح کرنا ہے کہ جن جانوروں کے گلے میں خدا کی تخصیص کے پٹے بندھ گئے ان پر حملہ خاص خدا کے گلے پر حملہ کرنا ہے۔ اسی طرح 'آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ' کے ساتھ 'يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا' کی صفت کا ذکر اس نہی کو مؤثر بنانے کے لیے ہے کہ جو اللہ کے بندے خدا کے فضل اور اس کی خوشنودی کی تلاش میں گھر سے نکلے ہوں ان کو نقصان پہنچانے کے درپے ہونا خود خدا سے تعرض کرنے کے مترادف ہے۔

دشمن کی دشمنی بھی ترک شعائر کے لیے دلیل جواز نہیں ہے

'وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ الآیۃ'، 'شَنَاٰن' کے معنی بغض و عداوت کے ہیں اور 'لَا يَجْرِمَنَّكُمْ' کے معنی ہیں، تمہارے لیے سبب و محرک نہ بنے، تمہیں آمادہ نہ کرے۔ 'قوم' سے مراد یہاں قریش ہیں اور 'اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ'، اس بغض و عداوت کے سبب کی تفصیل ہے۔ یعنی قریش نے تمہیں بیت اللہ سے روک کر ہر چند تمہارے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے لیکن اس چیز کا غم و غصہ

بھی تمھیں اس بات پر نہ اُبھارے کہ تم شعائرِ الٰہی کے معاملے میں حدودِ الٰہی سے تجاوز کرو۔ ان کے عازمینِ حج کے قافلوں کو یا ان کے نذر و نیاز کے جانوروں کو کوئی گزند نہ پہنچاؤ۔

دوسروں کی انگیخت پر حدودِ الٰہی سے تجاوز تعاون علی الاثم ہے

'وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى الآیۃ' یہ اوپر والی بات ہی کی ایک دوسرے پہلو سے تاکید ہے یعنی جس گروہ کو اللہ نے دنیا میں نیکی اور تقویٰ قائم کرنے کے لیے پیدا کیا ہے اس کے لیے پسندیدہ روش یہ نہیں ہے کہ وہ دوسروں کی زیادتیوں سے مشتعل ہو کر خود اسی طرح کی زیادتیاں کرنے لگے۔ وہ ایسا کرے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اس نے گناہ اور زیادتی کے کام میں تعاون کیا اور شریروں نے برائی کی جو نیو جمائی اس پر اس نے بھی چند ردے رکھ دیے، حالانکہ اس کا کام نیکی اور تقویٰ میں تعاون کرنا تھا[1]۔

اجزا کو سمجھ لینے کے بعد آیت کے مجموعی نظام پر ایک بار پھر نظر ڈال لیجیے۔

اوپر والی آیت میں حالتِ احرام میں شکار کی ممانعت فرمائی تھی کہ یہ چیز احرام کے تقدس اور اس کے درویشانہ مزاج کے خلاف نیز شعائرِ الٰہی میں سے ایک شعیرہ کی توہین ہے۔ اب اسی تعلق سے تمام شعائرِ الٰہی کے احترام کی پہلے بحیثیت مجموعی تاکید فرمائی پھر چند مخصوص شعائر کا حوالہ دیا۔ پھر شکار کی ممانعت سے متعلق یہ واضح فرما دیا کہ اس کا تعلق صرف حالتِ احرام سے ہے۔ احرام سے باہر آجانے کے بعد یہ ممانعت اُٹھ جائے گی۔

پھر اس اشتعال انگیز سبب کا ذکر فرمایا جو اس وقت تازہ تازہ موجود تھا۔ اندیشہ تھا کہ مسلمان اس سے مغلوب ہو کر کوئی ایسی بات کر گزریں جو احترامِ شعائر کے منافی ہو۔ قریش نے ان کو بیت اللہ کے حج و زیارت سے محروم کر رکھا تھا۔ یہ معاملہ نہایت نازک اور صبر آزما تھا اور اب کہ مسلمانوں نے سیاسی قوت حاصل کر لی تھی خاصا اندیشہ اس بات کا تھا کہ اس عہد کے احترام میں ان سے کوئی بے اعتدالی صادر ہو جائے۔ یہ صورتِ حال مقتضی ہوئی کہ اللہ تعالیٰ ان کو مزلۂ قدم سے ہوشیار کر دے کہ دوسروں کی زیادتیاں بھی ان کے لیے کسی زیادتی کا جواز فراہم نہیں کر سکتیں۔ وہ دنیا میں شعائرِ الٰہی کا احترام قائم کرنے اور نیکی اور تقویٰ کے علم بردار بن کر اُٹھے ہیں اس وجہ سے جب تک اپنے بچاؤ کی ضرورت مجبور نہ کر دے ان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی قدم نیکی اور تقویٰ کے خلاف اٹھائیں۔ اس کے بعد نکتے کی بات یہ ارشاد ہوئی کہ دوسروں کے غلط رویے سے متاثر ہو کر انھی کی سی روش اختیار کر لینا درحقیقت ان کی برپا کی ہوئی بدی میں ان کے ساتھ تعاون کرنا ہے، اور یہ چیز

---

[1] یہ ملحوظ رہے کہ یہاں جس چیز سے روکا جا رہا ہے وہ یہ ہے کہ دوسرے کے طرزِ عمل سے مشتعل ہو کر کوئی کام جارحانہ طور پر خود مسلمان بھی ایسا کر گزریں جو شعائرِ الٰہی کے احترام کے منافی ہو۔ اگر مسلمانوں کو اپنے تحفظ اور دفاع کے لیے مجبوراً کوئی قدم اٹھانا پڑے تو وہ اس سے مستثنیٰ ہے۔ دفاعی جنگ اشہرِ حرم بلکہ عین حرم میں بھی لڑی جا سکتی ہے۔ بقرہ میں یہ بحث گزر چکی ہے۔

اہل ایمان کے شایان شان نہیں ہے۔ اہل ایمان کے شایان شان بات یہ ہے کہ وہ نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں تعاون کریں۔ دشمن کے ہاتھوں بھی کوئی کام نیکی کا ہو رہا ہو تو اس میں مزاحم ہونے کے بجائے اس کی حوصلہ افزائی کریں۔ آخر میں شَدِيْدُ الْعِقَابِ کا حوالہ دینے سے مقصود مسلمانوں کو سخت الفاظ میں تنبیہ ہے کہ عہد الٰہی کی حرمت سخت سے سخت حالات میں بھی قائم رکھنی ہے۔ ورنہ یاد رکھو کہ جس خدا نے تم کو اپنے عہد و میثاق سے دُنیا کی امامت کی سرفرازی بخشی ہے، اس کے ہاں نقض میثاق کی پاداش بھی بڑی ہی سخت ہے۔

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوْذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيْحَةُ وَمَآ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ ۣ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ ۭ ذٰلِكُمْ فِسْقٌ ۭ اَلْيَوْمَ يَىِٕسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ۭ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ۭ فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۳)

میتۃ کی تفصیل

مَيْتَة، دَم، لَحْمِ خِنْزِيْر اور مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ کا ذکر سورہ بقرہ کی آیت ۱۷۳ کے تحت گزر چکا ہے۔

مُنْخَنِقَةُ اس جانور کو کہتے ہیں جو گلا گھٹ کر مر جائے۔

مَوْقُوْذَةُ جو چوٹ سے مر جائے۔ مثلاً کسی جانور پر دیوار گر پڑی یا وہ کسی ٹرک کے نیچے آ گیا۔

مُتَرَدِّيَةُ جو اوپر سے نیچے گر کر مر جائے۔

نَطِيْحَةُ جو کسی جانور کی سینگ سے زخمی ہو کر مر جائے۔

مَآ اَكَلَ السَّبُعُ جس کو کسی درندے نے پھاڑ کھایا ہو۔

مذکورہ پانچوں چیزوں کا ذکر درحقیقت میتہ کی تفصیل کے طور پر ہوا ہے اور اس تفصیل سے گویا اس حکم کی تکمیل ہو گئی جو بقرہ اور اس سے پہلے انعام میں بیان ہو چکا ہے۔ اس تفصیل کی ضرورت اس لیے تھی کہ بعض ذہنوں میں یہ شبہ پیدا ہو سکتا تھا کہ ایک مردار میں جو طبعی موت مرا ہو اور اس جانور میں جو کسی چوٹ یا کسی حادثہ کا شکار ہو کر اچانک مر گیا ہو، کچھ فرق ہونا چاہیئے۔ چنانچہ یہ شبہ اس زمانے میں بھی بعض لوگ پیش کرتے ہیں بلکہ بہت سے لوگ تو اسی کو بہانہ بنا کر گردن مروڑی ہوئی مرغی بھی جائز کر بیٹھے۔ قرآن کی اس تفصیل نے اس شبے کو صاف کر دیا۔

تھان، استھان اور مزارات پر قربانی کی ممانعت

وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ، نُصُب تھان اور استھان کو کہتے ہیں۔ عرب میں ایسے تھان اور استھان بے شمار تھے جہاں دیویوں، دیوتاؤں، بھوتوں، جنوں کی خوشنودی کے لیے قربانیاں کی جاتی تھیں۔ قرآن نے اس قسم کے ذبیحے بھی حرام قرار دیے۔ قرآن کے الفاظ سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ ان کے اندر حرمت مجرد بارادۂ

تقرب و خوشنودی، استھانوں پر ذبح کیے جانے ہی سے پیدا ہو جاتی ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ ان پر نام اللہ کا لیا گیا ہے یا کسی غیر اللہ کا۔ اگر غیر اللہ کا نام لینے کے سبب سے ان کو حرمت لاحق ہوتی تو ان کے علیحدہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی، اوپر 'وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ' کا ذکر گزر چکا ہے، وہ کافی تھا۔ ہمارے نزدیک اسی حکم میں وہ قربانیاں بھی داخل ہیں جو مزاروں اور قبروں پر پیش کی جاتی ہیں۔ ان میں بھی صاحب مزار اور صاحبِ قبر کی خوشنودی مدنظر ہوتی ہے۔ ذبح کے وقت نام چاہے اللہ کا لیا جائے یا صاحبِ قبر و مزار کا، ان کی حرمت میں دخل نام کو نہیں بلکہ مقام کو حاصل ہے۔

'استقسام بالازلام' کی نوعیت

وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ۔ 'اِسْتِقْسَام' کے معنی ہیں حصہ یا قسمت یا تقدیر معلوم کرنا۔ 'ازلام' جوئے یا فال کے تیروں کو کہتے ہیں۔ عرب میں فال کے تیروں کا بھی رواج تھا جن کے ذریعے سے وہ اپنے زعم کے مطابق غیب کے فیصلے معلوم کرتے تھے اور جوئے کے تیروں کا بھی رواج تھا جن کے ذریعے سے وہ گوشت یا کسی چیز کے حصے حاصل کرتے تھے۔ ہم سورۂ بقرہ کی تفسیر میں خمر و میسر کے تحت بیان کر آئے ہیں کہ عرب شراب نوشی کی مجلسیں منعقد کرتے، شراب کے نشے میں جس کا اونٹ چاہتے ذبح کر دیتے، مالک کو منہ مانگے دام دے کر راضی کر لیتے پھر اس کے گوشت پر جوا کھیلتے۔ گوشت کی جو ڈھیریاں جیتتے جاتے ان کو بھونتے، کھاتے، کھلاتے اور شرابیں پیتے اور بسا اوقات اسی شغل بدمستی میں ایسے ایسے جھگڑے کھڑے کر لیتے کہ قبیلے کے قبیلے برسوں کے لیے آپس میں گتھم گتھا ہو جاتے اور سینکڑوں جانیں اس کی نذر ہو جاتیں۔ مجھے خیال ہوتا ہے کہ یہاں 'اِسْتِقْسَام بِالْاَزْلَام' سے یہی دوسری صورت مراد ہے۔

ذٰلِكُمْ فِسْقٌ، 'ذٰلِكُمْ' کا اشارہ اوپر ذکر کی ہوئی تمام چیزوں کی طرف ہے اور 'فسق' کا لفظ یہاں عام فقہی مفہوم میں نہیں ہے بلکہ قرآنی مفہوم میں ہے۔ قرآن میں یہ لفظ کھلی ہوئی نافرمانی، سرکشی، کفر اور شرک سب کی تعبیر کے لیے آیا ہے۔ ابلیس کے متعلق ہے فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ۔

کفار سے معاشرتی انقطاع کا اعلان

اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ الاية، 'الیوم' سے مراد کوئی معین دن نہیں ہے بلکہ وہ زمانہ ہے جس میں یہ آیتیں نازل ہوئی ہیں۔ ہم تمہید میں اشارہ کر آئے ہیں کہ یہ سورہ تمام تر اسلام کے تکمیلی دور کے احکام و ہدایات پر مشتمل ہے۔ کفار کے اس دین سے مایوس ہو جانے کا مطلب یہ ہے کہ اب تک تو وہ اس طمع خام میں مبتلا رہے ہیں کہ وہ اس کو یا تو مغلوب کر لیں گے یا 'کچھ لو اور کچھ دو' کے اصول پر کوئی ایسا سمجھوتہ کر لیں گے کہ دونوں کا نباہ ہو سکے۔ لیکن اب ان کی اس طمع خام کا خاتمہ ہو گیا۔ اب انھوں نے کھلی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ دونوں راہیں ایک دوسری سے اس طرح الگ الگ ہو گئی ہیں کہ اب ان کا کسی نقطۂ اتصال پر جمع ہونا بالکل ناممکن ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ کھانے پینے کی چیزوں کے اشتراک کو معاشرتی ارتباط میں بڑا دخل ہوتا ہے۔ اگر صورت یہ پیدا ہو جائے کہ ایک کے ہاں جو چیزیں حلال و طیب ہوں دوسرے کے ہاں وہ خبیث و حرام قرار دے دی جائیں تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ دونوں میں مکمل معاشرتی انقطاع

کا اعلان ہوگیا اور اب ان دونوں کے مل بیٹھنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی ہے۔ قدرتی طور پر اس چیز نے ان کو اسلام اور مسلمانوں سے آخری درجے میں مایوس کر دیا۔ آخری مایوسی سے بعض مرتبہ آخری جھلاہٹ بھی پیدا ہوتی ہے لیکن یہ مریض کا آخری سنبھالا ہوتی ہے جس کے بعد آخری ہچکی کے سوا کوئی اور چیز باقی نہیں رہ جاتی۔ اس وجہ سے قرآن نے فرمایا کہ اب ان سے اندیشہ ناک ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب وہ زور لگائیں بھی تو ان میں دم کیا ہے۔ اب تم صرف مجھی سے ڈرو۔ ان کی کوئی پروا نہ کرو۔

تکمیلِ دین اور اتمامِ نعمت

'اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ الایۃ' تکمیلِ دین سے مراد اصل دین کی تکمیل ہے اور اتمام نعمت سے مراد اس آخری شریعت کا اتمام ہے۔ جہاں تک اصل دین کا تعلق ہے اس کا آغاز تو حضرت آدمؑ سے ہوا ہے۔ زمانہ کی رفتار کے ساتھ ساتھ، حالات اور حکمتِ الٰہی کے تقاضوں کے مطابق، مختلف انبیاء و رسل پر یہ اترتا رہا یہاں تک کہ خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ کامل ہوگیا۔ اس سے پہلے جو دین آئے وہ اسی دین کے اجزا تھے۔ ان کی حیثیت پورے دین کی نہیں تھی۔ پورے دین کی حیثیت صرف اسی دین کو حاصل ہے۔ اس حقیقت کے اشارات پچھلے آسمانی صحیفوں میں بھی موجود ہیں جن کے حوالے اس کتاب میں بھی گزر چکے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سلسلۂ نبوت کی آخری کڑی اور اس قصرِ دین کے کونے کی آخری اینٹ ہیں۔

جہاں تک اس آخری امت پر اللہ کی نعمت کا تعلق ہے اس کا آغاز غارِ حرا کی پہلی وحی سے ہوا اور درجہ بدرجہ ۲۳ سال کی مدت میں اللہ تعالیٰ نے اس نعمت کا اتمام فرمایا۔ چنانچہ اس مرحلے میں آکر ایک طرف اللہ کا دین بھی اپنے کمال کو پہنچ گیا، دوسری طرف اس امت پر اللہ تعالیٰ کی نعمت بھی پوری ہوگئی۔ اسی کا مجموعی نام اسلام ہے جو ہمیشہ سے اللہ کا دین ہے اور جو حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسمٰعیلؑ کی وراثت کی حیثیت سے نبی امی اور ان کی امت کو منتقل ہوا۔ 'وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا' میں اس دین کے لیے اللہ تعالیٰ کی اس پسندیدگی اور انتخاب کا اظہار ہے جس کے وجوہ و دلائل تفصیل کے ساتھ بقرہ اور آلِ عمران میں گزر چکے ہیں۔ اس پسندیدگی کے اظہار سے بالواسطہ یہودیت اور نصرانیت کے لیے ناپسندیدگی کا اظہار بھی ہوگیا کہ وہ اللہ کے دین نہیں بلکہ دین سے انحراف کی مختلف شکلیں ہیں۔

اضطرار کی شرعی حد

'فَمَنِ اضْطُرَّ فِیْ مَخْمَصَۃٍ غَیْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ'، 'مَخْمَصَۃ'، کے معنی بھوک کے ہیں۔ بھوک سے مضطر ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ آدمی بھوک کی ایسی مصیبت میں گرفتار ہو جائے کہ موت یا حرام میں سے کسی ایک کے اختیار کرنے کے سوا کوئی اور راہ بظاہر کھلی ہوئی باقی ہی نہ رہ جائے۔ ایسی حالت میں اس کو اجازت ہے کہ حرام چیزوں میں سے بھی کسی چیز سے فائدہ اٹھا کر اپنی جان بچا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ 'غَیْرَ مُتَجَانِفٍ' کی قید اسی مضمون کو ظاہر کر رہی ہے جو دوسرے مقام میں 'غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ' سے ادا ہوا ہے۔ یعنی نہ تو دل سے چاہنے والا بنے اور نہ ضرورت کی حد سے آگے بڑھنے والا۔ 'مَخْمَصَۃ' کی قید سے یہ بات صاف

نکلتی ہے کہ جہاں دوسرے غذائی بدل موجود ہوں وہاں مجرد اس عذر پر کہ شرعی ذبیحہ کا گوشت میسر نہیں آتا، جیسا کہ یورپ اور امریکہ کے اکثر ملکوں کا حال ہے، ناجائز کو جائز بنا لینے کا حق کسی کو نہیں ہے۔ گوشت زندگی کے بقا کے لیے ناگزیر نہیں ہے۔ دوسری غذاؤں سے نہ صرف زندگی بلکہ صحت بھی نہایت اعلیٰ معیار پر قائم رکھی جا سکتی ہے۔ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ کی قید اس حقیقت کو ظاہر کر رہی ہے کہ رخصت بہرحال رخصت ہے اور حرام بہر شکل حرام ہے، نہ کوئی حرام چیز شیرِ مادر بن سکتی نہ رخصت کوئی ابدی پروانہ ہے۔ اس وجہ سے یہ بات کسی کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ رفعِ اضطرار کی حد سے آگے بڑھے۔ اگر ان پابندیوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے کوئی شخص کسی حرام سے اپنی زندگی بچائے گا تو اللہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ اگر اس اجازت سے فائدہ اٹھا کر اپنے حظِ نفس کی راہیں کھولے گا تو اس کی ذمہ داری خود اس پر ہے، یہ اجازت اس کے لیے قیامت کے دن عذر خواہ نہیں بنے گی۔

اجزاء کی وضاحت کے بعد آیت کے مجموعی نظام پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔ یہ ان حرمتوں کی تفصیل بیان ہو رہی ہے جن کا پہلی آیت میں اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ کے الفاظ سے حوالہ دیا گیا تھا۔ اس میں پہلے ان چیزوں کا ذکر ہوا جن کی حرمت پہلے ہی بیان ہو چکی تھی، مزید تاکید اور تکمیلِ بحث کے طور پر ان کا بیان بھی اعادہ کر دیا گیا۔ اس کے بعد 'میتۃ' کی تفصیل فرمائی کہ جس طرح طبعی موت سے مرا ہوا جانور مردار ہے اسی طرح ناگہانی اور اتفاقی حوادث سے مرے ہوئے جانور بھی مردار ہیں دونوں کا حکم ایک ہی ہے۔ اسی طرح کسی درندے کا پھاڑا ہوا جانور بھی مردار ہے الا آنکہ تم نے اس کو زندہ پایا ہو اور ذبح کر لیا ہو۔ اسی طرح کسی استھان پر پیش کی ہوئی قربانی اور جوئے کے ذریعے سے تقسیم کیا ہوا گوشت بھی حرام ہے۔ جس طرح غیر اللہ کے نام پر ذبح کیے ہوئے جانور کو شرک کی آلودگی سے حرمت لاحق ہو جاتی ہے اسی طرح غیر اللہ کی خوشنودی اور جوئے کے تعلق سے ان چیزوں کو حرمت لاحق ہو جاتی ہے۔ حرمتوں کا یہ اعلان چونکہ کفار سے کامل معاشرتی انقطاع کے اعلان کے مترادف تھا، اس وجہ سے فرمایا کہ اب کفار تم سے اور تمہارے دین سے مایوس ہو چکے ہیں۔ اب ان کے اندر یہ دم خم باقی نہیں رہا کہ تمہارے دین کو مغلوب کرنے یا اس کو کچھ نرم بنانے کا حوصلہ کریں۔ اب اگر وہ کچھ کریں گے بھی تو وہ بس مایوسی کا مظاہرہ ہوگا تو تم اس کی پروا نہ کرنا، صرف میری ہی پروا کرنا۔ اس کے بعد مسلمانوں کو بشارت دی کہ اب اللہ کا دین بھی تکمیل کی حد کو پہنچا اور تمہاری شریعت بھی اتمام کی منزل کو پہنچی اور اسلام کو خدا نے تمہارے لیے دین کی حیثیت سے پسند فرمایا۔ آخر میں اضطرار کی حالت میں، حرام سے فائدہ اٹھا لینے کی جو رخصت ہے اس کا ذکر فرمایا۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ الاٰية حجۃ الوداع کے موقع پر نازل ہوئی ہے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ یہ نازل تو اسی سلسلے میں حجۃ الوداع سے پہلے ہوئی ہے لیکن اس بشارت کا اعلانِ عام چونکہ حجۃ الوداع ہی کے موقع پر ہوا اس وجہ سے بعض لوگوں کو خیال ہوا کہ اس کا نزول اسی موقع پر ہوا ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ فَكُلُوْا مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ (۴)

سدھائے ہوئے جانوروں کے پکڑے ہوئے شکار کا حکم

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ - سوال قرآن کے معروف اسلوب بیان کے مطابق اختصار کے ساتھ نقل ہوا ہے لیکن جواب بتا رہا ہے کہ سوال، سدھائے اور سکھلائے ہوئے جانوروں کے پکڑے ہوئے شکار سے متعلق ہے کہ اگر وہ شکار پکڑیں اور شکار ذبح کی نوبت آنے سے پہلے ہی دم توڑ دے تو اس کا کیا حکم ہے؟ یہ سوال اس وجہ سے پیدا ہوا ہوگا کہ اوپر والی آیت میں درندے کے پھاڑے ہوئے جانور کو صرف اس صورت میں جائز بتایا ہے جب اس کو زندہ حالت میں ذبح کر لیا جائے۔

تحریم و تحلیل کے باب میں ایک کلیہ

قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ - یہ جواب کا صرف ایک حصہ ہے جو ایک کلیہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ قرآن کا یہ بھی ایک اسلوب ہے کہ وہ کسی سوال کا جواب دیتا ہے تو اس کا آغاز بالعموم جامع بات سے کرتا ہے کہ جواب صرف سوال ہی تک محدود نہ رہ جائے بلکہ ایک وسیع دائرے میں سائل کی رہنمائی کرے۔ چنانچہ پہلے فرمایا کہ تمہارے لیے 'طیبات' حلال ہیں۔ 'طیبات' کا لفظ خبائث کا ضد ہے۔ 'طیبات' اچھی، ستھری اور پاکیزہ چیزوں کو کہتے ہیں۔ سوال چونکہ جانوروں سے متعلق ہے اس وجہ سے اس سے مراد وہ جانور ہوں گے جو اول تو خود اپنے مزاج، اپنی سرشت اور انسان کے لیے اپنی افادیت اور اپنے اثرات کے لحاظ سے اچھے اور پاکیزہ ہوں۔ ثانیاً ان کو اللہ کے نام پر ذبح کر لیا گیا ہو۔ اس طرح اس سے وہ تمام جانور نکل جائیں گے جو اپنے مزاج اور سرشت کے اعتبار سے انسان کے صالح مزاج سے مناسبت رکھنے والے نہ ہوں۔ مثلاً خنزیر، کتے، بندر، درندے اور شکاری پرندے وغیرہ۔ یا مزاج سے مناسبت رکھنے والے تو ہوں لیکن کسی خارجی سبب سے ان کے اندر خبث و فساد پیدا ہو گیا ہو۔ مثلاً جانور مر گیا یا غیر اللہ کے نام پر یا کسی استھان پر اس کو ذبح کیا گیا ہو۔ یہ خبائث میں داخل ہیں۔ قرآن کے اس جواب سے یہ رہنمائی ملی کہ شکار کیے ہوئے جانوروں میں بھی حلال صرف طیبات ہیں، خبائث اس حلت سے خارج ہیں۔

وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ: جوارح، شکاری جانوروں کو کہتے ہیں، عام اس سے کہ وہ درندوں میں سے ہوں مثلاً کتے، شیر، چیتے وغیرہ یا پرندوں میں سے مثلاً باز اور شکرے وغیرہ۔

'کلب' کتے کو کہتے ہیں۔ اسی سے 'تکلیب' بنا لیا ہے جس کے معنی کتے کو شکار کی ٹریننگ دینے کے ہیں۔ ابتداً تو یہ لفظ اسی معنی کے لیے استعمال ہوا لیکن پھر اس کا استعمال شکاری جانوروں کی تربیت کے لیے عام ہو گیا، خواہ کتا ہو یا شکاری درندوں اور پرندوں میں سے کوئی اور جانور۔ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ سے اس تربیت اور ٹریننگ کی نوعیت کا اظہار ہو رہا ہے کہ تم نے اس سلیقہ میں سے ان کو کچھ بتایا اور سکھایا ہو جو اللہ نے تم کو سکھایا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر تربیت میں مربی کے ذوق، اس کی پسند و ناپسند اور اس کے

مقصود تربیت کی جھلک ہوتی ہے اور اس چیز کو جس طرح زیر تربیت انسان اپناتا ہے اسی طرح اپنی جبلی استعداد کے حد تک حیوانات بھی اپناتے ہیں۔ یہ چیز سدھائے ہوئے جانوروں کو دوسرے جانوروں سے بالکل الگ کر دیتی ہے اس وجہ سے ایک عام کتے کے شکار اور ایک سدھائے ہوئے کتے کے شکار میں فرق ایک امر فطری ہے۔ بلکہ ایک مسلمان کے تربیت کردہ کتے اور ایک عیسائی کے تربیت کردہ کتے کے میلان اور سلیقہ میں بھی فرق ہو جائے گا۔ میرے نزدیک تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ کے الفاظ سے اسی خاص سلیقہ کی طرف اشارہ ہو رہا ہے جو کسی سدھائے ہوئے جانور کو اس کے مسلمان مربی سے ملتا ہے۔ اپنے اس سلیقہ کی وجہ سے یہ جانور اپنے مربی کا آلہ اور جارحہ بن جاتا ہے اور اس کا کیا ہوا شکار اس کے لیے اسی طرح طیب بن جاتا ہے جس طرح اس کے اپنے ہاتھ کا ذبیحہ۔

تربیت یافتہ جانور کی علامت

'فَكُلُوْا مِمَّا اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ'، اِمْسَاك کے معنی روکنے اور تھامنے کے ہیں۔ جب اس کے ساتھ 'علیٰ' آئے جیسا کہ 'اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ' میں ہے تو اس کے اندر اختصاص کا مضمون بھی پیدا ہو جاتا ہے یعنی کسی شے کو کسی خاص کے لیے روک یا سینت رکھنا۔ اب یہ سوال کا اصل جواب ہے۔ فرمایا کہ اگر مذکورہ شرائط کے مطابق تربیت کیا ہوا جانور ہو تو اس کے کیے ہوئے شکاروں میں سے وہ شکار تمہارے لیے جائز ہوگا جو وہ خاص تمہارے لیے روک رکھے۔ چونکہ یہاں اختصاص کا مضمون پایا جاتا ہے اس وجہ سے میں اُن لوگوں کے مذہب کو زیادہ قوی سمجھتا ہوں جو کہتے ہیں کہ شکاری جانور شکار میں سے کچھ کھا لے تو وہ شکار جائز نہ ہوگا۔ یہی بات بعض احادیث سے بھی ثابت ہوتی ہے۔ میرے نزدیک اس معاملے میں درندے اور پرندے کے شکار کے درمیان فرق کرنے کی بھی کوئی قوی بنیاد نہیں ہے۔ اس حد تک تربیت جس طرح درندے قبول کر لیتے ہیں، تجربہ کار بتاتے ہیں کہ باز، عقاب، شاہین بھی قبول کر لیتے ہیں۔

'وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ کا مفہوم

'وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ' میں ضمیر مجرور کے مرجع سے متعلق سلف سے تین قول منقول ہیں ایک یہ کہ شکاری جانور کو چھوڑتے وقت اس پر بسم اللہ پڑھ لیا کرو، اس قول کے قائلین کے نزدیک مرجع 'مَا عَلَّمْتُمْ' ہے۔ دوسرا یہ کہ اگر شکار زندہ ہاتھ آگیا ہو تو اس کو بسم اللہ پڑھ کر ذبح کر لو۔ اس گروہ کے نزدیک مرجع 'مَآ اَمْسَكْنَ' ہے۔ تیسرا یہ کہ اس شکار کو کھاتے وقت اس پر بسم اللہ پڑھ لیا کرو۔ ان لوگوں کے نزدیک اس کا تعلق 'فَكُلُوْا' سے ہے۔ ان میں سے پہلے قول کی تائید میں ایک حدیث ہے جو بخاری میں عدی بن حاتم سے مروی ہے کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ میں اپنے سدھائے ہوئے کتے کو شکار پر چھوڑوں اور کوئی دوسرا کتا بھی اس میں شریک بن جائے تو اس کا کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا ایسا شکار نہ کھاؤ کیونکہ تم نے اللہ کا نام اپنے کتے پر لیا ہے، دوسرے کتے پر نہیں لیا ہے۔

دوسرے قول میں یہ ضعف ہے کہ جب اوپر یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ درندے کا کھایا ہوا شکار اگر زندہ ہاتھ آجائے تو اس کو ذبح کر کے کھا سکتے ہو تو تربیت یافتہ جانور کے شکار سے متعلق بعینہٖ اسی حکم کا اعادہ

ایک بالکل غیر ضروری بات کا اعادہ ہے۔

تیسرے قول میں اس طرح کا کوئی ضعف یا اشکال اگرچہ نہیں ہے لیکن یہ بات، عام آداب طعام سے تعلق رکھنے والی بات ہے، یہاں اس کا محل سمجھ میں نہیں آتا۔

شکار بادیہ نشین قوموں کی ایک معاشی ضرورت ہے

اس سوال اور اس کے جواب کی یہ اہمیت ملحوظ رہے کہ شکار عرب میں محض ایک شوقیہ تفریح نہیں تھا بلکہ ان کے ہاں اس کو معاش کے ایک اہم ذریعے کی حیثیت حاصل تھی۔ ان کی معاش کا انحصار تین چیزوں پر تھا۔ گلہ بانی، تجارت، شکار۔ اس معاشی اہمیت کے سبب سے ان کے ہاں شکاری جانوروں کی تربیت کا فن بھی کافی ترقی کر گیا تھا۔ امرؤالقیس جب اپنے شعروں میں اپنی کتیا کا ذکر کرتا ہے تو آدمی حیران رہ جاتا ہے کہ یہ کسی کتیا کا ذکر ہے یا کسی شعلہ صفت پُرفن قتالہ کا۔ اور یہ چیز کچھ عربوں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ دنیا کی تمام بادیہ نشین قوموں کی یہ مشترک خصوصیت ہے۔ اس وجہ سے حلت وحرمت کی اس بحث میں یہ سوال پیدا ہوا اور قرآن نے اس کا جواب دیا۔ اور اس جواب سے یہ حقیقت نہایت واضح طور پر سامنے آجاتی ہے کہ حلت وحرمت اور پاکی و ناپاکی کے حدود کو ملحوظ رکھتے ہوئے شکار، فن شکار اور شکاری جانور ہر چیز کی اسلام نے عزت بڑھائی ہے۔ ایک تربیت پائے ہوئے درندے کی یہ عزت بڑھائی کہ اس کا پکڑا ہوا شکار اگر ذبح سے پہلے ہی دم توڑ دے جب بھی طیب ہے، اس فنِ تربیت کی عزت یہ بڑھائی کہ اس کو تعلیم الٰہی کا ایک جزو قرار دیا، اور یہ رہنمائی دی کہ کتوں اور درندوں کی تربیت کے معاملے میں بھی ایک مسلمان کو اپنے مخصوص اسلامی نقطۂ نظر کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ گویا اسلام میں فنِ شکار بھی دوسروں کے فن شکار سے مختلف مزاج رکھتا ہے۔

آخر میں 'وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ' فرما کر اللہ کے مقرر کردہ حدود اور اس کے عہد و پیمان کے احترام کی یاددہانی یہاں بھی فرما دی کہ شکار کی حرص و ہوس میں خدا کے حدود حلت وحرمت کو نہ بھول جانا ورنہ روز حساب بہت دور نہیں ہے۔ یہ یاددہانی اس پہلو سے بھی بہت ضروری تھی کہ جب شکار معاشی ضرورت ہو تو اس میں بے احتیاطی کے بڑے امکانات ہیں۔

اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ؕ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۪ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۫ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَاۤ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْۤ اَخْدَانٍ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ؗ وَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۵﴾

اس آیت میں کوئی مشکل لفظ یا مشکل ترکیب نہیں ہے۔ اس کے تمام اجزا پچھلی سورتوں میں زیر بحث آچکے ہیں۔ البتہ اس کا موقع محل اچھی طرح سمجھ لینے کا ہے۔

بریں خوان یغما چہ دشمن چہ دوست

یہ آیت اس انعام عام کا اعلان ہے جو خاتم الانبیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے ذریعے

سے تمام دنیا پر عموماً اور اہل کتاب پر خصوصاً ہونے والا تھا پچھلے صحیفوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے متعلق جو پیشین گوئیاں وارد ہیں اور جن میں سے بعض کا حوالہ بقرہ اور آل عمران کی تفسیر میں ہم دے چکے ہیں، ان میں یہ تصریح موجود ہے کہ جب آخری نبی آئیں گے تو اہل کتاب کو طیبات و خبائث سے متعلق خدا کے امر و نہی سے آگاہ کریں گے اور حلال و حرام کے باب میں ان تمام پابندیوں اور بیڑیوں سے ان کو آزاد کریں گے جو انھوں نے اپنے اوپر یا تو از خود عائد کر رکھی ہیں یا ان کی سرکشی کے سبب سے اللہ تعالیٰ نے ان پر عائد کر دی ہیں۔ قرآن مجید نے ان تمام پیشین گوئیوں کا حوالہ سورۂ اعراف میں ان الفاظ میں دیا ہے:

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ	جو لوگ اس رسول، نبی امی کی پیروی کریں گے جس کو
الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ	اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں، جو انھیں
فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ	نیکی کا حکم دیتا ہے، بدی سے روکتا ہے اور ان کے لیے
وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ	پاکیزہ چیزوں کو جائز کرتا ہے اور ناپاک چیزوں کو حرام ٹھہراتا
وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ	ہے اور ان سے ان کے اس بوجھ اور ان پابندیوں کو دور
اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ؕ	کرتا ہے جو ان پر تھیں تو جو لوگ اس پر ایمان لائیں گے،
فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ	اس کی تائید و نصرت کریں گے اور اس روشنی کی پیروی
وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ	کریں گے جو اس کے ساتھ اتاری گئی، وہی لوگ فلاح پانے
اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (الاعراف - ۷ : ۱۵۷)	والے بنیں گے۔

یہ انہی باتوں کا حوالہ ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے ظہور میں آنے والی تھیں چنانچہ آپ کے وجود باجود نے ان میں سے ایک ایک بات کی عملاً تصدیق فرما دی۔ آپ نے تمام طیب اور پاکیزہ چیزیں جائز کر دیں جن میں بعض یہود کے ہاں حرام تھیں، تمام خبیث چیزیں حرام ٹھہرائیں جن میں سے بعض یہود و نصاریٰ نے جائز بنا لی تھیں اور وہ تمام پابندیاں اور بیڑیاں ختم کر دیں جو انھوں نے یا تو از خود اپنے اوپر لادی تھیں یا ان کی ضد، سرکشی، کج روی اور کٹ حجتی کے باعث اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر عائد کر دی گئی تھیں[1]۔ اس مرحلے میں آ کر چونکہ یہ کام مکمل ہو چکا تھا اور یہ بات بالکل واضح ہو چکی تھی کہ اہل کتاب نے جو خبیث چیزیں جائز بنا لی ہیں محض اپنی بدعت سے جائز بنائی ہیں اور جو طیب چیزیں ان پر حرام ہیں وہ محض ان کی سرکشی کی سزا کے طور پر حرام ہیں، نبی امی کی بعثت کے بعد یہ پابندیاں ختم ہو گئیں تو مسلمانوں کو اجازت دے دی گئی کہ حرام و حلال اور خبیث و طیب کی اس وضاحت کے بعد اب تم اہل کتاب کا کھانا کھا سکتے ہو اس لیے کہ اب تمہارے لیے کسی خبیث سے آلودہ

---

[1] اس کی تفصیل سورۂ انعام آیت ۱۴۶ کے تحت آئے گی۔

ہو جانے کا اندیشہ نہیں رہا اور ساتھ ہی اس بات کا بھی اعلان کر دیا گیا کہ تمہارا کھانا اہل کتاب کے لیے جائز ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے وعدے کے مطابق نبی امی کی بعثت کے بعد اب وہ تمام پابندیاں ختم ہو گئیں جو ان پر عائد تھیں۔

ایک سوال اور اس کا جواب

ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ یہود منتظر کب تھے کہ قرآن ان کے لیے مسلمانوں کے کھانے کے جائز ہونے کا اعلان کرے، پھر اس کا فائدہ کیا، یہ تو مفت کرم داشتن کے قسم کی بات ہوئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہود منتظر تو تھے اور منتظر ہوتے کیوں نہ جب کہ ان کے اپنے صحیفوں میں آخری نبی کی پیشین گوئی اس تصریح کے ساتھ موجود تھی کہ وہ بنی اسرائیل کو تمام اصرو اغلال سے نجات دیں گے لیکن اس نبی کی بعثت چونکہ ان کے حریفوں یعنی بنی اسمٰعیل کے اندر ہوئی اس وجہ سے جان بوجھ کر جیسا کہ بقرہ اور آل عمران میں وضاحت ہو چکی ہے، وہ اس کی مخالفت کے درپے ہو گئے اور حسد میں انھوں نے اپنے آپ کو ان تمام رحمتوں اور برکتوں سے محروم کر لیا جن کے سب سے پہلے حقدار وہی تھے اگر وہ نبی امی پر ایمان لاتے۔

پھر فرض کیجیے، بنی اسرائیل اس کے منتظر نہیں تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ ان سے فرمایا تھا اس کو تو پورا ہونا تھا۔ ان سے جب یہ وعدہ تھا کہ آخری نبی کے ذریعے سے کھانے پینے کے معاملے میں وہ تمام پابندیاں ان سے اٹھالی جائیں گی جو ان کی سرکشی کے سبب سے عائد ہوئی ہیں تو جب اس وعدے کے پورا کرنے کا وقت آیا اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کا کھانا ان کے لیے جائز کر کے یہ وعدہ پورا کر دیا۔ رہی یہ بات کہ انھوں نے اس کی قدر نہیں کی، تو یہ ان کی اپنی محرومی و بدقسمتی ہے۔ ان کی نالائقی کی وجہ سے آخر خدا اپنے وعدے کو کیوں فراموش کرتا؟ سورج چمکتا ہے خواہ کوئی اپنی آنکھیں بند رکھے یا کھلی رکھے۔ نسیم صبح اپنی عطر بیزیوں سے ہر مشامِ جان کو معطر کرنا چاہتی ہے اور اس کے فیض عام کا تقاضا بھی ہے کہ وہ ہر ایک کو فیض یاب کرے لیکن جو محروم القسمت اپنی ناک اور اپنے منہ بند کر لیتے ہیں وہ اس سے محروم ہی رہتے ہیں۔ اسی طرح رب کریم نے جو سفرۂ نعمت اس امت کے ذریعے سے تمام دنیا کے آگے بچھانا چاہا تھا وہ بچھا دیا اور اس سے متمتع ہونے کی دعوت اہل کتاب کو بھی دے دی۔ انھوں نے اس سے فائدہ نہیں اٹھایا تو یہ ان کی اپنی بدقسمتی ہے۔

اہل کتاب کا کھانا اسلامی حدود حلت و حرمت کی پابندی کے ساتھ جائز ہے

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی کہ مسلمانوں کو اہل کتاب کے کھانے پینے کی چیزوں سے فائدہ اٹھانے کی اجازت جو دی گئی ہے وہ اس وقت دی گئی ہے جب ان کو اس باب کی آخری ہدایات سے آگاہ کیا جا چکا ہے، جب حلال و حرام دونوں اچھی طرح واضح کر دیے گئے ہیں، جب اہل کتاب اور مشرکین دونوں کی بدعات کی تفصیل ان کو سنا دی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سارے اہتمام کا مقصد مسلمانوں کو یہ بتانا تھا کہ تم دنیا کی دوسری قوموں کے ساتھ معاشرتی تعلقات رکھو لیکن حلت و حرمت کے ان

حدود کی پابندی کے ساتھ جو تمہارے لیے قائم کر دیے گئے ہیں۔ اس آیت میں 'الیوم' کا لفظ خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اب تمہیں خبیث و طیب کا پورا امتیاز حاصل ہو چکا ہے اس وجہ سے تمہیں یہ اجازت دی جا رہی ہے۔ یہ خطرہ نہیں رہا کہ تم ان کے دسترخوان پر بیٹھ کر کسی حرام یا مشتبہ میں مبتلا ہو جاؤ گے۔[1]

کتابیات سے جوازِ نکاح کی شرط

اس کے بعد فرمایا کہ جس طرح تمہارے لیے شریف اور پاک دامن مسلمان عورتوں سے نکاح جائز ہے اسی طرح شریف اور پاک دامن کتابیات سے بھی نکاح جائز ہے۔ یہاں لفظ مُحْصَنٰتُ استعمال ہوا ہے۔ یہ لفظ قرآن میں تین معنوں میں آیا ہے اور ہم اس کے تینوں معنوں کی وضاحت دوسرے مقام میں کر چکے ہیں۔ یہاں قرینہ دلیل ہے کہ اس سے مراد باعزت، شریف اور اچھے اخلاق کی عورتیں ہیں۔ یعنی یہ اجازت مشروط ہے اس شرط کے ساتھ کہ یہ عورتیں بد چلن، پیشہ ور، آوارہ اور بد قوارہ نہ ہوں۔ جس طرح تمہارے لیے ان کے دسترخوان کی صرف طیبات جائز ہیں اسی طرح ان کی عورتوں میں سے صرف محصنات جائز ہیں۔

ہمارے سلف صالحین میں سے ایک گروہ نے دارالحرب اور دارالکفر میں کتابیات سے نکاح کو مکروہ قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک اس کے جواز کے لیے دارالاسلام ہونا بھی ایک شرط ہے۔ مجھے یہ قول بہت ہی قوی معلوم ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات انھوں نے فحوائے کلام سے مستنبط کی ہے۔ میں اس کے ماخذ کے لیے لفظ اَلْیَوْمَ کی طرف پھر توجہ دلاتا ہوں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اجازت میں وقت کے حالات کو بھی دخل ہے۔ اوپر اَلْیَوْمَ یَئِسَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا اور اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ والی آیات بھی گزر چکی ہیں اور فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ بھی ارشاد ہو چکا ہے، جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اس دور میں کفار کا دبدبہ ختم ہو چکا تھا اور مسلمان ایک ناقابلِ شکست طاقت بن چکے تھے۔ یہ اندیشہ نہیں تھا کہ ان کو کتابیات سے نکاح کی اجازت دی گئی تو وہ کسی احساس کمتری میں مبتلا ہو کر تہذیب اور معاشرت اور اعمال و اخلاق میں ان سے متاثر ہوں گے، بلکہ توقع تھی کہ مسلمان ان سے نکاح کریں گے تو ان کو متاثر کریں گے اور اس راہ سے ان کتابیات کے عقائد و اعمال میں خوشگوار تبدیلی ہو گی اور عجب نہیں کہ ان میں بہت سی ایمان و اسلام سے مشرف ہو جائیں۔

علاوہ ازیں یہ پہلو بھی قابلِ لحاظ ہے کہ کتابیات سے نکاح کی اجازت بہرحال علی سبیل التنزل دی گئی ہے۔ اس میں آدمی کے خود اپنے اور اس کے آل و اولاد اور خاندان کے دین و ایمان کے لیے جو خطرہ ہے، وہ مخفی نہیں ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ مسلمان مردوں کو تو کتابیات سے نکاح کی اجازت دی گئی

---

[1] اہل کتاب کے ذبیحہ کے جواز کے لیے بھی کسوٹی یہی ہے جو یہاں بیان ہوئی ہے بلکہ اصلاً تو یہ بحث، جیسا کہ سیاق کلام سے واضح ہے، ذبیحہ ہی سے متعلق ہے۔

لیکن مسلمان عورت کو کسی صورت میں بھی کسی غیر مسلم سے نکاح کی اجازت نہیں دی گئی خواہ کتابی ہو یا غیر کتابی۔ یہ چیز اس بات کی دلیل ہے کہ یہ اجازت صرف ایک اجازت ہے۔ یہ کوئی مستحسن چیز نہیں ہے۔ اگر ماحول اسلامی تہذیب و معاشرت کا ہو اور آدمی کسی نیک چال چلن کی کتابیہ سے نکاح کر لے تو اس میں مضائقہ نہیں لیکن کافرانہ ماحول میں جہاں کفر اور اہل کفر کا غلبہ ہو اس قسم کا نکاح چاہے اس آیت کے الفاظ کے خلاف نہ ہو لیکن اس کے فحویٰ، اس کی روح اور اس کے موقع و محل کے خلاف ضرور ہے۔

یہ بات یہاں چنداں یاد دلانے کی ضرورت نہیں ہے کہ اسلام کے بہت سے قوانین دارالاسلام کی شرط کے ساتھ مشروط ہیں۔ اسی طرح بعض رخصتیں اور اجازتیں بھی خاص ماحول اور خاص حالات کے ساتھ مشروط ہیں۔ آگے اس سلسلے کی بعض اہم باتیں بیان ہوں گی۔

'مُحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسٰفِحِیْنَ' پر ہم تفصیل کے ساتھ سورۂ نساء کی آیات ۲۴-۲۵ کے تحت بحث کر چکے ہیں۔

'کفر بالایمان' کا مطلب

'وَمَنْ یَّکْفُرْ بِالْاِیْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ' کفر بالایمان کا مطلب یہ ہے کہ آدمی خدا اور رسول کو ماننے کا دعویٰ بھی کرے اور ساتھ ہی خدا اور رسول کے احکام کے صریح خلاف محض اپنی خواہشات کی اتباع میں قانون و شریعت ایجاد کر کے اس پر عمل پیرا بھی ہو۔ یہ وہی ایمان ہے جس کو قرآن نے 'نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ' سے تعبیر کیا ہے۔ کفر و ایمان دونوں کے اس ملغوبہ کی خدا کے ہاں کوئی پوچھ نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں ایمان صرف وہ معتبر ہے جو اللہ تعالیٰ کے شرائط پر ہے۔ جو لوگ اپنے شرائط پر ایمان لاتے ہیں ان کا ایمان ان مدعیان ایمان کے منہ پر پھینک مارا جائے گا اور اس قسم کے ایمان کے تحت کیے ہوئے سارے اعمال خدا کے ہاں ڈھے جائیں گے۔ اس پر پیچھے بھی بحث گزر چکی ہے۔

۲- آگے کا مضمون ___ آیات ۶-۱۱

اوپر طعام و نکاح کے باب کے طیبات و خبائث کا ذکر فرما کر ان کی تطہیر فرمائی۔ اب نماز کی طہارت کا بیان آ رہا ہے۔ نماز کی طہارت وضو ہے اور بصورتِ جنابت غسل۔ اسی ذیل میں پانی نہ ملنے یا کسی عذر کی صورت میں تیمم کی اجازت مرحمت فرمائی جو اس امت پر اتمامِ نعمت ہے اور یہ اس باب کا تکمیلی حکم ہے۔

اس کے بعد اس سلسلے میں جو اتمام نعمت فرمایا ہے اس کی یاد دہانی کرتے ہوئے آگاہ فرمایا کہ تم 'سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا' کہہ کر خدا کے ساتھ جس عہد میں شریک ہوئے ہو اس کو برابر یاد رکھنا۔ اللہ سے ڈرتے رہنا۔ خدا سے کوئی بات بھی ڈھکی چھپی رہنے والی نہیں ہے۔ وہ دلوں کے بھیدوں سے بھی اچھی طرح باخبر ہے۔

اس کے بعد قیام بالقسط اور شہادت علی الناس کے جس منصب پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو مامور فرمایا ہے اس کی یاد دہانی فرما دی تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ اب اس دنیا میں حق و عدل کی میزان وہی ہیں۔ اگر انھوں نے انحراف اختیار کیا تو ہر چیز ٹیڑھی ہو جائے گی۔ اس سلسلے میں انحراف کے اس سب سے بڑے محرک

کا بھی حوالہ دیا جو پچھلی امتوں کے لیے مزلۂ قدم ثابت ہو چکا ہے تاکہ یہ امت اس سے اچھی طرح ہوشیار رہے۔ ساتھ ہی یہ بھی واضح فرما دیا کہ اگر تم موافق و مخالف سب کے لیے حق و عدل پر قائم رہنے والے ثابت ہوئے تو آخرت کا اجرِ عظیم بھی تمہارے لیے ہے اور دنیا میں بھی تمہی کامیاب و بامراد رہو گے تمہارے دشمن تمہارا کچھ بھی نہ بگاڑ سکیں گے۔ اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمایئے۔

آیات ۶ - ۱۱

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا قُمۡتُمۡ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغۡسِلُوۡا وُجُوۡهَكُمۡ وَاَيۡدِيَكُمۡ اِلَى الۡمَرَافِقِ وَامۡسَحُوۡا بِرُءُوۡسِكُمۡ وَاَرۡجُلَكُمۡ اِلَى الۡـكَعۡبَيۡنِ‌ؕ وَاِنۡ كُنۡتُمۡ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوۡا‌ ؕ وَاِنۡ كُنۡتُمۡ مَّرۡضٰۤى اَوۡ عَلٰى سَفَرٍ اَوۡ جَآءَ اَحَدٌ مِّنۡكُمۡ مِّنَ الۡغَآئِطِ اَوۡ لٰمَسۡتُمُ النِّسَآءَ فَلَمۡ تَجِدُوۡا مَآءً فَتَيَمَّمُوۡا صَعِيۡدًا طَيِّبًا فَامۡسَحُوۡا بِوُجُوۡهِكُمۡ وَاَيۡدِيۡكُمۡ مِّنۡهُ‌ ؕ مَا يُرِيۡدُ اللّٰهُ لِيَجۡعَلَ عَلَيۡكُمۡ مِّنۡ حَرَجٍ وَّلٰـكِنۡ يُّرِيۡدُ لِيُطَهِّرَكُمۡ وَلِيُتِمَّ نِعۡمَتَهٗ عَلَيۡكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ ۞ ۶ وَاذۡكُرُوۡا نِعۡمَةَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ وَمِيۡثَاقَهُ الَّذِىۡ وَاثَقَكُمۡ بِهٖۤ ۙ اِذۡ قُلۡتُمۡ سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا وَاتَّقُوا اللّٰهَ‌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ۞ ۷ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا كُوۡنُوۡا قَوّٰمِيۡنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالۡقِسۡطِ‌ وَلَا يَجۡرِمَنَّكُمۡ شَنَاٰنُ قَوۡمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعۡدِلُوۡا‌ ؕ اِعۡدِلُوۡا هُوَ اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰى‌ وَاتَّقُوا اللّٰهَ‌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ ۞ ۸ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ‌ ۙ لَهُمۡ مَّغۡفِرَةٌ وَّاَجۡرٌ عَظِيۡمٌ ۞ ۹ وَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا وَكَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَاۤ اُولٰۤـئِكَ اَصۡحٰبُ الۡجَحِيۡمِ ۞ ۱۰ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اذۡكُرُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ اِذۡ هَمَّ قَوۡمٌ اَنۡ يَّبۡسُطُوۡۤا اِلَيۡكُمۡ اَيۡدِيَهُمۡ فَكَفَّ اَيۡدِيَهُمۡ عَنۡكُمۡ‌ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ‌ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلۡيَتَوَكَّلِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ۞ ۱۱ ع

ترجمۂ آیات ۶-۱۱

اے ایمان والو، جب تم نماز کے لیے اٹھو تو اپنے منہ اور اپنے ہاتھ کہنیوں تک دھو لو اور اپنے سروں کا مسح کرو اور اپنے پاؤں ٹخنوں تک دھوؤ اور اگر حالتِ جنابت میں ہو تو غسل کر لو، اور اگر تم مریض ہو یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی جائے ضرور سے آیا ہو یا عورتوں سے ملاقات کی ہو، پھر پانی نہ پاؤ تو پاک جگہ دیکھ کر اپنے چہروں اور اپنے ہاتھوں پر اس سے مسح کر لو، اللہ یہ نہیں چاہتا کہ تم پر کوئی تنگی ڈالے بلکہ وہ چاہتا ہے کہ تمہیں پاک کرے اور تم پر اپنی نعمت تمام کرے تاکہ تم اس کے شکر گزار رہو۔ ۶

اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا، جب کہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ سینوں کے بھیدوں سے بھی باخبر ہے۔ اے ایمان والو، عدل کے علم بردار بنو، اللہ کے لیے اس کی شہادت دیتے ہوئے، اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر نہ ابھارے کہ تم عدل نہ کرو۔ عدل کرو۔ یہی تقویٰ سے قریب تر ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے باخبر ہے۔ جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ ان کے لیے مغفرت اور اجرِ عظیم ہے اور جنھوں نے کفر کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا وہی لوگ دوزخ والے ہیں۔ اے ایمان والو، اپنے اوپر اللہ کے فضل کو یاد کرو جب کہ ایک قوم نے ارادہ کیا کہ تم پر دست درازی کرے تو اللہ نے تم سے ان کے ہاتھ کو روک دیا اور اللہ سے ڈرتے رہو اور اللہ ہی پر چاہیے کہ اہلِ ایمان بھروسہ کریں۔ ۷-۱۱

۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَی الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَیْدِیَكُمْ اِلَی الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا

بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ ۭ وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا ۭ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰي سَفَرٍ اَوْ جَاۗءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَاۗىِٕطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَاۗءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَاۗءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ ۭ مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۶)

وضوء سے طہارت حاصل کرنے کا طریقہ

'اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ'، 'قام' کے بعد جب 'الیٰ' آتا ہے تو اس کے معنی قصد کرنے کے ہوتے ہیں۔ یعنی جب تم نماز کا قصد کرو تو اس کے لیے طہارت حاصل کر لو۔ پھر اس طہارت کا طریقہ بتایا ہے جس پر ہم خود بھی پیچھے بحث کر چکے ہیں اور اس کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں بھی موجود ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے بھی ثابت ہے اور عقل و فطرت بھی گواہی دیتی ہے کہ ایک مرتبہ کی حاصل کردہ طہارت اس وقت تک باقی رہتی ہے جب تک کوئی ناقض حالت پیش نہ آ جائے۔ اس وجہ سے یہ ہدایت اس حالت کے لیے ہے جب آدمی کا وضو باقی نہ ہو۔ اگر باقی ہو تو تازہ وضو کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص نشاطِ خاطر حاصل کرنے کے لیے تازہ وضو کرے تو یہ فضیلت تو ضرور ہے لیکن شریعت کا مطالبہ نہیں ہے۔

رہے یہ سوالات کہ دھونے کا طریقہ کیا ہے۔ مذکورہ اعضا ایک ایک بار دھوئے جائیں یا دو دو تین تین بار، مَل مَل کے دھوئے جائیں یا صرف پانی بہا لیا جائے۔ کنپٹی، داڑھی اور کہنیوں کے معاملے میں کیا طریقہ اختیار کیا جائے تو ان کا تعلق احکام سے نہیں بلکہ آداب سے ہے اور آداب سیکھنے کا بہترین ذریعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ آپ کی سنت سے جو باتیں ثابت ہوں خواہ اس کی شکلیں مختلف ہوں، سب میں خیر و برکت ہے۔

'وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ' مسح کے معنی ہاتھ پھیرنے کے ہیں اور حرف 'ب'، اس طرح کے مواقع میں احاطہ کے مفہوم پر دلیل ہوتا ہے۔ اس وجہ سے مجھے ان لوگوں کا مسلک قوی معلوم ہوتا ہے جو پورے سر کے مسح کے قائل ہیں۔ اگرچہ عمامہ وغیرہ کی صورت میں رفعِ زحمت کے پہلو سے سر کے جزوی حصے کا مسح بھی کافی ہے۔

'وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ' اس کا عطف 'اَيْدِيَكُمْ' پر ہے۔ اس وجہ سے یہ ان اعضا کے تحت داخل ہے جن کے لیے دھونے کا حکم ہے۔ وضو میں اعضا کی ترتیب واضح کرنے کے لیے اس کو مؤخر کر دیا گیا ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ ترتیب فطری بھی ہے اور شرعی بھی۔ بعض لوگوں نے اس کو مسح کے تحت داخل کیا ہے لیکن یہ قول متواتر قراءت اور متواتر سنت کے بھی خلاف ہے اور عربیت کے بھی۔ اگر پاؤں کا مسح ہوتا تو اس کے ساتھ 'اِلَى الْكَعْبَيْنِ' کی قید بالکل غیر ضروری تھی۔ چنانچہ دیکھیے، وضو میں ہاتھ دھونے کے لیے 'اِلَى الْمَرَافِقِ' کی قید لگائی ہے لیکن تیمم میں جہاں مسح کا حکم دیا ہے 'اِلَى الْمَرَافِقِ' کی پابندی اڑا دی اس لیے کہ مسح میں اس قسم کی پابندی ایک بالکل غیر مفید بات تھی۔

'وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا الاية' یہ ٹکڑا معمولی تغیر الفاظ کے ساتھ سورۂ نساء آیت ۴۳ میں بھی گزر چکا ہے وہاں ہم تفصیل کے ساتھ بحث کر چکے ہیں۔

وضو اور تیمم کے احکام کی علت و حکمت

'مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ الاية' یہ اس حکم کی علت و حکمت بیان ہو رہی ہے کہ اگر کچھ لوگوں نے ان پابندیوں کو سخت محسوس کیا ہو تو ان پر ان کی افادیت واضح ہو جائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ غیر عادی طبائع پر غسل اور وضو کی یہ پابندی ہے بڑی شاق اور بڑی آزمائش کی چیز لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ پابندی بندوں کو مشقت میں ڈالنے کے لیے نہیں عائد کی ہے۔ اگر مشقت مقصود ہوتی تو بیماری اور سفر وغیرہ کی حالت میں تیمم کی اجازت کیوں مرحمت ہوتی؟ بلکہ یہ بندوں کو پاکیزہ بنانے کے لیے عائد کی گئی ہے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ خدا اور اس کے قدوسیوں کا قرب حاصل کرنے کے اہل ہو سکیں۔ اصلاً تو پاکیزگی باطن کی مطلوب ہے اور نماز باطن ہی کی پاکیزگی کے لیے فرض کی گئی ہے لیکن ظاہر اور باطن میں بڑا گہرا رشتہ ہے۔ ظاہر کا اثر باطن پر اور باطن کا اثر ظاہر پر پڑتا ہے۔ اس وجہ سے اسلام نے نماز کے لیے وضو کا حکم دیا ہے اور ناپاکی کی حالت ہو تو غسل کا۔ یہ چیز اس باطنی طہارت کے حصول میں معین ہے جو نماز کا اصل مقصود ہے۔

'وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ' میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نماز کے باب میں وضو اور تیمم کے ان احکام کے بعد اللہ کی نعمت تم پر تمام کی گئی۔ سورۂ نساء میں تیمم پر بحث کرتے ہوئے ہم اشارہ کر آئے ہیں کہ یہود کے ہاں طہارت کے معاملے میں بڑی سخت قیدیں اور پابندیاں تھیں۔ اول تو ان کی شریعت کے احکام تھے ہی سخت، پھر ان پر مزید اضافہ ان کے فقہا کے تشددات نے کر دیا تھا۔ تیمم کا ان کے ہاں کوئی تصور ہی نہیں تھا اور یہ بات تو ان کے ہاں انتہائی بد دینی کی تھی کہ کوئی شخص حدث و جنابت کی حالت میں خواہ کیسی ہی معذوری و مجبوری ہو، مجرد تیمم پر اکتفا کر کے نماز پڑھ لے۔ چنانچہ قرآن میں جب تیمم کی اجازت نازل ہوئی تو اس کا انھوں نے نہ صرف مذاق اڑایا بلکہ اس کو دلیل بنا کر یہاں تک کہنے لگے کہ ان مسلمانوں سے زیادہ ہدایت یافتہ تو مکہ کے مشرکین ہیں۔ یہود کے یہ تشددات بھی منجملہ ان اصار و اغلال کے تھے جو خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے دور ہونے والے تھے چنانچہ تیمم کی اجازت نے طہارت کے باب میں اللہ کی نعمت کا اتمام فرمایا اور اس اتمام نعمت سے اس امت کو جو سہولتیں اور برکتیں حاصل ہوئیں ان پر ہر آن شکر واجب ہے۔

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (۷)

اب یہ اس اتمام نعمت کا حق بتایا ہے کہ اللہ نے اپنی آخری اور کامل شریعت تم پر نازل کر کے جو فضل و انعام فرمایا ہے اور تم کو جو عزت و سرفرازی بخشی ہے، یہود کی طرح اس کو بھول نہ جانا بلکہ اس کو ہمیشہ یاد رکھنا۔ 'یاد رکھنا' اپنے حقیقی مفہوم میں ہے۔ یعنی ظاہراً و باطناً ہر پہلو سے اس کا حق ادا کرنا۔ اس کے بعد

اس ذمہ داری کی نوعیت واضح فرما دی کہ یہ تمہارے اور تمہارے رب کے درمیان ایک مضبوط میثاق کی حیثیت رکھتی ہے جو خدا نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے تم سے لیا ہے اور تم نے پیغمبر کے سامنے سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا کہہ کر اس میثاق کی ذمہ داری اٹھائی ہے۔ خدا نے تمہارے لیے دنیا و آخرت کی کامرانیوں کے جو وعدے فرمائے ہیں وہ اسی میثاق پر منحصر ہیں۔ اگر تم نے اس کو توڑا تو اس کی سزا بڑی ہی سخت ہے، اس لیے اللہ سے ڈرتے رہو اور یہ بات یاد رکھو کہ خدا دلوں کے بھیدوں سے بھی واقف ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ؗ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۟ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ؗ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (۸)

میثاقِ شریعت کی ذمہ داری امتِ مسلمہ پر

'كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ' تھوڑے سے تغیرِ الفاظ کے ساتھ یہ ٹکڑا سورۂ نساء کی آیت ۱۳۵ میں بھی گزر چکا ہے۔ وہاں اس کی وضاحت ہو چکی ہے۔ یہ اسی میثاق کی اجتماعی ذمہ داری واضح کی گئی ہے کہ مسلمانوں پر بحیثیت امتِ مسلمہ یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس حق و عدل کے علم بردار بنیں جو اس آخری شریعت کی شکل میں ان کو عطا ہوا ہے۔ خود اپنے اندر اس کو قائم کریں اور اسی کی شہادت دنیا کے سامنے دیں۔

'وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ' یہ ٹکڑا اسی سورہ کی آیت ۲ میں گزر چکا ہے۔ یہ حق و عدل کی راہ کے سب سے بڑے فتنے سے آگاہ کیا گیا ہے کہ کسی قوم کی دشمنی اور اس کا غلط سے غلط رویہ بھی تمہیں اس حق و عدل سے ہٹانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ شیطان نے راہِ حق سے گمراہ کرنے میں سب سے زیادہ جس حربے سے کام لیا وہ یہی ایک دوسرے کے ساتھ دشمنی کا حربہ ہے۔ یہود نے محض بنی اسمٰعیل اور مسلمانوں کی دشمنی میں اس تمام عہد و پیمان کو خاک میں ملا دیا جس کے وہ گواہ اور ذمہ دار بنائے گئے تھے۔ اس وجہ سے مسلمانوں سے یہ عہد لیا گیا کہ وہ شیطان کے اس فتنے سے بچ کے رہیں۔ دوستوں اور دشمنوں دونوں کے لیے ان کے پاس بس ایک ہی باٹ اور ایک ہی ترازو ہو۔

'اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى' یہی عدل، تقویٰ سے اقرب ہے۔ یعنی تقویٰ جو تمام دین و شریعت کی روح اور اہلِ ایمان کے ہر قول و فعل کے لیے کسوٹی ہے اس سے موافقت رکھنے والا طرزِ عمل یہی ہے کہ دشمن کی دشمنی کے باوجود اس کے ساتھ کوئی معاملہ عدل و حق سے ہٹ کر نہ کیا جائے۔ اس سے دین میں تقویٰ کا مقام واضح ہوا کہ تمام نیکیاں درحقیقت اسی کی جڑ سے ہیں۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَاۤ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ (۹-۱۰)

یہ مذکورہ بالا میثاق پر عمل کرنے اور نہ کرنے دونوں کا نتیجہ بیان ہوا ہے کہ جو لوگ اس میثاق پر قائم رہیں گے ان کے لیے مغفرت اور اجرِ عظیم ہے اور جو اس کو توڑیں گے ان کے لیے جہنم ہے۔ اس سے ایک تو یہ بات نکلی کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہم پر اس میثاق کی ذمہ داری ڈالی ہے، اسی طرح اپنے

اوپر بھی اس کے جواب میں ایک عہد کی ذمہ داری لی ہے۔ اس کا اظہار 'وَعَدَ اللّٰهُ' کے الفاظ سے ہو رہا ہے۔ یہ رب کریم کی کتنی بڑی بندہ نوازی ہے کہ وہ اپنی ہی پیدا کی ہوئی اور اپنی ہی پروردہ مخلوق کے ساتھ ایک معاہدے میں شریک ہوا اور جواب میں اپنی ذات پر بھی ایک عہد کی ذمہ داری اٹھائے۔ انسان کو یہ وہ شرف بخشا گیا ہے جس میں کوئی دوسرا اس کا شریک نہیں۔ دوسری بات یہ نکلی کہ ایمان وعمل صالح کی تعبیر ایک جامع تعبیر ہے جس میں وہ سب کچھ شامل ہے جو پروردگار نے اپنی شریعت کی شکل میں ہمیں عطا فرمایا ہے اور جس کی پابندی کا ہم سے اقرار لیا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْۤا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (۱۱)

اوپر آیت ۸ میں مسلمانوں سے ہر حالت میں حق و عدل پر قائم رہنے اور مخالفین کے علی الرغم اس کو نباہنے اور اس کی شہادت دینے کا جو عہد لیا ہے اس میں یہ اشارہ موجود ہے کہ اب تمہیں مخالفوں کی مخالفت کی پروا نہیں کرنی ہے۔ اگر تم اس عہد پر جمے رہے تو خدا کی مدد و نصرت ہر قدم پر تمہارے ساتھ ہے۔ تمہارے دشمن تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔ بعینہٖ یہی مضمون 'فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ' میں گزر چکا ہے۔ اب یہ اسی بات کی تائید میں واقعاتی شہادت پیش کر دی ہے کہ دیکھ لو، ایک قوم نے اس راہ میں تمہاری مزاحمت کی کوشش کی لیکن وہ تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکی۔ خدا نے اس کے ہاتھ باندھ دیے۔ اسی طرح اگر تم اپنے رب کے عہد و پیمان پر قائم رہے تو خدا ہر اس قوم کے مقابل میں تمہاری مدد فرمائے گا جو تمہارے مقابل میں سر اٹھائے گی۔ تم جب خدا پر ایمان لائے ہو تو تمہارے اس ایمان کا تقاضا یہی ہے کہ تم اپنے رب پر بھروسہ کرو۔

اس آیت میں قوم سے اشارہ میرے نزدیک قریش کی طرف ہے۔ اوپر آیت ۲ اور آیت ۸ میں بھی اشارہ انہی کی طرف ہے۔ لفظ کی تنکیر تحقیر شان کی طرف بھی اشارہ کر رہی ہے اور اس سے یہ ظاہر کرنا بھی مقصود ہے کہ متکلم کے پیش نظر ایک حقیقت کا بیان و اظہار ہے نہ کہ کسی خاص قوم کا، تاہم اشارے کی حد تک، جیسا کہ میں نے عرض کیا، اس سے مراد قریش ہی ہیں۔ اس سورہ کے مطالب سے، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اس دور کی سورت ہے جب مسلمان ایک سیاسی قوت بن چکے ہیں۔ ہجرت کے چھٹے، ساتویں سال تک ایسے حالات پیدا ہو چکے تھے کہ قریش متعدد زور آزمائیاں کر کے مسلمانوں کے ساتھ معاہدہ کرنے پر مجبور ہو گئے تھے اور یہود بھی اپنی درپردہ سازشوں کی ناکامیوں کے نہایت تلخ تجربات کر کے ہمت ہار چکے تھے۔

۴۔ آگے کا مضمون ___ آیات ۱۲-۱۴

یہود و نصاریٰ سے جو عہد لیا گیا تھا آگے اس کا ذکر فرمایا ہے اور اس عہد کو توڑ کر وہ جن نتائج

سے بعد چار جھوٹے بالاجمال ان کی طرف بھی اشارہ ہے۔ مقصود اس سے مسلمانوں کو متنبہ کرنا ہے کہ اب تم سے جو عہد لیا جا رہا ہے یہ بھی اسی نوعیت کا عہد ہے اور اگر تم نے بھی اس عہد کے ساتھ وہی معاملہ کیا جو یہود و نصاریٰ نے کیا تو تمہارے سامنے بھی وہی نتیجہ آئے گا جو ان کے سامنے آیا ـــــ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۲-۱۴

وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۚ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ۗ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مَعَكُمْ ۭ لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاۗءَ السَّبِيْلِ ﴿۱۲﴾ فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً ۚ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ۙ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۚ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰي خَاۗىِٕنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳﴾ وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۠ فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاۗءَ اِلٰي يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۭ وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۱۴﴾

ترجمۂ آیات ۱۲-۱۴

اور اللہ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور ہم نے ان میں سے بارہ نقیب مامور کیے اور اللہ نے ان سے وعدہ کیا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں، اگر تم نماز کا اہتمام رکھو گے، زکوٰۃ دیتے رہو گے، میرے رسولوں پر ایمان لاؤ گے، ان کی مدد کرتے رہو گے اور اللہ کو قرض حسن دیتے رہو گے تو میں تم سے تمہارے گناہ دور کر دوں گا اور تم کو ایسے باغوں میں داخل

کروں گا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ پس جو اس کے بعد بھی تم میں سے کفر کرے گا تو وہ اصل شاہراہ سے بھٹک گیا۔ پس ان کے اپنے عہد کو توڑ دینے کے سبب سے ہم نے ان پر لعنت کر دی اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا۔ وہ کلام کو اس کے موقع و محل سے ہٹاتے ہیں اور جس چیز کے ذریعے سے ان کو یاد دہانی کی گئی تھی اس کا ایک حصہ وہ بھلا بیٹھے اور تم برابر ان کی کسی نہ کسی خیانت سے آگاہ ہوتے رہو گے۔ پس تھوڑے سے ان میں سے اس سے مستثنیٰ ہیں۔ پس ان کو معاف کرو اور ان سے درگزر کرو۔ اللہ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ ۱۲-۱۳

اور جو لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں، ہم نے ان سے بھی عہد لیا تو جس چیز کے ذریعے سے ان کو یاد دہانی کی گئی وہ اس کا ایک حصہ بھلا بیٹھے تو ہم نے قیامت تک کے لیے ان کے درمیان عداوت اور بغض کی آگ بھڑکا دی اور جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں عنقریب اللہ اس سے ان کو آگاہ کرے گا۔ ۱۴

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۚ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ۭ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّىْ مَعَكُمْ ۭ لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاۗءَ السَّبِيْلِ (۱۲)

'نقیب' کا مفہوم

'نقیب' کے معنی ہیں کھوج لگانے والا، معاملات کی ٹوہ میں رہنے والا، لوگوں کے حالات کی جستجو کرنے والا۔ یہیں سے یہ قوم اور قبیلہ کے سردار، نگران، ذمہ دار افسر اور مانیٹر کے معنی میں استعمال ہوا۔ اس لیے کہ نگرانوں اور مانیٹروں کا اصلی کام لوگوں کے حالات کی نگرانی اور ان کی محافظت ہی ہوتا ہے۔ بنی اسرائیل کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے شریعت کی پابندی اور اس کی حفاظت

کا عہد لینے کے بعد بنی اسرائیل کے ہر قبیلے پر ایک ایک نقیب اس مقصد سے مقرر کیا کہ وہ لوگوں کی نگرانی رکھے کہ وہ شریعت کے حدود و قیود کی پابندی کریں اور کوئی ایسی چیز ان کے اندر گھسنے نہ پائے جو ان کو اللہ کے عہد سے روگرداں کرے۔ بنی اسرائیل کے قبیلے چونکہ بارہ تھے اس وجہ سے نقیب بھی بارہ مقرر ہوئے۔ ان کا تقرر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے تحت کیا تھا اس وجہ سے اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب فرمایا۔

بنی اسرائیل سے میثاق

'وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّیْ مَعَكُمْ الایۃ' یہ اس عہد و میثاق کا بیان ہے جو بنی اسرائیل سے لیا گیا اس میں نماز کے اہتمام، زکوٰۃ کی ادائیگی، آئندہ آنے والے رسولوں پر ایمان اور ان کی تائید اور خدا کی راہ میں انفاق کا عہد لیا گیا ہے اور اس کے صلے میں اللہ تعالیٰ نے ان سے اپنی معیت، ان کی عام لغزشوں سے درگزر اور ان کے لیے جنت کا وعدہ فرمایا ہے۔

'وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّیْ مَعَكُمْ' ایک جامع تعبیر ہے، خدا کی تائید و نصرت کے وعدے کی۔ ظاہر ہے کہ جن کے ساتھ خدا ہو ان کے ساتھ خدا کی پوری کائنات ہے۔

'لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَیْتُمُ الزَّكٰوةَ' سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح امتِ مسلمہ کے میثاق میں نماز اور زکوٰۃ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے اسی طرح بنی اسرائیل کے میثاق میں بھی ان کو بنیادی اہمیت حاصل رہی ہے۔ شریعت الٰہی میں حکمتِ دین کے پہلو سے ان دونوں چیزوں کا جو درجہ ابتدا سے ہے، اس پر پوری تفصیل کے ساتھ تفسیر سورۂ بقرہ کے آغاز میں ہم بحث کر چکے ہیں۔

'وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِیْ' میں یوں تو بعد میں آنے والے تمام انبیاء کی طرف اشارہ ہے لیکن اس میں خاص اشارہ نبی خاتم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے جن کا ذکر تورات میں نہایت نمایاں علامات کے ساتھ ہوا ہے۔ بقرہ میں بعض حوالے گزر چکے ہیں۔ اعراف میں اس پر مزید بحث آئے گی۔

'وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا' میں جس انفاق کا ذکر ہے یہ زکوٰۃ کے مقررہ نصاب سے الگ ہے۔ اس سے مراد وہ انفاق ہے جو جہاد فی سبیل اللہ اور اس قسم کے کسی اور دینی و ملی و اجتماعی مقصد کے لیے کیا جائے۔ اس کو قرض سے تعبیر کرنے کی وجہ اور اس کے قرض حسن ہونے کے شرائط پر پوری تفصیل کے ساتھ ہم دوسرے مقام میں بحث کر چکے ہیں۔

'لَاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ' میں 'سیئات' سے مراد لغزشیں اور کوتاہیاں ہیں، اگر دین کی بنیادی باتوں کا اہتمام کیا جائے تو بندے سے جو چھوٹی موٹی غلطیاں صادر ہو جاتی ہیں اللہ تعالیٰ ان کو معاف فرما دیتا ہے۔ اس مسئلہ پر بھی بحث گزر چکی ہے۔

'فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ الایۃ' یہ ٹکڑا بھی معاہدے کا جزو ہے یعنی اس عہد اور اس عہد کی حفاظت کے اس اہتمام کے باوجود جس کا ذکر ہوا اگر کسی نے اس معاہدے سے انحراف اختیار کیا تو وہ خدا کی شاہراہ سے

بھٹک گیا۔ یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ اس عہد سے انحراف کو کفر سے تعبیر کیا گیا ہے۔

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً ۚ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ۙ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۚ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (۱۳)

یہود کی عہد شکنی کے نتائج

یہود پر لعنت، ان کی قساوت اور ان کی تحریفات پر تفصیل کے ساتھ سورۂ بقرہ کی تفسیر میں گفتگو ہو چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی قوم کے ساتھ معاہدہ کر کے اس کو جس درجے کی عزت و سرفرازی بخشتا ہے، معاہدہ توڑ دینے کی صورت میں وہ اس کو اسی درجے کی ذلت کے ساتھ دھتکار بھی دیتا ہے۔ اس دھتکارنے کے لیے جامع تعبیر لعنت ہے۔ یعنی کسی کو راندۂ درگاہ قرار دے دینا۔ راندۂ درگاہ ہونے کا پہلا اثر جو اس قوم پر پڑتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے اندر سے خدا کی خشیت، جو دل کی زندگی کی ضامن ہے، ختم ہو جاتی ہے اور دل پتھر ہو کر توبہ و انابت کی روئیدگی کے لیے بالکل بنجر ہو جاتا ہے۔ یہ حالت پیدا تو ہوتی ہے عہد شکن قوم کے اپنے عمل کے نتیجہ کے طور پر لیکن چونکہ واقع ہوتی ہے اللہ تعالیٰ کی مقررہ سنت کے مطابق اس وجہ سے اس کو منسوب اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف فرمایا ہے۔ یہ قساوت عہد شکن قوم کے اندر جسارت پیدا کرتی ہے جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ میثاق الٰہی کی خلاف ورزی ہی پر بس نہیں کرتی بلکہ وہ اس معاہدے کو اپنی خواہشات کے مطابق بنانے کے لیے اس کے الفاظ و کلمات کی تحریف بھی کرتی ہے۔ یہ تحریف یہود نے جن جن شکلوں میں کی ہے اس کی تفصیل سورۂ بقرہ کی تفسیر میں ہم پیش کر چکے ہیں۔

'وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ' اور وہ بھلا بیٹھے اس چیز کا ایک حصہ جس کے ذریعے سے ان کو یاد دہانی کی گئی تھی۔ 'جس کے ذریعے سے یاد دہانی کی گئی تھی' سے مراد ہمارے نزدیک تورات ہے اس لیے کہ اسی کے اندر میثاق الٰہی کا سارا ریکارڈ محفوظ کیا گیا تھا اور وہ اسی لیے محفوظ کیا گیا تھا کہ بنی اسرائیل اور ان کی آئندہ نسلوں کے لیے ایک قابل اعتماد یادداشت کا کام دے۔ لیکن جب وہ اس یادداشت ہی کا ایک حصہ بھلا بیٹھے تو اب ان کے پاس ایسی کیا چیز رہ گئی تھی جو ان کو یاد دہانی کرا سکتی۔ گھر کا چراغ ہی ہوتا ہے جس سے روشنی حاصل کی جاتی ہے، اگر اسی کو بجھا دیا جائے یا چھپا دیا جائے تو اب دوسری کون سی چیز اجالا کرے گی۔

یہ فراموش کر دینا قدرتی نتیجہ ہے تحریف اور اخفا کا۔ یہود تورات کی بعض چیزیں، جیسا کہ بقرہ کی تفسیر میں ہم واضح کر چکے ہیں، عام لوگوں سے چھپاتے تھے، اسی طرح تورات کی جو پیشین گوئیاں ان کے منشا کے خلاف تھیں ان میں انھوں نے لفظی تحریفیں کر کے ان کا مفہوم بدل دیا۔ تاویل کے ذریعے سے بھی انھوں نے حقائق کی قلب ماہیت کی۔ پھر ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ تورات حضرت موسیٰ کے زمانے میں مرتب نہیں ہوئی بلکہ ان کی وفات کے اتنے دنوں کے بعد اس کی ترتیب عمل میں آئی جب کسی کو یہ علم بھی نہیں رہا تھا

کہ ان کی قبر کہاں ہے۔ اس کے مرتبین کا نام بھی معلوم نہیں کہ وہ کون اور کن صفات کے لوگ تھے۔ استثنا باب ۳۴ کے آخر میں ہے کہ "پر آج تک کسی آدمی کو اس کی قبر معلوم نہیں" اسی طرح یہ الفاظ بھی اس میں ہیں "اور اس وقت سے اب تک کوئی نبی موسیٰ کے مانند جس سے خداوند نے روبرو باتیں کیں، نہیں پیدا ہوا" ظاہر ہے کہ جو کتاب اپنے لانے والے کی وفات کے اتنے طویل عرصہ کے بعد مرتب ہوئی کہ لوگ اس کی قبر بھی بھول چکے تھے اس کی تعلیمات کو محفوظ رکھنا ان کے لیے کس طرح ممکن تھا چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تورات کی بہت سی باتیں بھول گئے۔ پھر جو باتیں مرتب بھی ہوئیں وہ بھی اصل الفاظ میں محفوظ نہیں رہیں بلکہ ان کے پاس اصل تورات کے بجائے صرف اس کے ترجمے رہ گئے اور یہ ترجمے بدلتے بدلتے اصل سے اتنے مختلف ہو گئے کہ یہ تمیز کرنا ناممکن ہو گیا کہ اس میں اصل بات کتنی ہے اور کتنی جامعین اور مترجمین کی حاشیہ آرائی ہے۔ اس طرح تورات کا ایک بہت بڑا حصہ اس کے حاملین نے ضائع کر دیا۔

'وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ'، 'خَآئِنَة' کے معنی خیانت کے ہیں جس طرح 'لَائِمَة' کے معنی ملامت کے۔ خیانت، بدعہدی اور عہد شکنی کے لیے عربی میں نہایت معروف ہے۔ قرآن نے یہود کی بہت سی بدعہدیوں اور ان کی تحریفات سے پردہ اٹھایا ہے جن کی تفصیل پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہے اور آگے ان کی مزید مثالیں آ رہی ہیں۔ قرآن سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ان کی صرف انہی تحریفات سے تعرض کیا ہے جن سے تعرض تجدید شریعت کے نقطۂ نظر سے ضروری تھا، جن سے تعرض ضروری نہیں تھا ان کو نظر انداز کر دیا ہے اور ان کی تعداد بھی کم نہیں ہے، بہت زیادہ ہے۔ چنانچہ آگے آیت ۱۵ میں ارشاد ہے 'يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيرًا مِّمَّا كُنتُمْ تُخْفُونَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَعْفُوا عَن كَثِيرٍ' (اور وہ تمہارے لیے ظاہر کر رہا ہے بہت سی وہ چیزیں تورات کی جن کو تم چھپاتے تھے اور بہت سی چیزیں نظر انداز کر رہا ہے)

'اِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ' سے یہود کے اس مختصر گروہ کی طرف اشارہ ہے جو نقض عہد اور اس کے مذکورہ بالا نتائج سے محفوظ رہا ہے۔ اگرچہ یہ گروہ نہ تو اپنی قوم کو فتنوں سے بچا سکا نہ تورات کو شریروں کی دستبرد سے۔ تاہم یہ لوگ اپنے علم کے حد تک اصل شریعت پر قائم اور اس کی گواہی دیتے رہے۔ صالحین کا یہی گروہ ہے جس نے اسلام کا بھی خیر مقدم کیا۔

'فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ' میں عفو و صفح سے مراد دل سے معاف کرنا نہیں بلکہ مجرد درگزر کرنا ہے۔ عفو کے اس معنی کے لیے نظیر آیت ۱۵ کے اس ٹکڑے میں بھی ہے جو اوپر ہم نے نقل کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ابھی ان کو نظر انداز کرو اور مہلت دو۔ ان سے نمٹنے کا زمانہ آگے آئے گا۔

وَمِنَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصٰرٰى أَخَذْنَا مِيثَاقَهُمْ فَنَسُوا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوا بِهِ فَأَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ إِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ بِمَا كَانُوا يَصْنَعُونَ (۱۴)

نصاریٰ کی عہد شکنی

یہود کے نقض عہد کے بعد اب یہ نصاریٰ کے نقض عہد کا ذکر ہو رہا ہے اور ان کے ذکر کی تمہید ہی اس

انداز سے اٹھائی ہے جس سے ترشح ہو رہا ہے کہ یہ نصاریٰ قرآن کے نزدیک نصاریٰ نہیں بلکہ صرف نصاریٰ ہونے کے مدعی ہیں۔ چنانچہ واقعہ یہی ہے کہ پال کے متبعین کو نہ صرف یہ کہ اصل نصرانیت سے کوئی علاقہ نہیں ہے بلکہ انھوں نے تو اپنا نام بھی بدل لیا۔ بقرہ میں، نصاریٰ پر مفصل بحث گزر چکی ہے۔ مزید بحث اسی سورہ کی آیات ۸۲-۸۵ کے تحت آرہی ہے۔

فَاَغْرَیْنَا بَیْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ، یہ نتیجہ بیان ہوا ہے کتاب الٰہی میں تحریف اور اس کے ایک حصے کو ضائع کر دینے کا۔ ملت کی شیرازہ بندی اللہ کے میثاق اور اس کی کتاب ہی سے ہوتی ہے۔ اگر اسی میں فساد و اختلال پیدا ہو جائے تو پھر ملت کو فساد و اختلال اور خون خرابے سے کیا چیز بچا سکتی ہے۔ یہ صورت حال عہد شکنی کا قدرتی نتیجہ بھی ہے اور اس جرم کی سزا بھی، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی طرف منسوب فرمایا۔ نصاریٰ کے لیے اس سے نجات کی واحد شکل یہ تھی کہ قرآن کی رہنمائی میں ان تاریکیوں سے نکل کر ہدایت کی روشنی اور امن و سلامتی کی شاہراہ پر آجاتے لیکن ان کے تعصب نے ان کو یہ سیدھی راہ اختیار نہ کرنے دی۔ اب نہ کوئی کتاب آنی ہے اور نہ کوئی رسول، اس وجہ سے اس جنگ و جدل سے نکلنے کا اب ان کے لیے قیامت تک کوئی امکان ہی باقی نہیں رہا۔

وَسَوْفَ یُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ یہ دھمکی ہے۔ یعنی عنقریب وہ وقت آئے گا جب اللہ ان کی یہ تمام کارستانیاں ان کے سامنے رکھ دے گا اور وہ اپنی ان تمام شرارتوں کے نتائج اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔

یہ ملحوظ رہے کہ نقض عہد کی یہ تاریخ مسلمانوں کو محض ماضی کی ایک سرگزشت کی حیثیت سے نہیں سنائی جا رہی ہے بلکہ اس لیے سنائی جا رہی ہے کہ مسلمان اس سے سبق لیں اور یاد رکھیں کہ اگر انھوں نے بھی اپنے میثاق کے ساتھ وہی معاملہ کیا جو یہود و نصاریٰ نے کیا تو ان کا بھی وہی حشر ہوگا جو یہود و نصاریٰ کا ہوا۔

۶- آگے کا مضمون ____ آیات ۱۵-۱۹

یہود اور نصاریٰ کے لیے نجات کی راہ

آگے یہود اور نصاریٰ دونوں کو بانداز تنبیہ توجہ دلائی ہے کہ تم اللہ کے عہد کو توڑ کر اور اس کی کتابیں ضائع کر کے جس تاریکی اور جس مذہبی جنگ و جدل میں پھنس گئے ہو اس سے نکالنے اور سلامتی کی راہ پر لانے کے لیے اللہ نے تمھیں پھر روشنی دکھائی ہے اور ایک واضح کتاب بھیجی ہے۔ اب اس کتاب اور اس رسول کے بعد تمھارے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہا۔ اگر اس اتمام حجت کے بعد بھی تم اسی تاریکی میں پڑے رہے تو یاد رکھو، اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اس کی گرفت سے باہر کوئی نہیں نکل سکتا۔ آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات ۱۵-۱۹

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ

نُورٌ وَكِتَابٌ مُّبِينٌ ﴿١٥﴾ يَهْدِي بِهِ اللَّهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ
سُبُلَ السَّلَامِ وَيُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِهِ
وَيَهْدِيهِمْ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿١٦﴾ لَّقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ
اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قُلْ فَمَن يَمْلِكُ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا
إِنْ أَرَادَ أَن يُهْلِكَ الْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهُ وَمَن فِي
الْأَرْضِ جَمِيعًا ۗ وَلِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۚ
يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿١٧﴾ وَقَالَتِ
الْيَهُودُ وَالنَّصَارَىٰ نَحْنُ أَبْنَاءُ اللَّهِ وَأَحِبَّاؤُهُ ۚ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُم
بِذُنُوبِكُم ۖ بَلْ أَنتُم بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ۚ يَغْفِرُ لِمَن يَشَاءُ
وَيُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ ۚ وَلِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا
بَيْنَهُمَا ۖ وَإِلَيْهِ الْمَصِيرُ ﴿١٨﴾ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا
يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلَىٰ فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ أَن تَقُولُوا مَا جَاءَنَا مِن
بَشِيرٍ وَلَا نَذِيرٍ ۖ فَقَدْ جَاءَكُم بَشِيرٌ وَنَذِيرٌ ۗ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ
شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿١٩﴾

ع ۳

ترجمۂ آیات ۱۵-۱۹

اے اہل کتاب، تمہارے پاس ہمارا رسول وہ بہت سی باتیں ظاہر کرتا ہوا آگیا ہے جو تم کتاب کی چھپاتے رہے ہو اور وہ بہت سی باتیں نظر انداز بھی کر رہا ہے۔ اب تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشنی اور ایک واضح کرنے والی کتاب آگئی۔ اس کے ذریعے سے اللہ ان لوگوں کو جو اس کی خوشنودی کے طالب ہیں سلامتی کی راہیں دکھا رہا

ہے اور اپنی توفیق بخشی سے ان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لا رہا ہے اور ایک صراطِ مستقیم کی طرف ان کی رہنمائی کر رہا ہے۔ ۱۵-۱۶

بے شک ان لوگوں نے کفر کیا جنھوں نے کہا اللہ تو وہی مسیح ابن مریم ہے۔ پوچھو، کون اللہ سے کچھ اختیار رکھتا ہے اگر وہ چاہے کہ ہلاک کر دے مسیح ابن مریم کو، اس کی ماں کو اور جو زمین میں ہیں ان سب کو۔ اللہ ہی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، سب کی بادشاہی۔ وہ پیدا کرتا ہے جو کچھ چاہتا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۱۷

اور یہود اور نصاریٰ نے دعویٰ کیا کہ ہم خدا کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں۔ ان سے پوچھو کہ پھر وہ تمھیں تمھارے جرموں پر سزا کیوں دیتا رہا ہے؟ بلکہ تم بھی اس کی پیدا کی ہوئی مخلوق ہی سے بشر ہو۔ وہ جسے چاہے گا بخشے گا اور جسے چاہے گا عذاب دے گا۔ اللہ ہی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کی بادشاہی اور اسی کی طرف سب کو لوٹنا ہے۔ ۱۸

اے اہل کتاب، تمھارے پاس ہمارا رسول، رسولوں کے ایک وقفے کے بعد، تمھارے لیے دین کو واضح کرتا ہوا آ گیا ہے۔ مبادا تم کہو کہ ہمارے پاس کوئی بشارت دینے والا اور ہوشیار کرنے والا تو آیا ہی نہیں۔ دیکھ لو، ایک بشیر و نذیر تمھارے پاس آ گیا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۱۹

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَعْفُوْا

عَنْ كَثِيْرٍ ۥ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۙ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۱۵-۱۶)

لفظ اخفاء تحریف کی ایک جامع تعبیر ہے

'يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ' تحریف خواہ تبدیلیِ الفاظ کی نوعیت کی ہو یا تبدیلیِ معنی کی نوعیت کی، اس کا اصل مقصد حقیقت پر پردہ ڈالنا اور خلق کی آنکھوں میں دھول جھونکنا ہوتا ہے اس وجہ سے قرآن نے اس کے لیے جامع لفظ 'اخفا' کا استعمال کیا ہے جس کے تحت ان کی لفظی و معنوی تحریفیں بھی آگئیں اور ان کی کتابوں کی وہ آیتیں بھی جن کو اہل کتاب کے علماء اس اندیشے سے عام لوگوں سے چھپاتے تھے کہ ان کے خلافِ شریعت اقدامات کی پردہ دری نہ ہو یا ان کی بنا پر آخری بعثت کے باب میں ان پر کوئی حجت نہ قائم ہو سکے۔ فرمایا کہ یہ رسول تمہاری بہت سی تحریفات بے نقاب کر رہا ہے اور ایسی بھی بہت سی ہیں جن کو نظر انداز کر رہا ہے اس لیے کہ مقصود اصل حقیقت کو ظاہر کرنا اور شریعت الٰہی کی تجدید و تکمیل ہے نہ کہ تمہاری تذلیل و تفضیح۔

'نور' اور 'کتاب مبین' سے مراد

'قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ' نور سے مراد قرآن مجید ہے اور 'کتاب مبین' کا لفظ بطور تفسیر ہے۔ قرآن مجید حکمت اور شریعت دونوں کا مجموعہ ہے۔ وہ ذہنی تاریکیوں سے بھی نکالتا ہے اور زندگی کے لیے عمل کی صحیح شاہراہ بھی متعین کرتا ہے اس وجہ سے وہ نور بھی ہے اور کتاب مبین بھی۔ اہل کتاب کو اللہ تعالیٰ نے جو روشنی عطا فرمائی تھی اس کو ضائع کر کے وہ پھر تاریکیوں میں گھر گئے تھے اصل حقیقت گم تھی اور شاہراہ ناپید۔ اس وجہ سے ان کے درمیان جنگ و جدل کی وہ آگ بھڑک اٹھی تھی جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔

ہدایت کے لیے طلب و جستجو شرط ہے

'يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ الاية' یہ اس کتاب کا مقصد بیان ہوا ہے کہ اللہ نے یہ کتاب اس لیے اتاری ہے کہ تم اس پر ایمان لائے تو یہ تم کو اس جنگ و جدل سے نجات دے کر امن و سلامتی کی راہ پر، تاریکی سے نکال کر روشنی میں، کج روی اور ضلالت کی وادیوں سے نکال کر خدا کی صراط مستقیم پر لائے گی، بشرطیکہ تمہارے اندر خدا کی خوشنودی کی طلب ہو اور تم اپنے تعصبات کی پٹیاں اپنی آنکھوں سے کھول کر اس روشنی کو دیکھو اور اس کی قدر کرو۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جن کے اندر رضائے الٰہی کی جستجو نہ ہو بلکہ وہ اپنی خواہشات کے پرستار بنے رہیں، ان کے لیے توفیق کا دروازہ نہیں کھلتا۔ 'باِذْنِهٖ' کے لفظ سے اسی سنت اللہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ یعنی یہ سعادت خدا کے اذن سے حاصل ہوتی ہے اور یہ اذن ان کے لیے ہوتا ہے جن کے اندر رضائے الٰہی کی جستجو ہو۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۭ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۭ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۭ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۱۷)

پال کے عقیدے کی اصل روح

اب یہ نصاریٰ کے نقضِ عہد کی ایک مثال بیان ہوئی ہے کہ انھوں نے تمام عہد و میثاق کی جو جڑ ہے یعنی توحید، اسی پر کلہاڑا رکھ دیا اور اللہ تعالیٰ کے بجائے مسیح ابن مریم کو خدا بنا بیٹھے۔ موجودہ مسیحیت جس کا بانی پال ہے، اصلاً تو حلول و اتحاد کے عقیدے پر مبنی ہے یعنی پال کے نزدیک مسیح کی شکل میں خدا ہی نے ظہور کیا ہے لیکن بعض اعتراضات سے بچنے کے لیے، جیسا کہ ہم نے سورۂ نساء کی تفسیر میں اشارہ کیا ہے، اس کو اس نے اس چیستاں کی شکل میں پیش کیا ہے، جس کو تثلیث کہتے ہیں۔ گویا حلول اس عقیدے کی روح ہے اور تثلیث اس کی تعبیر۔ قرآن نے کہیں اس گمراہی کی روح کو واضح کیا ہے، کہیں اس کی معروف تعبیر سے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ پال کا اصل مقصود مسیحؑ کو خدا ثابت کرنا تھا۔ اس کے لیے اس نے ان کی خارقِ عادت ولادت اور ان کے کلمۃ اللہ اور روح اللہ ہونے سے مواد فراہم کیا لیکن انجیلوں میں چونکہ باپ اور روح القدس کا بھی ذکر تھا اس وجہ سے اسے یہ محنت کرنی پڑی کہ الوہیت کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے کوئی ایسی تعبیر اختیار کرے کہ ان سب کے لیے اس میں کوئی نہ کوئی جگہ نکل آئے۔ لیکن یہ سارا گورکھ دھندا تو بس چند بال کی کھال ادھیڑنے والوں کے ذہن میں یا چند چیستاں قسم کی کتابوں کے اندر بند رہتا ہے، عام ذہن تو خلاصہ پسند ہوتا ہے، وہ ان موشگافیوں میں کہاں پڑتا ہے۔ چنانچہ عوام نے اس سارے افسانے میں سے صرف اتنی بات اپنے ذہن میں راسخ کر لی کہ مسیحؑ خدا ہیں۔ یہی حال عربوں کا ہوا۔ انھوں نے بھی خدا کے ساتھ دوسروں کو جو شریک کیا تو اپنے ایک مزعومہ فلسفے کے تحت کیا لیکن پھر صورتیں اور مورتیں خدا بن گئیں اور خدا یا تو بالکل غائب ہو گیا یا اس طرح پس منظر میں چھپا دیا گیا کہ اس کا ہونا اور نہ ہونا برابر ہو گیا۔ اس پر تفصیلی بحث ان شاء اللہ مکی سورتوں میں آئے گی[1]۔

نصاریٰ پر اظہارِ غضب

'فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا' کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے ارادے میں کوئی حائل و مانع نہیں ہو سکتا مثلاً 'لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَآ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ' (الممتحنہ ۴) (میں آپ کے لیے خدا سے مغفرت مانگوں گا، لیکن میں آپ کے معاملے میں خدا کے کسی فیصلے میں کوئی دخل نہیں رکھتا) یہ مسیحؑ کو خدا بنانے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اظہارِ غضب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نادانو، یہ کس قسم کی باتیں کرتے ہو، کیا مسیح، کیا ان کی ماں اور کیا یہ ساری مخلوق، خدا سب سے بے نیاز اور مستغنی ہے۔ سب کو وجود اسی نے بخشا ہے اور اگر وہ ان سب کو فنا کر دینا چاہے تو کون ہے جو اس کا ہاتھ پکڑ سکے۔ آسمان و زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب خدا ہی کی ملکیت ہے۔ کوئی نہیں ہے جو اس میں اس کا شریک ہو۔ وہ جو چاہے، جس طرح چاہے اور جتنی مقدار میں چاہے پیدا کرتا اور پیدا کر سکتا ہے۔ کسی کا بن باپ کے پیدا ہو جانا اس بات کی دلیل نہیں ہو جاتا کہ وہ خدا بن گیا یا خدائی میں شریک ہو گیا۔ خدا کسی

---

[1] اس مسئلے پر ہم نے اپنی کتاب حقیقتِ شرک و توحید میں بھی بحث کی ہے۔ تفصیل کے طالب اس کو پڑھیں۔

کو چاہے تو بن باپ کے بھی پیدا کر سکتا ہے بلکہ ماں اور باپ دونوں کے بغیر بھی پیدا کر سکتا ہے وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ۚ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ ۚ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ۚ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۡ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ (۱۸)

اہل کتاب کا محبوب خدا ہونے کا زعم باطل

نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ، اس ٹکڑے پر تفصیل کے ساتھ پچھلی سورتوں میں بحث گزر چکی ہے۔ اہل کتاب کا یہی زعم باطل تھا جس نے ان کو عہد الٰہی کی ذمہ داریوں سے سب سے زیادہ بے پروا بنایا۔ انھوں نے گمان کیا کہ وہ خدا کے محبوبوں اور برگزیدوں کی اولاد ہیں اس وجہ سے عمل و اطاعت کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہیں۔ جنت ان کا پیدائشی حق ہے۔ دوزخ میں اول تو وہ ڈالے نہیں جائیں گے اور اگر ڈالے بھی گئے تو بس یونہی چند دنوں کے لیے۔ اس فتنے کے اصل بانی تو یہود ہوئے لیکن آخر نصاریٰ ان کو جنت کا واحد اجارہ دار کیوں بننے دیتے۔ چنانچہ یہاں قرآن نے اس کو دونوں ہی کے مشترک عقیدے کی حیثیت سے ذکر کیا ہے۔

زعم باطل کی تردید خود ان کی اپنی تاریخ سے

قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ، یہ ان کے اس زعم باطل کی تردید خود ان کی اپنی تاریخ سے کی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر خدا کے محبوب اور چہیتے ہونے کے سبب سے تم خدا کے مواخذے اور عذاب سے بری ہو تو تمھاری یہ محبوبیت اور تمھارا یہ چہیتا پن اس دنیا میں تمھارے کچھ کام کیوں نہ آیا؟ یہاں تو تمھاری پوری تاریخ اس بات کی شہادت دے رہی ہے کہ جب جب تم نے خدا سے سرکشی کی ہے اس نے تمھیں نہایت عبرت انگیز سزائیں بھی دی ہیں۔ ایسی عبرت انگیز کہ دنیا کی کسی قوم کی تاریخ میں ایسی سزاؤں کی مثال نہیں مل سکتی۔ پوری قوم کی غلامی، پوری قوم کی مسخ گردی، پوری قوم کی جلا وطنی، متعدد بار پوری قوم کا قتل عام اور بیت المقدس کی عبرت انگیز تباہی، یہ سارے واقعات خود تورات میں موجود ہیں۔ اگر ابراہیم و اسحٰق کی اولاد ہونے کی وجہ سے تمھیں خدا کی طرف سے کوئی برأت نامہ حاصل ہے تو اس برأت نامے نے تمھیں ان عذابوں سے کیوں نہ بچایا؟

اصل حقیقت کا اظہار

بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ، یہ اصل حقیقت کا اظہار ہے کہ 'اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ' اور 'اَحِبَّآءُ اللّٰهِ' ہونے کے خبط سے نکلو، جس طرح خدا کی ساری مخلوق ہے اسی طرح تم بھی اس کی مخلوق ہو اور جس طرح سب کو خدا سے نسبت ایمان و عمل صالح کے توسط سے حاصل ہوتی ہے اسی طرح تمھیں بھی خدا سے کوئی نسبت حاصل ہوگی تو ایمان و عمل صالح ہی کے واسطے سے حاصل ہوگی۔

يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ، یعنی مغفرت اور عذاب خدا ہی کے اختیار میں ہے وہ جن کو مغفرت کا مستحق پائے گا ان کی مغفرت فرمائے گا، جن کو سزا کا مستحق پائے گا ان کو سزا دے گا۔ اگر کسی نے بزرگوں سے

خاندانی نسبت یا ان کی موہوم شفاعتوں پر بھروسہ کر کے خدا کے عہد ہی کو توڑ دیا ہے تو اس کو خدا کے عذاب سے بچانے والا کوئی بھی نہیں بن سکے گا۔

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ الایۃ یہ اوپر والے مضمون کی تاکید ہے کہ آسمان و زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب خدا ہی کی ملک ہے اور سب کو خدا ہی کی طرف لوٹنا ہے۔ نہ اس کائنات میں کسی کی حصہ داری ہے اور نہ خدا کے سوا کسی اور کے ہاں پیشی ہونی ہے کہ اس سے کوئی امید باندھی جائے۔

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ ۡ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّنَذِيْرٌ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۱۹)

'فترۃ' کا مفہوم

'فَتْرَةٍ' اس وقفہ کو کہتے ہیں جو ایک چیز کے ظہور کے بعد اس کے دوسرے ظہور سے پہلے واقع ہوتا ہے۔ مثلاً باری کے بخار کے دو حملوں کے درمیان جو وقفہ ہوگا اس کو 'فترۃ' کہیں گے۔ آیت میں اس سے مراد وہ وقفہ ہے جو دو نبیوں کی بعثت کے درمیان ہوتا ہے۔

اہل کتاب کو تنبیہ

یہ اہل کتاب کو تنبیہ ہے کہ اپنی کتاب کی جن چیزوں کو تم نے چھپایا یا ضائع کر دیا ان سب کو واضح اور خدا کی صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کرتا ہوا ہمارا رسول تمھارے پاس آگیا ہے۔ اب تمھارے پاس اپنی گمراہی پر جمے رہنے کے لیے یہ عذر بھی باقی نہیں رہا کہ پہلے رسولوں کی بعثت پر ایک زمانہ گزر چکا تھا اور تم ایک نذیر و بشیر کے محتاج تھے۔ تمھارے اس عذر کو بھی ختم کرنے کے لیے ہم نے نذیر و بشیر بھیج دیا۔ اب اس اتمام حجت کے بعد بھی تم نے اپنی روش نہ بدلی تو خدا کو بے بس ہستی نہ سمجھنا۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ یہ ملحوظ رہے کہ اہل کتاب کا یہ عذر کوئی قابل لحاظ عذر نہیں تھا لیکن جب اللہ تعالیٰ نے اس کا بھی لحاظ فرمایا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ان پر آخری درجے میں حجت تمام کر دی گئی۔

۸۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۲۰-۲۶

بنی اسرائیل کی تاریخ کے ایک اہم واقعہ کی یاد دہانی

اب آگے یہود کی ابتدائی تاریخ کے ایک اہم واقعہ کی یاد دہانی فرمائی ہے جس سے ایک طرف تو یہ حقیقت روشنی میں آتی ہے کہ یہ قوم ابتدا ہی سے خدا کے عہد اور اس کے حقوق و فرائض کے معاملے میں نہایت بودی اور نکمی رہی ہے۔ دوسری طرف یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ خدا نے ابتدا ہی سے اس کی بدعہدیوں اور نالائقیوں پر اس کو سزا بھی ہمیشہ نہایت عبرت انگیز دی ہے لیکن اس کے باوجود اب تک یہ یہی خواب دیکھے جا رہی ہے کہ یہ خدا کی محبوب اور لاڈلی ہے اس وجہ سے آخرت کے عذاب سے محفوظ ہے۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۰-۲۶

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ

إِذْ جَعَلَ فِيكُمْ أَنبِيَاءَ وَجَعَلَكُم مُّلُوكًا وَآتَاكُم مَّا لَمْ يُؤْتِ أَحَدًا مِّنَ الْعَالَمِينَ ﴿٢٠﴾ يَا قَوْمِ ادْخُلُوا الْأَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِي كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوا عَلَىٰ أَدْبَارِكُمْ فَتَنقَلِبُوا خَاسِرِينَ ﴿٢١﴾ قَالُوا يَا مُوسَىٰ إِنَّ فِيهَا قَوْمًا جَبَّارِينَ وَإِنَّا لَن نَّدْخُلَهَا حَتَّىٰ يَخْرُجُوا مِنْهَا فَإِن يَخْرُجُوا مِنْهَا فَإِنَّا دَاخِلُونَ ﴿٢٢﴾ قَالَ رَجُلَانِ مِنَ الَّذِينَ يَخَافُونَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوا عَلَيْهِمُ الْبَابَ فَإِذَا دَخَلْتُمُوهُ فَإِنَّكُمْ غَالِبُونَ ۚ وَعَلَى اللَّهِ فَتَوَكَّلُوا إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿٢٣﴾ قَالُوا يَا مُوسَىٰ إِنَّا لَن نَّدْخُلَهَا أَبَدًا مَّا دَامُوا فِيهَا ۖ فَاذْهَبْ أَنتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُونَ ﴿٢٤﴾ قَالَ رَبِّ إِنِّي لَا أَمْلِكُ إِلَّا نَفْسِي وَأَخِي ۖ فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ ﴿٢٥﴾ قَالَ فَإِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ ۛ أَرْبَعِينَ سَنَةً ۛ يَتِيهُونَ فِي الْأَرْضِ ۚ فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ ﴿٢٦﴾

ع ۴ ۸

ترجمۂ آیات ۲۰-۲۶

اور یاد کرو جب کہ موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا، اے میرے ہم قومو! اپنے اوپر اللہ کے فضل کو یاد کرو کہ اس نے تم میں نبی اٹھائے اور تم کو بادشاہ بنایا، اور تم کو وہ کچھ بخشا جو دنیا والوں میں سے کسی کو نہیں بخشا۔ اے میرے ہم قومو! اس مقدس سرزمین میں داخل ہو جاؤ جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دی ہے اور پیٹھ پیچھے نہ پھرو ورنہ نامرادوں میں سے ہو کر رہ جاؤ گے۔ وہ بولے کہ اس میں تو بڑے زور آور لوگ ہیں۔ ہم اس میں نہیں

داخل ہونے کے جب تک وہ وہاں سے نکل نہ جائیں۔ اگر وہ وہاں سے نکل جائیں تو ہم داخل ہوں گے۔ دو شخصوں نے، جو تھے تو انھی ڈرنے والوں ہی میں سے، پر خدا کا ان پر فضل تھا، للکارا کہ تم ان پر چڑھائی کر کے شہر کے پھاٹک میں گھس جاؤ۔ جب تم اس میں گھس جاؤ گے تو تمھی غالب رہو گے اور اللہ پر بھروسہ کرو، اگر تم مومن ہو۔ وہ بولے کہ اے موسیٰ، ہم اس میں ہرگز نہیں داخل ہونے کے جب تک وہ اس میں موجود ہیں تو تم اور تمھارا خداوند جا کر لڑو، ہم تو یہاں بیٹھتے ہیں۔ ۲۰-۲۴

موسیٰ نے دعا کی اے میرے پروردگار، میرا اپنی جان اور اپنے بھائی کے سوا کسی پر کچھ زور نہیں۔ پس تو ہمارے اور اس نافرمان قوم کے درمیان علیحدگی کر دے۔ فرمایا تو یہ سرزمین ان پر چالیس سال کے لیے حرام ٹھہری، یہ لوگ زمین میں بھٹکتے پھریں گے۔ پس تو ان نافرمان لوگوں کا غم نہ کھا۔ ۲۵-۲۶

۹۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖ وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ۝ يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ (۲۰-۲۱)

یہود کی تاریخ کا ایک ورق

'اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖ وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ'۔ سورۂ نساء کی آیت ۵۴ کے تحت ہم یہ واضح کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے وعدے جو مستقبل سے متعلق ہوتے ہیں، بعض اوقات ماضی کے صیغے سے تعبیر کیے جاتے ہیں ـــــ یہ وعدوں کی قطعیت کے اظہار کا ایک بلیغ اسلوب ہے جو قرآن میں بہت استعمال ہوا ہے۔ گویا یہ وعدے محض وعدے نہیں بلکہ واقعات ہیں جو واقع ہو چکے۔ حضرت موسیٰؑ سے پہلے اگرچہ بنی اسرائیل میں بعض انبیاء مبعوث ہو چکے تھے لیکن نبوت کا غیر منقطع سلسلہ آپ کے بعد شروع ہوا جو حضرت مسیحؑ کی بعثت تک جاری رہا۔ بادشاہوں کے سلسلے کا تعلق تمام تر حضرت موسیٰؑ کے بعد ہی

کے دور سے ہے۔ اس سے پہلے خاندان کے بزرگوں کو ایک قسم کی سیادت اور پدرسری (PATRIARCHY) تو حاصل رہی لیکن اس کو بادشاہی نہیں کہہ سکتے۔ تورات میں بھی اس کو بادشاہی سے تعبیر نہیں کیا گیا ہے۔

ایک سیاسی نکتہ

یہاں اسلوب کا ایک اور فرق بھی قابلِ لحاظ ہے۔ سلسلۂ نبوت کی تعبیر کے لیے تو فرمایا جَعَلَ فِیۡكُمۡ اَنۡۢبِیَآءَ (تم میں انبیاء بنائے) لیکن سلسلۂ بادشاہی کی تعبیر کے لیے 'وَجَعَلَكُمۡ مُّلُوۡكًا' (اور تم کو بادشاہ بنایا) کی تعبیر اختیار فرمائی۔ ان دونوں اسلوبوں کے فرق سے یہ بات نکلتی ہے کہ نبوت ایک مرتبۂ اختصاص ہے جو صرف اس سے مخصوص ہوتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ اس منصب پر فائز فرماتا ہے، دوسرے اس میں شریک نہیں ہوتے۔ اس کے برعکس بادشاہی ایک منصب اجتماعی ہے جس میں بادشاہ کے ساتھ اس کی پوری قوم حصہ دار ہوتی ہے۔ اگر کسی بادشاہی میں قوم شریک نہ ہو تو وہ استبداد اور مطلق العنانی ہے۔

'وَاٰتٰىكُمۡ مَّا لَمۡ یُؤۡتِ اَحَدًا مِّنَ الۡعٰلَمِیۡنَ' سے مراد وہ منصب امامت و شہادت حق ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو مامور فرمایا تھا اور جو امتِ مسلمہ کے ظہور میں آنے سے پہلے ان کے سوا کسی اور کو حاصل نہیں ہوا۔

ارضِ مقدس سے مراد کنعان اور فلسطین ہیں

'الۡاَرۡضَ الۡمُقَدَّسَةَ الَّتِیۡ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمۡ' ارضِ مقدس' سے مراد کنعان اور فلسطین کا علاقہ ہے۔ اس کو مقدس کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہی علاقہ ہے جہاں حضرت ابراہیم، حضرت اسحٰق اور حضرت یعقوب علیہم السلام نے اللہ کے دین کی دعوت کا آغاز کیا۔ یہ علاقہ اگرچہ بعد میں کافروں اور بت پرستوں کے قبضے میں آ گیا تھا لیکن توحید اور خدا پرستی کی اذان چونکہ سب سے پہلے اسی علاقے میں گونجی تھی، اس وجہ سے اس کو ارضِ مقدس سے تعبیر فرمایا۔ مصر سے نکلنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اسی علاقے کو بنی اسرائیل کی میراث قرار دیا اور تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قسم کھا کر ان سے وعدہ کیا کہ میں نے یہ علاقہ تم کو دیا۔ ملاحظہ ہو گنتی باب ۱۴۔

حضرت موسیٰ کی ایک تقریر

یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس تقریر کا حوالہ ہے جو انھوں نے دشتِ فاران میں اس موقع پر فرمائی جب بنی اسرائیل کو فلسطین پر حملہ کے لیے ابھارا ہے۔ تورات کی کتاب گنتی باب ۱۳-۱۴ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مصر سے نکلنے کے بعد تمام منازل سفر طے کرتے ہوئے، جب حضرت موسیٰؑ دشتِ فاران میں پہنچے اور فلسطین کا علاقہ قریب آیا تو چونکہ یہی علاقہ منزلِ مقصود تھا اس وجہ سے آپ نے ۱۲ سرداروں کی ایک پارٹی علاقے کے حالات دریافت کرنے کے لیے بھیجی۔ یہ پارٹی اپنی مہم سے فارغ ہو کر جب واپس آئی تو اس نے علاقے کی زرخیزی و شادابی سے متعلق تو نہایت شوق انگیز رپورٹ دی لیکن ملک پر قابض باشندوں کے قد و قامت اور ان کی زور آوری سے متعلق اس نے جو بیان دیا وہ بنی اسرائیل کے لیے نہایت حوصلہ شکن ثابت ہوا۔ چنانچہ یہ بیان سنتے ہی انھوں نے واویلا شروع کر دیا اور جس ملک پر قبضہ کرنے کی امنگیں لیے ہوئے یہاں تک پہنچے تھے اس پر قبضہ کرنا تو درکنار، پھر مصر پلٹ جانے کی باتیں کرنے لگے۔

اور یہ بات انھیں یاد بھی نہیں رہی کہ خدا نے ان کو اس ملک کی میراث دینے کا قسم کے ساتھ وعدہ فرمایا ہے۔ تفتیشی مہم کے ارکان میں سے دو شخصوں نے، جن کے نام تورات میں یوشع اور کالب بتائے گئے ہیں، ان کی ہمت بندھانے کی بڑی کوشش کی اور اللہ کے وعدوں اور عزم و ہمت کے ثمرات و برکات کا بہتیرا حوالہ دیا لیکن بنی اسرائیل فلسطین پر حملہ کرنے کی ہمت و حوصلہ کرنے کی بجائے ان دونوں حوصلہ مندوں کو سنگسار کر دینے کے درپے ہو گئے۔

یہی موقع ہے جب حضرت موسیٰؑ نے یہ تقریر فرمائی ہے۔ قرآن نے اگرچہ تقریر کا صرف خلاصہ دیا ہے۔ اس لیے کہ مقصود بالاجمال واقعہ کی طرف صرف اشارہ کر دینا تھا، تاہم وہ سارے پہلو اس میں موجود ہیں جو اس موقع پر حوصلے کو بحال کرنے اور پست حوصلگی کے انجام بد سے آگاہ کرنے کے لیے ضروری تھے۔ حضرت موسیٰؑ نے اللہ تعالیٰ کے ان افضال و عنایات کا حوالہ دیا جو مصر سے خروج کے وقت سے لے کر اب تک برابر سایہ کی طرح بنی اسرائیل کے ساتھ رہے، ان قطعی اور حتمی وعدوں کا حوالہ دیا جو سلسلۂ نبوت کے اجرا اور بنی اسرائیل کو ایک عظیم حکمران قوم بنانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرمائے۔ اس میراث کا حوالہ دیا جو ایک شاداب و زرخیز علاقہ کی شکل میں ان کو ملنے والی تھی اور جس کو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے لکھ دیا تھا۔ ان تمام وعدوں اور یقین دہانیوں کے ساتھ ان کو ارضِ مقدس پر حملہ کی دعوت دی اور ساتھ ہی بزدلی اور پست حوصلگی کے انجام بد سے بھی آگاہ کر دیا کہ قدم پیچھے ہٹایا تو بالکل ہی نامراد ہو کر رہ جاؤ گے۔ پیچھے مصر کی غلامی ہے اور آگے کے لیے ہمت نہ کی تو یہ صحرا گردی ہے جس میں مر کھپ کر فنا ہو جاؤ گے۔

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ ۖ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا ۚ فَاِنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ (۲۲)

بنی اسرائیل کی مرعوبیت

'قَوْمًا جَبَّارِيْنَ'، 'جبار' کے معنی قد آور، زور آور، تگڑے اور طاقت ور کے ہیں۔ عربی میں 'جبار' کھجور کے ان درختوں کو بھی کہتے ہیں جو بہت اونچے ہوں۔ تورات میں ان کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی گئی ہے۔

> وہ ملک جس کا حال دریافت کرنے کو ہم اس میں سے گزرے ایک ایسا ملک ہے جو اپنے باشندوں کو کھا جاتا ہے اور وہاں جتنے آدمی ہم نے دیکھے وہ سب قد آور ہیں اور وہاں ہم نے بنی عناق کو بھی دیکھا جو جبارہ ہیں اور جباروں کی نسل سے ہیں اور ہم تو اپنی ہی نگاہ میں ایسے تھے جیسے ٹڈے ہوتے ہیں اور ایسے ہی ان کی نگاہ میں تھے۔ گنتی ۱۳: ۳۳

ؐ یہاں غالباً 'حملہ آوروں' کے الفاظ ہوں گے۔

یہ اس رپورٹ کے الفاظ ہیں جو تفتیشی مہم کے ارکان نے فلسطین کے باشندوں سے متعلق دی۔ اس میں بنی عناق کے لیے 'جبار' ہی کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ معلوم ہوتا ہے یہ لفظ اسی زمانے سے چلا آرہا ہے جو بعینہٖ قرآن میں بھی استعمال ہوا۔ عربی اور عبرانی دونوں قریب المخرج زبانیں ہیں۔ اس وجہ سے دونوں میں بہت سے مادے اور الفاظ مشترک ہیں۔

یہ حضرت موسیٰؑ کی اس تقریر کا جو اوپر مذکور ہوئی، بنی اسرائیل کی طرف سے جواب ہے کہ جب اس ملک پر ایسے جبار اور قد آور لوگ قابض ہیں تو ہم تو ان کی تلواروں کا لقمہ بننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ البتہ اگر قدرت کے کسی ایسے معجزے کے ذریعے سے، جیسے معجزے تم اب تک دکھلاتے رہے ہو، یہ اس علاقے سے نکل جائیں تو بے شک ہم اس علاقے پر قابض ہونے کے لیے تیار ہیں۔

قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِیْنَ یَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْہِمَا ادْخُلُوْا عَلَیْہِمُ الْبَابَ ۚ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْہُ فَاِنَّکُمْ غٰلِبُوْنَ ۚ وَعَلَی اللّٰہِ فَتَوَکَّلُوْٓا اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (۲۳)

یوشع اور کالب کا شاندار کردار

'رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِیْنَ یَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْہِمَا'، 'رَجُلٰنِ' سے مراد، جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، یوشع اور کالب ہیں جو اس مہم کے ارکان میں تھے جو فلسطین کے حالات کی تفتیش کے لیے بھیجی گئی تھی۔ 'اَلَّذِیْنَ یَخَافُوْنَ' میں عام طور پر لوگوں نے 'یَخَافُوْنَ' کے مفعول کو محذوف مانا ہے یعنی 'یَخَافُوْنَ اللّٰہَ' وہ اللہ سے ڈرنے والوں میں سے تھے۔ اگرچہ میرے استاذ رحمۃ اللہ علیہ کا رجحان بھی اسی طرف ہے لیکن دو وجہ سے اس تاویل پر میرا دل نہیں جمتا۔ ایک تو یہ کہ یہ موقع مفعول کے اظہار کا تھا نہ کہ اس کے حذف کا، اس لیے کہ یہاں التباس پیدا ہو سکتا ہے اور التباس کے مواقع میں اظہار مستحسن ہے نہ کہ حذف۔ دوسری یہ کہ اس صورت میں یہ ماننا پڑے گا کہ اس وقت خدا سے ڈرنے والوں کی ایک جماعت موجود تھی جن کے اندر یوشع اور کالب بھی تھے۔ اگر یہ بات ہے تو انعامِ الٰہی کی تخصیص انہی دو حضرات کے لیے کیوں ہوئی، پھر تو 'اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْہِمَا' کی جگہ 'اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْہِمْ' ہونا تھا۔ علاوہ ازیں تورات اور قرآن دونوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس وقت بنی عناق کے خوف سے پوری قوم کا دل بیٹھ گیا تھا، صرف یہ دو اللہ کے بندے پوری قوم میں ایسے نکلے جو خوف زدہ نہیں ہوئے بلکہ اللہ کے عہد پر استوار رہے۔

اس وجہ سے قرین صواب تاویل میرے نزدیک یہ ہے کہ ہرچند یوشع اور کالب تھے تو اسی قوم میں سے جس پر خوف اور بزدلی کی موت طاری تھی لیکن اللہ کا ان پر فضل و انعام تھا کہ وہ اس وبائے عام میں مرنے پر راضی نہیں ہوئے بلکہ ایمان اور عزم پر استوار رہنے کی انھوں نے توفیق پائی۔ اس میں شبہ نہیں کہ جب پوری قوم کی قوم اس طرح ہمت ہار بیٹھے جس طرح بنی اسرائیل ہار بیٹھے تو بہادر سے بہادر آدمی کے اعصاب بھی جواب دے جاتے ہیں۔ بڑا ہی باوفا اور صداقت شعار ہوتا ہے وہ مردِ حق جو ایسے نازک موقع پر بھی اپنی وفاداری اور صداقت شعاری نباہ لے جائے۔ یوشع اور کالب کے کردار کا یہی پہلو ہے

جس کے سبب سے عہد و میثاق کی اس سورہ میں قرآن نے ان کا ذکر کر کے ان کو زندہ جاوید بنا دیا تاکہ جو لوگ خدا کی راہ پر چلنے کا ارادہ کریں وہ ان کے اس مثالی کردار سے یہ سبق لیں کہ جب سب سو جائیں تو جاگنے والے کس طرح جاگتے ہیں۔ اور جب سب مر جاتے ہیں تو زندہ رہنے والے کس طرح زندہ رہتے ہیں قرآن نے یہاں بزدلوں کے اندر کے بہادروں اور مُردوں کے اندر کے زندوں کو اس لیے نمایاں کیا ہے کہ بہادروں کے اندر بہادر اور زندوں کے اندر زندہ تو بہت نظر آ جائیں گے لیکن وہ زندگی بخش ہستیاں بہت کمیاب ہیں جو مُردوں کو زندگی بخشتی ہیں اگرچہ اسی راہ میں انھیں خود اپنی زندگیوں سے ہاتھ دھونے پڑ جائیں۔

یوشع اور کالب کی تاریخی تقریر

'ادْخُلُوا عَلَيْهِمُ الْبَابَ فَإِذَا دَخَلْتُمُوهُ فَإِنَّكُمْ غَالِبُونَ' یہ ان دونوں مردانِ حق کی تقریر ہے جو انھوں نے اپنی ہمت ہاری ہوئی قوم کا حوصلہ بحال کرنے کے لیے کی۔ انھوں نے للکارا کہ شہر کے پھاٹک سے ان پر چڑھائی کرو، جب تم یہ اقدام کر گزرو گے تو تمہی غالب رہوگے۔ اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ بندے جب اپنا فرض ادا کرنے کے لیے ان کے اپنے پاس جو طاقت و قوت موجود ہے اس کو میدان میں ڈال دیتے ہیں تب وہ اپنی مدد و نصرت سے ان کو نوازتا ہے، گھروں میں بیٹھے رہنے والوں کے لیے اس کی آسمانی تائید نہیں اترا کرتی۔ تورات میں ان کی یہ تقریر ان الفاظ میں ہے۔

"اور نون کا بیٹا یشوع اور یفنہ کا بیٹا کالب، جو اس ملک کا حال دریافت کرنے والوں میں سے تھے، اپنے اپنے کپڑے پھاڑ کر بنی اسرائیل کی ساری جماعت سے کہنے لگے کہ وہ ملک جس کا حال دریافت کرنے کو ہم اس میں سے گزرے نہایت اچھا ملک ہے۔ اگر خدا ہم سے راضی رہے تو وہ ہم کو اس ملک میں پہنچائے گا اور وہی ملک جس میں دودھ اور شہد بہتا ہے ہم کو دے گا فقط اتنا ہو کہ تم خداوند سے بغاوت نہ کرو اور نہ اس ملک کے لوگوں سے ڈرو، وہ تو ہماری خوراک ہیں، ان کی پناہ ان کے سر پر سے جاتی رہی ہے اور ہمارے ساتھ خداوند ہے۔ سو ان کا خوف نہ کرو۔ تب ساری جماعت بول اٹھی کہ ان کو سنگسار کرو" ۔گنتی باب ۱۴: ۶-۱۰)

'وَعَلَى اللَّهِ فَتَوَكَّلُوا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ' یعنی اگر خدا پر ایمان ہے تو خدا نے تو قسم کے ساتھ اس ملک کی میراث تم کو دینے کا وعدہ فرمایا ہے، پھر خدا پر بھروسہ رکھو، اس کے حکم کی تعمیل کا عزم کرو۔ جب تم اپنا فرض ادا کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوگے تو وہ اپنا وعدہ ضرور پورا فرمائے گا۔

قَالُوا يَٰمُوسَىٰٓ إِنَّا لَن نَّدْخُلَهَآ أَبَدًا مَّا دَامُوا۟ فِيهَا فَٱذْهَبْ أَنتَ وَرَبُّكَ فَقَٰتِلَآ إِنَّا هَٰهُنَا قَٰعِدُونَ (۲۴)

یہ بنی اسرائیل کی طرف سے آخری جواب تھا۔ تورات میں یہ جواب ان لفظوں میں تو موجود نہیں ہے لیکن بنی اسرائیل کے گریہ و ماتم کا ذکر ہے۔

بنی اسرائیل کا واویلا

"تب ساری جماعت زور زور سے چیخنے لگی اور وہ لوگ اس رات روتے ہی رہے اور کل بنی اسرائیل موسیٰ اور ہارون کی شکایت کرنے لگے اور ساری جماعت ان سے کہنے لگی ہائے کاش

ہم مصر ہی میں مر جاتے! یا کاش اس بیابان ہی میں مرتے! خداوند کیوں ہم کو اس ملک میں لے جا کر تلوار سے قتل کرانا چاہتا ہے۔ گنتی ۱۴: ۱-۳

ظاہر ہے کہ جن کی بزدلی اور دہشت زدگی کا یہ عالم ہو ان کے لیے حضرت موسیٰؑ اور یوشع و کالب کی یہ یقین دہانی کہ خدا ہمارے ساتھ ہے، تم ان کا خوف نہ کرو، بالکل بے سود تھی۔ انھوں نے یقیناً اس یقین دہانی کے جواب میں یہی کہا ہوگا کہ اگر خداوند ساتھ ہے تو تم اور تمہارا خداوند جا کر لڑو، ہم تو یہیں بیٹھتے ہیں۔

قَالَ رَبِّ إِنِّي لَآ أَمْلِكُ إِلَّا نَفْسِي وَأَخِي فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِينَ (۲۵)

حضرت موسیٰؑ کی درخواست بارگاہِ الٰہی میں

بنی اسرائیل کے مذکورہ بالا جواب کے بعد ان سے کسی خیر کی آخری امید بھی ختم ہوگئی اس وجہ سے حضرت موسیٰؑ نے نہایت غم اور صدمے کے ساتھ اپنے پروردگار سے دعا کی کہ اے میرے رب! میرا اپنی جان اور اپنے بھائی کے سوا کسی پر کوئی زور نہیں، اس وجہ سے اب تو ہمارے اور اس بدعہد قوم کے درمیان علیحدگی کر دے۔ 'علیحدگی کر دینے' کا منشا ظاہر ہے کہ یہی ہو سکتا ہے کہ اب ان کی قیادت و اصلاح کے بارِ عظیم سے ان کو سبکدوش کر دیا جائے۔ اتنی طویل جد و جہد اور اتنے بے شمار خوارق و عجائب کے بعد بھی جن کی بے یقینی کا یہ عالم ہے کہ ایک شخص بھی بات سننے کے لیے تیار نہیں ہے تو اب میں ان پتھروں میں کیا جونک لگا سکوں گا۔ اب تو میرے اور ان کے درمیان فیصلہ ہی فرما دے۔

حضرت ہارونؑ چونکہ خود خدا کے مقرر کردہ وزیر تھے اور انھوں نے ہر مرحلے میں اپنی وفاداری کا شایانِ شان ثبوت دیا تھا اس وجہ سے ان پر اعتماد تو ایک امر بدیہی تھا لیکن باقی پوری قوم، اللہ کے ان دو بندوں کے سوا جن کا ذکر اوپر ہوا، بالکل مردہ نکلی۔

قَالَ فَإِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ أَرْبَعِينَ سَنَةً ۚ يَتِيهُونَ فِي الْأَرْضِ ۚ فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِينَ (۲۶)

بنی اسرائیل کو صحرا گردی کی سزا

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کی علیحدگی کی درخواست تو منظور نہیں فرمائی، اس لیے کہ پیغمبر قوم کے لیے بمنزلۂ روح ہوتا ہے۔ قوم سے اس کی علیحدگی، اور وہ بھی اعلان برأت کے ساتھ، پوری قوم کے لیے پیغامِ ہلاکت ہوتی ہے لیکن بنی اسرائیل کی اس ناقدری اور بے یقینی کی سزا ان کو یہ دی کہ چالیس سال کے لیے سرزمین مقدس کو ان کے لیے حرام کر دیا اور یہ فیصلہ فرمایا کہ یہ مدت یہ اسی صحرا گردی میں گزاریں گے۔ تورات میں اس کا ذکر اس طرح ہوا ہے۔

> اور خداوند نے موسیٰؑ اور ہارونؑ سے کہا، میں کب تک اس خبیث گروہ کی جو میری شکایت کرتی رہتی ہے برداشت کروں؟ بنی اسرائیل جو میرے برخلاف شکایتیں کرتے رہتے ہیں میں نے وہ سب شکایتیں سنی ہیں، سو تم ان سے کہہ دو، خداوند کہتا ہے مجھے اپنی حیات کی قسم ہے کہ جیسے تم نے میرے سنتے کہا ہے میں تم سے ضرور ویسا ہی کروں گا، تمہاری لاشیں اسی بیابان میں پڑی رہیں گی اور تمہاری ساری تعداد میں سے یعنی بیس برس سے لے کر اس سے اوپر اوپر

کی عمر کے تم سب جتنے گنے گئے اور مجھ پر شکایت کرتے رہے ان میں سے کوئی اس ملک میں جس کی بابت میں نے قسم کھائی تھی کہ تم کو وہاں بساؤں گا، جانے نہ پائے گا۔ سوائے یفنہ کے بیٹے کالب اور نون کے بیٹے یشوع کے۔ اور تمہارے بال بچے جن کی بابت تم نے یہ کہا کہ وہ تو لوٹ کا مال ٹھہریں گے ان کو میں وہاں پہنچاؤں گا اور جس ملک کو تم نے حقیر جانا وہ اس کی حقیقت پہچانیں گے اور تمہارا یہ حال ہوگا کہ تمہاری لاشیں اس بیابان میں پڑی رہیں گی اور تمہارے لڑکے بالے چالیس برس تک بیابان میں پھرتے اور تمہاری ناکاریوں کا پھل پاتے رہیں گے۔ گنتی باب ۱۴: ۲۷-۳۴

اجتماعیات کا ایک اہم سبق

اس صحرا گردی کے دوران میں بنی اسرائیل حضرت موسیٰ و حضرت ہارونؑ کی قیادت سے بھی محروم ہو گئے اور ان کی وہ پوری نسل بھی ختم ہو گئی جس نے قبطیوں کی غلامی کے زیر سایہ پرورش پائی تھی البتہ وہ نسل باقی رہی جو اس صحرا کی فضا میں پلی اور جوان ہوئی۔ اسی نے بعد میں یوشع کی قیادت میں موعودہ سرزمین کو فتح کیا۔ اس سے ہمارے بعض علمائے اجتماعیات نے یہ نتیجہ نکالا ہے اور صحیح نتیجہ نکالا ہے کہ آزادی و حکمرانی کی ذمہ داریوں کے لیے خود اعتمادی اور اولوالعزمی ضروری ہے۔ مصر کی غلامی نے یہ چیز بنی اسرائیل کے اندر سے ختم کر دی تھی قدرت نے ان کو صحرا کی بھٹی میں تپا کر از سرِ نو ان کے اندر یہ جوہر پیدا کیا تب وہ اس قابل ہو سکے کہ کسی ملک کو فتح اور اس پر حکومت کریں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے لیے ضابطے اور قاعدے بنائے ہیں اور یہ ضابطے اور قاعدے بالکل بے لاگ ہیں۔ قدرت نے اجتماعی ترقی کے لیے جو زینے ٹھہرا دیے ہیں ان کو طے کیے بغیر کوئی قوم بام ترقی پر نہیں پہنچ سکتی، اگرچہ وہ حضرت ابراہیمؑ جیسے جلیل القدر پیغمبر کی نسل ہی سے کیوں نہ ہو۔ تاریخِ بنی اسرائیل کے اس واقعے نے ان کے اس زعم کی پوری پوری تردید کر دی جس کا حوالہ اوپر گزرا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ کے محبوب اور چہیتے سمجھتے ہیں۔ اس وجہ سے عمل و اطاعت کی ذمہ داریوں سے اپنے کو بری خیال کیے بیٹھے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تمہارا یہ گمان کچھ حقیقت رکھتا ہے تو موسیٰ کی موجودگی میں تو تم اور بھی زیادہ چہیتے تھے، پھر اس وقت ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب تم نے ڈگ ڈال دیے تھے تو خدا خود تمہیں اپنے کندھوں پر اٹھا کر لے جاتا اور فلسطین کا بادشاہ بنا دیتا۔ پھر خدا کی جنت کو تم یونہی مفت میں حاصل کرنے کے خبط میں کیوں مبتلا ہو!

۱۰۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۲۷-۳۱

قصۂ ہابیل و قابیل کی تعلیم

آگے آدم کے دو بیٹوں کا قصہ بیان ہوا ہے۔ یہ قصہ یوں مذکور تو تورات میں بھی ہے لیکن تورات کے عام انداز کے مطابق، اس کی نوعیت بس نسلِ آدم کی ابتدائی تاریخ کے ایک قصے کی ہے۔ اس سے یہ

---

[1] یہ بات یہاں یاد رکھنے کی ہے کہ زنا کاری کا لفظ تورات میں خدا کے ساتھ بدعہدی اور بے وفائی کے لیے بکثرت استعمال ہوا ہے۔

واضح نہیں ہوتا کہ اس کے اندر وہ کیا حکمت و موعظت ہے جس کے لیے یہ قصہ بیان ہوا ہے۔ قرآن نے اس کو اس کی حکمت و موعظت کے ساتھ بیان فرمایا اور اس کے ان حصوں کو بھی واضح کیا جو تورات کے راویوں نے ضائع کر دیے تھے حالانکہ وہ سبق آموزی کے لیے نہایت ضروری تھے۔ یہ قصہ یہاں قرآن میں جن حقائق کو واضح کرنے کے لیے بیان ہوا ہے ان کی تفصیل تو آیات کی تفسیر کے ضمن میں آئے گی لیکن چند اصولی باتوں کی طرف ہم یہاں بھی اشارہ کیے دیتے ہیں تاکہ سلسلۂ کلام سمجھ میں آجائے۔

سب سے پہلے تو یہ حقیقت اس سے واضح ہوتی ہے کہ عہد الٰہی پر قائم رہنے کے لیے مقدم شے یہ ہے کہ آدمی کے اندر خدا کا ایسا خوف ہو جو سخت سے سخت آزمائش کے موقع پر بھی اس کے قدم راہ حق پر استوار رکھے۔

دوسری یہ کہ نقض عہد کا باعث وہ فاسد جذبات ہیں جو شیطان کی انگیخت سے پیدا ہوتے ہیں اور بالآخر وہ انسان کو ایسے جرائم پر آمادہ کر دیتے ہیں جو عہد الٰہی کے بالکل منافی ہوتے ہیں۔

تیسری یہ کہ جس طرح اللہ کے نیک بندے یوشع اور کالب، عام فساد اخلاق و کردار کے باوجود اللہ کے عہد پر استوار رہے، انھوں نے اپنی جان کی پروا نہیں کی، اسی طرح اللہ کے نیک بندے — ہابیل — نے اپنے بھائی قابیل کے ظلم و تعدی کے مقابل میں اپنے آپ کو حق و عدل پر استوار رکھا اور قابیل کی دشمنی اس کو حق و عدل سے ہٹانے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ یہاں تک کہ اسی حق و عدل کی حفاظت میں انھوں نے اپنی جان قربان کر دی۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى اور كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ کے علمبرداروں کی تاریخ نہایت قدیم ہے۔ اس راہ کا سب سے پہلا شہید آدمؑ کا بیٹا ہابیل ہے جس نے اپنے عمل سے بعد کی نسلوں کے لیے یہ زندۂ جاوید مثال قائم کی کہ حق پر مر جانا باطل پر زندہ رہنے سے ہزار درجہ بہتر ہے۔

چوتھی یہ کہ خدا پر ایمان، خدا کی عبادت، عبادت کے لیے اخلاص و تقویٰ کی شرط، عدل کا تصور، قتل نفس کا جرم ہونا، جنت اور دوزخ کا عقیدہ، یہ سب چیزیں انسان کی ابتدائے آفرینش ہی سے اس کو تعلیم ہوئی ہیں۔ ان کا عہد جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہر نبی اور اس کی امت سے لیا ہے اسی طرح آدمؑ اور ان کی ذریت سے بھی لیا تھا۔ اس سے ان لوگوں کے خیال کی پوری پوری تردید ہو رہی ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ ابتدائی انسان حق و عدل کے ان تصورات سے بالکل خالی تھا جو اب اس کے اندر پائے جاتے ہیں۔ ان کے نزدیک انسان ایک طویل فکری و اخلاقی سفر ارتقا کے بعد ان تصورات تک پہنچا ہے، پہلے وہ ان چیزوں سے بالکل محروم تھا۔ ہم اس خیال کے باطل ہونے پر دوسرے مقام میں تفصیل کے ساتھ بحث کر چکے ہیں[1]۔ اس

---

[1] ملاحظہ ہوں ہماری کتاب حقیقت شرک و توحید کے حصہ اول کے آخری مباحث اور اسلامی قانون کی تدوین کا پہلا باب۔

روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

قرآن آیات ۲۷-۳۱

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۘ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ۭ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ ۭ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۲۷﴾ لَىِٕنْۢ بَسَطْتَّ اِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِيْ مَآ اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِيَ اِلَيْكَ لِاَقْتُلَكَ ۚ اِنِّىْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۸﴾ اِنِّىْٓ اُرِيْدُ اَنْ تَبُوْۗاَ بِاِثْمِيْ وَاِثْمِكَ فَتَكُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۚ وَذٰلِكَ جَزٰۗؤُا الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۹﴾ فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِيْهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۳۰﴾ فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِي الْاَرْضِ لِيُرِيَهٗ كَيْفَ يُوَارِيْ سَوْءَةَ اَخِيْهِ ۭ قَالَ يٰوَيْلَتٰٓى اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِيَ سَوْءَةَ اَخِيْ ۚ فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ ﴿۳۱﴾

النصف — ع ما نقرہ ۵

ترجمۂ آیات ۲۷-۳۱

اور ان کو آدم کے دو بیٹوں کی سرگزشت اس کی حکمت کے ساتھ سناؤ جب کہ ان دونوں نے قربانی پیش کی تو ان میں سے ایک کی قربانی قبول ہوئی اور دوسرے کی قربانی قبول نہیں ہوئی۔ وہ بولا کہ میں تجھے قتل کر کے رہوں گا۔ اس نے جواب دیا کہ اللہ تو صرف اپنے متقی بندوں کی قربانی قبول کرتا ہے۔ اگر تم مجھے قتل کرنے کے لیے مجھ پر دست درازی کرو گے تو میں تم کو قتل کرنے کے لیے تم پر دست درازی کرنے والا نہیں۔ میں اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرا گناہ اور اپنا گناہ دونوں تمہی لے کر لوٹو اور جہنم والوں میں سے بنو، یہی سزا ہے ظالموں کی۔ ۲۷-۲۹

بالآخر اس کے نفس نے اس کو اپنے بھائی کے قتل پر آمادہ کر لیا اور وہ اس کو قتل کر

کے نامرادوں میں سے ہو گیا۔ پھر خدا نے ایک کوّے کو بھیجا جو زمین میں کرید تا تھا تاکہ وہ اس کو دکھائے کہ وہ اپنے بھائی کی لاش کو کس طرح چھپائے۔ وہ بولا کہ ہائے میری کم بختی! کیا میں اس کوّے جیسا بھی نہ ہو سکا کہ اپنے بھائی کی لاش کو ڈھانک دیتا۔ سو وہ اس پر شرمسار ہوا۔ ۳۰-۳۱

۱۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۘ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ۭ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ ۭ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ (۲۷)

'وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ'۔ 'عَلَيْهِمْ' میں ضمیر کا مرجع اہل کتاب بالخصوص یہود ہیں جن کا ذکر اوپر سے چلا آرہا ہے۔ اگرچہ واقعے میں جو موعظت و نصیحت ہے وہ عام ہے، وہ جس طرح یہود کے لیے سبق آموز ہے اسی طرح اس امت کے لیے بھی ہے، چنانچہ ایک حدیث میں ہے بھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدمؑ کے دونوں بیٹوں کا واقعہ اس امت کے لیے بطور مثال بیان ہوا ہے تو ان میں سے اچھے کی مثال کی پیروی کرو۔ تاہم اس کا براہ راست خطاب یہود ہی سے ہے کیونکہ یہود نے اس امت کے معاملے میں بالکل وہی روش اختیار کی جو قابیل نے ہابیل کے معاملے میں اختیار کی۔ جس طرح ہابیل کی عند اللہ مقبولیت سے قابیل پر حسد کا بخار چڑھا تو وہ حق و عدل کا خون کرنے پر اترا، اسی طرح یہود نے جب اس امت پر رب کی نوازش دیکھی تو وہ حسد کے جنون میں ایسے بوکھلائے کہ بدبختی و شقاوت کی آخری حد کو پہنچ گئے۔

خدا کی زمین پر عدل اور ظلم کی پہلی کشمکش

'نَبَا' کسی اہم حادثے اور واقعے کی خبر کو کہتے ہیں۔ چونکہ یہ واقعہ اس آسمان کے نیچے، عدل و ظلم، وفاداری و عہد شکنی، خدا خوفی اور تعدّی کی کشمکش کا سب سے پہلا واقعہ ہے اور بالکل پہلی بار خدا کی اس زمین پر حق کی راہ میں ایک حق پرست کا خونِ ناحق بہا، اسی وجہ سے قرآن نے اس کو 'نبا' سے تعبیر فرمایا تاکہ اس کی اہمیت واضح ہو سکے۔

بالحق کا مفہوم

'بِالْحَقِّ' سے مقصود، جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں، ٹھیک ٹھیک اور حکمت و موعظت کے پہلو کو سامنے رکھتے ہوئے سنانا ہے۔ واقعات اگر محض داستان سرائی کے لیے بیان کیے جائیں تو یہ ایک کارِ عبث ہے۔ ان کے بیان کا نفع صرف اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جب وہ اس حکمت و موعظت

کے ساتھ بیان کیے جائیں جو ان کے اندر مضمر ہے اور ٹھیک ٹھیک بیان کیے جائیں۔ تورات میں یہ مصیبت ہے کہ نہ تو واقعات ٹھیک ٹھیک بیان ہوئے ہیں اور نہ ان سے وہ حکمت و نصیحت ہی واضح ہوتی ہے جو واضح ہونی چاہیئے۔ یہی حال ہماری بیشتر تاریخ کی کتابوں کا ہے جس کے سبب سے تاریخ کا فن ایک بالکل بیکار فن بن کے رہ گیا ہے۔ ہم مذکورہ واقعہ یہاں تورات سے نقل کرتے ہیں۔ اس کو پڑھیے اور پھر قرآن کے بیان سے مقابلہ کر کے دیکھیے تو اس سے خود اندازہ ہو جائے گا کہ 'بالحق' بیان کرنے کا مقصد کیا ہے۔ تورات میں یہ واقعہ یوں بیان ہوا ہے۔

ہابیل وقابیل کا قصہ تورات میں

> اور آدم اپنی بیوی حوا کے پاس گیا اور وہ حاملہ ہوئی اور اس کے قائن پیدا ہوا۔ تب اس نے کہا مجھے خداوند سے ایک مرد ملا۔ پھر قائن کا بھائی ہابل پیدا ہوا۔ اور ہابل بھیڑ بکریوں کا چرواہا اور قائن کسان تھا۔ چند روز کے بعد یوں ہوا کہ قائن اپنے کھیت کے پھل کا ہدیہ خداوند کے واسطے لایا اور ہابل بھی اپنی بھیڑ بکریوں کے کچھ پہلوٹھے بچوں کا اور کچھ ان کی چربی کا ہدیہ لایا اور خداوند نے ہابل اور اس کے ہدیے کو منظور کیا۔ پر قائن کو اور اس کے ہدیے کو منظور نہ کیا۔ اس لیے قائن نہایت غضب ناک ہوا اور اس کا منہ بگڑا اور خداوند نے قائن سے کہا تو کیوں غضب ناک ہوا؟ اور تیرا منہ کیوں بگڑا ہوا ہے؟ اگر تو بھلا کرے تو کیا تو مقبول نہ ہوگا؟ اور اگر تو بھلا نہ کرے تو گناہ دروازے پر دبکا بیٹھا ہے اور تیرا مشتاق ہے پر تو اس پر غالب آ۔ اور قائن نے اپنے بھائی ہابل کو کچھ کہا اور جب وہ دونوں کھیت میں تھے تو یوں ہوا کہ قائن نے اپنے بھائی ہابل پر حملہ کیا اور اسے قتل کر ڈالا۔ تب خداوند نے قائن سے کہا کہ تیرا بھائی ہابل کہاں ہے؟ اس نے کہا مجھے معلوم نہیں، کیا میں اپنے بھائی کا محافظ ہوں؟ پھر اس نے کہا تو نے یہ کیا کیا؟ تیرے بھائی کا خون زمین سے مجھ کو پکارتا ہے۔ اور اب تو زمین کی طرف سے لعنتی ہوا جس نے اپنا منہ پسارا کہ تیرے ہاتھ سے تیرے بھائی کا خون لے۔ جب تو زمین کو جوتے گا تو اب وہ تجھے اپنی پیداوار نہ دے گی اور زمین پر تو خانہ خراب اور آوارہ ہوگا۔ (کتاب پیدائش باب ۴: ۱-۱۲)

قرآن اور تورات کے بیان میں واضح فرق

یہ بیان قرآن کے بیان سے یوں تو کئی پہلوؤں سے مختلف ہے، اگر ہمیں اپنے دائرۂ بحث سے ہٹ جانے کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہم ان کی طرف اشارہ کرتے لیکن ایک چیز تو ایسی واضح ہے کہ بالکل پہلی ہی نظر میں سامنے آتی ہے۔ تورات میں ہابیل کے کردار کے وہ سارے پہلو غائب ہیں جو اس سرگزشت کی جان اور تمام عالم انسانی کے لیے نمونہ اور مثال ہیں۔ قرآن نے چونکہ اس سرگزشت کو 'بالحق' پیش کیا ہے اس وجہ سے ان پہلوؤں کو اس نے اچھی طرح نمایاں کیا ہے اور ہر انصاف پسند اعتراف کرے گا کہ ان کے نمایاں ہونے سے ہابیل کی سرگزشت نے 'قَآئِمِیْنَ بِالْقِسْطِ' کے سلسلۃ الذہب کی بالکل پہلی کڑی کی حیثیت

حاصل کرلی۔ قابیل کا کردار بھی تورات میں بالکل ادھورا پیش کیا گیا ہے۔ آگے آپ دیکھیں گے کہ قرآن نے اس کے کردار کے بعض ایسے گوشے بے نقاب کیے ہیں جو شریعت الٰہی کے بعض احکام کی حکمت و مصلحت سمجھنے کے لیے ضروری ہیں۔ اس نظر سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ وہی باتیں جو تورات کے ذخیرے میں بالکل خزف ریزوں کی شکل میں ہیں، قرآن میں آکر جواہرات کی طرح چمک اٹھی ہیں۔

قابیل کی قر
کی عدم قبو

'اِذۡ قَرَّبَا قُرۡبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنۡ اَحَدِهِمَا وَلَمۡ یُتَقَبَّلۡ مِنَ الۡاٰخَرِ' 'قربان' کا لفظ صدقہ اور قربانی دونوں کے لیے آتا ہے۔ جو چیز بھی اللہ کے حضور بقصد قرب الٰہی پیش کی جائے وہ قربان ہے۔ یہاں قرآن نے یہ وضاحت نہیں کی ہے کہ ہابیل اور قابیل کو قبولیت اور عدم قبولیت کا پتہ کس طرح چلا اس لیے کہ یہ وضاحت قرآن کے پیش نظر مقصد کے لحاظ سے غیر ضروری تھی۔ لیکن تورات کے مذکورہ بالا بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی خبر خداوند نے دی تھی۔ خداوند کی بات سننے اور جاننے کا ایک ذریعہ ہاتف غیب بھی ہے۔ تورات میں اس کا ذکر بہت سے مقامات میں آیا ہے۔

قابیل پر
حسد کا دورہ

'قَالَ لَاَقۡتُلَنَّکَ قَالَ اِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الۡمُتَّقِیۡنَ' قابیل کو یہ جان کر کہ اس کی قربانی قبول نہیں ہوئی بجائے اس کے کہ اپنی نیت کے کھوٹ کی طرف توجہ ہوتی، غصہ ہابیل پر آیا کہ اس کی قربانی کیوں قبول ہوئی۔ حالانکہ اس کی قربانی قبول نہ ہونے میں ہابیل کا کوئی دخل نہیں تھا بلکہ اس میں سارا قصور خود اس کا اپنا تھا لیکن جب آدمی پر حسد کا دورہ پڑتا ہے تو اس کو اپنی نالائقیاں نظر نہیں آتیں بلکہ وہ اپنی تمام ناکامیوں کے اسباب دوسروں کے اندر ڈھونڈتا ہے اور اس غصے میں ان کے درپے انتقام و آزار ہو جاتا ہے۔ افراد میں اس بدبختانہ کردار کی سب سے پہلی مثال قابیل نے پیش کی ہے اور اقوام میں یہود نے، اسی وجہ سے، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، یہ سرگزشت یہود کو سنائی گئی ہے کہ اس آئینے میں وہ ذرا اپنے منہ دیکھ لیں کہ آج بھی ہابیل و قابیل کا وہی قصہ دہرایا جا رہا ہے جو بہت پہلے پیش آچکا ہے اور جس کی روایت بھی دنیا کو یہود ہی کے واسطے سے پہنچی ہے۔

ہابیل کی
زبان سے
فلسفۂ قربانی
کا بیان

'اِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الۡمُتَّقِیۡنَ' یہ ہابیل کی زبان سے وہی حکمت بیان ہوئی ہے جو قرآن میں لَنۡ یَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوۡمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰکِنۡ یَّنَالُهُ التَّقۡوٰی مِنۡکُمۡ (۳۷-حج) کے الفاظ سے بیان ہوئی ہے۔ یہ بات ہابیل نے قابیل کو اصل حقیقت کی طرف توجہ دلانے کے لیے کہی، مطلب یہ ہے کہ تم اس غصے میں کہ تمہاری قربانی قبول نہیں ہوئی میرے قتل کے درپے ہو گئے ہو حالانکہ اس میں نہ قصور میرا ہے، نہ خداوند کا ہے بلکہ سراسر قصور تمہارا اور تمہاری قربانی کا ہے، خداوند کے ہاں قربانی درخور قبول وہ ٹھہرتی ہے جو خدا سے ڈرنے والے بندے قربانی کے آداب و شرائط کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ یہ ضابطہ جس طرح تمہارے لیے ہے اسی طرح میرے لیے بھی ہے تو قربانی رد ہونے کا غم و غصہ ہے تو فکر تقویٰ کی کرو، نہ کہ میرے قتل کرنے کی۔ میرے قتل کرنے سے تمہاری قربانی کی قبولیت کی راہ کس طرح کھلے گی۔

لَئِنْ بَسَطْتَّ اِلَیَّ یَدَکَ لِتَقْتُلَنِیْ مَآ اَنَا بِبَاسِطٍ یَّدِیَ اِلَیْکَ لِاَقْتُلَکَ ۚ اِنِّیْٓ اَخَافُ اللّٰہَ رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ (۲۸)

قابیل کے ارادۂ قتل کے مقابل میں ہابیل کا مومنانہ رویہ

'بسط ید' کے معنی ہاتھ بڑھانے اور دست درازی کرنے کے ہیں۔ یہاں بارادۂ قتل ہاتھ بڑھانے کا ذکر ہے اس وجہ سے اس کے معنی اقدامِ قتل کے ہوں گے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم جیسا کہ دھمکی دے رہے ہو، میرے قتل کے لیے اقدام کرنا چاہتے ہو تو میں یہ فرض کر کے کہ تم میرے قتل کے درپے ہو، تمہارے قتل کے لیے پہل کرنے والا نہیں ہوں۔ میں اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں جس نے مجھ کو اور تم کو دونوں کو پیدا کیا ہے، اور جس نے ایک دوسرے کے جان و مال کے احترام کی ہدایت فرمائی ہے۔

یہ ملحوظ رہے کہ یہاں کھلے ہوئے دینی دشمن کے ساتھ میدانِ جنگ میں مقابلے کی صورت نہیں بلکہ بھائی اور بھائی کا معاملہ ہے۔ ایک بھائی دوسرے بھائی کو قتل کی دھمکی دے رہا ہے۔ اس صورت میں صحیح مومنانہ رویہ یہی ہے کہ آدمی یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کا کوئی بھائی اس کے قتل کے درپے ہے اس کے قتل کے لیے پہل نہ کرے۔ لیکن "پہل نہ کرے" یہ نہیں کہ اپنا بچاؤ بھی نہ کرے۔ ہابیل نے پہل کرنے کی نفی کی ہے، بچاؤ کی نفی نہیں کی ہے۔ اپنی جان یا اپنے مال کی مدافعت کرنا خوفِ خدا کے منافی بات نہیں ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ ایک شخص اگر مجھ سے میرا مال چھیننا چاہتا ہے تو میں اس کے ساتھ کیا معاملہ کروں؟ ارشاد ہوا اس کو خدا کا خوف دلاؤ، سائل نے کہا، اگر وہ خدا کا خوف نہ مانے، ارشاد ہوا اپنے گرد و پیش کے مسلمانوں سے اس کے مقابلے کے لیے مدد چاہو۔ سائل نے کہا اگر میرے گرد و پیش ایسے لوگ نہ ہوں۔ ارشاد ہوا پھر حکومت سے مدد چاہو۔ سائل نے کہا اگر حکومت کے ذمہ دار بھی دور ہوں۔ ارشاد ہوا اپنے مال کی حفاظت کے لیے لڑو تا آنکہ اپنے مال کو بچا لو یا شہید ہو جاؤ۔

اِنِّیْٓ اُرِیْدُ اَنْ تَبُوْٓءَا بِاِثْمِیْ وَاِثْمِکَ فَتَکُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۚ وَذٰلِکَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِیْنَ (۲۹)

'باثمی و اثمک' کا مفہوم

'بِاِثْمِیْ وَاِثْمِکَ' دونوں میں مضاف محذوف ہے یعنی میں تمہارے قتل میں پہل اس لیے نہیں کرنا چاہتا کہ میں کوئی بارِ گناہ اپنے سر لیے ہوئے اپنے رب کی طرف پلٹنا نہیں چاہتا۔ اگر تم اس جرم کے لیے پہل کرنا چاہتے ہو تو کرو۔ اگر تم مجھے قتل کر دو گے تو میرے قتل کا بارِ گناہ بھی تمہارے سر ہوگا اور میری طرف سے مدافعت کے نتیجے میں اگر تمہیں کوئی نقصان پہنچ گیا یا تم قتل ہو گئے تو اس کا بارِ گناہ بھی تمہارے ہی سر ہوگا، اس لیے کہ اس کا سبب میں نہیں بلکہ تمہی ہو گے۔ یہ اس اصولِ عدل کی طرف اشارہ ہے جو ایک حدیث میں 'فعلی البادی ما لم یعتد المظلوم' کے الفاظ سے بیان ہوا ہے یعنی اگر مظلوم نے کوئی زیادتی نہیں کی ہے تو جو کچھ اسے اپنی عزت کی حفاظت کے لیے کرنا پڑے اس کا بارِ گناہ پہل کرنے والے پر ہے۔ 'بِاِثْمِیْ' کے ساتھ 'بِاِثْمِکَ' مماثلت کے اس اصول پر فرمایا ہے جو عربی زبان میں نہایت معروف ہے، مثلاً 'دِنَّاھُمْ کَمَا دَانُوْا'، یا 'جَزَآءُ سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُھَا'۔

یَقْتُلُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ وَذٰلِکَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِیْنَ، قتل مومن، جب کہ عمداً ہو، کی سزا جہنم ہے۔ اس مسئلے پر سورۂ نساء کی آیت ۹۳ کے تحت تفصیل سے ہم لکھ چکے ہیں۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جرم کی سزا ابتدا سے شریعتِ الٰہی میں یہی معروف ہے۔

قتل مومن کی سزا جہنم

فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِيْهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِي الْاَرْضِ لِيُرِيَهٗ كَيْفَ يُوَارِيْ سَوْءَةَ اَخِيْهِ ۭ قَالَ يٰوَيْلَتٰٓى اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِيَ سَوْءَةَ اَخِيْ ۚ فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ (۳۰-۳۱)

قابیل کی نامرادی

فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِيْهِ، کے معنی ہوں گے اس کے نفس نے اس کو بالآخر اپنے بھائی کے قتل پر آمادہ کر ہی لیا۔ اس اسلوبِ بیان سے اس اندرونی کشمکش کا اظہار ہو رہا ہے جو اول اول اس ارادۂ قتل سے اس کے اندر پیدا ہوئی۔ انسان کے اندر قدرت نے ایک نفسِ لوامہ ودیعت فرمایا ہے جو اس وقت تک کسی ارادۂ جرم کے خلاف احتجاج کرتا ہے جب تک مختلف تاویلوں اور بہانوں سے آدمی اس کی زبان بند نہ کر دے۔ قابیل کو بھی اس مرحلے سے گزرنا پڑا لیکن بالآخر اس کے حسد نے اس کو اس ہولناک جرم پر آمادہ کر ہی لیا۔ ابتداءً ہر مجرم کو یہ جھجک پیش آتی ہے لیکن جب وہ جرم پر جرم کیے چلا جاتا ہے تو اس کا نفسِ لوامہ یا بالفاظِ دیگر اس کا ضمیر بالکل مردہ ہو جاتا ہے اور وہ جرائم کے لیے بالکل بے باک ہو جاتا ہے۔

فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ، میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اس طرح کی ہر کشمکش انسان کے سامنے آزمائش کا ایک میدان کھولتی ہے جس میں اس کے لیے نامرادی اور فتحمندی دونوں کا امکان موجود ہوتا ہے۔ اگر انسان اس کشمکش میں اپنے نفس کو زیر کر لے تو وہ فتحمند رہتا ہے اور اس کا نفس شکست کھا جاتا ہے اور اگر نفس اس کو زیر کر لے تو اس کا نفس فتحمند رہتا ہے اور وہ خود نامراد ہو جاتا ہے۔ قابیل پر اس کا نفس غالب آگیا اس وجہ سے وہ نامراد ہوا۔

شیطان کوے کے بھیس میں

فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا الاٰیۃ۔ قتل کے بعد قابیل نے، معلوم ہوتا ہے، اپنے بھائی کی لاش یوں ہی پڑی چھوڑ دی تھی، اس کو چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ اتنے میں ایک کوا نمودار ہوا۔ کوا بڑا سیانا ہوتا ہے اس کی عادت ہے کہ جب وہ کوئی کھانے کی چیز اچکتا ہے اور بروقت اس کو کھانا نہیں چاہتا تو زمین کرید کر یا کسی چیز کے نیچے اس کو ضرورت کے وقت کے لیے چھپا رکھتا ہے۔ اس کوے نے بھی قابیل کے سامنے یہی نمائش کی اور اس طرح گویا اس کو رہنمائی دی کہ وہ بھی اسی طرح اپنے بھائی کی لاش چھپا دے کہ دوسروں کی نظر نہ پڑے اور اس کا جرم افشا نہ ہو۔ کوے کے اس سیانے پن کو دیکھ کر قابیل نے اپنا سر پیٹ لیا کہ لٹے میری بدبختی کہ میں کوے سے بھی گیا گزرا ثابت ہوا کہ یہ تدبیر مجھے نہ سوجھی کہ میں بھی اسی طرح بھائی کی لاش کو ڈھانک دیتا۔ چنانچہ اپنی اس بے وقوفی پر اس کو بڑی ندامت ہوئی۔

قرآن نے اس ٹکڑے سے یہ نمایاں کیا ہے کہ جو خدا سے نہیں ڈرتے وہ خلق سے ڈرتے اور جو خدا کے حکم

اور ضمیر کی آواز کی پروا نہیں کرتے وہ کوّے سے الہام حاصل کرتے اور جرم کرنے کے بعد اعتراف اور ندامت کے بجائے اس کو چھپانے کی تدبیریں کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ کوا شیطان کی تمثال ہے۔ شیطان نے پہلے تو قابیل کے نفس کے اندر وسوسہ اندازی کر کے اس کو بھائی کے قتل پر آمادہ کیا اور جب وہ یہ جرم کر گزرا تو کوّے کے واسطے سے اس کو جرم کے چھپانے کی تدبیر سجھائی اور اس طرح اولادِ آدمؑ کو گمراہ کرنے کی جو قسم اس نے کھائی تھی اس کی تکمیل کی راہ میں ایک نہایت کامیاب قدم اس نے اٹھایا۔

ایک سنتِ الٰہی

یہاں کوّے کو بھیجنے کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف جو فرمائی ہے یہ درحقیقت اس سنت اللہ کی نسبت اپنی طرف فرمائی ہے جس کے تحت یہ فعل ظہور میں آیا۔ اس کی متعدد مثالیں پچھلے صفحات میں بیان ہو چکی ہیں۔ وہ سنت اللہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص اللہ کی آیات، اس کے احکام اور اس کی تنبیہات سے اپنے کان اور اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتا ہے جو اس کا ساتھی بن کر اس کو اس کی خواہشات کی وادیوں میں ٹھوکر کھلاتا پھرتا ہے۔ سورۂ زخرف میں اس سنت اللہ کی طرف ان الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے۔ وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ (۳۶) (جو خدائے رحمان کے ذکر سے غافل ہو جاتا ہے، ہم اس کے لیے ایک شیطان مقرر کر دیتے ہیں جو اس کا شب و روز کا ساتھی بن جاتا ہے) سورۂ فصلت میں ہے۔ وَقَيَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَآءَ فَزَيَّنُوْا لَهُمْ مَّا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۲۵ (پس ہم نے ان کے لیے بُرے ساتھی مقرر کر دیے جنھوں نے ان کے پیش و عقب کو خوب مزین کر کے دکھایا) اوپر گزر چکا ہے کہ ہابیل نے قابیل کو بڑی مؤثر اور دل نشین نصیحتیں بھی کیں اور اپنے قول کی صداقت روزِ روشن کی طرح ثابت بھی کر دی لیکن اس کا دل ذرا نہ پسیجا۔ ایک ایسے سنگ دل کا خدا کی مذکورہ سنت کی زد میں آ جانا ایک امرِ بدیہی ہے۔

عام طور پر مفسرین نے یہ سمجھا ہے کہ کوّا قابیل کو یہ بتانے کے لیے آیا تھا کہ وہ اپنے بھائی کی لاش کس طرح دفن کرے۔ وہ مدتوں اپنے بھائی کی لاش اپنی کمر پر لادے لادے پھرا، لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ وہ اس کو کیا کرے۔ بالآخر جب لاش سڑ گئی تب خدا نے ایک کوّے کو بھیجا جس نے ایک دوسرے کوّے کو قتل کر کے زمین میں دفنایا تب قابیل کو بھائی کی لاش ٹھکانے لگانے کا طریقہ معلوم ہوا۔ ہمارا خیال ہے کہ ہم نے اوپر جو کچھ عرض کیا ہے اس کے بعد اس عجیب و غریب بات کی تردید کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

۱۲- آگے کا مضمون ــــــ آیات ۳۲-۳۴

قانونِ قصاص کی بنیاد

آگے فرمایا کہ چونکہ انسان اپنی سرشت کے لحاظ سے ایک ایسی مخلوق ہے جس کے اندر ہابیل جیسے خدا ترس اور حق و عدل پر قائم رہنے والے بھی ہیں اور قابیل جیسے سنگ دل اور خونی بھی۔ اس وجہ سے

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی شریعت میں قصاص کو ایک جماعتی فرض قرار دیا کہ ایک کا قاتل سب کا قاتل اور ایک کا بچانے والا سب کا بچانے والا ٹھہرے گا۔ پھر اس قانون کی تجدید و یاددہانی کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر اپنے نبی و رسول بھی بھیجے لیکن اس سارے اہتمام کی بنی اسرائیل نے کوئی پروا نہ کی بلکہ وہ برابر قابیل کی سنت بد کی پیروی میں خدا کی زمین میں فساد و خوں ریزی برپا کیے جا رہے ہیں۔

اس کے بعد ان لوگوں کی سزا بیان کی ہے جو ایک اسلامی حکومت عادلہ کے اندر رہتے ہوئے اس کے قانون عدل و قسط کو درہم برہم کرنے اور ملک میں فساد برپا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، عام اس سے کہ یہ کوشش نام کے مسلمانوں کی طرف سے ہو یا غیر مسلموں کی طرف سے، علانیہ ہو یا درپردہ سازشوں کی شکل میں، جتھہ بندی کر کے ہو، یا غنڈا گردی کی شکل میں۔ جو مفسدانہ سرگرمی بھی ملک کے سیاسی، اجتماعی اور معاشرتی نظام کے لیے خطرہ بن جائے اور اس سے قانون اور نظم کا مسئلہ پیدا ہو جائے اس کے استیصال اور اس کے مجرموں کی سرکوبی کے لیے حکومت کے ارباب حل و عقد کو وسیع اختیارات دیے گئے ہیں تاکہ قیام عدل کا جو فریضہ ان پر عاید ہوتا ہے وہ اس سے عہدہ برآ ہو سکیں۔ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمایئے۔

وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم — آیات ۳۲-۳۴

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۚۛ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِى الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِى الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ ﴿۳۲﴾ اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِى الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ؕ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْىٌ فِى الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۳۳﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ ۚ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۴﴾ ع

۵ ع ۵ ۹

ترجمۂ آیات ۳۲-۳۴

اس وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل پر یہ فرض کیا کہ جس کسی نے کسی کو قتل کیا بغیر

اس کے کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو یا ملک میں فساد برپا کیا ہو تو گویا اس نے سب کو قتل کیا اور جس نے اس کو بچایا تو گویا سب کو بچایا اور ہمارے رسول ان کے پاس واضح احکام لے کر آئے لیکن اس کے باوجود ان میں بہت سے ہیں جو زیادتیاں کرتے ہیں۔ ۳۲

ان لوگوں کی سزا، جو اللہ اور اس کے رسول سے بغاوت کرتے ہیں اور ملک میں فساد برپا کرنے میں سرگرم ہیں، بس یہ ہے کہ عبرت ناک طور پر قتل کیے جائیں یا سولی پر لٹکائے جائیں یا ان کے ہاتھ اور پاؤں بے ترتیب کاٹ ڈالے جائیں یا ملک سے باہر نکال دیے جائیں۔ یہ ان کے لیے اس دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں بھی ان کے لیے ایک عذاب عظیم ہے مگر جو لوگ تمہارے قابو پانے سے پہلے ہی توبہ کرلیں تو سمجھ لو کہ اللہ مغفرت فرمانے والا اور مہربان ہے۔ ۳۳-۳۴

۱۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۚ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ ۡ ثُمَّ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِي الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ (۳۲)

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ کا مفہوم

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بعینہٖ یہ واقعہ حکم قصاص کی فرضیت کا باعث ہوا۔ یہ واقعہ تو، جیسا کہ واضح ہوا، بنی اسرائیل کی تاریخ سے بہت پہلے کا ہے۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ جان کے بدلے جان کا قانون، کچھ بنی اسرائیل کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ یہ قانون ہر ملت میں ابتدا سے موجود رہا ہے۔ حضرت نوحؑ اور حضرت ابراہیمؑ کی ملت میں بھی یہ قانون موجود تھا۔ حضرت نوح اور ان کی ذریت کو اس باب میں جو ہدایت ہوئی تھی وہ تورات میں یوں مذکور ہے۔

آدمی کی جان کا بدلہ آدمی سے اور اس کے بھائی بندسے لوں گا۔ جو آدمی کا خون کرے گا اس کا

خون آدمی سے ہوگا۔ کیونکہ خدا نے انسان کو اپنی صورت پر بنایا ہے۔ پیدائش باب ۹۔ ۵۔ ۶

اس وجہ سے یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ بعینہٖ یہ واقعہ بنی اسرائیل پر حکم قصاص کے وجوب کا باعث ہوا۔ یہ بات ملحوظ رکھنے کی ہے کہ یہاں مقصود حکم قصاص کی تاریخ بیان کرنا نہیں ہے بلکہ یہ واضح کرنا ہے کہ بنی اسرائیل اللہ کے میثاق کے معاملے میں اتنے جری اور بے باک ہیں کہ یہ جاننے کے باوجود کہ ایک کا قاتل سب کا قاتل اور ایک کی حفاظت سب کی حفاظت ہے، برابر خدا کی زمین میں فساد برپا کیے چلے جا رہے ہیں۔ یہی روش ان کی پہلے بھی رہی اور یہی روش ان کی آج بھی ہے۔

اس روشنی میں مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ کا اشارہ نفس واقعہ کی طرف نہیں بلکہ شر و فساد کی اس ذہنیت کی طرف ہوگا جس کا قابیل نے اظہار کیا اور جس کا اظہار ان لوگوں کی طرف سے برابر ہوتا رہتا ہے جو اس کی سنتِ بد کی پیروی کرتے ہیں۔ یعنی کینہ جذبات اور شیطانی محرکات کے تحت اللہ کے بندوں کا خون بہاتے ہیں اور پھر اعتراف و اقرار اور توبہ و ندامت کے بجائے اپنی ساری ذہانت اس جرم کو چھپانے میں صرف کرتے ہیں۔ ان کو اپنے جرم پر افسوس بھی ہوتا ہے تو اس پہلو سے نہیں ہوتا کہ ان کے ہاتھوں خدا کے بندوں کا سب سے بڑا حق تلف ہوا بلکہ جرم پوشی کی تدبیریں اگر ان سے کوئی کوتاہی ہو جاتی ہے تو اس پر انھیں افسوس ہوتا ہے۔

قانونِ قصاص کی حکمت و علت

'اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِى الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا' یہ اس اصل حکم کا بیان نہیں ہے جو قصاص کے باب میں یہود کو دیا گیا۔ بلکہ اس کی دلیل اور اس کی حکمت و علت بیان ہوئی ہے۔ 'جان کے بدلے جان' کا قانون تورات میں بھی ہے اور اس کا حوالہ اس سورہ میں بھی آگے آ رہا ہے۔ یہاں چونکہ مقصود یہود کی شرارت و شقاوت کو نمایاں کرنا ہے اس وجہ سے قانون قصاص کا اصل فلسفہ بیان فرمایا کہ یہود پر قتلِ نفس کی سنگینی واضح کرنے کے لیے ان کو یہ حکم اس تصریح کے ساتھ دیا گیا تھا کہ ایک کا قاتل سب کا قاتل اور ایک کا بچانے والا سب کا بچانے والا ٹھہرے گا لیکن پھر بھی وہ قتل اور فساد فی الارض کے معاملے میں بالکل بے باک ہو گئے۔

قانونِ قصاص کی ذمہ داریاں

جو ملت قانون قصاص کی حامل اس فلسفہ کے ساتھ بنائی گئی ہو جس کا ذکر اوپر ہوا، اس پر چند ذمہ داریاں لازماً عاید ہوتی ہیں جس کی طرف ہم یہاں اشارہ کریں گے۔

ہر فرد ملت پر

ایک یہ کہ ہر حادثۂ قتل پوری قوم میں ایک ہلچل پیدا کر دے۔ جب تک اس کا قصاص نہ لے لیا جائے ہر شخص یہ محسوس کرے کہ وہ اس تحفظ سے محروم ہو گیا ہے جو اس کو اب تک حاصل تھا۔ قانون ہی سب کا محافظ ہوتا ہے۔ اگر قانون ہدم ہو گیا تو صرف مقتول ہی قتل نہیں ہوا بلکہ ہر شخص قتل کی زد میں ہے۔

دوسری یہ کہ قاتل کا کھوج لگانا صرف مقتول کے وارثوں ہی کی ذمہ داری نہیں ہے بلکہ پوری جماعت کی ذمہ داری ہے، اس لیے کہ قاتل نے صرف مقتول ہی کو قتل نہیں کیا بلکہ سب کو قتل کیا ہے۔

تیسری یہ کہ کوئی شخص اگر کسی کو خطرے میں دیکھے تو اس کو پرایا جھگڑا سمجھ کر نظر انداز کرنا اس کے

لیے جائز نہیں ہے بلکہ اس کی حفاظت و حمایت تا بہ مقدور اس کے لیے ضروری ہے۔ اگرچہ اس کے لیے اسے خود جوکھم برداشت کرنی پڑے۔ اس لیے کہ جو شخص کسی مظلوم کی حمایت و مدافعت میں سینہ سپر ہوتا ہے وہ صرف مظلوم ہی کی حمایت میں سینہ سپر نہیں ہوتا بلکہ تمام خلق کی حمایت میں سینہ سپر ہوتا ہے جس میں وہ خود بھی شامل ہے۔

چوتھی یہ کہ اگر کوئی شخص کسی قتل کو چھپاتا ہے یا قاتل کے حق میں جھوٹی گواہی دیتا ہے یا قاتل کا ضامن بنتا ہے، یا قاتل کو پناہ دیتا ہے، یا قاتل کی دانستہ وکالت کرتا ہے یا دانستہ اس کو جرم سے بری کرتا ہے وہ گویا خود اپنے اور اپنے باپ، بھائی، بیٹے کے قاتل کے لیے یہ سب کچھ کرتا ہے کیونکہ ایک کا قاتل سب کا قاتل ہے۔

پانچویں یہ کہ کسی مقتول کے قصاص کے معاملے میں مقتول کے وارثوں یا حکام کی مدد کرنا بھی درحقیقت مقتول کو زندگی بخشنا ہے اس لیے کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ قصاص میں زندگی ہے۔

ہم نے یہ اس اصول سے برآمد ہونے والی چند موٹی موٹی باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مزید غور کیجیے تو اس کی مزید حکمتیں واضح ہوں گی۔ پھر کس قدر قابلِ ماتم ہے اس قوم کا حال جو اس اصول سے باخبر ہوتے ہوئے قتل و خوں ریزی اور فساد فی الارض میں بالکل بے باک ہو گئی۔

ون کے ساتھ قانون کی یاددہانی کا اہتمام

'وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ ۫ ثُمَّ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِي الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ'۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے ان کو یہ فرض بتا دینے ہی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اتمامِ حجت کے لیے برابر ان کے اندر خدا کے رسول بھی آتے رہے جو نہایت واضح احکام و ہدایات اور نہایت بلیغ اور پرزور تعلیمات و تنبیہات کے ذریعے سے ان کو جگاتے اور جھنجھوڑتے رہے کہ اللہ کے عہد و میثاق کی ذمہ داریوں سے یہ غافل نہ ہو جائیں لیکن اس سارے اہتمام کے باوجود یہ برابر خدا کی زمین میں مختلف قسم کی زیادتیوں کے مرتکب ہوتے رہے۔

فساد اور اسراف کا مفہوم

'افساد فی الارض' اور 'اسراف فی الارض' دونوں میں مفہوم کے اعتبار سے کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ زمین کا امن اور نظم اس قانونِ عدل و قسط پر منحصر ہے جو خدا نے اس کے لیے اتارا ہے۔ جس طرح کائنات کے نظامِ تکوینی میں کوئی خلل پیدا ہو جائے تو سارا نظامِ کائنات درہم برہم ہو جائے، اسی طرح اگر اس نظامِ تشریعی میں، جو اس کے خالق نے اس کے لیے پسند فرمایا ہے، کوئی خلل پیدا کر دیا جائے تو اس کا اجتماعی و معاشرتی اور سیاسی نظام درہم برہم ہو جاتا ہے، پھر نہ تو نظامِ تکوینی کے ساتھ اس کے نظامِ سیاسی کی ہم آہنگی ہی باقی رہ جاتی ہے اور نہ اس کے نظامِ اجتماعی و سیاسی میں ہی کوئی ربط قائم رہ جاتا ہے۔ اسی صورتِ حال کو یہاں افساد اور اسراف سے تعبیر فرمایا ہے۔

اس اصولی حقیقت کے ساتھ ساتھ اس تاریخی حقیقت کو یاد رکھنا بھی یہاں ضروری ہے جس کا تجربہ ان آیات کے نزول کے زمانے میں، مسلسل مسلمانوں کو یہود کی طرف سے ہو رہا تھا۔ یہود کے متعدد قبائل مثلاً بنو نضیر، بنو قریظہ، بنو قینقاع مدینہ کے حوالی میں آباد تھے۔ انھوں نے یوں تو مسلمانوں کے ساتھ امن و صلح اور

باہمی حمایت و موافقت کے معاہدے کر رکھے تھے لیکن ایک دن بھی انھوں نے ان معاہدوں کا کوئی احترام نہیں کیا بلکہ ہمیشہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے اور مدینہ سے ان کے قدم اکھاڑ دینے کی سازشیں کرتے رہے۔ قریش نے مسلمانوں پر جتنے بھی حملے کیے سب میں در پردہ یہود شریک رہے۔ انصار اور مہاجرین کے درمیان پھوٹ ڈلوانے کی بھی انھوں نے بارہا کوشش کی۔ صحابہؓ بلکہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی بھی انھوں نے بارہا تدبیریں کیں۔ اگرچہ ان کی یہ چالیں بیشتر ناکام رہیں لیکن متعدد نہایت اندوہناک واقعات پیش بھی آئے۔ عورتوں اور بچوں کے اغوا اور قتل میں بھی یہ نہایت شاطر اور سنگ دل تھے۔ مسلمانوں کو ہر وقت یہود کی طرف سے اپنی جان اور عزت کے معاملے میں کھٹکا لگا رہتا تھا۔ حد یہ ہے کہ جن مسلمانوں کو وہ کسی قضیے کے طے کرانے اور کسی معاملے پر گفتگو کرنے کے لیے بلاتے تھے ان کے بھی ہلاک کرنے کی سازش پہلے سے تیار کر رکھتے تھے۔ ثُمَّ اِنَّ كَثِیْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِی الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ، میں اس ساری صورت حال کی طرف اشارہ ہے۔

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَیَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا اَوْ یُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَیْدِیْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ؕ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْیٌ فِی الدُّنْیَا وَلَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَیْهِمْ ۝ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ

'محاربہ' کا مفہوم

'یُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَیَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا' اللہ اور رسول سے محاربہ یہ ہے کہ کوئی شخص یا گروہ یا جتھہ جرأت و جسارت، ڈھٹائی اور بیباکی کے ساتھ اس نظامِ حق و عدل کو درہم برہم کرنے کی کوشش کرے جو اللہ اور رسول نے قائم فرمایا ہے۔ اس طرح کی کوشش اگر بیرونی دشمنوں کی طرف سے ہو تو اس کے مقابلے کے لیے جنگ و جہاد کے احکام تفصیل کے ساتھ الگ بیان ہوئے ہیں۔ یہاں بیرونی دشمنوں کے بجائے اسلامی حکومت کے ان اندرونی دشمنوں کی سرکوبی کے لیے تعزیرات کا ضابطہ بیان ہو رہا ہے جو اسلامی حکومت کی رعایا ہوتے ہوئے، عام اس سے کہ وہ مسلم ہیں یا غیر مسلم، اس کے قانون اور نظم کو چیلنج کریں۔ قانون کی خلاف ورزی کی ایک شکل تو یہ ہے کہ کسی شخص سے کوئی جرم صادر ہو جائے۔ اس صورت میں اس کے ساتھ شریعت کے عام ضابطۂ حدود و تعزیرات کے تحت کارروائی کی جائے گی، دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی شخص یا گروہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لینے کی کوشش کرے۔ اپنے شر و فساد سے علاقے کے امن و نظم کو درہم برہم کر دے، لوگ اس کے ہاتھوں اپنی جان، مال، عزت، آبرو کی طرف سے ہر وقت خطرے میں مبتلا رہیں۔ قتل، ڈکیتی، رہزنی، آتش زنی، اغوا، زنا، تخریب، تہریب اور اس نوع کے سنگین جرائم حکومت کے لیے لا اور آرڈر کا مسئلہ پیدا کر دیں۔ ایسے حالات سے نمٹنے کے لیے عام ضابطۂ حدود و تعزیرات کے بجائے اسلامی حکومت مندرجہ ذیل اقدامات کرنے کی مجاز ہے۔

'اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا' یہ کہ فساد فی الارض کے یہ مجرمین قتل کر دیے جائیں۔ یہاں لفظ قتل کے بجائے تقتیل،

محاربین کے لیے ضابطۂ تعزیرات

باب تفعیل سے استعمال ہوا ہے۔ باب تفعیل معنی کی شدت اور کثرت پر دلیل ہوتا ہے اس وجہ سے تقتیل شر تقتیل کے معنی پر دلیل ہوگا۔ اس سے اشارہ نکلتا ہے کہ ان کو عبرت انگیز اور سبق آموز طریقہ پر قتل کیا جائے جس سے دوسروں کو سبق ملے۔ صرف وہ طریقۂ قتل اس سے مستثنیٰ ہوگا جو شریعت میں ممنوع ہے مثلاً آگ میں جلانا، اس کے ماسوا دوسرے طریقے جو گنڈوں اور بدمعاشوں کو عبرت دلانے، ان کو دہشت زدہ کرنے اور لوگوں کے اندر قانون و نظم کا احترام پیدا کرنے کے لیے ضروری سمجھے جائیں، حکومت ان سب کو اختیار کر سکتی ہے۔ رجم یعنی سنگسار کرنا بھی ہمارے نزدیک 'تقتیل' کے تحت داخل ہے۔ اس وجہ سے وہ گنڈے اور بدمعاش جو شریفوں کے عزت و ناموس کے لیے خطرہ بن جائیں، جو اغوا اور زنا کو پیشہ بنالیں، جو دن دہاڑے لوگوں کی عزت و آبرو پر ڈاکے ڈالیں اور کھلم کھلا زنا بالجبر کے مرتکب ہوں ان کے لیے رجم کی سزا اس لفظ کے مفہوم میں داخل ہے۔ رجم کے باب میں شادی شدہ اور غیر شادی شدہ کے درمیان ہماری فقہ میں جو فرق کیا گیا ہے اس پر انشاءاللہ ہم سورۂ نور کی تفسیر میں تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے۔

'اَوْ یُصَلَّبُوْٓا' یہ کہ ایسے لوگوں کو سولی دے دی جائے۔ سولی دینے کے لیے یہاں 'صلب' کے بجائے 'تصلیب' کا لفظ استعمال ہوا ہے جس سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ سولی اور پھانسی کے وہ طریقے بھی اختیار کیے جا سکتے جو زیادہ دردناک اور زیادہ عبرت انگیز ہوں۔ اس زمانے میں بعض طریقے جو ایجاد ہوئے ہیں ہمارے نزدیک وہ بھی اس لفظ کے مفہوم میں داخل ہیں۔

'اَوْ تُقَطَّعَ اَیْدِیْھِمْ وَاَرْجُلُھُمْ مِّنْ خِلَافٍ' یہ کہ ان کے ہاتھ پاؤں بے ترتیب کاٹ دیے جائیں۔ یہ بے ترتیب کاٹنے کی ہدایت بھی عبرت انگیزی اور درد انگیزی ہی کے نقطۂ نظر سے ہے۔ مقصود یہ ہے کہ اگر اس قسم کے کسی شریر کی جان بخشی بھی جائے تو اس طرح کہ اس کی شر انگیزی اور فساد کے تمام اسلحہ بے کار کر دیے جائیں۔

'اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ' یہ کہ ان کو ملک سے جلاوطن کر دیا جائے۔ 'نفی' کا لغوی مفہوم جلاوطن کرنا ہے۔ حبس اور قید اس کا لغوی مفہوم نہیں ہے البتہ اس کے مفہوم میں شامل ضرور ہے، اگر ایسے مجرموں کی جلاوطنی دشوار یا دینی و سیاسی نقطۂ نظر سے خلاف مصلحت ہو تو ان کو محبوس یا کسی خاص علاقہ میں پابند اور نظر بند کیا جا سکتا ہے۔ یہ چیز اس لفظ کے مفہوم کے خلاف نہیں ہوگی۔

حالات کی نوعیت کے لحاظ سے حکومت کو مناسب اقدام کا اختیار

قرآن کے الفاظ صاف اس بات پر دلیل ہیں کہ حالات کی نوعیت اور بدامنی اور قانون شکنی کے موجود اور متوقع اثرات کے لحاظ سے حکومت ان میں سے جو اقدام بھی مناسب سمجھے، کر سکتی ہے۔ عربی زبان میں 'او' کا استعمال اسی مفہوم کو ظاہر کرتا ہے۔ اس وجہ سے مجھے ان لوگوں کی رائے صائب معلوم ہوتی ہے جو حکومت کو اختیار دیتے ہیں کہ قیام امن و قانون اور استیصالِ فتنہ کے نقطۂ نظر سے ان میں سے جو سی شکل بھی اس کو مفید و موثر اور مطابق مصلحت نظر آئے اس کو اختیار کر سکتی ہے۔ اس طرح کے حالات میں

صرف اسی امر کو ملحوظ نہیں رکھنا پڑتا ہے کہ جرم کرنے والے جتھہ نے صرف مال کو نقصان پہنچایا ہے بلکہ اس سے بڑھ کر زمانہ، مقام اور جتھہ بندی کرنے والے مجرموں کے عزائم اور ان کے اثرات پر نگاہ رکھنی پڑتی ہے۔ مثلاً زمانہ جنگ یا بدامنی کا ہو تو اس میں لازماً سخت اقدام کی ضرورت ہوگی، اسی طرح مقام سرحدی یا دشمن کی سازشوں کا آماجگاہ ہو تب بھی موثر کارروائی ضروری ہوگی، اگر شرارت کا سرغنہ کوئی بڑا خطرناک آدمی ہو اور اندیشہ ہو کہ اس کو ڈھیل ملی تو بہتوں کے جان و مال اور عزت و آبرو کو خطرہ پیش آ جائے گا تب بھی حالات کے لحاظ سے مؤثر قدم اٹھانا پڑے گا۔ غرض اس میں اصلی اہمیت جزئی واقعات کی نہیں بلکہ فسادات کے مجموعی اثرات اور ملک و ملت کے مصالح کی ہے۔

سزا جماعتی حیثیت سے دی جائے گی

اس طرح کے حالات میں سزا بھی انفرادی حیثیت سے نہیں بلکہ گروہی حیثیت سے دی جائے گی۔ اگر قتل، اغوا، زنا، آتش زنی، تخریب کے واقعات پیش آئے ہیں تو یہ جستجو نہیں کی جائے گی کہ متعین طور پر ان جرائم کا ارتکاب کن ہاتھوں سے ہوا ہے بلکہ ان کی ذمہ داری میں باغی گروہ کا ہر فرد شریک سمجھا جائے گا اور اسی حیثیت سے ان کے ساتھ معاملہ کیا جائے گا، اس لیے کہ ہر جرم کے ارتکاب میں سب کے مجموعی اثر نے کام کیا ہے۔

اس قانون کے استعمال کی بعض مثالیں

عکل اور عرینہ والوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت المال کے اونٹوں کو ہنکا لے جانے اور ان کے چرواہوں کو قتل کرنے کے جرم میں جو عبرت انگیز سزا دی، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو اسی آیت کے تحت لیا ہے۔ بنونضیر، بنوقریظہ، بنوقینقاع کے ساتھ جو معاملہ حضورؐ نے کیا، ہمارے نزدیک وہ بھی اسی حکم الٰہی کے تحت کیا۔ سیدنا ابوبکرؓ نے مانعینِ زکوٰۃ کی جو سرکوبی کی وہ بھی ہمارے نزدیک اسی حکم کے تحت کی۔ مسیلمہ کذاب کا فتنہ بھی اسی محاربۂ اللہ و رسول کے تحت آتا ہے اور اس کی سرکوبی بھی اسی قانونِ الٰہی کے تحت ہوئی۔ حضرت عمرؓ نے اپنے دورِ خلافت میں یہود کو عرب سے جو آخری بار نکالا وہ بھی اسی حکمِ خداوندی کی تعمیل تھی۔

جرم اور مجرمین کے جدید فلسفہ پر بحث

'ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا الاٰية' (یہ ان کے لیے اس دنیا میں رسوائی ہے) یہ اس شبہے کا ازالہ ہے جو مذکورہ بالا سزاؤں سے متعلق ان لوگوں کے ذہن میں پیدا ہوتا یا پیدا ہو سکتا ہے جو اللہ اور رسول کو چیلنج کرنے کے جرم کی سنگینی کا صحیح اندازہ نہیں کر پاتے۔ اس کائنات میں حقیقی عزت اللہ اور رسول کے لیے ہے۔ 'وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ' اس وجہ سے جو لوگ خدا اور رسول کے مقابل میں جرأت و جسارت کا اظہار اور بغاوت کا اعلان کریں وہ مستحق ہیں کہ اس دنیا میں بھی رسوا ہوں اور آخرت میں بھی وہ دردناک عذاب سے دوچار ہوں۔ دنیا میں ان کی یہ رسوائی دوسروں کے لیے ذریعۂ عبرت و بصیرت ہوگی اور اس کے اثر سے ان لوگوں کے اندر بھی قانون کا ڈر اور احترام پیدا ہوگا جو یہ صلاحیت نہیں رکھتے کہ مجرد قانون کی افادیت و عظمت کی بنا پر اس کا احترام کریں۔ موجودہ زمانے میں جرم اور مجرمین کے لیے فلسفہ کے نام سے جو ہمدردانہ اور رحم دلانہ نظریات پیدا ہو گئے ہیں یہ انہی کی برکت ہے کہ انسان بظاہر جتنا ہی ترقی کرتا جاتا ہے دنیا اتنی ہی جہنم بنتی جا رہی ہے۔ اسلام اس قسم کے مہمل نظریات کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا۔ اس کا قانون ہوائی نظریات پر نہیں

بلکہ انسان کی فطرت پر مبنی ہے۔

مغلوب ہونے سے پہلے اصلاح کر لینے والوں کا حکم

'اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَیْهِمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ' یعنی یہ خاص اختیارات صرف ان باغیوں کے خلاف استعمال کیے جائیں گے جو حکومت کے حالات پر قابو پانے سے پہلے تک اپنی بغاوت پر اڑے رہے ہوں، اور حکومت نے اپنی طاقت سے ان کو مغلوب و مقہور کیا ہو۔ جو لوگ حکومت کے ایکشن سے پہلے ہی توبہ کر کے اپنے رویہ کی اصلاح کر چکے ہوں ان کے خلاف ان کے سابق رویہ کی بنا پر اس قسم کا کوئی اقدام جائز نہیں ہوگا بلکہ اب ان کے ساتھ عام قانون کے تحت معاملہ ہوگا۔ اگر ان کے ہاتھوں عام شہریوں کے حقوق تلف ہوئے ہیں تو حتی الامکان ان کی تلافی کرا دی جائے گی۔

آیت میں 'فَاعْلَمُوْٓا' کے لفظ کے زور کو اگر ذہن میں رکھیے تو یہ بات صاف نکلتی ہے کہ قابو میں آنے سے پہلے ہی توبہ و اصلاح کر لینے والوں کے معاملے میں حکومت کے لیے کوئی انتقامی کارروائی جائز نہیں ہے۔ خدا غفور اور رحیم ہے۔ جب وہ پکڑ سے پہلے توبہ و اصلاح کر لینے والوں کو معاف کر دیتا ہے تو اس کے بندوں کا رویہ اس سے الگ کیوں ہو؟

۱۴۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۳۵-۴۰

آگے مسلمانوں کو پہلے اللہ کے حدود و قیود کی پابندی کرتے رہنے، اللہ ہی کا تقرب ڈھونڈنے اور اسی کی راہ میں برابر سرگرمِ کار رہنے کی تاکید فرمائی کہ دراصل یہی چیزیں ہیں جو خدا کے ہاں کام آنے والی اور آخرت کی پکڑ سے بچانے والی ہیں، جو لوگ ان چیزوں سے محروم ہوں گے ان کو دوسری کوئی چیز بھی دوزخ کے عذاب سے نہ بچا سکے گی۔

اس کے بعد چوری کی سزا کا قانون اور اس کی حکمت بیان فرمائی اور اس کے ساتھ یہ تنبیہ فرمائی کہ جو لوگ خدا کے قانون سے گریز اختیار کرنے یا اپنی دراندازیوں، سفارشوں، رشوتوں اور کوششوں سے اس کو بے اثر بنانے کی کوشش کریں گے وہ یاد رکھیں کہ اس قسم کی تدبیریں کچھ کارگر ہو سکیں گی تو بس اسی دنیا کی زندگی میں کارگر ہو سکیں گی۔ آخرت میں تمام جزا و سزا صرف خدا ہی کے اختیار میں ہوگی۔ وہاں کسی کا نہ زور و اثر کام کر سکے گا، نہ کسی کی سعی و سفارش کچھ کام آ سکے گی۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۳۵-۴۰

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ وَ جَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۳۵﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لِيَفْتَدُوْا بِهٖ

مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٣٦﴾ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنْهَا ۫ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿٣٧﴾ وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٣٨﴾ فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٣٩﴾ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿٤٠﴾

ترجمۂ آیات ۳۵-۴۰

اے ایمان والو، اللہ سے ڈرتے رہو اور اسی کے تقرب کے طالب بنو اور اس کی راہ میں برابر سرگرم کار رہو تاکہ فلاح پاؤ۔ بے شک جن لوگوں نے کفر کیا ہے اگر انھیں وہ سب کچھ حاصل ہو جائے جو زمین میں ہے اور اس کے ساتھ اس کے برابر اور بھی تاکہ وہ اس کو فدیہ میں دے کر روزِ قیامت کے عذاب سے چھوٹ سکیں تو بھی ان کا یہ فدیہ قبول نہ ہوگا، ان کے لیے بس ایک دردناک عذاب ہی ہے۔ وہ زور لگائیں گے کہ آگ سے نکل بھاگیں لیکن اس سے کبھی نکل نہ پائیں گے، ان کے لیے ایک دائمی عذاب ہوگا۔ ۳۵-۳۷۔

اور چور مرد اور چور عورت دونوں کے ہاتھ کاٹ دو، ان کے کیے کی پاداش اور اللہ کی طرف سے عبرت ناک سزا کے طور پر، اور اللہ غالب اور حکیم ہے۔ پس جس نے اپنے اس ظلم کے بعد توبہ اور اصلاح کر لی تو اللہ اس پر عنایت کی نظر فرمائے گا،

بے شک اللہ غفور رحیم ہے۔ کیا تمہیں علم نہیں ہے کہ اللہ ہی ہے جس کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے، وہی جس کو چاہے گا سزا دے گا اور جس کو چاہے گا بخشے گا اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۳۸-۴۰

۱۵- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْٓا اِلَیْهِ الْوَسِیْلَةَ وَجَاهِدُوْا فِیْ سَبِیْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (۳۵)

'تقویٰ' کا مفہوم ہم مختلف مقامات میں ظاہر کر چکے ہیں کہ خدا کے حدود و احکام کی پوری مستعدی کے ساتھ نگہداشت اور ان کی خلاف ورزی کے نتائج سے ڈرتے رہنا ہے۔

وسیلہ کا مفہوم

'وَابْتَغُوْٓا اِلَیْهِ الْوَسِیْلَةَ' وسیلہ کے معنی قربت کے ہیں اور 'اِلَیْهِ' کی تقدیم سے حصر کا مضمون پیدا ہو گیا ہے یعنی خدا ہی کا قرب اور اسی کا تقرب ڈھونڈو، جس کا طریقہ یہ ہے کہ خدا کے احکام و حدود کی پوری پوری پابندی کرو، اور ان کی خلاف ورزی کے نتائج سے ڈرتے رہو۔ خدا اور اس کے بندوں کے درمیان واسطہ اور وسیلہ، جیسا کہ آیت وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ الآیۃ کے تحت ہم واضح کر چکے ہیں، کتاب اللہ اور شریعت ہی ہے۔ اس وجہ سے کتاب اللہ اور شریعت کو مضبوطی سے تھامنا ہی خدا سے قربت کا واسطہ ہے۔ گویا آیت میں تنبیہ ہے کہ جن لوگوں نے خدا اور اس کی شریعت سے بے پروا ہو کر دوسروں کا تقرب ڈھونڈا اور ان کو اپنی نجات و فلاح کا ضامن سمجھے بیٹھے ہیں وہ بڑی غلط امیدوں اور جھوٹے ہی غلط سہاروں پر جی رہے ہیں۔ فوز و فلاح کی راہ یہ ہے کہ خدا ہی سے ڈرو اور اسی کا قرب ڈھونڈو۔ قرآن میں دوسری جگہ اس بات کی بھی تصریح ہے کہ فرشتے جن کو نادانوں نے خدا کی قربت کا ذریعہ سمجھ کر معبود بنایا وہ خود ہر لمحہ خدا کے قرب کے لیے ساعی و سرگرم اور اس کے عذاب سے ڈرتے رہتے ہیں اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ یَبْتَغُوْنَ اِلٰی رَبِّهِمُ الْوَسِیْلَةَ اَیُّهُمْ اَقْرَبُ وَیَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَیَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ ؕ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا ، (اور وہ لوگ جن کو یہ مشرکین پکارتے ہیں خود اپنے رب کے قرب کے حصول کے لیے ساعی رہتے ہیں کہ کون زیادہ سے زیادہ قرب حاصل کرتا ہے اور اس کی رحمت کی امید کرتے اور اس کے عذاب سے ڈرتے رہتے ہیں، بے شک تیرے رب کا عذاب ڈرنے ہی کی چیز ہے)

لفظ 'جہاد' اپنے وسیع مفہوم میں

'وَجَاهِدُوْا فِیْ سَبِیْلِهٖ' لفظ 'جہاد' یہاں وسیع معنوں میں ہے۔ اس سے مراد ہر وہ سعی و سرگرمی اور ہر وہ محنت و کوشش ہے جو خدا کے احکام کی پابندی، اس کے دین کے قیام اور اس کی رضا طلبی کی راہ میں کی جائے۔ عام اس سے کہ وہ تلوار کے ذریعے سے ہو یا اپنی دوسری قوتوں، صلاحیتوں اور دوسرے

اسباب و وسائل سے ۔ یہ گویا وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ کا عملی ثبوت ہے ۔ یعنی خدا سے قربت کا طالب اس کی راہ میں ہر لمحہ سرگرم کار رہتا ہے ۔

نظم کے پہلو سے یہ اوپر کے تعزیری احکام اور آگے چوری کی سزا کے حکم کے بیچ میں مسلمانوں کو تنبیہ و تذکیر ہے کہ خدا کے احکام و حدود کی پابندی کے معاملے میں دوسری امتوں کی طرح تم ڈھیلے نہ پڑنا ۔ خدا سے تعلق اس کی شریعت ہی کے واسطہ سے قائم ہوتا ہے ۔ اس کے سوا فلاح کی کوئی اور راہ نہیں ہے ۔ اگر خدا کی شریعت کو چھوڑ کر تم یہود و نصاریٰ کی طرح دوسرے سہاروں پر اعتماد کر بیٹھے تو یہ سہارے نافع ہونے کے بجائے صرف موجب وبال ہوں گے ۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لِيَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنْهَا ۡ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ (۳۶-۳۷)

خدا کے سوا دوسرے وسائل پر اعتماد کرنے والوں کا انجام

'اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا' سیاق و سباق دلیل ہے کہ یہاں اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے فلاح کی اس راہ سے الگ راہ اختیار کی جو اوپر والی آیت میں بیان ہوئی ہے ۔ یعنی انھوں نے خدا ہی سے ڈرنے ، خدا ہی کا قرب تلاش کرنے اور اسی کی راہ میں سرگرم رہنے کے بجائے بے بنیاد سہاروں اور خیالی سفارشوں کے اعتماد پر زندگی گزاری اور یہ توقع کیے بیٹھے رہے کہ آخرت کی تمام کامرانیاں انھی کا حصہ ہیں ۔ فرمایا کہ اگر یہ لوگ زمین کے تمام خزانے اور اس کے ساتھ انھی کے برابر مزید خزانوں کے مالک بن جائیں اور ان سب کو عذاب آخرت سے چھوٹنے کے لیے فدیہ میں دیں جب بھی ان کا فدیہ قبول نہیں ہوگا ۔ وہ دوزخ سے نکلنے کے لیے کتنا ہی ہاتھ پاؤں ماریں گے لیکن وہ اس سے نکل نہیں پائیں گے ، ان کے لیے ابدی اور دائمی عذاب ہوگا ۔

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۳۸-۳۹)

چوری کی سزا

'وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ' کا عطف محاربین پر ہے جن کا ذکر اوپر گزرا ۔ بیچ میں جو دو آیتیں آ گئی ہیں یہ جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ، تعزیرات و حدود کے بیان کے سلسلے میں بطور تنبیہ و تذکیر ہیں ۔

'سارق' اور 'سارقہ' چونکہ صفت کے صیغے ہیں اس وجہ سے ان سے اشارہ نکلتا ہے کہ ارتکاب فعل کی نوعیت ایسی ہو کہ اس کے ارتکاب پر چوری اور اس کے مرتکب پر چور کا اطلاق ہو سکے ۔ اگر کوئی ناتربیت یافتہ شخص راہ چلتے کسی کے درخت سے چند پھل توڑ لیتا ہے یا کسی کے کھیت سے کچھ سبزیاں لے لیتا ہے یا کسی کی ٹال سے چند لکڑیاں اٹھا لیتا ہے ، یا کسی کے باورچی خانے سے کوئی کھانے پینے کی چیز لے لیتا ہے تو گو یہ افعال ناشائستہ ہیں اور ان پر وہ تنبیہ و تادیب کا بھی سزاوار ہے

لیکن یہ وہ چوری نہیں ہے جس پر اس کو قطع ید کی سزا دی جائے۔ اس وجہ سے ہمارے فقہا نے اس جرم کے تعین اور اس کی سزا کے نفاذ پر چند شرطیں عائد کی ہیں جن کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں موجود ہے۔ ہمارے لیے یہاں ان تفصیلات میں جانے کی گنجائش نہیں ہے۔ تاہم چند باتوں کی طرف ہم اشارہ کریں گے تاکہ مسئلے کی نوعیت کا اندازہ ہو سکے۔

قطع ید کی سزا کے لیے شرطیں

فقہا نے چوری پر قطع ید کی سزا نافذ کرنے کے لیے مندرجہ ذیل قیدیں عائد کی ہیں۔

۱۔ چوری کسی قدر و قیمت رکھنے والی چیز کی کی گئی ہو، بے قیمت یا کسی چھوٹی موٹی چیز کی چوری پر ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں دی جائے گی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کسی کو معمولی چیزوں کی چوری پر یہ سزا نہیں دی گئی۔ قدر و قیمت کے اندازے کے باب میں فقہا کا اختلاف ہے اور یہ اختلاف اس بات کا ثبوت ہے کہ اس میں اختلاف کی گنجائش ہے۔ حنفیہ کے نزدیک ایک دینار سے کم قیمت کی چیز پر ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں دی جائے گی۔

۲۔ چوری محفوظ کیے ہوئے مال کی کی گئی ہو۔ اگر کسی نے اپنا مال یوں ہی کہیں ڈال دیا یا اپنے مویشی یوں ہی جنگل میں آوارہ چھوڑ دیے تو ان کی چوری اس قانون کے تحت نہیں آئے گی۔

۳۔ جس مال میں چوری کرنے والے کا اشتراک ہو یا وہ مال اس کی حفاظت یا امانت میں ہو اس کی چوری بھی اس قانون کے دائرہ سے باہر ہے۔

۴۔ مجنون اور نابالغ کی چوری پر بھی اس قانون کا اطلاق نہیں ہوگا۔

۵۔ کسی کے بیوی بچے اور اس کے گھریلو ملازم اگر اس کے مال میں سے کچھ چوری کرلیں تو یہ چیز بھی اس قانون کے دائرے سے الگ ہے۔

۶۔ اضطرار کا شائبہ ہو جب بھی یہ سزا نافذ نہیں کی جائے گی۔ مشہور ہے کہ حضرت عمرؓ نے عام الرمادہ کے قحط کے موقع پر قطع ید کی سزا روک دی تھی۔

۷۔ اس سزا کے نفاذ کے لیے دارالاسلام ہونا بھی شرط ہے۔ حدود و تعزیرات کا تعلق اول تو بااختیار حکومت سے ہے، ثانیاً ان کا تعلق دارالکفر یا دارالحرب سے نہیں بلکہ دارالاسلام سے ہے اس لیے کہ یہ احکام و حدود ایک مجموعی نظام کا جزو ہیں، اس نظام سے الگ کرکے ان کو نافذ کرنا ایسا ہی ہے جیسے گول خانے میں ایک چوکھٹی چیز۔ ان احکام کا زمانۂ نزول خود اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کے نفاذ کے لیے دارالاسلام شرط ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ احکام نازل ہی اس وقت فرمائے جب دارالاسلام عملاً قائم ہو چکا۔

قطع ید کی تعلیل

'فَاقْطَعُوٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ' میں قطع ید کے دو سبب بیان ہوئے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ مجرم کے جرم کی سزا ہے۔ دوسرا یہ کہ یہ 'نکال' ہے۔ 'نکال' کے معنی کسی کو ایسی سزا دینے کے ہیں

جس سے دوسرے عبرت پکڑیں۔ ان دونوں کے درمیان حرفِ عطف کا نہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ دونوں باتیں اس سزا میں بیک وقت مطلوب ہیں۔ یعنی یہ پاداشِ عمل بھی ہے اور دوسروں کے لیے سامانِ عبرت بھی۔ جو لوگ اس کے ان دونوں ہی پہلوؤں پر بیک وقت نظر نہیں ڈالتے وہ بسا اوقات اس خلجان میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ جرم کے اعتبار سے سزا زیادہ سخت ہے حالانکہ اس سزا میں متعین اس جرم ہی کی سزا نہیں ہے جو مجرم سے واقع ہوا بلکہ ان بہت سے جرائم کی روک تھام بھی اس میں شامل ہے جن کا وہ اپنے فعل سے محرک بن سکتا ہے اگر اس کو ایسی سزا نہ دی جائے جو دوسروں کے حوصلے پست کر دے۔ جنس کی طرح مال کی بھوک بھی انسان کے اندر بڑی ہی شدید ہے۔ اگر اس حرص کو ذرا ڈھیل مل جائے تو پھر اس کے نتائج کیا کچھ نکل سکتے ہیں، اس کا اندازہ کرنے کے لیے موجودہ زمانہ کے حالات میں کافی سامان بصیرت موجود ہے بشرطیکہ دیکھنے والی آنکھیں موجود ہوں۔ اس زمانے کے کسی متمدن سے متمدن ملک کے صرف ایک سال کے وہ ہولناک جرائم جمع کر لیے جائیں جو محض چوری کی وجہ سے پیش آئے تو وہ آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہیں لیکن تہذیب جدید کے مارے ہوئے انسان کی پیشانی یہ سن کر تو عرق آلود ہو جاتی ہے کہ چوری پر کسی کا ہاتھ کٹ جائے لیکن ان ہزاروں دل ہلا دینے والے واقعات سے اس کا دل نہیں پسیجتا جو بالواسطہ یا بلاواسطہ چوری کی راہ سے ظہور میں آتے ہیں۔ چوری کوئی مفرد جرم نہیں ہے بلکہ یہ مجموعۂ جرائم ہے جس سے طرح طرح کے ہولناک جرائم ظہور میں آتے ہیں۔ اگر چوری کی راہ مسدود ہو جائے تو یہ یا تو بالکل ہی ناپید ہو جائیں گے یا کم از کم یہ کہ انتہائی حد تک کم ہو جائیں گے۔ چنانچہ تجربہ گواہ ہے کہ چوری پر ہاتھ کاٹنے کی سزا سے نہ صرف چوری کے واقعات انتہائی حد تک کم ہو گئے بلکہ دوسرے جرائم میں بھی انتہائی کمی ہو گئی۔ پھر اگر چند ہاتھ کٹ جانے سے ہزاروں سر، ہزاروں گھر، ہزاروں آبروئیں محفوظ ہو جائیں، ظلم و شقاوت اور حرث و نسل کی بربادی کے بہت سے ابواب کا خاتمہ ہو جائے تو عقل سلیم تو یہی کہتی ہے کہ یہ مہنگا سودا نہیں ہے بلکہ نہایت بابرکت سودا ہے، لیکن موجودہ زمانے کے دانش فروشوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی۔

'وَاللّٰہُ عَزِیۡزٌ حَکِیۡمٌ' یہ اس قانونِ الٰہی کی قوت اور حکمت دونوں ہی پہلوؤں کی طرف اشارہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے تمام قوانین و احکام اس کی صفات کا عکس ہیں۔ وہ عزیز اور غالب ہے اس وجہ سے اس کو حق ہے کہ وہ جو چاہے حکم دے اور حکیم ہے اس وجہ سے اس کا ہر حکم حکمت و مصلحت پر مبنی ہے اس کے بندوں کے لیے نہ تو اس کے حکم سے سرتابی جائز ہے اور نہ ان کے لیے یہ زیبا ہے کہ وہ اس کے کسی حکم کو خلاف حکمت و مصلحت قرار دیں۔

'فَمَنۡ تَابَ مِنۡۢ بَعۡدِ ظُلۡمِہٖ وَاَصۡلَحَ الاٰیۃ'، 'مِنۡۢ بَعۡدِ ظُلۡمِہٖ'، میں لفظ 'ظلم'، اپنے فاعل کی طرف بھی مضاف ہو سکتا ہے اور اپنے مفعول کی طرف بھی۔ مفعول کی طرف مضاف ہونے کی صورت میں اس

کے معنی ہوں گے 'اپنے اس ظلم کے بعد جس کا اس نے ارتکاب کیا، اگرچہ قرآن میں لفظ یہ پہلے مفہوم کے لیے بھی موجود ہیں اور یہ ایک حقیقت بھی ہے کہ کسی انسان کا، جب کہ وہ مسلمان بھی ہو، چوری جیسے ذلیل جرم کا مرتکب ہونا خود اپنے نفس پر بہت بڑا ظلم ہے، اس فعل کے ارتکاب سے جتنی حق تلفی وہ دوسروں کی کرتا ہے اس سے کہیں زیادہ خود اپنے نفس کی کرتا ہے، لیکن میں دوسرے معنی کو ترجیح دیتا ہوں اس لیے کہ اس میں وہ ظلم بھی آجاتا ہے جو ایک چوری کرنے والا اپنے نفس پر کرتا ہے اور وہ ظلم بھی آجاتا ہے جو وہ اس پر کرتا ہے جس کا مال چراتا ہے۔

توبہ کے ساتھ اصلاح کی شرط

توبہ کے ساتھ اصلاح کا ذکر درحقیقت توبہ کی ایک لازمی شرط کی حیثیت سے ہے۔ بندہ جب کوئی اس طرح کا جرم کرتا ہے تو ایک تو وہ خدا کی نافرمانی کرتا ہے دوسرے وہ اپنے نفس کی یا دوسروں کی حق تلفی کرتا ہے۔ خدا سے معاملہ درست کرنے کے لیے تا حدِ امکان اپنے رویہ کی اصلاح اور اپنے ظلم کی تلافی ناگزیر ہے۔ بغیر اس دو طرفہ عمل کے توبہ بالکل بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔

یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ توبہ اور اصلاح سے بندے کا آخرت کا معاملہ صاف ہو جاتا ہے لیکن قانون کی گرفت میں آچکنے کے بعد توبہ کے سبب سے شریعت کی کوئی حد ساقط نہیں ہو سکتی۔ وہ بہر حال نافذ ہو گی۔

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ (۴۰)

ایک عظیم تنبیہ

'اَلَمْ تَعْلَمْ' کا خطاب عام ہے۔ یہ عام خطاب کے ساتھ تنبیہ ہے کہ آسمان و زمین میں سارا اختیار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے، وہی جس کو چاہے سزا دے گا جس کو چاہے بخشے گا، کسی دوسرے کے لیے اس میں کسی چون و چرا اور کسی مداخلت کی کوئی گنجائش نہیں ہو گی۔ اس وجہ سے ہر ایک کا فرض ہے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ کے قانون کے تابع اور اس کے حوالے کرے، نہ کوئی اس سے بھاگنے کی کوشش کرے، نہ کوئی اس سے دوسروں کو بچانے کی تدبیریں سوچے اور نہ کسی کے زور و اثر اور کسی کی سعی و سفارش پر بھروسہ کر کے خدا اور اس کی شریعت سے بے پروا ہو۔ یہ تنبیہ اس وجہ سے ضروری تھی کہ درحقیقت یہ سارے احکام جو قتل، قصاص، رہزنی اور چوری وغیرہ سے متعلق اس سورہ میں بیان ہو رہے ہیں، یہ سب دوسری امتوں کے لیے مزلۂ قدم ثابت ہوئے۔ انھوں نے ان سے بچنے کے لیے بہت سے چور دروازے نکال لیے، یہاں تک کہ یہ تمام قوانین بالکل بے اثر ہو کر رہ گئے۔ اگر اس کی علت کا سراغ لگایا جائے تو یہ بات صاف نظر آئے گی کہ ان قوموں نے توحید کی وہ حقیقت مستحضر نہیں رکھی جس کی اس آیت میں یاد دہانی کی گئی ہے۔

۱۶- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۴۱-۵۰

آگے چند آیات میں پہلے منافقین اور یہود کی اس ملی بھگت کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو انھوں نے شرعی احکام و قوانین، بالخصوص تعزیرات و حدود کی گرفت سے بچنے اور ایک دوسرے کو ان سے بچانے کے لیے باہم کر رکھی تھی۔ ان آیات کے زمانۂ نزول تک مدینہ اور اس کے اطراف میں اگرچہ اسلام کو سیاسی اقتدار حاصل ہو گیا تھا لیکن ابھی یہ اقتدار مکمل نہیں تھا، آس پاس یہود کی جو بستیاں تھیں وہ اپنے حدود میں قبائلی نوعیت کا اقتدار رکھتی تھیں اور ان کے حکام ان لوگوں کے معاملات و نزاعات کا فیصلہ کرتے تھے جو ان کے دائرۂ اثر میں تھے یا ان کی طرف رجوع کرتے۔ لیکن یہ عدالتیں قیام عدل و انصاف کے نقطۂ نظر سے بالکل بے جان اور بے مصرف ہو چکی تھیں۔ اول تو یہود نے خود قانون ہی کو اپنے اغراض کے تحت مسخ کر کے بالکل بے اثر کر دیا تھا، دوسرے جھوٹ اور رشوت کا ان کے ہاں اتنا زور تھا کہ کسی معاملے میں نہ گواہوں کی گواہی کا کوئی وزن باقی رہ گیا تھا نہ عدالتوں کے انصاف کا۔ بڑی آسانی سے گواہوں اور حکام دونوں کو رشوت کے ذریعے سے خریدا اور ان کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا جا سکتا تھا۔ اقتدار کی یہ دوعملی اور یہودی عدالتوں کی یہ انصاف فروشی ان لوگوں کے لیے ایک چور دروازہ فراہم کرتی تھی جو قانون کے تقاضوں سے فرار اختیار کرنا چاہتے۔ چنانچہ منافقین اور یہود اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھانے کے لیے یہ شرارت کرتے کہ جن معاملات میں ان کو توقع ہوتی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت سے فیصلہ ان کے حسبِ منشا ہو جائے گا ان کے لیے آنحضرت صلعم سے رجوع کرتے لیکن جن میں اپنے حسبِ منشا فیصلہ ہونے کی توقع نہ ہوتی ان کے لیے یہودی عدالتوں کی طرف رجوع کرتے تاکہ جھوٹے گواہوں اور رشوت کے ذریعے سے اپنے حسبِ منشا فیصلے حاصل کر سکیں۔ قرآن نے ان کی اس بدبختانہ روش پر افسوس کیا ہے اور آنحضرت صلعم کو یہ ہدایت فرمائی کہ اگر اس قسم کے اشرار اپنے معاملات آپ کی عدالت میں لائیں تو آپ کو اختیار ہے کہ آپ ان کے مقدمے لیں یا نہ لیں۔ البتہ اگر لیں تو فیصلہ اسی قانونِ عدل کے مطابق کریں جو اللہ نے اتارا ہے۔

اس کے بعد یہود کی حالت پر تعجب کا اظہار کیا ہے کہ وہ یہ جانتے ہوئے کہ فلاں معاملے میں تورات کا حکم کیا ہے تمھیں حکم بناتے ہیں پھر تم جو فیصلہ کرتے ہو اس سے مکر جاتے ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان کا ایمان کسی چیز پر بھی نہیں ہے۔ وہ صرف اپنی خواہشوں کی پیروی کرنا چاہتے ہیں۔

اس کے بعد پہلے تورات و انجیل کا حوالہ دیا ہے کہ اللہ نے یہ صحیفے ہدایت اور روشنی بنا کر اتارے، ان کے ذریعے سے لوگوں کو اپنے احکام و قوانین سے آگاہ کیا، ان کے حاملوں کو ان کا گواہ اور امین بنایا اور ساتھ ہی انھیں اس امر سے آگاہ فرمایا کہ جو لوگ معاملات کے فیصلے ان کتابوں کے احکام کے خلاف کریں گے

وہ کافر، ظالم اور فاسق ٹھہریں گے۔ لیکن یہود و نصاریٰ نے ان کتابوں کو بالائے طاق رکھ دیا اور اپنی خواہشات و بدعات کے پیرو بن گئے۔ پھر قرآن کا ذکر فرمایا کہ اب اللہ نے یہ کتاب اتاری ہے جو تمام اختلافات کے درمیان قولِ فیصل اور سابق صحیفوں کے لیے معیار اور کسوٹی کی حیثیت رکھتی ہے تو اب تم ہر معاملے کا فیصلہ اسی کی روشنی میں کرو، یہود و نصاریٰ کی بدعات کی پروا نہ کرو۔ یہ یہود و نصاریٰ حق کے طالب نہیں ہیں اس وجہ سے یہ وہی لکیر پیٹتے رہیں گے جس کو پیٹتے رہے ہیں۔ ان کو ان کے حال پر چھوڑو۔ حق کی راہ حق کے طالبوں کو ملتی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا سب کو ایک ہی راہ پر کر دیتا لیکن اس نے لوگوں کو اختیار کی نعمت بخشی کہ ان کا امتحان کرے کہ کون حق کی راہ اختیار کرتا ہے، کون باطل کی۔ تو ان کے پیچھے اپنی راہ کھوٹی کرنے کے بجائے تم فلاح و سعادت کی راہ میں سبقت کرو۔ کل سب کا معاملہ خدا کی عدالت میں پیش ہوگا۔ وہاں سارے اختلافات کا فیصلہ ہو جائے گا۔

آخر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مزید تاکید فرمائی کہ خواہ یہود و نصاریٰ کتنا ہی زور صرف کریں تم کسی حال میں بھی کتاب الٰہی کے بالمقابل ان کی بدعات و خواہشات کی پروا نہ کرنا۔ اگر وہ کتاب الٰہی سے انحراف کی اسی روش پر اڑے رہے تو سمجھ لو کہ وقت آچکا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی بعض شرارتوں کی سزا ان کو اسی دنیا میں دے ——— اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۴۱-۵۰

يَٰٓأَيُّهَا ٱلرَّسُولُ لَا يَحْزُنكَ ٱلَّذِينَ يُسَٰرِعُونَ فِى ٱلْكُفْرِ مِنَ ٱلَّذِينَ قَالُوٓا۟ ءَامَنَّا بِأَفْوَٰهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِن قُلُوبُهُمْ ۛ وَمِنَ ٱلَّذِينَ هَادُوا۟ ۛ سَمَّٰعُونَ لِلْكَذِبِ سَمَّٰعُونَ لِقَوْمٍ ءَاخَرِينَ لَمْ يَأْتُوكَ ۖ يُحَرِّفُونَ ٱلْكَلِمَ مِنۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهِۦ ۖ يَقُولُونَ إِنْ أُوتِيتُمْ هَٰذَا فَخُذُوهُ وَإِن لَّمْ تُؤْتَوْهُ فَٱحْذَرُوا۟ ۚ وَمَن يُرِدِ ٱللَّهُ فِتْنَتَهُۥ فَلَن تَمْلِكَ لَهُۥ مِنَ ٱللَّهِ شَيْـًٔا ۚ أُو۟لَٰٓئِكَ ٱلَّذِينَ لَمْ يُرِدِ ٱللَّهُ أَن يُطَهِّرَ قُلُوبَهُمْ ۚ لَهُمْ فِى ٱلدُّنْيَا خِزْىٌ ۖ وَلَهُمْ فِى ٱلْءَاخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿٤١﴾ سَمَّٰعُونَ لِلْكَذِبِ أَكَّٰلُونَ لِلسُّحْتِ ۚ فَإِن جَآءُوكَ فَٱحْكُم بَيْنَهُمْ أَوْ أَعْرِضْ

معتٰ الوقف علی الاولیٰ جوز

عَنْهُمْ ۚ وَإِن تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَن يَضُرُّوكَ شَيْئًا ۖ وَإِنْ حَكَمْتَ
فَاحْكُم بَيْنَهُم بِالْقِسْطِ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ﴿٤٢﴾ وَكَيْفَ
يُحَكِّمُونَكَ وَعِندَهُمُ التَّوْرَاةُ فِيهَا حُكْمُ اللَّهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ
مِن بَعْدِ ذَٰلِكَ ۚ وَمَا أُولَٰئِكَ بِالْمُؤْمِنِينَ ﴿٤٣﴾ إِنَّا أَنزَلْنَا التَّوْرَاةَ ع ۱۰
فِيهَا هُدًى وَنُورٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ الَّذِينَ أَسْلَمُوا لِلَّذِينَ
هَادُوا وَالرَّبَّانِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوا مِن كِتَابِ
اللَّهِ وَكَانُوا عَلَيْهِ شُهَدَاءَ ۚ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ
وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا ۚ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ
اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ ﴿٤٤﴾ وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا
أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنفَ بِالْأَنفِ وَ
الْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ ۚ فَمَن
تَصَدَّقَ بِهِ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهُ ۚ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ
اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿٤٥﴾ وَقَفَّيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِم بِعِيسَى
ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ ۖ وَآتَيْنَاهُ
الْإِنجِيلَ فِيهِ هُدًى وَنُورٌ وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ
مِنَ التَّوْرَاةِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ ﴿٤٦﴾ وَلْيَحْكُمْ أَهْلُ
الْإِنجِيلِ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فِيهِ ۚ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ
فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ﴿٤٧﴾ وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا

لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ ؕ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ اَنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّصِيْبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوْبِهِمْ ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ ﴿۴۹﴾ اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ؕ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۵۰﴾ ع ۱۱

ترجمۂ آیات ۴۱-۵۰

اے پیغمبر، ان لوگوں کی روش تمھیں غم میں نہ ڈالے جو کفر کی راہ میں سبقت کر رہے ہیں، ان لوگوں میں سے جو زبان سے تو دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں حالانکہ ان کے دلوں نے ایمان قبول نہیں کیا ہے اور ان لوگوں میں سے جنھوں نے یہودیت اختیار کی ہے۔ یہ جھوٹ کے رسیا اور دوسروں کی باتیں ماننے والے ہیں، جو خود تمھارے پاس نہیں آتے۔ وہ کلام کو اس کا موقع و محل معین ہونے کے باوجود اس کے محل سے ہٹا دیتے ہیں، کہتے ہیں اگر تمھارے معاملے کا فیصلہ یہ ہو تب تو قبول کر لینا اور اگر یہ نہ ہو تو اس سے بچ کے رہنا۔ اور جس کو اللہ فتنہ میں ڈالنا چاہے تو تم اللہ کے مقابل اس کے معاملے میں کچھ نہیں کر سکتے۔ یہی لوگ ہیں جن کے

دلوں کو اللہ نے پاک کرنا نہیں چاہا، ان کے لیے دنیا میں بھی رسوائی ہے اور آخرت میں بھی ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔ یہ جھوٹ کے رسیا اور پکے حرام خور ہیں۔ اگر یہ تمہارے پاس آئیں تو تمہیں اختیار ہے، خواہ ان کے معاملے کا فیصلہ کرو یا ان کو ٹال دو۔ اگر تم ان کو ٹال دو گے تو یہ تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں گے اور اگر تم فیصلہ کرو تو ان کے درمیان قانون عدل کے مطابق فیصلہ کرو، اللہ قانونِ عدل پر عمل کرنے والوں ہی کو دوست رکھتا ہے اور یہ تمہیں حکم کس طرح بناتے ہیں جب کہ تورات ان کے پاس موجود ہے جس میں اللہ کا حکم موجود ہے، پھر حکم بنانے کے بعد برگشتہ ہو جاتے ہیں! یہ ہرگز باایمان لوگ نہیں ہیں۔ ۴۱-۴۳

بے شک ہم ہی نے تورات اتاری جس میں ہدایت اور روشنی ہے، اسی کے مطابق خدا کے فرمانبردار انبیاء، ربانی علما اور فقہا یہود کے معاملات کے فیصلے کرتے تھے، بوجہ اس کے کہ وہ کتاب الٰہی کے امین اور اس کے گواہ ٹھہرائے گئے تھے کہ لوگوں سے نہ ڈریو، مجھی سے ڈریو اور میرے احکام کو دنیا کی متاع حقیر کے عوض نہ فروخت کیجیو اور جو لوگ اللہ کی اتاری ہوئی شریعت کے مطابق فیصلے نہ کریں تو یہی لوگ کافر ہیں اور ہم نے اس میں ان پر فرض کیا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت اور اسی طرح دوسرے زخموں کا بھی قصاص ہے۔ سو جس نے اس کو معاف کر دیا تو وہ اس کے لیے کفارہ ہے اور جو اللہ کی اتاری ہوئی شریعت کے مطابق فیصلے نہ کریں گے تو وہی لوگ ہیں جو ظالم ٹھہریں گے۔ ۴۴-۴۵

اور ہم نے ان کے پیچھے، انہی کے نقش قدم پر عیسیٰ ابن مریم کو بھیجا مصداق پیشتر سے موجود تورات کے اور ہم نے اس کو عطا کی انجیل، ہدایت اور روشنی پر مشتمل۔ مصداق اپنے سے پیشتر موجود تورات کی اور ہدایت و نصیحت خدا ترسوں کے لیے اور واجب ہے کہ اہل انجیل بھی فیصلہ کریں اس کے مطابق جو اللہ نے اس میں اتارا اور جو اللہ کے اتارے ہوئے قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں تو وہی لوگ نافرمان ہیں۔ ۴۶-۴۷

اور ہم نے تمہاری طرف کتاب اتاری حق کے ساتھ، مصداق اس سے پیشتر سے موجود کتاب کی اور اس کے لیے کسوٹی بنا کر، تو ان کے درمیان فیصلہ کرو اس کے مطابق جو اللہ نے اتارا اور اس حق سے ہٹ کر، جو تمہارے پاس آچکا ہے، ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو۔ ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک ضابطہ اور ایک طریقہ ٹھہرایا۔ اور اگر اللہ چاہتا تو تم کو ایک ہی امت بنا دیتا لیکن اس نے چاہا کہ اس چیز میں تمہاری آزمائش کرے جو اس نے تم کو بخشی، تو بھلائیوں کے لیے ایک دوسرے پر سبقت کرنے کی کوشش کرو۔ اللہ ہی کی طرف تم سب کا پلٹنا ہے تو وہ تمہیں آگاہ کرے گا اس چیز سے جس میں تم اختلاف کرتے رہے ہو۔ ۴۸

اور یہ کہ ان کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کرو جو اللہ نے اتارا ہے اور ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو اور ان سے ہوشیار رہو کہ مبادا وہ تمہیں اس چیز کی کسی بات سے پھسلا دیں جو اللہ نے تمہاری طرف اتاری ہے پس اگر وہ اعراض کریں تو سمجھ لو کہ اللہ ان کو ان کے بعض گناہوں کی سزا دینا چاہتا ہے اور بے شک ان لوگوں میں سے

بیشتر نافرمان ہی ہیں۔ کیا یہ جاہلیت کے فیصلہ کے طالب ہیں اور اللہ سے بڑھ کر کس کا فیصلہ ہو سکتا ہے ان لوگوں کے لیے جو یقین کرنا چاہیں۔ ۴۹ - ۵۰

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

یٰٓاَیُّہَا الرَّسُوْلُ لَا یَحْزُنْکَ الَّذِیْنَ یُسَارِعُوْنَ فِی الْکُفْرِ مِنَ الَّذِیْنَ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاَفْوَاہِہِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُہُمْ ۛ وَمِنَ الَّذِیْنَ ہَادُوْا ۛ سَمّٰعُوْنَ لِلْکَذِبِ سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِیْنَ لَمْ یَاْتُوْکَ ۭ یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِہٖ ۚ یَقُوْلُوْنَ اِنْ اُوْتِیْتُمْ ہٰذَا فَخُذُوْہُ وَاِنْ لَّمْ تُؤْتَوْہُ فَاحْذَرُوْا ۭ وَمَنْ یُّرِدِ اللّٰہُ فِتْنَتَہٗ فَلَنْ تَمْلِکَ لَہٗ مِنَ اللّٰہِ شَیْئًا ۭ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ لَمْ یُرِدِ اللّٰہُ اَنْ یُّطَہِّرَ قُلُوْبَہُمْ ۭ لَہُمْ فِی الدُّنْیَا خِزْیٌ ۚۖ وَّلَہُمْ فِی الْاٰخِرَۃِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ (۴۱)

رسول کی ذمہ داری

'یٰٓاَیُّہَا الرَّسُوْلُ' لفظ 'رسول' سے خطاب یہاں اس حقیقت کو ظاہر کر رہا ہے کہ رسول کی اصل ذمہ داری صرف اللہ کے دین کی تبلیغ اور انذار و تبشیر کے فریضہ کی ادائیگی ہے۔ اس امر کی کوئی ذمہ داری اس پر نہیں ہے کہ لوگ اس کی دعوت کے معاملے میں رویہ کیا اختیار کرتے ہیں۔ اگر رسول نے اپنا فرض رسالت ادا کر دیا ہے تو وہ عنداللہ اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو گیا، لوگ اگر کفر کی راہ میں سبقت کرتے ہیں تو اس کی پرسش رسول سے نہیں ہونی ہے بلکہ خود لوگوں سے ہونی ہے، پھر جو بات دوسروں سے متعلق ہے اس کا غم رسول کیوں کرے؟ یہاں چونکہ مقصود آنحضرت صلعم کو منافقین اور یہود کی مخالفانہ اور سازشانہ روش پر تسلی دینا اور اس حقیقت کو واضح کرنا ہے کہ جن کا فتنہ میں پڑنا سنتِ الٰہی کے بموجب مقدر ہو چکا ہے وہ فتنہ میں پڑ کے رہیں گے اس وجہ سے یٰٓاَیُّہَا الرَّسُوْلُ کے خطاب سے آپ کو مخاطب کرنا موزوں ہوا تاکہ خطاب ہی سے آپ کی ذمہ داری کی حد آپ پر واضح ہو جائے۔ آگے خطاب کی یہی مضمر حقیقت الفاظ میں یوں واضح فرما دی گئی ہے مَنْ یُّرِدِ اللّٰہُ فِتْنَتَہٗ فَلَنْ تَمْلِکَ لَہٗ مِنَ اللّٰہِ شَیْئًا اس پر مزید بحث آیت ۷۰ کے تحت بھی آئے گی۔

منافقین کی یہود دوستی

'یُسَارِعُوْنَ فِی الْکُفْرِ' کفر میں سبقت سے اشارہ یہاں منافقین کی یہود دوستی کی طرف ہے کہ یہ لوگ خدا او‍ر اس کی شریعت سے فرار کے لیے یہود کو ملجا و ماویٰ سمجھتے ہیں۔ اگرچہ زبان سے دعویٰ ایمان کا کرتے ہیں لیکن جب کوئی معاملہ اور قضیہ پیش آتا ہے تو ان کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس کو آنحضرت صلعم کی عدالت میں پیش کرنے کے بجائے یہود کی عدالت میں لے جائیں تاکہ وہاں سے حسب منشا فیصلہ حاصل کر سکیں۔ حالانکہ اللہ و رسول کی عدالت کے ہوتے ہوئے کسی اور کی عدالت کی طرف رجوع کرنا ایمان و اسلام کو چھوڑ کر کفر کی طرف رجوع کرنا ہے۔

منافقین کا من بھاتا کھاجا

'سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ' 'سمع' کے معنی جس طرح سننے کے آتے ہیں اسی طرح قبول کرنے کے بھی آتے ہیں اور 'ل' یہاں اضافت کے مفہوم کو ظاہر کر رہا ہے۔ یہ منافقین کی وہ صفت بیان ہوئی جس سے ان کی مسارعت الی الکفر کی توجیہہ ہو رہی ہے کہ ان کا من بھاتا کھاجا جھوٹ ہے، یہ جھوٹ کے رسیا اور جھوٹ کے گاہک ہیں، انھیں جھوٹی گواہی، جھوٹی عدالت اور جھوٹا فیصلہ چاہیے۔ اس وجہ سے یہ پیغمبر کی عدالت سے گھبراتے ہیں اور یہود کی طرف بھاگتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ جس جنس کے خریدار ہیں اس کی فراوانی اسی بازار میں ہے۔

منافقین یہود کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی

'سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِيْنَ لَمْ يَاْتُوْكَ' یہ ان منافقین کی دوسری صفت ہے اور چونکہ بعینہٖ پہلی صفت ہی کا پرتو ہے اس وجہ سے حرف عطف کے بغیر مذکور ہوئی۔ یعنی یہ منافقین اگر آپ کے پاس آتے ہیں تو اپنے ذوق و شوق سے اور حق و انصاف کے لیے نہیں آتے بلکہ دوسروں کے بھیجے ہوئے اور ان کے سکھائے پڑھائے ہوئے آتے ہیں۔ اشارہ یہود کے علما اور لیڈروں کی طرف ہے جن کا حال یہ بیان ہوا ہے کہ وہ خود سامنے نہیں آتے بلکہ پردے کے پیچھے بیٹھے بیٹھے ان کٹھ پتلیوں کو نچاتے ہیں اور یہ ان کے اشاروں پر ناچتے ہیں، جو کچھ وہ کہتے ہیں یہ اسی کو مانتے ہیں اور جو کچھ ان کا ایما ہوتا ہے یہ اسی کی تعمیل کرتے ہیں۔

کلام کو اس کے واضح محل سے ہٹانا تحریف دین ہے

'يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ ۚ يَقُوْلُوْنَ اِنْ اُوْتِيْتُمْ هٰذَا فَخُذُوْهُ وَاِنْ لَّمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوْا' یہ ان یہود کی پس پردہ سازشوں سے پردہ اٹھایا اور بتایا جا رہا ہے کہ یہ منافقین جن کے مرید ہیں اور جن سے یہ الہام حاصل کرتے ہیں ان کی کارستانیاں کیا ہیں اور وہ ان کو کیا سبق پڑھا کر آپ کے پاس بھیجتے ہیں۔ ان کی ایک کارستانی تو یہ بتائی کہ 'يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ' اس کا ذکر آیت ۱۳ کے تحت بھی گزر چکا ہے۔ بس یہ فرق ہے کہ وہاں 'يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ' ہے اور یہاں 'مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ' ہے۔ بات اگرچہ اصل حقیقت کے لحاظ سے دونوں جگہ ایک ہی ہے لیکن اس دوسرے اسلوب نے آیت کے مفہوم کو نسبتاً زیادہ واضح کر دیا ہے۔ جملہ میں ایک مضاف عربیت کے عام قاعدے کے مطابق محذوف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کے کلام اور اس کے احکام کا موقع و محل اور اس کا محل و مصداق متعین ہو جانے کے باوجود اس کو اس کے موقع و محل سے ہٹا دیتے ہیں جس سے حکم کا مقصد بالکل فوت ہو کر رہ جاتا ہے۔ اگر کسی حکم کا موقع و محل اور محل و مصداق واضح نہ ہو جس کے سبب سے قاضی و مفتی تطبیق میں غلطی کر جائیں تو ان کو معذور ٹھہرایا جا سکتا ہے، لیکن محل و مصداق کے تعین کے باوجود اس حکم کو اس کے موقع و محل سے ہٹانا صریح تحریف دین ہے اور ہم تفسیر سورۂ بقرہ میں واضح کر چکے ہیں کہ یہود اپنے صحیفوں میں جس طرح تحریف لفظی کے مرتکب ہوئے ہیں اسی طرح اس انطباقی تحریف کے بھی مرتکب ہوئے خاص طور پر تعزیرات و حدود کے باب میں تو انھوں نے اس قسم تحریف کو اس

بے دردی کے ساتھ استعمال کیا کہ شریعت کی کوئی حد و تعزیر بھی اس سے سلامت نہ رہ سکی۔ اور افسوس ہے کہ تحریف کی اس قسم کے ارتکاب میں یہ امت بھی یہود سے کچھ پیچھے نہیں رہی۔

ان کی دوسری کارستانی یہ بتائی کہ یہ ان منافقین کو یہ سکھا کر آپ کے پاس بھیجتے ہیں کہ اگر تمہارے قضیے کا فیصلہ یہ ہو تب تو قبول کر لینا اور اگر یہ فیصلہ نہ ہو تو اس کو قبول نہ کرنا۔ گویا اول تو وہ خود ہی تحریف کے چور دروازے سے مجرم کے لیے فرار کی راہ نکال دیتے ہیں اور اگر اس میں کچھ زحمت محسوس ہوتی ہے تو آنحضرت صلعم کی عدالت میں معاملہ کو بھیج دیتے ہیں لیکن اس ہدایت کے ساتھ کہ فیصلہ حسب منشا ہو تب تو قبول کر لینا ورنہ اس سے کترا جانا۔ مطلب قرآن کا اس ساری پردہ دری سے یہ ہے کہ جو لوگ اس طرح کے فتنہ کاروں کے ہتھے چڑھے ہوئے ہیں اور خود بھی فتنہ پسند ہیں ان کو ان کی قسمت پر چھوڑ دو، ان کی اس حالت پر غم نہ کرو۔

ہدایت و ضلالت کے باب میں سنتِ الٰہی

'وَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا' یہ ہدایت و ضلالت کے باب میں اس سنت الٰہی کا بیان ہے جس کی تفصیل سورۂ بقرہ کے شروع اور دوسرے متعدد مقامات میں بیان ہو چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حق و باطل اور خیر و شر میں امتیاز کی صلاحیت اور انسان کو اختیار کی نعمت دے کر اس کو دونوں طرح کے حالات سے آزمایا، اس کے سامنے نفس اور شیطان کی طرف سے شر و باطل بھی آتا ہے اور فطرت اور خدا ئے رحمان کی طرف سے خیر اور حق بھی۔ اس طرح اس کے عقل و ارادے کا امتحان ہوتا ہے کہ وہ خیر اور حق کو اختیار کرتا ہے یا شر و باطل کو۔ سنتِ الٰہی یہ ہے کہ جو لوگ جانتے بوجھتے اور دیکھتے سنتے شر کو خیر پر اور باطل کو حق پر ترجیح دیتے ہیں، نہ خدا کی تنبیہات سے سبق حاصل کرتے نہ اہلِ حق کی نصیحتوں سے، وہ آہستہ آہستہ اپنے ضمیر اور اپنے عقل و ارادے کو اس درجہ کند اور بے حس بنا لیتے ہیں کہ ان کے اندر حق کی طرف بڑھنے کا کوئی عزم و حوصلہ سرے سے باقی رہ ہی نہیں جاتا، باطل ہی ان کا اوڑھنا بچھونا بن جاتا ہے۔ ان کو کتنا ہی جھنجھوڑیے اور جگائیے لیکن وہ یہ بستر چھوڑنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ یہ لوگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو اس فتنہ ہی میں اور ندھے منہ پڑے چھوڑ دیتا ہے جس میں وہ پڑ چکے ہوتے ہیں۔ پیغمبر اپنی دل سوزی اور محبتِ حق کی وجہ سے اپنا پورا زور لگاتا ہے کہ ان کو جگائے اور جب یہ نہیں جاگتے تو بعض اوقات اس کو یہ غم ہوتا ہے کہ مبادا ان کا یہ نہ جاگنا خود اس کی کسی کوتاہی کا نتیجہ ہو۔ اسی طرح کا احساس رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ہوتا تھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو تسلی دی کہ کفر کی راہ میں ان لوگوں کی بھاگ دوڑ اس بات کا نتیجہ ہے کہ یہ سنتِ الٰہی کی زد میں آئے ہوئے ہیں اور جب یہ سنت الٰہی کی زد میں آئے ہوئے ہیں تو بھلا کس کے امکان میں ہے کہ ان کو باطل سے موڑ کر حق کی راہ پر لا سکے۔

ختمِ قلوب کا مرحلہ

'اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَمْ يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ يُّطَهِّرَ قُلُوْبَهُمْ' یہ اشارہ ہے اس سنت الٰہی کی طرف

جو قرآن میں 'ختمِ قلوب' یا 'رین' کے الفاظ سے تعبیر ہوئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دلوں کی تطہیر اور ان کے تزکیہ کے لیے اللہ کے ہاں ایک خاص ضابطہ ہے۔ جو لوگ نیکی اور تقویٰ کی راہ پر چلتے ہیں اگر اثنائے راہ میں ان کو کوئی ٹھوکر لگ جاتی ہے، وہ گر پڑتے ہیں، لیکن گرنے کے بعد پھر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور توبہ و اصلاح کے ذریعے سے دامن جھاڑ کے پھر چل کھڑے ہوتے ہیں تو خواہ ہزار بار گریں اور اٹھیں لیکن ان کے دامنِ دل پر میل جمنے نہیں پاتا، اللہ ان کی توبہ و اصلاح کو ان کے لیے کفارۂ سیئات بناتا رہتا ہے۔ لیکن جو لوگ برائی اور نافرمانی ہی کو اپنا پیشہ بنا لیتے ہیں اور گناہوں کی کیچڑ ہی میں لت پت رہتے ہیں ان سے وہ راحت محسوس کرتے ہیں، آہستہ آہستہ ان کے دلوں پر اتنی سیاہی جم جاتی ہے کہ ان پر کوئی صیقل بھی کارگر نہیں ہوتا، پھر خدا انھیں جہنم کی بھٹی ہی کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔

اجزائے کلام کو سمجھ لینے کے بعد نظم کے پہلو سے پھر ایک بار یہ بات ذہن میں تازہ کر لیجیے کہ میثاقِ الٰہی کی ان دفعات کو بیان کرنے کے بعد جو دوسری ملتوں کے لیے مزلّہِ قدم ہوئیں، اب یہ ان چور دروازوں کی نشان دہی کی جا رہی ہے جن سے انھوں نے پہلے بھی فرار کی راہیں اختیار کیں اور اب بھی ان کو استعمال کرنا چاہتی ہیں۔ ان چور دروازوں کی نشان دہی سے مقصود، جیسا کہ فحوائے کلام سے واضح ہے، اس امت کو یہ آگاہی دینا ہے کہ تم بھی پچھلی امتوں کی طرح خدا کے میثاق سے فرار اختیار کرنے والے نہ بن جانا بلکہ ہر حالت میں اس پر قائم و استوار رہنا۔ ورنہ جس طرح ان کے لیے دنیا کی رسوائی اور آخرت کا عذاب عظیم ہے اسی طرح تم بھی اس کے مستحق ٹھہرو گے۔ خدا کا قانون سب کے لیے یکساں اور بے لاگ ہے۔

سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ۭ فَاِنْ جَاۗءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ ۚ وَاِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ يَّضُرُّوْكَ شَـيْـــًٔـا ۭ وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ (۴۲)

سحت کا مفہوم

'اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ'، 'سُحْت' کے معنی کسبِ حرام کے ہیں۔ کسبِ حرام کی یوں تو مختلف شکلیں ہو سکتی ہیں لیکن اس لفظ کا غالب استعمال رشوت کے لیے ہے۔ اسی معنی میں یہ یہاں بھی استعمال ہوا ہے اور قرآن میں جہاں کہیں بھی استعمال ہوا ہے اسی معنی میں ہوا ہے۔

جھوٹ اور رشوت نظامِ عدل کو ختم کر دیتے ہیں

یہ اس گروہ منافقین و یہود کی، جن کا ذکر اوپر ہوا، مزید صفت بیان ہوئی کہ یہ جھوٹ کے رسیا اور پکے رشوت خور ہیں۔ یہ ملحوظ رہے کہ 'سمّاع' اور 'اکّال' اوّل تو مبالغہ کے صیغے ہیں پھر یہ پورے گروہ کی صفت کے طور پر وارد ہوئے ہیں، اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ دونوں بیماریاں یہود اور ان کے ہم مشربوں پر وبا کی طرح مسلط ہو گئی تھیں اور ان کی پوری قوم ان میں مبتلا تھی۔ جھوٹ اور رشوت یہ دونوں چیزیں ایسی ہیں جو کسی قوم میں پھیل جائیں تو اس کے اندر سے حق و عدل کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ حق و عدل کا قیام، جیسا کہ 'كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَاۗءَ بِالْقِسْطِ' والی آیت میں بیان ہوا ہے دو چیزوں پر مبنی

ہے۔ ایک اس چیز پر کہ حق کی بے لاگ شہادت دینے والے موجود ہوں، دوسری یہ کہ قانون عدل وقسط کے مطابق بے لاگ فیصلہ کرنے والے موجود ہوں۔ یہ دونوں چیزیں نظام حق وانصاف اور قیام عدل وقسط کی ریڑھ کی ہڈی ہیں اور جھوٹ اور رشوت ان دونوں کا استیصال کر دیتی ہیں۔ لفظ 'سحت' جو یہاں رشوت کے لیے استعمال ہوا ہے عربی لغت میں اصلاً استیصال کے مفہوم کے لیے استعمال ہوتا ہے مجھے خیال ہوتا ہے کہ ممکن ہے یہ رشوت کے مفہوم کے لیے اسی لیے استعمال ہوا ہو کہ یہ چیز تمام حق و عدل کی بنیاد ہی ڈھا دیتی ہے۔

حامل شریعت امت کا اصلی فریضہ

شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ اور قَوَّامِيْنَ بِالْقِسْطِ، پر سب سے بڑا خدائی فرض یہی عائد ہوتا ہے کہ وہ حق کی گواہی دینے والے، حق پر قائم رہنے والے اور حق کے مطابق بے لاگ فیصلہ کرنے والے بنیں۔ یہی اس عہد و میثاق کے قیام و استحکام کی بنیاد ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہر اس امت سے لیا ہے جس کو اپنی کتاب و شریعت سے نوازا ہے لیکن اس فرض کی ادائیگی اسی وقت تک ممکن ہے جب تک جھوٹ اور رشوت کی چاٹ لوگوں کو نہ لگے۔ جب جھوٹ کی چاٹ لگ جائے، جب جھوٹی گواہی دینا بہتوں کا پیشہ بن جائے، جب گواہی کو بیچنے والے، جھوٹی گواہی کی تعلیم دینے والے، جھوٹ کو فن بنا دینے والے اور جھوٹ کی وکالت کرنے والے سوسائٹی کے ہر طبقہ میں نہ صرف یہ کہ پیدا ہو جائیں بلکہ ان کو عزت کی نگاہوں سے دیکھا اور نہایت معزز القاب سے خطاب کیا جانے لگے، نیز رشوت خوری عام ہو جائے، اختیار رکھنے والے اور معاملات کا فیصلہ کرنے والے، اپنے اختیار و انصاف کو خریدنی و فروختنی شے بنا دیں، جو شخص ان کو خرید سکے، خواہ ظالم ہو یا مظلوم، ان کے اختیار و اقتدار اور ان کے زبان و قلم کو اپنے حق میں استعمال کر سکے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس قوم کے اندر سے حق و انصاف کا جنازہ نکل گیا اور عہد الٰہی کی اس نے دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں۔

یہود کی ایک چال اور اس کا توڑ

فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ وَاِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ يَّضُرُّوْكَ شَيْـًٔا۔ فرمایا کہ یہ لوگ جو دوسروں کے بھیجے ہوئے تمھارے پاس آتے ہیں اور دل میں یہ ارادہ لے کر آتے ہیں کہ فیصلہ ان کے حسب منشا ہوگا تب تو قبول کریں گے ورنہ رد کر دیں گے تو ایسے لوگوں کے بارے میں تمھیں اختیار ہے کہ تم ان کے مقدمے کے فیصلے کی ذمہ داری لو یا نہ لو۔ مطلب یہ ہے کہ تمھارے اوپر قیام عدل وقسط کی ذمہ داری اصلاً صرف انہی لوگوں سے متعلق ہے جو تمھارے دائرۂ اقتدار و اطاعت کے اندر ہیں۔ جو اس سے باہر ہیں، جن کی وفاداری ابھی تقسیم ہے، جو تمھارے پاس بھی آتے ہیں اور دوسروں سے بھی ساز باز رکھتے ہیں، ان کی ذمہ داری شرعاً تم پر نہیں ہے، مصلحت دیکھو تو ان کے مقدمے لو، مصلحت نہ دیکھو تو رد کر دو۔ فرمایا کہ تم ان کو رد کر دو گے تو یہ تمھیں کچھ نقصان نہ پہنچا سکیں گے۔ یہ اطمینان اس لیے دلایا گیا کہ یہود اس طرح کے معاملات و مقدمات آنحضرت صلعم کے پاس بھیجتے یا لاتے تو اس میں ان کی کوئی نہ کوئی مفسدانہ غرض

ضرور پوشیدہ ہوتی، وہ اس سے آپ کے خلاف سیاسی خانڈے اٹھانے کی کوشش کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اطمینان دلا دیا کہ تم ان کا معاملہ لو تو بہر حال اس کا فیصلہ اسی قانون عدل و قسط کے مطابق کرو جو اللہ نے تم پر نازل فرمایا ہے اور اگر ان کو رد کر دو تو اس کا بھی تمھیں اختیار ہے، یہ تم کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں گے، حق پر قائم رہنے والے کی اللہ حفاظت کرتا ہے۔

امت کو ہر حال میں حق پر قائم رہنے کی ہدایت

'وَإِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُم بَيْنَهُم بِالْقِسْطِ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ' یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے واسطے سے پوری امت سے گویا عہد لیا گیا ہے کہ فیصلہ اپنوں کے کسی معاملے کا ہو یا غیروں کے، بہر حال بے لاگ لپیٹ، قانون عدل و قسط کے مطابق ہو۔ 'قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ' کا فریضہ منصبی یہی ہے اور اسی کی خاطر اللہ نے پچھلی امتوں کو معزول کر کے اس امت کو برپا کیا ہے۔ 'إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ' میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خدا کی محبت کسی نسل و خاندان کے ساتھ نہیں بلکہ عدل و قسط قائم کرنے والوں کے ساتھ ہے، جو گروہ جب تک اس پر قائم رہے گا اور اس کو قائم کرے گا اللہ اس کو دوست رکھے گا اور جس کو اللہ دوست رکھے وہی دنیا اور آخرت دونوں میں بہرہ مند اور فلاح یاب ہوگا۔

شریعت سے فرار کے لیے یہود کی دہری شرارت

'وَكَيْفَ يُحَكِّمُونَكَ وَعِندَهُمُ التَّوْرَاةُ فِيهَا حُكْمُ اللَّهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِن بَعْدِ ذَٰلِكَ ۚ وَمَا أُولَٰئِكَ بِالْمُؤْمِنِينَ' (۴۳)

یہ تعجب کا اظہار اس بات پر نہیں ہے کہ وہ تورات رکھتے ہوئے اپنے معاملات کے فیصلے کے لیے آپ کو حکم کس طرح بناتے ہیں بلکہ اس بات پر ہے کہ وہ آپ کو حکم بنا کر آپ کے فیصلے سے مکرتے کس طرح ہیں جب کہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ آپ کے فیصلے شریعت الٰہی کے مطابق ہوتے ہیں۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اول تو احکام، بالخصوص تعزیرات و حدود، بنیادی طور پر تورات و قرآن دونوں میں یکساں ہیں۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ جن امور میں قرآن کی کوئی واضح ہدایت موجود نہ ہوتی ان میں آپ فیصلہ احکام تورات کے مطابق فرماتے اور ان یہود کو اچھی طرح علم ہوتا کہ آپ کا فیصلہ تورات کے قانون کے مطابق ہے۔ ایسی حالت میں یہ کیسی بے حیائی اور ڈھٹائی کی بات تھی کہ آپ کو حکم بھی بنایا جائے اور آپ کا فیصلہ اس قانون الٰہی کے مطابق بھی ہو جس پر ایمان کا دعویٰ ہے لیکن پھر اس فیصلہ سے فرار اختیار کرنے کی کوشش کی جائے۔ تفسیر کی کتابوں میں زنا کے ایک مقدمے کا ذکر ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ بالکل تورات کے قانون کے مطابق تھا لیکن علمائے یہود نے اس طرح کے معاملات میں امیر اور غریب کے لیے چونکہ الگ الگ ضابطے بنا رکھے تھے اس وجہ سے وہ تورات کے اصل قوانین کو چھپاتے تھے۔ چنانچہ اس معاملے میں بھی انھوں نے یہی کوشش کی لیکن بالآخر ان کو اصل حقیقت کا اعتراف کرنا پڑا۔ ظاہر ہے کہ یہ روش ہر پہلو سے دعوائے ایمان کے منافی ہے۔ اول تو آپ کی عدالت میں مقدمہ کو لے جانا ہی اس خواہش کے ساتھ تھا کہ تورات کے قانون سے فرار کی شاید کوئی شکل نکل آئے، لیکن جب وہاں سے کوئی شکل نہیں نکلی تو یہ جانتے بوجھتے کہ آپ کا فیصلہ بالکل تورات کے حکم کے مطابق ہے اس سے

گریز کی کوشش کی۔ فرمایا کہ وَمَا أُولَٰئِكَ بِالْمُؤْمِنِينَ یہ لوگ کسی چیز پر بھی ایمان نہیں رکھتے۔

إِنَّا أَنزَلْنَا التَّوْرَاةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ الَّذِينَ أَسْلَمُوا لِلَّذِينَ هَادُوا وَالرَّبَّانِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوا مِن كِتَابِ اللَّهِ وَكَانُوا عَلَيْهِ شُهَدَاءَ ۚ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا ۚ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ ۝ وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنفَ بِالْأَنفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ ۚ فَمَن تَصَدَّقَ بِهِ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهُ ۚ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ (۴۴-۴۵)

تورات کا مرتبہ

إِنَّا أَنزَلْنَا التَّوْرَاةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ، یہ تورات کی قدر و قیمت واضح فرمائی گئی کہ اللہ نے اس کو اتارا تھا تو بازیچۂ اطفال بنانے کے لیے نہیں اتارا تھا بلکہ زندگی کے اعلیٰ اقدار کے تحفظ کا وسیلہ، خدا اور اس کے نبیوں کے بتائے ہوئے طریقوں کی طرف رہنمائی کا ذریعہ، صراطِ مستقیم کی ہدایت اور خواہشات و بدعات کی تاریکیوں سے نکالنے والی روشنی بنا کر اتارا تھا۔

تورات کے بارے میں اس کے مخلص حاملین کی روش

يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ الَّذِينَ أَسْلَمُوا لِلَّذِينَ هَادُوا وَالرَّبَّانِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوا مِن كِتَابِ اللَّهِ وَكَانُوا عَلَيْهِ شُهَدَاءَ، تورات کے سچے اور مخلص حاملین کی روش بیان ہوئی ہے کہ کس طرح اللہ کے فرمانبردار نبیوں اور مخلص علما و فقہا نے خود اس کی اطاعت کی اور اس کے قوانین و احکام کے مطابق وہ یہودیوں کے معاملات و مقدمات کے فیصلے کرتے رہے اور اپنے اندر برابر اس احساس ذمہ داری کو زندہ رکھا کہ وہ خدا کی طرف سے اس کے امین و محافظ اور اس کے گواہ بنائے گئے ہیں اس وجہ سے نہ تو اس میں ان کے لیے کوئی خیانت جائز ہے اور نہ اس کے اظہار و اعلان میں کوئی کوتاہی روا ہے۔ یہ اللہ کا عہد و میثاق ہے جو بہر حال انھیں پورا کرنا ہے —— یہ آئینہ وقت کے یہود کے سامنے اس غرض سے رکھا گیا ہے کہ وہ اس میں دیکھیں کہ تورات سے متعلق ان پر کیا ذمہ داریاں عائد تھیں، ان کے صالح اسلاف نے ان ذمہ داریوں کو کس طرح نبھایا اور اب انھوں نے کس طرح اس عہد الٰہی کو بچوں کا کھیل بنا رکھا ہے۔

کتاب الٰہی کا حقیقی مقصد

يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ، میں مضارع سے پہلے عربیت کے عام قاعدے کے مطابق 'كَانَ' کا صیغہ محذوف ہے یعنی كَانَ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ (انبیاء اس کے ذریعہ سے یہود کے معاملات کا فیصلہ کرتے تھے) 'حکم' کے لفظ سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ کتابِ الٰہی کا اصل مقصد یہ ہے کہ وہ زندگی کے معاملات و نزاعات میں امر و حکم اور فیصلہ و قضا کا ذریعہ بنے اور تمام اجتماعی و سیاسی اور قانونی معاملات اسی کی ہدایات کے مطابق اور اسی کی روشنی میں انجام پائیں۔ اگر اس کی یہ حیثیت باقی نہ رہے بلکہ وہ صرف تبرک بنا کے رکھ چھوڑی جائے، یا اس کے الفاظ کی تلاوت کر لی جائے یا اس کو صرف مردے بخشوانے کا وسیلہ سمجھ لیا جائے، زندگی کے معاملات و مسائل سے نہ صرف یہ کہ اس کا کوئی تعلق باقی نہ رہے بلکہ سرے سے

اس کے احکام کے خلاف احکام و قوانین بنائے جائیں تو یہ اللہ کی کتاب کے ساتھ مذاق ہے۔

یہود پر ایک لطیف تعریض

انبیاء کے لیے اَلَّذِیْنَ اَسْلَمُوْا کی صفت سے اس حقیقت کا اظہار ہو رہا ہے کہ یہ انبیاء جو تورات کے احکام کے مطابق یہود کے معاملات کے فیصلے کرتے تھے، صرف دوسروں ہی کے لیے تورات کو واجب العمل نہیں سمجھتے تھے بلکہ خود بھی خدا کے فرمانبردار اور تورات کے احکام و قوانین کے پابند تھے۔ اس میں ایک لطیف تعریض ہے ان علمائے یہود پر جنھوں نے اول تو تورات کو زندگی کے معاملات سے بالکل بے دخل کر رکھا تھا اور اگر کسی دائرے میں اس کو جگہ دی بھی تھی تو اس کی نوعیت یہ تھی کہ دوسروں کو تو اس کا حکم دیتے تھے لیکن خود اپنے آپ کو اس کا مخاطب نہیں سمجھتے تھے۔ قرآن مجید نے اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ کے الفاظ سے ان کی اسی حالت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

یہود کو ایک یاددہانی

'ربانی' اور 'احبار' عربی زبان میں اہل کتاب سے آئے ہوئے الفاظ ہیں۔ 'ربانی' سے مراد علما ہیں اور 'احبار' کا غالب استعمال فقہا اور قضاۃ کے لیے ہے۔ یہ دونوں الفاظ یہاں اپنے حقیقی مفہوم یعنی علمائے حقانی اور دیانت دار و راست باز فقہا و قضاۃ کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح خدا کے فرماں بردار انبیاء ٹھیک تورات کے مطابق لوگوں کے فیصلے کرتے رہے ہیں اسی طرح حق پرست علماء اور راست باز فقہا بھی اپنے فتوے اور فیصلے اس کی روشنی میں صادر کرتے رہے ہیں۔ یہاں بھی وقت کے علمائے یہود اور ان کے فقہاء کو نہایت لطیف طریقے پر توجہ دلائی ہے کہ تم جن اسلاف کے اخلاف ہو ان میں ایسے لوگ بھی گزرے ہیں جو تمھاری طرح خدا کی کتاب کے معاملے میں چور اور بددیانت نہیں تھے۔

عہد الٰہی کی پاسبان خشیت الٰہی ہے

'بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ' میں اس ذمہ داری کا بیان ہے جس کے وہ حامل بنائے گئے تھے اور جس کے صحیح احساس ہی نے ان کی عناں گیری کی جس کے سبب سے ان کو کتاب اللہ کا حق ادا کرنے کی توفیق ملی۔ وہ یہ کہ اللہ نے ان کو اپنی کتاب کا محافظ اور امین اور خلق کے سامنے اس کا شاہد اور گواہ بنایا تھا اور ہر گروہ جو اللہ کی کتاب کا حامل بنایا جاتا ہے وہ درحقیقت اس کا محافظ اور گواہ ہی ہوتا ہے۔ یہ الفاظ بھی وقت کے یہود اور ان کے علماء و فقہا کو یاددہانی کر رہے ہیں کہ وہ ذرا اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر دیکھیں کہ پاسبان ہو کر انھوں نے خدا کے حرم میں کس طرح نقب لگائی ہے اور گواہ ہو کر کس طرح کتمان شریعت میں مہارت دکھائی ہے۔

'فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا' عام طور پر مفسرین نے اس ٹکڑے کو اوپر کے سیاق و سباق سے الگ کر کے وقت کے یہود سے خطاب کے مفہوم میں لیا ہے۔ اگرچہ الفاظ میں یہ مفہوم لینے کی بھی گنجائش ہے لیکن میرا رجحان اس طرف ہے کہ اس کا تعلق بھی اوپر کے ٹکڑے ہی سے ہے البتہ قرآن کے معروف طریقہ کے مطابق یہاں اسلوب غائب کے بجائے حاضر کا ہو گیا ہے

قرآن مجید میں اس کی مثالیں بکثرت پائی جاتی ہیں کہ بات غائب کے صیغے سے کہتے کہتے اچانک اسلوب حاضر کا آجاتا ہے۔ یہ تبدیلی کلام میں تنوع بھی پیدا کر دیتی ہے اور صورت حال کا نقشہ سامنے آجانے کے سبب سے قاری اور سامع پر اس کا اثر بھی پڑتا ہے۔ مثلاً سورہ انعام میں ہے وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِنَ الْإِنْسِ (اور جس دن جن و انس سب کو اکٹھا کرے گا، اے جنوں کے گروہ تم نے تو انسانوں میں سے بہتوں کو اپنے دام میں پھنسا لیا) پھر آگے ہے وَكَذَٰلِكَ نُوَلِّي بَعْضَ الظَّالِمِينَ بَعْضًا بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ ۱۳۰ (اور اسی طرح ہم ظالموں میں سے ایک کو دوسرے پر ان کے اعمال کی پاداش میں مسلط کر دیتے ہیں، اے جنوں اور انسانوں کے گروہ .....) یہی اسلوب سورہ بقرہ کی آیت وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِلنَّاسِ وَأَمْنًا وَاتَّخِذُوا مِنْ مَقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى ۱۲۵ میں بھی استعمال ہوا ہے۔ اس کے محل میں ہم نے اس پر تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔ ہمارے نزدیک یہی اسلوب مائدہ کی اس آیت میں بھی ہے۔ یعنی یہ بات ان شہداء سے خطاب کر کے کہی گئی تھی جن کا ذکر پہلے گزرا لیکن اس کو غائب کے صیغہ سے بیان کرنے کے بجائے حاضر کے صیغہ میں فرمایا تاکہ کلام زیادہ مؤثر ہو جائے۔

یہ ملحوظ رہے کہ تورات میں جہاں جہاں یہود سے پابندی احکام شریعت کے عہد لینے کا ذکر آتا ہے وہاں حضرت موسیٰ کی طرف سے ان باتوں کی تاکید ضرور آتی ہے جن کی طرف قرآن کے الفاظ اشارہ کر رہے ہیں۔ یعنی خداوند خدا ہی سے ڈرنا، اس کے حکموں کے معاملے میں کسی کی پروا نہ کرنا، اس کی شریعت کو دنیا کے حقیر فوائد پر قربان نہ کرنا۔ غور کیجیے تو یہ باتیں اس امانت اور شہادت کا لازمی تقاضا ہیں جن کا بِمَا اسْتُحْفِظُوا مِنْ كِتَابِ اللَّهِ وَكَانُوا عَلَيْهِ شُهَدَاءَ، میں ذکر آیا ہے۔ جو گروہ کتاب الٰہی کا گواہ بنایا گیا ہے اس کے لیے واجب ہے کہ وہ صرف خدا ہی سے ڈرے، دوسروں کا خوف و رعب اپنے سینے سے نکال دے۔ اس کے بغیر ہر طرح کے حالات میں اس کے لیے کتاب الٰہی کی شہادت کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا ممکن نہیں ہے۔ اسی طرح جو جماعت کتاب الٰہی کی امین بنائی گئی ہے اس پر حرام ہے کہ وہ اپنے دنیوی مفادات و اغراض کی خاطر خدا کی اس امانت میں خیانت کرے اور کتاب الٰہی پر تاویل و تحریف کی قینچی چلائے۔ مزید غور کیجیے تو یہ حقیقت بھی واضح ہو گی کہ میثاق الٰہی کی انہی تنبیہات کو فراموش کر دینے کی وجہ سے یہود شُهَدَاءَ اللَّهِ اور اُمَنَاءُ اللَّهِ ہونے کے بجائے سَمَّاعُونَ لِلْكَذِبِ اور أَكَّالُونَ لِلسُّحْتِ بن کر رہ گئے جس کے سبب سے خدا نے ان پر لعنت کر دی۔

حقیقی کافر

وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ، اس ٹکڑے کا عطف چونکہ اوپر والے ٹکڑے ہی پر ہے اس وجہ سے جو حکم اس کا ہے وہی حکم اس کا بھی ہے۔ یعنی یہ نتیجہ بھی اس تنبیہ کا ایک حصہ ہے جو اوپر مذکور ہوئی۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے جن کو شریعت کا امین اور گواہ بنایا ہے اگر انھی کے معاملات کے فیصلے شریعت کے مطابق نہ ہوئے تو حقیقی کافر وہی ہیں۔ اس تاکید

اور زور کے ساتھ ان کے کافر قرار دینے کی وجہ وہ اہتمام ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی شریعت اور کتاب کی تعلیم دینے، اس کی ذمہ داریوں سے آگاہ کرنے اور اس راہ کے خطرات سے متنبہ کرنے کے لیے فرمایا۔ جو لوگ اس سارے اہتمام کے بعد بھی راہِ حق سے بھٹک گئے انھوں نے گویا پورے دن کی روشنی میں ٹھوکر کھائی اس وجہ سے یہ تمام اندھوں سے بڑھ کر اندھے ہیں۔ یہ آیت اگرچہ ہے تو یہود سے متعلق لیکن بعینہٖ یہی جرم اگر مسلمانوں کے کسی گروہ سے صادر ہو کہ وہ اختیار و آزادی رکھتے ہوئے کتاب الٰہی کے مطابق معاملے کا فیصلہ نہ کریں، بلکہ علی الاعلان اس سے انحراف اختیار کریں تو ان کا حکم بھی یہی ہوگا اور یہی ہونا چاہیے آگے اس کی وضاحت آئے گی۔

'وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ الاية' یہ تورات کے اس قانون کا حوالہ ہے جو خروج ۲۱: ۲۳-۲۵ احبار ۲۴: ۲۰-۲۲۔ استثنا ۱۹: ۲۱ میں مذکور ہے۔ یہ حوالہ اس بات کی تصدیق کے لیے دیا گیا ہے جو اوپر آیت ۴۳ میں مذکور ہوئی ہے کہ تورات میں حدود و تعزیرات کے واضح احکام کی موجودگی میں آخر یہ یہود کس طرح تمھیں حکم بنا کر تمھارے فیصلہ سے گریز کرتے ہیں اور اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ دراصل یہ حدود ہی کے معاملات تھے جو یہود کے لیے سب سے زیادہ مزلۂ قدم ثابت ہوئے۔ اول تو انھوں نے تحریف کر کے ان کا حلیہ ہی بگاڑ دیا۔ پھر جو احکام تحریف کی دستبرد سے بچ رہے ان سے بھی فرار کے لیے انھوں نے مختلف قسم کے حیلے نکال لیے۔

'فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ' میں 'لَهٗ' کے مرجع کے بارے میں اصحاب تاویل کا اختلاف ہے۔ ایک گروہ کے نزدیک اس کا مرجع شخص مجروح ہے۔ یعنی اگر مجروح اپنے مجرم کو بخش دے، اس سے بدلہ نہ لے، تو اس کی یہ نیکی اللہ کے گناہوں کے لیے کفارہ بنے گی، گویا یہ ٹکڑا مجروح کے لیے ترغیب ہے کہ وہ مجرم کو معاف کر دے تو یہ بہتر ہے۔ دوسرے گروہ کے نزدیک جس میں ابن عباس، مجاہد اور ابراہیم و شعبی جیسے اکابر تفسیر شامل ہیں، اس کا مرجع جارح ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر مجروح (اور بصورت قتل، اولیائے مقتول) مجرم کو معاف کر دے تو یہ معافی مجرم کے لیے کفارہ بن جائے گی، حکومت اس پر کوئی گرفت نہیں کرے گی اور اگر مجرم توبہ کرے گا تو عنداللہ بھی یہ معافی اس کے لیے کفارہ بن جائے گی۔ میرا رجحان اسی دوسری تاویل کی طرف ہے۔ قرآن کے الفاظ سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔

معنی ظالم

'وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ' اوپر یہی مضمون بیان کرتے ہوئے 'كٰفِرُوْنَ' کا لفظ آیا ہے۔ یہاں 'ظٰلِمُوْنَ' کا لفظ ہے۔ لفظ ظلم ہلکے معنی میں نہیں سمجھنا چاہیے۔ یہ قرآن میں خدا اور بندوں کے سب سے بڑے حقوق کے تلف کرنے کے لیے بھی استعمال ہوا ہے چنانچہ شرک کو ظلم سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ جو لوگ اللہ کی کتاب اور اس پر عمل کی آزادی رکھتے ہوئے اس کے قانون کو نظر انداز کرتے ہیں وہ خدا کا بھی سب سے بڑا حق تلف کرتے اور خود اپنے نفس اور اللہ کے دوسرے بندوں کا بھی

سب سے بڑا حق تلف کرتے ہیں اور در حقیقت اصلی ظالم یہی لوگ ہیں۔ یہ آیت بھی اگرچہ یہود کے جرائم کے بیان کے سیاق میں ہے۔ لیکن یہی جرم مسلمانوں سے صادر ہو رجس کی شہادت ہر مسلمان ملک میں موجود ہے) تو میں نہیں سمجھتا کہ اس کا حکم اس سے الگ کس بنیاد پر ہوگا۔ خدا کا قانون تو سب کے لیے ایک ہی ہے؛

آیت کا حکم ہے یا منسوخ

یہ آیت قصاص، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، تورات کے ایک حکم کے حوالہ کے طور پر وارد ہوئی ہے لیکن کوئی اشارہ چونکہ اس کے منسوخ ہونے کا موجود نہیں ہے بلکہ اندازِ بیان اس کے محکم ہونے پر دلیل ہے اس وجہ سے یہی قانون اس امت کے لیے بھی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے عمل سے اس بات کی تائید ہوتی ہے۔ سورۂ بقرہ کی تفسیر میں لفظ قصاص پر بحث کرتے ہوئے ہم لکھ چکے ہیں کہ اپنے عام استعمال میں یہ لفظ قصاص جانی و مالی دونوں پر بولا جاتا ہے۔ اس وجہ سے اگر دیت پر راضی نامہ ہو جائے یا دیت ہی تقاضائے انصاف قرار پائے تو دیت ہی قصاص سمجھی جائے گی۔ تفصیلات اس کی فقہ کی کتابوں میں موجود ہیں۔

وَقَفَّيْنَا عَلَىٰٓ اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ ۖ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ ۙ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ‎(۴۶-۴۷)

انبیاء کی باہمی مماثلت ایک علامت شناخت ہے

'وَقَفَّيْنَا عَلَىٰٓ اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ'۔ 'قَفَّيْتُ عَلٰٓى اَثَرِهٖ بِفُلَانٍ' کے معنی ہوں گے، میں نے اس کو اس کے پیچھے بھیجا۔ مطلب یہ ہے کہ انھی انبیاء کے نقش قدم پر جن کا ذکر اوپر گزرا، ہم نے عیسیٰ بن مریم کو بھیجا جو ٹھیک اسی مقصد کے ساتھ آئے جس مقصد کے لیے ان کے پیشرو انبیا آئے تھے۔ 'عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ' کے لفظ سے انبیاء کی دعوت، ان کے مقصد، ان کے مزاج، کردار اور طریق کار کی یکسانی اور ان کی باہمی مشابہت کا اظہار ہو رہا ہے۔ یہ چیز منجملہ علامات نبوت کے ہے۔ جس طرح ایک ہی شجرہ طیبہ کے برگ و بار میں مماثلت ہوتی ہے اسی طرح اس مقدس گروہ کے افراد میں مماثلت ہوتی ہے کہ جو ان میں سے ایک کو پہچان گیا وہ گویا سب کو پہچان گیا۔ ان کی شناخت کے معاملے میں التباس انھی کو پیش آتا ہے جو یا تو اندھے ہوتے ہیں یا اندھے بن جاتے ہیں، جن کے اندر بصیرت ہوتی ہے وہ کبھی دھوکا نہیں کھاتے۔

نبی اپنی دعوت سے کوئی الگ چیز نہیں

'وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ ۙ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ'۔ 'فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ' کا جملہ چونکہ حال واقع ہوا ہے اس وجہ سے 'مُصَدِّقًا' کا عطف اس پر موزوں ہوا۔ یہاں حضرت مسیحؑ اور انجیل دونوں کی شان میں فرمایا ہے کہ 'مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ' اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ نبی اپنی دعوت و رسالت سے کوئی الگ چیز نہیں ہوتا، دوسری وجہ یہ ہے کہ حضرت مسیحؑ کی پیشینگوئی ان کے پیشرو انبیا کے صحیفوں میں موجود تھی جس کی آپ کی بعثت سے تصدیق ہوئی تھی اور یہ

چیز منجملہ آپ کے دلائل نبوت کے تھی، تیسری یہ کہ انجیل نے، جہاں تک شریعت کا تعلق ہے، کوئی نئی شریعت نہیں دی ہے بلکہ یہود کی بعض بدعات کی اصلاح کے ساتھ پوری سابق شریعت کی تصدیق کر دی ہے۔

انجیل دیتے وقت اہل انجیل کو ہدایت

'وَلْیَحْکُمْ اَھْلُ الْاِنْجِیْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ' اوپر ہم نے جو محل فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ والے جملہ کا قرار دیا ہے وہی محل ہمارے نزدیک یہاں اس جملے کا ہے یعنی اہل انجیل کو انجیل دیتے وقت یہ ہدایت دی گئی کہ وہ اپنے معاملات کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کریں گے، ورنہ وہ فاسق ٹھہریں گے۔ مقصود اس کا، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، یہ واضح کرنا ہے کہ خدا نے اپنی جو کتاب بھی اتاری اسی مقصد سے اتاری کہ زندگی کے معاملات و نزاعات میں لوگ اس کو حکم بنائیں، نہ اس لیے کہ جزدان میں لپیٹ کر بلائے طاق رکھ دیں اور آپس میں جو قضیے پیدا ہوں ان کو طاغوت کے پاس لے جائیں یا ان کو طے کرنے کے لیے من مانے طریقے ایجاد کریں۔ بعض لوگوں نے 'وَلْیَحْکُمْ' کو 'لِیَحْکُمْ' بھی پڑھا ہے۔ ہمارے نزدیک قرأت کے اس قسم کے سارے اختلافات تاویل کے اختلاف کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنی اس قرأت سے بھی یہی بات سمجھانی چاہی ہے کہ اہل انجیل کو بھی انجیل اس لیے دی گئی تھی کہ یہ اس کی روشنی میں اپنے معاملات کے فیصلے کریں۔

اصلی فاسق

'فَاسِقٌ' کا لفظ یہاں فقہی مفہوم میں نہیں ہے بلکہ جیسا کہ ہم مختلف مقامات میں واضح کرتے آئے ہیں، خدا سے غداری، عہد شکنی اور سرکشی کے مفہوم میں ہے۔ گویا جو لوگ جانتے بوجھتے اور آزادی و اختیار رکھتے ہوئے اللہ کے احکام و قوانین کے خلاف فیصلے کرتے اور کراتے ہیں وہ کافر، ظالم اور فاسق ٹھہریں گے۔ یہ تنبیہ اس میثاق الٰہی کا ہمیشہ سے ایک جزو لاینفک رہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب سے ان کو کتاب حوالہ کرتے وقت باندھا۔

وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْہِ مِنَ الْکِتٰبِ وَمُھَیْمِنًا عَلَیْہِ فَاحْکُمْ بَیْنَھُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ وَلَا تَتَّبِعْ اَھْوَآءَھُمْ عَمَّا جَآءَکَ مِنَ الْحَقِّ ط لِکُلٍّ جَعَلْنَا مِنْکُمْ شِرْعَۃً وَّ مِنْھَاجًا ط وَلَوْ شَآءَ اللّٰہُ لَجَعَلَکُمْ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً وَّلٰکِنْ لِّیَبْلُوَکُمْ فِیْ مَآ اٰتٰکُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَیْرٰتِ ط اِلَی اللّٰہِ مَرْجِعُکُمْ جَمِیْعًا فَیُنَبِّئُکُمْ بِمَا کُنْتُمْ فِیْہِ تَخْتَلِفُوْنَ ہ وَاَنِ احْکُمْ بَیْنَھُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ وَلَا تَتَّبِعْ اَھْوَآءَھُمْ وَاحْذَرْھُمْ اَنْ یَّفْتِنُوْکَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ اِلَیْکَ ط فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ اَنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ اَنْ یُّصِیْبَھُمْ بِبَعْضِ ذُنُوْبِھِمْ ط وَاِنَّ کَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ ہ اَفَحُکْمَ الْجَاھِلِیَّۃِ یَبْغُوْنَ ط وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰہِ حُکْمًا لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ (۴۸ - ۵۰)

حاملین قرآن کی ذمہ داری

اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ بعینہٖ انہی ذمہ داریوں اور اسی عہد و میثاق کے ساتھ یہ کتاب تمہارے حوالے کی جا رہی ہے تو تم ان کے دھیان بہر حال اللہ کی اس کتاب کے مطابق ہی فیصلہ کرو۔ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ اس سیاق میں 'بالحق' کے معنی قول فیصل کے ہوتے ہیں۔ اہل کتاب نے اپنے

صحیفوں کو تحریفات کے ذریعے سے حق و باطل دونوں کا مجموعہ بنا دیا تھا۔ قرآن نے اللہ کا دین تمام آمیزشوں اور تحریفات سے پاک کر کے بالکل ٹھیک ٹھیک پیش کر دیا۔ 'مُصَدِّقًا' کی تاویل مختلف مقامات میں گزر چکی ہے۔

'مہیمن' کا مفہوم

'مُهَيْمِنًا' اصل میں 'مُأَأْمِنٌ' ہے۔ دوسرا ہمزہ ی سے اور پہلا ہ سے بدل گیا ہے۔ یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی صفت کے طور پر بھی استعمال ہوا ہے (۲۳۔ حشر) اور قرآن کی صفت کے طور پر بھی۔ هَيْمَنَ الطَّائِرُ عَلٰى فِرَاخِهٖ کا مطلب یہ ہوگا کہ پرندہ اپنے بچوں کے اوپر پر پھیلائے ہوئے منڈلا رہا ہے، گویا ان کو اپنی حفاظت میں لیے ہوئے ہے۔ 'هَيْمَنَ فُلَانٌ عَلٰى كَذَا' فلاں اس چیز کا محافظ اور نگران بن گیا۔ اپنے سے سابق صحیفوں پر قرآن کے 'مُهَيْمِن' ہونے کے معنی یہ ہیں کہ قرآن اصل معتمد نسخہ کتاب الٰہی کا ہے اس لیے وہ دوسرے صحیفوں کے حق و باطل میں امتیاز کے لیے کسوٹی ہے۔ جو بات اس کسوٹی پر کھری ثابت ہوگی وہ کھری ہے، جو اس پر کھوٹی ثابت ہوگی وہ محرّف ہے۔ یہاں 'الکتاب' کا لفظ واحد استعمال کرنے کی وجہ یہ ہے کہ قرآن سے پہلے اصل شریعت کے اعتبار سے کتاب الٰہی کی حیثیت درحقیقت تورات ہی کو حاصل ہے، بقیہ صحائف اس کے اجزا و فروع کی حیثیت رکھتے ہیں۔

'فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ'، قرآن سے متعلق یہ اسی طرح کا عہد و میثاق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے واسطے سے آپ کی امت سے لیا گیا ہے جس طرح کا عہد تورات اور انجیل سے متعلق ان کے حاملین سے لیا گیا اور جس کا ذکر اوپر گزرا۔ مطلب یہ ہے کہ اب یہی کتاب حق و باطل کی کسوٹی اور احکام الٰہی کا قابل اعتماد مجموعہ ہے تو تم لوگوں کے درمیان اسی کے مطابق فیصلہ کرو اور جو حق تمہارے پاس آ چکا ہے، ہرگز اس سے منحرف ہو کر ان منافقین اور یہود کی خواہشات و بدعات کی پیروی نہ کرنا جو اپنی خواہشوں کے مطابق فیصلے حاصل کرنے کے لیے تمہارے پاس آتے ہیں۔ یہ بات یہاں بغیر کسی اظہار کے ظاہر ہے کہ اس حق کو چھوڑ کر کسی باطل کے مطابق معاملات کے فیصلے کرنا اسی طرح کفر، ظلم اور فسق ہے جس طرح اوپر تورات و انجیل سے متعلق مذکور ہوا۔

'لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ۭ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ' اس ٹکڑے کے صحیح موقع و محل اور اس کے صحیح مفہوم کو سمجھنے کے لیے بقرہ کی مندرجہ ذیل آیات پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ یہ دونوں بالکل ایک ہی موقع و محل کی آیات ہیں اور ایک ہی حقیقت کو واضح کر رہی ہیں۔

وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ۭ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا

اور اگر تم ان اہل کتاب کے پاس ہر قسم کی نشانیاں لا کر رکھ دو جب بھی تمہارے قبلہ کی یہ پیروی نہیں کریں گے اور نہ تم ان کے قبلہ کی پیروی کرنے کے، اور نہ ان میں سے کوئی ایک دوسرے کے قبلہ کی پیروی کرنے کا۔

جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ إِنَّكَ إِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِينَ ۘ
الَّذِينَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُونَهٗ كَمَا يَعْرِفُونَ
اَبْنَآءَهُمْ ؕ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ
الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۔ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ
فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۔ وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ
هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ اَيْنَ
مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ؕ
اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ
(البقرة ۲: ۱۴۵ - ۱۴۸)

اور اگر تم ان کی خواہشوں کی پیروی کروگے بعد اس کے کہ تمہارے پاس علم حق آ چکا ہے تو تم اپنے نفس پر ظلم کرنے والوں میں سے بن جاؤ گے۔ جن کو ہم نے کتاب عطا کی وہ اس کو پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ البتہ ان میں سے ایک گروہ حق کو جانتے بوجھتے چھپاتا ہے۔ یہی حق ہے تیرے رب کی جانب سے تو تم شک کرنے والوں میں سے نہ ہو، ہر ایک کے لیے ایک سمت ہے، وہ اسی کی طرف رخ کرے گا تو تم بھلائیوں کی سمت میں سبقت کرو، جہاں کہیں بھی تم ہوگے اللہ تم سب کو اکٹھا کرے گا۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

جس طرح یہاں سیاق و سباق دلیل ہے کہ وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ کا ٹکڑا، جیسا کہ ہم اپنی تفسیر میں واضح کر چکے ہیں، اہل کتاب کے ساتھ رواداری کے اظہار کے لیے نہیں بلکہ ان کے رویہ سے بیزاری کے اظہار کے لیے ہے اسی طرح مائدہ کی زیر بحث آیت میں لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا کا ٹکڑا بھی اہل کتاب کے ساتھ اظہار رواداری کے لیے نہیں بلکہ ان کے رویہ سے اظہار بیزاری اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے لیے تسکین و تسلی اور راہ حق میں سبقت کی دعوت کے لیے ہے۔

اسی طرح سورۂ حج میں ارشاد ہوا ہے۔

لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ
فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِى الْاَمْرِ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ ؕ
اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ ۔ وَاِنْ
جٰدَلُوْكَ فَقُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا
تَعْمَلُوْنَ ۔ اَللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ
الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۔
(۶۷ - ۶۹ - حج)

ہم نے ہر امت کے لیے ایک طریقۂ عبادت ٹھہرایا وہ اسی پر چلیں گے تو وہ تم سے جھگڑنے کی کوئی راہ اس معاملے میں نہ پائیں اور تم اپنے رب کی طرف بلاتے رہو اور اگر وہ تم سے جھگڑیں تو کہہ دو کہ جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے خوب واقف ہے۔ اللہ تمہارے درمیان فیصلہ کرے گا قیامت کے دن اس چیز میں جس میں تم اختلاف کر رہے ہو۔

آیت زیر بحث میں 'لِكُلٍّ' سے مراد وہی تینوں گروہ مراد ہیں جن کا اوپر ذکر گزرا یعنی یہود و نصاریٰ اور مسلمان۔ فرمایا کہ ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے الگ الگ شرعۃ اور منہاج مقرر کیا ہے۔ شرعۃ اور منہاج سے مراد شریعت کا وہ ظاہری ڈھانچہ اور قالب ہے جو دین کے حقائق کو بروئے کار لانے کے لیے ہر مذہب میں اختیار کیا گیا ہے۔ مثلاً عبادتِ الٰہی ایک حقیقت ہے جس کو مختلف مذاہب میں نماز

قربانی اور حج کی مختلف شکلوں صورتوں میں ظاہر کیا گیا ہے، بعض حقائق کے لیے قالب خود اللہ تعالیٰ نے مقرر فرما دیا ہے۔ بعض کے لیے اللہ تعالیٰ کے اذن سے نبی نے مقرر فرمایا ہے۔ غالباً اسی وجہ سے یہاں دو لفظ استعمال ہوئے ہیں۔ پہلے کے لیے 'شرعت' کا لفظ استعمال ہوا ہے، دوسرے کے لیے منہاج کا۔

مختلف امتوں کی شریعت کے اختلاف کی حکمت

جہاں تک دین کے حقائق کا تعلق ہے وہ ہمیشہ سے غیر متغیر ہیں اور غیر متغیر ہی رہیں گے لیکن شریعت کے ظواہر و رسوم ہر امت کے لیے اللہ تعالیٰ نے الگ الگ مقرر فرمائے تاکہ یہ چیز امتوں کے امتحان کا ذریعہ بنے اور وہ دیکھے کہ کون ظواہر و رسوم کے تعصب میں گرفتار ہو کر حقائق سے منہ موڑ لیتا ہے اور کون حقیقت کا طالب بنتا ہے، اور اس کو ہر اس شکل میں قبول کرنے کے لیے آگے بڑھتا ہے جس میں وہ خدا اور اس کے رسول کی طرف سے اس کے سامنے آتی ہے۔ سورۂ بقرہ میں، قبلہ کی بحث میں اس امتحان کا ذکر اس طرح فرمایا ہے۔

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ	اور ہم نے اس قبلہ کو، جس پر تم تھے، نہیں جائز رکھا
عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ	تھا مگر اس لیے کہ ہم چھانٹ کر الگ کر دیں ان لوگوں کو
الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ	جو رسول کی پیروی کرتے ہیں ان لوگوں سے جو پیٹھ
وَإِنْ كَانَتْ لَكَبِيرَةً إِلَّا عَلَى	پیچھے پھر جاتے ہیں، اگرچہ یہ بہت بھاری بات تھی مگر
الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ ۗ وَمَا	ان لوگوں کے لیے جن کو اللہ نے ہدایت کی توفیق بخشی
كَانَ اللَّهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ ۚ إِنَّ	اور اللہ کا یہ ارادہ نہیں تھا کہ وہ تمہارے ایمان کو برباد
اللَّهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوفٌ رَحِيمٌ ﴿	کردے، اللہ تو لوگوں پر بڑی رافت و رحمت رکھنے
(البقرۃ-۲ : ۱۴۳)	والا ہے۔

یہ حکمت واضح فرمائی گئی ہے اس بات کی کہ کیوں اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو اول اول اہل کتاب کے قبلہ پر باقی رکھا، پھر کچھ عرصہ کے بعد اس کو چھوڑ کر بیت اللہ کو قبلہ بنانے کا حکم دیا؟ ایسا کیوں نہ ہوا کہ پہلے ہی روز سے بیت اللہ ہی کو قبلہ قرار دے دیا جاتا؟ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت اس بات کی مقتضی ہوئی کہ یہ تبدیلی مخلصین و منافقین کے درمیان امتیاز کا ایک ذریعہ بنے۔ اس امتحان کے ذریعہ سے اس نے حق کے طالبوں اور رسول کے مخلص پیرووں کو ان لوگوں سے الگ کر دیا جو محض ظاہر دارانہ طور پر رسول کے ساتھ ہو گئے تھے، فی الحقیقت انھوں نے کوئی تبدیلی قبول نہیں کی تھی بلکہ بدستور اپنے پچھلے رسوم و قیود میں گرفتار تھے۔

اسی طرح آیت زیر بحث میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی کہ منافقین اور یہود جو تم سے اور تمہاری لائی ہوئی شریعت سے بدکتے ہیں تو تم ان کی پروا نہ کرو۔ یہ اپنے پچھلے رسوم و قیود میں گرفتار ہیں، ان کا تعصب ان کو اجازت نہیں دیتا کہ وہ ان سے آزاد ہو کر اس حق کو شرح صدر کے ساتھ اپنا لیں جو تم نے ان کے

سامنے پیش کیا ہے۔ اللہ نے ہر امت کے لیے شریعت اور منہاج الگ الگ بنائے ہیں۔ اگر وہ چاہتا تو سب کو ایک ہی منہاج دیتا لیکن اس کی حکمت کا تقاضا یہ ہوا کہ منہاج کی اس تبدیلی کو لوگوں کے امتحان کا ذریعہ بنائے اور دیکھے کہ کون حق کا طالب بنتا ہے اور کون صرف لکیر کا فقیر اور رسوم و ظواہر کا غلام بن کے رہ جاتا ہے۔ اللہ عقل، اختیار اور شریعت کی جو نعمت دیتا ہے اس میں وہ لوگوں کا امتحان کرتا رہتا ہے کہ کون ان نعمتوں سے فائدہ اٹھا رہا ہے، ان کی قدر کر رہا ہے، ان کے مغز اور قشر میں امتیاز رکھتا ہے اور کون بالکل اندھا بہرا بن کر محض رسم کا پجاری بن کر رہ گیا ہے تو تم ان اندھوں بہروں کو ان کے حال پر چھوڑو اور پیغمبر نے تمہارے سامنے حصولِ قربِ الٰہی کا جو میدان کھولا ہے اس میں ایک دوسرے سے گوئے سبقت لے جانے کی کوشش کرو۔ یہاں 'یٰٓاَیُّھَا الرَّسُوْلُ لَا یَحْزُنْکَ الَّذِیْنَ یُسَارِعُوْنَ فِی الْکُفْرِ' والے ٹکڑے کو پھر ذہن میں تازہ کر لیجیے۔ مطلب یہ ہوا کہ اگر منافقین اور ان کے مرشد یہود کفر کی راہ میں مسابقت کر رہے ہیں تو ان کی اس بدبختی پر غم کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اہلِ ایمان، ایمان کے میدان میں بازی جیتنے کی کوشش کریں۔

'اِلَی اللّٰہِ مَرْجِعُکُمْ جَمِیْعًا الاٰیۃ' یعنی اس دنیا میں تو بہرحال آزادی حاصل ہے، کوئی شخص چاہے کفر کی راہ اختیار کرے، چاہے ایمان کی لیکن منزل ہر شخص کی ایک ہی ہے، لوٹنا سب کو خدا ہی کی طرف ہے، ایک دن یہ سارا اختلاف اسی کے سامنے پیش ہوگا اور وہ اس اختلاف کا فیصلہ فرمائے گا۔

'وَاَنِ احْکُمْ بَیْنَھُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ الاٰیۃ' مجھے بار بار یہ خیال ہوتا ہے کہ اس ٹکڑے کا عطف اوپر 'فَاحْکُمْ بَیْنَھُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ وَلَا تَتَّبِعْ اَھْوَآءَھُمْ عَمَّا جَآءَکَ مِنَ الْحَقِّ' والے ٹکڑے پر ہے۔ بیچ میں 'لِکُلٍّ جَعَلْنَا مِنْکُمْ شِرْعَۃً الاٰیۃ' والا ٹکڑا بطور ایک جملہ معترضہ کے آگیا ہے۔ جملہ معترضہ کے ختم ہونے کے بعد سلسلہ کی اصل بات کا از سرِ نو حوالہ دے کر مزید تنبیہ فرمائی کہ 'وَاحْذَرْھُمْ اَنْ یَّفْتِنُوْکَ عَنْ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ اِلَیْکَ' ہوشیار رہو کہ مبادا وہ تمہیں فتنہ میں ڈال کر خدا کی اتاری ہوئی کسی بات سے ہٹانے میں کامیاب ہو جائیں۔ اس مزید تنبیہ کی ضرورت اس لیے تھی کہ یہ مرحلہ کوئی آسان مرحلہ نہیں تھا۔ مخالف قوتیں آسانی سے سپر انداز ہونے والی نہیں تھیں۔ فتنہ کا لفظ خود اشارہ کر رہا ہے کہ وہ پیغمبر اور مسلمانوں کو میثاقِ الٰہی سے ہٹانے کے لیے اپنا پورا زور لگا دیں گی۔ اس خطرے سے بچانے کے لیے آگاہ فرما دیا کہ وہ خواہ کتنا ہی زور لگائیں اور کتنا ہی دباؤ ڈالیں تمہیں بہرحال اللہ کی اتاری ہوئی شریعت ہی کی پیروی کرنی ہے، اس کو چھوڑ کر ان کی خواہشات و بدعات کی پیروی نہیں کرنی ہے۔

مخالفین کو تہدید

'فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ الاٰیۃ' مطلب یہ ہے کہ تم موقفِ حق پر جمے رہو، اگر شریعتِ الٰہی کو چھوڑ کر یہ شریعتِ جاہلیت ہی کی پیروی پر اڑے رہے تو سمجھ لو کہ ان کی شامت آئی ہوئی ہے اور وقت آگیا ہے کہ ان کے بعض جرائم کی سزا میں ان پر خدا کا عذاب آدھمکے۔ یہ بات یہاں یاد رکھنے کی ہے کہ قوموں کے اجتماعی جرائم کی سزا اللہ تعالیٰ اسی دنیا میں دے دیتا ہے، آخرت میں لوگ اپنی انفرادی حیثیتوں میں اپنے اعمال

کے لیے جواب دہ ہوں گے۔ وَاِنَّ کَثِیۡرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوۡنَ، یہ دلیل بیان ہوئی ہے اس بات کی کہ کیوں یہ اس بات کے سزاوار ہیں کہ ان پر اللہ کا عذاب آدھمکے۔ فرمایا کہ اس لیے کہ ان کی اکثریت خدا کی باغی اور نافرمان ہے۔

'اَفَحُکۡمَ الۡجَاہِلِیَّۃِ یَبۡغُوۡنَ' الآیۃ یعنی خدا کی اتاری ہوئی شریعت کو چھوڑ کر اگر یہ کہیں اور سے فیصلہ چاہتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ خدا کی شریعت پر جاہلیت کے قانون کو ترجیح دیتے ہیں اور کسی مدعی شریعت گروہ کی اس سے بڑی بدقسمتی اور کیا ہو سکتی ہے۔ جو لوگ خدا اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں ان کے لیے خدا کے قانون اور خدا کے فیصلے سے بڑھ کر کس کا قانون اور کس کا فیصلہ ہو سکتا ہے۔ اگر ان کے نزدیک کوئی اور قانون خدا کے قانون سے بڑھ کر ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کو خدا اور آخرت کسی چیز پر بھی یقین نہیں ہے۔

خدا کے قانون کے خلاف ہر قانون قانون جاہلیت ہے

یہاں یہ بات ملحوظ رکھنے کی ہے کہ 'حُکۡمَ الۡجَاہِلِیَّۃِ' کا لفظ 'مَآ اَنۡزَلَ اللّٰہُ' کے بالمقابل استعمال ہوا ہے اس وجہ سے ہر وہ قانون جو خدا کے اتارے ہوئے قانون کے خلاف ہے وہ جاہلیت کا قانون ہے، خواہ وہ قرون مظلمہ کی تاریکی میں وجود پذیر ہوا ہو یا بیسویں صدی کی روشنی میں۔

۱۸۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۵۱-۶۶

آگے مسلمانوں کو پہلے عام طور پر اور منافقین کو خاص طور پر آگاہ فرمایا کہ یہود و نصاریٰ کو اپنا معتمد اور دوست نہ بناؤ، جو لوگ ان کو اپنا معتمد اور دوست بنائیں گے وہ ادعائے ایمان کے باوجود انہی میں شامل ہوں گے اور ان کا حشر انہی کے ساتھ ہوگا۔ پھر ان منافقین کے باطن سے پردہ اٹھایا اور بتایا ہے کہ یہ کفر کی راہ میں جو سبقت کر رہے ہیں اس کے محرکات کیا ہیں اور بالآخر اس کا انجام کیا ہونا ہے۔ اس ضمن میں یہ بھی واضح فرما دیا کہ ان کی یہ روش ارتداد کی روش ہے اور اگر یہ ارتداد اختیار کرنا چاہتے ہیں تو کریں، خدا کو ان کی کوئی پروا نہیں ہے۔ اگر یہ مرتد ہو جائیں گے تو اللہ ان کی جگہ ایسے لوگوں کو لائے گا جو ایمان و اخلاص کے تمام اوصاف سے متصف ہوں گے، خدا ان سے محبت کرے گا، وہ خدا سے محبت کریں گے۔ وہ اللہ کی پارٹی بنیں گے اور یہی پارٹی بالآخر غالب ہوگی۔

اس کے بعد ان منافقین کو غیرت دلائی ہے کہ آخر تم ان لوگوں کو کس طرح اپنا دوست اور معتمد بناتے ہو جو علانیہ تمہارے دین کا مذاق اڑاتے اور اس کی تحقیر کرتے ہیں۔ پھر اہل کتاب کو ان کی ان شرارتوں پر سرزنش فرمائی اور ان کے اس انجام سے ان کو آگاہ فرمایا جس کے وہ اپنی بدبختیوں کے سبب سے سزاوار ٹھہرے۔ اسی ضمن میں ان کے علماء اور فقہا کو بھی سرزنش فرمائی کہ اگر وہ ان کو ان بلے ہودگیوں اور حرام خوریوں سے نہیں روکتے تو آخر وہ کس مرض کی دوا ہیں۔ آخر میں یہ واضح فرمایا کہ یہ تمام شرارتیں جو یہ دین حق کے خلاف کر رہے ہیں، اللہ ان میں سے کسی کو بھی کامیاب نہ ہونے دے گا بلکہ یہ ہر قدم پر

منہ کی کھائیں گے۔ بہتر ہو تا کہ یہ اچھی روش اختیار کرتے اور اللہ کے انعام کے سزاوار بنتے لیکن ان پر ان کی شامت مسلط ہو چکی ہے۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۵۱-۶۶

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۱﴾ فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَاۗىِٕرَةٌ ۭ فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰي مَآ اَسَرُّوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ ﴿۵۲﴾ وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَهٰٓؤُلَاۗءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ اِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ ۭ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۵۳﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَي الْكٰفِرِيْنَ ۡ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَاۗىِٕمٍ ۭ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۴﴾ اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۵۶﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ

اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَّلَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ
قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۵۷﴾
وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا ۭ ذٰلِكَ
بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ﴿۵۸﴾ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ
مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ ۙ
وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۵۹﴾ قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ
ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۭ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ
وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ ۭ
اُولٰۗىِٕكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ عَنْ سَوَاۗءِ السَّبِيْلِ ﴿۶۰﴾ وَاِذَا
جَاۗءُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَقَدْ دَّخَلُوْا بِالْكُفْرِ وَهُمْ قَدْ خَرَجُوْا
بِهٖ ۭ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا يَكْتُمُوْنَ ﴿۶۱﴾ وَتَرٰى كَثِيْرًا
مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِي الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۭ
لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۶۲﴾ لَوْلَا يَنْهٰىهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ
عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا
يَصْنَعُوْنَ ﴿۶۳﴾ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ ۭ غُلَّتْ
اَيْدِيْهِمْ وَلُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا ۘ بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ ۙ يُنْفِقُ كَيْفَ وقف لازم
يَشَاۗءُ ۭ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ
طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۭ وَاَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاۗءَ اِلٰى

يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۭ كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ ۙ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۶۴﴾ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۶۵﴾ وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ۭ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ۭ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَاۗءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۶۶﴾

ع ۹ ۱۰ ۱۳

ترجمۂ آیات ۵۱-۶۶

اے ایمان والو، تم یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست نہ بناؤ۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ اور تم میں سے جو ان کو اپنا دوست بنائے گا تو وہ انہی میں سے ہے۔ اللہ ظالموں کو راہ یاب نہیں کرے گا۔ تم ان لوگوں کو، جن کے دلوں میں روگ ہے، دیکھتے ہو کہ وہ ان کی طرف پینگیں بڑھا رہے ہیں، کہتے ہیں کہ ہمیں اندیشہ ہے کہ ہم کسی مصیبت میں نہ پھنس جائیں۔ تو بہت ممکن ہے کہ اللہ فتح یا اپنی طرف سے کوئی خاص بات دکھائے اور انھیں اس چیز پر جو یہ اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں، نادم ہونا پڑے۔ اور اس وقت اہل ایمان کہیں گے کہ کیا یہ وہی لوگ ہیں جو بڑے زور و شور سے اللہ کی قسمیں کھا کھا کر یقین دلاتے تھے کہ وہ تو تمہارے ساتھ ہیں۔ ان کے سارے اعمال ڈھے گئے اور وہ نامراد ہوئے۔ ۵۱-۵۳

اے ایمان والو، جو تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے گا، تو اللہ کو کوئی پروا نہیں، وہ جلد ایسے لوگوں کو اٹھائے گا جن سے وہ محبت کرے گا اور وہ اس سے محبت

کریں گے، وہ مسلمانوں کے لیے نرم مزاج اور کافروں کے مقابل میں سخت ہوں گے، اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پروا نہ کریں گے۔ یہ اللہ کا فضل ہے، وہ جس کو چاہے بخشے گا اور اللہ بڑی سمائی رکھنے والا اور علم والا ہے۔ ۵۴

تمھارے دوست اور معتمد تو بس اللہ، اس کا رسول اور وہ اہلِ ایمان ہیں جو نماز کا اہتمام کرتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں فروتنی کے ساتھ۔ اور جو اللہ، اس کے رسول اور اہلِ ایمان کو دوست بنائے ہیں تو وہ اللہ کی پارٹی ہیں اور اللہ ہی کی پارٹی ہے جو غالب رہنے والی ہے۔ ۵۵-۵۶

اے ایمان والو، ان لوگوں کو اپنا دوست نہ بناؤ جنھوں نے تمھارے دین کو مذاق اور کھیل بنا لیا ہے، ان لوگوں میں سے جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی، اور نہ کفار کو۔ اور اللہ سے ڈرو اگر تم مومن ہو اور جب تم نماز کے لیے منادی کرتے ہو تو یہ اس کو مذاق اور کھیل بنا لیتے ہیں، یہ اس وجہ سے کہ یہ ایسے لوگ ہیں جو عقل نہیں رکھتے۔ ان سے کہو کہ اے اہلِ کتاب، تم ہم پر بس اس بات کا غصہ نکال رہے ہو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر، اور اس چیز پر جو ہماری طرف بھیجی گئی اور اس چیز پر جو پہلے اتاری گئی اور تم میں اکثر نافرمان ہیں۔ کہو کیا میں تمھیں باعتبارِ انجام اللہ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ بُرے لوگوں کا پتہ دوں؟ یہ وہ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی، جن پر اس کا غضب ہوا اور جن کے اندر سے اس نے بندر اور سور بنائے اور جنھوں نے طاغوت کی پرستش کی۔ یہ ٹھکانے کے لحاظ سے بدتر اور اصل شاہراہ سے بعید تر ہیں۔ ۵۷-۶۰

اور جب یہ تمھارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تو ایمان لائے ہوئے ہیں حالانکہ وہ

کفر کے ساتھ داخل ہوتے ہیں اور اسی کے ساتھ نکلتے ہیں، اور اللہ خوب واقف ہے اس چیز سے جس کو وہ چھپا رہے ہیں۔ تم ان میں سے اکثر کو دیکھو گے کہ وہ حق تلفی، زیادتی اور حرام خوری کی راہ میں گرم رو ہیں۔ کیا ہی برا ہے جو کچھ یہ کر رہے ہیں۔ ان کے علما اور فقہا ان کو گناہ کی بات کہنے اور ان کو حرام کھانے سے روکتے کیوں نہیں؟ کتنی بری ہے یہ حرکت جو یہ کر رہے ہیں۔ ۶۱-۶۳

اور یہود کہتے ہیں کہ خدا کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ ہاتھ ان کے بندھ جائیں اور ان کی اس بات کے سبب سے ان پر لعنت ہو بلکہ اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں، وہ خرچ کرتا ہے جیسے چاہتا ہے۔ ان میں سے بہتوں کی سرکشی اور ان کے کفر کو وہ چیز بڑھا رہی ہے جو تیرے رب کی طرف سے تیری طرف اتاری گئی ہے اور ہم نے ان کے اندر دشمنی اور کینہ قیامت تک کے لیے ڈال دیا ہے۔ جب جب یہ لڑائی کی کوئی آگ بھڑکائیں گے اللہ اس کو بجھا دے گا۔ یہ زمین میں فساد برپا کرنے میں سرگرم ہیں اور اللہ فساد برپا کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ ۶۴

اور اگر اہل کتاب ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان سے ان کے گناہ جھاڑ دیتے اور ان کو نعمت کے باغوں میں داخل کرتے اور اگر وہ تورات اور انجیل اور اس چیز کو قائم کرتے جو ان کی طرف ان کے رب کی طرف سے اتاری گئی تو وہ اپنے اوپر سے اور اپنے قدموں کے نیچے سے خدا کا رزق و فضل پاتے۔ ان میں ایک راست رو جماعت بھی ہے لیکن زیادہ ان میں سے ایسے ہیں جن کے عمل بہت برے ہیں۔ ۶۵-۶۶

منافقین سے خطاب

یہود و نصاریٰ کے ساتھ ترکِ موالات کا حکم

یہود و نصاریٰ کے ساتھ معاملہ جماعتی حیثیت سے

۱۹۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (۵۱)

خطاب اگرچہ مسلمانوں سے عام ہے لیکن قرینہ دلیل ہے کہ روئے سخن ان منافقین ہی کی طرف ہے جن کا ذکر آیت ۴۱ سے چلا آ رہا ہے۔ اور جن کی صفت اَلَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ بیان ہوئی ہے۔ یہ لوگ، جیسا کہ ہم سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِيْنَ، کے تحت واضح کر چکے ہیں، یہود کے زیرِ اثر تھے، اور دعویٰ اگرچہ ایمان کا کرتے تھے لیکن عملاً یہود کی مقصد برآریوں میں ان کے آلۂ کار اور ان کے ایجنٹ تھے۔ ان کو یہ ہدایت کی جا رہی ہے کہ یہود و نصاریٰ کو اپنا معتمد اور کارساز نہ بناؤ۔ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ دوست بنانے کی یہ ممانعت مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ کی قید کے ساتھ وارد ہوئی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اسلام اور مسلمانوں کے مقابل میں ان کو دوست نہ بناؤ۔ اگر یہ موالات اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کے لیے ہو یا کم از کم یہ کہ اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کے خلاف نہ ہو تو اس کی ممانعت نہیں ہے۔

بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ، میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اس معاملے میں انفرادی مصالح اور انفرادی مراسم کو کوئی وزن نہیں دینا چاہیے، ہو سکتا ہے کہ کوئی مسلمان یہود و نصاریٰ میں سے کسی فرد یا گروہ کو اچھا سمجھے یا اس کے ساتھ اس کی کوئی ضرورت وابستہ ہو یا سابق رشتہ داری ہو اور اس چیز کو وہ ان کے ساتھ ربط و ضبط قائم رکھنے کے لیے عذر بنائے لیکن یہ چیز صحیح نہیں ہے۔ وہ اسلام اور مسلمانوں کو اپنے لیے ایک مشترک خطرہ سمجھتے ہیں اور اس خطرہ سے نمٹنے کے لیے باہم ایک دوسرے کے دوست اور معاون ہیں، اس لیے مسلمانوں کا رویہ ان کے ساتھ انفرادی بنیاد پر نہیں بلکہ جماعتی بنیاد پر ہونا چاہیئے۔ جس طرح وہ مسلمانوں کے خلاف بحیثیت جماعت ملّتِ واحدہ ہیں اسی طرح مسلمان ان کے مقابل میں ملّتِ واحدہ بنیں، ملّت سے الگ ہو کر مسلمانوں کا کوئی گروہ ان کے کسی گروہ کے ساتھ اپنے ذاتی اغراض و مصالح یا ذاتی تعلقات و مراسم کی بنا پر اعتماد و دوستی کا ربط و ضبط نہ بڑھائے۔

وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ، یعنی جو جماعت سے الگ ہو کر ان کو اپنا دوست اور معتمد بنائے گا، اس کا شمار انہی میں ہوگا۔ اس کا دعوائے اسلام بالکل بے حقیقت ہو کر رہ جائے گا۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ، ہدایت سے یہاں مراد، جیسا کہ دوسرے مقام میں ہم واضح کر چکے ہیں، منزلِ مقصود کی طرف ہدایت ہے اور ظالمین، سے مراد اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہیں۔ یعنی جو لوگ اسلام اور اہلِ ایمان کے مقابل میں ایمان و اسلام کے دشمنوں کو اپنا دوست و معتمد بنائیں گے وہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہیں اور ایسے لوگ راہ یاب نہیں ہوں گے اس لیے کہ انھوں نے

سَوَآءَ السَّبِيْلِ پر چلنے والے قافلے کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔

فَتَرَى الَّذِيْنَ فِىْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ ۚ فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِىَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَآ اَسَرُّوْا فِىْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ ۝ وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ اِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ ۭ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ (۵۲-۵۳)

منافقین کے مسلمانوں کا چور

'فَتَرَى الَّذِيْنَ فِىْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ' 'ف' یہاں تفصیل کے لیے ہے اور خطاب، عام مسلمانوں سے ہے۔ اوپر کی آیت میں جو بات اجمال کے ساتھ فرمائی گئی تھی اور پردے میں تھی اب پردہ اٹھا کر اس کی تفصیل فرمائی جا رہی ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جو ان سے پینگیں بڑھا رہے ہیں، ان کا مدعا کیا ہے اور بالآخران کا انجام کیا ہونا ہے۔ فرمایا کہ جن کے دلوں میں مرض ہے وہ ان کے ساتھ دوستی گانٹھنے کے لیے بے قرار ہیں 'مرض' کے لفظ پر سورۂ بقرہ کی تفسیر میں بحث گزر چکی ہے۔ یہاں اس سے مراد قرینہ دلیل ہے کہ نفاق ہے۔ نفاق کے لیے مرض کا لفظ استعمال کر کے قرآن نے یہ واضح فرما دیا کہ ان لوگوں کی یہ حرکت دل کی بیماری اور اس کے فساد کا نتیجہ ہے۔ اگرچہ یہ اس کو اپنی بڑی دانش مندی اور پیش بینی سمجھتے ہیں۔

'يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ' 'قول' کا لفظ جی میں کوئی بات کہنے کے لیے بھی قرآن میں متعدد مقامات میں استعمال ہوا ہے۔ قرآن نے آگے اس کو کھول بھی دیا ہے اس لیے کہ فرمایا ہے 'فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَآ اَسَرُّوْا فِىْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ' (یعنی وہ جو کچھ اپنے دل میں چھپائے ہوئے ہیں اس پر نادم ہوں گے) ظاہر ہے کہ یہ اشارہ اسی بات کی طرف ہے جس کا ذکر 'نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ' کے الفاظ سے ہوا ہے۔ 'دائرۃ' کے معنی گردش، آفت اور مصیبت کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان منافقین کے دل میں یہ ڈر سمایا ہوا ہے کہ اس وقت مسلمانوں اور ان کے مخالفین میں جو کشمکش برپا ہے معلوم نہیں یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے، ہو سکتا ہے کہ بالآخر فتح مخالفین ہی کی ہو۔ ایسی صورت میں اگر ہم مسلمانوں ہی کے ہو کے رہ گئے تو سخت مصیبت میں پھنس جائیں گے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ دونوں سے راہ و رسم باقی رکھنے کی کوشش کی جائے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ جس زمانے میں یہ آیات نازل ہوئی ہیں، اس زمانے تک، جیسا کہ ہم پیچھے ذکر کر آئے ہیں، مسلمان اگرچہ ایک سیاسی طاقت بن چکے تھے لیکن ابھی ان کو مکمل اقتدار حاصل نہیں ہوا تھا، اپنے اپنے دائروں میں یہود اور قریش بھی با اقتدار تھے، اگرچہ یہ اقتدار رُو بہ زوال تھا لیکن منافقین کا قلبی رشتہ چونکہ ان مخالف اسلام طاقتوں ہی کے ساتھ تھا اس وجہ سے وہ آسانی کے ساتھ یہ باور کرنے کے لیے تیار نہیں تھے کہ اسلام کے مقابل میں اب ان کے ٹک سکنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔

'فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِىَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَآ اَسَرُّوْا فِىْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ' 'عسٰی' اگرچہ اصلاً امکان غالب اور ظن غالب ہی کے اظہار کے لیے آتا ہے لیکن موقع دلیل ہو تو، جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں اشارہ کر چکے ہیں، یہ وعدے کی تعبیر کے لیے بھی ایک لطیف اسلوب ہے۔ یہاں یہ اسی

مفہوم میں ہے۔ 'بالفتح' سے مراد وہ آخری اور مکمل فتح ہے، جس کے بعد دشمن کی قوت بالکلیہ ختم ہو جائے۔ 'اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِہٖ' سے ایسی کوئی صورت مراد ہے جس سے منافقین کا سارا بھانڈا پھوٹ جائے اور ان کے لیے کہیں منہ چھپانے کی جگہ باقی نہ رہ جائے۔ سورۂ توبہ میں اس کی ایک شکل یہ بیان ہوئی ہے۔ یَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَیْھِمْ سُوْرَۃٌ تُنَبِّئُھُمْ بِمَا فِیْ قُلُوْبِھِمْ قُلِ اسْتَھْزِءُوْا اِنَّ اللّٰہَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ ۶۴۔ توبہ (منافقین ڈرتے ہیں کہ کہیں ان کے باب میں کوئی ایسی سورہ نہ نازل ہو جائے جو ان کے دلوں کے سارے راز ان پر آشکارا کر دے، کہہ دو، مذاق کر لو، اللہ ظاہر کرنے والا ہے جس کا تم اندیشہ رکھتے ہو)

'فَیُصْبِحُوْا عَلٰی مَآ اَسَرُّوْا فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ نٰدِمِیْنَ' میں ان کے اسی خیال کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر اوپر گزرا کہ یہ اسلام کی طرف یکسو ہو جانے میں اپنے مستقبل کی طرف سے اندیشہ ناک ہیں کہ اگر فتح یہود اور مشرکین کی ہوئی تو یہ مصیبت میں پھنس جائیں گے۔

'وَیَقُوْلُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا الاٰیۃ' یہ مسلمانوں کی طرف سے ان منافقین کے حال پر اس وقت کا اظہارِ تعجب نقل ہوا ہے جب ان کا سارا راز فاش ہو جائے گا، اس وقت مسلمان آپس میں کہیں گے، ارے، کیا یہی وہ لوگ ہیں جو بڑے زور و شور سے قسمیں کھا کھا کر ہمیں یقین دلاتے تھے کہ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں! مقصود اس صورت حال کی تصویر سے منافقین کو جھنجھوڑنا ہے کہ کب تک چھپنے اور چھپانے کی کوشش کرو گے، بالآخر ایک دن برسرِ عام رسوائی ہوتی ہے۔

'حَبِطَتْ اَعْمَالُھُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِیْنَ' مسلمانوں کے قول کا ایک حصہ بھی ہو سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان منافقین کے انجام کا بیان بھی۔ ہمارا رجحان اس دوسرے پہلو کی طرف ہے 'حبط عمل' کی حقیقت پر ہم دوسری جگہ بحث کر چکے ہیں۔ اعمال کے مثمر ہونے کا انحصار تمام تر ایمان و اخلاص پر ہے۔ نفاق کے ساتھ دینداری کی جو نمائش کی جاتی ہے وہ محض نمائش ہوتی ہے، حقیقت کی میزان میں اس کا کوئی وزن نہیں ہوتا۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْکُمْ عَنْ دِیْنِہٖ فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰہُ بِقَوْمٍ یُّحِبُّھُمْ وَ یُحِبُّوْنَہٗٓ اَذِلَّۃٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّۃٍ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ یُجَاھِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلَا یَخَافُوْنَ لَوْمَۃَ لَآئِمٍ ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ (۵۴)

منافقین کی روش ارتداد کی روش ہے

خطاب بظاہر عام مسلمانوں سے ہے لیکن روئے سخن ان منافقین ہی کی طرف ہے جن کا ذکر چلا آ رہا ہے۔ فرمایا کہ تم میں سے جو اپنے دین سے پھر جائے گا تو اللہ اپنے دین کی خدمت کے لیے ایسے ایسے لوگوں کو کھڑا کرے گا جو ...... اس سے یہ حقیقت آپ سے آپ ظاہر ہو گئی کہ ان کی یہ روش دین سے ارتداد کی روش ہے۔ اگر اس تنبیہ کے بعد بھی اس سے باز نہیں آنا چاہتے تو جائیں مرتد ہو جائیں، خدا کو ان کی کوئی پروا نہیں۔ اس طرح کے جملوں میں عربیت کے عام قاعدے کے مطابق جوابِ شرط محذوف ہوتا ہے جو سیاقِ کلام

سے واضح ہوتا ہے۔ ہم نے ترجمے میں اس محذوف کو کھول دیا ہے۔

منافقین کے سامنے ایک آئینہ — دین کے علم برداروں کی پسندیدہ صفات

فَسَوْفَ يَأْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ان صفات کے بیان سے مقصود ایک تو یہ ظاہر کرنا ہے کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ زمین میں اپنے دین کا گواہ اور علم بردار بنا کر کھڑا کرتا ہے ان کی صفات کیا ہوتی ہیں یا کیا ہونی چاہئیں۔ دوسرا یہ کہ یہ منافقین ان صفات کے بالکل برعکس صفات کے حامل ہیں۔ گویا براہِ راست ان کے عیوب گنانے کے بجائے ان کے سامنے ایک ایسا آئینہ رکھ دیا گیا ہے جس میں وہ اپنے سارے عیوب خود دیکھ سکتے ہیں۔ یہ اظہارِ حقیقت کا ایک نہایت بلیغ اسلوب ہے جو قرآن میں بہت استعمال ہوا ہے۔

يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ (ان سے خدا محبت کرے گا اور وہ خدا سے محبت کریں گے) اس سے یہ بات خود بخود واضح ہو گئی کہ ان منافقین سے نہ خدا محبت کرتا نہ یہ خدا سے محبت کرتے بلکہ خدا ان سے نفرت کرتا ہے اور یہ خدا سے بیزار و بے پروا ہیں۔ خدا کی محبت کسی کے نام و نسب، شکل و صورت اور مال و جاہ سے نہیں بلکہ ایمان و عمل اور اخلاق و کردار سے ہوتی ہے۔ جب اس اعتبار سے یہ نہ صرف صفر بلکہ خدا کی پسندیدہ صفات کے بالکل برعکس صفات سے متصف ہیں تو یہ خدا کی محبت کے حقدار کیسے ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح خدا سے محبت کی شہادت یہ ہے کہ یہ خدا کے احکام و ہدایات اور اس کے نبی کے طریقہ اور فیصلہ کے پابند ہوں لیکن جب یہ اللہ کے فیصلہ کو چھوڑ کر جاہلیت کے فیصلہ کے طالب اور اللہ و رسول اور اہلِ ایمان کو دوست بنانے کے بجائے اللہ و رسول کے مخالفین یہود و نصاریٰ اور کفار سے دوستی کی پینگیں بڑھاتے ہیں تو خدا سے بیزار ہونے کی اس سے بڑی شہادت کیا ہو سکتی ہے۔ اس مسئلہ پر آل عمران آیت ۳۱ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ، اَذِلَّة، ذَلِيْل کی جمع ہے۔ عربی میں یہ لفظ، جیسا کہ آل عمران کی آیت ۱۲۳ کے تحت ہم بتا چکے ہیں، اچھے اور بُرے دونوں معنوں میں آتا ہے۔ جب یہ اچھے معنوں میں آتا ہے، جیسا کہ یہاں ہے تو اس کے معنی نرم خو، نرم مزاج، فرمانبردار، متواضع اور سہل الانقیاد کے ہوتے ہیں۔ 'ذَلُوْل' کا لفظ بھی اسی معنی میں آتا ہے۔ فرمانبردار اونٹنی کو 'ناقة ذلول' کہتے ہیں۔

اَعِزَّة 'عزیز' کی جمع ہے۔ یہ لفظ بالکل 'ذلیل' کے مقابل لفظ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے معنی ہیں سخت، مشکل، بھاری، ناقابلِ شکست، ناقابلِ عبور، عسیر الانقیاد۔ اگر کسی چیز کے متعلق کہیں کہ هُوَ عَزِيْزٌ عَلَيَّ تو اس کے معنی ہوں گے کہ وہ چیز مجھ پر بھاری اور مشکل ہے۔ اس کو رام کرنا اور قابو میں کرنا میرے لیے دشوار ہے۔ یہی مفہوم شَدِيْدٌ عَلَيَّ کا بھی ہوتا ہے کسی حماسی کا نہایت عمدہ شعر ہے۔

اذا المرء اعيته المروة ناشئا　　　فمطلبها كهلا عليه شديد

اگر اٹھتی جوانی میں اولوالعزمی پیدا کرنے سے آدمی قاصر رہ جاتا ہے تو ادھیڑ پن میں اس کا حاصل

کرنا نہایت دشوار ہو جاتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے تو وہ نہایت نرم خو، بھولے بھالے اور ہر پہلو سے لچک قبول کرنے والے اور ہر سانچے میں ڈھل جانے والے ہوں گے لیکن کافروں کے لیے وہ پتھر کی چٹان ہوں گے۔ وہ اگر اپنے اغراض و مقاصد کے لیے ان کو استعمال کرنا چاہیں گے تو کہیں سے انگلی دھنسانے کی جگہ نہ پا سکیں گے۔ مسلمانوں کی یہی تعریف ایک حدیث میں بھی وارد ہے۔ المومن غر کریم مومن اپنے دوسرے بھائی کے لیے بھولا بھالا اور شریف و کریم ہوتا ہے۔ سیدنا مسیح نے اپنے شاگردوں کو ہدایت فرمائی تھی کہ کبوتر کے مانند بے آزار اور سانپ کے مانند ہوشیار رہو، اس میں بھی یہی دونوں پہلو ملحوظ ہیں۔

ان صفات کے بیان سے بھی مقصود، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، منافقین کے کردار پر عکس ڈالنا ہے جو بالکل اس کے برعکس واقع ہوا تھا یعنی وہ مسلمانوں کو دھوکا دینے کے لیے تو بڑے ہوشیار اور گھاگھ تھے، مٹھے پر ہاتھ نہیں رکھنے دیتے تھے لیکن یہود اور مشرکین کے ہاتھوں میں موم کی ناک اور کٹھ پتلی تھے، وہ جس طرف چاہتے ان کو موڑتے اور جس طرح چاہتے ان کو نچاتے۔ اس مضمون پر تفصیلی بحث انشاء اللہ سورۂ فتح کی آیت مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو ان کے ساتھ ہیں وہ کفار کے مقابل میں سخت اور آپس میں مہربان و نرم دل ہیں) کے تحت آئے گی۔

'يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ' جہاد سے مطلب یہاں صرف قتال ہی نہیں ہے بلکہ ہر وہ جدوجہد ہے جو اللہ کا کلمہ بلند کرنے اور اس کے دین کو قائم کرنے کے لیے کی جائے۔ اس میدان میں اترنے کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ آدمی اپنے تمام دوسرے مفادات اور دوسری دلچسپیوں سے منہ موڑ کر اور دوسروں کی نصیحتوں اور ملامتوں سے کان بالکل بند کر کے اترے۔ جو شخص ہر گام پر پیچھے مڑ مڑ کے بھی دیکھے گا اور اپنے ناصحوں اور ملامت گروں کی نصیحتوں اور ملامتوں کو بھی اہمیت دے گا وہ اگر ایک قدم آگے بڑھائے گا تو دو قدم پیچھے ہٹائے گا۔ عرب شعراء جب اولوالعزمی، بہادری اور فیاضی کا مضمون باندھتے ہیں تو اس کی تمہید میں ملامت کرنے والیوں کی ملامت کا ذکر ضرور کرتے ہیں اس لیے کہ اس راہ کی یہ سب سے پرانی اور ناگزیر آفت ہے۔ ممکن نہیں ہے کہ آدمی کوئی عزم و جزم کا کام کرنے اٹھے اور دہنے بائیں سے کچھ ناصح اور کچھ ملامت گر دامن گیر نہ ہو جائیں۔ یہ اس راہ کی پہلی آزمائش ہوتی ہے اگر کوئی آدمی دامن جھٹک کے آگے بڑھنے کا حوصلہ نہ رکھتا ہو تو اکثر وہ اس پہلے ہی مرحلے میں مار کھا جاتا ہے۔

اس صفت کے بیان کرنے سے بھی مقصود منافقین کے کردار پر عکس ڈالنا ہے کہ مدعی تو یہ بنے ہیں ایمان کے اور قدم رکھا ہے انھوں نے عشق کے کوچے میں لیکن پیچھے کے مفادات بھی دامن گیر ہیں۔ مستقبل کے خطرات سے بھی ہوش اڑے جا رہے ہیں اور پوری فراخدلی اور نیازمندی کے ساتھ ان ہمدردوں اور

ملامت گروں کی نصیحتوں کا احترام بھی انھیں ملحوظ ہے جن کے پھندوں میں گرہ شیطان نے لگائی ہے اور جن سے بچ کے نکل جانا بڑے ہی صاحب توفیق کا کام ہے۔

ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ۔ یعنی اللہ کا اصل فضل یہ ہے جس کے سزاوار وہ بنتے ہیں جن کو وہ چاہتا ہے۔ "جن کو وہ چاہتا ہے" سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ کی ٹھہرائی ہوئی سنت کے مطابق اس کے اہل ٹھہرتے ہیں۔ یہ بات ہم ایک سے زیادہ مقامات میں واضح کر چکے ہیں کہ خدا کی مشیت اس کی کامل قدرت اور اس کے کامل علم و حکمت کے ساتھ ہے اور جہاں مشیت کامل قدرت اور کامل علم و حکمت کے ساتھ ہو وہاں کسی حق تلفی و ناانصافی کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ مشیت کے بیان کے ساتھ وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ کی صفات کا حوالہ دینے سے مقصود اسی حقیقت کا اظہار ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ

یہاں ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ آخر اس وقت مسلمانوں کے اندر ان صفات کے حامل بھی تو موجود تھے بلکہ اکثریت ان صفات کے حاملین ہی کی تھی تو قرآن نے یہ کیوں کہا کہ "خدا ایسے لوگوں کو لائے گا" ان لوگوں کا حوالہ کیوں نہ دیا جو موجود تھے اور ان صفات کے بہترین حامل تھے۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ان آیات میں خطاب اگرچہ الفاظ کے اعتبار سے عام ہے لیکن روئے سخن اصلاً منافقین ہی کی طرف ہے۔ ان سے یہ کہا جا رہا ہے کہ اگر تم مرتد ہو گئے تو خدا کا اس سے کچھ نہیں بگڑے گا، خدا تمھاری جگہ اپنے دوسرے بندوں کو کھڑا کرے گا جو ایمان کے تقاضے پورے کرنے کے لیے تمام اعلیٰ صفات سے متصف ہوں گے۔ گویا یہ فرما کر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین مخلصین کے اس غم کو دور کیا گیا ہے جس کا ذکر اوپر لَا یَحْزُنْکَ الَّذِیْنَ یُسَارِعُوْنَ فِی الْکُفْرِ والی آیت میں ہوا ہے کہ پیغمبر اور اہل ایمان ان منافقین کی کفر دوستی سے غمگین نہ ہوں، اگر یہ نکل گئے تو ان کے نکل جانے سے اللہ کے دین کا کچھ نہیں بگڑے گا، ان کی جگہ اللہ اپنے دین کی خدمت کے لیے دوسری تازہ دم فوج لے آئے گا جو ان تمام کمزوریوں اور بیماریوں سے پاک ہوگی جو ان کے اندر موجود ہیں۔

اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوا الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَھُمْ رٰکِعُوْنَ ۝ وَمَنْ یَّتَوَلَّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الْغٰلِبُوْنَ (۵۵-۵۶)

آیت ۵۱ میں جو بات منفی اسلوب سے فرمائی گئی تھی وہی بات اب مثبت پہلو سے کہی جا رہی ہے۔ یعنی یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست اور معتمد نہ بناؤ بلکہ اللہ، اس کے رسول اور اہل ایمان کو اپنا دوست اور معتمد بناؤ۔ تمھارا ایمان (اگر وہ موجود ہے) تم کو ان سے جوڑتا ہے نہ کہ اُن سے۔ 'وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا' یہاں اپنے حقیقی مفہوم میں ہے۔ یعنی مومنین مخلصین۔

ایمان کی عملی تعبیر نماز اور زکوٰۃ ہے

'اَلَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَھُمْ رٰکِعُوْنَ'، یہ 'اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا' سے بدل ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ ایمان کی عملی تعبیر اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ ہے۔ عطف کے بجائے بدلیت

کے اسلوب سے اس کو تعبیر کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ حکمت شریعت کے پہلو سے ایمان اور نماز و زکوٰۃ میں کوئی فاصلہ نہیں ہے۔ دونوں بالکل لازم و ملزوم ہیں۔ جہاں ایمان موجود ہے نماز اور زکوٰۃ لازماً موجود ہوں گی۔ اگر یہ غائب ہیں تو یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ ایمان بھی غائب ہے۔ اگر اس کا دعویٰ ہے تو یہ محض دعویٰ ہے جس کا حقیقت کی میزان میں کوئی وزن نہیں ہے۔

نماز اور زکوٰۃ کی اصلی روح

وَهُمْ رٰكِعُوْنَ، 'رکوع' یہاں اپنے اصطلاحی مفہوم میں نہیں بلکہ اپنے عام لغوی مفہوم میں ہے۔ رَكَعَ الرجلُ کے معنی ہوتے ہیں 'افتقر وانحطت حالہ' اس وجہ سے فروتنی، افتقار، نیازمندی، عاجزی اور دل شکستگی اس لفظ کی اصل روح ہے۔ نماز میں رکوع، درحقیقت آدمی کے دل کی اسی حالت کی تعبیر کی ایک عملی شکل ہے۔ یہاں اس قید کے لگانے سے مقصود نماز اور زکوٰۃ کی اصل روح کی طرف اشارہ کرنا ہے اس لیے کہ جس طرح نماز اور زکوٰۃ کے بغیر ایمان بے معنی اور بے روح ہو کے رہ جاتا ہے اسی طرح دل کی فروتنی اور خشگی کے بغیر نماز اور زکوٰۃ بالکل بے مقصد ہو کے رہ جاتے ہیں۔ اسلام کے دورِ اوّل میں منافقین کو نماز بھی پڑھنی پڑتی تھی اور زکوٰۃ بھی ادا کرنی ہوتی تھی۔ اس کے بغیر اس عہدِ مبارک میں کوئی شخص اپنے آپ کو مسلمانوں میں شمار کرا ہی نہیں سکتا تھا لیکن سورۂ نساء میں تفصیل کے ساتھ بیان ہو چکا ہے کہ ان کی نمازیں مارے باندھے کی ہوتی تھیں، قرآن میں ان کے لیے 'کسالیٰ' کا لفظ آیا ہے، اسی طرح ان کا انفاق محض نمائش کے لیے ہوتا تھا۔ 'وَهُمْ رٰكِعُوْنَ' کی قید نے یہ واضح کیا کہ دین میں جو نماز و زکوٰۃ مطلوب ہے وہ دل کی خشگی اور فروتنی کے ساتھ مطلوب ہے، ریا، تکبّر اور کراہت کے ساتھ نہیں۔

'حزب اللہ' سے مراد

'وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ' میں ایجازِ کلام کے تقاضے سے ایک ٹکڑا محذوف ہے۔ پوری بات گویا یوں ہے کہ جو اللہ اور اس کے رسول اور اہلِ ایمان کو اپنا دوست بناتے ہیں وہ اللہ کی جماعت ہیں اور اللہ ہی کی جماعت ہے جو غالب ہونے والی ہے۔ چونکہ آخر کا ٹکڑا خود محذوف پر دلیل تھا اس وجہ سے پہلے کو حذف کر دیا۔ اوپر فرمایا تھا کہ جو لوگ یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست بنا رہے ہیں وہ ایک دن اپنے کیے پر پچھتائیں گے، ان کے اعمال ڈھے جائیں گے وہ نامراد ہوں گے۔ اب یہ اللہ و رسول اور اہلِ ایمان کو دوست بنانے والوں کے روشن انجام کو واضح فرما دیا اور ان کو 'حزب اللہ' کے لقب سے ملقب کر کے یہ اشارہ بھی فرما دیا کہ یہ منافقین جو یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست بنا رہے ہیں یہ حزب الشیطان ہیں اور شیطان کا کید چونکہ ضعیف اور بودا ہوتا ہے اس وجہ سے ان کی ناکامی و نامرادی ان کی تعبیر ہی کے اندر مضمر ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَّلَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ (۵۷-۵۸)

دین کا مذاق اڑانے والوں سے دوستی غیرت و حمیت کے خلاف ہے

اب یہ ان کے جذبۂ غیرت و حمیت کو ابھارا ہے کہ جو اہلِ کتاب اور کفار تمہارے دین کا مذاق اڑاتے اور تمہارے شعائرِ دین کو کھیل تماشہ بناتے ہیں حیف ہے اگر تم ان کو اپنا دوست بناؤ۔ انسان کی فطرت ہے کہ جو چیز اس کی طرف منسوب ہو یا جس کی طرف وہ منسوب ہو اس کی توہین و تذلیل وہ برداشت نہیں کرتا، اگر کوئی اس کو گوارا کر لے تو یہ اس کی بے حمیتی کی دلیل ہے۔ عرب کے لوگ اس معاملے میں بڑے حساس تھے۔ دین تو بڑی چیز ہے وہ اپنے خاندان یا اس کے کسی فرد کی توہین و تذلیل پر بھی آگ بگولہ ہو جاتے اور تلواریں سونت لیتے۔ اس انسانی فطرت کے پہلو سے قرآن نے ان کو ملامت کی ہے کہ جو لوگ تمہارے دین کا مذاق اڑاتے ہیں آخر کس دل و جگر سے تم ان کو دوست بناتے ہو۔ اس کے بعد نہایت سخت الفاظ میں تنبیہ فرمائی کہ اللہ سے ڈرو اگر تم مومن ہو، یعنی اگر تم سچ مچ ایمان کا دعویٰ رکھتے ہو تو خدا سے ڈرو کہ اس بے حمیتی پر تمہارا ایمان نہ سلب ہو جائے اور خدا کا غضب نہ نازل ہو جائے۔

وَاِذَا نَادَیۡتُمۡ اِلَی الصَّلٰوۃِ الایۃ۔ ذکر ہے اس چیز کا جس کا یہ مذاق اڑاتے ہیں۔ اشارہ اذان کی طرف ہے۔ یہودی اشرار جس طرح مجلسِ نبوی میں مختلف قسم کی بدتمیزیاں کرتے تھے جن کا ذکر اوپر گزر چکا ہے اسی طرح ان کے اراذل و انفار اذان کی بھی بھونڈے طریقے پر نقلیں کرتے اور اس پر ہنستے ہنساتے۔ اذان، اللہ کی بندگی کی دعوت ہے۔ اس کا مذاق اڑانا بالخصوص ان لوگوں کی طرف سے جو کتابِ الٰہی کے حامل بنائے گئے ہوں، خود خدا کی تحقیر اور اس کا مذاق اڑانے کے ہم معنی ہے۔ ایسے لوگ ہرگز اس لائق نہیں ہیں کہ کوئی مسلمان ان سے دوستی رکھے، اگر کوئی شخص ان سے دوستی رکھتا ہے اور ایمان کا مدعی بھی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ غیرتِ ایمانی سے خالی ہے اور غیرتِ ایمانی سے خالی شخص اپنے ایمان کی کبھی حفاظت نہ کر سکے گا۔ ذٰلِکَ بِاَنَّهُمۡ قَوۡمٌ لَّا یَعۡقِلُوۡنَ سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ نیکی اور بھلائی کا احترام انسان کے ذی عقل ہستی ہونے کا تقاضا ہے۔ اگر کوئی شخص اس سے محروم ہے تو وہ صرف دینداری ہی سے محروم نہیں ہے بلکہ عقل سے بھی محروم ہے۔

اذان شعائرِ الٰہی میں سے ہے

اس آیت سے اذان کے عظیم شعائرِ الٰہی میں سے ہونے کا بھی ثبوت ملتا ہے۔ اذان کا آغاز ملت میں کس طرح ہوا؟ اس سوال کے جواب میں، بربنائے اختلافِ روایات، اختلاف کی گنجائش ہو سکتی ہے۔ لیکن اس امر میں اختلاف کی گنجائش نہیں ہے کہ جس شکل میں وہ موجود ہے اس کو امت کے تواترِ قولی و عملی کے ساتھ اللہ اور اس کی کتاب کی تصدیق و تصویب بھی حاصل ہے۔ اس وجہ سے اس کو کسی اور شکل میں بدلنے کی کوشش دین میں ایک بہت بڑی جسارت ہے۔ شعائر کا معاملہ دین میں بڑا اہم ہے۔ بقرہ کی تفسیر میں ہم اس پر بحث کر چکے ہیں۔ خاص اذان کے مسئلہ پر انشاء اللہ

سورۂ جمعہ کی تفسیر میں ہم مزید بحث کریں گے۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ ۝ قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۭ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ ۭ اُولٰۗىِٕكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ عَنْ سَوَاۗءِ السَّبِيْلِ (۵۹۔۶۰)

'نقم' کے معنی انتقام لینے، بدلہ لینے اور کسی پر غصہ نکالنے کے ہیں۔

یہود کی ناز خائی — اوپر یہود کی جو شرارت بیان ہوئی ہے اس کے تعلق سے اب کلام کا رخ یہود کی طرف مڑ گیا۔ ان کو مسلمانوں کی طرف سے کہلوایا جا رہا ہے کہ ہمارے ساتھ تمہاری اس ساری دشمنی اور نزاع کی علت اس کے سوا کچھ سمجھ میں نہیں آتی کہ ہماری نیکی تمہارے نزدیک بدی بن گئی ہے۔ آخر ہمارا کیا جرم ہے؟ یہی نا کہ ہم اللہ پر ایمان لائے، اس کتاب پر ایمان لائے جو ہماری طرف اتاری گئی اور ان کتابوں پر بھی ایمان لائے جو پہلے اتاری گئیں، برعکس اس کے تمہارا حال یہ ہے کہ تم میں سے اکثر فاسق ہیں، نہ اس کتاب ہی پر ایمان رکھتے ہو جو تمہاری طرف اتاری گئی اور نہ اس کتاب ہی پر ایمان لانے کے لیے تیار ہو جو ہم کو عطا ہوئی! فرمایا کہ ان سے کہو کہ تمہارے نزدیک تو اس دنیا میں ہم سب سے برے ہیں اور اس کے سبب سے تم ہمارے دیے آزار و انتقام ہو لیکن کچھ پتہ ہے کہ آخرت میں اللہ کے نزدیک اپنے انجام کے لحاظ سے سب سے برا کون ہے؟ یہ وہ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی، جن پر اللہ کا غضب ہوا اور جن کے اندر سے اس نے بندر اور خنزیر بنائے اور جنھوں نے طاغوت کی پرستش کی — یہ ٹھکانے کے لحاظ سے سب سے برے اور شاہراہِ حق سے بعید تر ہیں۔

'مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ' میں ہمارے نزدیک مضاف محذوف ہے جس طرح 'وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ' میں ہے۔ یعنی مَثُوْبَةُ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ۔

انسانوں کے لباس میں بندر اور سؤر — 'اَلْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ'، اصحاب السبت کی لعنت کے سلسلہ میں 'قِرَدَةً' پر بحث گزر چکی ہے۔ انسان کی خواہش اور اس کے عمل کے درمیان سے جب عقل و ارادہ کی کڑی غائب ہو جائے اور وہ یکسر اپنی خواہشوں کا غلام بن کے رہ جائے تو پھر اس کے اور حیوانات کے درمیان کوئی جوہری فرق باقی نہیں رہ جاتا۔ یہ چیز اس کے باطن کو بالکل مسخ کر دیتی ہے اور باطن کے مسخ ہو جانے کے بعد ظاہر بھی بالتدریج مسخ ہو کے رہتا ہے۔ جو نگاہیں حقیقت بین ہوتی ہیں وہ سیرت کا عکس صورت میں بھی دیکھ لیتی ہیں اگرچہ اس کو غازہ اور پوڈر سے کتنا ہی چھپانے کی کوشش کی جائے۔ انسان اپنی مادی خلقت کے اعتبار سے گوشت پوست سے بنا ہوا ایک حیوان ہی ہے۔ بعض حیوان دو ٹانگوں پر چلتے ہیں، بعض چار پر، انسان کو انسانیت کا جمال اس شعلۂ نورانی سے حاصل ہوتا ہے جس کو قرآن نے 'نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ' سے تعبیر کیا ہے۔ اگر یہ شعلۂ یزدانی بجھ جائے تو پھر انسان کو بھی دو ٹانگوں پر چلنے والا ایک جانور سمجھیے

جو اپنی سرشت کے اعتبار سے بندر اور خنزیر بھی ہو سکتا ہے، کتا اور گدھا بھی۔ چنانچہ یہود کی مثال قرآن میں کتے اور گدھے سے بھی دی گئی ہے۔ اس معاملے میں نگاہ اور نگاہ کے درمیان بھی بڑا فرق ہوتا ہے۔ جن نگاہوں کی رسائی صرف صورت اور لباس ہی تک ہے ان کے لیے آدمی اور غیر آدمی میں فرق کرنا ناممکن ہے لیکن جو نگاہیں باطن میں گھسنے کی عادی ہیں وہ بادنیٰ تامل اندازہ کر لیتی ہیں کہ فلاں صورت کے اندر بندر چھپا ہوا ہے یا خنزیر، کتا چھپا ہوا ہے یا گدھا۔ انبیاء اور عارفین کے ملکوتی مشاہدات میں ایسی بہت سی چیزیں ملتی ہیں جن سے اُس بات کی تائید ہوتی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔ اگر طوالت کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہم بعض مثالیں یہاں پیش کرتے۔

'وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ' کا عطف اوپر 'مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ' الآیۃ پر ہے اور یہ اشارہ ہم کر چکے ہیں کہ 'مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ' کا مضاف محذوف ہے یعنی مَثُوْبَةً مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ اس وجہ سے یہاں بھی مضاف محذوف ہوگا یعنی مثوبۃ من عبد الطاغوت مطلب یہ ہوگا کہ جنھوں نے طاغوت کی پرستش کی وہ اپنے انجام کے لحاظ سے بدتر ہوں گے۔ یہاں سزا کے بجائے مجرم کا ذکر اس کی خاص اہمیت کی وجہ سے ہے فرمایا کہ جنھوں نے اہل کتاب ہو کر طاغوت کی پرستش کی ہے وہ اپنے انجام کی فکر کریں، ہم پر دانت پیسنے سے کیا حاصل۔

'اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ' اس میں پہلا ٹکڑا آخرت میں ان کے انجام کو ظاہر کر رہا ہے اور دوسرا ٹکڑا اس دنیا میں ان کی روش کو۔ گویا دوسرا ٹکڑا پہلے ٹکڑے کی دلیل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ دین کی شاہراہ سے بعید تر ہیں اس وجہ سے انجام کے اعتبار سے بدتر ٹھہریں گے۔ 'سَوَاء' کے لفظ پر ہم دوسری جگہ بحث کر چکے ہیں۔ اس کے معنی کسی شے کے وسط کے آتے ہیں۔ 'سبیل' سے مراد وہ صراط مستقیم ہے جو اللہ تعالیٰ نے بندوں کی ہدایت کے لیے کھولی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ اصل شاہراہ کو چھوڑ کر اس سے بہت دور ہٹ گئے ہیں۔

وَاِذَا جَآءُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَقَدْ دَّخَلُوْا بِالْكُفْرِ وَهُمْ قَدْ خَرَجُوْا بِهٖ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا يَكْتُمُوْنَ ○ وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○ لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ (۶۱-۶۳)

یہود کا ایک منافق گروہ

ان آیات کے تمام مشکل الفاظ پیچھے زیر بحث آ چکے ہیں۔ یہ بھی یہود ہی کا ذکر ہے لیکن یہ یہود کا وہ گروہ ہے جس کا ذکر بقرہ کی آیات ۷۶-۷۷ میں ہوا ہے۔ وہاں ہم تفصیل کے ساتھ بتا چکے ہیں کہ یہود میں ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی تھا جو مسلمانوں کی مجالس میں آتے تو کہتے کہ مومن تو ہم بھی ہیں، خدا اور رسول اور خدا کی کتاب پر ہمارا بھی ایمان ہے، پھر مسلمان ہمیں مومن کیوں نہیں تسلیم کرتے۔ یہ بات وہ اس ذہنی تحفظ کے ساتھ کہتے کہ اگر ہم محمدؐ اور ان کی پیش کردہ کتاب کو نہیں مانتے تو اس سے کیا فرق پیدا ہوتا ہے، آخر ہمارے

پیغمبر اور ہماری کتاب بھی تو خدا ہی کے بھیجے ہوئے ہیں۔ عام مسلمان ان کی اس طرح کی باتوں سے دھوکے میں پڑتے اور ان سے ایک قسم کے حسن ظن میں مبتلا ہو جاتے چنانچہ اسی بنا پر قرآن نے ان کی اس بات کو 'مخادعت' سے تعبیر کیا ہے۔ جب ان سے یہ کہا جاتا کہ اگر مومن ہو تو سیدھے سیدھے مسلمانوں کی طرح کیوں ایمان نہیں لاتے یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کا اقرار کیوں نہیں کرتے تو اس پر برہم ہو جاتے اور کہتے ہم بیوقوفوں کی طرح کی حرکت نہیں کرتے ہم ملک میں صلح و امن چاہتے ہیں اور اس کا طریقہ یہی ہے کہ مسلمان اگر کسی کو پیغمبر ماننا چاہتے ہیں تو مانیں لیکن ہمارے لیے اس کا ماننا ضروری نہ قرار دیں۔ اس کو مانے بغیر ہمارا دینی مقام و مرتبہ تسلیم کریں۔ اگر مسلمان اپنے سوا سب کو کافر قرار دیں گے تو اس سے ملک میں فساد برپا ہوگا جس میں سب کا نقصان ہے۔ بقرہ کی مذکورہ بالا آیات کے تحت ہم یہ بھی بیان کر چکے ہیں کہ اشتراک ایمان کا یہ وہی نظریہ ہے جو وحدت ادیان کے عنوان سے تقسیم ہند سے پہلے ہمارے ملک میں بھی پیش ہو چکا ہے اور اب بھی وقتاً فوقتاً اس کی صدائے بازگشت سنائی دیتی رہتی ہے۔ زیر بحث آیات میں یہود کے اسی گروہ کا ذکر ہے۔ فرمایا کہ جب یہ تمہاری مجالس میں آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی مسلمان ہیں، حالانکہ جس کفر کے ساتھ وہ آتے ہیں اسی کفر کے ساتھ وہ واپس جاتے ہیں، ایمان نہ داخل ہوتے وقت ان کے ساتھ ہوتا ہے نہ نکلتے وقت، بس تمہارے سامنے دعویٰ کر کے تمہیں دھوکا دینا چاہتے ہیں۔ دلوں میں ان کے جو کچھ ہے وہ اللہ کو خوب معلوم ہے۔ بقرہ کی محولہ بالا آیات میں قرآن نے ان کے دلوں کے اس بھید کو کھول بھی دیا ہے۔ اس وجہ سے ہماری تفسیر کی روشنی میں ان آیات پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

یہود کے دعوائے ایمان کی پردہ دری

'وَتَرٰی كَثِيرًا مِّنْهُمْ الآیة' یہ قرآن نے ان کے دعوائے ایمان کی قلعی کھولی ہے کہ ایمان کا دعویٰ تو کرتے ہیں لیکن حال یہ ہے کہ رات دن ان کی بھاگ دوڑ حق تلفی، تعدی اور حرام خوری کی راہ میں ہے۔ یہاں 'یسارعون' کا لفظ خاص طور پر نگاہ میں رکھنے کا ہے۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ ایمان کے ساتھ کسی ظلم و زیادتی کا صادر ہو جانا یا کسی حرام سے آلودہ ہو جانا تو بعید نہیں ہے لیکن حرام خوری ہی کسی کا اوڑھنا بچھونا بن جائے اور اس کی ہر وقت کی تگ و دو ظلم و زیادتی ہی کی راہ میں ہو تو بہت ہی برا عمل ہے یہ جو ایمان کے دعوے کے ساتھ ہو رہا ہے۔ اس بات کو دوسرے مقام میں یوں بھی فرمایا گیا ہے کہ اگر ان کا ایمان انھی باتوں کا حکم دے رہا ہے تو بہت ہی بری باتوں کا حکم دے رہا ہے۔

یہود کے علماء اور فقہاء کو سرزنش

'لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ الآیة' یہ ان کے علماء اور فقہاء کو سرزنش ہے کہ آخر وہ ان برائیوں اور حرام خوریوں سے ان کو روکتے کیوں نہیں؟ اس سے علماء کے فریضۂ منصبی کی وضاحت بھی ہو رہی ہے اور یہود کی سوسائٹی اس وقت زوال کی جس آخری حد کو پہنچ چکی تھی اس پر بھی روشنی پڑ رہی ہے۔ جب مریض مرض کے آخری مرحلہ میں داخل ہو جائے اور طبیب موت ہی کو شفا سمجھنے لگ جائیں تو اس مریض کی ہلاکت میں کیا شبہ رہا؟ 'قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ' سے مراد وہ گناہ کی باتیں بھی ہیں جن میں سے بعض کا ذکر اوپر

گویا اور بعض کا آگے آ رہا ہے۔ اور وہ جھوٹی شہادت بھی ہے جس نے یہود کے اندر ایک کاروبار کی شکل اختیار کر لی تھی، حالانکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حق و عدل کے گواہ بنائے گئے تھے۔ علمائے یہود کی جس اخلاقی و ایمانی موت پر یہاں ملامت فرمائی ہے، آیت کا سیاق دلیل ہے کہ ان کے اوپر یہ موت اس وجہ سے طاری ہوئی کہ وہ خود ان افعال کے مرتکب ہوئے جن میں ان کی قوم کی اکثریت مبتلا تھی۔ ایسی حالت میں ان کی زبانیں ان برائیوں کے خلاف کس طرح کھل سکتی تھیں۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ يَدُ اللَّهِ مَغْلُولَةٌ ۚ غُلَّتْ أَيْدِيهِمْ وَلُعِنُوا بِمَا قَالُوا ۘ بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوطَتَانِ يُنفِقُ كَيْفَ يَشَاءُ ۚ وَلَيَزِيدَنَّ كَثِيرًا مِّنْهُم مَّا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَكُفْرًا ۚ وَأَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ ۚ كُلَّمَا أَوْقَدُوا نَارًا لِّلْحَرْبِ أَطْفَأَهَا اللَّهُ ۚ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا ۚ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ (۶۴)

یہود کی گستاخی شانِ الٰہی میں

'وَقَالَتِ الْيَهُودُ يَدُ اللَّهِ مَغْلُولَةٌ' اوپر دین اور شعائر دین کے ساتھ ان کے مذاق کا ذکر ہو چکا ہے۔ اب یہ اسی قسم کی ایک اور گستاخی (قول اثم) کا ذکر ہو رہا ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ خدا کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ "ہاتھ بندھے ہوئے ہیں" یعنی تنگ ہیں۔ یہ وہی بات ہے جو سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۸۱ میں گزر چکی ہے۔ لَقَدْ سَمِعَ اللَّهُ قَوْلَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ فَقِيرٌ وَنَحْنُ أَغْنِيَاءُ (اللہ نے ان لوگوں کی بات سن رکھی ہے جو کہتے ہیں کہ اللہ غریب ہے اور ہم امیر ہیں) وہاں ہم نے بتایا ہے کہ قرآن نے جب مسلمانوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی دعوت دی اور اس دعوت کے لیے یہ مؤثر اسلوب اختیار کیا کہ کوئی ہے جو آج اللہ کو قرض حسن دے؟ تو یہود نے اسلام اور قرآن کی تحقیر اور مسلمانوں کا حوصلہ پست کرنے کے لیے اس دعوت کو مذاق بنا لیا کہ آج کل مسلمانوں کے اللہ میاں بہت غریب ہو رہے ہیں، بندوں سے قرض مانگنے کی نوبت آگئی ہے، اللہ میاں غریب اور ہم بندے امیر ہیں۔ بعینہٖ اسی موقع کی بات یہاں نقل ہوئی ہے۔ یہود کہتے ہیں کہ ان دنوں اللہ میاں کا ہاتھ بہت تنگ ہو رہا ہے، نوبت بندوں سے قرض مانگنے تک پہنچ گئی ہے۔

'غُلَّتْ أَيْدِيهِمْ وَلُعِنُوا بِمَا قَالُوا' یہ جملہ معترضہ کے طور پر، ان کی اس گستاخی پر لعنت اور پھٹکار ہے۔ اس فوری لعنت اور پھٹکار کی وجہ یہ ہے کہ یہود نہ تو اللہ اور اس کی شان سے بے خبر تھے اور نہ دعوتِ انفاق کے اس بلیغ انداز سے۔ وہ ہر چیز سے اچھی طرح واقف تھے لیکن قرآن اور پیغمبر کی عداوت میں ایسے اندھے بہرے ہو گئے تھے کہ تحقیر و استہزا کا جو موقع بھی مل جاتا اس سے ضرور فائدہ اٹھاتے، اس امر کی مطلق پروا نہ کرتے کہ بات کہاں تک پہنچے گی۔

یہود کی خیر امت سے عداوت

'بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوطَتَانِ الآيۃ' یہ ان کی بات کی تردید کے ساتھ ساتھ اس گستاخانہ رویہ کے اصل سبب سے پردہ اٹھایا گیا ہے کہ یہ کتاب جو تمہاری طرف اتری ہے اس کے حسد نے ان کو اس طرح

بے ضبط بنا دیا ہے کہ جو منہ میں آجاتا ہے وہ بک ڈالتے ہیں۔ قرآن کے سبب سے بنی اسرائیل کے اندر مسلمانوں کے خلاف بغض و حسد کے بھڑک اٹھنے پر تفصیل کے ساتھ سورۂ بقرہ اور آل عمران میں بھی بحث ہو چکی ہے اور اس سورہ میں بھی بعض نہایت اہم اشارات گزرے ہیں۔ یہود اس حقیقت سے اچھی طرح باخبر تھے کہ عربوں کو قرآن کا ملنا صرف قرآن ہی کا ملنا نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ وہ امامت و سیادت بھی اب ان کی طرف منتقل ہو رہی ہے جس کے تنہا اجارہ دار اب تک وہ خود بنے بیٹھے تھے۔ اس حسد نے ان کو خدا کا بھی باغی بنا دیا اور اس کے سبب سے ان کے اندر مسلمانوں کے خلاف بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے عداوت اور کینہ کا بیج پڑ گیا۔

مسلمانوں کو تسلی کہ یہود کی کوئی شرارت کامیاب نہیں ہوگی۔

﴿كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ﴾ یہ مسلمانوں کو تسکین و تسلی ہے کہ اگرچہ اس عداوت اور حسد کے جوش میں یہ برابر تمہارے خلاف جنگ کی آگ بھڑکائیں گے لیکن اللہ ان کی کسی سعیِ فساد کو کامیاب نہیں ہونے دے گا۔ بلکہ جب بھی یہ جنگ کی آگ بھڑکائیں گے خدا اس کو بجھا دیا کرے گا۔ یہ بات یہاں ملحوظ رہے کہ کفار نے مسلمانوں پر جب جب بھی چڑھائی کی ہے اس میں یہود کی سازش اور انگیخت کو ضرور دخل رہا ہے۔ اس بات کی طرف ہم پیچھے بھی اشارہ کر چکے ہیں اور آگے سورۂ انفال میں بھی انشاء اللہ ہم اس پر تفصیل سے گفتگو کریں گے۔

اس دنیا میں فساد مشائے الٰہی کے خلاف ہے۔

﴿وَيَسْعَوْنَ فِى الْاَرْضِ فَسَادًا ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ﴾ یہ اوپر کی بات کی وہ دلیل بیان ہوئی ہے جو صفات الٰہی کا مقتضیٰ ہے۔ بقرہ کی تفسیر میں ہم یہ واضح کر چکے ہیں کہ تمام فساد فی الارض کی اصل قانونِ الٰہی کی خلاف ورزی اور اس کی مخالفت ہے۔ اس سے کائنات کے تکوینی اور تشریعی نظام میں تصادم واقع ہوتا ہے جس سے اس زمین کی برکتیں اٹھ جاتی ہیں اور اس سے ان فتنوں کو راہ ملتی ہے جن کے سبب سے دنیا شیطان کی بازی گاہ بن جاتی ہے۔ خالق کائنات، جس نے یہ دنیا بنائی ہے اس کو اس کی صلاح و فلاح مطلوب ہے اس وجہ سے وہ ان مفسدانہ کوششوں کو اسی حد تک مہلت دیتا ہے جہاں تک اس کی حکمتِ ابتلا کا تقاضا ہوتا ہے۔ اس حد سے آگے ان کو بڑھنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اس کو بس ان لوگوں کی جد و جہد ہے جو اس دنیا میں نظامِ حق و عدل کے علمبردار ہیں۔ یہی چیز اس کائنات کے مجموعی نظام سے ہم آہنگ اور فطرۃ اللہ کے موافق ہے۔ اس وجہ سے وہ ان کی، اگر وہ حق و عدل کی شہادت کے تقاضے پورے کرتے ہیں، مدد فرماتا ہے اور مفسدین کی مخالفتوں، ریشہ دوانیوں اور جنگ آزمائیوں کے علی الرغم ان کو برومند اور فتحیاب کرتا ہے۔

﴿وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝ وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ۭ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ۭ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَاۗءَ مَا يَعْمَلُوْنَ﴾ (۶۵-۶۶)

'وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا' سیاق و سباق دلیل ہے کہ یہاں ایمان سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان ہے۔ یعنی یہ اہل کتاب حسد و عناد کی اس روش کے بجائے جو انھوں نے اختیار کر رکھی ہے، اگر ایمان و تقویٰ کی روش اختیار کرتے تو اللہ تعالیٰ ان کے پچھلے گناہوں کو معاف فرما دیتا اور ان کو اپنی نعمت کے باغوں میں داخل کرتا۔

'وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ الاية' اخروی انعام کے بعد یہ اس ایمان کی دنیوی برکات کی طرف اشارہ فرمایا کہ اہل کتاب سمجھتے ہیں کہ اگر انھوں نے یہ دعوت قبول کر لی تو وہ اس سیادت و قیادت سے جواب تک ان کو حاصل رہی ہے، محروم ہو جائیں گے حالانکہ یہ محض ان کی حماقت و بلادت ہے۔ اگر یہ اس کو قبول کرتے تو آسمان اور زمین دونوں کی برکتوں کے دروازے ان کے لیے کھل جاتے لیکن ان میں معقول اور راست رو تھوڑے نکلے، زیادہ فاسق و بدعمل ہی ہیں۔

'وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ' سے ظاہر ہے کہ قرآن مراد ہے۔ اس کے قائم کرنے کے ساتھ ساتھ تورات اور انجیل کے قائم کرنے کے حوالے سے مقصود ایک تو یہ ظاہر کرنا ہے کہ اس چیز کا قائم کرنا صرف اسی کو قائم نہیں کرنا ہے بلکہ یہ درحقیقت تورات و انجیل کو بھی قائم کرنا ہے۔ اس لیے کہ تورات و انجیل دونوں کی اپنی پیشینگوئیوں کے مطابق اب یہی چیز ہے جو تورات اور انجیل سب کی تکمیل کرنے والی اور سب کی محافظ و نگران ہے۔ دوسرا یہ کہ اہل کتاب نے محض دنیا کی متاع حقیر کے لیے، جیسا کہ اسی سورہ کی آیات ۱۲۔ ۱۵ میں بیان ہوا ہے، اللہ کے ساتھ اپنے عہد کو توڑا اور تورات و انجیل کو برباد کیا اور اب اسی دنیا کی محبت انھیں اس قرآن کے قبول کرنے سے مانع ہے حالانکہ ان چیزوں کے قبول کرنے کے معنی اس دنیا سے محروم ہونے کے نہیں تھے، اگر یہ تورات و انجیل کو قائم کرتے اور اب اللہ کی اس آخری کتاب کو قبول کرتے اور اس کو قائم کرنے کی جدوجہد میں شریک بنتے تو آسمان و زمین دونوں ان کے لیے اپنے خزانے اگلتے۔ سورۂ اعراف میں یہی مضمون اس طرح بیان ہوا ہے 'وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰۤى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۹۶' (اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان و زمین کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے)

'قائم کرنے' سے مراد زندگی کے معاملات سے ان کا تعلق قائم کرنا ہے۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب اس لیے عطا فرماتا ہے کہ ہم اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی اس کے احکام و قوانین کے مطابق بسر کریں۔ اگر زندگی کتاب الٰہی سے بے تعلق ہو جائے تو خواہ زبان سے کتاب الٰہی کی مدح میں کتنی ہی قصیدہ خوانی کی جائے نہ یہ کتاب الٰہی کا قائم کرنا ہے اور نہ اس قصیدہ خوانی سے کسی کو 'قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ' کا درجہ حاصل ہو سکتا ہے بلکہ یہ کھلم کھلا نقض میثاق اور شریعت الٰہی کا ہدم ہے۔

'مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ'، 'قصد' کے معنی سیدھی راہ کے ہیں 'هُوَ عَلٰى قَصْدٍ'، وہ رشد و ہدایت پر ہے

اسی سے ملتا ہوا "مُّقۡتَصِدٌ فِیۡ اَمۡرِہٖ" ہے (وہ اپنے معاملہ میں راہ راست پر ہے) یہ اہل کتاب کے اس قلیل التعداد گروہ کا ذکر ہے جو حالات کے اس ہمہ گیر بگاڑ کے باوجود جس کی تفصیلات اوپر گزریں اپنے امکان کے حد تک حق پر قائم رہا اور بالآخر اسلام سے مشرف ہوا۔

۲۰۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۶۷-۸۶

پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے تاکید فرمائی کہ ان اہل کتاب کی تم مطلق پروانہ کرو جو اپنی برتری اور پیشوائی کے گھمنڈ میں سرمست ہیں اور چاہتے ہیں کہ تم بھی ان کا یہ مزعومہ مقام و مرتبہ تسلیم کرو۔ تمہاری ذمہ داری بحیثیت رسول کے بے خوف لومتہ لائم اس حق کا اظہار و اعلان ہے جو تم پر خدا کی طرف سے نازل کیا جا رہا ہے۔ یہ تمہاری اپنی بات نہیں ہے کہ کسی کی رورعایت سے تم اس میں کوئی کمی بیشی کر سکو۔ یہ خدا کا پیغام ہے اور تم اس پیغام ہی کو اس کے مخاطبوں تک پہنچانے کے لیے رسول بنا کر بھیجے گئے ہو۔ اگر اس میں ایک حرف کی بھی کمی بیشی ہوئی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تم نے اپنے فرض منصبی کی ادائیگی میں کوتاہی کی۔ اگر اس کے سبب سے وہ تمہارے دشمن ہو جاتے ہیں تو ہو جائیں تم اس کی پروا نہ کرو۔ اللہ تمہاری حفاظت فرمائے گا اور تمہارے خلاف ان کی کسی چال کو کامیاب نہ ہونے دے گا۔

اس کے بعد نہایت آشکارا الفاظ میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے، اہل کتاب کو مخاطب کر کے اعلان کر دیا ہے کہ جب تک تم تورات و انجیل اور قرآن کو قائم نہ کرو تمہاری کوئی دینی حیثیت خدا کے ہاں نہیں ہے، خدا کے ساتھ کسی کو کوئی نسبت کسی گروہ کے ساتھ نسبت کی بنا پر حاصل نہیں ہوتی بلکہ اللہ اور آخرت پر ایمان اور عمل صالح کی بنا پر حاصل ہوتی ہے۔

پھر یہود اور نصاریٰ دونوں کے کفر اور ان کے کفریہ اعمال و عقاید کی تصریح کی ہے اور یہود پر ان کے کفر کے سبب سے حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ نے جو لعنت کی ہے اس کا حوالہ دیا ہے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ ان کے کفر کا مسئلہ آج نہیں پیدا ہوا ہے بلکہ یہ پرانی حکایت ہے۔

آخر میں نصاریٰ کے اس گروہ کی نہایت شاندار الفاظ میں تحسین فرمائی ہے جو حق پر قائم رہا۔ چنانچہ اس نے قرآن کی دعوت کو اپنے دل کی آواز سمجھا اور دلی جوش و خروش کے ساتھ آگے بڑھ کر اس نے اس کو لبیک کہا ــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۶۷-۸۶

يَٰٓأَيُّهَا ٱلرَّسُولُ بَلِّغۡ مَآ أُنزِلَ إِلَيۡكَ مِن رَّبِّكَۖ وَإِن لَّمۡ تَفۡعَلۡ فَمَا بَلَّغۡتَ رِسَالَتَهُۥۚ وَٱللَّهُ يَعۡصِمُكَ مِنَ ٱلنَّاسِۗ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يَهۡدِي ٱلۡقَوۡمَ ٱلۡكَٰفِرِينَ ﴿٦٧﴾ قُلۡ يَٰٓأَهۡلَ ٱلۡكِتَٰبِ لَسۡتُمۡ عَلَىٰ

شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ
رَّبِّكُمْ ۭ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا
وَّكُفْرًا ۚ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۶۸﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ
هَادُوْا وَالصّٰبِـُٔوْنَ وَالنَّصٰرٰى مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ
وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۹﴾ لَقَدْ
اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ رُسُلًا ۭ كُلَّمَا
جَآءَهُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُهُمْ ۙ فَرِيْقًا كَذَّبُوْا وَ
فَرِيْقًا يَّقْتُلُوْنَ ﴿۷۰﴾ وَحَسِبُوْٓا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ فَعَمُوْا وَصَمُّوْا
ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُوْا وَصَمُّوْا كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ ۭ وَ
اللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۷۱﴾ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ
هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۭ وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا
اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۭ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ
الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۷۲﴾ لَقَدْ
كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ وقف لازم
اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۭ وَاِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۳﴾ اَفَلَا يَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ وَيَسْتَغْفِرُوْنَهٗ ۭ
وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۷۴﴾ مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ
خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ۭ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ

انْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿۷۵﴾ قُلْ
اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ؕ
وَاللّٰهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۷۶﴾ قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ
دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْۤا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ
وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ﴿۷۷﴾ لُعِنَ الَّذِيْنَ
ع ۱۱ ۱۴
كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ؕ
ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۷۸﴾ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ
مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۹﴾ تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ
يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ
سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿۸۰﴾ وَلَوْ كَانُوْا
يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ
وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۸۱﴾ لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً
لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ
مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّا نَصٰرٰى ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ
قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۸۲﴾ وَاِذَا سَمِعُوْا مَاۤ
الجزء ۷
اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰۤى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا
مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۸۳﴾ وَمَا
لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ ۙ وَنَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا

رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۴﴾ فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۸۵﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿۸۶﴾ ع ۱۱ ۹

ترجمۂ آیات ۶۷-۸۶

اے رسول، تمہاری طرف جو چیز تمہارے رب کی جانب سے اتاری گئی ہے اس کو اچھی طرح پہنچا دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے اس کے پیغام کو نہیں پہنچایا۔ اور اللہ لوگوں سے تمہاری حفاظت کرے گا۔ اللہ کافروں کو ہرگز راہ یاب نہیں کرے گا۔ ۶۷

کہہ دو، اے اہل کتاب، تمہاری کوئی بنیاد نہیں ہے جب تک تم تورات، انجیل اور اس چیز کو قائم نہ کرو جو تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے اتاری گئی ہے لیکن وہ چیز جو تیری طرف تیرے رب کی جانب سے اتاری گئی ہے وہ ان میں سے بہتوں کی سرکشی اور ان کے کفر میں اضافہ کرے گی تو تم اس کافر قوم پر غم نہ کرو۔ بے شک جو ایمان لائے، جو یہودی ہوئے اور صابی اور نصاریٰ، جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے تو ان کو نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ ۶۸-۶۹

ہم نے بنی اسرائیل سے میثاق لیا اور ان کی طرف بہت سے رسول بھیجے۔ جب جب آیا ان کے پاس کوئی رسول ایسی بات لے کر جو ان کی خواہش کے خلاف ہوئی تو ایک گروہ کی انھوں نے تکذیب کی اور ایک گروہ کو قتل کرتے رہے اور انھوں نے گمان کیا کہ کوئی پکڑ نہیں ہوگی، پس اندھے اور بہرے بن گئے۔ پھر اللہ نے ان پر رحمت کی نگاہ کی، پھر ان میں سے بہت سے اندھے بہرے بن گئے اور اللہ دیکھ رہا ہے جو کچھ یہ کر رہے ہیں۔ ۷۱

بے شک ان لوگوں نے کفر کیا جنھوں نے کہا کہ خدا تو یہی مسیح ابن مریم ہے اور حال

یہ ہے کہ مسیح نے کہا کہ اے بنی اسرائیل اللہ کی بندگی کرو جو میرا بھی رب ہے اور تمھارا بھی رب ہے۔ جو کوئی اللہ کا شریک ٹھہرائے گا تو اللہ نے اس پر جنت حرام کر دی اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور ان ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔ ان لوگوں نے بھی کفر کیا جنھوں نے کہا کہ اللہ تین کا تیسرا ہے۔ حالانکہ نہیں ہے کوئی معبود مگر ایک ہی معبود اور اگر یہ باز نہ آئے ان باتوں سے جو یہ کہہ رہے ہیں تو ان میں سے جنھوں نے کفر کیا ان کو ایک دردناک عذاب پکڑے گا۔ کیا یہ اللہ کی طرف رجوع اور اس سے مغفرت طلب نہیں کرتے اور اللہ مغفرت فرمانے والا اور مہربان ہے۔ مسیح ابن مریم تو بس ایک رسول ہیں۔ ان سے پہلے بھی بہت سے رسول گزرے ہیں اور ان کی ماں ایک صداقت شعار بندی تھیں۔ دونوں کھانا کھاتے تھے۔ دیکھو، کس طرح ہم ان کے سامنے اپنی آیتیں کھول کر بیان کر رہے ہیں۔ پھر دیکھو کہ وہ کس طرح اوندھے ہوئے جا رہے ہیں۔ کہو کیا تم اللہ کے سوا اس چیز کی بندگی کرتے ہو جو تمھارے لیے کسی نقصان اور نفع پر اختیار نہیں رکھتی اور سننے والا اور جاننے والا تو بس اللہ ہی ہے۔ کہہ دو، اے اہل کتاب اپنے دین میں بے جا غلو نہ کرو اور ان لوگوں کی بدعات کی پیروی نہ کرو جو اس سے پہلے گمراہ ہوئے اور جنھوں نے بہتوں کو گمراہ کیا اور جو راہ راست سے بھٹک گئے۔ ۷۲ - ۷۷

بنی اسرائیل میں سے جنھوں نے کفر کیا ان پر داؤد اور عیسیٰ بن مریم کی زبان سے لعنت ہوئی۔ یہ اس وجہ سے کہ انھوں نے نافرمانی کی اور حد سے آگے بڑھ جایا کرتے تھے۔ جس برائی کو اختیار کر لیتے اس سے باز نہ آتے۔ نہایت ہی بری بات تھی جو یہ کرتے تھے۔ تم ان میں سے بہتوں کو دیکھو گے کہ کفار کو اپنا دوست بناتے ہیں۔ نہایت برا توشہ ہے جو انھوں

نے اپنے لیے بھیجا کہ خدا کا ان پر غضب ہوا اور عذاب میں وہ ہمیشہ رہنے والے بنے۔ اگر یہ اللہ پر، نبی پر اور اس پر جو اُس کی طرف اترا، ایمان رکھنے والے ہوتے تو ان کفار کو دوست نہ بناتے لیکن ان میں سے تو اکثر نافرمان ہیں۔ ۸۰-۸۱

تم ایمان والوں کی دشمنی میں سب سے زیادہ سخت یہود اور مشرکین کو پاؤ گے، اور اہل ایمان کی دوستی سے قریب تر ان لوگوں کو پاؤ گے جنھوں نے کہا کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ یہ اس وجہ سے کہ ان کے اندر عالم اور راہب ہیں اور یہ تکبر نہیں کرتے اور جب یہ سنتے ہیں اس چیز کو جو رسول کی طرف اتاری گئی ہے تو تم دیکھو گے کہ حق کو پہچان لینے کے سبب سے اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ وہ پکار اٹھتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم ایمان لائے تو ہمیں اس کی گواہی دینے والوں میں لکھ۔ اور آخر ہم اللہ پر اور اس حق پر جو ہم کو پہنچا ایمان کیوں نہ لائیں جب کہ ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہمیں نیکوکاروں کے زمرے میں شامل کرے گا تو اللہ ان کے اس قول کے صلے میں ان کو ہمیشہ رہنے کے لیے ایسے باغ عطا فرمائے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور خوب کاروں کا یہی صلہ ہے اور جنھوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا، وہ دوزخ میں پڑنے والے ہیں۔ ۸۲-۸۶

۲۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

یٰٓاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسٰلَتَهٗ ؕ وَاللّٰهُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْکٰفِرِیْنَ (۶۷)

اہل کتاب کے لیے ایک اہم پیغام

یٰٓاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ۔ یہ آیت تمہید ہے اس عظیم پیغام کی جو اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کیا جا رہا ہے کہ آپ بے کم و کاست یہود و نصاریٰ کو وہ سنا دیں۔ یہ پیغام آگے آیت ۶۸ سے لے کر آیت ۸۶ تک پھیلا ہوا ہے اور اس میں نہایت واضح طور پر ان دونوں گروہوں کو

یہ بتایا گیا ہے کہ جب تک تم تورات وانجیل اور اللہ کی اس آخری کتاب قرآن کو قائم نہ کرو تمہاری کوئی دینی حیثیت نہیں ہے۔ خدا کے ساتھ کسی کو کوئی نسبت کسی گروہ سے نسبت کی بنا پر حاصل نہیں ہوتی بلکہ ایمان اور عمل صالح کی بنا پر حاصل ہوتی ہے اور اس سے تم بالکل محروم ہو چکے ہو۔ یہود نے اللہ کے میثاق کو توڑا، اس کے رسولوں کی تکذیب کی، ان کو قتل کیا اور ڈھیٹ ہو کر اندھے بہرے بن گئے۔ نصاریٰ نے مسیح کی تعلیمات کے بالکل خلاف بت پرستوں کی پھیلائی ہوئی گمراہیوں کو اپنا دین بنا لیا اور کفر و شرک میں مبتلا ہو گئے۔ یہ پیغام بڑا اہم تھا۔ یہود و نصاریٰ دونوں کی دینی حیثیت پر یہ آخری ضرب لگائی جا رہی تھی اور عین اس وقت لگائی جا رہی تھی جب کہ وہ پورا زور اس بات کے لیے لگا رہے تھے کہ مسلمان ان کی دینی حیثیت تسلیم کر لیں، اس وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خاص طور پر 'رسول' کے لفظ سے خطاب کر کے یہ پیغام آپ کے حوالے کیا گیا جس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ رسول خدا کا پیغامبر ہوتا ہے اس وجہ سے یہ اس کا فرض منصبی ہے کہ خدا کی طرف سے جو کچھ اس پر اتارا جائے وہ بے کم و کاست اس کے مخاطبوں تک پہنچا دے، قطع نظر اس سے کہ اس پیغام سے ان کے اندر کیا ہلچل برپا ہوتی ہے اور وہ پیغام اور پیغامبر کے ساتھ کیا معاملہ کرتے ہیں۔

'وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسٰلَتَهٗ' یہ تاکید مزید ہے کہ اگر مخاطبوں کی رو رعایت یا اس کے متوقع ردعمل کے اندیشہ سے اس میں کوئی کوتاہی ہوئی تو یہ کوتاہی عین اس فریضۂ منصبی کی ادائیگی میں کوتاہی ہو گی جس کی ادائیگی ہی کے لیے اللہ کسی کو اپنا رسول مقرر کرتا ہے۔ یہ ملحوظ رہے کہ اس تاکید مزید میں جو شدت ہے اگرچہ اس کا خطاب ظاہر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے ہے لیکن حقیقت میں اس کا رخ یہود و نصاریٰ کی طرف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو خطاب کرنا پسند نہیں فرمایا اس وجہ سے پیغمبر کو خطاب کر کے یہ واضح فرما دیا کہ اس پیغام کی اہمیت کیا ہے اور کس قطعیت اور کس حتمی فیصلہ کے ساتھ اس کا بھیجا جانا منظور ہے۔

'وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ' میں 'النَّاسِ' اگرچہ عام ہے لیکن قرینہ دلیل ہے کہ یہاں مراد اہل کتاب بالخصوص یہود ہیں۔ یوں تو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے خلاف برابر سازشوں میں مصروف رہتے تھے لیکن آگے آنے والے اعلان کے بعد وہ کسی سمجھوتے کی توقع سے آخری درجے میں مایوس ہو کر اپنی آخری بازی بھی کھیل جانے کے لیے تیار ہو سکتے تھے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو اطمینان دلایا کہ تم ان کی مخالفت و عداوت کی کوئی پروا نہ کرو۔ ان شیاطین کے ہر شر سے خدا تمھیں محفوظ رکھے گا۔ 'اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ' اللہ ان کی کسی چال کو بھی تمھارے خلاف بامراد نہیں ہونے دے گا۔ 'هَدٰى يَهْدِيْ' کا لفظ ہم دوسرے مقام میں تفصیل کے ساتھ بتا چکے ہیں کہ کسی کو اس کی کوششوں اور تدبیروں میں بامراد کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ اوپر آیت 'كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ

اَطْفَاَهَا اللّٰهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ میں یہی مضمون دوسرے الفاظ میں گزر چکا ہے۔

قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـُٔوْنَ وَالنَّصٰرٰى مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۶۸ - ۶۹)

پیغام کا متن

یہ وہ پیغام ہے جو اہل کتاب کو، عام اس سے کہ وہ یہود ہیں یا نصاریٰ، سنانے کا آنحضرتؐ کو حکم ہوا۔ وہ یہ ہے کہ جب تک تم تورات، انجیل اور اس چیز کو، جو تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے اتاری گئی ہے، قائم نہ کرو اس وقت تک تمہاری کوئی بنیاد نہیں ہے۔ تم اپنے آپ کو ایک برگزیدہ امت، خدا کے محبوب اور چہیتے، برگزیدوں اور چہیتوں کی اولاد، آخرت کی سزا سے محفوظ، خدا وند کا خاص گھرانا اور معلوم نہیں کیا کیا بنائے بیٹھے ہو لیکن یہ سب جھوٹی آرزوئیں اور خواب کی باتیں ہیں، جب آنکھ کھلے گی تو دیکھو گے کہ تم ہوا میں اڑتے اور خیالی محل آراستہ کرتے رہے ہو۔ تورات اور انجیل اور خدا کی اتاری ہوئی چیز کو قائم کرنے کا مطلب ہم اوپر عرض کر چکے ہیں کہ زندگی کے معاملات و مسائل سے عملاً ان کا ربط قائم کرنا ہے۔ اس سورہ میں تفصیل کے ساتھ یہ بحث گزر چکی ہے کہ یہ خدا کے عہد و میثاق کے صحیفے ہیں۔ ان میں خدا نے اپنے احکام و قوانین دیے اور یہ عہد لیا کہ انہی کے مطابق زندگی گزاری جائے اور انہی کے مطابق باہمی نزاعات کے فیصلے کیے جائیں۔ اسی ذمہ داری کے لیے ان کے حاملین کو قوامین بالقسط اور شُهَدَاءَ لِلّٰهِ کا لقب عطا ہوا۔ اگر اس عہد کی دھجیاں بکھیر دی گئی ہیں اور زندگی سے عملاً ان کا کوئی تعلق یا تو سرے سے باقی ہی نہیں رہا ہے یا باقی ہے تو صرف اس حد تک جس حد تک اپنی خواہشوں کی سند اس سے حاصل ہو سکے تو آخر دینی پیشوائی، مذہبی تقدس اور خدا رسیدگی کے یہ بہاسے دعوے کس بنیاد پر ہیں؟ ایسے لوگوں کو خدا سے کیا تعلق اور خدا کو ایسے لوگوں سے کیا واسطہ؟

'وَمَاۤ اُنْزِلَ' الیکم سے مراد قرآن ہے

'وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ' سے مراد قرآن مجید ہے۔ قرآن مجید کے سوا کوئی اور چیز مراد لینے کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ آگے فوراً ہی اس چیز کو مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ کے الفاظ سے تعبیر کر کے بالکل واضح بھی کر دیا ہے کہ اس سے مراد قرآن ہی ہے۔ یہاں قرآن کی تعبیر وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ کے الفاظ سے کرنے میں اہل کتاب پر اتمام حجت کا ایک پہلو ہے۔ وہ یہ کہ تورات اور انجیل دونوں میں اہل کتاب سے اللہ تعالیٰ نے یہ عہد لیا تھا کہ تمہارے پاس اِن اِن صفات کا پیغمبر خدا کا آخری اور کامل صحیفہ لے کر آئے گا تو تم اس پر ایمان لانا، اس کی پیروی کرنا، اس کی مدد کرنا اور اس کی گواہی دینا۔ اسی پہلو کی طرف یہاں اشارہ ہے اور اس موقع پر جبکہ قرآن ان تمام صفات کے مطابق، جو

سابق صحیفوں میں اس کی بیان ہوئیں نازل ہو چکا تو تورات اور انجیل کا قائم کرنا یہی ہے کہ خدا کی اتاری ہوئی اس چیز کو اہل کتاب قائم کریں۔ اس کا قائم ہونا ہی تورات اور انجیل سب کا قائم ہونا ہے۔

قرآن نے یہود کے دبے ہوئے حسد کو بھڑکا دیا

'وَلَيَزِيدَنَّ كَثِيرًا مِّنْهُم الاية' یعنی ہونا تو یہ تھا کہ یہ اس کتاب کے علمبردار بنتے اور اس طرح تورات و انجیل کے قائم کرنے والے بنتے جن کے قائم کرنے کا ان سے عہد لیا گیا تھا اور اپنے عہد و میثاق کی ذمہ داری سے سبکدوش اور عند اللہ و عند الناس سرخرو ہوتے لیکن ہو یہ رہا ہے کہ اس کتاب نے ان کی سرکشی اور ان کے کفر میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ آگے یہود کی سرکشی اور نصاریٰ کے کفر و شرک کی تفصیل آ رہی ہے۔ قاعدہ ہے کہ جو حسد دبا ہوا ہوتا ہے جب اس کا اصل محرک سامنے آتا ہے تو وہ حسد پوری شدت کے ساتھ بھڑک اٹھتا ہے۔ اہل کتاب کو بنی اسمٰعیل پر غصہ تو پہلے سے تھا کہ آخری رسول کی بعثت ان کے اندر ہونے والی ہے لیکن یہ غصہ دبا ہوا تھا، جب انھوں نے دیکھا کہ یہ چیز واقعہ کی صورت میں ظاہر ہو گئی تو ان کے حسد کی آگ پوری طرح بھڑک اٹھی۔ حالانکہ ان کو سوچنا تھا کہ اگر وہ قرآن کو قبول کرتے اور اس کو قائم کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے تو کسی دوسرے کا کام نہ کرتے بلکہ خود اپنی ہی ذمہ داری ادا کرتے۔ قرآن کو قائم کرنا، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، صرف قرآن ہی کو قائم کرنا نہیں بلکہ تورات و انجیل کو بھی قائم کرنا تھا اس لیے کہ یہ انھی کی پیشین گوئیوں کی تعمیل ہو رہی تھی لیکن جب کسی قوم کی مت ماری جاتی ہے تو وہ اسی طرح اندھی ہو جاتی ہے چنانچہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی کہ ان لوگوں کے حال پر غم نہ کرو۔ انھوں نے اپنی ہلاکت کو خود دعوت دی ہے۔

'إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا الاية' یہ آیت بعینہٖ بقرہ میں بھی گزر چکی ہے۔ ملاحظہ ہو آیت ۶۲۔ بس دونوں میں صرف یہ فرق ہے کہ وہاں صابئین ہے اور یہاں صَابِئُونَ۔ وہاں نصاریٰ کا لفظ صَابِئِينَ پر مقدم ہے یہاں مؤخر۔ یہ محض اسلوب کا تنوع ہے۔ صَابِئُونَ یہاں محل پر عطف ہونے کی وجہ سے حالت رفع میں ہو گیا ہے۔ اس آیت کے تمام الفاظ بقرہ کی تفسیر میں زیر بحث آ چکے ہیں۔ یہ جس سیاق و سباق میں وہاں وارد ہوئی ہے اسی سیاق و سباق میں یہاں بھی ہے۔ یہ درحقیقت اوپر اہل کتاب کو مخاطب کر کے جو بات ارشاد ہوئی ہے اس کی مزید وضاحت ہوئی ہے کہ خدا کے ہاں کسی کو کوئی درجہ و مرتبہ کسی گروہ کے ساتھ نسبت کی بنا پر حاصل نہیں ہوتا، جیسا کہ یہود و نصاریٰ نے سمجھ رکھا ہے، بلکہ ایمان باللہ، ایمان بالآخرت اور عمل صالح کی بنا پر حاصل ہوتا ہے۔ اگر یہ چیز حاصل نہ ہو تو ہر چند کوئی شخص مسلمانوں ہی کے گروہ سے وابستہ ہونے کا مدعی ہو، خدا کے ہاں اس کی بھی کوئی حیثیت نہیں ہے اور اگر یہ چیز حاصل ہے تو وہ صابئین کے گروہ سے سہی اللہ کے ہاں وہ اپنے ایمان کے اعتبار سے مرتبہ پائے گا۔ مقصود اس آیت کا، جیسا کہ بقرہ کی تفسیر میں بیان ہو چکا ہے محض گروہی فخر و غرور کا ابطال ہے نہ کہ اجزائے ایمان کی تفصیل۔ یہاں إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا سے مراد مسلمان بحیثیت

گروہ کے ہیں جس سے اس حقیقت کا اظہار مقصود ہے کہ اگر مسلمان بھی ایمان باللہ، ایمان بالآخرۃ اور عمل صالح سے بے نیاز ہو کر اپنی گروہی نسبت ہی کو نجات کا ضامن سمجھ بیٹھیں تو ان کے لیے بھی یہی حکم ہے بلکہ سرفہرست ان ہی کا نام ہے۔

لَقَدْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ رُسُلًا ۭ كُلَّمَا جَاۗءَهُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُهُمْ ۙ فَرِيْقًا كَذَّبُوْا وَفَرِيْقًا يَّقْتُلُوْنَ ۝ وَحَسِبُوْٓا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ فَعَمُوْا وَصَمُّوْا ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُوْا وَصَمُّوْا كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ (۷۰-۷۱)

یہود کا مجرم

اب یہ اس بات کی دلیل بیان ہو رہی ہے کہ کیوں اِن اہل کتاب کی اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی دینی حیثیت نہیں ہے؛ فرمایا کہ ان سے جس کتاب و شریعت کی پابندی کا عہد لیا گیا تھا اور جس کی تجدید اور یاد دہانی کے لیے اللہ نے یکے بعد دیگرے اپنے بہت سے رسول اور نبی بھی بھیجے، اس عہد کو انھوں نے توڑ دیا اور جو رسول اس کی تجدید اور یاد دہانی کے لیے آئے ان کی باتوں کو اپنی خواہشات کے خلاف پاکر یا تو ان کی تکذیب کر دی یا ان کو قتل کر دیا۔ اس قتل اور تکذیب کی تفصیل سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔

خدا کی رعایت سے جسارت میں اضافہ

وَحَسِبُوْٓا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ الایۃ 'فتنۃ' کے معنی آزمائش و ابتلا کے ہیں۔ آزمائش چونکہ پکڑ کی شکل میں بھی ہوتی ہے اور یہاں موقع اسی کا ہے۔ اس وجہ سے ہم نے اِس کے معنی پکڑ کے لیے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل نے رسولوں کی تکذیب اور ان کے قتل کے جو جرائم کیے ان پر ان کی فوری پکڑ نہیں ہوئی تو وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ اب کوئی پکڑ ہوگی ہی نہیں۔ حالانکہ اللہ کی سنت یہ نہیں ہے کہ وہ لازماً ہر جرم کی سزا فوراً ہی دے۔ بلکہ وہ مجرموں کو ڈھیل دیتا ہے تاکہ وہ توبہ و اصلاح کر لیں اگر چاہیں ورنہ اپنا پیمانہ اچھی طرح بھر لیں۔ بنی اسرائیل نے اس ڈھیل کو اپنے لیے لیسنس سمجھ لیا اور اندھے بہرے بن گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ خدا نے ان کو پکڑا۔ پھر انھوں نے توبہ و اصلاح کی تو اللہ نے ان پر رحمت کی نگاہ کی لیکن اس کے بعد وہ پھر اندھے بہرے بن گئے۔ لیکن وہ اندھے بہرے بن گئے ہیں تو بن جائیں خدا تو بصیر ہے وہ ان کی ساری کرتوت دیکھ رہا ہے اور جب دیکھ رہا ہے تو لازماً وہ ان کو سزا دیے بغیر بھی نہیں رہے گا۔[1]

یہود پر دو بڑی تباہیاں

آیت میں بنی اسرائیل کے دو مرتبہ اندھے بہرے بن جانے اور پھر ان پر گرفت ہونے کا ذکر ہے۔ یہاں حذف کا یہ اسلوب ملحوظ رہے کہ ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ سے پہلے یہ مضمون محذوف ہے کہ اللہ نے ان کو پکڑا تو انھوں نے توبہ و اصلاح کی، جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ پہلی پکڑ کے بعد تو انھوں نے توبہ و اصلاح کی لیکن دوسری پکڑ کے بعد وہ بدستور اندھے بہرے بنے ہوئے ہیں۔ قرآن نے ان کو توبہ و اصلاح کی جو دعوت دی ہے اس سے اپنی شامت اعمال کے سبب سے گریز کر رہے ہیں۔ اس مقام پر میرا ذہن بار

---

[1] اس آیت کے اشارات کو سمجھنے کے لیے ملاحظہ ہو۔ نحمیاہ ۹: ۲۶-۳۰

بار اس طرف جاتا ہے کہ یہ ان کی تاریخ کی ان دو بڑی تباہیوں کی طرف اشارہ ہے جن میں وہ اپنی بداعمالیوں کے سبب سے شاہ اسور سلمنسر اور شاہ بابل نبوخذ نضر کے ہاتھوں مبتلا ہوئے۔ سورۂ بنی اسرائیل آیات ۴ - ۸ میں ان حوادث کی طرف اشارہ ہے۔ وہاں ہم انشاء اللہ ان کی تفصیل کریں گے اور دکھائیں گے کہ بنی اسرائیل نے قرآن کا انکار کر کے کس طرح نہ صرف خدا کی دوسری پکڑ سے نجات حاصل کرنے کا راستہ اپنے اوپر بند کر لیا بلکہ ہمیشہ ہمیش کے لیے اپنے اوپر اس کی رحمت کے دروازے بند کر لیے۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۭ وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۭ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ (۷۲)

نصاریٰ کا جرم

یہود کے بعد اب یہ نصاریٰ کے کفر و شرک کا بیان ہوا تاکہ ان کی حقیقت بھی واضح ہو جائے کہ دین کے پلڑے میں ان کا کیا وزن ہے۔ ان کا ذکر آل عمران ۳۳ - ۶۴ اور نساء ۱۷۱ - ۱۷۳ میں بھی ہو چکا ہے۔ وہاں بہت سی باتوں کی وضاحت ہو چکی ہے۔ نساء کی متعلقہ آیات کے تحت ہم نے واضح کیا ہے کہ نصاریٰ حلول اور تثلیث دونوں ہی کے قائل تھے اور یہ دونوں ہی باتیں کفر ہیں۔ یہاں حلول کا کفر ہونا بیان فرمایا ہے۔ آگے والی آیت میں عقیدۂ تثلیث کے کفر ہونے کی تصریح ہے 'اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ' پر انجیلوں کے حوالے، دوسرے مقام میں، نقل ہو چکے ہیں۔ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ الآیۃ حضرت مسیح کے کلام کا جزو نہیں ہے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نصاریٰ کو تنبیہ ہے۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۭ وَاِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۔ اَفَلَا يَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ وَيَسْتَغْفِرُوْنَهٗ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۔ مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ۭ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ۭ اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۔ قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ۭ وَاللّٰهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (۷۳ - ۷۶)

'ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ' عقیدۂ تثلیث کی حقیقت پر آل عمران اور نساء میں بحث گزر چکی ہے۔ اس اسلوب میں اس عقیدے کو تعبیر کرنے سے اس کا گھنونا پن واضح ہوتا ہے۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ کائنات کا خالق و مالک تو اللہ وحدہٗ لاشریک ہے لیکن ان ظالموں نے اس کی خدائی کو تین میں تقسیم کر کے اس کو تین کے تیسرے کا درجہ دے رکھا ہے۔

'لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ' یہاں 'مِنْهُمْ' کے لفظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ اگرچہ عقیدۂ تثلیث، کفر ہے اور اس کے ماننے والوں کے لیے دردناک عذاب ہے لیکن ان کے لیے توبہ و اصلاح کا دروازہ اب بھی کھلا ہوا ہے جو ان میں سے قرآن کی دعوت قبول کر کے اپنی اصلاح کر لیں گے۔

وہ اپنے آپ کو اس عذاب سے بچا لیں گے لیکن جواب بھی باز نہ آئے تو وہ لازماً اس عذاب سے دوچار ہوں گے چنانچہ اسی مضمون کو واضح کرنے کے لیے اس کے ساتھ اَفَلَا یَتُوۡبُوۡنَ اِلَی اللّٰہِ وَیَسۡتَغۡفِرُوۡنَہٗ الایۃ کا ٹکڑا ملایا ہے۔

سیدنا مسیحؑ کی بشریت کی دلیل

مَا الۡمَسِیۡحُ ابۡنُ مَرۡیَمَ اِلَّا رَسُوۡلٌ الایۃ۔ یعنی مسیح ابن مریم کو تم نے خدا بنا کے رکھ دیا حالانکہ وہ اللہ کے رسولوں میں سے بس ایک رسول ہیں۔ ان سے پہلے بھی بے شمار رسول گزر چکے ہیں۔ جس طرح وہ خدا کے رسول تھے اسی طرح یہ بھی خدا کے رسول تھے۔ مزاج، کردار، دعوت، عبدیت، خشیت اور بشریت ہر چیز میں مشترک اور ایک دوسرے سے مشابہ۔ پھر اسی زمرے کے ایک فرد کو خدائی میں شریک کر دینے کے کیا معنی؟ وَاُمُّہٗ صِدِّیۡقَۃٌ ان کی ماں جنھوں نے ان کو جنا، خدا کی نہایت وفادار اور صداقت شعار بندی تھیں، مومنہ، عابدہ، قانتہ۔ مزید براں یہ کہ یہ ماں بیٹے دونوں کھانا کھاتے تھے۔ اپنی زندگی کو قائم رکھنے کے لیے یہ اسی طرح غذا اور پانی کے محتاج تھے جس طرح ہر انسان ان کا محتاج ہوتا ہے۔ ان تمام باتوں کی دلیل خود انجیلوں میں موجود ہے۔ آخر غذا، پانی اور تمام انسانی ضروریات کی محتاج مخلوق کو خدا یا خدائی میں شریک کس طرح مان بیٹھے ہو؟

یہاں یہ بات ملحوظ رکھنے کی ہے کہ غذا اور پانی کی احتیاج یوں تو بشریت کی دلیل ہے ہی لیکن اہل کتاب بالخصوص نصاریٰ کے ہاں تو یہ ایک مسلم دلیل بشریت ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے پاس جب فرشتے بیٹے کی ولادت کی بشارت اور قوم لوط کے لیے عذاب لے کر آئے تو حضرت ابراہیمؑ نے ان کو اول اول بشر سمجھا اور ان کی ضیافت کے لیے ان کے سامنے بچھڑے کا بھنا ہوا گوشت پیش کیا لیکن جب اُنھوں نے کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا تو حضرت ابراہیم فوراً تاڑ گئے کہ یہ بشر نہیں بلکہ خدا کے فرشتے ہیں۔

اسی طرح انجیلوں میں خود حضرت عیسیٰؑ کے متعلق ہے کہ جب ان کے شاگرد ان کو ایک روح سمجھ کر ان سے ڈرے تو اُنھوں نے بھنی ہوئی مچھلی کا ایک قتلہ ان کے سامنے کھا کر ان کو اطمینان دلایا کہ وہ کوئی روح نہیں بلکہ آدمی ہیں۔ لوقا میں ہے۔

> 'وہ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ یسوع آپ ان کے بیچ میں آکھڑا ہوا اور ان سے کہا تمھاری سلامتی ہو مگر انھوں نے گھبرا کر اور خوف کھا کر یہ سمجھا کہ کسی روح کو دیکھتے ہیں ۔ اس نے ان سے کہا تم کیوں گھبراتے ہو اور کس واسطے تمھارے دل میں شک پیدا ہوتے ہیں ۔ میرے ہاتھ اور میرے پاؤں دیکھو کہ میں ہی ہوں۔ مجھے چھو کر دیکھو کیونکہ روح کے گوشت اور ہڈی نہیں ہوتی، جیسا مجھ میں دیکھتے ہو اور یہ کہہ کر اس نے اپنے ہاتھ اور پاؤں دکھائے ۔ جب مارے خوشی کے ان کو یقین نہ آیا اور تعجب کرتے تھے تو اس نے ان سے کہا کیا یہاں تمھارے پاس کچھ کھانے کو ہے؟ انھوں نے اسے بھنی ہوئی مچھلی کا قتلہ دیا ۔ اس نے لے کر ان کے

روبرو کھایا۔ لوقا ۲۴: ۳۶ - ۴۳

اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ الایۃ، 'انظر'، اظہار تعجب کے مفہوم میں ہے۔ یہاں بات چونکہ اتنی وضاحت کے ساتھ بیان ہوئی ہے کہ صرف انتہائی غبی یا انتہائی ہٹ دھرم ہی اس کو سمجھنے سے قاصر رہ سکتا ہے اس لیے فرمایا کہ اس وضاحت کے باوجود ان کی کج فہمی اور ہٹ دھرمی دیکھو کہ کس طرح ان کی عقل الٹ کے رہ گئی ہے۔

قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ الایۃ، مطلب یہ ہے کہ انسان کو عبادت تو صرف اس ذات کی کرنی چاہیے جو حقیقی معنوں میں نافع و ضار ہے۔ ایسی ذات صرف خدا کی ذات ہے۔ وہی نافع و ضار بھی ہے اور وہی سمیع و علیم بھی ہے۔ دوسروں کی عبادت سے کیا حاصل جو نہ نافع و ضار ہیں نہ سمیع و علیم۔

قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْۤا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ (۷۷)

نصاریٰ کا غلو

خطاب اگرچہ ظاہر میں عام اہل کتاب سے ہے لیکن اس کا رُخ نصاریٰ ہی کی طرف ہے۔ ان کے غلو پر سورۂ نساء کی آیت ۱۷۱ کے تحت مفصل بحث ہو چکی ہے۔ جس طرح یہود کی عام بیماری دین کے معاملے میں تفریط کی رہی ہے اسی طرح نصاریٰ کی عام بیماری افراط اور غلو کی رہی ہے اور یہ افراط و تفریط دونوں ہی چیزیں دین کو برباد کرنے والی ہیں۔ اسی غلو کا کرشمہ ہے کہ نصاریٰ نے حضرت مسیح کو رسول سے خدا بنا ڈالا پھر ان کی ماں اور روح القدس کو بھی خدائی میں شریک کر دیا۔ رہبانیت کا نظام جو انھوں نے کھڑا کیا، اس کے متعلق بھی قرآن نے تصریح فرمائی ہے کہ یہ ان کے غلو ہی کا کرشمہ ہے۔

نصرانیت تمام تر بت پرست قوموں کی نقالی ہے

وَلَا تَتَّبِعُوْۤا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا 'اھواء' سے مراد بدعات ہیں۔ بدعات جس قدر بھی ہیں سب خواہشوں سے پیدا ہوتی ہیں۔ انسان جب اپنی کسی خواہش کو دین بنانا چاہتا ہے تو اس کے لیے کوئی بدعت ایجاد کرتا ہے اور اس پر دین کا ملمع چڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔ بدعات کے لیے اس لفظ کو استعمال کر کے قرآن نے ان کے اصل منبع کا پتہ دے دیا۔ 'قوم' سے اشارہ یہاں پال اور اس کے ساتھیوں کی طرف ہے جنھوں نے نصرانیت کا حلیہ بگاڑا اور بت پرست قوموں کی نقالی میں تثلیث وغیرہ کا ڈھونگ رچایا۔ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان تمام بدعات کا مواد انھوں نے اپنی سابق ضلالتوں سے لیا ہے۔ نصرانیت میں داخل ہونے سے قبل وہ جن گمراہیوں میں مبتلا رہے تھے انھی گمراہیوں پر انھوں نے نصرانیت کا ملمع چڑھانے کی کوشش کی اور اس طرح وہ خود بھی شاہراہِ حق سے بھٹکے اور دوسروں کو بھی انھوں نے گمراہ کیا۔ اس اسلوبِ بیان میں درپردہ نصاریٰ کے لیے یہ تلقین ہے کہ آج جس چیز کو تم نصرانیت سمجھ رہے ہو یہ تمہارے اپنے گھر کی چیز نہیں ہے بلکہ یہ تمام تر بت پرست قوموں سے برآمد کردہ چیز ہے جو تم پر لاد دی گئی ہے۔

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝ تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ۝ وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ (۷۸-۸۱)

یہود پر انبیاء کی لعنت

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الآیۃ۔ یہ بنی اسرائیل کے ذکر کو پھر لے لیا کہ آج تو انھوں نے اپنی پاک دامنی اور برگزیدگی کی حکایت اتنی بڑھا رکھی ہے لیکن ان کا حال یہ رہا ہے کہ داؤدؑ سے لے کر عیسٰی ابن مریم تک ہر نبی نے ان کی حالت پر توجہ کیا ہے۔ زبور کے مزامیر میں جگہ جگہ ایسی چیزیں ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کی بدعہدیوں سے حضرت داؤدؑ کا دل نہایت زخمی تھا اور اپنی دعاؤں اور مناجاتوں میں انھوں نے بار بار ان پر لعنت کی ہے۔ ملاحظہ ہو زبور باب ۱۲: ۱-۳۔ باب ۳-۶ باب: ۴-۱۰-۱۷ باب ۶۸: ۱-۴ باب ۱۰۹، باب ۱۴۰: ۶-۱۱۔ باب ۹۵ کے متعلق بھی شارحین کی تصریح ہے کہ اس میں بنی اسرائیل ہی پر لعنت ہے۔ ان مناجاتوں کا جو انداز ہے اس کی مثال کے لیے ایک مناجات کا ایک ٹکڑا پیش کیا جاتا ہے۔

'لیکن خدا شریر سے کہتا ہے
تجھے میرے آئین بیان کرنے سے کیا واسطہ۔
اور تو میرے عہد کو اپنی زبان پر کیوں لاتا ہے؟
جب کہ تجھے تربیت سے عداوت ہے۔
اور میری باتوں کو پیٹھ پیچھے پھینک دیتا ہے۔
تو چور کو دیکھ کر اس سے مل گیا۔
اور زانیوں کا شریک رہا ہے
تیرے منہ سے بدی نکلتی ہے۔
اور تیری زبان فریب گھڑتی ہے
تو بیٹھا بیٹھا اپنے بھائی کی غیبت کرتا ہے۔
اور اپنی ماں کے بیٹے پر تہمت لگاتا ہے۔
تو نے یہ کام کئے اور میں خاموش رہا۔
تو نے گمان کیا کہ میں بالکل تجھ ہی سا ہوں۔
لیکن میں تجھے ملامت کر کے ان کو تیری آنکھوں کے سامنے ترتیب دوں گا۔

اب اے خدا کو بھولنے والو! اسے سوچ لو۔
ایسا نہ ہو کہ میں تم کو پھاڑ ڈالوں اور کوئی چھڑانے والا نہ ہو۔ زبور ۵۰: ۱۶-۲۲

سیدنا مسیح کی لعنت

اسی طرح سیدنا مسیح نے بھی ان پر بارہا لعنت کی ہے جس کی مثالیں انجیلوں میں موجود ہیں۔ ہم بخیال اختصار صرف ایک مثال پر اکتفا کرتے ہیں۔ بنی اسرائیل کو خطاب کر کے فرماتے ہیں۔

"اے ریاکار فقیہو اور فریسیو، تم پر افسوس! تم بیواؤں کے گھروں کو دبا بیٹھے ہو اور دکھاوے کے لیے نماز کو طول دیتے ہو کہ ایک مرید کرنے کے لیے تری اور خشکی کا دورہ کرتے ہو اور جب وہ مرید ہو چکتا ہے تو اپنے سے دونا جہنم کا فرزند بنا دیتے ہو۔

اے اندھے راہ بتانے والو تم پر افسوس! جو کہتے ہو کہ اگر کوئی مقدس کی قسم کھائے تو کچھ بات نہیں لیکن اگر مقدس کے سونے کی قسم کھائے تو اس کا پابند ہوگا۔

اے احمقو اور اندھو، کون سا بڑا ہے، سونا یا مقدس جس نے سونے کو مقدس کیا اور پھر کہتے ہو کہ اگر کوئی قربان گاہ کی قسم کھائے تو کچھ بات نہیں لیکن جو نذر اس پر چڑھی ہو اگر اس کی قسم کھائے تو اس کا پابند ہوگا۔ اے اندھو، کون سی بڑی ہے نذر یا قربان گاہ جو نذر کو مقدس کرتی ہے۔...

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو، تم پر افسوس! کہ پودینہ اور سونف اور زیرے پر تو دہ یکی دیتے ہو پر تم نے شریعت کی زیادہ بھاری باتوں یعنی انصاف، رحم اور ایمان کو چھوڑ دیا ہے۔ لازم تھا کہ یہ بھی کرتے اور وہ بھی نہ چھوڑتے۔

اے اندھے راہ بتانے والو، مچھر کو چھانتے ہو اور اونٹ کو نگل جاتے ہو۔

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو، تم پر افسوس! کہ پیالے اور رکابی کو اوپر سے صاف کرتے ہو مگر وہ اندر لوٹ اور ناپرہیزگاری سے بھرے ہیں۔ اے اندھے فریسی! پہلے پیالے اور رکابی کو اندر سے صاف کر تاکہ اوپر سے بھی صاف ہو جائیں۔

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو، تم پر افسوس! کہ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کے مانند ہو جو اوپر سے تو خوب صورت دکھائی دیتی ہیں مگر اندر مردوں کی ہڈیوں اور ہر طرح کی نجاست سے بھری ہوتی ہیں۔ اسی طرح تم بھی ظاہر میں تو لوگوں کو راست باز دکھائی دیتے ہو مگر باطن میں ریاکاری اور بے دینی سے بھرے ہو۔

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو، تم پر افسوس! کہ نبیوں کی قبریں بناتے اور راست بازوں کے مقبرے آراستہ کرتے ہو اور کہتے ہو کہ اگر ہم اپنے باپ دادا کے زمانے میں ہوتے تو نبیوں کے خون میں ان کے شریک نہ ہوتے۔ اس طرح تم اپنی نسبت گواہی دیتے ہو کہ تم نبیوں کے قاتلوں کے فرزند ہو۔ غرض اپنے باپ دادا کا پیمانہ بھر دو۔

اے سانپو، اے افعی کے بچو! تم جہنم کی سزا سے کیوں کر بچو گے؟ اس لیے دیکھو میں نبیوں اور

داناؤں اور فقیہوں کو تمھارے پاس بھیجتا ہوں، ان میں سے تم بعض کو قتل کرو گے اور صلیب پر چڑھاؤ گے اور بعض کو اپنے عبادت خانوں میں کوڑے مارو گے اور شہر بہ شہر ستاتے پھرو گے تاکہ سب راست بازوں کا خون جو زمین پر بہایا گیا تم پر آئے۔ راست باز ہابل کے خون سے لے کر برکیاہ کے بیٹے زکریا کے خون تک جسے تم نے مقدس اور قربان گاہ کے درمیان قتل کیا۔ میں سچ کہتا ہوں کہ یہ سب کچھ اس زمانہ کے لوگوں پر آئے گا۔

اے یروشلم! اے یروشلم! تو جو نبیوں کو قتل کرتی اور جو تیرے پاس بھیجے گئے ان کو سنگسار کرتی ہے! کتنی بار میں نے چاہا کہ جس طرح مرغی اپنے بچوں کو پروں تلے جمع کر لیتی ہے اسی طرح میں بھی تیرے لڑکوں کو جمع کر لوں مگر تم نے نہ چاہا۔ دیکھو، تمھارا گھر تمھارے لیے ویران چھوڑا جاتا ہے۔ کیوں کہ میں تم سے کہتا ہوں کہ اب سے مجھے پھر ہرگز نہ دیکھو گے جب تک نہ کہو گے کہ مبارک ہے وہ جو خداوند کے نام سے آتا ہے۔ متی ۲۳: ۱۴-۳۹

نبیوں کا حوالہ پوری تاریخ کا حوالہ ہے

یہ بات ملحوظ رکھنے کی ہے کہ یہاں ذکر تو صرف حضرت داؤدؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی لعنت کا ہے لیکن تورات کے صحیفوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر نبی نے بنی اسرائیل پر لعنت کی ہے۔ بعض نبیوں کے الفاظ تو ان سے بھی کہیں سخت ہیں جو زبور اور انجیل سے اوپر نقل ہوئے ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ یہ دو نبیوں کا ذکر صرف ابتدا اور انتہا کو واضح کرنے کے لیے ہے۔ مقصود یہ بتانا ہے کہ داؤدؑ سے لے کر مسیحؑ تک ہر نبی نے اس بدبخت قوم پر لعنت کی ہے۔ حضرت داؤدؑ سے بنی اسرائیل کی سیاسی عظمت کی ابتدا ہوئی ہے، یہود کو ان پر بڑا فخر رہا ہے اور حضرت مسیحؑ اسرائیلی سلسلۂ نبوت کی آخری کڑی ہیں اس وجہ سے ان دونوں ناموں کے ذکر سے گویا پوری تاریخ سامنے آ گئی۔

جرم اور جرم پر اصرار موجب لعنت ہے

ذٰلِكَ بِمَا عَصَوا وَّكَانُوا يَعْتَدُونَ یہ ان کا جرم بیان ہوا ہے بِمَا عَصَوا میں وہ تمام جرائم آ گئے جو خدا اور اس کی شریعت کے حقوق سے تعلق رکھتے ہیں اور وَّكَانُوا يَعْتَدُونَ میں بندوں کے تمام حقوق آ گئے جو ان کے ہاتھوں پامال ہوئے۔ كَانُوا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنكَرٍ فَعَلُوهُ یہ ٹکڑا ان جرائم کی سنگینی کو واضح کر رہا ہے۔ کہ انھوں نے نہ صرف جرائم کیے بلکہ ان کے نبیوں اور راست بازوں نے ان جرائم سے ان کو روکنے کی کوشش کی تو ان کو بھی خاطر میں نہ لائے بلکہ ان کے دشمن بن گئے۔ کسی قوم کی اخلاقی و ایمانی تباہی کی یہی وہ حد ہے جس پر پہنچ کر وہ اللہ کی سنت کے بموجب لعنت کی مستحق بنتی ہے۔

یہود کی اخلاقی پستی کی انتہا

تَرٰى كَثِيرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِينَ كَفَرُوا، اَلَّذِينَ كَفَرُوا سے مراد مشرکین مکہ ہیں۔ یہود ایک طرف تو اپنی برگزیدگی پر اتنے نازاں تھے کہ کسی کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے، دوسری طرف ان کی ذہنی پستی کا یہ عالم تھا کہ مشرکین مکہ تک سے دوستی و اعتماد کے نہایت گہرے تعلقات رکھتے تھے اور ان کو مسلمانوں سے زیادہ ہدایت یافتہ قرار دیتے۔ سورۂ نساء میں ان کی اس حالت پر اظہارِ تعجب بھی

فرمایا ہے اور ان کی اس حرکت کی بنا پر ان پر لعنت بھی کی ہے۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ یُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَیَقُوْلُوْنَ لِلَّذِیْنَ كَفَرُوْا هٰۤؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سَبِیْلًا ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ یَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِیْرًا ۝ (۵۱-۵۲ نساء) (کیا تم نے ان کو نہیں دیکھا جن کو کتابِ الٰہی کا ایک حصہ ملا اور وہ جبت اور طاغوت پر عقیدہ رکھتے ہیں اور کفار کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ ایمان لانے والوں سے زیادہ ہدایت پر ہیں۔ یہی ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی اور جن پر اللہ لعنت کر دے تو ان کا تم کوئی مددگار نہیں پا سکتے) ٹھیک اسی طرح یہاں بھی ان پر لعنت کے ذکر کے بعد اس لعنت کے اسباب میں سے ان کی اس کفر دوستی کا بھی ذکر فرمایا۔

لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ الآیۃ۔ 'ان سخط اللہ' بیان ہے 'مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ' کا۔ گویا عمل کی جگہ اس کا نتیجہ سامنے رکھ دیا کہ وہ دیکھ لیں کہ جو کچھ انھوں نے کیا ہے اس کا کیا نتیجہ سامنے آنے والا ہے۔

وَلَوْ كَانُوْا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِیِّ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِیَآءَ الآیۃ۔ 'یُؤْمِنُوْنَ' اپنے حقیقی مفہوم میں ہے۔ 'نبی' سے مراد حضرت موسیٰ اور 'مَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ' سے مراد تورات ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ اللہ اور موسیٰ اور تورات پر ایمان کا جو دعویٰ کرتے ہیں یہ اپنے اس دعوے میں بالکل جھوٹے ہیں۔ اگر یہ فی الواقع اللہ پر اور اپنے نبی اور اپنی کتاب پر ایمان رکھتے ہوتے تو کبھی کفار و مشرکین کو اپنا دوست نہ بناتے۔ ان میں سے اکثر نافرمان ہیں اور ان کا یہ فعل ہی ان کی نافرمانی پر سب سے بڑی شہادت ہے۔

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوا الْیَهُوْدَ وَالَّذِیْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوا الَّذِیْنَ قَالُوْۤا اِنَّا نَصٰرٰى ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّیْسِیْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا یَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ (۸۲)

'قسیس' اور 'رہبان' سے مراد: 'قسیس' اور 'رہبان' کے الفاظ عرب کے نصاریٰ اپنے علماء اور زاہدوں کے لیے بولتے تھے جس طرح یہود اپنے علماء اور فقہاء کے لیے 'ربی'، 'ربانی' اور 'احبار' استعمال کرتے تھے۔ یہ الفاظ اہل کتاب ہی کے واسطہ سے عربی میں آئے۔ چونکہ عرب کے یہود و نصاریٰ کی عام زبان عربی تھی، ان میں بڑے بڑے شاعر اور ادیب تھے، اس وجہ سے ان کی یہ دینی اصطلاحیں عربی ادب میں معروف و مقبول ہو گئیں۔

یہود اسلام دشمنی میں مشرکین کے ہم پلہ: اس آیت میں یہود کو اسلام دشمنی کے اعتبار سے مشرکین مکہ کا ہم پلہ قرار دیا ہے اور یہ گویا اوپر والی بات 'تَرٰى كَثِیْرًا مِّنْهُمْ یَتَوَلَّوْنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا' کی تصریح مزید ہے۔ قرآن نے جگہ جگہ اسلام دشمنی کے معاملے میں ان دونوں گروہوں کی ہم مشربی و ہم آہنگی کو نمایاں کیا ہے اور مقصود اس سے، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، یہود کے زعم برتری و تقدس کی تردید ہے کہ دیکھو جن کو اپنی برتری کا یہ دعویٰ ہے وہ کس گڑھے میں جا کے گرے ہیں اور اسلام دشمنی کے جوش میں کن سے یارانہ انھوں نے گانٹھا ہے۔ حامل کتاب کو،

مکہ کے بت پرستوں سے یارانہ، وہ بھی اسلام کی دشمنی میں، ایمانی و اخلاقی انحطاط کی آخری حد ہے۔

سیدنا مسیح کے خلیفہ راشد شمعون کے پیرو نصاریٰ

ان کے مقابل میں نصاریٰ کی تعریف فرمائی ہے کہ وہ مسلمانوں سے قریب ہیں۔ یہاں قرائن دلیل ہیں کہ اس سے مراد یہ عام مسیحی نہیں ہیں جو پال کی ایجاد کردہ مسیحیت کے پیرو، تثلیث و کفارہ وغیرہ کے قائل اور اسلام دشمنی میں تمام اعدائے اسلام کے سرخیل ہیں بلکہ اس سے مراد سیدنا مسیح کے خلیفہ راشد شمعون صفا کے پیرو ہیں جو پال کی تمام بدعات سے بالکل الگ حضرت مسیح کی اصل تعلیم پر قائم رہے اور جن کے باقیات صالحات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد آپ کی دعوت پر اسلام لائے۔ نجاشی وغیرہ اسی باایمان گروہ سے تعلق رکھنے والے تھے۔ یہاں جو قرائن ہمارے اس نظریے کی تائید میں ہیں ان میں سے بعض یہ ہیں۔

پال کے پیرؤوں کی لفظ نصاریٰ سے بیزاری

ایک یہ کہ ان کی نسبت فرمایا ہے کہ اَلَّذِیۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّا نَصٰرٰیؕ (جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فرقہ کو اس وقت تک نہ صرف یہ کہ اپنے اس نام کی اہمیت و معنویت کا احساس تھا بلکہ ان کو اس پر فخر بھی تھا۔ یہ فرقہ، جیسا کہ نصاریٰ کی تاریخ سے ثابت ہے، صرف شمعون صفا کے پیرؤوں کا تھا، پال کے ماننے والوں کی نسبت ہم سورۂ بقرہ کی تفسیر میں بیان کر آئے ہیں کہ وہ اپنے کو نصاریٰ کہلانا حقیر سمجھتے تھے چنانچہ انھوں نے اس کو بدل کر 'مسیحی' نام اختیار کر لیا تھا۔ ولیم بلیکی اپنی بائبل ہسٹری میں لکھتا ہے

"بارنباس اور پال انطاکیہ میں ایک سال تک غیر خدا پرستوں کو نصرانی بنانے میں مصروف رہے۔

معلوم ہوتا ہے اسی سال (۴۳ھ میں) پہلی بار نصرانیت اختیار کرنے والوں کو مسیحی (CHRISTIAN) کا نیا اور شاندار نام دیا گیا۔" بائبل ہسٹری - ولیم بلیکی ص، ۴۹۷

اس عبارت میں "مسیحی کا نیا اور شاندار نام" کے الفاظ نگاہ میں رہیں۔ اس سے صاف واضح ہے کہ پال اور اس کے پیرو 'نصاریٰ' کے لفظ کو اپنے لیے حقیر خیال کرتے تھے اور موجودہ مسیحیت تمام تر اسی پال کی ایجاد ہے۔

دوسرا یہ کہ اس گروہ کی صفت یہ بیان فرمائی ہے کہ ان میں علماء اور زاہد ہیں اور وہ تکبر نہیں کرتے۔ ظاہر ہے کہ یہ صفت موجودہ عیسائیوں پر صادق نہیں آتی۔ علماء اور زہاد کے الفاظ یہاں نہایت اچھے معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔ یہ موجودہ کلیسائی نظام کے پروہتوں کے لیے کسی طرح بھی موزوں نہیں ہیں۔ پھر ان کے باب میں فرمایا ہے کہ "وہ تکبر نہیں کرتے۔" مجھے بار بار خیال ہوتا ہے کہ یہ سیدنا مسیح کی اس بات کی طرف اشارہ ہے جو انجیلوں میں ہے کہ "مبارک ہیں وے جو دل کے غریب ہیں، آسمان کی بادشاہی میں وہی داخل ہوں گے۔" موجودہ مسیحی جن کی رعونت کا یہ حال ہے کہ وہ اپنے اصلی نام کو بھی حقیر سمجھتے ہیں اور اس کی جگہ انھوں نے اپنے لیے ایک نیا نام پسند کیا ہے وہ اس صفت کے مصداق کس طرح قرار دیے جا سکتے ہیں۔

تیسرا یہ کہ اس گروہ کے متعلق آگے کی آیات میں صاف تصریح ہے کہ یہ سب لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر دلی جوش و خروش کے ساتھ ایمان لائے اور قرآن کا انھوں نے اس طرح والہانہ خیر مقدم کیا گویا وہ مدتوں سے

اس کے لیے سراپا شوق و انتظار تھے۔

وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ ۙ وَنَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ ۝ فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ (۸۳-۸۶)

قرآن کے بارے میں اچھے نصاریٰ کا طرزِ عمل

اس گروہ نے جس والہانہ انداز میں قرآن اور پیغمبر آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کا خیر مقدم کیا یہ اس کی تصویر ہے۔ اس تصویر میں یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ حضرت عیسیٰ نے انجیلوں میں جس تسلی دینے والے اور جس نجات دہندہ کی بشارت دی تھی اور اس کی جو علامتیں بتائی تھیں وہ ان میں سے ایک ایک چیز کو محفوظ کیے ہوئے اس آنے والے کی راہ دیکھتے رہے تھے یہ آنے والا نہایت محبوب تھا اس لیے کہ ان کی تمام امیدیں، دنیا اور آخرت دونوں میں، اب اسی سے وابستہ تھیں، اس کی آمد سے ان کی، ان کے صحیفوں کی اور ان کے نبیوں کی صداقت ثابت ہونے والی تھی اس لیے کہ سب نے اس کی منادی کی تھی، ان کو اس کے ہراول دستہ میں شامل ہونے کی سرفرازیاں حاصل ہونے والی تھیں اس لیے کہ وہ پہلے سے دنیا کے سامنے اس کے گواہ اور اس کے تعارف کرانے والے ٹھہرائے گئے تھے۔ اس کا ظہور خدا کی زمین میں اس آسمانی بادشاہی کا ظہور تھا جس کی مسیح نے بشارت دی تھی اور جس میں اللہ کے وہ سارے بندے حصہ پانے والے تھے جن کے دل غرور اور گھمنڈ کی آلائشوں سے پاک اور خشیتِ الٰہی کے نور سے معمور تھے۔ چنانچہ ان کا حال یہ ہے کہ جب وہ قرآن پاک کی آیات سنتے اور ان کے اندر اس حق کی کرنیں جلوہ گر دیکھتے ہیں جس کے انتظار میں بے قراری کی طویل راتیں کاٹ چکے ہیں تو جوشِ مسرت سے ان کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو جاتی ہیں اور وہ پکار اُٹھتے ہیں کہ اے رب! ہم اس کتاب پر اور اس کے لانے والے پر ایمان لائے، تو ہمیں اس کی گواہی دینے والوں کے زمرے میں لکھ۔ "گواہی دینے والوں کے زمرے میں لکھ" اس قدیم عہد کا اقرار ہے جس کے وہ پچھلے نبیوں کی امانتوں اور ان کی سپرد کردہ ذمہ داریوں کے حامل ہونے کی وجہ سے پابند تھے۔ وہ عہد جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، یہ تھا کہ جب آخری نبی، آخری کتاب کے ساتھ آئیں تو تم آگے بڑھ کر خلق کے سامنے گواہی دینا کہ یہی ہیں وہ جن کی ہمارے صحیفوں میں پیشین گوئی تھی۔ اور پھر اس پر خود بھی ایمان لانا اور دوسروں کو بھی اس پر ایمان لانے کی دعوت دینا۔

وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الآیۃ۔ یہ ان کی طرف سے از خود اپنے اس اقدام کی تائید میں دلیل ہے کہ جب ہم یہ توقع لیے بیٹھے ہیں کہ خدا ہمیں زمرۂ صالحین میں داخل کرے گا تو آخر اللہ اور اس حق پر جو ہمارے پاس آیا ہے، ایمان لائے بغیر ہمیں یہ توقع کرنے کا کیا حق ہے۔

اوپر فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ اور پھر وَنَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ میں

ان یہود و نصاریٰ پر نہایت لطیف تعریض بھی ہے جو اپنا سارا زور تو صرف کر رہے تھے اس رسول کی مخالفت پر جس کی گواہی دینے پر مامور کیے گئے تھے لیکن توقع بلکہ دعویٰ یہ رکھتے تھے کہ آخرت کی کامیابیاں اور جملہ سرفرازیاں تنہا انھی کا حصہ ہیں۔

۲۲۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۸۷-۱۲۰

آگے کا حصہ، آخر سورہ تک، خاتمۂ سورہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں انھی باتوں سے متعلق، جو اس سورہ کے شروع میں بیان ہوئی ہیں یا ان سے تعلق رکھتی ہیں بالعموم جو سوالات پیدا ہوئے ہیں یا پیدا ہو سکتے تھے، ان کے جوابات دیے گئے ہیں اور یہ اشارہ بھی فرما دیا گیا ہے کہ یہ توضیحی آیات ہیں۔ ساتھ ہی یہ تنبیہ بھی ہے کہ جو سوالات مفید تھے ان کے جوابات دے دیے گئے ہیں، رہے غیر ضروری سوالات تو اس قسم کے سوالات نزولِ قرآن کے دوران نہ پوچھو ــــ غیر ضروری سوالات پوچھ پوچھ کر یہود نے اپنے اوپر بہت سی قیدیں اور پابندیاں عائد کرالیں، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ان کو نباہ نہ سکے اور بالآخر کفر میں مبتلا ہوئے۔

آخر میں قیام عدل و قسط اور شہادتِ حق کی اس عظیم ذمہ داری کے تعلق سے، جو اس سورہ میں مرکزی مضمون کی حیثیت رکھتی ہے اور جس کا ذکر آیت ۸ میں ہوا ہے، اس شہادت کی تفصیل بیان ہوئی ہے جو حضرات انبیاء علیہم السلام قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے حضور میں دیں گے کہ انھوں نے اپنی اپنی امتوں کو بے کم وکاست وہ حق پہنچا دیا تھا جس کے پہنچا دینے کی ان پر ذمہ داری ڈالی گئی تھی۔ رہی یہ بات کہ ان کی امتوں نے اس کے ساتھ کیا معاملہ کیا تو یہ ان امتوں کی ذمہ داری ہے۔ اس تفصیل سے مقصود یہود و نصاریٰ کو عموماً اور اس امت کو خصوصاً یہ بتانا مقصود ہے کہ اسی شہادت کے مطابق اللہ تعالیٰ ہر امت پر حجت تمام کرے گا اور جس امت نے نبی کی تعلیم و شہادت کے خلاف اللہ کے دین میں کوئی ردّ و بدل کیا ہو گا وہ اس کی ذمہ دار ٹھہرے گی۔ یہاں اگرچہ مثال صرف حضرت عیسیٰؑ کی شہادت کی پیش کی گئی ہے، اور اس کے کچھ وجوہ ہیں جن کی تفصیل اپنے محل میں آئے گی، لیکن مقصود یہ بتانا ہے کہ اسی طرح اللہ تعالیٰ تمام انبیاء سے شہادت لے گا۔ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی طرح شہادت دیں گے اور اسی شہادت کی بنا پر آپ کی اُمت پر حجت قائم ہو گی۔ یہ گویا تنبیہ ہے اس امر کے لیے کہ جو لوگ اب قَوّٰمِیْنَ لِلّٰہِ شُھَدَآءَ بِالْقِسْطِ بنائے جا رہے ہیں اور جن سے شریعتِ الٰہی پر قائم رہنے اور اس کو قائم کرنے کا عہد لیا جا رہا ہے وہ اپنی ذمہ داریاں ادا کرتے ہوئے آخرت کی اس شہادت کو یاد رکھیں۔ گویا سورہ کے شروع میں اس امت سے جو میثاق لیا گیا ہے، سورہ کے آخر میں اس کی اخروی ذمہ داریوں کی یاد دہانی کر دی گئی۔

یہ آگے کے مضامین کے نظم کو سمجھنے کے لیے چند نشانات کی طرف ہم نے اشارہ کر دیا ہے۔ تفصیل آیات کی تفسیر کے تحت آئے گی۔ اس روشنی میں اب آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۸۷-۱۰۰

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا
تَعْتَدُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۸۷﴾ وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ
اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۠ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾
لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ
بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ۚ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ
مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ۭ
فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ۭ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ
اِذَا حَلَفْتُمْ ۭ وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ
اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۸۹﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ
وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ
فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۹۰﴾ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ
بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاۗءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ
ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ﴿۹۱﴾ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ
وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰي
رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۹۲﴾ لَيْسَ عَلَي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ
الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۹۳﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَيَبْلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ بِشَيْءٍ مِّنَ

ع ۱۲ / ۲

الصَّيْدِ تَنَالُهُ أَيْدِيكُمْ وَرِمَاحُكُمْ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَخَافُهُ بِالْغَيْبِ ۚ
فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٩٤﴾ يٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ
اٰمَنُوا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَأَنْتُمْ حُرُمٌ ۚ وَمَنْ قَتَلَهُ مِنْكُمْ مُتَعَمِّدًا
فَجَزَآءٌ مِثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِنْكُمْ
هَدْيًا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ أَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِينَ أَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا
لِيَذُوقَ وَبَالَ أَمْرِهٖ ۗ عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ ۚ وَمَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ
مِنْهُ ۚ وَاللّٰهُ عَزِيزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿٩٥﴾ أُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهُ
مَتَاعًا لَكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ ۖ وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا ۗ
وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيٓ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ﴿٩٦﴾ جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ
الْحَرَامَ قِيٰمًا لِلنَّاسِ وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ وَالْهَدْيَ وَالْقَلَآئِدَ ۚ ذٰلِكَ
لِتَعْلَمُوٓا أَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَأَنَّ
اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿٩٧﴾ اِعْلَمُوٓا أَنَّ اللّٰهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ وَ
أَنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٩٨﴾ مَا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلٰغُ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ
مَا تُبْدُونَ وَمَا تَكْتُمُونَ ﴿٩٩﴾ قُلْ لَا يَسْتَوِي الْخَبِيثُ وَالطَّيِّبُ
وَلَوْ أَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيثِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰٓأُولِي الْأَلْبٰبِ لَعَلَّكُمْ
تُفْلِحُونَ ﴿١٠٠﴾ يٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَآءَ إِنْ تُبْدَ لَكُمْ ع ۱۳
تَسُؤْكُمْ ۚ وَإِنْ تَسْأَلُوا عَنْهَا حِينَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ ۖ
عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا ۗ وَاللّٰهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ ﴿١٠١﴾ قَدْ سَأَلَهَا قَوْمٌ مِنْ قَبْلِكُمْ

ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۲﴾ مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ
وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ ۙ وَّلٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ
الْكَذِبَ ؕ وَاَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى
مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ
اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۴﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ؕ اِلَى اللّٰهِ
مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِيْنَ الْوَصِيَّةِ
اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَيْرِكُمْ اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ
فِى الْاَرْضِ فَاَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةُ الْمَوْتِ ؕ تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْۢ بَعْدِ
الصَّلٰوةِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ اِنِ ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِىْ بِهٖ ثَمَنًا وَّلَوْ كَانَ
ذَا قُرْبٰى ۙ وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ ۙ اللّٰهِ اِنَّآ اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِيْنَ ﴿۱۰۶﴾ فَاِنْ
عُثِرَ عَلٰۤى اَنَّهُمَا اسْتَحَقَّاۤ اِثْمًا فَاٰخَرٰنِ يَقُوْمٰنِ مَقَامَهُمَا مِنَ
الَّذِيْنَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْاَوْلَيٰنِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ لَشَهَادَتُنَاۤ اَحَقُّ
مِنْ شَهَادَتِهِمَا وَمَا اعْتَدَيْنَاۤ ۖ اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۷﴾ ذٰلِكَ
اَدْنٰۤى اَنْ يَّاْتُوْا بِالشَّهَادَةِ عَلٰى وَجْهِهَاۤ اَوْ يَخَافُوْۤا اَنْ تُرَدَّ اَيْمَانٌۢ
بَعْدَ اَيْمَانِهِمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاسْمَعُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ
الْفٰسِقِيْنَ ﴿۱۰۸﴾ ع يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَاۤ اُجِبْتُمْ ؕ قَالُوْا

ع ۱۴ / ۴

لَا عِلْمَ لَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿۱۰۹﴾ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ
(وقف لازم) مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ وَعَلٰى وَالِدَتِكَ ۘ اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ
الْقُدُسِ ۣ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۚ وَاِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَ
الْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۚ وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ
بِاِذْنِيْ فَتَنْفُخُ فِيْهَا فَتَكُوْنُ طَيْرًۢا بِاِذْنِيْ وَتُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ
بِاِذْنِيْ ۚ وَاِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِاِذْنِيْ ۚ وَاِذْ كَفَفْتُ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ عَنْكَ
اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ
مُّبِيْنٌ ﴿۱۱۰﴾ وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِيْ وَبِرَسُوْلِيْ ۚ
قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ اِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى
ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَاۗىِٕدَةً مِّنَ
السَّمَاۗءِ ۭ قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾ قَالُوْا نُرِيْدُ اَنْ
نَّاْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمَىِٕنَّ قُلُوْبُنَا وَنَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَنَكُوْنَ
(الربع) عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۱۱۳﴾ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَآ اَنْزِلْ
عَلَيْنَا مَاۗىِٕدَةً مِّنَ السَّمَاۗءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَ
اٰيَةً مِّنْكَ ۚ وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ قَالَ اللّٰهُ اِنِّىْ مُنَزِّلُهَا
عَلَيْكُمْ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّىْٓ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّآ اُعَذِّبُهٗٓ
(ع ۱۵ / ۵) اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۱۵﴾ ع وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ
قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ قَالَ سُبْحٰنَكَ

مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ بِحَقٍّ ؕ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ؕ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿۱۱۶﴾ مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِيْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۚ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ؕ وَاَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿۱۱۷﴾ اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۱۸﴾ قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ ؕ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۱۹﴾ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا فِيْهِنَّ ؕ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۲۰﴾

وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم

ع ۱۶ / ۵ / ۶

ترجمۂ آیات ۸۷-۱۲۰

اے ایمان والو، ان پاکیزہ چیزوں کو حرام نہ ٹھہراؤ جو خدا نے تمھارے لیے جائز کی ہیں اور نہ حدود سے تجاوز کرو۔ اللہ حدود سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ خدا نے تمھیں جو حلال و طیب چیزیں بخشی ہیں ان کو برتو اور اس سے ڈرتے رہو جس پر تم ایمان لائے ہو۔ تمھاری قسموں میں جو غیر ارادی ہیں ان پر تو اللہ تم سے مواخذہ نہیں کرے گا لیکن جن قسموں کو تم نے پختہ کیا ہے ان پر مواخذہ کرے گا۔ سو اس کا کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے اس معیار کا جو تم عام طور پر اپنے اہل و عیال کو کھلاتے ہو یا ان کو کپڑے پہنانا یا ایک غلام کو آزاد کرنا ہے جو اس کی مقدرت نہ رکھتا ہو وہ تین دن کے روزے رکھ دے۔ یہ تمھاری قسموں کا کفارہ ہے

جب کہ تم قسم کھا بیٹھو اور اپنی قسموں کی حفاظت کرو۔ اس طرح اللہ تمھارے لیے اپنے احکام کی وضاحت کرتا ہے تاکہ تم اس کے شکرگزار رہو۔ ۸۰ - ۸۹

اے ایمان والو، شراب، جُوا، تھان اور پانسے کے تیر بالکل نجس شیطانی کاموں میں سے ہیں تو ان سے بچو تاکہ تم فلاح پاؤ۔ شیطان تو بس یہ چاہتا ہے کہ تمھیں شراب اور جُوئے میں لگا کر تمھارے درمیان دشمنی اور کینہ ڈالے اور تمھیں اللہ کی یاد اور نماز سے روکے تو بتاؤ کیا اب تم ان سے باز آتے ہو! اور اللہ کی اطاعت کرو، رسول کی اطاعت کرو اور بچتے رہو۔ اگر تم اعراض کرو گے تو جان رکھو کہ ہمارے رسول کے ذمہ صرف واضح طور پر پہنچا دینا ہے۔ ایمان لانے والوں اور عمل صالح کرنے والوں پر اس چیز کے باب میں کوئی گناہ نہیں جو انھوں نے کھائی جب کہ انھوں نے تقویٰ اختیار کیا، ایمان لائے اور عمل صالح کیا، پھر تقویٰ اختیار کیا اور ایمان لائے، پھر تقویٰ اختیار کیا اور خوبی کے ساتھ اس کا حق ادا کیا اور اللہ خوب کاروں کو دوست رکھتا ہے۔ ۹۰ - ۹۳

اے ایمان والو! اللہ تمھاری کسی ایسے شکار سے آزمائش کرے گا جو تمھارے ہاتھوں اور نیزوں کی زد میں آجائے گا تاکہ اللہ دیکھے کہ کون اس سے غیب میں ڈرتا ہے اور جس نے اس کے بعد حدود سے تجاوز کیا تو اس کے لیے ایک دردناک عذاب ہے۔ اے ایمان والو! حالت احرام میں شکار نہ کیجیو، اور جو تم میں سے اس کو قصداً مارے گا تو اس کا بدلہ اسی طرح کا جانور ہے جیسا کہ اس نے مارا ہے، جس کا فیصلہ تم میں سے دو معتبر کریں گے۔ یہ نیاز کی حیثیت سے خانہ کعبہ کو پہنچایا جائے

یا کفارہ دینا ہوگا، مسکینوں کو کھانا یا اسی کے برابر روزے رکھنے ہوں گے تاکہ وہ اپنے کیے کا وبال چکھے۔ جو ہو چکا اللہ نے اس سے درگزر کیا۔ لیکن جو کوئی پھر کرے گا تو اللہ اس سے انتقام لے گا اور اللہ غالب اور انتقام والا ہے۔ اور تمہارے لیے دریا کا شکار اور اس کا کھانا جائز کیا گیا، تمہارے اور قافلوں کے زادِ راہ کے لیے۔ اور خشکی کا شکار جب تک تم احرام میں ہو، تم پر حرام کیا گیا۔ اس اللہ سے ڈرتے رہو جس کے حضور میں سب حاضر کیے جاؤ گے۔ اللہ نے کعبہ، حرمت والے گھر کو، لوگوں کے لیے مرکز بنایا اور حرمت کے مہینوں، قربانی کے جانوروں اور گلے میں پٹے پڑے جانوروں کو شعیرہ ٹھہرایا۔ یہ اس لیے کہ تم جانو کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔ جان رکھو کہ اللہ سخت عذاب دینے والا بھی ہے اور بڑا بخشنے والا اور مہربان بھی۔ رسول پر صرف پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے، اللہ جانتا ہے جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو۔ کہہ دو کہ ناپاک اور پاک دونوں یکساں نہیں ہو سکتے اگرچہ ناپاک کی کثرت تمہیں فریفتہ کرنے والی ہو، پس اللہ سے ڈرتے رہو اے اہلِ عقل تاکہ تم فلاح پاؤ۔ ۹۴-۱۰۰

اے ایمان والو! ایسی باتوں سے متعلق سوال نہ کرو جو اگر ظاہر کر دی جائیں تو تمھیں گراں گزریں اور اگر تم ان کی بابت ایسے زمانے میں سوال کرو گے جب قرآن اُتر رہا ہے تو تم پر ظاہر کر دی جائیں گی۔ اللہ نے ان سے درگزر فرمایا۔ اللہ بخشنے والا اور بُردبار ہے۔ اسی طرح کی باتیں تم سے پہلے ایک قوم نے پوچھیں تو وہ ان کے منکر ہو کے رہ گئے۔ اللہ نے تو نہ بحیرہ مشروع کیا، نہ سائبہ، نہ وصیلہ، نہ حام۔ جنھوں نے کفر

کیا ہے وہ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں اور ان میں سے اکثر سمجھ سے عاری ہیں۔ اور جب ان کو دعوت دی جاتی ہے کہ اس چیز کی طرف آؤ جو اللہ نے اتاری ہے اور رسول کی طرف آؤ تو جواب دیتے ہیں کہ ہمارے لیے وہی کافی ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا اس صورت میں بھی جب کہ ان کے باپ دادا نہ کچھ جانتے رہے ہوں نہ ہدایت پر رہے ہوں؟ اے ایمان والو! تم اپنی فکر رکھو، اگر تم ہدایت پر ہو تو جو گمراہ ہوا وہ تمھارا کچھ نہیں بگاڑے گا۔ اللہ ہی کی طرف تم سب کا پلٹنا ہے، وہ تمھیں بتائے گا جو کچھ تم کرتے رہے ہو۔ ۱۰۱-۱۰۵

اے ایمان والو، تمھارے درمیان گواہی بوقت وصیت جب کہ تم میں سے کسی کی موت کا وقت آپہنچا ہو اس طرح ہے کہ دو معتبر آدمی تم میں سے گواہ ہوں یا دو دوسرے تمھارے غیروں میں سے اگر تم سفر میں ہو اور وہیں تمھیں موت کی مصیبت آپہنچے۔ تم ان کو نماز کے بعد روک لو۔ پس وہ اللہ کی قسم کھائیں اگر تمھیں شک ہو کہ ہم اس کے بدلے میں کوئی قیمت قبول نہیں کریں گے اگرچہ کوئی قرابت دار ہی کیوں نہ ہو اور نہ ہم اللہ کی گواہی کو چھپائیں گے۔ اگر ہم ایسا کریں تو بے شک ہم گنہگار ٹھہریں۔ پس اگر پتہ چلے کہ یہ دونوں کسی حق تلفی کے مرتکب ہوتے ہیں تو ان کی جگہ دوسرے دو ان میں سے کھڑے ہوں جن کی مقدم گواہوں نے حق تلفی کی ہے پس وہ اللہ کی قسم کھائیں کہ ہماری گواہی ان دونوں کی گواہی سے زیادہ راست ہے اور ہم نے کوئی تجاوز نہیں کیا ہے، اگر ہم نے ایسا کیا ہے تو ہم ظالم ٹھہریں۔ یہ طریقہ اس امر کے قرین ہے کہ وہ ٹھیک ٹھیک گواہی دیں یا اس بات سے ڈریں کہ ان کی گواہی کے بعد ان کی گواہی رد ہو جائے گی اور اللہ

سے ڈرو اور سنو۔ اللہ نافرمانوں کو راہ یاب نہیں کرتا۔ ۱۰۶ - ۱۰۸

اس دن کو یاد رکھو جس دن اللہ سب رسولوں کو جمع کرے گا پھر پوچھے گا کہ تمہیں کیا جواب ملا، وہ کہیں گے ہمیں کچھ علم نہیں، غیب کی باتوں کا جاننے والا تو بس تو ہی ہے۔ جب کہ اللہ کہے گا، اے عیسیٰ ابن مریم! میرے اس فضل کو یاد کرو جو میں نے تم پر اور تمہاری والدہ پر کیا۔ جب کہ میں نے روح القدس سے تمہاری تائید کی۔ تم لوگوں سے کلام کرتے تھے گہوارے میں بھی اور ادھیڑ ہو کر بھی۔ اور یاد کرو جب کہ میں نے تمہیں کتاب و حکمت اور تورات و انجیل کی تعلیم دی۔ اور یاد کرو جب کہ تم مٹی سے ایک صورت پرندے کی صورت کی مانند میرے حکم سے بناتے تھے پھر تم اس میں پھونک مارتے تھے تو وہ میرے حکم سے پرندہ بن جاتی تھی اور تم اندھے اور کوڑھی کو میرے حکم سے اچھا کر دیتے تھے۔ اور یاد کرو جب کہ تم مُردوں کو میرے حکم سے نکال کھڑا کرتے تھے۔ اور یاد کرو جب کہ بنی اسرائیل کے شر کو میں نے تم سے دُور رکھا جب کہ تم ان کے پاس کھلی ہوئی نشانیاں لے کر آئے تو ان کے کافروں نے کہا کہ یہ تو بس صریح جادو ہے۔ اور یاد کرو جب کہ میں نے حواریوں کی طرف وحی کی کہ مجھ پر اور میرے رسُول پر ایمان لاؤ تو وہ بولے کہ ہم ایمان لائے اور تو گواہ رہ کہ ہم مسلم ہیں۔ یاد کرو جب کہ حواریوں نے کہا کہ اے عیسیٰ ابن مریم کیا تمہارا رب یہ کر سکتا ہے کہ ہم پر آسمان سے ایک خوان اتارے۔ اس نے کہا اللہ سے ڈرو اگر تم سچے مومن ہو۔ وہ بولے کہ ہم چاہتے ہیں کہ ہم اس میں سے کھائیں اور ہمارے دل مطمئن ہوں اور ہم یہ جان لیں کہ تو نے سچ کہا اور ہم اس کی گواہی دینے والے بنیں۔ عیسیٰ ابنِ مریم نے دعا کی، اے اللہ، ہمارے پروردگار، تو ہم پر آسمان سے ایک

خوان اتار، جو ہمارے لیے ایک یادگار بن جائے، ہمارے اگلوں اور پچھلوں کے لیے اور تیری طرف سے ایک نشانی ٹھہرے، عطا فرما تو بہترین عطا فرمانے والا ہے۔ اللہ نے فرمایا، میں یہ خوان ضرور تم پر اتاروں گا لیکن اس کے بعد جو تم میں سے کفر کرے گا تو میں اس کو سزا بھی وہ دوں گا جو جہان والوں میں سے کسی کو نہ دوں گا اور یاد کرو جب کہ اللہ پوچھے گا کہ اے عیسیٰ ابن مریم! کیا تم نے لوگوں کو کہا تھا کہ مجھ کو اور میری ماں کو خدا کے سوا معبود بناؤ۔ وہ جواب دے گا تو پاک ہے، میرے لیے کیسے روا تھا کہ میں وہ بات کہوں جس کا مجھے کوئی حق نہیں۔ اگر میں نے یہ کہی تو تو اسے جانتا ہے۔ تو جانتا ہے جو کچھ میرے دل میں ہے، پر میں نہیں جانتا جو تیرے دل میں ہے۔ غیب کی باتوں کا جاننے والا تو بس تو ہی ہے۔ میں نے تو ان سے وہی بات کہی جس کا تو نے مجھے حکم دیا کہ اللہ کی بندگی کرو جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی اور میں ان پر گواہ رہا جب تک ان میں موجود رہا۔ پھر جب تو نے مجھے اٹھا لیا تو تو ہی ان پر نگران رہا اور تو تو ہر چیز پر گواہ ہے ہی۔ اگر تو ان کو سزا دے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو انھیں بخش دے تو تو غالب اور حکمت والا ہے۔ اللہ فرمائے گا آج سچوں کو ان کی سچائی کے نفع پہنچانے کا دن ہے۔ ان کے لیے باغ ہوں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی جن میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔ آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے سب کی بادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۱۰۹-۱۲۰

۲۲- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ

وَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ (۸۷-۸۸)

طیبات کی وضاحت

'طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ' اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں ہمارے لیے حلال ٹھہرائی ہیں اگرچہ وہ سب طیبات کے حکم میں ہیں اس وجہ سے یہاں اس لفظ کے اضافہ کی بظاہر ضرورت نہیں معلوم ہوتی لیکن اس کا ایک خاص فائدہ ہے۔ وہ یہ کہ بعض اوقات چیز تو فی الاصل جائز ہوتی ہے لیکن کسی خارجی سبب سے اس کو خباثت لاحق ہو جاتی ہے۔ مثلاً ایک جانور حلال ہے لیکن اس کو ذبح نہیں کیا گیا یا ذبح تو کیا گیا لیکن اس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا یا اس کو کسی تھان یا استھان کی نذر کیا گیا تو ان صورتوں میں وہ جانور جائز ہونے کے باوجود طیب و پاکیزہ نہیں رہے گا۔ اس وجہ سے وہ ناجائز قرار پائے گا۔

'اعتداء' کا مفہوم

'لَا تَعْتَدُوْا' یہاں 'لَا تُحَرِّمُوْا' کا مقابل ہے یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ کی جائز کردہ چیزوں میں سے 'طیبات' کو حرام ٹھہرانا جائز نہیں ہے اسی طرح اس کی حرام کردہ چیزوں کو حلال بنا لینا بھی جائز نہیں ہے۔ یہ 'اعتداء' یعنی اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حدود سے تجاوز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ساری چیزیں ہمارے لیے پیدا کی ہیں، ہمیں ان کے کھانے پینے اور برتنے کی اجازت ہے۔ گنتی کی چند چیزیں ہیں جو حرام قرار دی گئی ہیں۔ ان کی حیثیت اللہ کے حدود کی ہے اور حدود کو لانگنے کی اجازت نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص ان حدود سے آگے بڑھنے کی جسارت کرتا ہے تو وہ محارم الٰہی کے حدود میں مداخلت کرتا ہے، اللہ تعالیٰ ایسے گستاخوں اور بے دقوفوں کو پسند نہیں کرتا۔ 'پسند نہیں کرتا'، یعنی ان سے نفرت کرتا ہے۔ لفظ اعتداء کا یہی مفہوم آگے آیت ۹۴ میں بھی ہے۔

بعض سوالوں کے جواب

ہم اوپر تمہید میں اشارہ کر چکے ہیں کہ اس سورہ کے شروع میں جو احکام بیان ہوئے ہیں ان سے متعلق جو سوالات بعد میں پیدا ہوئے یا پیدا ہو سکتے تھے اب آخر میں ان کی وضاحت کر دی گئی ہے۔ پیچھے مڑ کر سورہ کی آیات ۱-۲ پر نظر ڈال لیجیے۔ عہد و پیمان کی پابندی کی تمہید کے بعد یہ بتایا ہے کہ تمہارے لیے تمام چوپائے جائز ٹھہرائے گئے ہیں بجز چند مستثنیات کے جو یہ یہ ہیں۔ اب ان سے متعلق کئی سوالات ہیں جو ذہن میں پیدا ہو سکتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ اگر اللہ کے نام پر باندھے ہوئے عہد و پیمان کی پابندی کی اہمیت دین میں اس درجہ ہے تو کوئی شخص اگر شریعتِ الٰہی کے خلاف کسی چیز کو اپنے اوپر حرام یا حلال ٹھہرانے کی قسم کھا بیٹھے تو اس کا کیا حکم ہے یا کوئی شخص اپنی کھائی ہوئی قسم کو توڑ دے تو اس کے باب میں کیا ہدایت ہے؟ اگر شعائر الٰہی، ہدی اور قلائد وغیرہ کی حرمت کی اس درجہ تاکید ہے تو جو جانور قدیم زمانے سے مذہبی رسوم ہی کی بنا پر محترم چلے آ رہے ہیں، مثلاً بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام، ان کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ یہ اور ان کے علاوہ دوسرے متعدد سوالات ابتدا میں بیان کردہ احکام سے متعلق پیدا ہوئے۔ اب یہ قرآن نے ان سوالوں کو لیا ہے اور آگے کی آیات میں ان کے جواب دیے ہیں۔

تحریم کا مفہوم

سب سے پہلے یہ جامع اور اصولی بات فرمائی کہ خدا کی شریعت نے جو چیز جائز ٹھہرائی ہے اس کو نہ تو حرام قرار دو اور نہ جن چیزوں سے روکا ہے ان کو جائز بناؤ۔ 'حرام ٹھہرانے' سے مراد کسی شے کو اس حیثیت سے اپنے لیے یا دوسروں کے لیے ممنوع ٹھہرانا ہے کہ اس کے متعلق وہ یہ گمان یا دعویٰ کرے کہ یہ خدا کا حکم ہے، یا اس پر عذاب و ثواب مترتب ہوتا ہے یا یہ نیکی اور فضیلت میں داخل ہے۔ اگر اس قسم کی کوئی بات نہ ہو بلکہ مجرد ذوق یا باقتضائے صحت یا برنبائے احتیاط و کفایت کسی چیز کا استعمال کوئی شخص ترک کر دے تو یہ چیز تحریم میں داخل نہیں ہے۔

اپنے جی سے تحریم و تحلیل حدود الٰہی میں مداخلت ہے

یہ بات یہاں یاد رکھنے کی ہے کہ یہ تحریم و تحلیل حاکمیت الٰہی کے حدود میں مداخلت اور نقض میثاق کا نہایت وسیع دروازہ ہے۔ یہ مداخلت جس طرح حرام کو حلال کرنے کی راہ سے ہوتی ہے اسی طرح حلال کو حرام قرار دینے کی راہ سے بھی ہوتی ہے۔ حرام کو حلال کرنے کی راہ تو زیادہ تر خواہشاتِ نفس کی تحریک سے کھلی ہے لیکن حلال کو حرام ٹھہرانے کے معاملہ میں زیادہ دخل مشرکانہ عقائد و اوہام کو رہا ہے چنانچہ مشرکین عرب نے اپنے مشرکانہ تصورات کے تحت بہت سی چیزیں اپنے اوپر حرام کر لی تھیں۔ آگے آیت ۱۰۳ میں بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام کا ذکر آ رہا ہے۔ مزید تفصیل سورۂ انعام میں یوں آئی ہے۔ وَقَالُوا هَٰذِهِ أَنْعَامٌ وَحَرْثٌ حِجْرٌ لَا يَطْعَمُهَا إِلَّا مَنْ نَشَاءُ بِزَعْمِهِمْ وَأَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُورُهَا وَأَنْعَامٌ لَا يَذْكُرُونَ اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهَا افْتِرَاءً عَلَيْهِ سَيَجْزِيهِمْ بِمَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ۝ وَقَالُوا مَا فِي بُطُونِ هَٰذِهِ الْأَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِذُكُورِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلَىٰ أَزْوَاجِنَا وَإِنْ يَكُنْ مَيْتَةً فَهُمْ فِيهِ شُرَكَاءُ سَيَجْزِيهِمْ وَصْفَهُمْ إِنَّهُ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ۱۳۸-۱۳۹ (اور وہ کہتے ہیں کہ فلاں فلاں چوپائے اور فلاں فلاں قسم کی زمینی پیداوار حرام ہے، ان کو نہیں کھا سکتے مگر وہی جن کو ہم بتائیں۔ ان کا یہ دعویٰ محض اٹکل پچو ہے۔ اور کچھ جانور ہیں جن پر سواری حرام کر دی گئی ہے اور کچھ پر خدا کا نام نہیں لیتے محض خدا پر جھوٹ باندھتے ہوئے، اللہ ان کے اس افترا کا ان کو جلد بدلہ دے گا اور وہ کہتے ہیں کہ جو بچے فلاں فلاں ماداؤں کے پیٹ میں ہیں وہ خاص مردوں ہی کے لیے جائز ہیں، عورتوں کے لیے وہ حرام ہیں اور اگر وہ مُردہ پیدا ہوں تو مرد اور عورت دونوں ان کو کھا سکتے ہیں، اللہ ان کے اس فتوے کی ان کو جلد سزا دے گا، وہ حکیم و علیم ہے) اسی طرح یہود کے متعلق بھی قرآن میں بیان ہوا ہے کہ بہت سی چیزیں انھوں نے اپنے من گھڑت فتووں، اپنے لایعنی سوالات اور اپنے مشرکانہ اوہام کی بنا پر اپنے اوپر حرام کر لیں۔ قرآن نے اس قسم کی خود مختارانہ تحریم و تحلیل کو توحید اور ایمان کے منافی قرار دیا۔ فرمایا کہ تمام حلال و طیب چیزیں جو خدا نے تمھیں بخشی ہیں ان کو کھاؤ پیو اور برتو، اپنے زمانۂ جاہلیت کے توہمات کی بنا پر ان سے احتراز نہ کرو اور اس اللہ سے ڈرو جس پر ایمان لائے ہو۔

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ۚ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ۭ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ۭ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ۭ وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۸۹)

شریعتِ الٰہی میں قسم کی اہمیت

'لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ' اس ٹکڑے میں جو مضمون بیان ہوا ہے، یہی مضمون، معمولی لفظی اختلاف کے ساتھ، سورۂ بقرہ آیات ۲۲۴-۲۲۵ میں گزر چکا ہے۔ وہاں ہم نے اس پر مفصل بحث کی ہے۔ وہاں مسئلہ ایلاء کے تعلق سے قسم کی اہمیت کا ذکر ہوا تھا یہاں اوپر کی بیان کردہ تحریم و تحلیل کے تعلق سے اس کا ذکر ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کی غیر ارادی قسموں پر تو کوئی مواخذہ نہیں کرے گا لیکن جو قسمیں دل کے عزم و ارادہ سے ظہور میں آئیں گی، جن کے ذریعہ سے کوئی عہد و پیمان بندھے گا، جن سے حقوق و فرائض پر کوئی اثر مترتب ہوگا، جو کسی پہلو سے شریعت کی تحریم و تحلیل پر اثر انداز ہوں گی، ان پر اللہ ضرور مواخذہ فرمائے گا۔ اللہ کے نام کو، جیسا کہ بقرہ میں فرمایا ہے، خلافِ شرع یا جھوٹی قسموں کا ہدف بنانے کی اجازت نہیں ہے۔ قسم قول و قرار، شہادت اور عہد و پیمان کی بنیاد ہے اور عہد و پیمان نہ صرف تمام معاشرتی، اجتماعی اور سیاسی حقوق و فرائض کی اساس ہے بلکہ، جیسا کہ ہم اس سورہ کی پہلی آیت يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ الاية کے تحت تفصیل کے ساتھ بیان کر آئے ہیں، اس عہد و میثاق کی بھی اساس ہے جو ہم نے اپنے رب کے ساتھ باندھا ہے۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ آدمی قسم کے معاملہ میں نہایت محتاط رہے، کوئی قسم بے ضرورت یا خلافِ شرع نہ کھائے، جو قسم کھائے خلافِ شرع نہ ہو تو وہ پوری کرے، اگر کوئی قسم کھانے کے بعد توڑے تو اس کا کفارہ ادا کرے تاکہ وہ قسم کے معاملے میں سہل انگار، بے پروا اور بالکل غیر ثقہ اور ناقابلِ اعتبار آدمی بن کے نہ رہ جائے، اس لیے کہ اس قسم کا آدمی نہ معاشرے کی ذمہ داریوں کا اہل ہے نہ میثاقِ الٰہی کی ذمہ داریوں کا۔

قسم کا کفارہ

'فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ الاية' اس کا کفارہ یہ ہے کہ دس مسکینوں کو اس معیار کا کھانا کھلائے جس معیار کا کھانا وہ اپنے اہل و عیال کو کھلاتا ہے یا ان کو کپڑے پہنائے یا ایک غلام آزاد کرے اگر اس کی مقدرت نہ ہو تو تین دن کے روزے رکھ دے۔

قرآن میں توضیحی آیات کا مفہوم

'كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ' یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ توضیحی آیات ہیں جو بعد میں پیدا ہونے والے سوالات کے، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، جواب میں نازل ہوئیں۔ شریعت و ہدایت تمام تر اللہ تعالیٰ کے بندوں پر فضل و احسان ہے اور اگر اس کے کسی اجمال کی وضاحت خود اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہو جائے تو یہ اس کا مزید احسان ہے، پھر اس توضیح میں اگر بندوں کے لیے سہولت کے بھی بہت سے پہلو ملحوظ ہوں، جیسا کہ غیر ارادی قسموں اور کفارہ کے معاملہ میں یہاں ملحوظ ہیں، تو گویا احسان

کے گوناگوں پہلو جمع ہو گئے۔ اس کا فطری تقاضا یہی ہو سکتا ہے کہ بندے اپنے پروردگار کے زیادہ سے زیادہ شکرگزار ہیں۔ اگر اس ساری توضیح و تفصیل کے بعد بھی انھوں نے اس نعمت کی قدر نہ کی تو یہ انتہائی کفران نعمت ہے۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِی الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ وَیَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ (۹۰-۹۱)

ہر نشہ آور چیز خمر ہے

خمر اور میسر پر بقرہ ۲۱۹ میں اور انصاب و ازلام، پر مائدہ ۳ میں بحث گزر چکی ہے۔ شراب اور جوا، جیسا کہ سورۂ بقرہ کی تفسیر میں ہم بیان کر آئے ہیں، دونوں توام بیماریاں ہیں۔ کم از کم عرب جاہلیت کی سوسائٹی میں ان کی حیثیت یہی تھی۔ خمر، کے متعلق یہ دعویٰ بے بنیاد ہے کہ اس کا اطلاق صرف انگوری شراب ہی پر ہوتا ہے۔ کلام عرب سے اس کی تائید نہیں ہوتی اور ہو بھی تو شراب کی حرمت کی اصل علت، جیسا کہ نساء کی آیت ۴۳ سے واضح ہے، اس کے اندر نشہ کا پایا جانا ہے۔ اس وجہ سے ہر نشہ آور چیز کا حکم یہی ہوگا، خواہ وہ انگوری ہو یا غیر انگوری۔ اور شریعت کے اس حکیمانہ اصول کے مطابق کہ جس کی مقدار کثیر حرام ہے اس کی مقدار قلیل بھی حرام ہے، اس کی ہر مقدار حرام ہوگی تاکہ فتنہ کا دروازہ کلیتہً بند ہو جائے۔

جوا اور شراب شیطانی ایجادات سے ہیں

رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ، 'رجس' اور 'نجس' پر دوسرے مقام میں ہم بحث کر چکے ہیں۔ معناً ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ مِنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ یعنی یہ شیطان کی ایجادات اور اس کی کارستانیوں میں سے ہیں اور یہ حربے اس نے اس لیے ایجاد کیے ہیں کہ بنی آدم کو شریعت کی صراط مستقیم سے بہکانے کا جو عہد اس نے کر رکھا ہے اس کو پورا کر سکے۔ ان کے اندر اگر کوئی پہلو نفع کا نظر آتا ہے تو یہ محض ایک نظر فریب ملمع ہے۔ ان کا ضرر ان کے نفع کے مقابل میں، جیسا کہ بقرہ کی تفسیر میں واضح ہو چکا ہے، اتنا زیادہ ہے کہ اس کے سامنے اس حقیر نفع کی کوئی قیمت نہیں۔

جوئے اور شراب کے اثرات معاشرے پر

اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِی الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ، فِی الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ میں 'فی' اشتغال و انہماک کے مضمون پر دلیل ہے۔ یعنی شیطان نے یہ فتنے اس لیے ایجاد کیے ہیں کہ تمھیں ان میں لگا کر تمھارے درمیان برابر دشمنی اور انتقام کی آگ بھڑکاتا رہے۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ جس معاشرے میں یہ وبا پھیل جائے اس میں یا تو عفت، عزت، ناموس اور وفا و حیا کا احساس مٹ جائے گا، جیسا کہ مغرب زدہ سوسائٹی میں آج شاہدہ ہو رہا ہے اور یہ بجائے خود ایک عظیم حادثہ ہے اور اگر ان کی کوئی رمق باقی رہے گی تو ناگزیر ہے کہ آئے دن ان کی بدولت تلواریں کھنچی رہیں۔ عرب اعفت و عصمت، خودداری اور غیرت کے معاملے میں بڑے حساس تھے اور یہ ان کی بہت بڑی خوبی تھی لیکن ساتھ ہی شراب اور جوئے کے بھی رسیا تھے اس وجہ سے جام و سنداں کی یہ بازی ان

کے لیے بڑی منگی پڑ رہی تھی۔ جہاں کسی نے شراب کی بدمستی میں کسی کے عزت و ناموس پر حملہ کیا، کسی کی تحقیر کی، کسی کو چھیڑا یا جوئے میں کوئی چھینا جھپٹی کی (اور یہ چیزیں جوئے اور شراب کے لوازم میں سے ہیں) دونوں فریقین تلواریں سونت لیتے اور افراد کی یہ لڑائی چشم زدن میں قوموں اور قبیلوں کی جنگ بن جاتی اور انتقام در انتقام کا ایسا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا کہ صرف مہینے اور سال نہیں بلکہ پوری صدی گزار کر بھی یہ آگ ٹھنڈی نہ پڑتی۔ چنانچہ عرب کی تاریخ میں ایسی جنگیں موجود ہیں جن کی آگ جوئے یا شراب خانہ خراب ہی نے بھڑکائی اور پوری ایک صدی تک وہ آگ نہ بجھی۔ بہر حال یہ چیز یا تو دیوث بناتی ہے یا خانہ خراب اور ان دونوں میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جس کو کوئی سلیم الفطرت معاشرہ گوارا کر سکے۔

خدا سے غفلت زندگی کے حقائق سے غفلت ہے

'وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ'، 'ذِكْرُ اللّٰه' کے بعد 'صَلٰوة' کا ذکر عام کے بعد خاص کا ذکر ہے جس سے ان دونوں کا ربط واضح ہوتا ہے۔ اسلام نے زندگی کی تمام رفعت و عظمت ذکر الٰہی کے ساتھ وابستہ کی ہے۔ جو شخص خدا سے غافل ہوا وہ خود اپنی قدر و قیمت سے بالکل بے خبر ہو جاتا ہے 'نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ' میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ اللہ کی یاد کا خاصہ یہ ہے کہ وہ انسان کو زندگی کی اصل حقیقتوں سے کبھی بے پروا نہیں ہونے دیتی جس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کبھی راہ سے بے راہ نہیں ہوتا۔ اگر کبھی کوئی لغزش ہو جاتی ہے تو خدا کی یاد اس کو سنبھال لیتی ہے۔ برعکس اس کے شراب کا اصل اثر جو انسان پر پڑتا ہے وہ یہی ہے کہ وہ اس کو زندگی کی اصل حقیقتوں سے ہٹا کر ایک خیالی دنیا میں لے جا کر پھینک دیتی ہے اور اس خیالی دنیا کا وہ ایسا دیوانہ ہو جاتا ہے کہ پھر جس طرح سگ گزیدہ پانی سے ڈرتا ہے اسی طرح وہ زندگی کی اصل حقیقت سے ڈرنے لگتا ہے۔ کبھی اس سے دو دو چار ہونے کی جرأت نہیں کرتا اور اسی حال میں ایک دن اس کی زندگی کا قصہ تمام ہو جاتا ہے ___ اب ذرا اس انسان کی بدبختی پر غور کیجیے جو زندگی بھر خواب دیکھتا رہا اور کبھی اس کو جاگنے اور زندگی کے انجام پر غور کرنے کی نوبت نہیں آئی۔

عربی میں 'استفہام' کے مختلف مفہوم

'فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ' استفہام عربی زبان میں جیسا کہ استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب اسالیب القرآن میں وضاحت فرمائی ہے، تاکید، اقرار، تنبیہ، انکار، زجر، امر اور تحقیر کے مفہوم کے لیے آتا ہے۔ یہاں موقع دلیل ہے کہ یہ امر کے مفہوم میں ہے، جس طرح سورۂ ہود آیت ۱۴ میں 'فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ' (تو کیا اب تم مسلمان بنتے ہو) ہے۔ اس اسلوب میں امر کے ساتھ زجر، موعظت، تاکید و تنبیہ اور اتمام حجت کا مضمون بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ یہاں غور کیجیے تو اسلوب کلام اس حقیقت کو ظاہر کر رہا ہے کہ شراب اور جوئے کے مفاسد کی تفصیل اتنے مختلف مواقع پر اور اتنے مختلف پہلوؤں سے تمہارے سامنے آ چکی ہے کہ اب اس معاملے میں کسی کے لیے بھی کسی اشتباہ کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے تو بتاؤ اب بھی اس سے باز آتے ہو یا نہیں؛ ظاہر ہے کہ امر کے سادہ اسلوب میں یہ سارا مضمون نہیں سما سکتا تھا۔

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ (۹۲)

یہ اوپر والی تنبیہ کی مزید تاکید ہے کہ شیطان کے بچھائے ہوئے جال سے نکل کر اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں داخل ہو جاؤ اور نافرمانی و سرکشی سے بچو۔ اگر اس توضیح و تنبیہ کے بعد بھی تم نے اعراض کیا تو ذمہ داری تمہاری ہوگی، رسول کی ذمہ داری تو صرف خدا کے امر و نہی سے واضح طور پر آگاہ کر دینا ہے اور یہ فرض رسول نے ادا کر دیا جس کے بعد تم پر اللہ کی طرف سے حجت پوری ہو چکی۔ اس اتمام حجت کے بعد اب جو بے راہ روی اختیار کریں وہ اس کے نتائج بھگتنے کے لیے تیار ہو کر کریں۔ اس لیے کہ اتمام حجت کے بعد اللہ تعالیٰ کی پکڑ بڑی سخت ہوتی ہے۔

لَيْسَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جُنَاحٌ فِيمَا طَعِمُوا إِذَا مَا اتَّقَوا وَّآمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ثُمَّ اتَّقَوا وَّآمَنُوا ثُمَّ اتَّقَوا وَّأَحْسَنُوا ۗ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ (۹۳)

شریعت الٰہی کا مطالبہ

اوپر فَهَلْ أَنتُم مُّنتَهُونَ کے اسلوب میں جو زجر و توبیخ مضمر ہے اس کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں اسلوب بیان کی اس شدت نے ان لوگوں کو متاثر کیا ہوگا جو شراب کے معاملے میں اُس رخصت سے اب تک فائدہ اٹھاتے رہے تھے جو انہیں حاصل تھی۔ انھوں نے یہ محسوس کیا ہوگا کہ شراب کے باب میں بالکل پہلی ہی تنبیہ پر دوسرے بہت سے محتاط اور پیش بین صحابہؓ کی طرح انھوں نے بھی شراب سے یک قلم توبہ کر لی ہوتی تو خوب ہوتا، ممکن ہے یہ تاخیر جو ان سے ہوئی آخرت میں ان کی کوتاہی میں محسوب ہو اور اس پر کوئی گرفت ہو جائے۔ خاص طور پر اس دوران میں جو لوگ وفات پا چکے ہوں گے ان کے باب میں محتاط لوگوں کے اندر تشویش پیدا ہوئی ہوگی کہ ان کے ساتھ کیا معاملہ ہوگا؟ آیت زیر بحث نے اس قسم کے سارے شبہات دور کر دیے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں پرسش کسی ایسی چیز کے کھانے پینے پر نہیں ہوگی جس کے بارے میں کسی صریح ممانعت کی خلاف ورزی کا ارتکاب نہیں ہوا ہے۔ شریعتِ الٰہی کا مطالبہ صرف یہ ہے کہ جس چیز کے باب میں جو حد جب معین ہو گئی لوگ اس حد کا احترام کریں، پھر اگر اس حد میں کچھ اضافہ شریعت کی رُو سے ہو جائے تو اس کو مضبوطی کے ساتھ اختیار کر لیں اور اگر اس پر مزید اضافہ ہو جائے تو اس کو بھی اختیار کر لیں اور پھر پوری خوبی، پوری احتیاط اور پورے اخلاص کے ساتھ اس کو نباہیں۔

شریعت میں تدریج بندوں کی سہولت کے لیے ہے

اس آیت سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ شریعت الٰہی میں احکام کا نزول بالتدریج ہوا ہے اور یہ تدریج بندوں کی سہولت کے پہلو سے اللہ تعالیٰ نے پسند فرمائی ہے۔ اس وجہ سے ان لوگوں پر وہ گرفت نہیں فرمائے گا جنھوں نے اس کی بخشی ہوئی سہولت سے فائدہ اٹھایا ہے، اگرچہ ان لوگوں کو سبقت الی الخیر کا درجہ ملے گا جنھوں نے کسی باب میں ہوا کا رُخ پہچان کر اس کے پہلے ہی مرحلہ میں احتیاط اور تقویٰ کا آخری قدم اٹھا دیا۔ مثلاً شراب کی حرمت کا حکم بالتدریج نازل ہوا لیکن دین کے معاملے میں جن کی حس زیادہ تیز تھی وہ پہلے ہی مرحلہ میں اس سے تائب ہو گئے۔ یہ ان کے کمال درجہ فطرت اسلام پر ہونے کی دلیل ہے لیکن اللہ تعالیٰ ان لوگوں پر بھی رحم فرمائے گا جنھیں اگرچہ یہ درجۂ کمال تو حاصل نہ ہو سکا

لیکن انھوں نے کسی مرحلہ میں حدود الٰہی سے تجاوز نہیں کیا۔

تدریج کے مراحل

دوسری بات آیت کے الفاظ سے یہ نکلتی ہے کہ اس تدریج کے تین مدارج ہیں، یہ بات ایک کلیہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ عمومیت کے لحاظ سے ہے۔ بعض معاملات میں قطعی اور آخری حکم پہلی ہی مرتبہ میں آگیا ہے، بعض میں دوسری مرتبہ میں اور بعض میں حکم کی تکمیل تیسری بار میں ہوتی ہے۔ مثلاً کھانے پینے کے سلسلہ کی حرمتوں کا اجمالی ذکر سورۂ انعام میں بھی ہوا ہے، جو ایک مکی سورہ ہے، اس کے بعد اس کی تفصیل اس سورہ (مائدہ) کے آغاز میں آئی ہے جس سے انعام کے بعض اجمالات کی وضاحت ہوتی ہے پھر اس سلسلہ میں کچھ مزید سوالات پیدا ہوئے ہیں جن کی تقریب سے بعض چیزوں کی حرمت، جیسا کہ واضح ہوگا، یہاں اس سورہ کے خاتمہ میں بیان ہوئی اور یہ سورہ، جیسا کہ ہم واضح کر چکے ہیں، احکام شریعت کے باب میں آخری سورہ ہے۔ اس وجہ سے گویا اس تیسرے مرحلہ میں کھانے پینے سے متعلق احکام کی تکمیل ہو گئی۔ یہ آیت یہ واضح کر رہی ہے کہ جو لوگ ان تینوں مرحلوں میں اللہ کے نازل شدہ احکام و حدود کی پیروی کرتے آئے ہیں ان سے ان چیزوں کے کھانے پر کوئی گرفت نہیں ہوگی جو انھوں نے اس وقت کھائی ہیں جب ان کی صریح حرمت نازل نہیں ہوئی تھی۔

تقویٰ، ایمان اور احسان

تیسری بات یہ سامنے آتی ہے کہ آیت میں تین بار تقویٰ کا ذکر ہوا ہے۔ پہلی بار تقویٰ کے ساتھ ایمان و عمل صالح کا ذکر ہے، دوسری بار ایمان کا ذکر ہے، تیسری بار احسان کا ذکر ہے۔ تقویٰ کا مفہوم ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ اصلاً یہ لفظ حدود الٰہی کی نگہداشت کے لیے آتا ہے۔ یہاں تین بار اس کا حوالہ احکام کے ان تدریجی مراتب کے لحاظ سے ہوا ہے جن کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا۔ رہا تقویٰ کے ساتھ ایمان و عمل صالح کا حوالہ تو وہ اس حقیقت کو ظاہر کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں معتبر صرف کسی چیز سے بچنا نہیں بلکہ وہ بچنا معتبر ہے جو ایمان و عمل صالح کے ساتھ ہو۔ اس قید کی ضرورت اس وجہ سے تھی کہ بہت سی چیزوں سے بچنے کے معاملے میں (بالخصوص کھانے پینے کی چیزوں کے معاملے میں) بہت سے لوگ بڑے محتاط اور متقشف ہوتے ہیں حالانکہ ایمان و عمل صالح سے ان کو کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ جوگیوں، سنیاسیوں اور راہبوں سے قطع نظر جو لوگ اعمال سفلیہ کے دلدادہ ہوتے ہیں وہ بھی اپنے اوپر بہت سی پابندیاں عاید کر رکھتے ہیں اور بڑی سختی کے ساتھ ان کی نگہداشت کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس چیز کا دین میں کوئی اعتبار نہیں۔ اعتبار صرف اس احتیاط کا ہے جو ایمان اور عمل صالح کے ساتھ ہو۔ آخر میں تقویٰ کے ساتھ احسان کی جو شرط ہے وہ اس حقیقت کو ظاہر کرتی ہے کہ دین میں جو تقویٰ مطلوب و مقبول ہے وہ صرف ظاہر داری اور رسوم کی خانہ پری سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے آخری شرط احسان ہے۔ احسان کا مدعا یہ ہے کہ آدمی اللہ کے حدود کی خلاف ورزی سے اس طرح بچے جس طرح اس سے بچنے کا حق ہے، وہ ہر حکم کی تعمیل اس طرح کرے گویا وہ خدا کو دیکھ رہا ہے اور

اس یقین سے اپنے باطن کو منور رکھے کہ اگر وہ خدا کو نہیں دیکھ رہا ہے تو خدا تو بہرحال اس کو دیکھ رہا ہے۔ یہی احسان تقویٰ کی اصل روح اور حدودِ الٰہی کا اصل پاسبان ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو انسان تقویٰ اور پرہیزگاری کی نمائش کرتے ہوئے حدودِ الٰہی کے توڑنے کے لیے ہزار چور دروازے پیدا کر سکتا ہے۔ آخر یہود نے دینداری کے مظاہرے کے ساتھ خدا کی حرام ٹھہرائی ہوئی چیزوں کو جائز کرنے کی کتنی راہیں کھول لیں سبت کے لیے جو حیلۂ شرعی انھوں نے ایجاد کیا اس کی طرف یہاں بھی آگے اشارہ آرہا ہے۔ یہی صورت اس امت میں بھی پیش آئی۔ یہاں تک کہ کتاب الحیل ہماری فقہ کا ایک جزو بن گئی۔ ایسے دین بازوں یا تقویٰ کی خدا کے ہاں کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو دوست رکھتا ہے جو احسان کی صفت سے متصف ہوں۔ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَيَبْلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ بِشَيْءٍ مِّنَ الصَّيْدِ تَنَالُهٗۤ اَيْدِيْكُمْ وَرِمَاحُكُمْ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّخَافُهٗ بِالْغَيْبِ ۚ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ؕ وَمَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ هَدْيًا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا لِّيَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِهٖ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ ؕ وَمَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ۝ اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهٗ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ ۚ وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْۤ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ (۹۴-۹۶)

سورہ کے شروع، آیت ۱ میں حالتِ احرام میں شکار کی جو ممانعت وارد ہوئی ہے اس سے متعلق بعض تفصیلات اور بعض سوالوں کے جواب جو بعد میں نازل ہوتے وہ یہاں بیان ہو رہے ہیں۔

پیش آنے والی آزمائشوں سے آگاہی

'لَيَبْلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ بِشَيْءٍ مِّنَ الصَّيْدِ تَنَالُهٗۤ اَيْدِيْكُمْ وَرِمَاحُكُمْ' یہ اس آزمائش سے آگاہ فرمایا جا رہا ہے جو حالتِ احرام میں دفعتہً شکار نظر آجانے کی وجہ سے پیش آسکتی ہے۔ چونکہ یہ ممانعت اصلاً کی ہی اس لیے گئی ہے کہ لوگوں کے ایمان و تقویٰ کو جانچا جائے اس لیے پہلے سے خبردار کر دیا گیا کہ ایسے مواقع پیش آئیں گے کہ تم احرام باندھے ہوئے ہوگے اور تمہیں نظر آئے گا کہ ہرنوں یا نیل گائے کی پوری ڈار کی ڈار ہے جو بالکل تمہارے نیزوں کی زد میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آزمائش کے ان مواقع پر اپنے عزم و ایمان کی حفاظت کرنا، اس طرح پھسل نہ جانا جس طرح بنی اسرائیل سبت کے معاملے میں پھسل گئے۔

اس تنبیہ کی اہمیت

اس تنبیہ کی اہمیت اچھی طرح سمجھنے کے لیے چند باتیں ذہن میں مستحضر کر لیجیے۔ ایک تو یہ کہ شکار بجائے خود بڑی رغبت کی چیز ہے بالخصوص اہلِ عرب کے لیے جن کی تفریح اور معاش دونوں چیزوں کا انحصار بڑی حد تک اس زمانے میں شکار ہی پر تھا۔ دوسری یہ کہ جب کسی مرغوب چیز پر کوئی پابندی عائد ہو جاتی ہے تو اس کی رغبت اور زیادہ قوی ہو جاتی ہے۔ عربی میں مثل ہے الانسان حریص علیٰ ما منع انسان جس

چیز سے روک دیا جائے اس کا بڑا حریص ہو جایا کرتا ہے۔ اس حرص کا نفسیاتی اثر یہ بھی ہوتا ہے کہ جس طرح ساون کے اندھے کو ہر جگہ ہرا ہرا نظر آتا ہے، اسی طرح اس کو بھی ہر جگہ وہی چیز نظر آتی ہے جس سے وہ اپنے کو محروم پاتا ہے۔ تیسری یہ کہ یہ مناہی جب اصلاً امتحان کے لیے ہوتی ہے تو بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ ایسے مواقع پیدا فرمائے کہ اس امتحان کا مقصد پورا ہو۔

بنی اسرائیل اور امت مسلمہ کے امتحان کی مماثلت

یہ بات یہاں یاد رکھنے کی ہے کہ اس امت کے لیے یہ امتحان بنی اسرائیل کے اس امتحان سے مشابہ ہے جو ان کو سبت کے معاملے میں پیش آیا۔ قرآن میں اس کا ذکر اس طرح ہوا۔

اِذْ یَعْدُوْنَ فِی السَّبْتِ اِذْ تَاْتِیْهِمْ حِیْتَانُهُمْ یَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّیَوْمَ لَا یَسْبِتُوْنَ لَا تَاْتِیْهِمْ كَذٰلِكَ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا یَفْسُقُوْنَ ۝ (اعراف - ۱۶۳)	اور یاد کرو جب کہ وہ سبت کے معاملے میں حدودِ الٰہی کی خلاف ورزی کرتے تھے، جب کہ ان کی مچھلیاں ان کے سبت کے دن منہ اٹھائے ہوئے نمودار ہوتی تھیں اور جب سبت کا دن نہ ہوتا تو مچھلیاں نمودار نہ ہوتیں۔ اسی طرح ہم ان کو آزمائش میں ڈالتے تھے بوجہ اس کے کہ وہ ہماری نافرمانی کرتے تھے۔

ان دونوں مقامات پر غور کیجیے تو دونوں کی مماثلت بالکل واضح ہو جائے گی۔ بنی اسرائیل کی آزمائش کی نوعیت یہ تھی کہ جو دن ان کے سبت کا ہوتا اس دن مچھلیاں منہ اٹھائے ہوئے سطح آب پر نظر آتیں لیکن جو دن سبت کا نہ ہوتا اس دن وہ نظر نہ آتیں۔ اس چیز نے ان کو اس فتنے میں ڈال دیا کہ انھوں نے سبت کے دن شکار کے لیے ایک حیلہ ایجاد کر لیا۔ اسی طرح اس امت کے امتحان کے بارے میں فرمایا ہے کہ حالت احرام میں بسا اوقات تمھیں ایسا نظر آئے گا کہ شکار بالکل تمھارے ہاتھوں اور تمھارے بھالوں کے نیچے ہے۔ مبادا یہ چیز تمھیں اسی طرح کے کسی فتنہ میں مبتلا کر دے جس طرح کے فتنہ میں بنی اسرائیل مبتلا ہو گئے۔

یہاں 'بِشَیْءٍ' کے لفظ، بالخصوص اس کی تنکیر، سے یہ اشارہ بھی نکلتا ہے کہ ہر چند یہ آزمائش پیش تو آئے گی لیکن یہ بہت سخت نہیں بلکہ ہلکی ہو گی۔ یہ چیز اس آخری شریعت کے مزاج کو ظاہر کرتی ہے کہ اس کے ہر پہلو میں انسانی فطرت کی پوری پوری رعایت ملحوظ ہے۔

'یعلم' کا صحیح مفہوم

'لِیَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ یَّخَافُهٗ بِالْغَیْبِ'، یہ اس آزمائش کا مقصد بیان ہوا ہے۔ 'علم' 'یعلم' کے معنی ہم دوسری جگہ بیان کر چکے ہیں کہ ممیز کرنے کے بھی آتے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ یہ امتحان اللہ تعالیٰ نے اس لیے رکھا ہے کہ وہ ان لوگوں کو ممیز کرے جو غیب میں رہتے خدا سے ڈرتے ہیں۔ یہاں مقابل کا جملہ محذوف ہے یعنی ان لوگوں سے ممیز کرے جو غیب میں رہتے خدا سے نہیں ڈرتے۔ ابتلائی احکام سے متعلق ہم یہ حقیقت اس سورہ کے آغاز میں واضح کر چکے ہیں کہ ان کا اصل مقصود خدا کے ساتھ بندوں کی وفاداری کا امتحان ہوتا ہے۔ بظاہر وہ بندوں کے مصالح کے نقطۂ نظر سے ایک عام آدمی کو بے حکمت نظر آتے ہیں لیکن

حقیقت میں ایمان بالغیب اور خشیت بالغیب کے جانچنے کے لیے وہی اصلی کسوٹی ہوتے ہیں۔

فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ میں بَعْدَ ذٰلِكَ کا زور اس تنبیہ و تذکیر پر ہے جو یہاں کی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حالتِ احرام میں شکار کی ممانعت کے بعد یہ آگاہی بھی تمہیں سنا دی گئی ہے کہ اس راہ میں تمہیں اس طرح کی آزمائشیں بھی پیش آئی ہیں جس طرح کی تم سے پہلی امت کو پیش آئی ہیں تو جس نے اس آگاہی کے بعد بھی حدودِ الٰہی کی خلاف ورزی کی اس کے لیے عذاب دردناک ہے۔

حالتِ احرام میں عمداً شکار کا کفارہ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ۭ وَمَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا الآیہ۔ اب یہ اس سوال کا جواب دیا جا رہا ہے کہ کوئی شخص حالتِ احرام میں ہونے کے باوجود عمداً اس گناہ کا ارتکاب کر بیٹھے تو اس کا کیا حکم ہے۔ ارشاد ہوا کہ ایسا شخص کفارہ ادا کرے جس کی تین صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ جس طرح کا جانور اس نے شکار کیا ہے اسی قبیل کا جانور گھریلو چوپایوں میں سے کفارہ کی قربانی کے لیے خانہ کعبہ بھیجے۔ اگر یہ متعذر ہو تو اس جانور کی قیمت کی نسبت سے مسکینوں کو کھانا کھلائے، اگر یہ اس کے لیے دشوار ہو تو آخری درجے میں اتنے روزے رکھ دے جتنے مسکینوں کو کھانا کھلانا اس پر عائد ہوتا ہے۔ رہا اس امر کا فیصلہ کہ شکار کردہ جانور کا مثل اور بدل پالتو چوپایوں میں سے کون چوپایہ ہو سکتا ہے تو اس کا فیصلہ اور اس کے متعذر ہونے کی صورت میں اس کی قیمت یا مساکین یا روزوں کی تعداد کا فیصلہ تو یہ کام مسلمانوں میں سے دو ثقہ آدمی کریں گے تاکہ جرم کے مرتکب کے لیے اپنے نفس کی جانبداری کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔

خطا کی صورت میں حکم اور بعض متعلق مسائل۔

قرآن کے الفاظ سے مجھے یہی بات قوی معلوم ہوتی ہے۔ اکثر لوگ اس معاملے میں خطا اور عمد کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے۔ مجھے الفاظِ قرآن کی روشنی میں سعید بن جبیر کا مذہب مضبوط معلوم ہوتا ہے جو خطا کی صورت میں کفارہ کے قائل نہیں۔ اس کی تائید میں ایک قول حضرت حسنؓ کا بھی ہے۔ اسی طرح جو لوگ شکار کردہ جانور کی مثلیت کا فیصلہ بہر شکل قیمت ہی کے ذریعہ سے کرنے کے قائل ہیں، اس کے بعد وہ اختیار دے دیتے ہیں کہ چاہے کوئی شخص اس قیمت کے جانور کی قربانی دے، چاہے اسی نسبت سے مسکینوں کو کھانا کھلا دے یا روزے رکھ دے تو یہ بات بھی کچھ زیادہ مضبوط نہیں معلوم ہوتی۔ جب واضح طور پر پالتو جانوروں میں شکار کے جانوروں کے بدل موجود ہیں مثلاً ہرن کی جگہ بکری، دنبہ، مینڈھا وغیرہ، نیل گاؤ اور گورخر کی جگہ گائے وغیرہ تو مثلیت کے فیصلہ کے لیے قیمت ہی کیوں معیار قرار پائے، شکار کردہ جانور کا بدل موجود نہ ہو تب تو بلا شبہ قیمت ہی اس کا بدل ہو سکتی ہے لیکن ہر حالت میں اسی کو معیار قرار دینا الفاظِ قرآن کے خلاف ہے۔ یہ بات بھی کچھ زیادہ مضبوط نہیں معلوم ہوتی کہ کفارہ کی مذکورہ تینوں شکلوں میں کفارہ دینے والے کو یکساں اختیار رہے، چاہے روزے رکھ دے چاہے مسکینوں کو کھانا کھلا دے، چاہے قربانی کر دے بلکہ ان میں ترتیب معلوم ہوتی ہے۔ یہ بات کہ 'او' تخییر کے لیے آتا ہے اگرچہ صحیح ہے لیکن قرینہ موجود ہو تو یہ ترتیب کو بھی مستلزم ہے جیسا کہ اسی سورہ کی آیت ۱۰۶ میں ہے۔ اس وجہ سے میں امام محمد

اور فرّاء کے مذہب کو قوی سمجھتا ہوں جو یہاں ترتیب کے قائل ہیں۔

ایک سخت تنبیہ

'وَمَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ' اسی طرح کی تنبیہ ہے جس طرح کی تنبیہ اوپر والی آیت میں 'فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ' کے الفاظ میں وارد ہوئی ہے۔ یہ تنبیہ بہت سخت ہے اور اس سختی کی وجہ وہی ہے جس کی طرف ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں کہ یہ اسی طرح کا امتحان ہے جس طرح کا امتحان سبت کے معاملے میں بنی اسرائیل کا ہوا اور جس میں فیل ہونے پر ان کو نہایت عبرت انگیز سزا ملی۔ یہ کفارہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ جو رکھا ہے تو یہ نافع اسی شکل میں ہے جب اس کے ساتھ مخلصانہ توبہ پائی جائے۔ اگر دل کا رجوع اس کے ساتھ شامل نہ ہو بلکہ آدمی یہ خیال کر کے نافرمانی کرتا ہے کہ گرفت ہوئی تو کفارہ دے لیں گے تو ایسے لوگ خدا کی پکڑ سے نہیں بچ سکتے۔

'اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهٗ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ ۚ وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا' الاية

بنی اسرائیل اور امت مسلمہ کے امتحان میں فرق

مذکورہ بالا نہی سے جو شکار مستثنیٰ ہے، یہ اس کا بیان ہے۔ یہود کے لیے جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، سبت کے دن دریائی شکار بھی ممنوع تھا، اس امت کے لیے حالتِ احرام میں خشکی کا شکار ممنوع ہوا لیکن دریائی شکار مباح رہا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ فرق اس بنیاد پر ہو کہ اہلِ عرب کے لیے زیادہ کشش خشکی کے شکار میں تھی اور یہود کے لیے، ان کے جائے وقوع کے لحاظ سے، دریائی شکار میں۔ یہ ایک امتحان ہے اور امتحان میں اگر یہ پہلو ملحوظ ہو تو یہ اس کے مزاج سے مناسبت رکھنے والی بات ہے۔

'صَيْد' کا لفظ جس طرح 'غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ' میں مصدری معنی میں ہے چنانچہ وہاں 'وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا' کہہ کر اس کے مصدری معنی میں ہونے کو واضح بھی کر دیا ہے۔ اسی طرح ہمارے نزدیک یہاں بھی مصدری معنی میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جہاں تک خشکی کا تعلق ہے اس کا شکار کرنا تو محرم کے لیے ممنوع ہے لیکن کسی غیر محرم کا کیا ہوا شکار کھانا، اگر کسی پہلو سے اس شکار میں اس کا کوئی دخل نہیں ہے، اس کے لیے ممنوع نہیں ہے۔ رہا دریا کا شکار تو اس کا شکار کرنا اور دوسرے کا کیا ہوا شکار کھانا دونوں محرم کے لیے جائز ہے۔ یہ رُخصت اللہ تعالیٰ نے اس لیے عطا فرمائی ہے کہ محرمین اور اہل قافلہ کو زادِ راہ کے معاملے میں آسانی ہو۔ خشکی کے سفر میں اگر زادِ راہ ختم ہو جائے تو اس کے حاصل کرنے کی راہیں کھلی رہتی ہیں۔ دریائی سفر میں اگر یہ زحمت پیش آ جائے تو شکار کے سوا کوئی اور راہ باقی نہیں رہ جاتی یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ یہود کو جو شکار کی ممانعت تھی وہ تو صرف ہفتہ میں ایک دن کے لیے تھی۔ اس وجہ سے کسی ناقابلِ حل زحمت کے پیش آنے کا کوئی اندیشہ نہ تھا۔ اس امت کو یہ ممانعت پورے دورانِ احرام کے لیے ہوئی۔ دریائی سفر کرنے والے قافلوں کو بعض حالات میں ناقابلِ حل مشکل پیش آ سکتی تھی اس وجہ سے دریائی شکار کے معاملے میں یہ رعایت ہوئی۔

جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ وَالْهَدْيَ وَالْقَلَاۗىِٕدَ ۭ ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوْٓا

أَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَأَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۞ اِعْلَمُوٓا أَنَّ اللّٰهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ وَأَنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۞ مَا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلٰغُ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا تَكْتُمُونَ ۞ قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ أَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيثِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰٓأُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۞ (۹۷-۱۰۰)

تمام شعائر کے احترام کی تاکید

اوپر والی بات اصلاً شعائر الٰہی کے احترام سے تعلق رکھنے والی بات ہے اس وجہ سے اس کے بعد دوسرے معروف شعائر، بیت اللہ، شہر حرام اور ہدی اور قلائد کی بھی یاد دہانی فرما دی کہ ان کے احترام سے متعلق بھی جو ہدایات دی گئی ہیں ان کو بھی حرزِ جان بناؤ۔ کسی پہلو سے ان کی حرمت میں کوئی فرق نہ آئے۔ کعبہ کی وضاحت 'بیت الحرام' کے لفظ سے یہاں اسی پہلو کی طرف توجہ دلانے کے لیے کی گئی ہے کہ یہ خدا کا محترم ٹھہرایا ہوا گھر ہے، اس کے احترام کے حدود و قیود مقرر ہیں، ان حدود و قیود کی ہر حال میں نگہداشت رہے۔ قِيَامًا لِّلنَّاسِ پر سورۂ بقرہ کی تفسیر میں مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْنًا کے تحت ہم تفصیل سے لکھ چکے ہیں کہ ذریت ابراہیم کی تمام دینی، سیاسی اور معاشی شیرازہ بندی اسی گھر کی بدولت تھی اور بعثت نبوی کے بعد یہی گھر ہے جو تمام امت کا قبلہ اور مرکز ہے۔ اَلشَّهْرَ الْحَرَامَ سے مراد یہاں کوئی مخصوص مہینہ نہیں بلکہ تمام اشہر حرم کے لیے یہ بطور اسم جنس کے استعمال ہوا ہے۔ ان مہینوں کی دینی و دنیوی برکات پر ہم سورۂ بقرہ کی تفسیر میں گفتگو کر چکے ہیں۔ ہدی اور قلائد کی وضاحت اسی سورہ کے آغاز میں ہو چکی ہے۔ ہمارے نزدیک تقدیر کلام یوں ہے۔ جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ وَالْهَدْيَ وَالْقَلَائِدَ شَعَائِرَ یعنی اللہ نے کعبہ بیت محترم کو لوگوں کے لیے مرکز اور شہر حرام، ہدی اور قلائد کو شعائر کا درجہ دیا۔ چونکہ یہ بات سیاق کلام سے بالکل واضح تھی اس وجہ سے لفظ شعائر کو حذف کر دیا۔

شعائر کی حکمت

ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوٓا أَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ الآیۃ، ذٰلِكَ کا اشارہ مذکورہ بالا شعائر کی طرف ہے اور یہ حکمت بیان ہوئی ہے ان شعائر کے مقرر کیے جانے کی کہ اللہ نے یہ اس لیے مقرر فرمائے ہیں کہ تمہارے اندر خدا کے فعلاً و صفتاً علیم و خبیر ہونے کا عقیدہ پوری طرح راسخ ہو جائے۔ ہم اوپر آیت ۹۴ میں لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّخَافُهُ بِالْغَيْبِ کے تحت اشارہ کر چکے ہیں کہ شعائر درحقیقت ابتلاء و امتحان کے لیے مقرر کیے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے ذریعہ سے امتحان کرتا ہے کہ کون اس سے غیب میں رہتے ڈرتے ہیں، کون نہیں ڈرتے۔ ظاہر ہے کہ اس امتحان میں پورے وہی اترتے ہیں اور وہی اتر سکتے ہیں جن کے اندر یہ علم راسخ ہوتا ہے کہ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے سب کو خدا جانتا ہے۔ جن کے اندر یہ عقیدہ پختہ ہوتا ہے وہی ہیں جو غیب میں رہتے اور خدا سے ڈرتے ہیں اور یہی غیب میں رہتے خدا سے ڈرنا تمام خشیت و تقویٰ اور سارے اسلام و ایمان کی روح ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کو فعلاً بھی بیان کیا ہے اور صفتاً بھی اس لیے کہ خدا کا علم ماضی، حاضر، مستقبل، ظاہر، باطن، غائب، موجود، مضمر سب پر محیط ہے اور انسان کا خدا کے علم کے متعلق یہی عقیدہ ہے جو اس کے اندر خشیت بالغیب پیدا کرتا ہے۔

تنبیہ اور بشارت

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ وَاَنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۔ یہ تنبیہ اور بشارت دونوں ساتھ ساتھ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ خدا سے بے خوف ہو کر اس کے شعائر کی بے حرمتی کریں گے اللہ ان کو سخت سزا دے گا اور جو لوگ غیب میں رہتے اس سے ڈرتے رہیں گے اور اس کے شعائر کا کما حقہ احترام کریں گے ان کے لیے وہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔

مَا عَلَی الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الایۃ یہ دوسری تنبیہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارے رسول پر ذمہ داری صرف واضح طور پر ہماری ہدایات کو پہنچا دینے کی ہے۔ یہ فرض رسول نے ادا کر دیا۔ اب آگے ذمہ داری تمہاری ہے۔ تم مانو یا نہ مانو۔ مانو گے تو اس میں تمہاری ہی بھلائی ہے، نہ مانو گے تو اس کا انجام خود دیکھو گے۔ یاد رکھو کہ جو تم ظاہر کرتے ہو خدا اس کو بھی جانتا ہے اور جو چھپاتے ہو اس سے بھی باخبر ہے۔

کسی برائی کی کثرت اس کے جواز کی دلیل نہیں ہے

قُلْ لَّا یَسْتَوِی الْخَبِیْثُ وَالطَّیِّبُ وَلَوْ اَعْجَبَکَ کَثْرَۃُ الْخَبِیْثِ فَاتَّقُوا اللّٰہَ یٰٓاُولِی الْاَلْبَابِ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ یہ بھی اسی سلسلے کی ایک تنبیہ ہے اور بہت بڑی تنبیہ ہے۔ خبیث اور طیب پر ہم دوسرے مقام میں بحث کر کے بتا چکے ہیں کہ ان کا اطلاق بری اور اچھی اشیا پر بھی ہوتا ہے اور برے اور اچھے اشخاص پر بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح ان اشیا پر بھی ہوتا ہے جو مادی اعتبار سے بری اور اچھی ہوتی ہیں اور ان اشیا پر بھی جو عقلی اور اخلاقی اعتبار سے اچھی یا بری ہوتی ہیں۔ یہاں پیش نظر اشیا اور اشخاص دونوں ہیں لیکن جہاں تک اچھائی اور برائی کا تعلق ہے وہ صرف اخلاقی پہلو سے زیر بحث ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کے نزدیک خیر و شر، نیکی اور بدی، فسق اور تقویٰ، نیکوکار اور بدکار دونوں یکساں نہیں ہیں۔ خدا خیر مطلق اور سراپا حق و عدل ہے۔ اس وجہ سے وہ صرف خیر کو پسند کرتا ہے، شر کو پسند نہیں کرتا، وہ صرف طیب کو قبول فرمائے گا، خبیث کے لیے اس کے ہاں جہنم کی آگ کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ جو لوگ خدا کی نافرمانی اور اس کے شعائر کی توہین کر کے اپنے آپ کو خبیث بنا لیں گے، یاد رکھیں کہ خدا ان کو دوزخ میں جھونک دے گا، فوز و فلاح صرف ان کو حاصل ہوگی جو خدا سے ڈرتے رہیں گے۔ اس کے احکام و شعائر کا احترام کریں گے اور اپنے آپ کو طیب و پاکیزہ بنائیں گے۔ گویا یہ اوپر والے مضمون اَنَّ اللّٰہَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ وَاَنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ کی تکمیل ہے۔ اس کے بعد وَلَوْ اَعْجَبَکَ کَثْرَۃُ الْخَبِیْثِ کہہ کر اس راہ کے سب سے بڑے فتنہ سے آگاہ فرما دیا۔ وہ یہ کہ بہت سے نادانوں کے لیے کسی برائی کی کثرت نہ صرف اس کی تقلید کے لیے محرک بلکہ اس کے جواز و استحسان کی ایک دلیل بن جاتی ہے۔ جو فتنہ عام ہو جاتا ہے اور جو بدی فیشن میں داخل ہو جاتی ہے وہ اپنے دروازے بھی اس کے لیے چوپٹ کھول دیتے ہیں۔ اول تو ان کا ضمیر اس سے کوئی انقباض محسوس ہی نہیں کرتا اور اگر شروع شروع میں کچھ محسوس کرتا بھی ہے تو وہ اس کو اس طفل تسلی سے مطمئن کر لیتے ہیں کہ بھلا اس زمانے میں کوئی اپنے آپ کو اس چیز سے کس طرح الگ رکھ سکتا ہے؟ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دوسروں کو حمام میں ننگا دیکھ کر وہ خود بھی ننگے ہو جاتے ہیں۔ اس طرح آہستہ آہستہ پورا معاشرہ ننگوں کا معاشرہ بن جاتا ہے اور پھر

حالت یہ ہو جاتی ہے کہ شریف اور مہذب وہ نہیں کہلاتا جو کپڑے پہن کر نکلتا ہے بلکہ وہ کہلاتے ہیں جو اپنی عریانی کی نمائش کرتے یا کرتی ہیں۔ اگر ان سے ان کے اس رویہ کے جواز کی دلیل پوچھیے تو وہ اس کے حق میں جو سخن سازی بھی کریں اس کی تہ میں صرف یہ چیز نکلے گی کہ کیا کیا جائے، یہی زمانہ کا چلن اور یہی وقت کا فتویٰ ہے یعنی اکثریت کا عمل ان کے لیے دلیل راہ بن جاتا ہے اور دانش فروشی کی تمام لن ترانیوں کے ساتھ جس ڈگر پر سارا گلہ چل رہا ہوتا ہے وہ بھی اس پر چل پڑتے ہیں۔ قرآن کے الفاظ سے یہاں یہ بات صاف نکلتی ہے کہ اگرچہ کسی برائی کا غلبہ اور خبیث کی کثرت اپنے اندر کشش تو رکھتی ہے لیکن اس کشش سے مغلوب ہو کر جو اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیتے ہیں وہ سب سفہا اور حمقا میں داخل ہیں، اولوا الالباب اور اہل عقل وہ ہیں جو اس وبائے عام میں بھی اس کے اثرات سے محفوظ اور تقویٰ کی راہ پر گامزن رہتے ہیں یہی لوگ ہیں جو فلاح پانے والے ہیں اس لیے کہ خدا کے ہاں نہ خبیث و طیب دونوں یکساں ہوں گے اور نہ خبیث اس لیے طیب بن جائے گا کہ اس کی مقدار بہت زیادہ ہے۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَسْـَٔلُوا۟ عَنْ أَشْيَآءَ إِن تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ وَإِن تَسْـَٔلُوا۟ عَنْهَا حِينَ يُنَزَّلُ ٱلْقُرْءَانُ تُبْدَ لَكُمْ عَفَا ٱللَّهُ عَنْهَا ۗ وَٱللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ ۝ قَدْ سَأَلَهَا قَوْمٌ مِّن قَبْلِكُمْ ثُمَّ أَصْبَحُوا۟ بِهَا كَٰفِرِينَ (۱۰۱-۱۰۲)

غیر ضروری سوالوں کی ممانعت

یہ بھی برسر موقع ایک تنبیہ ہے۔ ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ اوپر ان سوالوں کے جواب دیے گئے ہیں جو ابتدائے سورہ میں بیان کردہ احکام سے متعلق پیدا ہوئے یا پیدا ہو سکتے تھے۔ اب یہ تنبیہ فرمائی کہ جو مفید سوال تھے ان کے جواب دے دیے گئے لیکن ایسے سوال نہ کرو جن کے جواب اگر دے دیے جائیں تو تمہارے مزاج اور تمہاری خواہش کے خلاف پڑنے کے سبب سے وہ تمہیں برے لگیں گے۔ ساتھ ہی یہ حقیقت بھی واضح فرما دی کہ یہ زمانہ نزول قرآن کا زمانہ ہے۔ یہ زمانہ بارش کے ایام سے مشابہ ہے۔ بارش کے زمانہ میں جس طرح ہر بیج اگ پڑتا ہے اسی طرح اس زمانے میں جو سوال بھی کرو گے اس کا جواب نازل ہو سکتا ہے۔ اس وجہ سے سوچ سمجھ کر وہی سوالات کرو جو دنیا اور آخرت میں تمہارے لیے نافع اور علم شریعت میں اضافہ کے موجب ہوں۔ غیر ضروری سوالات اٹھا کر اپنی پابندیوں میں اضافہ کی راہ نہ کھولو۔ خدا بخشنے والا اور بردبار ہے۔ اس وجہ سے اس نے تمہارے بے ضرورت سوالات نظر انداز کر دیے ہیں۔ اگر ان کے بھی جواب دے دیے جاتے تو ہو سکتا ہے کہ تم ان کو نباہ نہ پاتے اور اس طرح اپنے ہی ہاتھوں اپنی راہ میں کانٹے بونے والے اور خدا کے غضب کو دعوت دینے والے بنتے۔

اس کے بعد بطور مثال ایک قوم کا حوالہ دیا ہے۔ مراد تو اس سے بالبداہت یہود ہیں لیکن ان کا نام نہیں لیا ہے بلکہ ان کا ذکر نکرہ کے ساتھ کیا ہے جس سے فی الجملہ اعراض اور نفرت کا اظہار ہوتا ہے۔ ان کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ انھوں نے بھی اپنے نبی سے اسی طرح کے سوالات و مطالبات کیے لیکن

جب ان کو جواب دے دیے گئے تو وہ ان کے منکر بن بیٹھے۔ ان کے سوالوں کی نوعیت سورۂ بقرہ میں گائے کے قصہ سے واضح ہو چکی ہے اور پچھلی سورتوں میں یہ بات بھی ہم تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں کہ درحقیقت ان کے اسی طرح کے سوالات تھے جن سے انھوں نے اپنی ان قیدوں اور پابندیوں میں اضافہ کرایا جن کو قرآن نے 'اصر و اغلال' سے تعبیر فرمایا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس امت پر اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہے کہ اس نے غیر ضروری سوالوں کو نظر انداز فرما کر ہمیں اصر و اغلال سے بچایا ہے اور ان معاملات کو ہمارے عقل و اجتہاد پر چھوڑ دیا جن میں ہماری عقل و فطرت ہماری رہنمائی کے لیے کافی ہے۔ اس میں یہ حکمت بھی تھی کہ یہ شریعت آخری اور کامل شریعت ہے، اس میں کوئی بات بھی معیار سے مختلف نہیں ہو سکتی، اس لیے کہ خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں تھا جو اس کو معیار پر لاتا۔ اس کے برخلاف یہود کی شریعت ایک وقتی شریعت تھی، اس میں اگر اصر و اغلال تھے تو وہ، جیسا کہ قرآن میں تصریح ہے، آخری پیغمبر کے ذریعہ سے دور ہو گئے۔

'قَدْ سَاَلَهَا' میں ضمیر کا مرجع مذکورہ سوال ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ انھوں نے بعینہٖ وہی سوالات کیے جن کی طرف اوپر اشارہ ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ اس نوعیت کے سوالات کیے۔ عربی میں ضمیروں کا استعمال اس طرح بھی ہوتا ہے۔ قرآن میں اس کی نظیریں موجود ہیں۔ ہم مناسب محل میں اس پر مفصل گفتگو کریں گے۔

مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ ۙ وَّلٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ وَاَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ؕ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۱۰۳-۱۰۵)

غیر مشروع شعائر سے اجتناب کی ہدایت

اوپر آیت ۹۷ میں ان چیزوں کا ذکر ہوا ہے جن کو اللہ نے شعائر کا درجہ دے کر محترم قرار دیا ہے۔ اس کے بعد چند مناسب موقع تنبیہات آگئیں۔ اب یہ ان مشرکانہ چیزوں کا ذکر ہو رہا ہے جن کو مشرکین نے شعائر کا درجہ دے کر مذہبی تقدس کا جامہ پہنا رکھا تھا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں میں سے کسی چیز کو بھی مشروع نہیں کیا تھا۔ مشرکین نے محض من گھڑت طور پر ان کو ایجاد کیا، ان کے احترام کی روایت قائم کی اور پھر اپنی ان بدعات کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیا کہ اس نے ان کے احترام کا حکم دیا ہے۔ گویا مشروع کے بیان کے بعد اس کے مقابل کی غیر مشروع چیزوں کا بھی ذکر فرما دیا تاکہ مسلمان ان سے اجتناب کریں۔

'مَا جَعَلَ اللّٰهُ'، 'جعل' یہاں مشروع کرنے کے معنی میں ہے۔ یعنی اللہ نے یہ چیزیں مشروع نہیں فرمائی ہیں۔

'بَحِيْرَة' اس اونٹنی کو کہتے جس سے پانچ بچے پیدا ہو چکے ہوتے اور ان میں آخری نر ہوتا۔ ایسی

اونٹنی کے کان چیر کر اس کو آزاد چھوڑ دیتے، نہ اس پر سواری کرتے نہ اس کا دودھ دوہتے۔

'سَائِبَۃ' اس اونٹنی کو کہتے جس کے متعلق اس کا مالک اپنی کسی بیماری میں یہ منت مانتا کہ اگر اس کو شفا ہو گئی تو وہ اس کو آزاد چھوڑ دے گا نہ اس پر سواری کرے گا نہ اس کا دودھ دوہے گا۔

'وَصِیلَۃ' بکری اگر مادہ جنتی تو اس کو اپنا حصہ سمجھتے، نر جنتی تو اس کو اپنے معبودوں کا حصہ سمجھتے اور اگر نر و مادہ دونوں ایک ساتھ جنتی تو اس کو وصیلہ کہتے اور ایسے نر کو بتوں کی نذر کے قابل نہ سمجھتے۔

'حَام' اس سانڈ اونٹ کو کہتے جس کی صلب سے کئی پشتیں پیدا ہو چکی ہوتیں۔ ایسے سانڈ کو بھی آزاد چھوڑ دیتے۔ نہ اس پر سواری کرتے، نہ بوجھ لادتے۔

یہ سب عرب جاہلیت کی نذریں اور منتیں تھیں۔ اس قسم کے جانور آزاد چھوٹے پھرتے، جس گھاٹ سے چاہتے پانی پیتے اور جس کی چراگاہ میں چاہتے چرتے۔ نہ ان کو کوئی روک سکتا نہ چھیڑ سکتا۔ ان کو مذہبی تقدس کا ایسا درجہ حاصل تھا کہ ہر شخص ان کے چھیڑنے کے وبال سے لرزہ براندام رہتا۔ قرآن نے واضح فرما دیا کہ ان کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے۔ شرعی حیثیت صرف ہدی اور قلائد کی ہے۔ یہ چیزیں صرف اوہام کی ایجاد ہیں، جن کو شریعت کی طرف منسوب کرنا اللہ اور اس کی شریعت پر صریح اتہام ہے۔ جو لوگ عقل سے عاری ہیں انھوں نے ان احمقانہ چیزوں کو اللہ سے نسبت دے رکھی ہے۔

اندھی روایت پرستی کی مذمت

وَاِذَا قِیۡلَ لَہُمۡ تَعَالَوۡا اِلٰی مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ الایۃ اوپر والی آیت میں یہ جو فرمایا ہے کہ 'وَاَکۡثَرُہُمۡ لَا یَعۡقِلُوۡنَ' (ان میں سے اکثر ناسمجھ ہیں) یہ اس کی دلیل بیان ہوئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب ان کو دعوت دی جاتی ہے کہ ان لایعنی باتوں کو چھوڑ کر اللہ کی اتاری ہوئی کتاب اور رسول کے بتائے ہوئے طریقہ کی طرف آؤ تو بڑے غرے سے جواب دیتے ہیں کہ حَسۡبُنَا مَا وَجَدۡنَا عَلَیۡہِ اٰبَآءَنَا ہم نے اپنے باپ دادا کو جس طریقے پر پایا ہے ہمارے لیے وہی کافی ہے۔ فرمایا کہ کیا اس صورت میں بھی وہ باپ دادا ہی کی روایت کو حجت بنائیں گے جب کہ ان کے باپ دادا کو نہ تو کچھ علم رہا ہو اور نہ وہ ہدایت کی راہ پر رہے ہوں، یعنی کسی طریقہ کی صحت کی دلیل مجرد یہ چیز تو نہیں بن سکتی کہ وہ باپ دادا سے چلا آرہا ہے، اس کے متعلق یہ معلوم کرنا بھی تو ضروری ہے کہ باپ دادا نے اس کو کسی علم اور کسی دلیل پر اختیار کیا تھا یا یوں ہی اختیار کر لیا تھا۔ اگر یہ تمیز غیر ضروری ہو جائے تو پھر تو یہ عقل، جو انسانیت کا وصف امتیازی ہے، بالکل خالتو چیز بن کے رہ جائے۔

مسلمانوں کو تسلی کہ تمھاری ذمہ داری صرف حق پہنچا دینے کی ہے

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا عَلَیۡکُمۡ اَنۡفُسَکُمۡ ۚ لَا یَضُرُّکُمۡ مَّنۡ ضَلَّ اِذَا اہۡتَدَیۡتُمۡ ؕ اِلَی اللّٰہِ مَرۡجِعُکُمۡ جَمِیۡعًا فَیُنَبِّئُکُمۡ بِمَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ، اوپر آیت ۹۹ میں جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی تھی کہ رسول کی ذمہ داری صرف واضح طور پر حق پہنچا دینے کی ہے، اس کو قبول کرنا یا نہ کرنا لوگوں کی اپنی ذمہ داری ہے۔ جو لوگ قبول نہ کریں گے اس کی پرسش خود ان سے ہوگی نہ کہ رسول سے۔ اسی طرح اس آیت

میں مسلمانوں کو تسلی دی ہے کہ جو لوگ اپنی عقل بیچ کر باپ دادا کی اندھی تقلید پر اڑ گئے ہیں ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو، تم نے کلمۂ حق پہنچا دیا، اگر وہ نہیں مانتے تو اپنا بگاڑیں گے، تمھارا کچھ نہیں بگاڑیں گے۔ جو گمراہی کی راہ اختیار کرتا ہے وہ خود اپنی ہرزہ گردی کا انجام دیکھتا ہے۔ اس سے صحیح راہ بتانے والے کا کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ تم نے ان کو سنبھالنے کی کوشش کر دی، اگر وہ نہیں سنبھلتے تو تم اپنی فکر کرو، ان کے غم میں پریشان نہ ہو۔ یہ مضمون قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوا ہے۔ انعام کی آیات ۱۵، ۴۸، ۵۱، ۵۲، ۶۹ کے تحت ہم اس پر مزید بحث کریں گے۔

بعض لوگوں کو اس سے یہ شبہ ہوا کہ مسلمانوں کو دوسروں کی ہدایت و ضلالت سے کوئی سروکار نہیں ہے، انھیں بس اپنے نفس کی فکر کرنی چاہیے۔ لیکن یہ خیال قطع نظر اس سے کہ مسلمانوں کے فریضۂ منصبی — شہادت علی الناس کے خلاف ہے، خود اس آیت سے بھی بالکل بے جوڑ ہے۔ اس آیت سے جو بات نکلتی ہے وہ تو یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح آپ کے صحابہؓ بھی کفار کی حق بیزاری دیکھ کر کبھی کبھی یہ خیال فرمانے لگتے کہ کہیں یہ چیز اس امر کا نتیجہ نہ ہو کہ جو فرض ابلاغ ان پر عائد ہوتا ہے اس میں کوئی کوتاہی ہو رہی ہو۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے جس طرح پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے اسی طرح صحابہؓ کو بھی تسلی دی کہ اس میں قصور تمھارا نہیں بلکہ یہ ان کے اپنے مزاج کا فساد ہے۔ تم نے اپنا فرض بخوبی انجام دے دیا، اب ان کے کفر و ایمان کی ذمہ داری تم پر نہیں ہے۔ اس باب میں کوئی پرسش تم سے نہیں ہونی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِيْنَ الْوَصِيَّةِ اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَيْرِكُمْ اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَاَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةُ الْمَوْتِ ۭ تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْۢ بَعْدِ الصَّلٰوةِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ اِنِ ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِيْ بِهٖ ثَمَنًا وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۙ وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ ۙ اللّٰهِ اِنَّآ اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِيْنَ (۱۰۶)

تمام ابواب شہادت پر میثاق

یہ بھی ایک تکمیلی و اتمامی حکم ہے جس کی نوعیت ابتدائے سورہ میں بیان کردہ بعض احکام کی وضاحت کی ہے۔ سورہ کے شروع، آیت ۸ میں، مسلمانوں کو یہ ہدایت ہوئی ہے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۡ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ۔ وہاں، جیسا کہ ہم اس آیت کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں، اس عمومی شہادت کا بیان ہے جس کی ذمہ داری اس امت پر تمام خلق سے متعلق ڈالی گئی ہے۔ اب یہ اس شہادت کا عمل مسلمانوں کے آپس کے ایک جزوی معاملہ میں بیان کر کے اس باب کی گویا تکمیل فرمائی ہے اور اس آیت کو اس شہادت کبریٰ کے بیان کے ساتھ جوڑ دیا ہے جس کا ذکر آیت ۱۰۹ سے آ رہا ہے اور جو اس عظیم سورہ کا آخری مضمون ہے جس پر یہ سورہ ختم ہوئی ہے۔ اس آیت کا اس مقام میں جگہ پانا ایک تو اس حقیقت کو ظاہر کر رہا ہے کہ جب اس تکمیلی حکم پر میثاق لے لیا گیا تو گویا تمام ابواب شہادت پر میثاق لے لیا گیا، دوسرے اس امر

کو ظاہر کر رہا ہے کہ ہر چند یہ حکم ایک جزوی حکم ہے لیکن باعتبار اپنی اصل کے یہ بھی اسی شہادت کبریٰ کا ایک جز ہے جس پر انبیاء علیہم السلام مامور ہوئے اور جس کو انھوں نے اس دنیا میں بھی انجام دیا اور جس کے لیے اللہ تعالیٰ انھیں آخرت میں بھی کھڑا کرے گا۔

شہادت وصیت سے متعلق ہدایات

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَیْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِیْنَ الْوَصِیَّةِ اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ۔ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اور حِیْنَ الْوَصِیَّةِ یہ دونوں ظرف شَهَادَةُ بَیْنِكُمْ سے تعلق رکھتے ہیں اور اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ اسی طرح کی ترکیب ہے جس طرح وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کی موت کا وقت آجائے اور اسے اپنے مال سے متعلق کوئی وصیت بھی کرنی ہے تو اس کے لیے وہ مسلمانوں میں سے دو ثقہ آدمیوں کو گواہ بنا لے۔

اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَیْرِكُمْ اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَاَصَابَتْكُمْ مُّصِیْبَةُ الْمَوْتِ اگر کوئی شخص سفر میں ہے اور سفر ہی میں اس کو موت کا مرحلہ پیش آجاتا ہے اور گواہ بنانے کے لیے اسے دو مسلمان نہیں مل رہے ہیں تو بدرجۂ مجبوری غیر مسلموں ہی میں سے دو آدمیوں کو گواہ بنا سکتا ہے۔

تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْۢ بَعْدِ الصَّلٰوةِ فَیُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ اِنِ ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِیْ بِهٖ ثَمَنًا وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ اللّٰهِ اِنَّآ اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِیْنَ۔ یہ ہدایت اصل حکم اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ سے متعلق ہے۔ یعنی اپنوں میں سے جن دو معتبر گواہوں کو گواہی کے لیے منتخب کرو، اگر اندیشہ ہو کہ وہ اپنی گواہی کسی کی جانب داری میں کہیں بدل نہ دیں تو اس کو مؤکد کرنے کے لیے یہ تدبیر کر سکتے ہو کہ کسی نماز کے بعد مسجد میں انھیں روک لو اور ان سے اللہ کے نام پر قسم لے لو کہ وہ اپنی گواہی کسی نفع دنیوی کی خاطر اور کسی کی جانبداری میں، خواہ وہ ان کا عزیز ہی کیوں نہ ہو بدلیں گے نہیں اور اگر وہ اس کو بدلیں تو وہ گنہگار ٹھہریں۔

مِنْۢ بَعْدِ الصَّلٰوةِ میں 'صَلٰوة' سے مراد کوئی مخصوص نماز نہیں بلکہ یہ لفظ اسم جنس کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ جس نماز کے بعد بھی وصیت کرنے والے کو موقع میسر آجائے، یہ کام کر سکتا ہے۔ نماز کی قید کا فائدہ یہ ہے کہ جو قول و قرار اور جو شہادت و قسم نماز کے بعد اور مسجد میں نمازیوں کی موجودگی میں انجام پائے ایک صاحب ایمان سے توقع یہی کی جاتی ہے کہ وہ اس پر مضبوطی سے قائم رہے گا۔ کسی ترغیب و تحریص سے اس کو بدلے گا نہیں۔ چنانچہ قسموں اور معاہدوں کے باب میں زمانۂ قدیم سے یہ رواج رہا ہے کہ ان کی تکمیل بالعموم معبدوں کے سامنے ہوتی۔ چونکہ اس چیز کی اثر انگیزی ایک فطری چیز ہے اس وجہ سے اسلام نے بھی اس کو اہمیت دی ہے۔ یہاں ایک شرط بھی مذکور ہے، وہ یہ کہ اگر گواہوں کے بارے میں کوئی شک ہو، تب یہ قسم لی جائے۔ اگر کوئی اندیشہ نہ ہو، گواہ ثقاہت و عدالت کے اعتبار سے ایسے مرتبہ کے ہوں کہ ان کے بارے میں کسی سوء ظن کا احتمال نہیں ہے تو خواہ مخواہ ان سے قسم لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ اللّٰهِ میں اس گواہی کو شَهَادَةَ اللّٰهِ سے تعبیر کر کے اس کی عظمت واضح فرمائی ہے اس لیے کہ مومن کی

ہر گواہی چھوٹی ہو یا بڑی کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰہِ شُھَدَآءَ بِالْقِسْطِ کی رو سے اس عظیم فریضۂ منصبی کا ایک حصہ ہے جس پر اللہ نے اس کو مامور فرمایا ہے، اگر اس میں ادنیٰ خیانت بھی اس سے صادر ہو تو وہ صرف بندوں ہی کا خائن نہیں بنتا ہے بلکہ اپنے رب کا بھی خائن بن جاتا ہے۔

ہم نے اس قسم کو اصل حکم یعنی اس صورت سے متعلق مانا ہے جب گواہ اپنوں، مسلمانوں، میں سے ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غیر مسلموں کے لیے نماز، مسجد، اللہ کے نام پر قسم اور وہ بھی ان الفاظ میں کہ وَلَا نَکْتُمُ شَھَادَۃَ اللّٰہِ اِنَّآ اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِیْنَ (ہم اس شہادتِ الٰہی کو چھپائیں گے نہیں، اگر ہم ایسا کریں تو ہم گنہگاروں میں سے ٹھہریں) بالکل غیر موثر چیزیں ہیں۔ اول تو وہ اپنے مذہبی جذبات کے خلاف ان باتوں کو گوارا کیوں کریں گے اور کر بھی لیں تو اس کا اثر ان پر کیا ہوگا! ان کی گواہی تو ایک مجبوری کی صورت میں گوارا کی گئی ہے اور ایک شاذ حالت سے متعلق ہے۔ اس وجہ سے ان کی گواہی کی حفاظت کے لیے یہ اہتمام ایک بالکل بے جوڑ سی چیز ہے۔

فَاِنْ عُثِرَ عَلٰٓی اَنَّھُمَا اسْتَحَقَّآ اِثْمًا فَاٰخَرٰنِ یَقُوْمٰنِ مَقَامَھُمَا مِنَ الَّذِیْنَ اسْتَحَقَّ عَلَیْھِمُ الْاَوْلَیٰنِ فَیُقْسِمٰنِ بِاللّٰہِ لَشَھَادَتُنَآ اَحَقُّ مِنْ شَھَادَتِھِمَا وَمَا اعْتَدَیْنَآ ۖ اِنَّآ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِیْنَ (۱۰۷)

عثر عثرا وعثورا علی السر کے معنی ہیں وہ راز سے آگاہ ہوا۔

اولیان، اولیٰ کا تثنیہ ہے جس کے معنی احق کے ہیں اِنَّ اَوْلَی النَّاسِ بِاِبْرٰھِیْمَ۔ الاولیان یعنی الاولیان بالشہادۃ شہادت کے زیادہ حق دار۔ ان سے مراد وہ دونوں گواہ ہیں جو میت کے ابتدائی گواہ بنائے گئے۔ چونکہ اپنے منصب کے اعتبار سے گواہی کے اصل حق دار وہی ہیں اس وجہ سے ان کو 'اولیان' کے لفظ سے تعبیر فرمایا۔ یہاں اس میں اس بات کی طرف اشارہ بھی ہے کہ جب وہ اولیٰ بالشہادۃ ہیں تو انھیں چاہیے کہ وہ اپنے اس منصب کی لاج رکھیں اور کسی ایسی بدعنوانی کے مرتکب نہ ہوں کہ اولیٰ بالشہادۃ ہوتے ہوئے بھی ان کی شہادت دوسروں کی قسم سے باطل ہو جائے۔

یہ ان گواہوں پر ایک مزید احتساب اور چیک ([illegible]) ہے۔ فرمایا کہ اگر یہ بات علم میں آئے کہ انھوں نے وصیت کرنے والے کی وصیت کے خلاف کسی کی جانب داری یا کسی کی حق تلفی کی ہے تو جن کی حق تلفی ہوئی ہے ان میں سے دو آدمی اٹھ کر قسم کھائیں گے کہ ہماری گواہی ان دونوں اولیٰ بالشہادت گواہوں کی گواہی سے زیادہ سچی ہے، ہم نے ذرا بھی حق سے تجاوز نہیں کیا ہے، اگر ہم نے ایسا کیا ہو تو ہم ظالموں میں سے ٹھہریں۔

ذٰلِکَ اَدْنٰٓی اَنْ یَّاْتُوْا بِالشَّھَادَۃِ عَلٰی وَجْھِھَآ اَوْ یَخَافُوْٓا اَنْ تُرَدَّ اَیْمَانٌۢ بَعْدَ اَیْمَانِھِمْ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاسْمَعُوْا ۭ وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ (۱۰۸)

یہ اس احتساب کا فائدہ بتایا ہے کہ توقع ہے کہ اس احتساب کے خیال سے وہ ٹھیک ٹھیک گواہی دیں ورنہ انھیں ڈر ہوگا کہ اگر ان سے کوئی بدعنوانی صادر ہوئی تو ان کی قسمیں دوسروں کی قسموں سے باطل ہو جائیں گی۔ اس سے معلوم ہوا کہ جن کی حق تلفی ہوتی ہے اگر وہ مذکورہ قسم کھا لیں گے تو وصیت کے اصل گواہوں کی گواہی ان

کے اولیٰ بالشہادت ہونے کے باوجود رد ہو جائے گی۔ تُرَدَّ اَیْمَانٌ بَعْدَ اَیْمَانِھِمْ میں ایمان کی تنکیر اسی طرح کی ہے جس طرح نَفْسٌ مُّطْمَئِنَّۃٌ میں ہے جس پر گفتگو ہو چکی۔

وَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاسْمَعُوْا وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ یعنی اللہ سے ڈرو، پیغمبر کی بات مانو، جو اللہ سے نہیں ڈرتے اور پیغمبر کی بات نہیں سنتے وہ نافرمان ہیں اور اللہ ایسے نافرمانوں کو راہ یاب نہیں کرے گا، وہ دنیا میں بھٹکتے رہیں گے اور آخرت میں اپنے انجام بد سے دوچار ہوں گے۔

یَوْمَ یَجْمَعُ اللّٰہُ الرُّسُلَ فَیَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا اِنَّکَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ (۱۰۹)

میثاق الٰہی کی ذمہ داری دنیا اور آخرت دونوں میں

یہاں سے اس سورہ کا بالکل آخری ٹکڑا شروع ہو رہا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تمام انبیاء کو جمع کر کے ان سے پوچھے گا کہ انھوں نے اپنی اپنی امتوں کو کیا تعلیم دی تھی اور ان کی امتوں نے اس تعلیم کے باب میں کیا رویہ اختیار کیا؟ یہ سورہ کے آخر میں گویا اس حقیقت کی یاد دہانی ہے کہ میثاق الٰہی کی ذمہ داری نبی اور امت دونوں پر عائد ہوتی ہے اور قیامت کے دن اس کے بارے میں دونوں سے سوال ہوگا۔ آگے ذکر اگرچہ صرف سیدنا مسیح سے سوال و جواب کا ہے لیکن آنجناب کا ذکر بطور مثال ہے۔ اس مثال سے یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ اسی طرح کے سوال و جواب ہر نبی سے اس کی امت کے بارے میں ہوں گے اور اللہ تعالیٰ ہر امت پر اس کے نبی کی موجودگی میں واضح فرما دے گا کہ اس نے اللہ کے عہد کے معاملے میں اپنے نبی کی تعلیم کی کیا کیا خلاف ورزیاں کی ہیں۔ مثال کے طور پر سیدنا مسیح کے انتخاب کی حکمت یہ ہے کہ وہ اسرائیلی سلسلۂ نبوت کی آخری کڑی ہیں۔ ان کی شہادت یہود و نصاریٰ کے لیے بھی سبق آموز ہو سکتی تھی اور اس امت کے لیے بھی۔ آنحضرت کی شہادت اس مرحلہ میں اس لیے ذکر نہیں کی گئی کہ آپ کی امت ابھی دورِ تشکیل میں تھی۔ اس کا پورا کردار ابھی سامنے نہیں آیا تھا۔

انبیاء سے سوال ان کی امتوں کے رویہ سے متعلق

مَاذَآ اُجِبْتُمْ کے سوال کا صحیح مفہوم موقع و محل سے واضح ہوتا ہے۔ انبیاء سے یہ سوال جو بیان مذکور ہے ان کے منکروں سے متعلق نہیں کیا جائے گا بلکہ، جیسا کہ واضح ہوا، ان کی امتوں سے متعلق کیا جائے گا کہ جن لوگوں کو تم نے اللہ کے عہد و میثاق میں داخل کیا ان کا رویہ اور رد عمل کیا رہا؟ انبیاء علیہم السلام پر سوال کی یہ حقیقت چونکہ واضح ہوگی اس وجہ سے وہ اپنی لاعلمی کا اظہار کریں گے کیونکہ ان کا علم صرف دنیا میں اپنی موجودگی کے زمانے تک ہی محدود ہوگا اور اس سوال کے صحیح جواب کا انحصار اس امر پر ہے کہ انھیں اپنی امتوں کی بعد کی تبدیلیوں کا بھی علم ہو۔ چونکہ بعد کی تبدیلیوں کا انھیں علم نہیں ہوگا اس وجہ سے وہ اس جواب کے معاملے کو خدا ہی کی طرف تفویض کریں گے۔ آگے حضرت عیسیٰ کا ارشاد مذکور ہے کُنْتُ عَلَیْھِمْ شَھِیْدًا مَّا دُمْتُ فِیْھِمْ فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ کُنْتَ اَنْتَ الرَّقِیْبَ عَلَیْھِمْ وَاَنْتَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَھِیْدٌ (میں جب تک ان میں رہا ان پر گواہ رہا، پھر جب تو نے مجھے اٹھا لیا تو تو ان پر نگران رہا اور تو ہر چیز پر نگران ہے)

اِذْ قَالَ اللّٰہُ یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ اذْکُرْ نِعْمَتِیْ عَلَیْکَ وَعَلٰی وَالِدَتِکَ اِذْ اَیَّدْتُّکَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ

تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۚ وَإِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْإِنْجِيلَ ۚ وَإِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ بِإِذْنِي فَتَنْفُخُ فِيهَا فَتَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِي وَتُبْرِئُ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ بِإِذْنِي ۚ وَإِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِإِذْنِي ۚ وَإِذْ كَفَفْتُ بَنِي إِسْرَآءِيلَ عَنْكَ إِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ إِنْ هٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ (۱۱۰)

یہاں حضرت عیسیٰ کے جو معجزات مذکور ہیں یہ سب سورۂ آل عمران میں بھی بیان ہو چکے ہیں ہو ہاں ہم ان کی وضاحت کر چکے ہیں۔

وَإِذْ كَفَفْتُ بَنِي إِسْرَآءِيلَ عَنْكَ اشارہ بنی اسرائیل کی ان سازشوں کی طرف ہے جو انھوں نے سیدنا مسیح کے قتل اور سولی کے لیے کیں۔

سوالات نصاریٰ کی فضیحت کے لیے

یہ تمام باتیں قیامت کے دن حضرت عیسیٰ کو مخاطب کر کے اللہ تعالیٰ نصاریٰ پر حجت تمام کرنے کے لیے فرمائے گا۔ گویا حضرت عیسیٰ کی موجودگی میں نصاریٰ پر یہ حقیقت واضح کر دی جائے گی کہ حضرت عیسیٰ اور ان کی والدہ پر جو انعام بھی ہوا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوا، انھوں نے جو معجزے بھی دکھائے سب اللہ کے اذن و حکم سے دکھائے اور یہودیوں نے ان کو جن خطرات میں ڈالا ان سے ان کو اللہ تعالیٰ ہی نے نکالا۔ پھر جب یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ نے کیا اور اس کے سب سے بڑے گواہ خود عیسیٰ ہیں تو نصاریٰ بتائیں کہ انھوں نے کس کے کہنے سے ان کو خدا بنا ڈالا۔ یہاں بِاِذْنِيْ (میرے حکم سے) کی تکرار نہایت بلیغ ہے۔ ایک ایک بات پر اللہ تعالیٰ اس کو دہرائے گا اور ان میں سے ہر بات پر سیدنا مسیح اٰمَنَّا وَصَدَّقْنَا کہیں گے تو ظاہر ہے کہ جن معجزات کے بل پر نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ کو خدا بنایا جب وہ سب خدا کے اذن سے ہوئے اور اس کا اعتراف خود معجزات کا دکھانے والا ہی کرے گا تو نصاریٰ کے حصے میں فضیحت اور رسوائی کے سوا اور کیا باقی رہ جائے گا۔

وَإِذْ أَوْحَيْتُ إِلَى الْحَوَارِيِّينَ أَنْ اٰمِنُوا بِي وَبِرَسُولِي ۚ قَالُوا اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِأَنَّنَا مُسْلِمُونَ ۝ إِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ يٰعِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيعُ رَبُّكَ أَنْ يُنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ ۖ قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ ۝ قَالُوا نُرِيدُ أَنْ نَّأْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمَئِنَّ قُلُوبُنَا وَنَعْلَمَ أَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَنَكُونَ عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِينَ ۝ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَآ أَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُونُ لَنَا عِيدًا لِّأَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنْكَ ۖ وَارْزُقْنَا وَأَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِينَ ۝ قَالَ اللّٰهُ إِنِّي مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ ۖ فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَإِنِّيٓ أُعَذِّبُهُ عَذَابًا لَّآ أُعَذِّبُهُ أَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِينَ (۱۱۱-۱۱۵)

حواریین کی غیبت بحث و نے کی حکمت

'وحی' کا لفظ یہاں اصطلاحی معنی میں نہیں، بلکہ لغوی معنی میں ہے۔ یعنی دل میں کوئی ارادہ ڈالنا۔ 'حواری' کے لفظ پر دوسرے مقام میں بحث ہو چکی ہے۔ یہی حواریین ہیں جو پوری قوم کے اندر سے حضرت عیسیٰ پر ایمان لائے، انھی نے دعوت کے کام میں آپ کی مدد کی اور انھی کو آنجناب کے خلفا کی حیثیت حاصل ہوئی۔ ان کی

اس اہمیت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان کے سامنے بھی وہ حقائق پیش کرے گا جن سے نصاریٰ پر حجت پوری ہو گی۔ اس اتمامِ حجت کے چند پہلو یہاں ذکر کیے جاتے ہیں۔

ایک یہ کہ حواریین نے جس دین کو قبول کیا وہ نصرانیت و مجوسیت نہیں بلکہ اسلام ہے۔

دوسرا یہ کہ حواریین حضرت عیسیٰؑ کو عیسیٰ بن مریم کہتے تھے، ان کی الوہیت کا کوئی تصور ان کے ذہن میں نہیں تھا۔ وہ اللہ تعالیٰ ہی کو حضرت عیسیٰؑ اور تمام کائنات کا رب مانتے تھے۔

نزولِ مائدہ کی دعا کا مقصد

تیسرا یہ کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کو بالذات معجزات کا دکھانے والا نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان کو صرف ان کے ظہور کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے، چنانچہ انھوں نے مائدہ کے اتارے جانے کے لیے جو درخواست کی وہ حضرت عیسیٰؑ سے نہیں کی کہ آپ ہمارے لیے مائدہ اتاریں بلکہ یہ درخواست کی کہ اگر یہ بات آپ کے خداوند کی حکمت کے خلاف نہ ہو تو آپ اس سے درخواست کیجیے کہ وہ ہمارے لیے مائدہ اتارے تاکہ اس سے ہمارے دلوں کو طمانیت حاصل ہو۔

جب یہ ساری باتیں سیدنا مسیحؑ، حواریین اور نصاریٰ کی موجودگی میں سامنے آئیں گی تو اس وقت وہ سارے جھوٹ آشکارا ہو جائیں گے جو مسیحیوں نے حضرت مسیحؑ یا حواریین پر باندھے ہیں اور جن کے ذریعہ سے اپنی بدعات میں ان کو ملوث کیا ہے۔

سوال خدا کی قدرت سے متعلق نہیں اُس کی حکمت سے متعلق ہے

هَلْ يَسْتَطِيعُ رَبُّكَ کے سوال کے باب میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ حواریین کا سوال خدا کی قدرت سے متعلق نہیں بلکہ اس کی حکمت سے متعلق تھا کہ اس قسم کی کھلی ہوئی نشانی دکھانا اس کی حکمت کے مطابق بھی ہوگا یا نہیں؟ حواریین باایمان لوگ تھے، وہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہو سکتے تھے کہ ان کی یہ درخواست مشابہ ہے اس مطالبہ سے جو بنی اسرائیل نے خدا کو دیکھنے کے لیے کیا تھا جس کے نتیجہ میں ان کو کڑک نے آدبوچا تھا۔ معجزات ہر چند خارقِ عادت ہوتے ہیں تاہم وہ اسباب کے پردے ہی میں ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ تمام پردے اٹھا دیے جائیں اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس طرح کے مطالبات کی کبھی حوصلہ افزائی نہیں فرمائی جن میں خواہش ان حدود سے متجاوز ہو جائے جو معجزات کے ظہور کے لیے سنت اللہ میں مقرر ہیں۔ چنانچہ حضرت مسیحؑ نے بھی اس سے روکا اور جب حواریین کی دوبارہ درخواست پر اس کے لیے درخواست فرمائی تو اللہ تعالیٰ نے اس درخواست کو پسند نہیں فرمایا بلکہ ارشاد ہوا کہ اتارنے کو تو میں مائدہ اتار دوں گا لیکن یاد رکھو کہ جو لوگ اتنی کھلی نشانیاں دیکھنے کے بعد کفر میں مبتلا ہوں گے ان کو سزا بھی وہ دوں گا جو کسی اور کو نہ دوں گا۔ معلوم ہوتا ہے اس کے بعد حواریین اپنی اس درخواست سے باز آ گئے۔ اہلِ تاویل علما سے بھی ایک گروہ کا یہی خیال ہے کہ اس کا نزول نہیں ہوا۔ انجیلوں میں بھی اس کا ذکر نہیں ہے۔

وَإِذْ قَالَ اللَّهُ يَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ أَأَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأُمِّيَ إِلَٰهَيْنِ مِنْ دُونِ اللَّهِ ۖ قَالَ سُبْحَانَكَ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أَقُولَ مَا لَيْسَ لِي بِحَقٍّ ۚ إِنْ كُنْتُ قُلْتُهُ فَقَدْ عَلِمْتَهُ ۚ تَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِي وَلَا

أَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِكَ ۚ إِنَّكَ أَنتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ ۝ مَا قُلْتُ لَهُمْ إِلَّا مَا أَمَرْتَنِي بِهِ أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ ۚ وَكُنتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ ۖ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنتَ أَنتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ ۚ وَأَنتَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ۝ إِن تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۖ وَإِن تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝ (۱۱۶-۱۱۸)

نصاریٰ کی رسوائی آنحضرت میں

وَإِذْ قَالَ اللَّهُ الآیۃ اوپر جو باتیں مذکور ہوئی ہیں مقصود ان کے ذکر سے بھی اگرچہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، نصاریٰ کی تفضیح ہے لیکن وہ تفضیح بالواسطہ ہے۔ اب یہ اس سوال کا ذکر آ رہا ہے جو اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ سے نصاریٰ کی اصل گمراہی کے بارے میں پوچھے گا کہ کیا تم نے نصاریٰ کو یہ تعلیم دی تھی کہ اللہ کے سوا مجھ کو اور میری ماں کو بھی معبود بناؤ۔ حضرت عیسیٰ جواب میں فرمائیں گے کہ بھلا میں ایسی بات زبان سے کس طرح نکال سکتا تھا جس کا مجھے کوئی حق نہیں تھا، نہ تو تو نے یہ کہنے کا مجھے مجاز کیا تھا، نہ دنیا کی خلق و تدبیر میں میری کوئی حصہ داری تھی کہ میں اس کا مدعی بنتا۔ مقصود اس سوال و جواب سے یہ ہو گا کہ نصاریٰ حضور نے حضرت مسیح اور ان کی والدہ کو خدا کا شریک بنایا، بھرے مجمع میں پوری طرح رسوا ہوں۔

أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ کے ٹکڑے پر آل عمران کی تفسیر میں ہم گفتگو کر چکے ہیں کہ یہ دراصل مسیح تعبیر ہے سیدنا مسیح کے ارشاد 'میرا باپ اور تمہارا باپ' کی اس کو وہاں دیکھیے۔

وَكُنتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ، 'شہید' یہاں نگران کے معنی میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں جب تک ان میں موجود رہا، اس وقت تک تو میں دیکھتا رہا کہ وہ کیا بنا رہے ہیں لیکن جب تو نے مجھے اٹھا لیا تو مجھے کچھ پتہ نہیں کہ انھوں نے کیا بنایا اور کیا بگاڑا —— اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ مَاذَا أُجِبْتُمْ کے سوال کا یہی پہلو ہے جس کی بنا پر انبیاء علیہم السلام اپنی لاعلمی کا اظہار فرمائیں گے۔

نصاریٰ کی شفاعت سے سیدنا مسیحؑ کی برات

إِن تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ الآیۃ سیدنا مسیح کے اس فقرے کی بلاغت کی تعبیر نہیں ہو سکتی۔ بظاہر دل چاہتا ہے کہ فقرہ یوں ہوتا إِن تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَإِن تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ لیکن اگر یوں ہوتا تو یہ نہایت واضح الفاظ میں نصاریٰ کے لیے شفاعت بن جاتا اور انبیاء علیہم السلام کے متعلق یہ معلوم ہے کہ وہ مشرکین کے لیے سفارش نہیں فرمائیں گے۔ اس وجہ سے سیدنا مسیح بات ایسے اسلوب میں فرمائیں گے کہ بات سچی بھی ہو، دربار الٰہی کے شایان شان بھی ہو، دردمندانہ بھی ہو اور ان پر اس سے مشرکین و محرفین دین کی سفارش کی کوئی ذمہ داری بھی عائد نہ ہو۔ چنانچہ إِن تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۖ وَإِن تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ کے الفاظ پر غور فرمائیے تو معلوم ہو گا کہ اس فقرے میں وہ تمام خوبیاں بھی موجود ہیں جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا اور ساتھ ہی یہ پہلو بھی موجود ہے کہ سیدنا مسیح اپنے آپ کو ان کی شفاعت کی ذمہ داری سے بری کر لیں گے۔

قَالَ اللَّهُ هَٰذَا يَوْمُ يَنفَعُ الصَّادِقِينَ صِدْقُهُمْ ۚ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۚ رَّضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ۚ ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝ لِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا فِيهِنَّ ۚ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ (۱۱۹-۱۲۰)

'صدق' کے لفظ پر ہم آل عمران آیت ۱۷ کی تفسیر میں بحث کر چکے ہیں۔ یہاں 'صٰدقین' سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ سے اپنے قول و اقرار اور عہد و میثاق میں پورے راست باز ثابت ہوئے، اس میں انھوں نے کوئی تبدیلی اور تحریف نہیں کی، زندگی کے تمام نشیب و فراز میں حزم و عزم کے ساتھ اللہ کی شریعت پر قائم رہے۔ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ (اور مومنین میں وہ مردانِ کار بھی ہیں جنھوں نے اللہ سے باندھے ہوئے عہد کو سچ کر دکھایا)۔

راست بازوں کی کامرانیوں کا دن

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ آج کا دن تو راست بازوں کی فتح مندیوں اور کامرانیوں کے ظہور کا دن ہے۔ بدعہدوں، خائنوں اور جھوٹی آرزوؤں میں زندگی گزارنے والوں کے لیے آج حسرت و نامرادی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ جنھوں نے اللہ کے ساتھ اپنے عہد اخلاص و سچائی کے ساتھ پورے کیے ہیں ان کے لیے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ یعنی ان کے رب نے جو کچھ ان سے چاہا انھوں نے اس کی رضا کے مطابق وہ پورا کر دکھایا اور انھوں نے اپنے رب سے جو امیدیں کیں ان کی توقعات اور ان کے تصورات سے ہزاروں لاکھوں درجہ اوپر وہ پوری ہو گئیں۔ فرمایا کہ اصلی بڑی کامیابی یہی ہے۔ آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے اندر ہے سب کی بادشاہی اللہ ہی کی ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

یہ اس سورہ کی تفسیر کی آخری سطریں ہیں جو سپردِ قرطاس ہوئیں۔ وَاٰخِرُ دَعْوٰىنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

لاہور

۸ رمضان المبارک ۱۳۸۷ھ

۱۱ دسمبر ۱۹۶۷ء

فہرست مضامین

فہرست مضامین

تفسیر سورۃ آل عمرٰن-۳

تفسیرِ سورۃ النسآء - ۴

تفسیر سورۃ المآئدۃ - ۵

خطاطی ـــــ عبدالغفور کیلانی